لازوال

بشریٰ رحمٰن

"دنیا بہت بُری ہے"

اس کی زندگی میں اسی ایک فقرے نے انقلابات کے زہر گھولے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد اور ہوش آنے سے پہلے اس نے اور بھی بہت سے فقرے سنے تھے مگر نہ جانے کیوں یہ ننھا سا فقرہ اس کے من کے پاتال میں جا کر بیٹھ گیا۔ بس نس میں کھب گیا۔

دنیا بری کیوں ہے بھلا؟ اس کی برائی جاننے کا تجسّس جی میں بیدار ہونے لگا۔ حالانکہ دیکھنے میں تو دنیا بڑی اچھی جگہ ہے۔ خوب صورت ہے۔ دلکش ہے۔ دلنواز ہے۔

نایاب تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس لئے اس پر کڑی نظر رکھی جاتی۔ آپا جی تو جیسے سے نظروں میں تولتے رہتے۔ وہاں کیوں گئی تھی۔ ادھر کیوں بیٹھی تھی۔ بیٹھک میں کیوں جھانک رہی تھی۔ چار پانچ سال کی بچّی کے لئے ایسی سرزنشیں اس پنکھے کی مانند ہوتی ہیں جو کوئلوں کو ہوا دے کر دہکاتا ہے۔

وقت بے وقت بھائیوں کے دوست آجاتے اور وہ اپنے کمرے میں طوفانِ بدتمیزی برپا کرتے تو اس کا جی چاہتا جا کر ان میں شامل ہو جائے۔ اور نہیں تو دروازے میں کھڑی ہو کر دیکھے تو سہی۔ وہ بے اختیار دروازے میں جا کر کھڑی ہو جاتی اور پھر والہانہ پن سے انہیں

آزادانہ اچھل کود اور دھینگا مشتی کرتے دیکھتی تو اس کا بھی جی چاہتا کہ جا کر ان میں شامل ہو جب وہ بے تکلفانہ ایک دوسرے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتے تو اس کا دل چاہتا کہ دوڑ کر جائے کسی ایک کی ٹانگ کے ساتھ گتھم گتھا ہو جائے۔ ہاں۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ لڑکا بن جائے لڑ میں کود جائے۔ کسی کے ہاتھ رسید کر دے۔ کسی کو ٹھائیں ٹھائیں مکے مارے! اوپر تلے، اوپر گتھم گتھا ہوتے ہوتے کہیں سے کہیں لڑھک جائے۔

خیر اب لڑکا بننا تو ناممکن تھا۔ کیونکہ امی جان نے منتیں مان مان کر تو اسے حاصل کیا اوپر تلے تین لڑکے غیاث، وقاص اور اویس پیدا ہو گئے تو امی جان کو یکایک بیٹی کی دھن ہوئی۔ ہائے جس گھر میں بیٹی نہ ہو وہ بھی کوئی گھر ہوتا ہے۔ بیٹی کی چہکار سے گھر میں موسیقیت ہے۔ بیٹی کے پیراہن سے گھر کے در و دیوار منقش نظر آتے ہیں۔ بیٹی کا وجود گھر میں امن و شا کا پیغامبر ہے۔ بیٹی آتی ہے تو ماں کی تنہائیاں سنور جاتی ہیں۔ مگر باپ کی کمر جھک جاتی ہے۔ شاید امی جان اسی کمر کو جھکانا چاہتی تھیں۔

ابا جی بڑے سخت گیر آدمی تھے۔ شادی سے پہلے دس سال اپنی طبیعت کی سختی امی پر نکالتے رہے تھے اور اب غصہ نکالنے کے لئے ان کو بچے مل گئے تھے۔ لڑکوں کا بھی پیٹتے رہتے۔ مگر لڑکے کب ان کی پروا کرتے تھے۔ وہ گھر میں داخل ہوتے تو گھر کی دیواریں کا لگتیں۔ تینوں لڑکوں کی شکلیں ہی بگڑ جاتیں۔ کوئی سکول کی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ کوئی غسل خ میں گھس جاتا کوئی امی جان سے پیسے لے کر سودا سلف لینے چل دیتا۔

"حرام زادوں نے سکول کا کام کر لیا؟" ابا جی اپنی بارعب اور بلند آواز میں پوچھتے۔ ک لڑکا جواب نہ دیتا مگر امی جان خود ہی بول پڑتیں "جی ہاں"

"الو کے پٹھوں نے آج تو کوئی شرارت نہیں کی؟"

اس پر امی بالکل خاموش ہو جاتیں بلکہ ادھر ادھر کام میں مشغول ہونے کی کوشش کرتیں تینوں لڑکے انتہائی مسکین صورت بنا کے کتابیں ڈھونڈنے لگتے۔

"اوئے غیاث!" ابا جی للکارتے "میں کیا پوچھ رہا ہوں؟"

"جی"

"اوئے جی کے بچے میری بات کا جواب دے"

"جی ابا جی"

"اوئے الو کے پٹھے۔ ناخلف، نامراد۔ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دے۔ کیا بے وقوفوں کی طرح جی جی لگا رکھی ہے۔

"جی ہاں.... جی.... نہیں.... جی.... ابا جی...."

غیاث کچھ سمجھ نہ پاتا کہ ابا جی نے کیا پوچھا تھا اور اسے کیا جواب دینا چاہیئے۔

اس کو ہکلاتے دیکھ کر ابا جی وقاص کے پیچھے پڑ جاتے۔

"اوئے ذلیل کی اولاد۔ تو نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ یہ منہ کالا کہاں سے کر کے آیا ہے؟"

گھبراہٹ کے مارے وقاص سیاہی سے بھرا ہوا ہاتھ دوبارہ اپنے منہ پر مارنے لگتا۔

"اور وہ کہاں ہے تیرا لاڈلا، اویس کہاں ہے؟"

وہ امی کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتے "تو اس کی جڑوں میں بیٹھ جاتے گی مجھے پتہ ہے کھسک گیا ہو گا باہر سودا سلف لینے کے بہانے۔ تو اس کو ادھر ادھر کر دیتی ہے۔ کل بھی گلی کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں کہتا ہوں اس کو اندر بٹھایا کر اندر گورا چٹا لڑکا ہے۔ زمانہ خراب ہے بے وقوف عورت! عقل کر عقل"

جب تک ابا جی کا لیکچر جاری رہتا بچے ادھر ادھر دیکھے رہتے اور امی جان ماتھے پر بل ڈالے چپ چاپ کام میں مگن رہتیں۔ نایاب سہمے ہوئے انداز میں امی کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاتی۔

جب ابا جی باہر مردانے میں چلے جاتے تو نایاب امی سے پوچھتی "امی جان! ابا جی بھائیوں کو حرام زادہ اور الو کا پٹھا کیوں کہتے ہیں؟"

امی کچھ جواب نہ دیتیں۔ بس منہ ہی منہ میں بڑبڑائے جاتیں۔

نایاب پھر کہتی۔ "امی جان! الّو کا پٹھا اور حرامزادہ کیا ہوتا ہے؟"

"تمہارا سر" امّی جل کر جواب دیتیں۔

"آآ۔ میں تجھے بتاؤں" وقاص اچھلتا ہوا اس طرح نکل آتا جیسے اسے ابھی ڈانٹ نہیں پڑی تھی۔ "بڑا بے حیا ہے" نایاب دل میں کہتی۔

"جس کا باپ الّو ہو۔ اس کو الّو کا پٹھا کہتے ہیں۔ آئی سمجھ میں!"

اس کی اس وضاحت پر امّی جان اسے خونخوار نظروں سے دیکھ کر چمٹا اٹھا لیتیں۔ "کمینے بہن کو بری باتیں سکھاتا ہے"

"خود ہی تو پوچھ رہی تھی" یہ کہہ کر وہ اچھلتا ہوا دور نکل جاتا۔

"کیا تکلیف ہے تجھے جو ہر بات پوچھتی ہے؟" بالآخر امّی بھی اسی پر غصہ نکالتیں۔

اس گھر کا عجیب دستور تھا۔ ہر کوئی اپنے سے کمزور پر اپنا غصہ نکالتا۔ پر ان لڑکوں کے اندر تو جیسے ڈھٹائی کا بیج تھا۔ کبھی جو ابّا جی کی ڈانٹ کا کان پر اثر ہوا ہو۔ ذرا سی دیر کو دبک جاتے اور پھر اسی طرح ہڑبونگ، اچھل کود، چیخ و پکار شروع کر دیتے۔ نیّا نے جب بھی انہیں دیکھا کشتی کے عالم میں ہی دیکھا۔ ایک دبوچ رہا ہے اور دوسرا چیخ رہا ہے۔ ایک نیچے ہے تو دوسرا اوپر ہے اس کا دل چاہتا وہ بھی ان کے ساتھ گتھ جائے۔ اور اپنے جی کا سارا غصہ نکال لے۔ توبہ توبہ جو کبھی ابّا جی نے دیکھ لیا تو محاورے بول بول کر ہی ادھ موا کر دیں گے اور وہ ان کے مطلب پوچھ پوچھ کر حاجز آجائے گی۔

ان لڑکوں کو گھر میں ہر قسم کی آزادی تھی۔ جو چاہیں کریں۔ گھر میں ننگ دھڑنگ گھوما کرتے غسل خانے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر نہانے لگتے۔ جہاں دل چاہتا لیٹ جاتے، ٹانگیں اوپر اٹھا کر قلابازیاں کھاتے اور ایک دوسرے کو گندی گندی گالیاں دیا کرتے۔

بندشیں ساری اس گھر میں نیّا کے لئے تھیں۔ گھر میں ننگا پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ اوّل تو اسے امّی جان نہلایا کرتیں ورنہ گھر میں ایک مائی برتن اور کپڑے دھونے کے لئے آتی تھی۔ وہ

اسے نہلا دیتی۔ غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند کر کے۔ وہ انڈویئر اتار کر گھر میں نہیں پھر سکتی تھی اسے صحن کے نل کے نیچے کھڑے ہو کر نہانے کی اجازت نہیں تھی۔

"ہائے کتنے مزے کا پانی ہے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا نرم نرم" وہ چلتے نل کے نیچے ہاتھ کر دیتی۔

ایک بار وہ پانی کی گدگدی سے مجبور ہو کر نہانے کی جرأت کر بیٹھی تھی۔ جب سارے کپڑے اتار کر پانی کی پھوار کے نیچے کھڑی رم جھم کے مزے لے رہی تھی تو اچانک ابّا جی آگئے تھے اور پھر امّی کو وہ بے بھاؤ کی پڑی تھیں کہ بس پوچھو ہی مت۔ انہوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ باورچی خانے سے نکلیں اسے بازو سے گھسیٹ کر پانی سے نکالا اور پھر ننگے پنڈے پر دھپ دھپ کر کے اتنا مارا کہ خود ہی اپنی انگلیوں کے نشان دیکھ کر کئی دن تک روتی رہیں۔

"اونہہ" اسے امّی جان کے لٹھوے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ مار کر بھی روتی تھیں اور پیار کرتے وقت بھی روتی تھیں۔

اس کے تین بڑے بھائی تھے اور تینوں شیطان درجہ اوّل تھے۔ غیاث کی عمر چودہ سال تھی، وقاص بارہ سال کا تھا اور اویس دس برس کا۔ وہ اویس سے چار برس چھوٹی تھی۔ ویسے اس کی اپنی صحت بھی بہت اچھی تھی۔ سرخ و سفید چاق و چوبند بچّی تھی مگر اس کے بھائیوں کی صحت تو قابلِ رشک تھی۔ سب اپنی عمر سے بڑے لگتے۔ قد کاٹھ اپنے باپ پر گیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا۔ دبلے پتلے تو ابھی جوان بنیں گے بے حسی اور بے پروائی نے ان کا چمڑا موٹا کر دیا تھا۔ ڈٹ کر کھاتے تھے۔ جی بھر کر سوتے تھے۔ جانوروں کی طرح لڑا کرتے تھے۔ کھانے کے اتنے شوقین کہ ہر دو گھنٹے کے بعد باورچی خانے میں گھس جاتے اور جو کچھ ملتا ہڑپ کر جاتے اسی لئے امّی جان سارا دن باورچی خانے میں رہتیں۔ کچھ نہ کچھ پکتا ہی رہتا۔ پتہ نہیں ان بچوں کے لئے یا اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے۔

ایک ماسٹر بھی ان لڑکوں کو پڑھانے آتا تھا۔ وہ اتنا کمزور اور مریل تھا کہ پڑھانے کی بجائے خود پڑھ کر جاتا تھا۔

ابّا جی کی آڑھت کی دکان تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے بچوں کے منونوں کا تھیلا اور اپنا ہی کھانا لے کر نکلتے تو پھر رات کے آٹھ نو بجے واپس آتے۔ کبھی کبھی مغرب کے وقت بھی آجایا کرتے تھے بس جس دن ذرا پہلے آجاتے بچوں کی شامت آجاتی تھی۔

ابّا جی کی آواز سے تو محلے والے بھی ڈرتے تھے۔ ان کی تندخوئی کی وجہ سے محلے کے لوگوں سے ان کا زیادہ ملنا جلنا نہیں تھا۔ بات ہی اس طرح شروع کرتے جیسے کھا جائیں گے اور امّی جان کو تو جیسے وہ کھا ہی چکے تھے کہ اب ان کے منہ سے آہ، واہ کچھ بھی نہیں نکلتا تھا۔ امّی کو تو ان کے منتر کا بس ایک ہی تو نظر آتا تھا۔ وہ چاہتی تھیں اس گھر میں لڑکی آجائے۔ اتنے مغرور اور بدزبان آدمی کے گھر لڑکی کا پیدا ہونا اشد ضروری ہے اور پھر جس طرح ان لڑکوں کی اٹھان ہو رہی تھی۔ اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان کی کوئی بہن ہو۔ خود امّی جان جو آج تک دل کی بات زبان پر نہ لا سکی تھیں بیٹی سے جی کا دکھ بیان کرنا چاہتی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے منتیں مانیں۔ تعویز منگوائے۔ حمل کے دوران سورۃ مریم کا ورد جاری رکھا۔ ہر نماز کے بعد اللہ سے بیٹی کے لئے دعائیں مانگیں۔ تب اللہ نے انہیں ایک بیٹی دے دی اور انہوں نے اس کا نام نایاب رکھا۔ کہ ایسی بیٹیاں جن کی اتنی چاہ کی جائے نایاب ہی ہوتی ہیں اور پھر پیار سے اسے نیّا کہہ کر بلایا کرتیں۔ نیّا جو دوسرے کنارے پر لے جاتی ہے۔

"لڑکی ذات ہونا بُرا کیوں ہے؟"

یہ بات نیّا کی سمجھ میں کبھی نہ آسکی۔ جبکہ لڑکی کے لئے بھی منتیں اور مرادیں مانگی جاتی ہیں اللہ کے آگے گڑگڑایا جاتا ہے۔ لڑکی رسوئی کی روشنی ہوتی ہے تو پھر لڑکی کے نام پر آبا چوٹتے کیوں ہیں؟

نہیں وہ چوٹتے تو نہیں تھے۔ مگر کچھ ایسا احساس ہوتا تھا کہ وہ نیّا کو زمانے کی نظر سے کہیں چھپا دینا چاہتے ہیں۔ کوئی اس کا بال نہ چھوئے، کوئی اسے نظر بھر کر نہ دیکھے، کوئی اس سے بات نہ کرے۔ کیوں آخر؟

جب وہ دس سال کی ہوئی تو ہر بات کے بارے میں غور کرنے لگی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کو لوگوں سے دور کیوں رکھا جاتا ہے۔ جتنی اس پر بندشیں لگتیں اتنا ہی اس کا شدت سے مہار بننے کو دل چاہتا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دھکا دے کر دھڑ سے دروازہ کھول دیتی اور پھر بے تحاشا باہر کی طرف دوڑنا شروع کر دیتی۔ نہ سر پر دوپٹہ، نہ پاؤں میں جوتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر ننگے ننگے پاؤں چلنے سے کیسا میٹھا میٹھا مزہ آتا۔ کچ کرچ مٹی پاؤں تلے کراہتی۔ اور دوپٹہ کیا ہوتا ہے؟ سوائے پھانسی کے۔

ایک دن وہ یوں ہی بھاگی چلی جا رہی تھی کہ سامنے سے ان کا پرانا نوکر اللہ بخش نظر آیا۔ اسے نوکری چھوڑے عرصہ ہو گیا تھا مگر کبھی کبھار بچوں سے ملنے آجاتا تھا۔ اللہ بخش کو دیکھ کر جھٹ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ اس نے بھی اٹھا کر اسے کندھے پر بٹھا لیا۔ خوب پہ ابا جی بھی بس ایسے ہی موقعوں پر اچانک گلی میں نمودار ہو جاتے تھے۔ اس وقت وہ جا کیسے ٹپک پڑے۔ سب دیکھ لیا۔ پھر اندر جا کر امی جان پر برسے۔

"اندھی بن کے بیٹھی رہو گی۔ لڑکے تو تیرے ہاتھ سے نکل گئے اب لڑکی سے کیوں ہا دھوتی ہے۔ وہ تو بچی ہے مانا۔ تو تو بچی نہیں۔ زمانہ کتنا خراب ہے۔ تجھے کچھ ہوش نہیں۔ نامراد اللہ بخش کے کندھوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ وقت کی نز کا احساس کرو۔ جاگو۔ آنکھیں کھولو۔"

امی نے اسے اندر بلا لیا۔ پھر وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ اس کی خوب پٹائی ابا جی کی ڈانٹ سن کر تو امی جان کا مارنا فرض ہو جاتا تھا "خبردار جو کبھی کسی نوکر کی گود میں سوار ہو اب تو چھوٹی نہیں ہے۔"

"اونہہ، نوکر کی گود میں سوار ہونے سے کیا ہوتا ہے اور تو اس گھر میں کسی کو فرصت ہی نہیں ہے اسے گود میں اٹھانے کی اور ان بھائی لوگوں کو دیکھو جو مرضی کریں۔ ایک دوسرے کو مار یں خون کریں، کسی کے کندھے پر بیٹھیں، کسی کے زانو پر۔ بس ساری سختی اسی کا مقدر ہے۔" وہ دل دل میں کڑھتی۔ اب اس میں اس کا کیا قصور تھا، جو بھی دیکھتا تھا گود میں اٹھا لیتا تھا اور گود میں کر منہ چوم لیتا تھا۔ ممکن ہے۔ اس میں قصور اس کے منہ کا ہو مگر منہ بدلوایا تو نہیں جا سکتا نا؟

جب سے وہ اسکول میں داخل ہوئی تھی۔ یہی سب کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ سب استانیاں تو باقاعدہ اس کا منہ چوما کرتی تھیں۔ عجیب بات ہے جب کوئی عورت اس کا منہ چوم تو امی ذرا بھی برا نہیں مانتی تھیں۔ مگر جب کوئی مرد ایسا کرتا۔ خواہ اس سے کتنا ہی قریبی رشتہ ہ امی کی پیشانی پر بل پڑ جاتے اور وہ مار کھانے کے لئے تیار ہو جاتی۔

اس گلی میں اس کی کوئی سہیلی بھی نہ تھی۔ گھر میں کوئی باتیں کرنے والا نہیں تھا۔ کام ختم کرتے کے بعد امی کے سر میں درد ہونے لگتا۔ وہ سر پر پٹی باندھ کے اندر جا کر لیٹ جاتیں اور بار بار اسے تنبیہہ کرتی جاتیں کہ ادھر مت جانا، ادھر مت کھیلنا۔ وہ مت کرنا، یہ مت کرنا۔ مگر وہ چپکے سے گلی کا دروازہ کھولتی اور باہر والی سیڑھی پر جا کر بیٹھ جاتی۔ جب گھر میں کوئی دلچسپی کا سامان نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔ وہاں بیٹھ کر سڑک پر ہونے والے سارے ہنگامے نظر آتے تھے۔ سامنے سڑک کے پار ایک گراؤنڈ تھا جس میں اس کے بھائی کھیلنے چلے جاتے۔ ان کے ساتھ محلے کے اور بھی بہت سے لڑکے ہوتے وہ سب مل کر کھیلتے، چیختے چلاتے، نعرے بازی کرتے اور پھر آخر میں ایک دوسرے کی خوب پٹائی کرتے۔ "پٹنے میں کتنا مزہ آتا ہو گا" وہ چپکے سے سوچا کرتی۔

وہیں سے محلے کے اور بھی کئی آدمی گزرا کرتے تھے۔ انہی میں ایک بڑی بڑی مونچھوں اور چکنے چہرے والا ایک لمبا تڑنگا آدمی بھی گزرا کرتا تھا۔ جب وہ نیا کو وہاں بیٹھے دیکھتا تو مسکراتا اور کبھی کبھار وہاں سے گزرتے ہوئے اسے کچھ ٹافیاں بھی دے جاتا۔ شاید وہ یہ ٹافیاں اپنے بچوں کے لئے لے جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس سے باتیں بھی کرنے لگا تھا۔ اس نے نیا کا نام بھی دریافت کر لیا تھا۔ ٹافیاں، بسکٹ دیتے دیتے ایک دن اس نے نیا کو اپنے سینے سے لگا کر پیار کر لیا تھا۔ اس کے منہ سے تمباکو کی بڑی گندی بُو آتی تھی۔ نیا کو یہ بُو اچھی نہیں لگی تھی اور شاید اس کا یوں بھینچ کر پیار کرنا بھی اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ آدمی اسے ضرور اچھا لگتا تھا۔ بڑے پیارے انداز میں اسے دیکھا کرتا تھا۔ جب دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔

اس آدمی کے جانے کے بعد وہ سوچا کرتی۔ اگر کبھی ابا جی اسے اس طرح پیار کریں تو کیسا لگے۔ ابا جی تو کبھی اسے پیار ہی نہیں کرتے تھے۔ نہ سینے سے لگاتے تھے۔ نہ رخسار تھپتھپاتے تھے۔ بس جب بھی دیکھتے نگاہِ قہر سے دیکھتے تھے۔ ان سے تو یہ آدمی اچھا تھا جو بڑی محبت سے پیار کر کے اس کے گال تھپتھپا کے گزر جاتا تھا۔

ایک دن غضب ہو گیا۔ وہ آدمی نیا کو سینے سے لگائے کھڑا تھا اور میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا۔

ادھر سے اچانک ابا جی آ گئے وہ آدمی ابا جی کو دیکھتے ہی رفو چکر ہو گیا۔ مگر نیا کی روح فنا ہو گئی اس کو معلوم تھا اب کیا ہونے والا ہے؟ یہ بھی غنیمت تھا کہ ابا جی خود کچھ نہیں کہتے تھے۔ جو کچھ بھی ہوتا امی کے توسط سے ہوتا تھا۔

"او بدبخت عورت، او بدبخت عورت!" ابا جی اندر جاتے ہی دھاڑے۔ "زندگی بھر سوتی رہنا اور اس کے بعد روتی رہنا۔ کچھ خبر بھی ہے باہر کیا ہو رہا ہے؟"

نیا دوڑ کے بھائیوں کے کمرے میں جا گھسی۔ پھر اسے آواز نہیں آئی کہ ماں اور باپ میں کس قسم کا مکالمہ ہوا۔ البتہ تھوڑی دیر کے بعد ابا جی اپنے کمرے سے نکلے، لوٹا لے کر ہاتھ دھوئے اور کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔

"دنیا بہت بری ہے۔ زمانہ کتنا خراب ہے۔ لڑکی ذات ہے۔ ہاتھ مل کر دو گی وغیرہ وغیرہ۔"

وہ اندر دبکی بیٹھی تھی اور ابا جی کا کوئی کوئی فقرہ اس کے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ جیسے وہ وقتاً فوقتاً ہڈی کی طرح پھینک رہے تھے۔ ہاں امی جان کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ امی اب نہیں بولیں گی۔ میسنی بن کے بیٹھی رہیں گی۔ وہ اپنا غبار تو اس کے پنڈے پر نکالیں گی۔

اور پھر وہی ہوا۔ نہ صرف یہ کہ اسے ہمیشہ سے زیادہ مار پڑی بلکہ اس کا گھر کے دروازے سے باہر جانا بھی بند ہو گیا۔ جب سکول کی امی اسے گھر چھوڑ جاتی تو دروازے میں قفل پڑ جاتا وہ بیٹھی اس قفل کو حیرت سے تکا کرتی۔ دروازے کے باہر کتنی خوب صورت دنیا تھی۔ آزاد، صاف شفاف کتنی کھلی فضا تھی۔ وہاں پیار کرنے والے لوگ تھے۔ سینے سے لگاتے تھے۔ ٹافیاں اور گولیاں دیتے تھے۔ وہاں ہر کوئی شخص خوش باش تھا۔ مسرور تھا۔ اس طرف کھیل کا میدان تھا۔ جہاں خوش فکر لڑکوں کا ہجوم ہوتا تھا اور اس گھر میں کیا تھا۔ اس گھر میں ایک ہی دنیا تھی جو بہت بری تھی۔ ایک ہی زمانہ تھا جو بڑا خراب تھا۔

انہی وسوسوں اور الجھنوں میں نیا نے میٹرک پاس کر لیا اور کالج میں داخل ہو گئی۔ ابا جی نے ج میں داخلے کی مخالفت بالکل نہیں کی تو اس نے سمجھ لیا کہ اب محاورے اور اندیشے اس کا ا چھوڑ دیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ محاوروں اور اندیشوں کا حلقہ اور بھی تنگ ہوتا گیا۔ اب بان اپنی زبان سے زیادہ کام نہیں لیتے تھے بلکہ امی جان صبح ہی صبح شروع ہو جاتیں۔

ا تنگ قمیض پہن کر مت جاؤ۔"

چُنا ہوا دوپٹہ مت لو۔

اوپر چادر اوڑھ کر جایا کرو۔

بال اس طرح کیوں بناتے ہیں؟

یہ لٹ کس لئے کاٹ لی ہے؟

تمہاری سہیلیاں کون ہیں؟

یہ کیسی لڑکی ہے؟

یہ کس کی بیٹی ہے؟

توبہ ہے۔ واہیات سے سوالوں کا جواب دے دے کر نیا تھک جاتی۔ کبھی کبھی تو

اس کا دل چاہتا کالج جانا بند کردے۔ گھر سے بالکل نہ نکلے، دن برت رکھ کے اندر بیٹھ
لیکن اگلے دن پھر وہ کالج جانے کے لئے تیار ہوجاتی۔ کم از کم وہاں فضا کھلی تھی۔ جتنے
باہر رہتی۔ خوش و خرم رہتی۔

کالج کی بس باہر گلی کے نکڑ پہ آکر ٹھہرتی تھی۔ وہ اور لڑکیوں کے ساتھ اس میں سو
جاتی اور اسی طرح واپس بھی آجاتی۔ ورنہ تو ابا جی پتہ نہیں کتنا بڑا پہرہ کیدار اس پر مسلط کردیتے
ویسے اب وہ خود بھی محسوس کرتی تھی کہ اس میں کوئی خاص بات پیدا ہوگئی ہے۔ کیونکہ راہ
شخص اسے دیکھتا تھا اور بار بار دیکھتا تھا، مڑ مڑ کے دیکھتا تھا۔ کالج کے لڑکے اس کی
کر اشارے کرتے تھے، آنکھیں مارتے تھے۔ کئی بار راہ میں پرچیاں پھینک جاتے تھے
پرچیوں کو وہ آنکھ بچا کر اٹھا لیا کرتی تھی اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر پڑھا کرتی۔ بڑا مزہ آتا تھا پڑھ
یہ جاننے میں کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ حسین ہے اور لوگ اس پر مرتے ہیں، حسب
فدا کرتے ہیں۔

یہ مرنا کیا ہوتا ہے؟ ابھی اچھی طرح اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ مگر ایسی باتیں پڑھنے
بہت لطف آتا تھا۔ جب کوئی راہ چلتا نوجوان لڑکا بڑی دلچسپی سے اپنی ننگی نگاہیں اس
چہرے پر گاڑ دیتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے خدوخال پی جانا چاہتا تو بظاہر اسے بُ
لگتا مگر باطن میں بڑی تسکین ہوتی۔ ایک خاص قسم کا کیف محسوس ہوتا۔ ایسے معلوم دیتا جی
دنیا کی کوئی انوکھی نرالی شے بن گئی ہے۔ گردن فخر سے اکڑ جاتی۔ سینہ دھڑ دھڑ بولنے لگتا۔
بھی کیسی مستانی ہوجاتی۔ اونچی ایڑی کی نوک پر ٹکی ہوئی ایڑیاں بجنے لگتیں اور خوب صورت کا
لہرا لہرا کر تال دینے لگتے۔ دل چاہتا کہ اور بھی بجلیاں گرائی جائیں اور بھی زلفیں لہرائی جائیں
راہ چلتے عاشقوں کی فہرست لمبی ہوتی جاتے۔ ہر روز سینکڑوں کشتگان یونہی راہوں میں
ہونے کو کھڑے ہوں۔

ایسا کیوں دل چاہتا تھا؟ حالانکہ وہ تو بڑی بھلی لڑکی تھی اور سب لوگ کہتے تھے

ں ہیں اس طرح لڑکیاں بدنام ہوجاتی ہیں۔ بھلا جو باتیں دل کو اچھی لگیں۔ وہ بُری کس طرح
لتی ہیں؟ دل کو تو عشقیہ شعر بھی اچھے لگتے تھے۔ رومانوی ناول بھی پسند آتے تھے۔ جذبات انگیز
ں دیکھ کر بھی بہت لطف آتا تھا۔

ہیرو اور ہیروئن جب ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوب کر مکالمے بولتے اور پھر
دوسرے سے لپٹ لپٹ کر گانا گاتے تو اس کے پسینے چھوٹ جاتے۔ دل پسلیوں
دھک دھک بولنے لگتا۔ رُواں رُواں جیسے اکڑ جاتا۔ دل چاہتا یہ سین یونہی آنکھوں کے
مینے رہے اور ٹھنڈی گرم لہریں یونہی تن بدن میں آتی جاتی رہیں۔ اسی لئے رات کو سوتے
ت وہ خود ہیروئن بن جاتی اور ہیرو کئی کئی روپ بدل کر اس کی باہوں میں آتا رہتا۔

یہ تو بڑے مزے کی باتیں ہیں ان میں برائی کیا ہے؟

یہ دنیا تو بڑے مزے کی چیز ہے۔ اسے بُرا کیوں کہتے ہیں؟

نیا کے خاندان میں چھوٹے بڑے بے شمار لڑکے تھے اور ان میں سے بہت سے اسے
پی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوتے وقت ان کو بھی ہیرو بنا لیتی تھی۔ ایک بار
دی کی ایک تقریب میں جہاں وہ بہت بن ٹھن کر گئی ہوئی تھی۔ اس کے ایک کزن نے موقع
ر اس کا منہ چوم لیا۔

اف اللہ! اس کا سارا خون چہرے پر آگیا۔ ہوا یوں کہ وہ کچھ برتن اٹھا کر پچھلے دالان میں جا
ی تھی جانے وہ وہاں کب سے تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ جھپٹ کر نکل آیا اور اسے دبوچ لیا
ہ حیرت سے اسے تکتی رہ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہوجائے گا۔ بظاہر
اس کی اس جرأت پر اسے بڑا غصہ آیا۔ مگر دل میں بہت مزا آیا۔ عجیب حرکت تھی یہ۔ اور
عجیب سے احساسات ہو رہے تھے۔ پہلی بار۔ زندگی میں پہلی بار جو کچھ سوچا کرتی تھی
ں کی ایک جھلک دیکھی۔

اس کی احمقانہ حیرت کو دیکھ کر وہ کھسیا گیا اور پھر ہنسنے لگا۔ بولا۔

"آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔۔۔۔"

اس کا فقرہ پورا سنے بغیر وہ وہاں سے بھاگ گئی مگر سارا وقت اس کا ادھورا فقرہ کے اطراف چکر لگاتا رہا۔ کاش وہ سن لیتی۔ وہ آگے کیا کہنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلو وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ وہی نابجواس نے کر دکھایا تھا۔ اچھا تھا یا بُرا۔ تھا مزے کا۔ وہ والہانہ وہ شدت، وہ گرمی۔ توبہ توبہ۔ وہ کیسی گندی گندی باتیں سوچ رہی تھی۔

بہرحال وہ شادی کے ہنگامے میں اس کی ٹوہ میں رہنے لگی۔ پھر تھوڑا سا وقت ملے اور و سے تنہائی میں ملے۔ وہ سارا وقت اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے رہی۔

ایک موقع مل ہی گیا۔ وہ جلدی جلدی پچھلے دالان میں جا رہا تھا۔ وہ بھی سب کی نظ سے بچتی بچاتی ادھر کو لپکی۔ شاید وہ اسے ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ وہاں جا کر اس کے قدم زمین نے پکڑ وہ اس کی ایک اور کزن کا منہ چوم رہا تھا اور اس سے بھی وہی فقرے کہہ رہا تھا جو کچھ دیر پیشتر نے نیّا سے کہے تھے اس کا خون کھول اٹھا۔ الٹے قدموں واپس آگئی۔ سارا کچھ تو اس نے خود لیا تھا۔ اس میں کسی کا کیا قصور؟

"واقعی دنیا بری جگہ ہے"۔ اس نے سوچا۔ "سب لوگ بہت برے ہیں، دھوکے باز ہیں ساری شادی کا مزہ کرکرا ہو گیا۔ اتنے خوب صورت کپڑے پہن کر اتنی بن ٹھن کر گئی تھی۔ اپنے آپ کو سب لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت سمجھ رہی تھی۔ اور عالیہ اس کی کزن آ خوب صورت بھی نہ تھی، مگر اسے بھی سہیل کا بچہ، کمینہ وہی فقرے کہہ رہا تھا۔

"اونہہ"۔ وہ ایک کونے میں کھڑی بسورتی رہی۔ نہ جانے کس طرح وہ ہجوم میں تنہا رہ گئی سہیل موقع دیکھ کر اس کے قریب آگیا۔

"چلو ہٹو تم ہرجائی ہو"۔ نیّا نے فلمی انداز میں اسے جھڑکا۔

"کیا ہرجائی پن دیکھا تم نے مجھ میں؟" وہ بولا۔

"میں نے دیکھ لیا تھا۔"

"کیا؟"

"تم عالیہ کے ساتھ بھی۔۔۔۔"

"ہاہاہا"۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "تم ابھی بہت چھوٹی ہو ان باتوں کو کہاں سمجھ پاؤ گی۔ جانی۔ یہ دنیا بڑی حسین ہے۔ یہ ایک خوب صورت باغ ہے۔ اس کا ہر پھول دوسرے سے پیارا ہے۔ سب پھولوں سے پیار کرنا چاہیئے۔ اگر ایک پھول پر بیٹھ جائیں تو وہ کملا جائے گا۔

"اونہہ"

کچھ لوگ آگئے تھے۔ وہ ادھر ادھر ہو گیا۔

رات کو جب وہ اپنے بستر پر لیٹی تو کتنی دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ وہ کہہ رہا تھا دنیا بڑی حسین جگہ ہے۔ ہاں یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ ہر شے یہاں کی اچھی لگتی ہے۔ موت کے سوا۔ مگر امّی ابّا سارا وقت یہی کہتے ہیں۔ دنیا بہت بری جگہ ہے۔ ممکن ہے دنیا نے ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہو۔ ممکن ہے۔ امّی ابّا دونوں ہی غلط ہوں۔ اگر انہیں دنیا بری لگتی ہے تو لگے۔ مگر اس نے تو ابھی اس دنیا کا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ البتہ سہیل کا فلسفہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی اسے پسند آیا تھا۔

کیوں جی ہر پھول کا رس کیوں چُوسا جاتے؟

ہر پھول صرف گلشن میں تو مرجھا جانے کے لئے نہیں ہوتا۔

کسی پھول کو کالر میں سجنا ہوتا ہے کسی کو جُوڑے میں لگنا ہوتا ہے۔

ہر پھول کا رنگ الگ، ہر پھول کی تقدیر جُدا۔

سو دنیا اچھی تو ہے اگر اس میں سہیل جیسے ہرجائی لوگ نہ ہوں۔

لڑکیاں تو پیدائشی جذباتی ہوتی ہیں یا پھر کمزور ہوتی ہیں اور اپنی کمزوری کا انہیں اس قدر شدید احساس ہوتا ہے کہ ہمیشہ ایک مستقل سہارا تلاش کرتی ہیں۔ کوئی ہاتھ تھامے تو پہنچا پکڑ لیتی ہیں۔ پکڑیں تو چھوڑتی نہیں۔ اسی لئے لاشعوری طور پر نیّا بھی یہی چاہتی تھی کہ ایک چاہنے والا ہو۔ محرم ہو، پاسبان

ہو۔ چاہے جس صورت میں بھی ہو۔

جلتے، سلگتے، کڑھتے، انتظار کرتے اس نے کالج کے چار سال پورے کر لئے۔ دوسرے لفظ
میں بی اے پاس کر لیا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ سارا دن گھر میں پڑی پڑی اوب جاتی کہ
جانے کی اجازت نہ تھی۔ سہیلیاں آ آ کر تھک گئی تھیں اور اب انہوں نے اس کے گھر آنا بند کر دیا تھا۔
ابا جی گھر میں اس کی سہیلیاں دیکھ کر غرّایا کرتے۔ رسالے اور کتابیں بھی زیادہ خریدنے کی اجازت نہ
تھی۔ امی اگرچہ نیم خواندہ خاتون تھیں۔ مگر ہر رسالہ اور ہر کتاب سنسر کیا کرتیں۔ انہیں کیا معلوم کہ اتنی پابند
کے باوجود وہ کیسے کیسے مزے کے رسالے منگوالیا کرتی اور خوب چٹخارے لے لے کر پڑھا کرتی۔

ایک دن ابا جی، امی جان کے ساتھ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ اس نے وہاں سے گزرتے کا بہا
ڈھونڈا اور پھر کان ان کی جانب لگا دیئے۔ ابا جی کہہ رہے تھے۔

"سارا دن صاحبزادی کیا کرتی رہتی ہیں؟"

"اندر پڑی کتابیں پڑھا کرتی ہے۔"

"ذرا اس پر نظر رکھا کرو۔ سنا ہے لوگ اچھے نہیں ہیں۔"

"اسے تو پتہ بھی نہیں کون، کب اور کہاں آیا ہے۔"

"اس عمر میں سب پتے چل جاتے ہیں۔"

"اب اس کے پاؤں میں رسی تو ڈال نہیں سکتی۔"

"بہر حال دھیان رکھنا پڑے گا۔ پہلے بھی جس محلے سے نکالے گئے ہیں وہاں صرف بدنامیاں ہی
چھوڑ آئے ہیں۔"

"کیا کرتا ہے ان کا لڑکا؟"

"معلوم نہیں۔ میں تو کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ سنا ہے کئی سال سے یونیورسٹی میں ہے اور وہاں
ہنگامے کرواتا رہتا ہے۔ ویسے دیکھنے میں بھی لوفر ہی معلوم ہوتا ہے۔

"ماں باپ تو خاصے شریف لگتے ہیں"

"ضروری نہیں کہ اولاد بھی شریف ہو۔ اپنے لاڈلوں کو دیکھ رہی ہو؟ کیا کرتوت ہیں ان کے"

یہ امّی جان کی دکھتی رگ تھی اور اسے ابّا جی ہر بار چھیڑتے تھے۔

"کہاں ہیں نواب زادے۔ یونیورسٹی گئے ہوں گے۔ ہیں نا؟ تم سے تو یہی کہہ کر گئے ہوں گے غیاث نے جو کر دکھایا ہے وہی سب کریں گے۔ کیا کریں گے ڈگریاں لے کر۔ پانچ سال میں تو غیاث بی اے نہیں کر سکا۔ اب دکان پر بھی نہیں بیٹھتا۔ شرم آتی ہے باپ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے۔ کہہ دو ان حرام زادوں سے کہ اگر فیل ہو گئے تو میں گھر سے نکال دوں گا"

امّی جان کے چپ کرانے کو یہی سب کافی تھا۔ لڑکوں کے کرتوت سن کر وہ ایسے گم صم ہو جاتیں جیسے واقعی ان کی پیدائش میں کوئی کھوٹ ہو۔ حالانکہ یہ ابّا جی کی ذمہ داری تھی۔ ساری زندگی ڈنڈے سے حکومت کی۔ بیٹے تو باپ کا سامنا ہی نہ کرتے تھے اور اب نیّا پر پرے بٹھائے جا رہے تھے۔

بھلا کیوں؟ وہ جلدی جلدی سوچنے لگی۔ کون لوگ ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں؟ کب آتے ہیں۔ اسے پتہ کیوں نہ چلا؟ ہاں دو تین مہینے پہلے اس سامنے والے گھر سے وہ بڈھی بڈھا دفعان ہو گئے تھے۔ جنہیں سارا دن کھانسنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ عجیب بات ہے سر ملا کر کھانسا کرتے تھے ان کو جاتے تو نیا نے ضرور دیکھا تھا لیکن ان کے جانے کا محلے میں کسی کو بھی ملال نہ تھا۔ شاید لوگ یہ چاہتے تھے کہ محلے کی بجائے دنیا سے اٹھ جائیں۔ بوڑھوں کے بارے میں لوگ ایک ہی بات سوچتے ہیں۔ اچھا تو نئے کرایہ دار آ گئے ہیں اور ان کے ایک صاحب زادے بھی ہیں۔ اور ہمسایوں میں یہی ایک گھر تھا جو نیا کے گھر کے بالمقابل تھا۔ یعنی قریبی ہمسایہ۔ ان کی چھت پر کھڑے ہوں تو ان کے گھر کا سب کچھ دکھتا تھا۔ مگر ان دونوں بڈھی بڈھوں کی وجہ سے یہ گھر آسیب زدہ ہوا پڑا تھا۔ کوئی حال پوچھنے نہ جاتا کہ ان کے آزار کی مالا اتنی لمبی ہو جاتی کہ سننے والے کو اپنے گلے میں بوجھ محسوس ہونے لگتا۔ وہ کہیں نہ جاتے تھے کہ اب جانے کی ہمت ہی نہ تھی۔ اس واسطے اس گھر میں کسی کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اچھا تو اب کچھ دلچسپ اور ہنگامہ پرور قسم کے لوگ اس

گھر میں آ ہی گئے ہیں۔

نیّا ہر وقت ٹوہ میں رہنے لگی کہ دیکھیں وہ حضرت کون ہیں اور ان کا اسم شریف کیا ہے؟ جن سے اسے محفوظ رکھنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ افسوس بسیار کوشش کے باوجود ان کا دیدار نصیب نہ ہو سکا۔

اس نے ہر ہر موقع پر کوشش کر کے دیکھ لیا۔ کپڑے سکھانے کے بہانے چھت پر گئی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر ریڈیو اونچی آواز میں لگایا۔ نہانے کے بعد بال کھلے چھوڑ کر پچھلے برآمدے میں ٹہلتی رہی۔ نہ کوئی کھڑکی کھلی نہ کوئی چلمن اٹھی۔ شاید صاحبزادے کی نزدیک کی نظر کمزور تھی۔

پھر اس نے پچھلے برآمدے کو ہی اپنا مسکن بنا لیا۔ ہر روز کام سے فارغ ہو کر وہ کتابیں اور رسالے اٹھاتی اور پچھلے برآمدے میں جا کر بیٹھ جاتی۔ امّی جان دن میں کئی بار اسے جھانکنے آتیں اور ہر بار وہ سامنے والی کھڑکی پر ضرور نظر ڈالتیں مگر وہ ہمیشہ بند ہوتی۔ شروع شروع میں تو ان کی اچانک آمد پر نیّا کا دل دھڑک اٹھتا کہ جانے کس لمحے وہ لفنگا اچانک کھڑکی کھول دے اور وہ امّی کی نگاہوں میں ننگی ہو جائے۔ مگر اب وہ اتنی مایوس ہو چکی تھی کہ سوچتی آخر کھڑکی کھل کیوں نہیں جاتی۔ امّی جان بھی روز روز کی مایوسی سے بچ جاتیں۔

کھڑکی تو نہیں کھلی مگر امّی جان کی آمد و رفت جاری رہی۔ کبھی وہ کچھ پوچھنے کے بہانے آ جاتیں۔ کبھی کچھ یاد آ جاتا تو بتانے آ جاتیں، کبھی یہاں بیٹھ کر مٹر کے دانے نکالتیں، کبھی چاول صاف کرتیں، کبھی پاس پڑا ریڈیو سننے لگتیں۔ اب وہ امّی کی آمد کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ نہ ان کے آنے پر جز بز ہوتی۔ نہ ان کے آ جانے پر کوستی۔ بعض اوقات ان کی بات بھی توجہ سے نہ سنتی جانے وہ کیا کہہ جاتیں، کتنی باتیں کر جاتیں۔ وہ فرش پر الٹی لیٹی اپنی کتاب پڑھتی رہتی۔ کبھی کبھی تو ان کے اٹھ کر چلے جانے کا بھی احساس نہ ہوتا۔ خدا جانے غصّے میں اٹھ کر گئی تھیں۔ یا کوئی کام یاد آ گیا تھا۔

جوانی کڑکڑا رہی ہو تو مائیں بور بن جاتی ہیں۔ اور پھر ایسی ماں جو ساری زندگی تکیئے کا غلا

بنی رہی ہو۔ اندر کیا ہے کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ کتنی سختی کتنی نرمی۔ روئی یا پتھر۔ یہ بوریت ٹوٹنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ برآمدے میں اس نے ایک پرانا مگر چھوٹا سا قالین بچھا لیا تھا۔ ساری کتابیں اور رسالے لے کر وہاں لیٹ جاتی۔ کبھی کبھی گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی چھابڑی والے سے مکئی کے بھٹے یا سنگھاڑے خرید لیتی۔ جب جبڑے تھک جاتیں اور بات کرنے والا نہ ملے تو پھر کھانے میں لطف آتا ہے۔ ہاں ریڈیو ہر وقت لگا رہتا۔ ریڈیو کے بغیر تو وہ پڑھ بھی نہیں سکتی تھی۔

کافی دن گزر گئے تھے۔ امّی جان شاید بالکل ہی بے فکر ہو گئی تھیں۔ اب ان کے چکر تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہ کہتیں کہ دوپٹہ لے کر یہاں بیٹھا کر۔ دوپٹہ تو ویسے بھی اس کے ابھاروں پر نہ ٹکتا تھا۔ اور وہ خود بھی کب ایک پل چین سے بیٹھتی تھی۔ کبھی اس پہلو لیٹتی، کبھی اس پہلو۔ کبھی سیدھی، کبھی الٹی۔ کبھی ٹانگیں دیوار پر ٹکا رکھی ہیں اور کبھی الٹی لیٹ کر ٹانگیں ہلائے جا رہی ہے۔

امّی جان جل کر کہا کرتیں۔ یہ نئی نسل تو نحوست کی ماری ہوتی ہے۔ ہر کام لیٹ کر کرتی ہے۔ نہ جانے ان کا کیا حشر ہو گا۔ بھلا الٹے سیدھے لیٹنے سے بڑی بھی کوئی عیاشی ہے۔

"اونہہ۔" وہ الٹی لیٹ جاتی۔ سینے کے نیچے تکیہ رکھ دیتی اور ٹخنے اوپر اٹھا لیتی۔ جنہیں مسلسل ہلائے جاتی۔ شلوار کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ اسے اس کی پروا نہ تھی۔ لیکن اس دن تو وہ الٹی لیٹی لیٹی تھک گئی تھی۔ ایک دم سے سیدھی ہو گئی۔ ریڈیو کا سٹیشن بدلا۔ اس کا پسندیدہ نغمہ بج رہا تھا۔ آنکھیں موند کے وہ بالکل موسیقی میں غرق ہو گئی۔ جب اچانک۔ بالکل اچانک کاغذ کی ایک گولی اس کے سینے پر آ کر لگی تو وہ ڈر کر چونک گئی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بے اختیار اس کی نظر سامنے کھڑکی پر گئی۔ کھڑکی بند تھی اور آس پاس کوئی نہ تھا۔ پھر کیا شے تھی جو اسے آ کر لگی تھی۔ اچھی طرح تسلی کر لینے کے بعد وہ پھر لیٹ گئی۔ حیران تھی۔ کیا ہوا تھا؟

اس نے ہاتھ لمبا کر کے دور پڑی کتاب اٹھائی۔ اوہ! کتاب کے نیچے ایک کاغذ کی گولی

پڑی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔

یہ کس نے پھینکی؟ کہاں سے آئی۔ اس کے اندیشے بتا رہے تھے۔ کہاں سے آئی ہو گی۔

اس عمر میں دعائیں جلدی جلدی سامنے آ جاتی ہیں۔ مارے تجسس کے صبر نہ ہوا۔ آخر اس میں کیا لکھا ہو گا؟ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلدی سے اس کاغذ کو کھول کر اس کی تہیں صاف کیں۔ پین سے بڑا خوشخط لکھا تھا۔

"جناب! یہ آپ اتنے دنوں سے یہاں کیوں براجمان ہیں؟ اور الٹے سیدھے زاویے بنا کر کسی غریب پر کیوں مسلسل بجلی گرا رہی ہیں۔ کہاں تک آپ کے یہ انداز برداشت کئے جائیں۔"

واہ عجیب تحریر تھی۔ حکم تھا، دھمکی تھی یا التجا؟

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ خوف کے مارے پسینہ آ گیا۔ جیسے چوری کر رہی ہو اور پکڑی جائے گی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ کھڑکی بند تھی یا کھلی۔ سب چیزیں اٹھائیں اور دوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو وہ پرچہ دوبارہ کھول کر پڑھا۔ سہ بارہ پڑھا۔ جتنا پڑھتی اتنا لطف آتا۔ اس لطف کو چھپانے کے لئے اس نے الماری میں سے سارے کپڑے باہر نکال دیئے۔ پھر ایک قمیض اٹھا کر اس کا زپ ادھیڑنا شروع کر دیا۔ کئی دنوں سے وہ اپنی کچھ قمیضیں کھلی کرنا چاہتی تھی۔ چھ ماہ سے گھر بیٹھ کر شاید وزن بڑھ گیا تھا۔ مگر ہر قمیض سینے سے تنگ ہو گئی تھی۔ روز سوچتی تھی ان قمیضوں کو ادھیڑ کر دوبارہ ٹھیک کرے گی۔ مگر دل ہی نہ چاہتا تھا۔ ایک کیف آگیں کاہلی سارے تن پر چھائی رہتی۔

مگر اب اس نے مشین نکالی اور قمیضیں ادھیڑ کر ٹھیک کرنے بیٹھ گئی۔ امّی جان آئیں اور حیرت زدہ سی کھڑی رہیں۔ آج یکایک لاڈلی نے کام شروع کر دیا۔

مگر اس کا دل جو بار بار دھڑک اٹھتا تھا۔ ہونٹ جو کانپ رہے تھے اور ہر بار کچھ سوچ کر منہ لال ہو جاتا تھا۔ اس کو چھپانے کا بہترین ذریعہ مشین کی ٹھک ٹھک تھی۔ نہ جسم کے ہیجان کا پتہ چل رہا تھا۔ نہ کانپتے ہاتھ نظر آ رہے تھے نہ بار بار پیشانی کا پسینہ پونچھنی کھا رہا تھا بھیجی کام جو کر رہی تھی۔ کام میں بار بار

پیاس لگتی ہے۔ چہرہ بھی رنگ بدلتا ہے۔ تھکاوٹ بھی ہو جاتی ہے۔

صبح سے لے کر رات تک نہ جانے کتنی بار اس نے وہ پرچہ اپنے تکیے کے نیچے سے نکال کر پڑھا۔ تحریر بہت دلچسپ تھی۔ لکھنے کا انداز بھی خوب صورت تھا۔ خط بہت پختہ تھا۔ کاغذ بھی قیمتی تھا اور کاغذ پر خوشبو بھی لگی ہوئی تھی۔ بار بار پڑھنے سے اتنی باتوں کا پتہ چلا تھا۔ ہاں ایک اور بات کا بھی پتہ چلا تھا کہ لڑکا گھائل معلوم ہوتا تھا۔

ایک دن اور ایک رات خوف میں مبتلا رہنے کے بعد اب اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ بے خوف تو نہیں ہوئی تھی۔ مگر یہ حرکت اچھی لگنے لگی تھی۔

ایک شہزادی ہو اور وہ کسی بڑے دیو کے چنگل میں ہو۔ روزن دروازے سب بند ہوں۔ جادو کی بڑھیا اس کے سر میں جادو کی سوئیاں چبھو رہی ہو تاکہ وہ ایک دن پتھر میں تبدیل ہو جائے اور وہ شہزادی ایک دن پتھر کی دیواروں کے اس طرف کسی انجانے شہزادے کی بنسری کی آواز سن لے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ باہر نکلنے کا کوئی دروازہ نہیں۔ وہ جانتی ہے کہ شہزادہ آدم خور نہیں ہے اس واسطے میلوں پرے انسان کی خوشبو سونگھ کر آدم بو کرتا دوڑا نہیں آئیگا۔ کچھ بھی نہ ہوگا۔ مگر سناٹوں میں زندگی کی آہٹ سن کر خوشی تو ہوتی ہے۔ امنگ تو جاگتی ہے روشنی تو سب کو اچھی لگتی ہے، سورج کی ہو۔ بلب کی ہو یا ننھے منّے دیئے کی۔ بلکہ ننھا دیا تو گھپ اندھیرے میں زندگی کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ یہ تو پتہ ہوتا ہے کہ جلدی اس کا تیل ختم ہو جائے گا، بجھ جائے گا۔ مگر اس کے بجھنے تلک تو آدمی روشنی کا لطف لے لے۔

چار پانچ دن تو ڈر کے مارے باہر والے برآمدے میں گئی ہی نہیں البتہ کمرے کے اندر کھڑی ہو کر جالی والے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر وہ سامنے ان کے گھر کا نظارہ کرتی رہتی تھی۔ کھڑکی بدستور بند تھی۔ مکان ویسے ہی خاموش کھڑا تھا۔ اتنے ساکن مکان کے اندر کس قدر بارود بھرا ہوا ہے کہ خود اسے اپنے در و دیوار خطرے کی زد پر محسوس ہو رہے تھے۔ کبھی کوئی سامنے نظر نہ آیا۔ تو اس نے اپنے دل سمجھانا شروع کر دیا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ یونہی چھوٹی موٹی بات سے لڑکیاں بدنام

ہو جاتی ہیں۔ پھر کوئی رشتہ مانگنے بھی نہیں آتا اور ابا جی۔ وہ تو ذرا سے شک پر ہی بوٹی بوٹی کر دیں گے۔ کیا فائدہ سامنے جانے کا۔ ڈھیل دینے کا۔ رسم و راہ پیدا کرنے کا۔ یونہی۔ یونہی۔ کھیل کھیلنے کا۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور پتہ نہیں وہ لڑکا کیسا ہو۔ لوفر جو ٹھہرا۔ شاید شکل بھی اس کی مکروہ ہو۔ مکروہ صورتوں والے مرد اسے بہت برے لگتے تھے۔

ایک ہفتہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ ایک ہفتے میں زندگی معمول پر آ گئی۔ سب قمیضوں کی مرمّت ہو گئی تھی۔ الماریاں ٹھیک ہو گئی تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ اس نے چمکا لیا تھا۔ کام ختم ہو گئے تھے۔ اب بوریت ہی بوریت تھی۔ دل پھر کوئی حشر بپا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اب پھر باہر والے برآمدے میں آ کر لیٹنا شروع کر دیا تھا۔ دو تین دن امّی جان نے خوب چکر لگائے پھر بے پروا ہو گئیں۔ عجیب موڈی لڑکی ہے۔ جہاں جی چاہتا ہے۔ ڈیرہ جما لیتی ہے۔

پورے ایک ہفتے بعد پھر ایک گولی آ کر گری۔

"اچھا تو محترمہ نے پھر یہاں بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ لگتا ہے سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہو رہا ہے۔ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

دوسرے دن ایک اور گولی آ گری۔

"ویسے آپ بہت خوب صورت ہیں۔ اتنی دور سے آپ کی تاب لانا مشکل ہے تو قریب آنے کی کون کافر کوشش کرے گا۔"

تیسرے دن پھر ایک گولی آ گری۔

"حسن پہ اتنا غرور اچھا نہیں۔ عشق جلا کر خاک کر دیتا ہے۔"

اب گولیوں سے وہ خوف زدہ نہیں ہوتی تھی۔ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ گولی کس سمت سے آتی ہے مگر اسے اس کا پتہ نہ چل سکا۔ جب تک وہ دیکھنے کی کوشش میں مصروف رہتی کوئی آہٹ نہ ہوتی۔ جونہی خیال ادھر ادھر ہوتا گولی آ جاتی۔ اب گولی کے آنے سے وہ گھبراتی بھی نہیں تھی۔ نہ چہرے کا رنگ متغیر ہوتا تھا۔ بس گولی اٹھا کر اندر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ وہاں

اطمینان سے بیٹھ کر پڑھتی اور پھر پہلی پرچیوں کے ساتھ اسے بھی اپنی ڈائری میں رکھ لیتی۔

پورا ہفتہ کچھ اس قسم کی گولیاں آتی رہیں۔

"نارنجی رنگ میں تو آپ بالکل بہار کا پھول لگ رہی ہیں۔"

"اف اتنا خوب صورت جسم اور اتنی پتلی کمر، اتنا تو زور سے موڑا نہ کریں اسے، ٹوٹ جائے گی۔"

"سونا بھی دلچسپ مشغلہ ہے مگر کمرے کے اندر۔"

"یہ رسالے ٹھیک نہیں جو آپ پڑھتی ہیں۔ حکم کریں تو بالکل نئے انداز کے رسالے بھیجوں؟"

گولیاں دلچسپ ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کا شوق بڑھتا جا رہا تھا۔ دل لگتا جا رہا تھا۔ اب گولی گرنے کے بعد وہ اٹھ کر اندر نہیں جاتی تھی اور نہ گھبراتی تھی بلکہ وہیں لیٹے لیٹے کاغذ کھول کر پڑھتی اور پھر اپنی کتاب میں رکھ دیتی۔ لاشعوری طور پر وہ ہر روز ایک گولی کا انتظار کرتی اور بلاناغہ ہر روز ایک گولی اس کے اوپر آ کر گرتی۔ کبھی کندھے پر، کبھی سینے پر، کبھی ناف پر، کبھی چہرے پر۔ البتہ گولی کون پھینکتا ہے اور کس طرح پھینکتا ہے۔ یہ راز اس پر منکشف نہ ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی پہلے یہ راز کھلے۔ وہ کیسا ہے، دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ گولی کس طرح پھینکتا ہے۔ اس کے مشغلے کیسے ہیں؟ تب جوابی کارروائی ہو۔

جوابی کارروائی کے لئے وہ کافی اصرار کر چکا تھا۔

"واہ اچھی بے نیازی ہے۔ گولیاں ہضم کرتی جا رہی ہیں آپ، اور پڑھ کر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو گرفتار ہونا ہوگا۔"

"ہونہہ۔" وہ ہنس کر کندھے اچکاتی اور پھر ٹانگیں ہلا کر چیونگم چبانے لگتی۔

ایک دن وہ امی جان کے ساتھ بازار جا رہی تھی۔ جوں ہی باہر نکلی، دیکھا ایک جوان سالڑکا سامنے والے گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ اسے دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ پھر اس کی سندھی چادر کو جو اس نے ارد گرد لپیٹ رکھی تھی۔ دیکھ کر مسکرایا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے کوئی شرارت کی اور اندر چلا گیا۔

واہ کیسا شاندار لڑکا ہے۔ سارے راستے نیا یہی سوچتی رہی۔ چھ فٹ لمبا، صحت مند، لمبی

لمبی قلمیں، گردن تک گرتے بال۔ سیاہ گھنی مونچھیں، رنگت بالکل صاف، آنکھوں میں کھا جانے والی چمک، چال درست، لباس موزوں۔ وہ تو کسی طرح بھی لفنگا نہیں لگتا تھا۔ انتہائی نیک چلن اور نجیب الطرفین نظر آ رہا تھا۔ جی کو کچھ کچھ اچھا لگنے لگا تھا۔ پتہ نہیں ابا جی نے اس کے بارے میں اتنی باتیں کہاں سے سنی تھیں۔ بس ابا جی کانوں کے کچے ہیں اور جوان نسل سے تو انہیں بطورِ خاص بیر ہے۔ ان کا بس چلے تو سارے جوان لڑکوں کے کان چھدوا کر ان کے ہاتھوں میں ایک ایک پھاوڑا دے دیں۔

"اچھا تھا نا؟" اس نے رات کو سوتے وقت اپنے دل سے پوچھا۔

دل نے کہا: "بہت خوب تھا!"

دوسرے دن وہ اہتمام سے تیار ہو کر برآمدے میں گئی اور ایک گولی اس کے گورے گورے پاؤں کے قریب آ گری۔ اس نے جلدی سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔ مسکرایا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد کھڑکی بند ہو گئی۔ نیا نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کہیں امی جان نے تو یہ سب نہیں دیکھ لیا؟ مگر شکر ہے۔ امی جان کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ اس نے اطمینان سے گولی اٹھائی۔ یہ نسبتاً بڑی تھی۔ وہ اسے کھول کر پڑھنے لگی۔

"اب تو آپ نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ پھر کیا خیال ہے میرے بارے میں؟ میں ذرا آپ کو ستانے کے لئے اوٹ میں رہتا تھا ورنہ مجھے اپنی وجاہت پر پورا پورا اعتماد ہے۔ دوسرے آپ کی امی صاحبہ ہر وقت آپ کے سر پر منڈلاتی رہتی ہیں اور آپ کے ابا جی کی گھن گرج اور تند خوئی سے سارا محلہ نالاں ہے اس لئے میں آپ کے سامنے آ کر آپ کے لئے مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا ویسے اتنا بتا دوں جس دن میں نے آپ کو دیکھا تھا اسی دن آپ پر عاشق ہو گیا تھا۔ کیونکہ میں عشق پیشہ آدمی ہوں اور حسن کو خراج ضرور دیتا ہوں۔ میں نے آپ کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لی ہیں آپ کا نام نیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر نیا کو ایک کھویا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ وہ پار نہیں لگتی۔ کنارے پر کھڑی کھڑی ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

میں نے اپنے کمرے کی دیوار میں بڑی چابکدستی سے ایک سوراخ بنالیا ہے۔ وہیں سے گولہ باری کیا کرتا ہوں۔ آج سارے بھید کھول دیئے ہیں! اب کچھ تو صلہ دیجیئے۔ ارسلان"

اچھا تو صاحبزادے کا نام ارسلان ہے۔ اچھا نام ہے۔ خط بھی اچھا ہے۔ وہ سوچنے لگی کیا کیا جائے؟ اک ذرا سی پرچہ بازی سے بھلا کیا نقصان ہو جائے گا۔ ایسا نہ ہو اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آکر وہ کہیں اور منہ کر جائے۔ کسی دوسری دیوار میں سوراخ کرلے۔ ساری رات وہ اسی کشمکش میں مبتلا رہی۔ خط لکھے یا نہیں۔ دل ہر بار کہتا تھا لکھ دے یار! کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی کو کیا پتہ چلے گا کھیل ہی سہی۔ مگر کھیل کھیل میں تو جان چلی جاتی ہے۔ ذہن اس کو ڈراتا تھا۔

دوسرے دن اس نے ایک اور رقعہ پھینکا۔ لکھا تھا۔

"جواب دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ گولی بنا کر ہمارے دروازے کے اندر پھینک دیں اور خود چلی جائیں۔ میں اندر سے نکل کر وہ گولی اٹھالوں گا۔ بے فکر رہیں میں اوپر سے دیکھ رہا ہوں جب آپ پھینک کر چلی جائیں گی۔ مجھے خود بخود پتہ چل جائے گا۔"

واہ ترکیب تو بالکل اچھوتی ہے اور اس کے دل کو لگ رہی تھی۔ بلکہ وہ تو کل سارا دن یہی سوچتی رہی تھی۔ اگر جواب لکھا جائے تو کس طرح بھیجا جائے؟ اور اب سوچ رہی تھی کہ لکھا جائے یا نہیں۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے دل اور دماغ میں جنگ چھڑ گئی۔ اسے معلوم تھا۔ اس پرچہ بازی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس نے ایسی بہت سی کہانیاں اور قصے کتابوں میں پڑھ رکھے تھے۔ اس کے گھر کا ماحول بھی اسے رومانس لڑانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اب تو اس کے بھائی بھی کافی خونخوار بن چکے تھے۔ پھر بھی اس کا دل چاہتا تھا کہ زندگی کی اس گھٹن کو کسی طرح کم کیا جائے۔ زندگی میں کچھ تو ہلچل ہو۔ ایک چھوٹی سی پرچی لکھنے سے بھلا کیا ہوگا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا اور پھر وہ اپنی رائٹنگ بدل کے لکھے گی۔ کیونکہ اسے دونوں ہاتھوں سے لکھنے پر قدرت تھی۔ الٹے ہاتھ سے ویسے ہی خط اچھا نہیں آتا تھا۔ ٹوٹا پھوٹا لکھا جاتا تھا۔ دماغ نے بہت کہا کہ یہ پٹرول اور آگ کا کھیل ہے۔ مگر دل نے کہا۔ کھیلنے میں کیا حرج ہے۔ انسان کو یہ تو پتہ ہوتا ہے کہ دماغ

مشورہ دیتا ہے۔ جوانی ہمیشہ دل کی سنتی ہے۔ جوانی میں دل دوست ہوتا ہے اور دماغ سوتیلی ماں۔

سو اس نے لکھنے کی پریکٹس شروع کی۔ رات بھر لکھتی رہی اور پھاڑتی رہی۔ کبھی مضمون پسند نہ آیا تو کبھی خط ٹھیک نہ ہوتا۔ بہرحال بڑی سوچ بچار کے بعد وہ ایک رقعہ لکھنے میں کامیاب ہوگئی۔

"شریف لڑکیوں کو تنگ کرنا بری بات ہے۔ باز آجائیں ورنہ ابا جی کو بتادوں گی۔"

ہاں یہ مضمون ٹھیک ہے۔ اس نے رقعہ بار بار پڑھا۔ اس میں انکار بھی ہے اقرار بھی۔ قدم بڑھانے کی اجازت بھی ہے اور دھمکی بھی۔ ذرا سی حوصلہ افزائی بھی ہے اور آگے نہ بڑھنے کی تاکید بھی۔

دوسرے دن وہ موقع کی تاک میں رہی۔ بڑا حوصلہ کر کے، جی کڑا کر کے وہ باہر والے دروازے کی گھنٹی اور جلدی سے گولی ان کی ڈیوڑھی میں پھینک کر دوڑ آئی۔ ذرا سی گولی پھینکتے وقت اس پر کیا کیا قیامتیں گزر گئیں۔ دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے سارے محلے کو سنانا چاہتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ ماتھے پر پسینہ آگیا، زبان خشک ہوگئی۔ مگر یہ حرکت کرنے میں بڑا مزا آیا۔ اندر سے چھپ کر دیکھا۔ وہ خود اٹھاتا ہے یا کوئی اور اس کے اندر آتے ہی وہ جانے کہاں سے نکلا، لپیٹ کر گولی اٹھائی اور گھر کے اندر چلا گیا۔

سو پہلا مرحلہ تو طے ہوگیا تھا اور بڑی خوش اسلوبی سے اس نے اطمینان کی سانس لی۔ منہ ہاتھ صاف کیا دل کو سنبھالا اور پھر باہر امی جان کے پاس چلی گئی۔ امی جان حسب معمول باورچی خانے کے پرانے ڈبے کھولے صفائیاں کر رہی تھیں۔

"لائیں امی میں کردوں؟"

امی جان نے نظر اٹھا کر اپنی لاڈلی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ انہوں نے پرانے اخبار اس کے ہاتھ میں پکڑا دیئے اور بولیں: "ذرا الماریاں صاف کر کے ان میں بچھا دو۔ یہ ڈبے وہاں لگا دینا۔"

ہر چند کہ اس کا دل اس کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار نظر سامنے والی کھڑکی کی طرف اٹھ جاتی تھی جس کی کھڑکی بند تھی اور کھڑکی کے خاموش سمندر میں کنکر پھینک کر اس نے ہلچل سی مچادی تھی۔

جیسے وہ خود ہی محسوس کر رہی تھی۔ مگر اب یہ کام تو ختم کرنا ہی تھا۔ لیکن اس کے بعد امّی کسی اور م
میں نہ پھنسا دیں۔ جلدی جلدی وہ پرانے اخبار الماریوں میں بچھانے لگی۔ امّی جان اپنے دل میں
خوش ہو رہی تھیں کہ بیٹی آخر بیٹی ہے ماں کا ہاتھ بٹانے لگی ہے۔ ایک دن درد بھی بٹانے لگ

بڑی مشکل سے نیّا نے کام نمٹایا اور پھر بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کہیں بھی اس کا
نہیں لگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ جلدی سے پتہ چل جائے کہ اس کے رقعے کا کیا اثر ہوا
اپنے رسالے وغیرہ اٹھا کر ہاتھ میں ریڈیو لٹکائے پچھلے برآمدے میں جا بیٹھی۔ اسی وقت کا
ایک گولی آ گری۔

"شریف لڑکی! اگر تمہیں یہ حرکت بُری لگتی تو تم اس رقعے کا جواب دینے کی بجائے
ابّا جی کے ہاتھ میں تھما دیتیں۔ لگتا ہے جیسے میں تمہارے دل کو بھا گیا ہوں۔ کتنا بھایا ہوں
کا اندازہ ابھی نہیں ہوا جس دن گھر پہ ملنے آؤ گی میں سمجھ جاؤں گا۔ میں اکثر گھر پر اکیلا ہوتا ہوں
وقت اور دن تم طے کر دو گی۔"

"واہ۔" وہ ہنس پڑی۔ "حضرت تلے بیٹھے ہیں۔" جواب دے نہ یا نہ دے۔ لیکن ایک بار شرو
کے اس کو بند کرنا اختیار میں نہ رہا اس نے جواب دے دیا۔

پھر رقعہ آ گیا، پھر جواب دے دیا۔ سو ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ بند دروازے کھل گ
زندگی میں قوسِ قزح کے رنگ کھل گئے۔ پھر ایک دن اس نے لکھا۔ "اس پرچہ بازی سے
نہیں آتا۔ کل میں تمہیں مفصّل خط لکھوں گا اور لفافے میں بند کر کے تمہاری ڈیوڑھی میں پھینک
گا۔ جلدی سے آ کر اٹھا لینا۔ کل ٹھیک بارہ بجے دوپہر۔

اس دن ٹھیک بارہ بجے دوپہر، نہ جانے کیسے، نہ جانے کہاں سے۔ ہمیشہ کی طرح اچا
ابّا جی ٹپک پڑے۔ ابّا جی کو تو شاید شک بھی نہ ہوتا۔ وہ بے دھیانی میں چلے آ رہے تھے!
نے اسے خط پھینکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پھینکنے کے بعد ادھر ادھر تسلی کر رہا تھا۔ جو
کی نظر ابّا جی پر گئی۔ ڈر کر اندر بھاگ گیا۔ اس کے بھاگنے سے ابّا جی چونک گئے۔ ڈیوڑھی میں پ

ٹی کے سہارے کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے۔

کہ آخر یہ لڑکا اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا۔ جبکہ ارد گرد کوئی بھی نہیں ہے۔ اچھی طرح تسلی کر
نے کے بعد انہوں نے یوں ہی سرسری سا ڈیوڑھی میں چاروں طرف دیکھا۔ تو دور کونے میں ایک
بوجھل لفافہ پڑا تھا۔ انہوں نے یہ سوچ کر اٹھا لیا کہ ڈاکیہ پھینک گیا ہو گا۔ مگر اس پر نیّا کا نام دیکھ
اپنے کمرے میں لے گئے۔ نیّا نے یہ سب دیکھ لیا تھا۔ اسے ہرگز امید نہ تھی کہ وہ یوں پہلے
مرحلے میں پکڑی جائے گی۔ اب کیا ہو گا۔ ؟ اب کیا ہو گا۔ ؟

خوف کے مارے اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اپنے کمرے میں گھس کر اس نے اندر
نڈی لگائی۔ اب اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائیگا۔ ؟ پتہ نہیں اس کم بخت نے کیا لکھا ہو گا؟
پچہ بازی کا بھید ابّا جی پر کھل گیا ہو۔ ابّا جی کی طبیعت کو وہ جانتی تھی جس طرح اس کا بچپن
را تھا۔ وہ بھی اسے یاد تھا۔ اور یہ تو بہت بڑا جرم تھا۔ جتنی بھی سزا ملتی۔ کم تھی۔ آخر اس نے ایسا
ں کیا۔ ؟ خود بارود سے کھیلنے کی کوشش کی۔ اب جو عذاب اترے گا۔ سہنا پڑے گا۔

کتنی دیر تک بیٹھی وہ خود کو کوستی رہی۔ لعنت ملامت کرتی رہی، دل بے چین تھا۔ جی چاہتا تھا
یوار میں چھید کر کے کہیں باہر بھاگ جائے۔ باہر ذرا سی آہٹ ہوتی تو یوں لگتا امّی ڈنڈا اٹھائے
آ رہی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی بڑی بڑی سزائیں مل چکی تھیں۔ یہ تو بہت بڑی غلطی تھی۔ کتنی
دیر گزر گئی۔ کوئی اس کمرے میں نہیں آیا۔ نہ جانے اس کا کتنا خون خشک ہوا اور خوف نے کتنی
اسے مارا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ اپنے واہموں سے لڑتے لڑتے۔ جانے کس وقت سو گئی۔
۔ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا اتر رہا تھا۔ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ بے خیالی میں دروازہ کھول
ر پھر بتی جلا دی۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی۔ !
نے ڈر کے مارے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ باہر پتہ نہیں کون سی کھچڑی پک چکی تھی۔ کوئی اسے
نے نہیں آیا تھا۔ وہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ آیا جا کر باورچی خانے میں کھانا کھا آئے۔ مار تو
نی تھی۔ سو پڑنی تھی۔ کم از کم پیٹ تو بھر جائے گا۔ اتنے میں امّی جان کمرے میں آ گئیں۔

وہ ابھی اچھی طرح آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہ وہ بولیں۔ "تو
کو گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں تم۔ میں نے دروازہ بہت کھٹکھٹایا۔ کھانے کے لئے تمہیں جگا
رہی۔ کیا بات ہے۔ آج تم بے وقت سو گئی تھیں"

نیا نے بے یقینی سے امی جان کی طرف دیکھا۔ مگر ان کے چہرے پر ایسا سناٹا تھا جو پڑھا
جا سکتا تھا۔ نیا نے نظریں چرالیں۔ "یونہی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سو گئی تھی"

"اندر سے دروازہ مت بند کیا کرو" امی جان نے پھر کہا۔ "اٹھو منہ ہاتھ دھو لو کھانا کھا لو۔ میں
باورچی خانے میں رکھ چھوڑا ہے" یہ کہہ کر امی باہر چلی گئیں۔

امی نے سب کس لہجے میں کہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ بکرے کو بھی ذبح کرنے سے پہلے خو
کھلایا پلایا جاتا ہے۔ یہ محبت تھی یا مصلحت یا سیاست۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پتہ نہیں ابا
میں تھے۔ یا چلے گئے تھے۔ گھر میں تھے۔ تو کوئی طوفان کیوں نہیں برپا ہو رہا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو
آ گئی۔ باورچی خانے میں بیٹھ کر اس نے صبح والا کھانا کھایا۔ بھوک بہت لگ رہی تھی۔ اور باسی کھا
مزہ دے رہا تھا۔ مگر اعصاب پر مسلسل ایک خوف سوار تھا۔ گھر پورا معمہ بنا ہوا تھا۔ اسے یوں محسو
رہا تھا جیسے سارے گھر میں بارودی سرنگیں بچھا دی گئی ہیں۔ پتہ نہیں کس وقت اس کا پاؤں
تاروں سے چھو جائے۔ اور دھماکوں کے ساتھ آگ کی چنگاریاں اڑتی ہوئی نظر آئیں۔

جب وہ کھا رہی تھی تو اس نے دیکھا ابا جی اٹھ کر باہر آ رہے ہیں۔ شاید وہ صحن میں لیٹنا
تھے۔ امی جان نے وہاں ایک پلنگ بچھا دیا تھا۔ اور خود ان کے ساتھ ان کی چیزیں اٹھائے آ
نیا کا نوالہ حلق میں ہی پھنس گیا اس نے خوف زدہ آنکھوں سے ابا جی کو دیکھا۔ مگر ابا جی نے
نہیں دیکھا۔ ابا جی بہت اداس اور کمزور لگ رہے تھے۔ نیا نے پہلی بار محسوس کیا۔ جیسے
میں وہ دم خم نہیں رہا۔ ان کی کمر زیادہ جھک گئی تھی۔ مریض اور ضعیف لگ رہے تھے۔ ان
بھی نہیں جاتا۔ اس کے دل میں ابا جی کے لئے بے شمار ہمدردیاں جاگ اٹھیں۔ ایسے کمزور
باپ کی عزت سے کھیلنا کہاں کا انصاف ہے۔ صبح تک تو ابا جی کی کمر اس قدر جھکی ہو

شاید اس خط نے انہیں لاغر کر دیا ہے۔ نیا اپنے آپ پر لعنت بھیجنے لگی۔ اس نے کھانے
سے ہاتھ روک لیا۔ اور پانی پینے لگی۔

ابا جی اپنے بستر پر بیٹھ چکے تھے اور امی جان پاس بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ نیا
نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا۔ آج دونوں کے چہروں پر وہ بات نہیں تھی جس کی توقع وہ
کر رہی تھی۔ نہ ابا جی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ نہ ان کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے
تھے نہ ان کی گھن گرج گھر میں سنائی دے رہی تھی۔ امی جان پر بھی وہی عالم تھا۔ آنکھوں میں
غصہ اور ہونٹوں پر چپ نہ تھی۔ بلکہ دونوں کے چہرے سناٹے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

یہ کیسا سناٹا ہے۔؟ نیا کو پھر خوف آنے لگا۔ کیا یہ سناٹا وہ ہے جو طوفان سے پہلے ساحل
پر ہوتا ہے۔ یا دونوں اپنی شکست تسلیم کر چکے تھے۔ دونوں کو کیا ہوا ہے؟ دونوں گم صم کیوں
ہیں۔؟ یا پھر اسے مارنے کے کامیاب منصوبے بنا رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں
چلی گئی۔ ابا جی نے نظر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا۔ پھر اس کے بعد وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔

شام ہوتے ہی سارے بھائی باری باری گھر آ گئے۔ غیاث ابا جی کی دوکان پر بیٹھتا تھا
اسی لئے ابا جان اب وقت بے وقت اٹھ کر گھر آ جاتے تھے۔ باقی دونوں کو گو ابا جی سے
کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر بہر حال انہیں رات کو گھر تو آنا ہوتا تھا۔

گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ ہر شخص ہر روز کی طرح اپنے معمولات میں مگن تھا۔ مگر
نیا کو نہ جانے کیوں ہر طرف سے سازش کی بو آ رہی تھی۔ جیسے کہیں کھانا پھوسی ہو رہی ہے
اس کے خلاف کارروائی کرنے کی ترکیبیں وضع ہو رہی ہیں۔ یا.... اس پر اچانک حملہ کرنے
کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں گھر کی ساری فضا اتنی تنی کیوں لگ رہی تھی۔
لوگ تو کھانا کھا کر سو بھی گئے تھے پر اسے سارے گھر سے وحشت ہو رہی تھی۔ بھلے ابا جی
اپنے دل کا غصہ نکال ہی لیتے۔ یا امی جان ہی گالی گلوچ کر لیتیں۔ کچھ تو ہوتا۔؟ اس نہ ہونے
نے اسے بے سکون کر کے رکھ دیا تھا۔ آج سارا دن وہ سولی پہ لٹکی رہی اور کل بھی لٹکی رہے

رہے گی۔ جب تک اس بات کا نتیجہ سامنے نہیں آجاتے گا۔ اسے یونہی وسوسوں کی سو
پر لٹکنا ہوگا۔ سوچتے سوچتے آخر وہ اس موڑ پر پہنچی کہ بھلا میں نے کیا قصور کیا ہے۔؟ کچھ بھی تو
نہیں کیا۔ ایک لڑکے نے مجھے خط لکھ مارا۔ اس میں میرا کیا دوش ہے۔؟ وہ خوب صورت
ہے۔ جوان ہے۔ کوئی بھی لڑکا مجھے خط لکھ سکتا ہے۔ یہ اس لڑکے کا قصور ہے۔ کوئی میرا
ثابت نہیں کر سکتا۔ میرا کوئی خط نہیں پکڑا گیا۔ میں باتیں کرتی یا اشارے کرتی نہیں پائی گئی
خدانخواستہ میں نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اگر وہ لڑکا
خواہ مخواہ مجھے ملوث کرنے کے لئے جھوٹی تہمت لگا دے یا میرے خط پیش کر دے تو میں کیا
سکتی ہوں۔ اس ملک میں روزانہ ایسی دھاندلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ پھر میرے خط پکڑے
کون۔؟ میں نے تو الٹے ہاتھ سے اپنا خط بگاڑ کر لکھا ہوتا ہے۔ میں آباجی سے صاف کہہ سکتی
ہوں کہ آپ میری رائٹنگ اس کے ساتھ ملا لیں۔ ٹھیک ہے۔ اس طرح میں صاف بچ
ہوں۔ میرے پاس اپنے بچاؤ کے سارے ثبوت ہیں۔ مگر لوگ مجھ سے پوچھتے کیوں نہیں
یہ خاموشی کتنی اذیت ناک بنتی جا رہی ہے۔

کچھ اور رات ڈھلی تو وہ ایک نئے موڑ پر آگئی۔ اس میں لڑکے کا بھی کیا قصور۔ دل
کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ جوان اور خوب صورت لڑکی دیکھ کر دل آہی جاتا ہے۔ بیچارے
کیا پتہ کہ اس کی شامت آنے والی ہے۔ محبت کرنا کوئی عیب نہیں۔ جرم نہیں۔ دنیا میں
ہی محبت کرتے ہیں۔ مگر جب لوگ بڈھے ہو جاتے ہیں تو اسی طرح شکی مزاج اور چڑچڑے
ہو جاتے ہیں۔ محبت اگر ایک سچائی نہیں ہے تو دنیا میں محبت کی داستانیں کیوں باقی
لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ سسی پنوں۔ ہیر رانجھا کیا وہ انسان نہیں تھے۔ ایک دوسرے
لئے کیسی کیسی قربانیاں دیں انہوں نے اور اپنا نام رہتی دنیا تک چھوڑ گئے۔ محبت کا
تو یہاں صدیوں سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ بھلا تشدد سے کہیں محبت مری ہے
لیٹے لیٹے وہ فلم کی ہیروئن بن گئی۔ اور اس نے سوچا اب راہ میں خواہ کتنی بھی مشکلا

کیوں نہ آئیں۔ وہ ڈٹ کر کھڑی ہو جائے گی۔ وہ زمانے سے اپنا حق مانگے گی۔ باپ کے سامنے
ڈٹ جائے گی۔ ماں کی بھی پرواہ نہیں کرے گی۔ کھانا پینا چھوڑ دے گی۔ زیادہ تنگ کریں
گے تو زہر کھا لے گی۔ مر جائے گی۔ مٹ جائے گی۔ اس دنیا میں ایک نئی کہانی چھوڑ جائے
گی۔ مگر ارسلان کا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ دنیا کو بتا دے گی کہ ایک وفا شعار عورت کی محبت
کیا شے ہوتی ہے۔ ہاں۔ جوں جوں رات جوان ہوتی گئی۔ اس کے جذبے اور ارادے
تپتے گئے۔

صبح ہوئی تو پھر نئے سرے سے حقائق کا سامنا ہوا۔ وہی آباجی کا خوف۔ امی جان کا
ڈر۔ زمانے کی باتیں رسوائیوں کے بھوت، بدنامیوں کے وسوسے۔

اگلا ہفتہ یونہی گزرا۔ کوئی زور سے بولتا تو وہ ڈر جاتی۔ گھر کا کوئی برتن چھنا کے سے گرتا۔ تو وہ
سمجھتی بم پھٹا ہے۔ کوئی کھانستا تو یوں لگتا بندوقیں چل رہی ہیں۔ اور سب سے عجیب بات یہ
تھی کہ گھر میں ایک جان لیوا سناٹا تھا۔ امی جان خلافِ عادت گہری چپ تھیں۔ آباجی خلافِ معمول
بجھے بجھے اور بیمار تھے۔ ہفتے میں صرف دو ایک بار وہ دکان پر گئے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں
پڑے رہتے اور کمرے کے در و دیوار انہیں حیرت سے تکا کرتے کہ یہ شخص زندہ ہے یا مردہ۔ نہ
وہ گھن گرج نہ تند خوئی۔

آباجی شاید بیمار ہیں۔ وہ دل میں سوچتی۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ اب تک ان کا ردِ عمل
ظاہر ہوا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے وہ نیلا لفافہ پڑھا ہی نہ ہو۔ اپنی میز پر رکھ کر بھول گئے
ہوں اور وہ اڑ کر دور کونے میں جا پڑا ہو۔ اور اب تک کسی کی نظر میں نہ آیا ہو۔

ایک دن اس کے دل میں وہی لفافہ ڈھونڈنے کی دھن سوار ہوئی وہ تاک میں رہی۔ جونہی آباجی
کل کے باہر گئے، وہ لپک کر ان کے کمرے میں گھس گئی۔ جلدی جلدی ان کے تکیے اٹھا اٹھا کر دیکھے۔
خبارات الٹ پلٹ کے میز کو ہر طرف سے دیکھا۔ درازیں ٹٹولیں۔ جب وہ گھٹنوں کے بل جھک کے
یز کے نیچے دیکھ رہی تھی۔ تو امی جان اندر آگئیں۔ ان کی آہٹ پا کر وہ چونکی۔ اور کانپتی ہوئی کھڑی ہو

گئی۔ "کیا بات ہے۔؟"

"کمرے کی صفائی کرنے آئی تھی۔"

"صفائی تو میں نے کر دی ہے۔" امّی جان نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔ مگر اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ پہلے تو وہ صفائی کرنے نہ آتی تھی۔ امّی جان سب جانتی ہیں، وہ کیوں آتی ہے۔ اور کیا ڈھونڈھنے آئی ہے۔ امّی جان سامنے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اس انداز سے جیسے بہت تھک گئی ہوں۔ اس نے سوچا۔ ابھی۔ ابھی۔ وہ لعنت ملامت کا لیکچر شروع کر دیں گی اور بتائیں گی کہ وہ یہاں کیا کرنے آتی تھی۔ مگر وہ بڑی آزردگی اور عجیب نظروں سے بس اسے دیکھتی رہیں۔

"مجھے آج کا اخبار چاہیئے۔" نیّا نے بات بنائی اور اخبار کے ڈھیر کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جانتی تھی اسے اخبار نہیں چاہیئے۔ اور آج کا اخبار سب سے اوپر پڑا ہوا تھا۔ مگر بوکھلاہٹ میں وہ یونہی سارے اخبار الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ امّی چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ اس کی بوکھلاہٹ سے اس کی دلی حالت عیاں ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ امّی جان اس کی بوکھلاہٹ کا نوٹس لیں اس سے کچھ پوچھیں۔ کچھ کہیں۔ کچھ تو کہیں۔ آخر یہ جان لیوا خاموشی ٹوٹے۔

وسوسوں کے پُل صراط پر چلتی چلتی وہ تھک گئی تھی۔ بلا سے دوزخ میں گرے یا بہشت میں۔ اب وہ گرنا چاہتی تھی۔ مگر امّی بیٹھی خالی خالی نظروں سے اس کو دیکھتی رہیں۔ جیسے وہ نیّا کو نہیں۔ بلکہ کسی دیوار کو دیکھ رہی ہیں۔ اُف اتنی خالی نظروں سے کبھی کبھی ڈر آنے لگتا ہے نظر کی زبان تلوار کی نوک کی طرح سیدھی کلیجے میں اتر جاتی ہے۔ وہ خالی نظریں ہوں یا بولتی ہوئی۔

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور اخبار کا فلموں والا صفحہ لے کر باہر نکل گئی۔ اس نے کونسی فلم دیکھنی تھی۔ فلم دیکھنے کا اس گھر میں رواج نہ تھا۔ بھائی لوگ بچپن سے ہی چوری چھپے دیکھ آتے تھے۔ اب تک وہی عالم تھا۔ شہر کی کوئی فلم وہ نہ چھوڑتے تھے اور پھر کالج میں نیّا نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا سہیلیوں کے ساتھ مل کر میٹنی شو دیکھ لیتی تھی۔ اور اب تو وہ سلسلہ بھی بند تھا۔ وہ کمرے میں بیٹھی

ہی اخبار دیکھتی رہی۔

ان سارے دنوں میں وہ ایک دن بھی باہر والے برآمدے میں نہیں گئی تھی۔ ایک بار بھی اس نے سامنے والی کھڑکی کی طرف نہیں دیکھا تھا عجیب بات ہے۔ تب سے کوئی اور گولی بھی آ کر نہیں گری تھی۔ اور نہ کوئی خط آیا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا۔ جو ادھر بیت رہی ہے۔ ادھر اس کا خود بخود پتہ چل رہا ہے۔ ہاں ایک نئی بات اس کے نوٹس میں آئی تھی۔ اب امّی جان جب کام سے فارغ ہو جاتیں تو چپکے سے آ کر اس کے کمرے میں بیٹھ جاتیں۔ پہلے پہلے تو وہ چونک جاتی اور ڈر جاتی تھی۔ کہ جانے کس وقت کیا کہہ دیں۔ مگر رفتہ رفتہ یوں ہوا۔ کہ وہ عادی ہو گئی۔ وہ چپ چاپ آ کے بیٹھ جاتیں۔ یا آنکھیں موند کے صوفے پر لیٹ جاتیں۔ وہ بہتیرا کہتی "آئیں امّی آپ پلنگ پر لیٹ جائیں۔"

"نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔" یہ کہہ کر وہ وہیں پڑی رہتیں۔ ہاں کوئی کام یاد آ جاتا یا کھانے کا وقت ہو جاتا وہ اٹھ کر چلی جاتیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر آ کر لیٹ جاتیں۔ البتہ رات کو وہ اپنے کمرے میں بالکل اکیلی ہوتی۔

"تو گویا اس کا پہرہ دیا جا رہا ہے۔" یہ سوچ کر اس کا خون کھول اٹھتا۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا وہ امّی کو پکڑ کر جھنجوڑ دے اور کہے۔ "تابوت کی صورت میرے پاس مت آ کر بیٹھیں۔ جوانی میں مُردوں سے ڈر آتا ہے۔ یہ ساری خاموشی کی کیلیں باہر نکال دیں۔ اور دل کی بھڑاس نکالیں۔ مگر۔ اس کی اپنی حالت اس بکرے کی مانند بن گئی تھی۔ جس کے آگے ہری ہری گھاس ڈال کے۔ سر کے اوپر دو دھاری تلوار لٹکا دی گئی ہو اب اس کا دل چاہنے لگا کہ یہ تلوار گر پڑے۔ خواہ اسکی گردن دھڑ سے جدا ہو جائے۔

کچھ تو ہو ــــ کچھ تو ہو ــــ ؟

اور پھر ایک صبح جب وہ ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھی جمائیاں لے رہی تھی تو کمرے کا دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور امّی جان اندر داخل ہوئیں۔ اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ !!!!

امی سادگی سے بولیں۔ "مانی آگئی ہے۔ ذرا اٹھ کر گھر کی صفائی کرادو۔ ڈرائینگ روم اور کھانے والا کمرہ خاص طور سے سجا دینا۔ شام کو چار بجے کچھ مہمان آرہے ہیں۔۔۔۔"

پھر جیسے امی کو کچھ یاد آگیا۔۔۔

جاتے جاتے رکیں اور رک کر بولیں "تم بھی ذرا نہا دھو کر ڈھنگ کے کپڑے پہن لینا۔ شاید وہ لوگ تمہیں بھی منگنی کی انگوٹھی پہنا جائیں۔۔۔۔"

پھر امی جلدی سے یوں باہر نکل گئیں۔ جیسے انہیں خود بھی اپنی بات کا یقین نہ ہو۔۔۔۔ یا انہوں نے بے خیالی میں غلط بات کہہ دی ہو۔

امی چلی گئی تھیں۔ دروازہ ایک بار پھر کھٹاک سے بجا تھا۔ امی کو جب ذہنی پریشانی ہوتی تھی تو وہ آتے جاتے ہوئے اسی طرح دروازے ضرور بجاتی تھیں۔

مگر نیا ابھی تک خلاؤں میں امی کو دیکھ رہی تھی، محسوس کر رہی تھی اور سن رہی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جب امی یہاں کھڑی تھیں۔ تو انہوں نے کیا کہا تھا۔؟

صاف صاف کہا تھا۔۔۔ اور اس نے بھی صاف صاف سنا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں آج اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ شاید امی نے کچھ اور کہا تھا۔۔۔ اس نے کچھ اور سن لیا۔

مگر۔۔۔ اتنی بڑی بات۔۔۔۔ الجھی ہوئی امی کتنے سلیقے سے کہہ گئی تھیں۔۔۔۔!

ایسی بات کوئی ماں مذاق میں تو نہیں کہہ سکتی۔ لڑکی کے پیدا ہوتے ہی ایسی بات کہنے کے لئے اپنے پہلو میں حوصلہ اور صندوقوں میں جہیز جمع کرتی رہتی ہے تب کہیں جاکر وہ اس قابل ہوتی ہے کہ لڑکی کے روبرو کھڑی ہو کر صاف صاف کہہ دے۔۔۔ کہ اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

نیا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ دو چار قدم چل کر دروازے تک آگئی۔ ایک دروازہ بند تھا۔ ایک دروازہ کھلا تھا۔

بند دروازے کو اس نے کھول دیا۔ اور کھلے دروازے کو بند کر دیا۔

پھر باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ باورچی خانے سے امی کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں وہ غالباً چینی کے برتن نکال نکال کر مانی کو دھونے اور احتیاط سے سکھانے کی ہدایات دے رہی تھیں۔ واقعی!

وہ دروازے سے ہٹ گئی۔ تب اس کو یقین آیا کہ اس نے کچھ سنا تھا۔۔۔ اور وہ کچھ ایسا اہم تھا کہ سارا خون اس کے چہرے پر آگیا۔ وہ پلٹ کر اپنے بستر پر آگئی۔

یہ سارا کچھ یک بیک ہوا کیسے۔۔۔۔؟ نہ تو گھر میں بار بار مہمان آئے۔ نہ اسے چائے لیکر بیٹھک میں جانا پڑا۔۔۔۔ ہاں جب سے وہ سیانی ہوئی تھی، گھر میں اس قسم کے لوگ کبھی کبھار آ جاتے تھے۔ مگر امی جان انہیں اندر ہرگز نہ بلاتی تھیں۔ چائے بھی مانی لے کر جاتی تھی۔ اور بعد میں بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا۔ جس سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ لوگ اس کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ یا حیثیت سے زیادہ مطالبات کرتے ہیں۔

کیونکہ ابا جی نے امی کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ لڑکی کو بیچیں گے نہیں۔ شرعی شادی کریں گے۔ اور امی جان انہیں سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں کہ وہ اس قسم کی بے جا ضد نہ کریں۔ جو کچھ دے سکتے ہیں۔ ضرور دیں۔ ورنہ اتنی خوبصورت تعلیم یافتہ اور باسلیقہ لڑکی کو کوئی نہ پوچھے

گا۔ پر ابا جی کا وہ عالم تھا ع

جو نہیں کہیں تو نہیں رہے کسی التجا پہ بھی ہاں نہ ہو!

امی بیچاری اپنے طور پر کچھ نہ کچھ بناتی رہتی تھیں۔ مگر ابا جی سے سنسر کرائے بغیر تو اس گھر سے کوڑا کرکٹ بھی باہر نہیں جا سکتا تھا۔

پھر یہ لوگ کون تھے۔ اور امی ابا کو کس طرح پسند آ گئے تھے کہ آناً فاناً بات یہاں تک پہنچ گئی اور اتنے سلیقے سے پہنچی کہ گھر کی دیواروں کو بھی پتہ نہ چلا۔

نیا اپنے بستر پر چت لیٹ گئی۔ اور سوچنے لگی۔ آخر یہ سب اتنی جلدی کیسے اور کیونکر ہوا .... ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی منگنی ارسلان سے ہو رہی ہو .... ؟

یہ سوچتے ہی اس پر ہیجان سا طاری ہوا ... پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے ؟ ....

کیوں نہیں .... ؟ ممکن ہے ابا جی نے اس کے والدین سے شکایت کی ہو اور اس نے اپنے ماں باپ سے صاف صاف کہہ دیا ہو کہ وہ شادی کرے گا تو نیا سے ورنہ زہر کھا لے گا۔ گھر سے نکل جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے والدین نے جھولی پھیلا کر نیا کو مانگ لیا ہو اور ابا جی مجبور ہو گئے ہوں۔

اگر ایسا ہی ہے تو اس کا مطلب ہے ارسلان کا عشق صادق تھا اور وہ بزدل تھی یکایک اسے ارسلان پر پیار آنے لگا ... کیا سچ وہ ننھا سا ڈرامہ زندگی کا تاریخی واقعہ بننے والا ہے .... ؟

کافی دیر تک وہ دل کو تھام کر طرح طرح کے خواب دیکھتی رہی۔ پھر اس کے دماغ نے اس کو جھنجھوڑا اور کہا ... ہوش کے ناخن لے ! اپنے ابا جی کی طبیعت کو فراموش نہ کر ــــ بھلا یہ کیسے ممکن ہے ــــ بھلا یہ کیسے ممکن ہے ــــ ؟ اسے خود اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ اگر ارسلان نہیں تو پھر کون ہے ــــ کون ہے اور کیسا ہے ــــ ! اور اسے اس صیغۂ راز میں کیوں رکھا گیا ہے۔

اس کی منگنی ہے اور اس سے مشورہ بھی نہیں لیا گیا۔

لڑکا نہیں دکھایا گیا ....

لڑکے والے نہیں دکھائے گئے ....

یہ منگنی ہو رہی ہے یا سزا دی جا رہی ہے۔

اونہہ ....

اب اگر میں انکار کر دوں تو ....

عاقل ہوں ــــ بالغ ہوں ــــ تعلیم یافتہ ہوں۔ کسی کی کیا مجال کہ میری مرضی کے بغیر

محترمہ !

ذہن پھر چیخا ــــ آپ کچھ بھی نہیں ہیں۔ صرف بالغ ہیں۔ اور ایسے گھروں میں بالغ لڑکیوں کو بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ اس واسطے ان کی زبان داغ دی جاتی ہے ــــ اور نگاہ پر تالے لگا دیئے جاتے ہیں۔

نہیں ــــ میں بغاوت کروں گی۔ میں ــــ میں

مگر کس لئے ــــ اور کس کے لئے ....

کون ہے ارسلان ؟ تمہارا کیا لگتا ہے ــــ اور کہاں ہے وہ ؟ اتنے دنوں سے اس سے نکر یہ نیا کی خبر نہیں لی۔ یونہی کھیل جاری رکھا تھا تمہارے ساتھ ــــ کوئی اور گرگٹیا مل گئی ہو گی۔ کوئی اور روزن کھل گیا ہو گا ....

شریف لڑکیوں کی شادی ماں باپ کے اشارے پر ہوتی ہے۔

نیا نے ایک طویل سانس لی۔ اور پھر دراز ہو گئی۔ امی بھی اسے جذبات کے بھنور میں چھوڑ گئی تھیں۔ کتنی عجیب ہیں امی، ہمیشہ معمہ بنی رہتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر لڑکیاں ماں سے ہزار قسم کے سوال کرتی ہیں۔ اور مائیں سو طریقوں سے سارا کچھ لڑکیوں کے کان میں ڈال جاتی ہیں، مگر زندگی کے اہم مقامات پر امی خود گم صم ہو جاتی ہیں .... سوالیہ نشان بن جاتی ہیں

کہ کوئی آگے بڑھ ہی نہ سکے۔

اب چور تو اس کے من میں تھا۔ اگر یہ خط والا واقعہ نہ ہو چکا ہوتا تو وہ امّی کے گرد منڈلاتی رہتی کسی نہ کسی طریقے سے سب کچھ پوچھ ہی لیتی۔ پر اب چور بنی دور دور رہتی تھی گلے میں بانہیں ڈال کر اصرار نہ کر سکتی تھی۔ کاش اس کی کوئی بہن ہوتی۔ ایسے موقعوں اسے ہمیشہ احساسِ محرومی ہونے لگتا تھا۔

آخر آدمی اپنے دل کی بات کہے بھی تو کسے؟ ....

دل کی ہر بات دفن کرنے کے لئے تو نہیں ہوتی۔

اُف خدایا! یہ گھر ہے یا جہنم — ؟ کوئی مسکراتا نہیں — بولتا نہیں — اور بھا لوگ ہیں تو وہ اس حویلی میں یوں آتے ہیں۔ جیسے کوئی کچھ چرانے آتا ہے اور یوں چلے جا ہیں جیسے انتقام لے لیا ہو!

اور ابھی صبح کے دس بجے تھے اور شام چار بجے تک سولی پہ لٹکنا تھا اور کیا ضروری کہ وہی سارے گھر کی صفائی کراتے .... گھر کو ہمیشہ صاف کیوں نہیں رکھا جاتا؟ آج اگر صاف نہیں ہوگا تو کون سی قیامت آجائے گی — وہ لوگ واپس ہی تو لوٹ جائیں گے مگر نہیں — یوں ہونا تو نہیں چاہیئے۔ اگر کسی جوان اور خوبصورت لڑکی کو انگوٹھی پہنا بغیر واپس چلے جائیں تو اس لڑکی کے گھر پہ آسیب ڈیرے ڈال دیتا ہے۔ تقدیریں بھی یکایک جاتے ہیں اور لوگوں کی زبانیں لمبی ہو جاتی ہیں۔

پھر تو سب ہی کہیں گے کہ وہ تھی ہی ایسی ....

اور بھلا ارسلان کہاں ہوگا؟ — اس کا دل پوری کے انداز میں دھڑکا۔

اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا۔ وہ ڈری اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی، اس بار امّی نہ تھیں، مائی تھی۔ گندے غلیظ دوپٹے سے اپنی گیلی کہنیاں اور ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ اس کے اندر آتے ہی لہسن اور پیاز کی باس کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ شاید کچھ کھا بھی رہی تھی۔

مینس کی طرح منہ چلاتے ہوئے بولی۔

"بی بی صفائی کراؤ گی کہ آج سوتی ہی رہو گی — میرا باورچی خانے کا کام تو ختم ہو گیا"۔

نیا نے جلدی سے پاؤں چپل میں ڈالے اور کھڑی ہو گئی۔ کھڑے ہو کر اپنی قمیض کی سلوٹیں ست کیں، چارپائی پر سے دوپٹہ اٹھا کر اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹا اور پورے دوپٹے سے ھک لیا۔ اپنی الماری میں سے ایک جھاڑن نکالا اور مائی سے پہلے باہر نکل گئی۔ ڈرائینگ رم میں جا کر وہ رک گئی۔ اسے ہرگز ڈرائینگ روم نہیں کہتے۔ اس نے دل میں سوچا۔ ن کتنی گندگی تھی یہاں — اور بھائیوں کے جوتے، کپڑے تک یہاں پہنچ گئے تھے۔ ی دن سے اس نے پرواہ جو نہیں کی تھی۔ توبہ ایسے ڈرائینگ روم میں بھلا انگوٹھی ننانے والے مہمان آسکتے ہیں؟

اسے ایک دم جوش آگیا — یا کوئی جذبہ جاگ اٹھا۔ دوپٹہ کس کر کمر سے باندھا۔ اور رائینگ روم کا سارا بھاری بھاری سامان مائی کے ساتھ اٹھوا اٹھوا کر باہر دھوپ میں پٹخنا شروع کر دیا۔ پہلے تو امّی اس کے چہرے کو حیرت سے دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے منہ پرے لیا۔ وہ اپنی آئی پہ آجائے تو سب کچھ کر گزرتی تھی۔ مائی بھی چیختی جا رہی تھی کہ بی بی سارا سامان اٹھواؤ۔ وقت بہت کم ہے۔ ابھی شام کی چائے کے لئے بہت کچھ بنانا ہے ادھر سے ہی صفائی رادو۔ مگر یہ نیا کو منظور نہ تھا ....

اس نے مائی کی ایک نہیں سُنی۔ حتیٰ کہ مٹی سے اٹا ہوا قالین بھی باہر نکلوا کر خوب جھاڑا۔ نہ جانے آج اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ سارے صحن پر گرد کے بادل اڑ رہے تھے ور وہ ان کے درمیان بھتنی بنی کھڑی تھی۔ فرش اس نے خود چمکائے۔ دیواریں بھی جھاڑیں۔ الے اتارے ... صوفوں پر پٹرول سے بھیگا کپڑا رگڑا۔ پیتل کے ظروف پہلے ریت سے ر پھر کھٹا لگا کر چمکائے ... گاؤ تکیوں پر نئے غلاف چڑھائے، سندھی کام کی شیشے والی لدیاں جو اس نے سہیلیوں سے سیکھ سیکھ کر بنائی تھیں، نکال کر ڈرائینگ روم میں رکھ دیں۔

باہر سڑک پر سے پھول تڑوائے ـــــ انہیں گلدانوں میں سجایا۔ یہی حال اس نے کھانے دا
کمرے کا کیا۔ اور تو اور اباجی کا کمرہ بھی چمکا دیا اسے کھٹکا سا تھا کہ جیسے کچھ مرد بھی آئیں گے
اباجی کی بیٹھک میں بیٹھیں گے۔

تین بجے تک سارا گھر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ جب وہ شلوار کے پائنچے چڑھا
سر پر دوپٹے کی گٹھڑی بنائے بلے سے جھاڑو کے ساتھ صحن کا فرش دھو رہی تھی اور ما
پائپ سے پانی ڈال رہی تھی تو امّی کو اس پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا اور اس پیار کے اظہار
طور پر ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

اور نیا سوچ رہی تھی اگر اس عالم میں اس کی ہونے والی ساس اس کو دیکھ لے تو
... وہ کہے گی "واہ کیسی اچھی لڑکی ہے۔ جمعدارن کی جمعدارن اور بہو کی بہو..." یہ سو
ہی اس نے ہاتھ جلدی جلدی چلانا شروع کر دیئے۔ وہ اپنے سسرال والوں کو ہرگز یہ
چاہتی تھی کہ سارے گھر کی صفائی اس نے کی ہے۔ اور ایک دن میں وہ اس حد تک
کر سکتی ہے۔

توبہ! آج تو گھر کی نالیاں بھی روزانہ سے زیادہ گندی دکھائی دے رہی تھیں
دے ان کو... مگر پھر اس کو خیال آیا اگر ساس نک چڑھی ہوئی تو وہ باہر نکل کر ضرور د
گی۔ بہانہ کر کے آئے گی۔ سارے صحن کا چکر کاٹے گی، پھر غسل خانے میں بھی ضرور جا
گی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ان لوگوں کا رہن سہن کیسا ہے۔ ابھی اسے اپنا کمرہ بھی ٹھیک
تھا گو وہاں کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ مگر... کسی کے آنے پر پابندی تو نہیں
تھی ممکن ہے ساتھ کچھ لڑکیاں ہوں اور وہ اس کی تصویر کا تقاضا کرتی ہوئی اس کے
کمرے میں آجائیں۔

جب امّی نے تیسری بار بڑی محبت سے اسے کھانے کے لئے آواز دی تو ا
نے آخری بار بہت سا پانی فرش پر ڈال کر ـــــ سیمنٹ کے فرش کو شیشے کی طرح چمکایا۔

دور ایک کونے میں دھوپ کی طرف رکھ دی۔ اور خود پاؤں جھاڑتی ہوئی امّی کے پاس
ی۔ آج وہ ان کی پیاری بیٹی بن گئی تھی۔ نہ ضد کی تھی۔ نہ منہ بنایا تھا۔ اٹھ کر سارا کام
ال لیا تھا۔ گویا اس نے اپنی رضامندی کا پروانہ دے دیا تھا۔ نہ صرف یہی ـــــ بلکہ
ن پہلے جو اس نے ان کے اعتماد کو متزلزل کیا تھا، وہ بحال کر دیا تھا۔ امّی کا رویہ صاف
ہا تھا کہ ان کی معصوم بچی بے گناہ ہے....

پھر سزا کس بات کی دی جا رہی ہے؟ اس نے کھانا کھاتے ہوئے سوچا....
شادی سزا نہیں ہوتی ـــــ امّی سموسوں میں مصالحہ بھرتے ہوئے سوچے جا رہی تھیں
کی کو ایک نہ ایک دن پرائی بننا ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ ماں باپ کو خود کرنا پڑتا ہے۔ وہ خوف
تحت کریں یا مجبوری کے تحت....

لڑکی کو جلدی اپنے گھر کا ہو جانا چاہیئے۔ وسیلہ تو اللہ بنا ہی دیتا ہے۔

"اب تم نہا کر کپڑے بدل لو" امّی نے اٹھتے دیکھ کر بس اتنا ہی کہا۔

وہ گیلے چپل گھسیٹتی اپنے کمرے میں آگئی۔ کیا اس کا کپڑے بدلنا ضروری تھا؟ شاید
ت ضروری ہو۔

اس نے جلدی جلدی اپنا کمرہ ٹھیک کیا۔ بستر پر نیا بیڈ کور ڈالا۔ ڈریسنگ ٹیبل کی ساری
یں ترتیب سے رکھیں۔ میک اپ کی سب چیزیں ہٹا دیں، بس وہاں اپنی ایک تصویر
ھ دی۔ پھر کپڑوں والی الماری کھول کر کپڑے دیکھنے لگی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نارنجی سوٹ
ل لیا۔ اس کے گلے اور بازوؤں پر سیاہ دھاگے اور ستاروں کا بے حد دلکش کام بنا ہوا تھا۔
وٹ کھول کر اس نے پھیلا دیا۔ پھر ایک دم ایک خیال بھی بجلی کے کوندے کی طرح اس
ذہن میں لپک گیا۔ بھلا آج کے دن بھی کوئی کالے کام والے کپڑے پہنتا ہے؟

نہیں.... اس نے سوٹ لپیٹ دیا۔ وہ بڑی وہمی لڑکی تھی۔ وہ یہ سوٹ نہیں
نے گی۔ کوئی اور پہنے گی۔ کوئی سوٹ بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اور امّی دوربا درچی خانے

میں بیٹھی سموسے تل رہی تھیں۔ اتنا نہیں کہ گھڑی بھر کو آجاتیں۔ اور اسے بتاتیں
آج یہ کپڑے پہنو۔ اور نہیں تو اپنا کوئی پرانا کمخواب کا سوٹ یا زری کی ساڑھی نکا
لے آتیں اور کہتیں۔ یہ میری شادی کی ساڑی ہے۔ آج کے روز اسے پہنو تاکہ
گھڑی یادوں اور دعاؤں سے مالا مال ہو جائے بھلا اسے کیا پتہ آج کے روز
ہے۔ نہ کوئی کزن نزدیک تھی اور نہ کوئی سہیلی ـــــ نہ کسی کو بلانے کا امّی نے موقع
نہ جانے یہ اچانک خوشی تھی یا اچانک صدمہ ۔ ۔ ۔ ۔

بہر حال اب زیادہ سوچنے کا وقت کہاں تھا، پونے چار بج چکے تھے۔ اگر
تعلیم یافتہ ہوئے تو وقت پر پہنچ جائیں گے۔ ساڑھے چار بجے تک ضرور آجائیں
اس نے کلائی کی گھڑی اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔ واڑڈوب میں منہ دے کر کھ
ہو گئی۔ کسی سوٹ کا رنگ ٹھیک نہیں تھا۔ کسی کا کام مناسب نہیں تھا۔ کسی کا دو
ہوا نہ تھا اور کسی دوپٹے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ
گلناری رنگ کا جوڑا پہن لے کچھ دن ہوئے امّی نے ہاتی صوفی کا یہ جوڑا سلوا کر دیا تھا
اس سے کہا تھا۔ "سارا دن نکمّی بیٹھی رہتی ہو۔ اس پر سنہری ستاروں کا جال بنا
وہ جانتی تھی یہ جوڑا امّی اس کے جہیز کے لئے بنوا کر رکھنا چاہتی ہیں اس وا
نے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا اور اٹھا کر اسے الماری میں پھینک دیا تھا یہ کہ
"جس روز بازار جاؤں گی اس پر جال ٹکوا لاؤں گی"۔

آج وہی جوڑا وہ ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ انتہائی موزوں جوڑا تھا ـــ بالکل نیا
رنگ بھی خوب ـــ ہاں تو امّی کیا کہیں گی ـــ ؟ اسے دلہن بننے کا اتنا شوق
آج یہ گل ناری جوڑا پہن کر بیٹھ گئی۔ پھر کیا کروں ؟ امّی سے پوچھنا بھی مناسب نہ
بہر حال وہی جوڑا استری کر کے وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ نہا کر آئی تو پورے چا
چکے تھے۔ تولیہ لے کر اس نے اپنے لمبے لمبے بال خشک کرنے شروع کر دیئے۔

ں چاہتی تھی کہ جب وہ کمرے میں جائے تو اس کے بالوں میں سے پانی کے
ے نکل رہے ہوں۔

جب وہ شیشے کے آگے بیٹھی بال سکھا رہی تھی تو امّی کمرے میں آگئیں۔ اس کو ان
ں میں دیکھ کر جیسے کھل اٹھیں۔

نیّا نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ اور کنگھی سے کھیلنے لگی۔

امّی تھوڑی دیر کھڑی رہیں۔ پھر ایک چھوٹی سی ڈبیا میز پر رکھ کر بولیں "میک اپ
یہ زیور پہن لینا" ـــ پھر وہ اس طرح باہر چلی گئیں، جیسے پلکوں پر آئے آنسو چھپانا
تی ہوں۔

ان کے جانے کے بعد نیّا نے وہ سرخ ڈبیا اٹھالی اور اسے کھول دیا۔ اس میں امّی
لدن کے بڑے بڑے جھمکے اور دو پرانے فیشن کے کنگن تھے۔ یہ کنگن اور جھمکے نیّا
ت پسند تھے اور اس نے کئی بار کسی شادی کی تقریب پر پہننے کے لئے امّی سے مانگے
تھے۔ مگر امّی نے ہمیشہ انکار کر دیا تھا۔ آج وہ خود میز پر رکھ گئی تھیں۔ واہ۔ ! نیّا حیران
۔ مائیں بھی کس کس دور سے ہے پر من کی ساری خوشیاں پوری کرتی ہیں۔ جب ایک
ی کی جگہ ایک غم کھڑا ہوتا ہے۔

نیّا سوچتی رہی۔ اور آہستہ سے تیار ہوتی رہی۔ اس نے بڑے سلیقے سے ہلکا
میک اپ کیا۔ خوب صورت تو وہ ویسے ہی بہت تھی۔ اس لئے ہلکے میک اپ
ی اس میں جان ڈال دی۔ بڑے بڑے جھمکے پہن کر جب اس نے آئینہ دیکھا تو شرما
بڑا روپ آگیا تھا چہرے پر۔ بال ابھی گیلے تھے۔ انہیں اس نے کرسی کی پشت پر پھیلا
رکھا تھا کہ اپنے مخروطی ناخن رنگنے لگی۔ دل سخت مضطرب تھا۔ بار بار گھڑی دیکھ
تی۔ پانچ بجنے والے تھے مگر ابھی مہمانوں کا پتہ نہیں تھا۔ خدا جانے کون تھے ؟ ـــ
گے بھی یا نہیں ؟

امّی کو کسی نے بے وقوف ہی نہ بنایا ہو۔ شکر ہے محلے والوں کو علم نہیں اس نے اپنی کسی سہیلی کو بلایا تھا۔ ورنہ کتنی سبکی ہوتی ....

ہاں یہ اسے خود ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی منگنی ارسلان سے نہیں کیونکہ ارسلان کا گھر مسلسل سناٹوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ معلوم کیوں کبھی کبھی اس کا دل دھڑک اٹھتا۔

ارسلان اس طرح خاموش کیوں تھا؟

کیا واقعی وہ اس کے ساتھ کھیل رہا تھا؟

یہ کیسا خطرناک کھیل تھا؟

پتہ نہیں آنے والی گھڑیاں کس طرح گزریں۔؟

ایک انجانے خوف سے وہ سہمی جا رہی تھی۔

اچانک باہر کچھ آوازیں ابھریں۔ اور پھر ایک شور سا سنائی دیا۔

شاید مہمان آ گئے تھے۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے کلائی پر بندھی ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ چار بجے کا ٹائم دے کر جو لوگ ساڑھے پانچ وہ کیسے ہوں گے؟ اس نے دل میں سوچا۔ پھر خود ہی بولی یہاں ہمارے وقت کی پابندی جیسی کوئی شے نہیں ہے۔ یہاں وقت ہر ایک کی مٹھی میں اور پھر اگر وہ لڑکے والے ہوں۔ تو وقت کے بادشاہ ہوتے ہیں۔

سب لوگ شاید اندر ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئے تھے۔ آوازیں پر تھیں۔ مگر گھر میں ہلچل مچ رہی تھی۔ آج تو بھائی لوگ بھی سرِ شام گھر آ گئے تھے ٹوکروں میں سے مٹھائیاں اور پھل نکال کر طشتریوں میں سجا رہے تھے۔ کیا بوجھ سمجھتے ہیں۔ جو اس بوجھ کو ہٹانے میں ہاتھ بٹانے آ گئے ہیں۔

نیّا نے ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔ بال تقریباً سوکھ گئے تھے۔ بس جڑوں پر۔

گیلے تھے۔ اس نے دوبارہ انہیں کنگھی سے سلجھایا اور پھر سیدھی مانگ نکال کر خوب صورت سی چوٹی گوندھ لی۔ سیدھی مانگ اس پر بہت جچتی تھی اور ادھ کھلی سیاہ چوٹی اس کے کولہوں کے درمیان اس طرح لہرایا کرتی جیسے ننھی بچیاں رسّی کود رہی ہوں۔

بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئی تھی۔ بے کار بیٹھنا اور پھر انتظار کرنا کتنا تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ آج تو جیسے سب اسے بھول گئے تھے کسی لڑکی یا بچی نے مارے تجسّس کے اس کے دروازے میں سے جھانکا بھی نہیں تھا۔ نہ معلوم کتنے لوگ آئے تھے؟

کھانے کے کمرے میں جب برتن بجنے کی آوازیں آئیں تو اسے اندازہ ہو گیا اب سب لوگ چائے پی رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ آج سب جیسے اپنی رضی کے مالک بن بیٹھے تھے۔

وہ سارے دن کی تھکی ہاری تھی۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ذہن الگ سلگ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں آنکھ لگ گئی جوانی اور نیند کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خوب صورت آنکھیں جاگتے میں بھی سپنے دیکھتی ہیں۔

تب ہی دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ اور بوکھلائی ہوئی امّی اس کے سرہانے کھڑی ہوئیں۔ وہ گھبرا کر یوں جاگی جیسے زمین ہل گئی ہو۔ سوئی سوئی حیران کن آنکھوں سے اس نے امّی کو گھور کر دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو آخر بات کیا ہے... ؟

"اٹھو بیٹی۔" امّی نے انتہائی محبت اور افسردگی سے کہا "وہ لوگ تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"کون لوگ....؟" اس نے بیٹھی بیٹھی آواز میں پوچھا اور پھر خود بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہی — تمہارے سسرال والے۔"

افوہ! اک ذرا سی جھپکی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ وہ تو کوئی اور ہی خواب دیکھ رہی تھی۔ کھڑی ہو گئی گھڑی دیکھی آٹھ بج رہے تھے۔

"جلدی کرو۔" امّی کو اختلاج ہو رہا تھا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ میک اپ درست کرنے کا وقت نہیں تھا
کو ذرا کنگھی لگائی اور دور پڑا ہوا دوپٹہ اٹھا کر اپنے سر پر ڈال لیا۔

پھر اپنے ہائی ہیل کے سینڈل پہنے اور امّی کی طرف دیکھا۔ امّی نے آگے بڑھ کر ا
پکڑ لیا۔ امّی کے ہاتھ ٹھنڈے برف ہو رہے تھے بلکہ لرز رہے تھے "امّی آج آپ اتنی ن
کیوں ہیں"۔ اس نے دل میں سوچا جبکہ وہ بالکل نروس نہیں تھی۔ بس ایسے تھی جیسے
اختیار میں نہ ہو کسی کے اشاروں پر چل رہی ہو۔

جب امّی اسے تھامے ہوئے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئیں تو جیسے ڈرائینگ
میں سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں بیٹھا تھا سن ہو گیا۔ یا اسے دیکھنے میں مگن ہو گیا۔ جلدی
سلام کر کے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ہونٹ کانپنے لگے
پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ یہ کون سا موڑ ہے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سب لوگ اسے
دیکھ رہے تھے۔ جیسے بکرمنڈی میں بکری کو دیکھا جاتا ہے اور وہ نظریں نہیں اٹھا
تھی اٹھانا چاہیں تو یوں لگا جیسے پلکیں لوہے کی بن گئی ہوں۔ دل موم کا ہو گیا ہے
ہونٹوں پر تالے پڑ گئے ہیں۔

بلاشبہ وہ اس وقت بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ گلناری رنگ کے
سے سوٹ نے اس کے چہرے پر انار کی کچی کلیوں جیسی سندرتا اور پوترتا بکھیر دی
اس پر وہ ذرا کی ذرا سو گئی تھی۔ اس تھوڑی سی نیند نے اس کے حسن کو نوا بیدہ کر دیا
آنکھیں سرخ سرخ اور بھاری بھاری ہو گئی تھیں۔ ان میں کیف ہی کیف تھا۔ ر
ہی رنگ تھا۔ شدتِ جذبات سے سفید گال گلگوں ہو رہے تھے۔ ہونٹوں پر اس
نیچرل کلر کی لپ اسٹک لگائی تھی مگر اس وقت وہ شفق کی طرح سرخ ہو رہے تھے
نچوڑ لیں تو خون ٹپک پڑے۔ شفاف میدے ایسا رنگ تھا۔ کشادہ محرابی پیشانی
جس پر سیاہ بال اور ان کے درمیان دودھیا مانگ کہکشاں کا منظر پیش کر رہی تھی جھکی

ٹھوڑی کے نیچے بلوریں صراحی دار گردن تھی — جہاں گردن کے ہلکے ہلکے خم تھے۔
ہاں پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں، دلکش گلاگو ہر قسم کے زیور سے بے نیاز تھا۔ مگر
ردن کی جلد اور رنگت صاف اعلان کر رہی تھی کہ ع

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی

اس بلوریں گردن اور مہکتے جسم پر ہزار ہا لعل و کندن قربان کئے جا سکتے تھے گردن
کے تلے اس کا خوب صورت کورا جسم تھا جس پر دوشیزگی ہی دوشیزگی چھائی ہوئی تھی۔ جہاں
دا بھار لرز رہے تھے ان کے پیچھے پتلی سی کمر تھی۔ جس نے قمیض کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔
دا جانے کمر قمیض کا سہارا تھی یا قمیض کمر کا آسرا تھی۔ بہرحال تاج محل کی طرح اس کا مصنفا
ن تھا کہ جب کوئی دیکھتا چند ثانیئے بولنے کے قابل نہ رہتا۔

کمرے کے لوگ بھی کچھ دیر خاموش رہے۔ اور پھر جیسے سب کو ہوش آ گیا۔ ایک
واز آئی ....

"کیا نام ہے بیٹی کا ....؟"

"نایاب" امّی نے افسردگی سے کہا۔

"نایاب بڑا پیارا نام ہے" وہ خاتون اپنی جگہ سے اٹھی اور نیاّ کے قریب آ کر بیٹھ گئی
ں کے بیٹھنے سے نیاّ کو اندازہ ہوا کہ وہ کافی وزنی خاتون تھی۔

پاس بیٹھ کر اس نے نیاّ کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور بولی۔ "واقعی نایاب ہے آپ
بیٹی۔ ماشاء اللہ"

اتنے میں دوسری خاتون بھی اٹھ کر آ گئی۔ اور بولی "بھئی یہ تمہاری ساس ہیں جو تم پہ
ار ہو رہی ہیں"

نیاّ نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

"نہ بھئی مجھے تو ساس مت کہو" وہی پہلی خاتون بولی "میں تو اس کی ماں ہوں۔

ماں سمجھے گی تو گزارہ ہوگا۔

اس بار نیا نے اچٹتی سی نگاہ اس خاتون پر ڈالی۔ امی کا رنگ بیٹھے بیٹھے زرد تھا۔ اسی بھاری بھرکم خاتون نے اپنا پرس کھولا۔ اس میں سے ایک ڈبیا نکالی، اس کی انگوٹھی تھی۔ نیا کا سیدھا ہاتھ پکڑ کر اس کی تیسری انگلی میں اس نے انگوٹھی پہنا دی سو ایک روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر دھر دیئے۔

سب لوگوں نے مبارک سلامت کا شور مچا دیا۔

دوسری خاتون لڈو اٹھا لائی۔ اس کی ساس نے ایک لڈو اٹھا کر نیا کے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ بے چاری کیسے کھا سکتی تھی۔ وہ تو بس ذرا سا کاٹنا چاہ رہی تھی۔

تب اس نے دل میں سوچا کہ اس عورت میں نفاست نام کو نہیں ہے۔

دو خواتین بھی اٹھ کر قریب آئیں۔ اپنے اپنے ہاتھوں سے اسے لڈو کھلایا اور سلامی دی یہ سب کرنے کے بعد ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ نیا کی جان میں جان آئی۔

"ہائے سر اونچا کر لو۔ تھک جاؤ گی بیٹی۔" اس کی ساس لگاوٹ سے بولی۔

"آج کل کی لڑکیاں تو ذرا بھی شرم نہیں کرتیں۔ آپ کی بیٹی بہت شرمیلی ہے" اس نے امی کی طرف دیکھ کر کہا۔ مگر امی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہاں بھئی ذرا گردن اونچی کر لو۔" ایک اور خاتون اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

"آج کون سا شادی کا دن ہے، بس ہم گھر والے ہی تو ہیں۔"

نیا واقعی تھک گئی تھی۔ اس نے ذرا گردن اونچی کر لی۔

"اب میں سب کا تعارف کرا دوں۔" اس عورت نے جو سب سے ہوشیار تھی پھر کہنا شروع کیا "یہ ہماری امی ہیں۔" اس نے موٹی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "تینوں شہباز کی بہنیں ہیں۔ میں بڑی ہوں میرا نام نسرین ہے۔ وہ درمیانی بہن کوکب، اور یہ چھوٹی بہن ترنین اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی یہ چاروں میرے

تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ اور وہ تین جو اس طرف بیٹھے ہیں۔ کوکب کے بچے ہیں۔ یہ نسواری سوٹ میں ہماری خالہ ہیں۔ وہ پرلی طرف پھوپھی ہیں۔ اور دائیں ہاتھ ہماری ممانی ہیں۔ وہ جو نیچے قالین پر بیٹھی ہیں —— وہ ہماری نوکرانیاں ہیں۔"

اس نے دو انتہائی غلیظ اور بدبودار عورتوں کی طرف بطورِ خاص اشارہ کیا حالانکہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ نوکرانیاں ہی ہیں۔ مہارانیاں تو ہرگز نہیں ہو سکتیں۔

نیا نے نظر اٹھا کر سب کی طرف دیکھا تھا۔ مگر غور کسی پر نہیں کیا تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اسے ان عورتوں کی طرف دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی تھی۔ ان کے لباس اور گفتگو سے ذرا بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ اعلیٰ گھرانے کی مہذب خواتین ہیں۔ نیم متوسط طبقے کی نیم خواندہ خواتین لگ رہی تھیں۔ وہ کرسی سے ٹیک لگا کر ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی! اب اس کی روایتی شرم بھی دور ہو گئی تھی۔ اور کمر اتنی تھک گئی تھی کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھنا چاہتی تھی۔ گاہے گاہے وہ ان سب خواتین اور ان کے بچوں پر بھی ایک اچٹتی سی نظر ڈال دیتی ہر اچٹتی سی نظر میں وہ کئی باتیں ڈھونڈھ لیتی۔

اس کی دونوں بڑی نندوں نسرین اور کوکب نے بڑے بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ یعنی سستے بردکیڈ کی قمیضیں تھیں۔ سستے دوپٹے اور سستی شلواریں۔ جن کا میچ بھی ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہا تھا۔ خوب زیورات بھی پہنے ہوئے تھے مگر بڑے بے ڈھنگے سے... زیوروں کی ڈوریاں اور نگینے میلے ہو چکے تھے۔ گلے میں دو دو تین تین ہار ڈال کے امارت کا رعب ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے بچوں نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ یوں معلوم دیتا تھا بچوں کے کپڑے اور جوتے آج ہی بازار سے خرید کے گئے ہیں۔ لڑکوں کی نیکریں ڈھیلی اور بشرٹیں لمبی تھیں۔ اسی طرح لڑکیوں کے بے ڈھنگے لمبے لمبے فراک تھے۔ چھوٹی بچیوں کو بھی میک اپ کروایا ہوا تھا۔ وہ جو ساتھ اپنی خالہ، پھوپھی، ممانی کو لے کر آئیں تھیں، وہ تو بالکل مائیاں لگ رہی

تھیں اور جن نوکرانیوں کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا وہ اتنی خلیظ تھیں۔ بے
جمعدارنیاں ہوں۔ البتہ اس کی ساس کی سج دھج سب سے جدا اور سب سے
تھی۔ وہ ساٹھ سال کی بھاری بھرکم خاتون تھی۔ چہرا چوڑا چکلا اور کلّے بھرے بھرے
چھوٹی چھوٹی مگر چاق و چوبند آنکھیں تھیں۔ ناک بیٹھی ہوئی تھی۔ دہانہ چوڑا تھا۔ رنگ
تھا۔ ہاتھ پاؤں موٹے موٹے صحت مند تھے پورا جسم چونکہ چربی زدہ تھا۔ اس لئے
الگ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس نے سبز رنگ کا مون لائٹ کا سوٹ پہنا ہوا تھا
ساتھ چنا دوپٹہ تھا۔ چہرے پر اپنے طرز کا میک اپ کر رکھا تھا۔ دونوں کلائیوں
ڈھیر ڈھیر ساری سونے کی چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں جو اس کی کلائیوں میں پھنسی ہو
تھیں۔ دونوں ہاتھوں کی چار چار انگلیوں میں بدنما نگینوں والی انگوٹھیاں پھنسائی ہو
تھیں۔ گلے میں ایک نیکلس تھا جو گردن کے گوشت میں گھسا جا رہا تھا اس کے ساتھ ا
چمپا کلی لٹک رہی تھی۔ پھر ایک لمبا ہار تھا جو توند تک آ رہا تھا۔ اسی وضع کے میلے میلے
جھمکے پہن رکھے تھے۔

اس میں سے سستے عطر کی لپٹیں اٹھ اٹھ کر آ رہی تھیں۔ بڑی خوش باش اور خوش
اخلاق خاتون نظر آ رہی تھی۔ مسکرا مسکرا کر مسلسل باتیں کر رہی تھی۔ اور باتیں کرتے سمے
دونوں کلائیوں کی چوڑیوں کو بار بار برابر کرتی تھی۔ کبھی انگوٹھیاں ٹھیک کرتی۔ کبھی ہو
گردن کی تہوں میں پھنسا ہوا نیکلس ٹھیک کرتی۔ اور جب کچھ بھی کرنے کو نہ ہوتا تو ا
ہائی ہیل کی گولڈن سینڈل کو پائنچوں میں سے نکال کر فرش پر بجاتی۔

یہ کس قسم کی شے ہے۔ ؟ نیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس نے امّی جان کی
طرف دیکھا۔ بوگم صم بیٹھی تھیں۔ واہ ماں۔ ! یہ کیا عجائب خانہ گھر میں اکٹھا کر لیا ہے اس
نے دل میں کہا۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر میری تقدیر ان لوگوں سے وابستہ کر دی گئی ہے
مگر ایک تسلی تھی اسے۔ اس کی ایک سہیلی کی شادی پسماندہ لوگوں میں ہو گئی تھی۔ وہ
آ کر بتایا کرتی تھی کہ یہ لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ فیشن ایبل لڑکیوں سے دبتے ہیں۔

بات بات میں ان کا مشورہ مانگتے ہیں۔ غرض ایسے گھرانوں میں پڑھی لکھی لڑکی
حکومت کرتی ہے۔ !

مگر پتہ نہیں ان کا لڑکا کیسا ہو گا۔ ؟ اگر وہ بھی اسی قسم کا ہوا تو پھر کیسے گزارہ ہو گا۔ ؟

اس گھر کی تمام تر گھٹن کے باوجود نیا بڑے نفیس ذوق کی لڑکی تھی۔ حسن بھی قدرت
نے دل کھول کر دیا تھا۔ اور شوق بھی پیارے پیارے دیئے تھے۔ ہمہ وقت اس کے ذہن
میں ایک خوش پوش، با اخلاق، تعلیم یافتہ اور محبت کرنے والا شخص رہتا تھا۔ ایک چھوٹا
سا صاف ستھرا دلہن کی طرح سجا سجایا گھر۔ دو تین پیارے پیارے نفیس بچے۔ گھر کی ہر
شے میں سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی ہوں۔ اور آدمی ایسا ہو کہ اس کو دیکھتے ہی دل
بچھ بچھ جائے۔

پتہ نہیں اسے کہاں رہنا ہو گا۔ ؟ ان لوگوں کے ساتھ یا الگ۔ معلوم نہیں لڑکا
کیا کرتا ہو گا۔ کیا ملازم ہو گا۔ سرکاری محکمہ ملے گا یا نہیں۔ سوچتے سوچتے اس کی نظر اپنے
ہاتھ کی انگوٹھی پر ٹک گئی۔ بہت بڑی اور بے ڈھنگی انگوٹھی تھی۔ ہر رنگ کے نگینے جڑے
تھے۔ سرخ، سبز، سفید، نیلے، جامنی ۔ بھلا کیا ضرورت تھی اتنے نگینوں کی ٹوپی بنانے
کی۔ ؟ بس صرف روبیز لگوا کے چھوٹی سی انگوٹھی بنوالی ہوتی۔ مگر ان لوگوں نے شاید
رعب ڈالنے کے لئے اتنی بڑی انگوٹھی بنوائی ہے اور سارے جھوٹے نگینے لگوا دیئے ہیں۔

انگوٹھی سے کھیلتے کھیلتے اس کی نگاہ پھر اپنی کلائی کی گھڑی پر چلی گئی پورے نو بج
رہے تھے۔ اور یہ لوگ اس طرح اطمینان سے بیٹھے تھے۔ جیسے رات کا کھانا کھا کر جائیں
گے۔ وقت کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ بارے اس کی چھوٹی نند ترنم نے انگڑائی
لے کر کہا۔ "امّی جان چلیں بھی اب مجھے نیند آ رہی ہے۔"

تب نیا کی نظر اچانک اس پر ٹک گئی۔ وہ اپنی ماں کی اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اس
واسطے نیا اس کا جائزہ نہ لے سکی تھی۔ وہ سوکھی سی لڑکی اپنی دونوں بہنوں سے بدصورت
تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی چمکدار سی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جس طرح مکڑی کے گرد ساڑھی

لپیٹ دی جاتی ہے۔ بار بار جمائیاں لے کر اپنے ہاتھوں کی انگوٹھیاں دکھا رہی تھی "چلو امی صبح مجھے کالج بھی جانا ہے"۔

اچھا تو یہ محترمہ کالج میں پڑھتی ہیں۔ نیا نے دل میں سوچا۔ ورنہ وہ تو ہائی سکول کی طالبہ لگ رہی تھی۔

"ہاں میرا خیال ہے۔ اب اجازت لینی چاہیئے"۔ اس کی ساس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارا دل تو آپ کے گھر میں ایسا لگا ہے کہ گھر بار بھولے بیٹھے ہیں" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ اس کے ساتھ باقی سب لوگ بھی کھڑے ہوگئے۔

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ اب یہ آپ ہی کا گھر ہے"۔ گم صم سی امی نے اتنے شائستہ انداز میں کہا کہ نیا کو مڑ کر امی کو دیکھنا پڑا۔ آیا وہ اتنا اچھا اندازِ گفتگو بھی جانتی ہیں۔؟

جب سب کھڑے ہوگئے تو نیا بھی کھڑی ہوگئی۔ اور پھر اس نے عافیت اسی میں جانی کہ یہاں سے بھاگ جائے۔ سو وہ اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ بعد میں جانے کیا باتیں ہوئیں۔

وہ جا کر اپنے پلنگ پر بت کی طرح بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد چاپ ہوئی۔ اور وہ محترمہ جو ساڑی میں تھیں جن کا نام غالباً ترنم تھا اور اس کی چھوٹی نند ہوتی تھیں۔ لٹکتی مٹکتی ہوئی اندر آگئیں۔ نہ اجازت طلب کی۔ نہ معذرت۔ رکیسین کا لال رنگ کا پرس کھول کر اس نے اس میں سے ایک پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر نکالی اور نیا کے زانو پر رکھ دی۔ "بھابی بھلا پہچانیں تو یہ کون ہیں؟"

اونہہ — وہ بھلا کیا جانے . . . ، نیا نے تصویر اٹھا کر پلنگ پر رکھ دی اور منہ پھیر لیا۔ تب وہ تالیاں بجانے لگی۔ "ہائے ہائے بھابی شرما گئیں۔ بھیا کو بتاؤں گی — اچھا بھابی یہ تصویر رکھ لیں۔ تنہائی میں تو ضرور دیکھیں گی نا؟ اور مجھے اپنی کوئی تصویر دے دیں جو میں بھائی جان کو دکھا سکوں"۔

نیا چپ چاپ بیٹھی رہی۔ لٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس کو معلوم تھا ان لوگوں کے سامنے شرمانے کی ایکٹنگ بھی ضروری ہے۔ یہ نیم خواندہ لوگ بات کا تبنگڑ بنا لیتے ہیں۔ پھر اس کا بے تکلفی سے بار بار اسے بھابی کہنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیسا ب صورت اور روح پرور لفظ ہے بھابی — ! مگر کسی اچھی اور نفیس ہستی کے منہ سے ادا ہو تب۔ یہ چھچھلی سی لڑکی خواہ مخواہ مسخری حرکتیں کر رہی تھی۔ جتنا اس کو چھیڑنے کی کوشش کرتی اتنا اسے گھن آتی۔

اچھا اگر آپ نہیں بولیں گی۔ تو میں یہ تصویر لے جاؤں گی"۔ اس نے بڑھ کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی تصویر بمعہ فریم اٹھالی۔ نیا نے بھی خوب سوچ سمجھ کر یہ تصویر لگا دی تھی۔ اس کی سب سے خوب صورت تصویر تھی۔ اور جیسے اس کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ آج اس کے سسرال والے اس کمرے میں ضرور آئیں گے۔ شاید وہ لاشعوری طور پر یہی چاہتی تھی کہ اس کی یہ تصویر اس کے ہونے والے دولہا کے پاس پہنچ جائے۔ سو اس نے اعتراض نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لڑکی فریم نکال کر رکھ دے گی۔ مگر اس کی فریم رکھنے کی نیت نہیں لگ رہی تھی۔

"اچھا بھابی بائے بائے۔ میں اب چلتی ہوں"۔ اس نے ماڈرن بنتے ہوئے کہا۔ "میں ویسٹ ایڈ میں پڑھتی ہوں۔ بھائی جان روز صبح مجھے کالج چھوڑنے جاتے ہیں۔ اگر بھائی جان کو کوئی خط وط لکھنا ہو تو اچھی قاصد بن سکتی ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے خود ہی اتنے زور سے قہقہہ لگایا جیسے کوئی بڑی شاندار بات کہہ دی ہو۔

اسی لمحے اس کی ماں دن دن کرتی اندر آگئی۔ "میں دیکھوں۔ یہ نند بھاوج میں کیا مذاق ہو رہا ہے"۔

نیا اور سمٹ گئی۔ تصویر ابھی تک پلنگ پر اوندھی پڑی تھی۔ نیا کی ساس نے کمرے کو بڑے غور سے دیکھا۔ اور پھر بولی۔ "میں صدقے جاؤں۔ میری بیٹی تو تھک گئی ہوگی۔

اب ہم جاتے ہیں۔ تم آرام کرو۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ چاند کا ٹکڑا ہے میری بہو!
کروہ قریب آئی اور اس نے بڑے بھدّے طریقے سے نیّا کا چہرہ اٹھایا، اور اس
پیشانی پر بوسہ دیا۔ سارا تھوک نیّا کے ماتھے پر لگ گیا۔ اس کے ہونٹ ملائم نہیں
کھردرے تھے۔ اور اس کے کپڑوں میں سے دیسی اور سستے عطر کی ایسی لپٹیں نکل
تھیں۔ جن سے ایکدم نیّا کا سر چکرا گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے قے آ
گی۔ پھر اپنے کھردرے ہاتھوں سے اس نے نیّا کی پیٹھ کو سہلایا۔ صدقے و
ہوئی اور باہر نکل گئی۔

اگر یہ پیار ہے تو مار کسے کہتے ہوں گے۔ نیّا اندر بیٹھی سوچ رہی تھی۔
کے کھردرے کھردرے ہاتھ ابھی تک اسے اپنے جسم پر محسوس ہو رہے ہے
اور اس کے کپڑوں کی سستی مہک اس کے نتھنوں میں گھسی چلی جا رہی تھی۔

گھر سے باہر نکلتے نکلتے بھی انہوں نے آدھا گھنٹہ لگایا۔ ان کے کمرے
جاتے ہی نیّا نے تصویر اٹھائی اور ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی۔ اور خود غ
میں چلی گئی۔

جب باہر نکلی تو گھر میں امن امان تھا۔ بڑا سکون تھا اور آسودگی محسوس ہو
تھی۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا۔ امّی جان باورچی خانے میں بیٹھی بچی کھچی چیزیں سم
رہی تھیں اور اس کے تینوں بھائی دیوانوں کی طرح کھا رہے تھے۔ وہ واپس
کمرے میں آگئی۔ اندر سے دروازے کی کنڈی لگا لی۔ دراز میں سے تصویر نکا
اور بستر پر دراز ہو گئی۔ پہلی بار اس نے تصویر کو دیکھا۔ پھر دیکھا اور پھر دیکھا۔

واہ بڑی شاندار تصویر تھی۔ یا بڑا شاندار آدمی تھا۔ کوئی بات تھی ضرور تصویر میں
خوب صورت نقش و نگار کا ایک نوجوان تھا۔ گھنے گھنے خم دار بال تھے۔ جیسے
پسند تھے۔ موٹی موٹی آنکھیں تھیں اور چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اس کا

ایک نقش چُپ تھا۔ اور ہر نقش پر معصومیت کی اور سادگی کی چھاپ تھی۔ ایسی شکلیں اسے
ہمیشہ اچھی لگا کرتی تھیں۔ اسے وہ آدمی اچھے نہیں لگتے تھے جو دیکھنے میں شاطر درجہ
اوّل نظر آتے ہیں۔ اس نے شاید سوٹ پہن رکھا تھا۔ تصویر پوری نہ تھی صرف کوٹ کا کالر
اور چوڑی سی ٹائی نظر آ رہی تھی۔ کتنا لمبا ہے۔؟ وزن کتنا ہے؟ رنگ کیسا ہے....؟
اسے کسی بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ تصویر دیکھ کر جیسے اس کی
مضطرب روح کو قرار آگیا تھا۔

جیسے وسوسوں کے بادل چھٹ گئے تھے۔

جیسے اس کے سارے واہمے ڈھل گئے تھے۔

جیسے اس کے دل نے حامی بھر لی تھی —!

جو کچھ بھی تھا۔ لڑکا دل میں اتر گیا تھا۔ آگے اس کی قسمت — ہاں وہ حیران بھی تو
ہو رہی تھی۔ ایسی ماں کا ایسا شاندار لڑکا — کیونکہ تصویر میں تو لڑکے کی شکل بالکل ماں پر
نہ تھی۔ ضرور اس کی شکل باپ پر ہو گی۔

شکر ہے اللہ کا لڑکا ماں پر نہ تھا۔

اسے مکروہ صورت مردوں سے گھن آتی تھی۔ اس کی سدا سے تمنّا تھی کہ اس کا
شوہر خوش شکل ہو۔ بلا سے امیر نہ ہو۔ دولت مند نہ ہو۔ مگر خوب رو ہو۔ اس نے دور
اور نزدیک ہر زاویئے سے تصویر کو دیکھا۔ ایسا ہی تھا اس کے خوابوں کا شہزادہ —
گدڑی میں لعل ہوتے ہیں۔ کوئی حرج نہیں وہ ان لوگوں میں گزارہ کرے گی اور خوب
کرے گی۔ وہ ان سب سے زیادہ حسین اور تعلیم یافتہ تھی۔ پیا کے دل میں اتر گئی تو
راج کرے گی راج۔ اور اس کا ساجن بھی اسے دیکھتے ہی گھائل نہ ہو جائے گا۔

اس نے تصویر اپنے سینے پر رکھ لی۔ آنکھیں موندلیں اور خوابوں کے پیچھے چل
دی۔ دھیرے دھیرے.... ہولے ہولے....

خواجہ عبدالقدوس کاروباری آدمی تھے۔ شروع شروع میں انہوں نے مختلف قسم کے کاروبار کئے تھے۔ مگر اب شہر کے بہت بڑے آڑھتی تھے۔ اکبری منڈی میں ان کی کئی دکانیں تھیں۔ کئی دکانیں انہوں نے کرائے پر چڑھا رکھی تھیں۔ اور کئی دکانیں ان کی زیرنگرانی چلتی تھیں۔ وہ مختلف اناجوں اور فصلی بیجوں کی آڑھت کا کاروبار کرتے تھے۔

وہ کاروبار کے تمام پیچ وخم اور اسرار و رموز اچھی طرح جانتے تھے۔ خالصتاً کاروباری ذہن رکھتے تھے۔ مگر لین دین میں ایماندار تھے۔ یوں بھی وہ پانچ وقت کے نمازی تھے۔ جمعہ کی نماز ہمیشہ مسجد میں ادا کرتے تھے۔ اور جمعہ کے وقت دکان ضرور بند کر دیتے تھے۔ مزاج میں سختی اور غصہ تھا۔ اسی لئے وقت کے تقاضوں کو جلدی نہ سمجھ سکتے تھے۔ مالی حالت اتنی اچھی تھی کہ انہوں نے محلہ مبارک پورہ میں ایک حویلی بنالی تھی۔ موٹر گاڑی کے وہ قائل نہ تھے۔ زیادہ تر بس یا رکشا پر سفر کرتے تھے۔ چہرے پر بھی کرختگی برستی رہتی تھی۔ اس لئے محلے والے تو کجا، خود اپنے بچے بھی ان سے خوف کھاتے تھے۔

سنا ہے ان کے والد خواجہ عبدالرحیم بڑے اللہ والے بزرگ تھے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ تھا۔ علوم دنیوی سے انہیں رغبت نہ تھی۔ دینی علوم میں دسترس رکھتے تھے

واسطے مسجد میں درس دیتے تھے۔ نہ صرف یہ، بلکہ مسجد میں پانچ وقت کی اذان بھی
یتے تھے اور بعض اوقات جمعہ کا خطبہ بھی پڑھوا دیتے تھے۔ بہت نیک طینت بزرگ
ے۔ مگر اُن کی خواہش تھی کہ ان کا اکلوتا بیٹا عبدالقدوس پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جاتے۔ تمام تر
یادی تعلیم اور ڈگریاں حاصل کرے۔ کیونکہ دینی تعلیم وہ اسے گھر پر ہی دیا کرتے تھے۔

مگر میٹرک پاس کرتے ہی عبدالقدوس مسجد کے ماحول سے بھاگ گیا۔ جب اس نے
ر چھوڑا تو وہ صرف میٹرک پاس تھا پھر وہ ہمیشہ میٹرک پاس ہی رہا۔ البتہ زندگی کی مختلف
ہ داریوں سے سفر کرتے ہوئے وہ خود بخود کاروباری آدمی بن بیٹھا۔ تب اس کی شادی
گئی۔ بچے ہوگئے۔ شہر میں ایک گھر بن گیا۔ تو اس کی خواہشوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا

وہ چاہتا تھا اس کے بیٹے وہ سب کچھ بن کر دکھائیں جو وہ خود نہیں بن سکا تھا۔ اس
خیال تھا بڑا آدمی سی۔ ایس۔ پی افسر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی خواہش تھی کہ غیاث
یم اے کر کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھ جائے اور اوّل آئے اور کسی دن ڈپٹی کمشنر یا
شنر بن جائے۔ وقاص کو وہ چیف انجینئر کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جو ملک
ں بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ اور اخباروں میں نام چھپواتے ہیں۔ اور اوایس۔ اویس
کے لئے وہ سوچا کرتے فوج کا جرنیل بن جائے یا پھر جج تو کہلائے۔ ابّا جی سارا دن تو اپنے
ی کھاتوں اور رجسٹروں سے مغزماری کیا کرتے۔ اور شام کو جب گھر آتے تو یہی چاہتے کہ
ن کے خواب مجسم نظر آئیں۔

غیاث نے یوں ان کے خوابوں کا مذاق اڑایا کہ پانچ مرتبہ ایم اے کا امتحان دیا اور
ہر مرتبہ ایک پرچے میں رہ جاتا تھا۔ وہ کہتا تھا وہ پیدائشی ایکٹر ہے۔ اس کے پاس خوبصورت
جسم ہے۔ چوڑی چھاتی ہے۔ لمبا قد ہے۔ گھونگریالے بال ہیں۔ دلکش نقش و نگار ہیں۔
دل میں اتر جانے والی آواز ہے۔ آخر ابّا جی اسے ایکٹر بن جانے کی اجازت کیوں نہیں دے
دیتے۔ اگر اسے ایک بار چانس مِل جاتے تو وہ ملک کا سب سے بڑا ایکٹر بن کے دکھا

دے گا۔ نام بھی کمائے گا اور دولت بھی۔ اسی واسطے وہ سر پر گھنے بالوں کی ٹوکری رکھ
فلمی سٹائل کے دھاری دار کپڑے پہنتا۔ صبح کو اٹھ کر باقاعدہ ورزش کرتا۔ اونچی آواز میں
گایا کرتا۔ تنہائی میں شیشے کے آگے کھڑے ہو کر ایکٹنگ کرتا۔ اپنے من پسند ہیرو کی نقال
کرتا۔ اور شہر میں لگنے والی ہر فلم دیکھا کرتا۔ اپنی آواز کو ٹیپ کر کے بار بار سنا کرتا تھا۔ وہ
دن کے انتظار میں جی رہا تھا۔ جس دن ابا جی کا جنازہ اٹھے گا! اور وہ دنیا سے اپنی صلاحیت
کے لئے نکل کھڑا ہوگا۔ مگر وہ ازلی بزدل تھا۔ اس واسطے ابا جی سے بہت ڈرتا تھا
بغاوت نہیں کر سکتا تھا۔

بار بار فیل ہونے کا طعنہ دے کر ابا جی نے اسے زبردستی اپنی دکان پر بٹھا رکھا تھا
اکبری منڈی کے بدبودار ماحول میں اس کا خوب صورت دل نہیں لگتا تھا۔ وہاں اَن گ
بوریاں تھیں۔ بوریوں سے اٹھنے والی بساند تھی۔ بڑے بڑے ترازو تھے۔ مغلظ گا
تھیں۔ تول مول اور تکرار تھی۔ وہ ناک پر معطر رومال رکھے ایک طرف بیٹھا رہتا۔ جیسے
غلاظت کی نگرانی کرنے کے لئے بٹھا دیا گیا ہو۔ بار بار جیب سے آئینہ نکال کر دیکھتا
اور اپنے گھونگریالے بالوں کی لہریں درست کرتا رہتا۔ شام کے شو سے ایک گھنٹہ پہ
دکان بند کرتا اور پھر رات کو دس گیارہ بجے گھر آتا۔ وقت بے وقت آئینہ دیکھنا اس
شغل خاص تھا۔

وقاص بی۔ ایس۔ سی انجینئرنگ میں تھا۔ اس کی تعلیمی رپورٹ کچھ اچھی نہ تھی۔ وہ
سے زیادہ کھیلوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ بچپن ہی سے کھیلوں میں حصہ لینے کی وجہ سے
اس کی جسمانی ساخت بہت اچھی تھی۔ اب بھی باکسنگ کا چیمپئن تھا۔ ہر مقابلے میں اوّ
آتا تھا۔ اور اسی لئے کم نمبر آنے کے باوجود اسے ہر کالج میں داخلہ مل جاتا تھا۔

ابا جی جب بھی اسے نئی ٹرافی کے ساتھ دیکھتے۔ ہواؤں میں مکّے لہرایا کرتے۔ "او
پٹھا۔ نام بھی پیدا کیا تو مکّے بازی میں، او حرام زادے۔ تیرے خاندان میں پہلے بھی کوئی

ا ہوا ہے؟"

"اچھا باپ دادا کا نام روشن کر رہا ہے۔ خواجہ عبدالرحیم کا پوتا اب پہلوانی کرے گا۔
ڑے میں نام پیدا کرے گا۔ واہ واہ سبحان اللہ — اے سنتی ہو؟"

مگر وقاص ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا۔ جب بول چال کے
ی باہر نکل جاتے۔ تو وہ اپنے دستانے چڑھا کر صحن میں ٹنگی ہوئی ریت کی بوری پر
زور زور سے مکّے مارنے لگتا، پھر دانت پیس پیس کر کہتا۔ کلّے ہوں کلّے — میں
ستانی کلّے ہوں۔ ایک دن دنیا کے پریس میں آجاؤں گا۔ سمجھے کہ نہیں!"

اور امّی دور بیٹھی اس کی طرف یوں دیکھتیں۔ جیسے وہ باؤلا ہو گیا ہے۔ اور ہواؤں
ے الجھ رہا ہے۔

باقی رہ گیا ادیس — تو وہ پہلے ہی ماں کا لاڈلا مشہور تھا۔ پھر بھی اس نے رو دھو کے
ے کر لیا تھا۔ کیوں کہ ایف ایس سی میں فیل ہونے کے بعد اسے اچھی طرح اندازہ ہو
تھا۔ کہ وہ ڈاکٹری میں نہیں چل سکے گا۔ جلدی ہی اس نے لائن بدل لی۔ اور پھر بی اے
نے کے بعد فوج میں کمشن لے لیا۔ اور آج کل ٹریننگ کے لئے کاکول گیا ہوا تھا۔

ماں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ اسے ادیس سے ہر دم خطرہ رہتا تھا
لاڈلا بھی تھا اور ضدّی بھی۔ باقی لڑکے باپ کے سامنے لرزتے تھے۔ مگر وہ زبان
ا تھا۔ ایک کی دو سناتا تھا۔ سر اٹھا کر چلتا تھا اور ہر وقت پوچھتا تھا۔ میں نے کیا جرم کیا
ے۔ جو ابا جی ہر وقت لعنت ملامت سے کام لیتے ہیں؟"

ویسے بھی اس کا مزاج لڑکپن سے کچھ عاشقانہ تھا۔ چھیڑ چھاڑ۔ اِٹی سٹی۔ آنکھ مٹکّا
ی شکایتیں گھر میں موصول ہوتی رہتی تھیں۔ ماں کو ہر دم خطرہ رہتا تھا۔ گھر میں ایک جوان
ا تھی۔ اور وہ سر اٹھا کر چلتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ ماں کے پیار کے آگے موم ہو جاتا
سو ماں نے سمجھا بجھا کر — آنسوؤں کا دامن بچھا کر، ممتا کا واسطہ دے کر اسے

فوج میں جانے پر راضی کرلیا تھا، اس کا اس گھر سے دُور رہنا ہی ٹھیک تھا۔ اس
ممکن ہے۔ ابا جی کے خیالات بھی اس کے بارے میں بدل جاتے سو وہ چلا گیا
کیوں کہ وہ بھی اس روز روز کی بک بک اور جھک جھک سے تنگ آگیا تھا۔
اس کے جانے سے خواجہ عبدالقدوس خوش ہوئے تھے یا نہیں۔ لوگ کہتے
باپ کے تین جوان بیٹے ہوں اس کی کمر کبھی نہیں جھکتی مگر خواجہ عبدالقدوس کی
کمر جھکنا شروع ہوگئی تھی، بلکہ جوڑوں میں درد بھی ہونے لگا تھا۔ وہ چاہتے
کے سارے بچے لائق فائق ہوکر ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے اپنے گھر میں
ہو جائیں۔ عجیب بات ہے کہ ان کے بچے سمجھتے تھے کہ ابا جی کے جیتے جی ان
کوئی بھی اپنی مرضی کے مطابق گھر بسا کر نہیں رہ سکتا۔

پتہ نہیں خدیجہ بیگم کس مٹی سے بنی تھی۔؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا چا
ہے۔ غریب گھر کی لڑکی تھی۔ شکل اچھی تھی۔ ابھی میٹرک میں پڑھتی تھی کہ باپ نے
عبدالقدوس کی مالی حالت دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ شادی کردی۔ عمر کا بھی خا
تھا۔ اس لئے وہ دبتی چلی گئی۔ وہ حاوی ہوتے چلے گئے۔ کبھی کسی نے نہیں سو
کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس کے منہ میں بھی زبان ہے — اس کے بھی جذبات ہیں
بول سکتی ہے — وہ کہہ سکتی ہے۔ سب لوگوں نے اسے صرف سننے کا
آلہ سمجھ رکھا تھا۔ بچے ہوتے ہیں تو کچھ جاں کا غبار نکلتا ہے۔ کچھ جسم کا۔ اس کے
کا غبار بھی نہ نکلا تھا۔ ماں سمجھتی ہے۔ بچے میرا دکھ سنیں گے۔ باپ کی گردن پکڑ
مگر بعض اوقات بچے پیدا ہوتے ہی — والدین کا گریبان پکڑ لیتے ہیں۔؟ منفی
پاداش میں —؟ جب وہ خود والدین بنتے ہیں تو ان کو سمجھ آتی ہے —
پیدا کرنا جرم نہیں ہوتا — یہ ایک ضرورت بھی ہے۔ ایک فرض بھی —
میں کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی ہے۔ یہ صرف "ہوس" نہیں ہے۔ جوانی کی صبحو

راتوں کا انجام ہی نہیں!

ایسے گھرانوں میں خدیجہ بیگم ہمیشہ خاموش رہتی ہے — بسے جلتی ہے اور اس کے اپنے وجود سے پگھلا ہوا موم اس کے اردگرد ایک موٹا حصار بنا پا جاتا ہے۔ جس میں اس کی اپنی شکل اور شخصیت دب جاتی ہے۔ مسخ ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات وہ خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتی

زیادہ تر متوسط طبقوں میں ایسی ہی مائیں نظر آتی ہیں۔

نہ ان کے لباس ان کا تشخص ہیں ——
نہ ان کی گفتگو ان کی شناخت ہے ——
نہ ان کا رہن سہن ان کی پہچان ہے ——
نہ ان کی کوئی انفرادی قوت ہے ——

وہ بس کسی کی بیوی ہیں۔ کسی کی ماں — کسی کی امّی — اور کسی کی بے بے۔ ان کے شناختی کارڈ ان کے بچے ہیں یا شوہر ہیں۔ بچے جو بعض اوقات تعلیم اور فیشن کے زور پر ماؤں کے آگے آگے اڑتے ہیں — اور بعض اوقات احساس کمتری میں مبتلا ہو کر ماؤں کی کوکھ پر پاؤں رکھ دیتے ہیں۔

اور شوہر تو ویسے بھی شرعی آقا ہوتا ہے ——
آقا کے ہاتھ میں غلام کی زنجیر ہوتی ہے ——
زنجیر کی نوعیت مختلف ہوتی ہے ——

لوہے کی ——
چاندی کی ——
سونے کی ——
اور بعض اوقات ریشم کی ——
زنجیر کا مصرف ایک ہی ہوتا ہے۔

مرد کی زندگی میں دو قسم کی باندیاں آتی ہیں۔ پر جس باندی کے لئے اسے کاغذ میں م
جاتا ہے۔ اسی باندی سے وہ رات بدلا لے لیتا ہے۔ ——
اس کو آگ سے راکھ میں بدلتا ہے۔ ——
زر سے زمین کی طرف لاتا ہے ——
جسم کو فنا کے گھاٹ اتارتا ہے ——
روح کو اپنی برتری کے تحفظ میں لپیٹ لیتا ہے!
یہ سب محبت سے ہو یا تشدد سے ——
ہوتا یونہی ہے ——
اور ان سب کے بدلے عورت کے ہاتھ میں مامتا کی کمزوری لاٹھی تھما دیتا ہے۔ تاکہ
رہے۔ پیچھے پیچھے۔ قدم بہ قدم —— اس لاٹھی کا سہارا لے کر!
جب تک کہ دم ہے!

نیا اب پورے اٹھارہ سال کی تھی۔ اور اس کی منگنی ہو گئی تھی۔ اس کی منگنی کر کے جیسے ماں
پ کے سر سے آدھا بوجھ اتر گیا تھا۔ حالانکہ وہ سب بھائیوں میں چھوٹی تھی۔ ابھی اس کا بی اے
زلٹ آیا تھا۔ ابھی اس کے ہنسنے اور سونے کے دن تھے۔ وہ رات کی رانی کا پودا تھی ——
ں کی کلیاں ہمہ وقت نیم خوابیدہ رہتی ہیں، جوانی کی نیند سوتی ہیں مگر سوتے میں ہوش اڑا
ینے والی مہک دیتی ہیں۔ سارا صحن مہکا مہکا رہتا ہے۔ ہمسائے بھی یہ خوشبو سونگھتے ہیں۔ اور
ہ گیر بھی۔ جب رات ہوتی ہے تو ان کلیوں کی خوشبو اور شوخ ہو جاتی ہے —— ہوا کے دوش
دور دور کا سفر کر کے آتی ہے —— تب دور دور تک یہ احساس جاگتا ہے کہ کسی کے ہاں
ت کی رانی کا پودا ہے۔
پر کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے نا کہ رات کی رانی کے گھنے پودے میں سے زہریلا سانپ
ں آتا ہے۔ اسی سانپ سے ماں باپ ڈرتے ہیں۔ جو ہر رات کی رانی کے پودے کے
ر چھپا ہوتا ہے۔ سولڑکی کو اٹھارواں سال لگتے ہی.... وہ بے سکون ہو جاتے ہیں ——
اٹھارواں سال تو لڑکی کا موسم بیمار ہوتا ہے۔
اٹھارواں سال تو خوشبوؤں کی لڑی ہوتا ہے۔

پھولوں کی چھڑی ہوتا ہے۔
رنگ و نور کی پری ہوتا ہے۔
اٹھارواں سال . . . تپتا ہوا سورج ہوتا ہے۔
آرزوؤں کا سائبان ہوتا ہے۔
خوابوں کا جہان ہوتا ہے۔
تاروں بھرا آسمان ہوتا ہے۔
لڑکی خود کہکشاں بن جاتی ہے۔
اٹھارواں سال موتیوں اور ہیروں سے بھرا ہوا طشت ہوتا ہے۔
ایک ایسا دفینہ جس کی تہہ میں لعل و جواہر نظر آتے ہیں ——
لڑکی خود ایک انمول خزانہ ہوتی ہے۔
سانس میں خوشبوئیں —— بات میں مہکار ——
رات پُربہار ——
دن میں خمار ——
قدموں تلے پھول کھلتے ہیں —— ہنسے تو چاندنی چٹکتی ہے۔ روئے تو شبنم گ
لگتی ہے۔ بسورے تو گھٹا چھا جاتی ہے۔ مسکرائے تو تارے رقص کرنے لگتے ہیں
مانگے تو چاند ہتھیلی پر اتر آتا ہے ——

ہنسی بھی بھلی!
آنسو بھی بھلے ——
بستر —— خواب خواب ——
سرہانہ —— مشک مشک ——
دل —— ارمان ہی ارمان ——

جسم —— میکدہ ہی میکدہ ——
چہرہ —— گلستاں ——

اور ذہن!
ذہن تو کبھی زمین پر ٹھہرتا ہی نہیں۔ ذہن اس کا آسمان پر رہتا ہے
تصوّر میں البیلے شہزادے آتے ہیں۔ اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا ——
اپنے سوا ہر شے ہیچ لگتی ہے ——

اور ایسے ہی باغ و بہار موسم میں، جب دام پل پل چڑھ رہے ہوں۔ ماں باپ بولی لگا دیتے ہیں۔ موتیوں سے بھرے خزانے کا چور دروازہ کھول دیتے ہیں۔ باغبان کو لوٹ کھسوٹ کا پروانہ دے دیتے ہیں۔ راہ زن کو سہرے باندھتے ہیں۔ صیّاد کو جسم کے طوق سونپ دیتے ہیں —— جوانی کی دُعا دیتے ہیں —— پھر جوانی سے حسد کرنے لگتے ہیں —— جوانی کو ایک ایسے رستے پر لگا دیتے ہیں۔ جس کا آخری کنارہ —— ہر حال میں بڑھاپے سے جا ملتا ہے۔

نیا کیا ہر لڑکی اس سازش سے بے خبر ہوتی ہے۔ تبھی تو خوشی خوشی وہ طوق کو گلے کا ہار سمجھ لیتی ہے اور جلدی ہی زیور اور کپڑے کی دنیا میں گم ہو جاتی ہے۔

خواجہ عبدالقدوس کو اس بات سے بہت اطمینان ہو گیا تھا کہ انہیں لڑکا شریف مل گیا ہے گو سفید پوش لوگ تھے، مگر بہت اچھے نظر آتے تھے۔ اب جب دولت چور دروازے سے آنے لگی ہے اور شرافت پچھلے دروازے سے رخصت ہونے لگی ہے، لوگ صرف شریف لڑکا ڈھونڈتے ہیں اور کچھ بھی نہیں مانگتے۔

شہباز کا رشتہ خواجہ عبدالقدوس کے ایک دوست کی معرفت طے ہوا تھا۔ وہ ذاتی طور پر شہباز کو جانتے تھے اور اس کی شریف النفسی اور فطری نجابت کے معترف تھے۔ کتنے عرصے سے وہ خواجہ عبدالقدوس پر زور دے رہے تھے کہ وہ اسے اپنی فرزندی میں لے لیں —— خواجہ

صاحب کو شاید اس سے بہتر آدمی مل جانے کی امید تھی۔ اس واسطے اپنی رضامندی کا اظ
نہیں کرتے تھے۔ لیکن جس روز انہوں نے ارسلان کا خط اپنی چوکھٹ پر دیکھا تھا خطر
محسوس کر لیا تھا۔ اسی دن ان کے اعصاب اور صحت نے جواب دینا شروع کر دیا تھا او
انہیں اپنی زندگی کا چراغ بھی ٹمٹماتا نظر آ رہا تھا۔ سو انہوں نے شہباز کو دیکھنے کا ارادہ کر لیا
وہیں دکان پر بلا کر اس سے ملاقات کی۔ خدا کی قدرت لڑکا انہیں پسند آ گیا۔ باقی سب
نے اللہ پر چھوڑ دیا۔ لڑکی اپنی قسمت بھی تو سسرال میں لے جاتی ہے۔ ہر محکمے میں ترقی
امکانات ہوتے ہیں۔ انہوں نے ضروری بات چیت کرنے کے بعد منگنی کی تاریخ دے دی
اس طرح بات مردوں میں ہی طے پا گئی۔ عورتوں کو روایتی چکر نہ لگانے پڑے۔ یوں خاموشی
منگنی ہو گئی تھی۔

تین مہینے بعد شادی ہونے والی تھی۔ سب تاریخیں طے ہو گئی تھیں اور دونوں گھرا
تیاریوں میں مگن ہو گئے تھے۔

نیا کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ لڑکا بنک میں منیجر ہے۔ بنک ہی کی طرف سے ا
تین کمروں کا فلیٹ ملا ہوا تھا۔ سب مل جل کر اس میں رہتے ہیں۔ اس کے جذبات کا دھا
تو صرف شادی کی طرف مڑ گیا تھا۔

منگنی کے بعد کبھی کبھی شہباز ان کے گھر آتا تھا۔ گو وہ اس سے پردہ کرتی تھی مگ
چھپ کر ہر بار دیکھ لیا کرتی تھی۔ ویسا ہی تھا جیسا تصویر میں نظر آیا تھا۔ البتہ خوب اونچا لمبا او
وجیہہ تھا۔ چہرے سے بھلا مانس ہی نظر آتا تھا۔ وہ جب بھی آتا گردن جھکا کر ان کے صحن سے
گزر جاتا۔ نیا کا دل چاہتا اس کے ساتھ کوئی شرارت کرے۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ ؟ وہ کوئی اگ
کی سالی تھی۔ یہ کام تو سالیوں کے ہوتے ہیں۔ کاش اس کی کوئی چھوٹی بہن ہوتی تو پھر اسے شہبا
کو ستانے کے نت نئے طریقے بتاتی ـــــ شوخ دلہن کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ورنہ ـــــ جانے وہ
کیا کیا کرتی ـــــ ؟ اور پتہ نہیں ـــــ بھلے مانس لوگوں کو دیکھ کر چھیڑنے کو کیوں دل چاہتا ہے ؟

تب اسے بالکل اچانک ارسلان کا خیال آ جاتا ـــــ اور وہ کانپ جاتی کتنے خطرناک
ہوتے ہیں، ایسے چلبلے اور منچلے لڑکے ـــــ تیز و طرار خوفناک ـــــ دیوانوں میں چھید کر لیتے ہیں
اور ہر لڑکی کو چھیڑنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ اچھا ہوا وہ وقت پر سنبھل گئی، اگر قدم آگے بڑھا
لیتی تو کیا ہوتا۔ ؟ اور اب بھی اس سے کیا بعید تھا۔ چاہے تو انتقام لے سکتا ہے۔ اسے
بدنام کر سکتا ہے۔ گمنام خط لکھ کر شادی رکوا سکتا ہے۔ جس طرح کہ آج کل ڈرامے ہوتے رہتے
ہیں۔ ہائے اگر ایسا ہو گیا۔ تو۔۔۔۔۔ ؟ لیٹے لیٹے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ شادی کی
ساری خوشیاں خاک میں مل جاتیں ـــــ وہ سوچتی ابا جی تو جیتے جی مر جائیں گے۔ حالانکہ
اس میں ابا جی کا کیا قصور ہے ـــــ " امی بھی زندہ درگور ہو جائیں گی۔ اور بھائی، اس کے
خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ اسے جھرجھری آ جاتی ـــــ توبہ۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔ " مستقبل
کے خوش آئند سپنے دیکھتے دیکھتے اس کے دل میں کانٹا سا چبھ جاتا۔ کاش وہ ہمیشہ کی
طرح محتاط رہتی ـــــ خدا جانے اس کم بخت کو منگنی کا علم ہو گیا ہو گا۔ کہیں کسی دن
شہباز سے ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ شہباز تو ایسے ہی بھلا مانس نظر آتا ہے۔ اس کی باتوں میں
جھٹ آ جائے گا۔

اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

ایک دن دوپہر کے وقت وہ اپنی ڈیوڑھی میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی گوٹے
والے سے گوٹا کناری خرید رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر سامنے ارسلان کے گھر پر چلی گئی
پھر وہ اپنے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھے دیکھتی ہی رہ گئی۔۔۔۔۔

ایک نوجوان مگر دیہاتن سی لڑکی کھڑکی کے ریلنگ سے لٹکی ادھر ادھر متجسّسانہ دیکھ رہی وہ گلی میں آواز لگانے والے کسی خوانچہ فروش کو تلاش کر رہی تھی۔ اس طرح جھکی جا رہی تھی جیسے گر جائے گی۔ جب نیّا ہاتھ میں گوٹے کا لچھا پکڑے حیرت سے مسلسل اس کو دیکھے گئی تو وہ ہ اٹھی، سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی ـــــ جواب میں باقاعدہ نیّا کو گھور کر دیکھا ـــــ

نیّا پر پھر بھی اثر نہ ہوا تو چلّا کر بولی۔

"کیا دیدے پھاڑے کھڑی ہو ـــــ وہ تمہارا یار چلا گیا ـــــ"

یا خدا ـــــ

ایسے لگا جیسے نیّا کے سر پر وزنی بم آ لگا ہو۔

پھر اس نے نیّا کو ایک ٹھینگا دکھایا اور کھڑکی بند کر لی۔

نیّا جیسے بھیانک خواب سے چونک پڑی ـــــ پسینہ پسینہ چہرے کے ساتھ گوٹے کو دیکھا ـــــ وہ گوٹہ کناری اپنی بالشت پر لپیٹنے میں مگن تھا۔ خدا جانے اس نے سنا یا نہیں نے جو کچھ خرید لیا تھا اس کے پیسے دے کر اسے رخصت کر دیا۔ مگر کچھ ایسا بھونچال اس کے آیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے زمین کے ساتھ ہی منجمد ہو گئی۔

یہ لڑکی کون تھی ـــــ ؟

.ور اسے ارسلان اور اسکے تعلّق کا علم کیوں کر ہوا ـــــ ؟

یا وہ اتنی منہ پھٹ اور بدزبان ہے کہ بلا سوچے سمجھے ایسا کہہ گئی۔

کیا ارسلان نے شادی رچالی ہے اور وہ بھی اس گنوارن سے ـــــ ؟

یہ سب کیونکر ہوا ـــــ ؟

ابھی وہ اسی شش و پنج میں کھڑی تھی کہ وہاں سے محلے کی مشترکہ ملازمہ شیداں گزری۔ اس نے ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری پکڑی ہوئی تھی۔ جس میں سے اروی، بینگن اور ٹماٹر صاف نظر آ رہے تھے اور ایک سرخ سا ٹماٹر ہاتھ میں پکڑے مزے مزے سے کھا رہی تھی۔

"اے شیداں ـــــ"

اس نے اتنی زور سے شیداں کو پکارا کہ وہ ڈر گئی۔ مگر رک گئی اور پلٹ کر یوں دیکھا۔ جیسے یہ آواز خواجہ صاحب کے گھر سے نہیں آئی بلکہ کسی آسیب زدہ گھر سے آتی ہے۔

گندی غلیظ ننگے پاؤں گھومنے والی شیداں نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔

"یہ ٹماٹر تو میں نے "جھونگے" میں لیا تھا ـــــ"

"اری میں ٹماٹر کا نہیں پوچھ رہی۔ لے، یہ چونّی لے جا"

"چونی ـــــ ؟"

شیداں مٹکتی مٹکتی ہوئی قریب آئی۔ نیّا کے ہاتھ سے لے کر چونّی دیکھی۔ پرانی ہے یا نئی۔ اسے معلوم تھا نئی چونّی پر پچیس پیسہ لکھا ہوتا ہے اور بعض دفعہ لوگ دھوکے سے پرانی چونّی دے کر سب کچھ پوچھ لیتے ہیں۔

چونّی دیکھ کر اسے تسلی ہو گئی بولی "کیا پوچھنا ہے بی بی ؟"

شیداں اس محلے کی مخبر تھی۔ اور دن میں اسے ایسی کئی چونّیاں اور اٹھنّیاں مل جاتی تھیں۔ اس کی ماں مختلف گھروں کے برتن مانجھتی اور کپڑے دھوتی تھی۔

وہ مختلف گھروں کا چھوٹا موٹا کام کرنے اور سودا لانے پر مامور تھی اس کی ساری کی ساری توماں دھر لیتی تھی اس لئے زبان کا چٹخارہ چوری کر کے اور باقی ضروریات وہ ادھر کی ادھر پوری کر لیتی تھی۔

"یہ سامنے گھر میں لڑکی کون ہے ؟" نیا نے وقت ضائع کئے بغیر پوچھ لیا۔

"لے بی بی ـــ تجھے نہیں پتہ ـــ یہ بات تو سارے محلے کو پتہ ہے ـــ"

پھر وہ اپنے گندے ہاتھ پر بہتا ہوا ٹماٹر کا رس چاٹنے لگی۔

نیا کو اختلاج ہو رہا تھا۔ اس دوران کوئی آ نہ جائے کہ لوگوں کے بارے میں استفسار کرنا صاحب کے گھر کا شیوہ نہ تھا اور وہ کم بخت بات کو لٹکائے جا رہی تھی۔

"جلدی سے بتا وہ پہلے کرائے دار کیا ہوئے ـــ ؟"

یہ جو لڑکی ہے نا ؟ گوجرانوالہ سے آئی ہے۔ میاں عشق کر کے شادی کر لایا ہے۔ اس کی ساس بھی اسی گھر میں رہتی ہے۔ اس کا شوہر ریلوے میں ملازمت کرتا ہے۔ یہ لڑکی سارا دن اپنی ساس سے لڑتی رہتی ہے۔ اس سے سارا کام کراتی ہے اور گندی گندی گالیاں بھی دیتی ہے ـــ بڑی کمینی ہے۔ گندی گالیاں تو اپنے شوہر کو بھی دیتی ہے ـــ ؟"

شیداں ایسے شروع ہو گئی۔ جیسے کوئی ریکارڈ پر سوئی رکھ دے۔

"بس ـــ"

نیا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ "اور وہ ـــ وہ لوگ جو پہلے رہتے تھے۔"

"ہائے تمہیں نہیں پتہ بی بی ـــ ؟" وہ باقی ماندہ ٹماٹر منہ میں ڈال کر وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور پھر گندے ہاتھ اپنی غلیظ شلوار سے صاف کرنے لگی ـــ

اور ابھی پورا ٹماٹر اس نے نگلا نہیں تھا کہ بولنے لگی ـــ

"وہ جو نوجوان سا لڑکا تھا نا ـــ ؟ خوبصورت سا ـــ گبرو سا۔" نیا کا دل دھڑک اٹھا ـــ

"اونچا لمبا ـــ سُندر سا ـــ ہے نا ؟ ـــ"

نیا کا دم گھٹنے لگا۔ نہ جانے اتنی لمبی تمہید کا مقصد کیا تھا۔

"ہاں ـــ" اس نے جلدی سے سر ہلا دیا۔

"اس کا جو باپ تھا نا ـــ ؟"

"ہاں ـــ" اب کے نیا نے جلدی سے سر ہلا دیا۔

"اسے پولیس پکڑ لے گئی ـــ"

"باپ کو ـــ ؟"

"ہاں ـــ" اب شیداں نے سر ہلایا ـــ

"باپ کو ـــ ؟" دوبارہ نیا نے حیرت سے دریافت کیا۔

"ہاں ہاں ـــ اس کے باپ کو! آپ کو حیرت کیوں ہوئی ـــ ؟" وہ عیاری سے سوال کر بیٹھی۔

"اس لئے کہ اس کا باپ تو شریف آدمی تھا۔"

"نہیں بی بی! بدمعاشوں کی اولاد ہی بدمعاش ہوتی ہے۔ پتہ ہے اس کے باپ نے بہت بڑا غبن کیا تھا اور یہاں اس چھوٹے سے محلے میں آ کر چھپا پڑا تھا ـــ بیٹے کے کرتوتوں کی وجہ سے پولیس کو پتہ چل گیا۔ پولیس آ کر انہیں لے گئی۔ جانے سارا گھرانہ کہاں دفن ہو گیا۔ کیونکہ ان کا سامان بعد میں کوئی اور لینے آیا تھا۔"

"کب ـــ ؟"

"یہی کوئی مہینہ ہوا ـــ"

نیا نے ایک طویل سانس لی۔

"اور پھر یہ چنڈال اس محلے میں آ گئی ہے۔ مجھ سے سودا بھی نہیں منگواتی ـــ"

"صرف ایک مہینہ ہوا ان کو گئے ؟"

اور ایک مہینہ ہی اس کی منگنی کو ہوا تھا۔

"ہاں جی ہاں ـــ سارے محلے والوں کو پتہ ہے اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا۔ اور آپ کو نہیں پتہ

بی بی جی ——— ؟"

نیّا دم سادھے کھڑی تھی۔

"آپ کے تو گھر کے سامنے رہتے تھے۔ سارا وقت تو لڑکا کنگھی پٹی کر کے آپ کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ اچھا ہوا چلے گئے ———"

نیّا کا دل پھر دھڑک اٹھا ———

"آپ کی منگنی ہو گئی ہے نا بی بی ——— کیسا ہے لڑکا ——— دیکھا ہے کہ نہیں

نیّا اس کے اس سوال پر چونک اٹھی اور گھبرا کر ایک اور چوٹی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"جا اب اپنا کام کر ———"

"بی بی اپنی شادی پر ضرور بلانا ——— اور کام بھی مجھ سے کروانا ———" وہ اپنی تیز تیز آواز گھماتے ہوئے بولی ———

"اچھا اچھا ———"

"اور کبھی دولہا آئے تو مجھے بھی دکھانا ———"

"اچھا اچھا ———"

اس کے سیڑھیاں اترتے ہی نیّا اندر کو بھاگی۔ ناحق شہد کی مکھیوں کے چھتے کو ہاتھ جانے اب کس کس کے گھر میں جا کر کیا کیا کہتی پھرے گی۔

"جلدی جا تجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے جاتے جاتے شیداں سے کہا۔

"مجھے دیر نہیں ہوتی جی ——— حاجن جی تو ابھی حقہ پی رہی ہوں گی ———"

وہ اونچی اونچی آواز میں ہاتھ ہلا ہلا کر کہتی گئی اور گلی کی طرف چلتی گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نیّا نے اطمینان کی طویل سانس لی۔ ایک بوجھ بے شعوری طور وہ اٹھائے اٹھائے پھر رہی تھی اس سے نجات مل گئی تھی اور جب خطرے کا احساس ٹل گیا اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کرنے جا رہی تھی اور کیسا بھیانک کھیل رچانے والی تھی اور لڑکے

تی بھولی ہوتی ہیں۔ بلکہ بے وقوف ہوتی ہیں۔ ایک جوان لڑکے کی توجہ کو ہی سب کچھ سمجھ
تی ہیں۔ اور اپنے ماں باپ کی عزت کو گھر بیٹھے داؤ پر لگا دیتی ہیں۔

اب یہی دیکھو۔ وہ لوگ نہ خاندانی تھے اور نہ باعزت لوگ تھے ——— باپ مجرانہ ذہنیت
تھا۔ تبھی تو بیٹے کی ایسی اٹھان ہوئی مگر دیکھنے میں وہ کتنے شاندار اور خوبرو تھے ایسے لوگوں
لئے بھلا کسی کی عزت کیا معنی رکھتی ہے۔ فرض کرو ——— وہ رسم و راہ بڑھا لیتی۔ آنکھیں
کر کے اس پر ایمان لے آتی اسے اپنا دین و دھرم سمجھ بیٹھتی اور پھر اپنے عشق میں اندھی ہو کر
ب دن تنہائی میں مل بیٹھتی ——— تو کیا ہوتا ——— ؟

ان کو نت نئے مشغلے درکار ہوتے ہیں۔

اور لڑکی تو نرا کانچ ہوتی ہے۔

اگر بازار میں ہر قیمت اور ہر ڈیزائن کے کانچ کے گلاس ہر وقت دستیاب ہو سکتے ہیں تو
ہر ایک گلاس ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جائے یا دانستہ توڑ دیا جائے۔ کیا فرق پڑتا ہے ——— ؟

توبہ، توبہ، ———

وہ لرز گئی۔

لڑکی کی عزت اور کانچ کے گلاس میں بہت فرق ہے۔

اور ہر لڑکی کو فولادی قوتِ ارادی کا غلاف چڑھا کر اس کانچ کے گلاس کی حفاظت کرنی چاہیئے۔
پٹرول آگ کے نزدیک جائے گا تو شعلے ہی بھڑکیں گے۔

اچھا ہوا اس کا خط ابا جی کے ہاتھ لگ گیا اور وہ اپنی دانشمندی سے اسے کانٹوں سے
نسیٹ لائے ———

ہائے کتنے پیارے ہوتے ہیں والدین ———

ایک دم نیّا کو امّی اور ابا جی پر پیار آنے لگا۔

ایک ایسا وقت آتا ہے۔ جب ہم انہیں اپنا دشمن سمجھ لیتے ہیں!

اولاد بھی بڑی بے فیض ہوتی ہے ——

بھلا کون نہیں اپنے بچوں کا سکھ مانگتا۔

نیا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گوٹہ کناری کھول کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔

اللہ کا شکر ہے وہ گرداب میں آنے سے پہلے بچ گئی۔

تب اسے شہباز کا خیال آیا۔

شہباز اس کا ہونے والا دولہا تھا جب بھی اس کا خیال کرتی دل پر کلیوں اور پھ
ہونے لگتی اور احساس میں شہنائیاں سی بج اٹھتیں۔ ایسے جذبات ارسلان کے ساتھ
وہ چھوٹا سا ذہنی ربط جو ارسلان کے ساتھ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اسے ایک بودا خیا
تصور نظر آنے لگا تھا۔

جس بات کی شرع اجازت نہ دے —— اس پہ دل کیونکر مسرور رہ سکتا ہے

اللہ کا شکر ہے ارسلان کا کانٹا خود بخود ہی نکل گیا تھا۔ اسے اپنے کالج کی وہ لڑ
آئیں جو اترا اترا کر اپنے بوائے فرینڈز کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ تنہائی میں ان سے
ایک کو للچاتی تھیں اور دوسرے کو جلاتی تھیں اور پھر ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتی تھیں
نیا ان سب لڑکیوں سے مختلف تھی۔

نہ جانے اس پر اس کے گھر کے ماحول کا اثر تھا یا وہ پیدائشی شرمیلی تھی۔

بہرحال اس کا منتہائے مقصود شادی ہی تھا۔

اور اب گھر میں شادی کی باقاعدہ تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

لڑکی کی شادی ایک گورکھ دھندا ہی تو ہوتا ہے۔ کتنے ہی کام اس طرح نکل آتے ہیں
پانی ڈالنے سے بل میں سے کیڑے نکل آتے ہیں ——

ہر روز کام ختم کرو ہر روز اتنے ہی کام ——

امی جان نے اپنے مقفل صندوق کھول دیئے تھے اور نیا کو یہ دیکھ کر بے حد جو

ن میں بے شمار کپڑا دبا ہوا تھا —— نئے و پرانے فیشن کا —— ہر رنگ اور ہر نمونے کا ——
شاید جب سے وہ پیدا ہوئی تھی امی جان کپڑا جمع کر رہی تھیں۔ شادی پر لڑکی کو کپڑے اور
سے تولا جاتا ہے۔ اور وہ تُل جانے پر اپنے آپ کو زیادہ وزنی سمجھتی ہے۔
یا خوشی خوشی سب چیزیں بنا رہی تھی —— روزانہ بازار کے چکر لگتے ——
کبھی زیورات کی دکان پر کبھی درزیوں کی دکانوں پر —— کبھی جوتے، پرس اور میک اپ کی
پر ——

تنے سارے پروانے اسے ایک ساتھ مل گئے تھے —— اور اصراف کی اجازت بھی!
رات گئے تک وہ میٹھی اپنے دھنک رنگ دوپٹوں پر گوٹہ ٹانکا کرتی کبھی کبھی اس کی کوئی سہیلی
ملتی اب تو انہیں باقاعدہ آنے کی اجازت مل گئی تھی اور تو اور محلے والوں کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ
ے گھر میں شادی ہے ——

شادی والا گھر بھی افواہوں کی طرح چھپا نہیں رہتا —— کوئی بلائے نہ بلائے ہر کوئی
بادو دینے کے بہانے چلا آتا ہے۔

محلے کی خواتین مفت مشورے، اور تیر بہدف تجربے ہتھیلی پہ لئے روزانہ چلی آتیں ——
اور کوئی ستم ظریف یہ بھی کہہ جاتی۔

آپ نے شادی کرنے میں بہت جلدی کر دی۔ نیا پر تو میں نے نظر رکھی ہوئی تھی۔ اسے بس فرا
ن نوکری کا انتظار تھا ——

تب نیا کو ہنسی آجاتی۔

بھلا یہ بھی کوئی جلدی تھی ——

خواب پھلوں کی صورت اُگتے ہیں۔

جب لڑکی کم سن ہوتی ہے تو کچے خواب دیکھتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ خواب پکنے
ہیں۔

جب ان سے رس ٹپکنے کے دن آئیں تو ان میں حقائق کی چاشنی بھر دینی چاہیئے۔

بس وہی مناسب وقت ہوتا ہے!

یک بیک نیا خوش رہنے لگی تھی۔

آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔

اور جسم کا خمار دو آتشہ ہونے لگا تھا۔

خوشی خوشی سارا دن کاموں میں لگی رہتی رات گئے تک جاگتی مگر صبح صبح یوں اٹھتی جیسے کے سرہانے گلاب کھلے ہوں۔ نہ تھکن ہوتی نہ چڑچڑاپن۔

جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے تھے اس کا سارا خون چہرے پر آرہا تھا۔

ایک ان دیکھا جہاں ہمہ وقت بازو کھولے اسے پھولوں بھری روش پر بلاتا تھا ——

وہ اس کے سپنوں میں کھو کھو جاتی تھی۔

ہر صبح نئی امنگوں کے ساتھ اٹھتی۔ اور ہر رات نئے نویلے خوابوں کو کلیجے سے لگا کر

شادی

شادی ——

کیا ہے شادی بھی —— ؟

ویسے تو شادی کے لغوی معنی خوشی کے ہیں۔ کیا ہر ذی روح اس لفظ کی آڑ میں ابدی کا متلاشی ہے —— یا ایک ابدی خوشی سے ناطہ جوڑنا چاہتا ہے۔

لڑکی کی انتہا بھی شادی ——

اور لڑکے کا انجام بھی شادی ——

عشق، محبت، پیار، وفا —— یہ سب لہریں ہیں —— موجیں ہیں جو بالآخر شادی کے سمندر میں گم ہو جاتی ہیں۔

مگر لڑکی کا معاملہ کچھ اور ہوتا ہے

جب سے ہوش سنبھالتی ہے۔ گھر میں اسی لفظ کی تکرار سنتی ہے۔

"لڑکی کے کھانے پینے کے دن ہیں شادی ہو جانی چاہیئے"

"اپنے گھر میں جا کر جو جی چاہے کرتی رہنا"

"بھئی لڑکی کے ارمان تو اپنے شوہر کے گھر ہی پورے ہوتے ہیں"

"میاں کے گھر میں ملکہ بن کر راج کرے گی"

"بال کٹائے یا چولی پہنے ہمیں کیا —— ؟ شوہر والی ہے شوہر کی مرضی پر چلے گی"

فیشن،

کپڑا،

روٹی،

آزادی،

اور پیار ہی پیار ——

شادی کا لفظ لڑکی کے کان میں اتنے ڈھیر سارے رس گھولتا ہے۔

شادی کے لفظ کو —— سونا چاندی، اطلس و کمخواب، افشاں و سنگھار اور روشنیوں کے تھال اس قدر سجایا جاتا ہے کہ بس لڑکی کی ہر آرزو اسی ایک لفظ کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔

اور ایک ان دیکھا اور انجانا آدمی زندگی کا واحد ارمان بن جاتا ہے۔

آرزوؤں کا منبع،

تمناؤں کا سوداگر ——

اور ارمانوں کی سیج ——

وہ ایک آدمی چاند بھی ہوتا ہے۔ اور سورج بھی ——

دل کے آنگن میں چاند بن کر اترتا ہے تو محبت کی وادیوں میں تپتا ہوا گرم جوش سورج بن کر مل ہوتا ہے۔

کبھی وہ محبت کا ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ جس کی شاخیں ہر سمت کو جاتی
شاخوں میں زندگی کے مختلف شعبے بسیرا لیتے ہیں۔
ہلکورے کھاتے ہیں۔
رفتہ رفتہ وہ ایک آدمی اتنا بڑا آسمان بن جاتا ہے کہ اس عورت کو، جو اس کے مقا
دھرتی سمجھی جاتی ہے۔ اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتا ہے یوں [illegible] خواب و
لڑکی کی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شادی کے پردے میں ایک لڑکی ایک
کے خواب دیکھتی ہے جو درحقیقت رسم و رواج کی کالی کوٹھڑیوں میں بند حسین و نازک لڑکیو
کا واحد ذریعہ ہوتا ہے۔ اور نیا بھی انہی لڑکیوں میں سے تھی۔ اس کا بچپن اسی گھر میں گز
اسے اس گھر سے پیار تھا۔ مگر وہ اس گھر سے جانے کے لئے تیار ہو بیٹھی تھی ——
امی ابا بہت پیاری چیزیں تھیں —— مگر ایک اور پیاری شے کے لئے ان
رابطہ توڑنا تھا۔
بھائی بھی بہت اچھے ہوتے ہیں مگر جب تک بھابھیاں نہ آئیں ——
رشتے ناطوں کی پہچان کا وقت آگیا تھا۔
نیا کو مائیوں بٹھا دیا گیا۔

ڈھولک پر تھاپ پڑی اور گھر آنگن میں سہاگ کے گیت اُڑنے لگے۔
سہاگ گیت ——
جن کی سمجھ ان بھولی بھالی لڑکیوں کو شادی کے دس سال بعد آتی ہے —— آج یہ گیت
سن کر ان کے ننھے منّے بھولے بھالے معصوم دل دھڑکتے ہیں کل یہ گیت سُن کر آنکھیں اشکبار
ہوتی ہیں۔
روز شام کو ڈھولک بجتی اور وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں پیلا دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ جاتی۔ اس
کے مکھڑے پر ننھے منّے چراغ جل اٹھتے —— اور ایسی مہک آنے لگتی جیسے کچے آموں میں
سے آتی ہو۔ کبھی چھیڑ چھاڑ کے دوران اس کا چہرہ گلابی ہو جاتا اور کبھی گھبرا کر گھٹنوں میں چھپا لیتی۔
جونہی وہ سر جھکاتی اپنے ہی گریبان سے ایسی مسحور کن خوشبو آتی کہ وہ خود مدہوش ہو ہو جاتی
تب اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ زندگی کے اس موڑ پر خوشبو کے جھرنے کیوں پھوٹ رہے ہیں۔
جس روز اس کی برات آنا تھی ابا جی نے صبح ہی صبح اس کو اپنے کمرے میں بلایا امی اسے
بلانے آئیں اس نے اپنے سارے وجود کو سرخ کھدر کی چادر میں لپیٹا جو نیک شگون کے طور پر
امی نے اس کے اوپر ڈال دی تھی۔

اور امی جان کو تھامے ہوئے قدم قدم چلی۔

جانے آج ابا جی کیا کہنے والے تھے۔ کئی دنوں سے اس نے ابا جی کی صورت نہیں
تھی ——— حجاب تو ضرور مانع تھا مگر اپنی خوشیوں میں اسے ابا جی کا خیال کم ہی آیا تھا
جی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ابا جی خود کھڑے ہوئے ورنہ ہمیشہ اسے بیٹھنے کو کہتے تھے۔ نیا
ڈرتے جھجکتے ان کے چہرے کی طرف دیکھا ——— ابا جی کتنے ضعیف لگ رہے تھے
تھوڑے دنوں میں ابا جی اتنے بوڑھے کیسے ہو گئے ——— ؟

ان کی آنکھیں گیلی گیلی تھیں ——— چہرہ زرد زرد تھا۔ اور تہہ در تہہ جھریوں میں
صاف نظر آ رہی تھی۔

کیا سبھی باپ بیٹی کو رخصت کرتے وقت ایسے ہو جاتے ہیں ؟

بیٹی کیا چیز ہوتی ہے خدایا ———

ابا جی چل کر اس کے قریب آئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے یوں محسوس
جیسے کسی نے اس کے سر پر پھول رکھ دیا ہے ———

یہ فولادی ہاتھ ——— جس کے نشانات بچپن میں اس کے رخساروں پر جم جاتے تھے
جس ہاتھ سے وہ خوف کھاتی تھی ——— بڑھاپے میں وہ پھول کیسے بن گیا ———

اور وہ بھی ایسے وقت میں جب وہ رخصت ہو رہی ہے ———

اس پھول کے لمس سے اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اور دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ ایک
احساس نے اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ پیدا کر دی۔

ابا جی اس سے پیار کرتے تھے۔

ان کا لرزتا ہوا ہاتھ گواہی دے رہا تھا۔

ابا جی کو اس سے پیار تھا۔

ان کی گیلی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں۔

بڑھاپے میں آنسوؤں کا کوئی رنگ نہیں ہوتا ——— تبھی تو وہ سارا چہرہ گیلا کر دیتے ہیں مگر
کا گرنا محسوس نہیں ہوتا۔

باپ کا پیار کتنا انمول ہوتا ہے۔

پتہ نہیں زندگی کے کسی موڑ پہ اس پیار کا بدل ملتا بھی ہے یا نہیں ———

کھڑے کھڑے نیا کی ٹانگیں لرزنے لگیں ———

اتنے میں ابا جی نے اپنی آواز پر قابو پا لیا تھا۔

گلا صاف کر کے بولے۔

"بیٹی! اب تم پرائی ہو رہی ہو میکے کا گھر عارضی ہوتا ہے۔ اصل گھر اپنے شوہر کا گھر ہوتا
ہے اور اصل والدین بھی ساس سسر ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہاں پر ابا جی رک گئے یا شاید ان کا گلا رندھ گیا۔

نیا کا دل چاہا ——— وہ کہہ دے ——— نہیں نہیں ——— یہ سب جھوٹ ہے۔ اپنے والدین
سا دنیا میں کوئی نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔

"ہم نے تمہیں پالا پوسا ——— پروان چڑھایا۔ مگر تم ہمارے گھر کسی اور کی امانت تھیں ۔ ۔ ۔"

ابا جی نے پھر حوصلہ کر کے بولنا شروع کر دیا۔ "الحمدللہ کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے۔
ب ہم تمہیں تمہارے اصل وارث کے سپرد کر رہے ہیں۔"

نیا کی آنکھوں سے جھر جھر نیر بہنے لگے۔

"بیٹی جو لڑکیاں میکے کو بھول جاتی ہیں وہ اپنے گھر آباد کر سکتی ہیں۔ اور سسرال والے جیسے
ی ہوں ان میں گھل مل جانا چاہیئے۔ سسرال میں میکے کی بڑائی جتانے سے نئے رشتوں کے
رمیان خلیجیں حائل ہو جاتی ہیں۔ جنہیں پوری ایک نسل نہیں پاٹ سکتی ہر ایک کی آنکھوں کا تارا
نے کے لئے انکساری اور حلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی سے دین و دنیا کی سرخروئی حاصل ہوتی

ہے۔ اور اچھی بیٹیاں اپنے ماں باپ کا مان رکھتی ہیں ـــــ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔
یہ کہہ کر انہوں نے سر پہ سے اپنا پھول سا ہاتھ اٹھالیا۔

"نہیں ..... نہیں ....."

نہ جانے روتی ہوئی نیّا کو کیا محسوس ہوا کہ چلاتی ہوئی ابّا جی کے کاندھے سے لگ
اور پھر بلک بلک کر رونے لگی ـــــ

وہ کہنا چاہتی تھی ـــــ

یہ ظلم نہ کریں ابّا جی ـــــ مجھے غیروں کے حوالے نہ کریں ـــــ

مجھ سے میکے کو بھول جانے کا وعدہ نہ لیں اگر میں میکے کو بھول گئی تو میرے پاس کیا رہ
اس گھر کو میرا عارضی گھر نہ کہیں۔

اس گھر میں تو محبت کے دو انمول چراغ روشن ہیں۔

جن کی روشنی کی مجھے ہمیشہ ضرورت ہے۔

اس گھر کی آس تو سانس کی ڈوری ہے ـــــ جو ہمیشہ جان کے ساتھ رہتی ہے ـــــ

یہ گھر تو میری پہلی اور آخری پناہ گاہ ہے ـــــ

مگر اس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

صرف روتی رہی ـــــ اور "ابّا جی ..... ابّا جی ....." چلاتی رہی ..... اس کی
سے ابّا جی کا کمزور ڈھانچہ جیسے زلزلے کی زد میں آگیا ہو۔ انہوں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ دوبارہ
کے سر پہ رکھ دیا مگر اس کو اپنے ساتھ نہیں لپٹایا۔

وہ جانتے تھے۔ جدائی کے اس سنگھم پر اگر انہوں نے اسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا
ان کے وجود میں سسکتی محبت ان کی بیٹی کا دامن دل تھام لے گی وہ محبت جو انہوں
اپنے سے بھی چھپائی تھی ـــــ اس لئے چھپائی تھی کہ مستقبل کا خوف دامن گیر تھا۔ یہی دھڑ
وقت لگا رہتا تھا کہ یہ تو چلی جائے گی۔ پرائی ہے ـــــ اور اسی واسطے وہ بیٹی کی پیدائش

ڈرتے تھے۔ سخت گیر اور تند خو ابّا جی کا دِل ـــــ بیٹی کے لئے نرم موم تھا۔
اور اب وہ اپنے دل کی کیفیات چھپاتے چھپاتے تھک گئے تھے۔

ابّا جی کے نحیف جسم میں سے ایک عجیب و غریب الوہی خوشبو آرہی تھی۔ شاید یہی محبت
کی خوشبو ہے۔ نیّا نے دل میں سوچا ـــــ اور آج اس خوشبو میں ڈوب جانے کو دل چاہ رہا تھا
اور ڈوب کر پھر کبھی نہ ابھرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ جدائی کے اس دوراہے پر وہ کتنے شفیق اور
محبوب نظر آرہے تھے۔ جیسے سارے فاصلے آپ ہی آپ مٹ گئے تھے ـــــ اور وہ
زندگی کا ایک جزوِ لاینفک تھے۔ ان سے جُدا ہونا کٹھن تھا۔ قہر تھا۔

ابّا جی نے جاتے وقت اپنا یہ روپ کیوں دکھایا ـــــ کہ ان سے دور جانا دوبھر لگنے لگا تھا
اس کو اس طرح روتے دیکھ کر امی جان آگے بڑھیں۔ اور آہستہ سے نیّا کو ابّا جی سے
الگ کر دیا ـــــ

ابّا جی تھکے ہارے یوں بستر پر گرے جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آرہے ہوں
اور ہچکیاں لیتی ہوئی نیّا کو امّی جان اس کے کمرے کی طرف لے کر چلیں۔ زندگی میں پہلی بار تو وہ
ابّا جی کے گلے لگی تھی اور امّی نے اتنی جلدی الگ بھی کر دیا۔

امّی اسے کمرے میں بٹھا کر پانی لینے چلی گئیں۔ جلدی پانی کا گلاس تھام کر اندر آئیں۔ اسے
پانی پلایا ـــــ اس کا چہرہ صاف کیا ـــــ پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور بولیں۔

"تمہارے ابّا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تمہیں نہیں معلوم وہ تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔
تمہاری جدائی کے خیال سے اور بھی نڈھال ہو رہے ہیں اگر تم نے بھی حوصلہ چھوڑ دیا تو ان کا کیا بنے
گا۔ اسی لئے تو میں نے تمہیں ان سے ابھی ملوایا ہے۔ ایسا نہ ہو رخصتی کا منظر وہ برداشت نہ کر
سکیں۔ اب ذرا خود کو سنبھالو۔ بہت رو چکی ہو۔ جاتے وقت مت رونا ـــــ دل کڑا کر کے
اس منزل سے گزر جانا ـــــ اگر انہوں نے تمہاری آواز سن لی تو ان کا دل بیٹھ جائے گا۔"

نیّا کی ہچکیاں دھیرے دھیرے تھم گئیں۔

زندگی کے دوراہے بھی عجیب ہوتے ہیں ایک طرف خوشیاں ہیں، سہانے
ہیں۔ دوسری طرف ماں باپ کے بچھڑنے کا غم ہے۔

ہاں ـــــ اگر شادی میں اتنی دلکشی نہ ہوتی۔ یہ ان دیکھی جنت ہر لڑکی کا منتہا
نہ ہوتی تو پھر اتنا بڑا چرکہ کس طرح سہا جاسکتا۔

واہ ـــــ زندگی کا حساب کیسا ہے ـــــ

ایک ہاتھ سے دیتی ہے۔ ایک ہاتھ سے لیتی ہے۔

بار بار ابا جی کا افسردہ چہرہ اسے آبدیدہ کر دیتا۔

اب تک تو وہ شادی کی خوشی میں سب کچھ بھولی ہوئی تھی۔ اور اب زندگی کا نیا
اچانک اس کے سامنے آگیا تھا۔

امی جان اسے برابر سمجھائے جارہی تھیں۔

اور امی جان بہت حوصلے میں تھیں۔

مگر امی جان بے حوصلہ کب ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ ایسے تھا جیسے کنوئیں کی منڈ
ہے ـــــ کبھی کچھ گرا دیا تو بس گرنے کی آواز آئی۔ کبھی کوئی ہلچل نہ مچی۔ ایسے لگتا تھا۔ ج
تعالےٰ نے بہت سے لوگوں کے حصّے کا حوصلہ بھی انہیں دے دیا ہے۔ جس کو ہر
استعمال کرنا ان کا فرض بن گیا تھا۔

رخصتی کا وقت بھی آگیا۔

رخصتی سے پہلے والدین کتنے بوجھل ہوتے ہیں۔ ایسے جیسے کندھوں پر منوں
اٹھائے پھر رہے ہوں۔ اس بوجھ تلے دب کر دم نکلنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے ـــ مگر
کرنے کا یارا نہیں ہوتا ـــــ اپنے ہی بوجھ سے کوئی واویلا نہیں مچاتا۔ . . . . بلکہ وہ
بوجھ سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہزاروں لاکھوں داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اس بوجھ
کے لئے دوسرے کئی بوجھ اٹھانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بس چاہتے یہ ہیں کہ یہ گھڑی

مگر ـــــ کسی طور عافیت سے گزر جائے ـــــ

اپنا چراغ دوسرے گھر میں جل اٹھے ـــــ

اپنے جگر کا ٹکڑا ـــــ دوسرے کی پیشانی پہ سج جائے۔

خواہ اسے موتیوں میں تول کر دوجے کے حوالے کرنا پڑے ـــــ وہ بوجھ ہی ہوتا ہے۔

ماں، باپ، بھائی بہن ـــــ سب کی یہی ایک آس ہوتی ہے۔

ڈھولک بول بول کر تھک گئی تھی اور سنگیوں سکھیوں کے گلے بیٹھ گئے تھے۔ بارات کا
دن ہنگامے کا آخری دن ہوتا ہے۔

ہنگامے سے بھی لوگ تھک جاتے ہیں۔ زیور اور کپڑے سے گھبرا جاتے ہیں۔ اور
چاہتے ہیں۔ آج ساری کسر نکال دی جائے۔

سو بارات کے دن لوگ خوب زور و شور سے کپڑا اور زیور دکھاتے ہیں ـــــ پھر پیٹ
بھر کر کھاتے ہیں۔ پھر چاہتے ہیں۔ دلہن رخصت ہو جائے تاکہ وہ ایک طویل تبصرہ کرتے ہوئے
آرام کرنے کے قابل ہو جائیں۔

دولہا دولہن کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔

ان تمام دنوں میں وہ بالکل عافیت سے رہتے ہیں۔ بلکہ بڑے مزے میں رہتے ہیں۔ بہتر
سے بہتر سلوک اور بہتر سے بہتر تواضع ان کا نصیب بن جاتی ہے اور جہاں لوگ تھک ہار کر ان کا
ساتھ چھوڑ جاتے ہیں وہاں سے ان کے سفر کی ابتدا ہوتی ہے۔

گو وہ تازہ دم بھی ہوتے ہیں اور ان کے پاس زادِ راہ بھی بہت ہوتا ہے ـــــ مگر پڑاؤ کا
بدل جانا بذاتِ خود ایک بہت بڑا حادثہ ہے ـــــ جس سے وہ بے خبر ہوتے ہیں۔

نیّا کو سہیلیوں نے بڑی جانفشانی سے دلہن بنایا اور واقعی وہ تو ماہِ تاباں بن گئی
شریف اور شرمیلی لڑکیوں پر شادی کے دن ایک آسمانی روپ ہوتا ہے ـــــ جو چور دروازوں
سے نکل کر گھونگٹ سے چھن چھن کر آتا ہے۔

شادی کے روز دلہن تیرھویں کا چاند ہوتی ہے۔

جیسے تیرھویں کا چاند ذرا سا نامکمل، معصوم، کنوارا، اور شرمیلا شرمیلا نظر آتا ہے۔

رفتہ رفتہ تکمیل کی طرف بڑھتا ہے پھر ٹھٹک جاتا ہے ـــــ نہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنا نہ ہی روشنی بے باک ہوتی ہے۔

صرف ایک رات ـــــ

بیچ میں ایک رات ہوتی ہے۔ مکمل ہونے کو ـــــ

پھر ہر رات اسے زوال کی طرف لے جاتی ہے..... رفتہ رفتہ..... تیرھویں کے چاند والی دوشیزگی اور پاکیزگی نیّا کے چہرے پر بھی تھی ـــــ وہی حجاب، وہی شرم۔ وہی پل پل روپ کی سیڑھی پر آگے بڑھنے کی کیفیت ـــــ

وہی سوز ـــــ وہی ٹھٹک!

پھیلنا بھی ـــــ اور سمٹنا بھی ـــــ

ہنسنا بھی، اور ڈرنا بھی ـــــ

دیکھنا بھی اور نظریں چرانا بھی ـــــ

کچھ اور جاننے کی تمنا، کچھ ہار جانے کا ڈر ـــــ

دلہن کا کنوارپن ایک خوبصورت خوشبو بن کر بارات کے روز آخری بار اس کے چہرے کا طواف کرتا ہے ـــــ اور اس کے ہالے میں وہ سونا چاندی بنتی جاتی ہے ـــــ

جس نے بھی نیّا کو دیکھا عش عش کر اٹھا۔

جب وہ باہر پنڈال میں آئی تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔

جانے لوگ اتنی بے تابی سے دلہن کو کیوں دیکھتے ہیں ـــــ؟ کوئی اپنا مستقبل۔ اور کوئی اجڑنے سے پہلے پھلواری کو دیکھتا ہے ـــــ اور خوش ہوتا ہے ـــــ

ہر نگاہ الگ،

ہر ذہن جدا ـــــ

رخصتی بھی بخیر و خوبی انجام پائی۔ نیّا کو امّی نے بہت سمجھایا تھا کہ رو! نہیں ـــــ مگر جب وہ دھیرے دھیرے اپنی بازیب کی تال پر چلتی ہوئی ڈیوڑھی تک آئی اور وہاں امّی نے آخری بار اسے سینے سے لگایا۔ تو اس کی سسکیاں نکل گئیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ماں بیٹی آخری بار ملیں اور روئیں بھی نہیں ـــــ

بہت سی باتیں جو بیٹی ماں کو اور ماں بیٹی کو نہیں سمجھا سکتی۔ وہ ان کے آنسو ایک دوسرے کو کہہ دیتے ہیں۔

ویسے بھی ماؤں میں آنسوؤں کی زبان سمجھنے کی بہت اہلیت ہوتی ہے ـــــ اور چونکہ وہ ان راہوں سے گزر چکی ہیں اس لئے بیٹیوں کی دلی کیفیت کو خوب سمجھتی ہیں۔

نیّا سسکتی ہوئی سجی سجائی موٹر میں بیٹھ گئی اس کے پہلو میں اس کا دولہا بیٹھا تھا مگر ایک گٹھڑی کو کیا پتہ چل سکتا تھا کہ دولہا کہاں ہے اور اس کا منہ کس طرف ہے ـــــ

بس سر جھکائے وہ اپنی نتھ میں اٹکے ہوئے آنسو پونچھتی جا رہی تھی۔ اب اس کے آنسو کوئی نہیں پونچھ رہا تھا مگر اپنے ہلتے ہوئے جسم سے وہ خود ہی اپنے روئے جانے کا اندازہ کر رہی تھی

موٹر چل پڑی ـــــ

ماں نے دعاؤں کے ساتھ پیسے نچھاور کئے۔

نیّا کا دل دھڑک اٹھا۔

یہ تھی نئے سفر کی ابتدا ـــــ

موٹر چلی جا رہی تھی۔ جانے کن کن راہوں سے ـــــ اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا کہ دلہن کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

مگر وہ موٹر چلنا، رکنا اور پھر چلنا محسوس کر لیتی ہے ـــــ رفتہ رفتہ اس کی سسکیاں بند ہو گئیں۔

اسے ایک دم اپنی سہیلی کی ایک بات یاد آگئی۔ شادی کے روز وہ بہت رو
دوسرے دن خوب ہنس رہی تھی۔ نیّا نے پوچھا ——

تو وہ بولی۔

"میرا دولہا مجھ سے پہلی رات پوچھ رہا تھا۔ کہ یہ لڑکیاں آخری وقت رو رو کر اتنا ڈرا
کرتی ہیں۔ حالانکہ برضا و رغبت شادی پر آمادہ ہو جاتی ہیں اور سب کام خوشی خوشی کرتی
آخری وقت میں رو کر دولہا پر رعب ڈالتی ہیں یا لوگوں پر۔"

"اچھا پھر تم نے کیا کہا ——"، نیّا نے پوچھا تھا۔

"میں کیا کہتی ——"، وہ زور سے ہنس پڑی۔

"واہ یہ بھی کوئی جواب ہوا" —— نیّا بولی "سوچ سمجھ کر کوئی اچھا سا جواب دینا چاہ
"کیا کہتی اسے ——"

"یہی کہتیں کہ ماں باپ سے بچھڑنے کا خیال آجاتا ہے۔"

"وہ کہتا ہے یہ جدائی تو عارضی ہوتی ہے۔ ہر روز تو ماں باپ سے ملنے جاتی ہیں۔"

"ہوں —— تو کہہ دینا تھا کہ بھئی شوہر سے ڈر لگتا ہے۔ اس لئے روتی ہیں ——
اس بات پر دونوں سہیلیاں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔

"ہاں یہ بات تو مجھے سوجھی ہی نہیں۔"

"اچھا اب کہہ دینا ——"

روتے روتے نیّا مسکرا پڑی۔ اگر اس کے شوہر نے بھی یہی سوال پوچھ لیا تو کیا ہوگا
وہ کیا جواب دے گی۔

شہباز تو صورت سے اتنا معصوم اور بھلا مانس نظر آتا ہے۔ بھلا اس سے کیا ڈر
مگر ڈر تو پھر بھی آتا ہے نا ——

نیّا کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

جہاں ایک انجانے جہان کے متعلق جاننے کا تجسّس ہوتا ہے وہاں موہوم سے خدشوں
سے خون بھی آتا ہے۔

بہر حال ——

جب حشر کا وقت آئے گا
اس وقت دیکھا جائے گا

بیٹھے بیٹھے نیّا کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔

دل گھبرانے لگا۔

گھر میں اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور کچھ کھانے کی چاہ بھی نہیں تھی —— اس کی
گردن بے حد تھک گئی تھی۔ اور نہ جانے اور کتنی دیر یونہی بیٹھنا تھا۔

خدا خدا کر کے گھر آگیا موٹر کھڑی ہو گئی۔ بچے آس پاس اکٹھے ہو کر تالیاں بجانے لگے۔

بینڈ پھر بجنا شروع ہو گئے اور باہر بدنظمی کا ایک شور پھیل گیا تھا۔

اسے موٹر میں بیٹھے بیٹھے اتنی دیر ہو گئی کہ اس نے سمجھا شاید لوگ اسے بھول گئے ہیں۔

مگر بہت دیر بعد پتہ چلا ——

گھر کے دروازے کو جو تالا لگایا گیا تھا اس کی خوش دامن صاحبہ اس کی چابیاں کہیں گرا بیٹھی
ہیں اور پھر تالہ توڑنے کی مخالفت بھی کر رہی ہیں ان کا خیال ہے دلہن کے میکے جا کر چابیاں
ڈھونڈ کر لائی جائیں تب تک سب لوگ سڑک کے کنارے کھڑے رہیں۔

ناچار شہباز موٹر سے نکل کر باہر گیا نہ جانے اس نے کس طرح مار کا ٹ کر دروازہ کھول گیا
اور سب لوگوں نے گھر میں جانا شروع کر دیا۔

تب نیّا کی باری آئی۔

گرمی اور حبس سے اس کا برا حال تھا۔

شہباز نے دروازہ کھولا —— اور اسکی ساس پورے دروازے میں پھنس کر بولی۔

"آمیری بیٹی میں صدقے جاؤں۔ پسینہ پسینہ ہو رہی ہے ——"

اس نے درمیان میں بیٹھی ہوئی نیّا کو بازو سے پکڑ کر اس طرح اپنی طرف کھینچا جس طرح کی بوری کھینچتا ہے۔

نیّا جلدی سے خود ہی کھسک آئی۔ کیونکہ اس کے بازو کو جو دھچکا لگا تھا وہ آئندہ چوبیس کے لئے بہت کافی تھا۔

قدم قدم چلتے چلتے جب سیڑھیاں سامنے آگئیں تب اسے پتہ چلا کہ ان کا گھر دوسری آگے آگے نیّا کی بڑی نند اس کا پرس اٹھائے چڑھ رہی تھی۔ پیچھے نیا تھی —— نیّا کے اس کی ساس کبھی بسم اللہ کہہ کر اس کا غرارہ سنبھالتی اور کبھی دوپٹہ سنبھالتی —— اور ساس کے غالباً شہباز تھا۔ کیونکہ موڑ اس نے بند کی تھی۔

سیڑھیاں چڑھنے کے بعد —— جب اس کا دم پھول رہا تھا۔ نہ جانے انہوں نے کیا شگن کئے —— بہنوں نے بھائی سے نیگ مانگے —— ہنسی مذاق ہوا ——

مگر نیّا کا دل گھٹتا جا رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا وہ بے ہوش کر گر جائے گی۔ کسی کو اس کا خیال خدا خدا کر کے رسمیں اور ہنسی مذاق ختم ہوا۔ اور اسے لا کر ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا ——

کمرے میں بیٹھنے کے بعد پھر اس کے گرد اتنا ہی ہجوم ہو گیا تھا۔ جو بھی آتا جھٹ اس گھونگٹ اٹھا کر دیکھتا —— یہاں کوئی رونمائی کرانے کو نہ بیٹھا تھا۔ جیسے دلہن پر سارے حق برابر ہو گیا تھا۔ پھر عورتیں اتنی بدتمیزی سے اس کا سر اٹھاتیں —— کہ کبھی اس کی ناک دکھ جو نتھ کے بوجھ سے سرخ ہو رہی تھی۔ کبھی بھاری جھمکوں میں دبے ہوئے کان دکھ جاتے۔

مگر وہ "سی" کی آواز نکالے بغیر چپ چاپ یوں منہ اٹھا لیتی جیسے روبوٹ ہو اور اسی کام کے لئے لائی گئی ہو۔

اس کی ساس اور نندیں غالباً لوگوں سے مبارک بادیں وصول کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ عورتوں نے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔

خدا خدا کر کے چائے کا کہہ کر عورتوں کو وہاں سے اٹھایا گیا۔ وہ ہجوم باہر نکلا تو اس نے ذرا سکھ اسانس لیا۔

اس کی بڑی نند نے ایک گول تکیہ لا کر اس کے پیچھے رکھ دیا اور بولی۔

"تم ذرا آرام کرو۔ بیٹھے بیٹھے کمر دکھنے لگی ہو گی"

سچ مچ وہ نیم دراز ہو گئی۔ شادی کے روز دلہن سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ جیسے وہ صرف گوشت کی ایک کٹھڑی ہے۔ جہاں چاہا —— اور جس حالت میں چاہا اٹھا کر رکھ دیا۔ بڑا تلخ تجربہ ہے شادی کا دن بھی اس نے دل میں سوچا —— مگر یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ یہ دن زندگی میں صرف ایک بار ہی آتا ہے"

ذرا سا آرام کرنے لگی تھی کہ چائے آگئی اور چائے کے ساتھ ہی خواتین کا غول بھی اندر آگیا اور پھر اسی طرح گفتگو شروع ہو گئی۔

یہ گلوبند کس طرف کا ہے ——؟

یہ ٹیکا میکے کا ہے یا سسرال کا ——؟

کپڑے کس طرف کے ہیں ——؟

چوڑیاں کس طرف کی ہیں ——؟

جہیز میں کیا دیا ——؟

حق مہر کیا بندھا ——؟

اف اللہ کتنے بے ہودہ سوالات ہیں۔ نیا مسلسل سوچے جا رہی تھی اور ہر بار ان کے جوابات دینے پڑتے ہیں۔ آخر لوگ دلہن کی صورت دیکھ کر ہی کیوں مطمئن نہیں ہو جاتے ——؟ زندگی ان سوالوں سے کب نجات حاصل کرے گی۔ اور ایک دن کی دلہن بار بار کیسے ان سوالوں کا جواب دے ——

پھر تو اس کے سامنے ہی تبصرے شروع ہو جاتے ——

"اے فلاں کی بہو سونا تو لے لائی ـــــ پانچ لاکھ نقد لائی ـــــ دو سو جوڑے لائی یہ لائی ـــــ وہ لائی ـــــ"

"ہاں اور انہوں نے مہر بھی تو پانچ لاکھ بندھوایا تھا۔"

"اوئی اللہ پانچ لاکھ ـــــ"

"نہ صرف پانچ لاکھ بلکہ وہ کوٹھی بھی لکھوالی جس میں سب لوگ رہتے تھے۔"

"اچھا ـــــ"

"لو اور سنو چھ ماہ کے اندر اندر بہو نے ساس سسر کو اس کوٹھی میں سے نکال دیا۔ بولی یہ تو میری ہے ـــــ"

"قسم خدا کی ـــــ"

جانے دے بہن چودھری صاحب کی بہو اس سے بھی زیادہ لائی تھی۔ مگر ساس نے ہمیشہ جوتی کی نوک پہ رکھا۔ کہتی تھی باپ کی دولت پہ اکڑتی ہے اگر دبا کر نہیں رکھوں گی تو آپے سے باہر ہو جائیگی"

"ماں باپ نے برداشت کر لیا؟"

"کر ہی لیا ـــــ"

"ارے اس کا نام سنا ہے رقیہ سلطانی کا ـــــ"

"ہاں ہاں سنا ہے۔"

"تمہیں پتہ ہے اس نے اپنی بہو کے ساتھ کیا کیا ـــــ؟"

"کیا کیا ـــــ؟"

دوسرے دن ولیمے کے بعد اس کے گلے سے میکے والا سیٹ اتروا کے اپنی بیٹی کے جہیز میں رکھ دیا۔"

"اے اس کا کیا پوچھتی ہو ـــــ"

"وہ تو حرافہ ہے حرافہ ـــــ سات بیٹے ہیں اس کے اور ہر دفعہ کسی اونچی جگہ ہاتھ مارتی ہے لڑکا بہو لے آتی ہے۔ پھر اس کا سارا جہیز ہتھیا کر اپنی کسی بیٹی کی شادی کر دیتی ہے۔"

"اوئی ماں ـــــ؟"

"جانے بھی دو۔ سنا نہیں، پچھلے سال اس کا حشر کیا ہوا تھا؟"

"کیا ہوا تھا ـــــ؟"

"بھئی اللہ سمیع و بصیر ہے۔ پر ہم نے تو جو سنا ـــــ"

"کیا سنا تھا ـــــ؟"

"چوتھی بہو کے ساتھ جب اس نے ایسا کیا نا؟ تو اس نے پہلی تینوں کو بھی ساتھ ملا لیا اور ایک دن دروازہ بند کر کے اس کو اتنا پیٹا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا پھر لوگوں سے کہتی پھرتی تھی میں رات کو سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ اس لئے منہ پر چوٹیں آ گئیں ـــــ"

"ہاہاہا ـــــ" سب خواتین نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

"ہاں ایسوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔"

"بس بہن کچھ نہ پوچھو ـــــ زمانہ خراب ہے۔ آج کل تو اپنی عزت بچا کر رکھنا ہی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں ـــــ خدا کی پناہ ـــــ" ایک خاتون نے بھی سانس چھوڑ کر تبصرہ کیا۔

اور پھر باقاعدہ گفتگو کا رخ ساس اور نند کی طرف مڑ گیا۔ بوڑھی عورتوں نے بہوؤں کے بڑے نکالنے شروع کر دیئے ـــــ اور جوان عورتیں ساسوں کے بخیئے ادھیڑنے لگیں ایسے ایسے دل خراش اور سمع خراش واقعات بیان کرنے لگیں کہ بیٹھے بیٹھے نیا کا سر چکرانے لگا۔

خداوندا! یہ کون سا موقع ہے۔ ان بھیانک وارداتوں کو بیان کرنے کا۔ بجائے اس کے خوشی کے موقع پہ کوئی خوشی کی بات کریں ـــــ یہ زیوروں اور کپڑوں سے لدی ہوئی عورتیں، مگر کے تلخ حقائق کو کتنا مکروہ بنا کر پیش کر رہی ہیں۔

اس کے من میں کلیوں اور تاروں سے سجی ہوئی ایک شرمیلی اور گنگناتی ہوئی رات اتر رہی تھی اس رات کے سوا نہ وہ کوئی بات سننا چاہتی تھی اور نہ کچھ اور سوچنا چاہتی تھی ـــــ

وقت کے پل صراط پر چلتی چلتی آج وہ چاند کی نگری میں پہنچ گئی تھی۔ اب اس نور نور وا
داخل ہونا تھا ——

وہ باہر ٹھٹھک گئی تھی —— دروازہ کھلا تھا۔ مگر اس نگری میں داخل ہونے کے کچھ
ہیں ——

یہ سوچ کر اس کا دل دھڑک اٹھا ——

پیچھے مڑ کر دیکھتی تو یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ کہکشاں پر چلتی آ رہی ہے ——

پوری روش ستاروں سے جگمگا رہی تھی ——

اور آگے اتنا بڑا چاند سے بھرا طشت جگمگا رہا تھا۔

یہ سہاگ رات کی روشنی تھی!

سہاگ رات!

سہاگ رات کے ساتھ دنیا بھر کی خوشیوں اور دلکشیوں کا تصوّر وابستہ ہو جاتا ہے۔

اس رات کو خوشیوں کی ابتداء اور انتہا کی رات کہا جاتا ہے۔

ہر لڑکی کے ذہن کا خوب صورت ترین خانہ اس رات کے تصوّر سے آباد ہوتا ہے۔

لڑکی سوتے وقت دل کے آنگن پر سہاگ رات کا چاند اتارتی ہے ——

اس کے خوابوں کی جنت سہاگ رات کی خوشبو سے مہکتی رہتی ہے —— اس کو اپنی ہ
عکس اور ہر آرزو کا پتہ سہاگ رات میں ہی ملتا ہے۔

اس لئے جب بات بات پہ اس کا دل دھڑکنا شروع ہوتا ہے —— اور بہاروں کے معط
موسم میں اس کے ذہن اور جسم میں چور دروازے کھل جاتے ہیں ——

اس کا پسینہ مشک دینے لگتا ہے ——

اور آنکھوں میں سوز پیدا ہو جاتا ہے ——

تو وہ ایک البیلے تصوّر کے ساتھ ہی سہاگ رات کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔ شادی اپنی پ
ہو یا والدین کی پسند کی ——

اس رات کے ساتھ سب لڑکیوں کی اکڑنا چاہتی تھی۔ یہ اور حسین ترین توقعات وابستہ
ہو جاتی ہیں۔

پتہ نہیں لڑکوں کا کیا حال ہوتا ہو گا۔

کم و بیش انہی حالات سے وہ بھی گزرتے ہوں گے۔

فرق صرف فاتح اور مفتوح کا ہو گا!

نیا کا دل چاہ رہا تھا۔ یہ بے ڈھنگی اور گھسی پٹی عورتیں یہاں سے رخصت ہو جائیں ——

تھوڑی دیر وہ سکون سے آرام کرے ——

اچھی طرح سوچ سمجھ لے ——

اور پرسکون ہو کر ——

نئی رات کو خوش آمدید کہہ سکے۔

مگر ان عورتوں کا وہاں سے اٹھ کر جانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ بلکہ جو بھی دلہن کو دیکھنے آتی وہیں
راجمان ہو جاتی جگہ نہ ہوتی تو یونہی پھنس کر بیٹھ جاتی —— حتیٰ کہ اب تو سب کی سب نیا کے پلنگ
براجمان تھیں ذرا سی بھی جگہ نہ بچی تھی۔

وہ ایسی ندیدی نظروں سے نیا کو دیکھ رہی تھیں۔ جیسے لوگ تکے کباب کی دکانوں پر گرم گرم سیخ
چڑھے تکوں کو دیکھ کر زبان ہونٹوں پر پھیرتے جاتے ہیں۔

بیچ بیچ میں سے کوئی ستم ظریف نیا کے ساتھ کوئی تکنہ سا مذاق بھی کر دیتی جس کی نیا کو بالکل
سمجھ نہ آتی پھر وہ آپس میں ہی کھی کھی کر کے ہنسنے لگتیں کنواری لڑکیاں خواہ مخواہ شرمانے کی ایکٹنگ
کرتیں مگر مجال ہے جو اٹھ کر باہر چلی جائیں۔

نیا سیج میچ تھک گئی تھی۔

کسی وقت ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ بارے —— کسی نے

آکر کہا باہر کھانا لگ گیا ہے۔ اور عورتیں باہر تشریف لے جائیں ——

پھر تو سب یوں اٹھیں جیسے ہوں۔

اپنی بے ہودہ قسم کی خوشبوئیں اور بدبوئیں لے کر جب وہ باہر نکل گئیں تو نیا کی جان میں

اتنے میں اسکی وہی چھپکلی نما نند چند لڑکیوں کے ساتھ آموجود ہوئی۔ ہنستی ہوئی بولی۔

"بھابھی یہ میری سہیلیاں ہیں۔ اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں"۔

نیا نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

وہ سب تزئین سے تیز نہ تھیں۔

تھوڑی دیر انہوں نے نیا پر کچھ اس انداز میں تبصرہ کیا۔

"ہائے اللہ تزئین تمہاری بھابھی تو بڑی سویٹ ہیں ——"

آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں۔

ہونٹ کتنے کیوٹ ہیں۔

بڑی سمارٹ ہیں ——"

بیوٹی فل ہیں۔

یہ رنگ ان کو بہت سوٹ کر رہا ہے۔

جیولری کتنی پیاری ہے۔

میک اَپ ونڈر فل ہے۔

بڑی ماڈرن دکھائی دیتی ہیں تمہاری بھابھی ——

جب ان کے پاس انگریزی کے سب الفاظ ختم ہو گئے تو خاموش ہو گئیں۔ چلو باہر چلتے

تزئین نے کہا تو سب کھڑی ہو گئیں۔

ان کے جاتے ہی دوسری نند نسرین آ گئی۔

بولی۔

"نیا تم کچھ دیر آرام کر لو گی۔ یا کھانا لے آؤں ——"

نیا کو بھوک بالکل نہیں تھی۔ وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔

"تیرا خیال ہے تم کھانا تو شہباز کے ساتھ کھا لینا"

نیا نے شرما کر سر جھکا لیا۔

شکر ہے اس کو نیا کی بات سمجھ میں آ گئی۔ بولی "اچھا تم اب تھوڑا سا آرام کر لو۔ میں عورتوں کو کھانا کھلا دوں"

جاتے جاتے اس نے دروازہ بھی بند کر دیا۔

نیا جلدی سے لیٹ گئی کمر اور کندھے بے حد دکھ رہے تھے ——

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور تصورات میں کھو گئی ——

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔

اس نے ڈر کر آنکھیں کھول دیں اور اٹھ گئی مگر اب یہ حرکت بچے کر رہے تھے۔ کیونکہ بڑے تو سب کھانا کھانے میں مصروف تھے ——

تھوڑی دیر بعد کوئی بچہ یا بچی —— دھکا دے کر اس کے کمرے کا دروازہ کھول دیتا۔ پھر جھانک کر اس کو یوں دیکھتا جیسے چڑیا گھر کا جانور ہو۔ پھر خود ہی کھی کھی کرتے ہوئے اس کا دروازہ بند کر دیتا —— یہ مشق ستم بھی کافی دیر تک جاری رہی مگر اب اس نے پروا نہیں کی اسی طرح چت لیٹی رہی ——

البتہ آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

یہ غالباً اسی کا کمرہ تھا۔

کیونکہ اس میں اس کے جہیز کا سارا سامان پڑا ہوا تھا۔ کل امی نے سارا فرنیچر اور کراکری وغیرہ بھجوا دی تھی کیونکہ یہ لوگ بار بار تقاضا کر رہے تھے کہ انہوں نے دلہن کا کمرہ سجانا ہے —— جو کچھ بھیجنا ہے بھیج دیں۔

اور اب انہوں نے اپنی دانست میں دلہن کا کمرہ سجا دیا تھا۔

جس ڈبل بیڈ پر اس وقت نیا لیٹی تھی وہ اس کے جہیز کا ہی تھا اس کا کھیڑہ سرخ ریشم بنا ہوا تھا اور ویسا ہی سرخ جھالروں والا بیڈ کور اس پر پڑا تھا۔ غالباً یہ بیڈ کور آپا جی عرب سے لائے تھے اور امی نے اب نیا کے جہیز میں دے دیا تھا۔

سامنے اس کا سرخ صوفہ پڑا تھا۔ اس کے ساتھ شیشوں والی سنٹر ٹیبل تھی پھر برتنوں وا میں ساری کراکری ٹھونس کے وہ بھی اسی کمرے میں پھنسا کر رکھ دی تھی ——

کمرہ چھوٹا تو نہیں تھا۔ مگر کچھ زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ اور سٹینگ تو بالکل بے ہودہ تھی۔ لیٹے لیٹے سوچا —— کہ وہ جلد ہی اس کمرے کو اپنی پسند کے مطابق ترتیب دے لے گی اس بالکل کمرے کے وسط میں پڑا تھا —— اور اس کے اوپر صرف مصنوعی پھولوں کی ایک چاد دی گئی تھی۔ یہ ایسا چھپر کھٹ نہیں تھا۔ جیسا فلموں میں دکھایا جاتا ہے —— کیونکہ ہر لڑکی فلمیہ کے بعد ویسا ہی چھپر کھٹ تصور میں لاتی ہے۔

کمرے کے پردے سستے اور پرانے تھے۔ ان لوگوں نے سامان تو سارا اس کا لگا دیا پردے نہیں بدلے تھے۔

نیا کے خیال کے مطابق اس کمرے کو سجا ہوا کمرہ بالکل نہیں کہتے ——

مگر اس نے دل میں سوچا —— کہ یہ لوگ کم پڑھے لکھے ہیں۔ مالی وسائل بھی زیادہ نہیں ہیں سمجھ ہے اس کے مطابق انہوں نے سجا دیا ہے —— اب وہ خود ان سب کو عقل سکھائے

نے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

غالباً عورتیں کھانا کھا کر رخصت ہو رہی تھیں۔ کیونکہ باہر شور اور ہنگامہ کم ہو رہا تھا

اتنے میں اس کی ساس اندر آ گئی۔

نیا جلدی سے احتراماً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ہنستی ہوئی ساس اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور بولی۔

"تمہیں بھی کسی نے کھانا کھلایا یا نہیں۔؟ میں نے نسرین کے ذمے لگا دیا تھا۔" نیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ سر جھکا لیا —— حقیقتاً وہ شہباز کے ساتھ کھانا کھانا چاہتی تھی۔

مگر اس کی مشکل اس کی نند کوکب نے آ کر حل کر دی۔

بولی۔ امی آپا نے کہا تھا کہ نیا بھیا کے ساتھ کھانا کھائے گی۔"

"اور سنو ——" اس کی ساس کھڑی ہو گئی۔ "شہباز نے تو کھانا کھا بھی لیا ہے۔"

"کب ——؟" وہ بولی

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تیرے ماموں جان جا رہے تھے۔ میں نے شہباز کو ان کے ساتھ بٹھا کر کھلا دیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ دلہن نے ابھی اندر کھانا کھا لیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں پھر میں بھی بھابھی کے لئے کھانا لاتی ہوں"

دونوں ماں بیٹی باہر نکل گئیں۔

تھوڑی دیر میں کوکب نے کھانا لا کر میز پر رکھ دیا۔ کھانے کی خوشبو سارے کمرے میں پھیل گئی مگر پھر بھی نیا کی بھوک نہ جاگی شاید اسے شہباز کے ساتھ کھانا نہ کھا سکنے کا افسوس تھا ——

بہر حال وہ خاموش بیٹھی رہی —— نہ کسی نے بار بار کھانے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد کوکب پھر آئی اور بولی ——

"بھابھی آپ کے رات کے کپڑے کس صندوق میں ہیں؟"

بھلا اسے کیا پتہ تھا۔

بہر حال وہ سب بہنیں سب صندوق کھول کر ادھر ادھر ہاتھ مارتی رہیں۔ بالآخر اس کا نائٹ سوٹ نکال کر لے آئیں۔

اور بولیں۔

"اٹھ کر کپڑے بدل لو۔"

نیا کو بڑی حیرت ہوئی۔ ابھی تو اس کی پھپھی اور بانکپن کو اس کے دولہا نے دیکھا ہی نہیں تھا۔

اور یہ بے وقوف لڑکیاں اسے کپڑے بدلنے کو کہہ رہی تھیں۔

اسے خاموش دیکھ کر سب باہر نکل گئیں۔

نیّا اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔

وہاں اس نے آئینہ دیکھا ـــــ رونے سے کاجل پھیل گیا تھا۔

باہر آکر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی ہو گئی۔ شکر ہے کوئی اندر نہیں آیا اس نے بڑی چابک دستی سے اپنا میک اپ درست کیا۔ چہرے کو پھر سنوارا ـــــ اپنی نتھ ٹھیک کی اور پھر آکر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔

باہر خاموشی ہو گئی تھی۔ شاید سب عورتیں چلی گئی تھیں اور اسی وقت دروازہ کھلا۔ اور... شہباز اندر داخل ہوا۔

نیّا کی نظر پہلے اس کے پاؤں پر پڑی ـــــ سنہری سلیم شاہی جوتا ـــــ اور اس پر تنگ پاجا ـــــ اس کے اوپر زرتار اچکن ـــــ بس نیچی نظروں سے نیّا اتنا ہی دیکھ سکی۔

اس کی آمد سے نیّا کا دل ایک دم دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا اگر اس نے دونوں ہاتھوں سے دل کو پکڑ نہ لیا تو پسلیاں توڑ کر باہر نکل جائے گا ـــــ

وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ بڑی بہادر لڑکی ہے اور اس نے سوچ رکھا تھا کہ شہباز کو اپنے پر بالکل حاوی نہ ہونے دے گی لیکن صرف اس کے اندر قدم رکھنے سے ہی اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے ـــــ

اس کا ننھا سا کچی کلی کی مانند دل۔ یوں بج رہا تھا۔ جیسے جسم کے اندر کسی نے سارنگی رکھ دی ہو۔ کیا یہی وہ لمحے تھے جن کا تصور ایک لڑکی زندگی بھر کرتی ہے۔ اور پھر یہ لمحے اتنے جاوداں ہو جاتے ہیں۔ تاعمر لو دیتے رہتے ہیں۔ شہباز نے اندر داخل ہو کر آہستہ سے دروازے کی کنڈی لگا لی تھی۔ اور پھر مڑ کر نیّا کی طرف دیکھا۔

نیّا نے سر اتنا جھکا لیا تھا کہ خود بخود گھونگٹ لمبا ہو گیا۔ شہباز نے دھیرے دھیرے نیّا کی طرف بڑھائے۔ شہباز یہ سب کچھ بڑے سکون سے کر رہا تھا تب نیّا کو احساس ہوا کہ وہ اپنی تمام تر نت اور ہوشیاری کے باوجود ایک بزدل لڑکی تھی اور شہباز بہر حال مرد تھا ـــــ

مرد تو مرد ہوتا ہے۔

اور زندگی کے ہر موڑ پر اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شہباز آہستہ آہستہ چلتا آیا اور آکر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ پلنگ پر کیا بیٹھا۔ نیّا کو ایسے لگا جیسے اس کی شریانوں میں زلزلہ آگیا ہے۔ صرف اس کے بیٹھنے کے احساس نے ہی اس کے دورانِ خون کو تیز کر دیا۔

آج پہلی بار اس کا دولہا.... سیج پر آکر بیٹھا تھا۔ آج کا ہر لمحہ ـــــ سونے کی روشنائی اور چاندی قلم سے لکھنے کے قابل تھا۔ ہر لمحے کی بھاری قیمت تھی اور ہر لمحہ دل میں اتر رہا تھا۔

شہباز ابھی بیٹھا ہی تھا کہ باہر سے دروازہ پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ان آوازوں نے احساس اس خوبصورت تانے بانے کو ایک دم ہلا کر رکھ دیا نیا کو بہت ناگوار گزرا۔

شہباز جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ دوڑ کر دروازہ کھولا۔ باہر اس کی ماں کھڑی تھی۔ نہ معذرت نہ کچھ۔ اندر آگئی۔ ہاتھ میں دودھ کا جگ اور شیشے کا گلاس تھا بولی۔

"دلہن بے چاری نے کچھ کھایا بھی نہیں۔ کھانا بھی ویسے ہی رکھا ہے۔ میں نے سوچا گرم دھ ہی اندر رکھ دوں تھکی ہوئی ہے ایک گلاس پی لے گی تو ذرا سکون مل جائے گا۔" شہباز ے اس کے ہاتھ سے دودھ کا جگ اور گلاس لے کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ مگر خاموش رہا۔

اس کی ماں نے چاروں طرف کمرے میں نظر دوڑائی۔ بے مقصد ادھر ادھر دیکھا۔ پھر آکر نیّا کا گھونگٹ اٹھا کر پیار کیا اور بولی

"اتنا سر جھکا کر بیٹھو گی تو تھک جاؤ گی۔"

اس کے بعد یونہی بلاوجہ کھڑی رہی شہباز دروازے کے پاس کھڑا رہا اور نیّا سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"اچھا اب تم دونوں آرام کرو۔" جیسے اس نے بادلِ نخواستہ کہا اور باہر نکل گئی۔ شہبا
کنڈی لگالی اور کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ شاید انتظار میں ہوگا کہ اب کسی نے دروازہ کھٹکھٹا
کھٹکھٹائے۔ بالآخر پھر آکر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

نیا کے کان اس فقرے کے منتظر تھے۔ جو شہباز پہلے پہل اس سے کہے گا۔ شاہ
پہلا فقرہ انوکھا نرالا۔ اور کانوں میں رس گھولنے والا سننا چاہتی ہے۔

اور شاید ہر لڑکا۔ اپنا تمام تر زورِ بیان پہلے فقرے کی ساخت اور ادائیگی پر لگا دیتا ہے
شہباز ان آدمیوں سے نہیں تھا۔ بستر پر بیٹھ گیا اور کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

شاید وہ عین وقت پر کوئی فقرہ سوچ رہا تھا اور جب کوئی موزوں بات یاد نہیں آئی
صاف کر کے بولا۔

"امی جان ٹھیک کہتی ہیں جھکے جھکے آپ کی گردن تھک جائے گی۔ ٹھیک ہو کر بیٹھ

واہ — نیا نے ہنس کر سوچا۔ کیا بات کی ہے — اس کے کان جو پہلا فقرہ سننے
لئے دل بن گئے تھے۔ ڈھیلے ہو گئے۔ نیا نے اپنا سر اور بھی جھکا کر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

شہباز ہنس پڑا۔

"تو گویا مجھے ہی آپ کا سر اوپر اٹھانا پڑے گا۔"

"پاگل"، نیا نے ہنس کر سوچا "تو کیا میں خود اپنا سر اوپر اٹھاؤں گی۔"

شہباز نے آہستہ سے اس کا دوپٹہ اوپر سرکایا اور پھر ڈرتے ڈرتے اس کو دونوں کند
سے پکڑ کر اونچا کیا۔ گو کندھوں پر اس کے ہاتھوں کا دباؤ بہت نرم تھا۔ مگر نیا اس کے پہلی بار
سے سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ یوں جیسے اس کے اعصاب میں گدگدی سی ہو گئی۔ لیکن ا
سر اٹھانے میں ضد نہیں دکھائی۔

وہ جان گئی تھی کہ شہباز جانباز نہیں ہے — وہ اس کے انکار پر اصرار نہیں کرے گا
اور بھی شرمائے گا۔ اس لئے جب اس نے سر اٹھایا تو نیا سر اٹھاتی چلی گئی۔ کیونکہ اس کے خیا

بازو پر بجلی گرا دینا ہی بہتر تھا۔

اس کا خیال صحیح نکلا۔ کیونکہ جب نیا نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو شہباز مبہوت سا اسے دیکھتا
رہ گیا۔ گول چاند ایسے چہرے پر ہر نقش موزوں اور درست تھا۔ لمبی لمبی سیاہ پلکیں گو بند تھیں
برز رہی تھیں۔ سرخ خم دار ہونٹ بری طرح کانپ رہے تھے۔ اور معطر سانس نازک نتھنوں
ساتھ یوں الجھ رہی تھی۔ جیسے چڑھے چاند کے ساتھ موجوں میں جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا ہو
تی ہے۔

حُسن

شباب

رات

دوشیزگی

خوف

شرارت

خود رعمی

اس کے چہرے پر بیشمار چراغ جل رہے تھے شہباز کے ہاتھ کانپنے لگے دل دھڑکنے لگا۔
لق تشنک ہو گیا۔ تپش اس کی ہمت سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ فیصلے کی قوت اس میں نہیں تھی۔

یہ سب شیشے کے جام تھے۔ جنہیں ایک ایک گھونٹ میں وہ توڑ سکتا تھا۔ پھر ساری رات
ر ساری راحت اس کی اپنی لیکن بڑھ کر جام اٹھانا بھی تو بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ناتجربہ کار آدمی
جب پہلے پہل میخانے میں گھستا ہے تو اسی طرح بوکھلا جاتا ہے۔ پہلا جام کس شئے کا مانگے اور
کیسے پیئے۔ بعض اوقات اسی سوچ میں رات گزار دیتا ہے۔ شہباز کو اتنا تو معلوم تھا کہ ایسی
غلطی آج رات نہیں کرنی۔ مگر پھر بھی پورا میکدہ لوٹنے کے لئے پہلے چھوٹے چھوٹے جام خالی کرنا
ضروری تھے۔ شہباز اپنی پوری ہمت مجتمع کرنے لگا۔

وہ گفتگو کا شہنشاہ نہیں تھا۔ ہمیشہ سے کم گو تھا۔ ورنہ گفتگو کی چاندماری ہمیشہ ٹھیک ٹھیک نشانے پر لگاتی ہے۔ بات بڑھتے بڑھتے جوانی کے قفل کھول دیتی ہے۔

ہاں اسے معلوم تھا کہ پہل اسی کو کرنا ہے۔

کیونکہ وہ مرد تھا۔ جانے پہل کی رسم کس نے ڈالی تھی؟ کیونکہ محبت تو درجہ بندی سے پرے ہوتی ہے۔ مگر اس رسم کو مرد نے اپنے وقار کا سوال ضرور بنا لیا تھا۔

نیا جان گئی تھی کہ شہباز سر سے لے کر پاؤں تک کانپ رہا ہے۔ اس لئے آج کی رات اسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ بالآخر بڑی مشکل سے وہ اپنی قوتِ گویائی کو جمع کر کے بولا۔

"مجھے امّی اور بہنوں نے بتایا تھا کہ تم چاند کا ٹکڑا ہو۔ مگر۔۔۔۔" وہ پھر لڑکھڑایا۔ مجھے اپنی قسمت پر اعتبار نہیں آتا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر جھکا۔ نیا نے کمال چابکدستی سے اپنا سر پرے ہٹا کر دوبارہ اپنا چہرہ گھٹنوں پر رکھ لیا۔

وہ اسے پہلی مات دے چکی تھی اور اب اندر ہی اندر مسکرا رہی تھی۔ بلکہ اسے لطف آ رہا تھا۔ خوب صورت عورت کو ہر بار اپنے حسن کی تعریف سننے میں مزہ آتا ہے۔ مگر شادی کی پہلی رات تو بدصورت سے بدصورت لڑکی بھی اپنے دولہا کے منہ سے اپنے حسنِ فتنہ ساماں کا قصیدہ ہی سننا چاہتی ہے۔ تبھی تو بناؤ سنگھار، زیور کپڑے کی کمک سے بھرپور حملہ کیا جاتا ہے۔

نیا کو اطمینان ہو گیا ——— اس کا حسن کام کر گیا تھا۔

اب تمام شب اسے بسمل کا تماشہ دیکھنا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی۔ دل ٹھیک ٹھاک انداز میں رواں ہو گیا۔

شہباز نے دوبارہ نیا کا سر اٹھایا تو اب نیا کی آنکھیں کھلی تھیں۔ بند آنکھوں کا اپنا حسن ہوتا ہے مگر کھلی آنکھیں، جن سے کیف ہی کیف چھلک رہا ہو۔ کون پاپی بچ سکا ہے۔ اسے معلوم تھا اس کی آنکھیں بے حد خوب صورت ہیں۔ اس واسطے اس نے دوسرا تیر اپنی آنکھوں سے چلایا۔ جو سیدھا شہباز کے جگر کے پار اترا۔

رقیب نے ابھی اف بھی نہیں کی تھی کہ نیا نے باقاعدہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

ایک لمحے کو وہ دونوں جیسے بجلی کے تاروں کی گرفت میں آ گئے۔ جس طرح وائرلیس پر جلدی جلدی بولتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے ایک دوسرے کے دلی پیغام وصول کر لئے ——— اور ہنس پڑے۔ ہنس کر سر جھکا لیا۔ اور شہباز نے ہنس کر ہار مان لی۔ تب اسے اچانک خیال آیا کہ اس نے ابھی رات کا تحفہ ہی نہیں دیا اپنی دلہن کو ———

جلدی سے اچکن کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سنہری ڈبیا نکال لی۔ اپنی ساری پونجی جوڑ کر نیا کے لئے ہیرے کی انگوٹھی لی تھی۔ سفید سفید انگوٹھی کے وسط میں دو خوبصورت اور نازک ہیرے جڑے تھے۔ ڈبی کھول کر اس نے انگوٹھی نکالی اور بڑے پیار سے نیا کو پیش کی۔

نیا کے دونوں ہاتھ انگوٹھیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا پھر انگوٹھی کی طرف دیکھا، پھر شہباز کی طرف دیکھا ——— شہباز کا انگوٹھی والا ہاتھ کانپ رہا تھا اور اس کی طرح نیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نیا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی تیسری انگلی میں سے انگوٹھی اتار دی اور اپنا ہاتھ شہباز کے آگے کر دیا۔ شہباز سودائی کو سمجھ آئی کہ انگوٹھی اس کو خود پہنانا تھا۔

اس نے جلدی سے نیا کی صرف انگلی پکڑی اور اس میں انگوٹھی ڈال دی۔ ایک انگلی پکڑنے سے دل کو کرنٹ لگ گیا۔ نیا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

نیا ———" وہ والہانہ پن سے بولا۔ "تمہارے لائق تو دنیا میں کوئی تحفہ نہیں ہے۔ تم میری آرزو کی سختی سے بڑھ کر ہو۔ تمہارے قدموں میں اپنا دل پیش کرتا ہوں۔"

نیا نے مسکرا کر پھر اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ ہاں اب ہوا ہے۔ فلمی ڈائیلاگ ———

اس نے دل میں سوچا۔

پہلی رات آدمی کو دل پیش کرنا ہوتا ہے ——— اور عورت کو جسم ———

دونوں اپنی اپنی جگہ ڈٹ کر میدان میں اترتے ہیں۔

شہباز نے اپنی دانست میں اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ اب اس کی لغت میں [illegible] ختم ہو گئے تھے۔

اِدھر اُدھر کمرے میں دیکھنے لگا۔ پھر بولا "ہاں تم نے تو ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ کھایا؟"

نیّا چپ رہی ——

"میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتا ہوں"

وہ اُٹھ کر دور پڑی میز کے قریب گیا۔ ایک پلیٹ میں چاول ڈالے اُوپر مرغ کی [illegible] اور لے آیا۔

نیّا سر اٹھائے بیٹھی تھی۔ اس نے چاول سے چمچ بھر کر جب اس کے منہ کے قریب [illegible] شرما کر بولی۔

"پہلے آپ ——" مسکراتے ہوئے شہباز نے وہ چمچ اپنے منہ میں ڈال لیا۔

اسی طرح وہ اسے کھانا کھلاتا رہا —— ایک چمچ اپنے منہ میں اور ایک اس کے منہ [illegible] جلدی میں اس نے "بس" کہہ دیا۔ پھر پانی کا گلاس بھر کر لایا۔ وہ بھی اس نے نیّا کو اپنے ہاتھ [illegible] اس کام میں بے تکلفی بھی کافی ہو گئی۔ اور اس میں ہمت بھی پیدا ہو گئی۔ نیّا نے اس دولا [illegible] اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ زرتار اچکن میں وہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا! اونچا لمبا اکھرے [illegible] اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اور آج تو ایک سوز بھی تھا۔ جانے کس خیال [illegible] کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جیسے واقعی اس نے پی رکھی ہو —— یا شاید نیّا کے سرخ [illegible] اس کی آنکھوں میں اتر رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ہونٹ گہرے گلابی ہو رہے تھے۔ ان [illegible] کا ہر نقش گویا ایک اَن دیکھی آگ میں جل رہا تھا۔

تب نیّا کو احساس ہوا کہ شادی کے دن دلہن پر ہی نہیں۔ دولہا پر بھی روپ آتا ہے [illegible] اسے شہباز اپنے ہر تصوّر سے پیارا لگ رہا تھا۔ خدا جانے شہباز کو بھی اس بات کا [illegible]

[illegible]یں۔

اس کا دل چاہا وہ بھی شہباز کی تعریف کرے۔ اور کہے ——

"شہباز! تم آج اتنے پیارے دولہا لگ رہے ہو۔ کہ دل چاہ رہا ہے۔ تمہیں نظروں کے پیالے [illegible] رکھ کے پی جاؤں"

مگر —— وہ چونک گئی۔ ہمارے رسم و رواج دلہن کو یہ بات کہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ [illegible] بے شرم سمجھی جاتی ہے۔ اور شاید آوارہ بھی۔ اس رات کے تمام حقوق —— یہ معاشرہ صرف مرد [illegible] دے دیتا ہے۔ ظلم ہے نا یہ ——

شہباز کھڑا ہو گیا۔

اس نے اپنی اچکن اتار کر پلنگ کے کٹہرے پر لٹکا دی۔ اچکن کے نیچے اس نے سفید کرتا پہنا ہوا [illegible] کرتے کے دو بٹن اس نے کھول دیئے۔ اس کی صحت مند چھاتی نظر آنے لگی۔ جس کے اندر اس کا [illegible] قرار دل دھڑک رہا تھا۔

پھر وہ واپس آ کر نیّا کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ اتنے قریب کہ نیّا کو اختلاج ہونے لگا۔ وہ ذرا پرے [illegible] سک گئی۔

وہ مسکرا کر پھر قریب ہو گیا۔ نیّا ہنس کر پھر پرے ہو گئی۔

تیسری بار جب نیا پھر پیچھے ہٹی تو ——

شہباز نے ہمت کر کے اپنے دونوں جلتے ہوئے ہاتھ اس کے ٹھنڈے برف ہاتھوں پر رکھ [illegible] یئے ہنس کر بولا۔

"اب پلنگ ختم ہو گیا ہے ——"

نیّا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ واقعی وہ پیچھے ہٹتی —— تو نیچے گر جاتی۔ اس نے دوپٹے کی [illegible] ٹ میں چہرہ چھپا لیا۔

تھوڑی دیر شہباز اپنے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ . . . . پھر اس کے ہاتھوں

کی گرفت نیا کے ہاتھوں پر سخت ہونے لگی ـــــ حتیٰ کہ نیا کے دونوں ہاتھ مکمل
ہاتھوں میں آ گئے ـــــ نیا کے ہاتھ ایسے تھے جیسے ریشم کے لچھے ہوں۔ گو
انگلیاں جو مہندی سے لالہ زار بنی ہوئی تھیں۔

وہ والہانہ پن سے ان ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور انہیں مسل رہا تھا ـــــ
سے دھڑکنے لگا ـــــ

ہر بار اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کہیں کوئی کرنٹ لگا ہے۔

مگر تھوڑی دیر کے لئے دونوں کی زبان گنگ ہو گئی ـــ کبھی کبھی ـــ
پراسرار سی خاموشی چھا جاتی ہے ـــــ

جب ان کا رواں رواں اتنا ہوش مند ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی ذرا ذرا سی
زبان سمجھنے لگ جاتا ہے۔

ایک سنتا ہے دوسرا کہتا ہے ـــ ایک کہتا ہے دوسرا سنتا ہے۔

دو دلوں کے درمیان جب تک ایسی خاموشی کے پڑاؤ نہ ہوں ـــ تو دو
کی زبان سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ ان کہی کہانیاں اور محسوسات کے پھول ایک
نہیں بھیج سکتے۔

جب چاروں طرف جذبے ہی جذبے ہوں ـــ طلب ہو ـــ مسرت ہو
تو وہ کیا کریں؟ وادیٔ شوق کو پار کرنے کی اجازت طلب کرنا عشق کی ریت نہیں ـــ

نیا کو امید تھی ـــ پہلے وہ بے شمار باتیں کریں گے۔ زندگی کی سب کہانیاں کہ
یہ کہیں گے ـــ وہ کہیں گے ـــ مگر اب اچانک ـــ بالکل اچانک ـــ

پوری کی پوری رات شہباز کے ہاتھوں میں آ کر اٹک گئی تھی۔

شہباز کے خوب صورت اور مردانہ ہاتھ برابر کانپ رہے تھے۔ مگر کسی کمزور
محبت کے پیمانے چھلکنے کو تھے اور سنبھالنا اس کے لئے دشوار ہو گیا تھا۔

سماجت اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی ـــ اس کا دل اس کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تھا۔
پوری داستان بن گئی تھی ـــ وہ اس کے پیغام اچھی طرح سمجھ رہی تھی ـــ
گویا اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ حلق میں اس کی سانس اٹک جائے گی ـــ مگر جیسے آج
رہا تھا کہ یہ سانس حلق میں اٹک جائے ـــ یہ لمحے ابدی ہو جائیں۔

پوری کی پوری رات ان کی جھولی میں آ گری تھی۔

ہر لحظہ شہباز کے ہاتھوں کی گرمی بڑھ رہی تھی ـــ اور گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔

نیا کو پہلی بار محسوس ہوا کہ یہ ایک مرد کے ہاتھ کی گرفت ہے۔

ایک گرفت کے پیچھے ایک پورا مرد ہوتا ہے ـــ یہ گرفت ایک پیغام ہوتی ہے ـــ
مکمل جذبے کا ـــ اور اس پیغام سے منہ موڑنا اس کے اختیار میں نہ رہا تھا ـــ جیسے اس
کا موم جسم کو کسی نے آگ کے قریب رکھ دیا ہو۔

آگ بہت قریب ہو تو موم ایک ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔

بھڑ بھڑ..... دھڑ..... دھڑ..... بھڑ بھڑ.....

اس کی گرفت کا پیغام وصول کرتے ہی اس کا سارا وجود ..... جیسے لاؤ کی لپیٹ میں آ گیا۔

دھڑ دھڑ۔۔۔۔۔ دھڑ دھڑ۔۔۔۔۔ دھڑ دھڑ۔۔۔۔۔ نیند میں جیسے انہوں نے
کی آواز سن لی۔ دونوں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے ـــــ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر کمرے کا
تو پتہ چلا وہ تو حجلۂ عروسی میں بیٹھے ہیں۔
واہ کتنی خوبصورت نیند تھی۔؟
نیند تھی یا مدہوشی تھی۔؟
اسے مدہوشی ہی کہتے ہوں گے۔ نیند میں تو خواب ہی خواب آتے ہیں مدہوشی تو مجسم خواب
ہے۔ جب ذہن اور جسم ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ان دونوں
لئے اس نیند کا تجربہ پہلا تھا۔
اور کون ظالم انہیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔
دروازہ اب بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پیٹا جا رہا تھا۔
شہباز اپنی مدھ بھری انگڑائی کا پوری طرح مزہ بھی نہیں لے سکا تھا کہ چھلانگ لگا کے پلنگ
نیچے اتر گیا اور جھٹ دروازہ کھول بھی دیا۔ نیا بوکھلا گئی۔ اس نے ابھی اپنا حلیہ بھی ٹھیک نہیں کیا
نیند سے بوجھل پپوٹوں کو زبردستی کھول کر دوپٹہ اپنا سُرخ ڈریسنگ گاؤن اٹھا لیا اور جلدی

گھس گئی اور پھر اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی اس کا خیال تھا کوئی اندر نہیں آئے گا۔
انہیں تیار ہونے کا موقع دیا جائے گا۔
مگر دروازہ کھلتے ہی اس کی بنی ٹھنی ساس اندر آ گئی۔ شہباز تو جلدی سے غسل خانے میں گھس
یا۔ نیا خمیازی رہ گئی۔ وہ بھی کمر پہ ہاتھ رکھے آ کر نیا کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ نیا نے ہاتھ اٹھا کر اسے
لام کیا۔ جس کے جواب میں اس نے آہستہ سے کہا۔ "جیتی رہو!" نیا کو اس قدر شرم آ رہی تھی کہ
ان سے باہر ہے۔ بھلا شبِ عروسی کے بعد کبھی ساس بھی جگانے آتی ہے۔ کسی لڑکی کو ہی بھیج
ا ہوتا۔؟ اس کی ساس غسل خانے کی طرف منہ کر کے اونچی آواز میں بولی۔
"آٹھ بج گئے ہیں۔ برادری اکٹھا ہونا شروع ہو گئی۔ اور دولہا دلہن گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔"
صرف آٹھ بجے ہیں ـــــ!
نیا کو دل میں بہت غصہ آیا۔ اس نے سمجھا تھا۔ شاید دوپہر کے بارہ بج گئے ہیں جو اس طرح دروازہ
ڑ دھڑایا جا رہا ہے۔
بہرحال یہ خاتونِ محترم باہر تشریف لے جاتیں تو وہ اٹھ کر اپنے کپڑے ٹھیک کرتی۔ بستر درست کرتی۔
رکی سکیں خود بخود رات کی کہانی دہرا رہی تھیں اور اس کی ساس اسی کے سر پہ کھڑی، کبھی بستر کو اور
ی نیا کو اس طرح گھور رہی تھی جیسے سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمے نے سراغرسانی کے لئے بھیجا ہو۔
نیا اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنسائے، سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سارے کمرے
ایک خوب صورت سی سہاگ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ـــــ پھول، عطر اور شاید کُندن ایسے جسم
مہک آپس میں غلط ملط ہو گئی تھی۔ نیا کو اپنے ہاتھوں اور باتوں سے بڑی پیاری خوشبو آ رہی تھی۔
لمبی لٹیں اس کے گلے میں جھول رہی تھیں اور ان لٹوں میں سے کبھی کبھی شہباز کی مہک بھی آنے
ن۔
واہ ایک ہی رات میں زلفوں نے اس کی خوشبو چرا لی تھی۔ وہ ابھی تک مدہوش ہوتی جا رہی تھی۔
کی ساس نے بڑھ کر بتی جلا دی۔ کمرہ اور بے باک ہو گیا۔ نیا کی گردن بالکل جھک گئی ـــــ

نہ معلوم وہ کیوں کھڑی تھی ـــــ اِدھر اُدھر کیا تلاش کرتی رہی۔

"شکر ہے خدا کا" ساس نے اطمینان کی سانس لی۔ "بیٹی اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔ میں نائی

ہوں" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

نیّا نے جلدی سے اٹھ کر اپنا بستر ٹھیک کیا اور اس پر وہی سرخ بیڈ کور ڈال دیا

بستر ہوتا ہے۔ کسی طرح اس کی تو زبان بند کر دی جائے۔

اور دوسرا چغل خور ـــــ نیّا بال سمیٹتی ہوئی قدِ آدم آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی۔

دوسرا چغل خور چہرہ ہوتا ہے۔ وہ زور سے ہنس پڑی۔ کیسا نکھرا نکھرا چہرہ تھا۔ جیسے

بعد گلاب ـــــ

ساون کی پہلی بارش کے بعد جیسے چکا چوند دھوپ نکل آتی ہے ـــ یا ـــ

بادلوں کی قبا پھاڑ کر ننگ دھڑنگ باہر نکل آتا ہے۔ آج اس حسین چہرے پر ہر

کھا رہی تھی۔

نور ہی نور تھا۔

کیف ہی کیف تھا۔

سوجی سوجی آنکھوں نے شرابِ وصل پی تھی۔ اس لئے پوری طرح کھل نہ رہی تھ

کنوارے کورے ہونٹ اپنا صلہ پا چکے تھے۔ اس واسطے بہکے جاتے تھے۔

کیا ہو جاتی ہے لڑکی ایک ہی رات میں ـــــ

ایک رات کی فصیل پھاند کر وہ دنیا کے دوسرے کنارے پر پہنچ جاتی ہے۔

بس ـــــ

یہ ہوتی ہے سہاگ رات۔؟

اس نے مسکرا کر آئینے میں دیکھا۔

جی ہاں یہی ہوتی ہے سہاگ رات۔

آئینے نے جواب دیا۔!

ذرا اپنا آج کا جوبن دیکھو۔ اپنی جوانی کا نکھار دیکھو ـــ سنگھار اور زیور سے بے نیاز چہرے

یہو۔ آج فرشتے بھی اس چہرے کی تاب نہیں لا سکتے۔ چہرہ ہے یا کہر آلود سبزہ زاروں میں چمکتا

سورج۔!

اونہہ ـــ کیا ہوا ہے ـــ نیّا پھر ہنسی۔

پگلی! شیشہ بھی ہنسنے لگا۔

عورت پگلی ہوتی ہے ..... ہاں پگلی ہی ہوتی ہے۔ اپنی سب سے قیمتی شے لٹا کر مسرور

ہے۔ سب سے قیمتی تحفہ۔ سب سے کم اعتبار والے رشتے کو سونپ کر مطمئن ہو جاتی ہے

ب زنی کی پہلی واردات ہے۔ جو عورت کو بہت اچھی لگتی ہے۔ جس کے لٹنے کا عورت ماتم

لرتی۔ بلکہ شادیانے بجاتی ہے۔

سہاگ رات کی بازی جیتنے کے لئے عورت کے پاس سب سے قیمتی پتا ہوتا ہے۔ لیکن

ست ہوتا ہے۔

بیخ تک بساط الٹ جاتی ہے ـــــ

سب سے قیمتی پتا مرد کے پاس چلا جاتا ہے۔

ر زندگی بھر عورت تہی دامن رہتی ہے۔

ردہ یہ بازی خوشی خوشی ہار جاتی ہے۔ اسے اپنی جیت سمجھ کر"

ی لئے تو میں کہتا ہوں کہ عورت پگلی ہوتی ہے"

نہہ ـــــ

اُس نے اپنے معطر معطر بالوں کو زور سے جھٹکا ـــ پھولوں کی پتیاں ابھی تک ان میں

ئی تھیں۔

راس کا جوڑا جوڑ دکھ رہا تھا ـــ نس نس نیند کے خمار میں ڈوبی تھی ـــــ

کتنے ستم ظریف ہوتے ہیں لوگ ——

ابھی تو وہ سوئی تھی —— اور ابھی اسے جگا دیا گیا۔

مگر وہ سوئی کب تھی۔ اسے یہ یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔

رات بارہ بجے تو شہباز اندر آیا تھا۔ اور چار بجے انہوں نے بتی بجھائی تھی اور ابھی آٹھ

افوہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔

اتنے میں اس کی نند اندر آ گئی۔ بولی "جھوٹے برتن لے جاؤں ——" نیا نے شرما

میں سر ہلا دیا۔

وہ بھی زیرِ لب مسکراتی ہوئی برتن اٹھانے لگی۔ شکر ہے اس نے کوئی فقرہ چست نہیں

مگر نیا کو خواہ مخواہ ہر شخص سے شرم آ رہی تھی۔

نیا وہیں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اور اپنی انگوٹھیاں اور چوڑیاں اتار کر

لگی۔ نہ جانے آج آئینے کے آگے سے اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ رات کے حسن کو اتنا خو

کہ آج پوری کائنات میں اسے اپنا حسن ہی حسن نظر آ رہا تھا۔ اس نے سب انگوٹھیاں اور

دیں۔ سوائے شہباز والی انگوٹھی کے —— اسے تو اس نے اپنی جان کے ساتھ رکھنے کا

تھا۔ بلکہ شاید مرتے وقت بھی نہیں اتارے گی۔ تو یہ ایک رات میں اتنی محبت ہو جاتی

ہو جاتا ہے۔

آدمی یوں دل دے بیٹھتا ہے۔

اتنے میں غسل خانے کا دروازہ کھلا اور شہباز باہر نکل آیا —— نہا کر اس نے

پہن لیا تھا۔ خوب صورت بال ابھی گیلے تھے۔ اور سر پہ چپکے ہوتے تھے۔ بہت تو دما

خوش باش نظر آ رہا تھا۔ نیا نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ابھی تک وہ

تھی۔ نیا کا دل دھڑک اٹھا۔

نہ جانے دل نے اس انداز میں دھڑکنا ایک ہی رات میں کیسے سیکھ لیا تھا۔ جب

لیتا تو اس کا سارا خون چہرے پر جمع ہو جاتا۔ اس نے اٹھا کر سر جھکا لیا۔ شہباز اس کے قریب آ کر رک

پھر اس نے تولیہ ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اور اپنے ٹھنڈے ہاتھوں کے ساتھ اس کا شرمایا ہوا چہرہ تھام لیا

اسی وقت اس کی ماں دن دن کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

اس کے پیچھے چھوٹی نند ناشتے کی ٹرے اٹھائے داخل ہوئی۔ شہباز نے گھبرا کر نیا کا چہرہ چھوڑ دیا

ڈریسنگ ٹیبل سے کنگھا اٹھا کر اپنے بال ٹھیک کرنے لگا۔ شہباز کی ماں نے میز پوش جھاڑا اور اس پر

تہ لگانے لگی۔ نیا موقع پا کر غسل خانے میں کھسک گئی۔

شہباز جلدی سے بولا۔

"آپا! آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں، میں خود ناشتہ لگا لیتا ہوں" آپا کچھ دیر خاموش رہی۔ اور پھر بولی۔

اے تو کیا کرے گا ——؟ مجھے معلوم ہے۔ تو کیا کر سکتا ہے۔ اور کیا نہیں۔ پرے ہٹ ——

میز یہاں رکھ دوں۔ بس اب جلدی سے تم دونوں ناشتہ کر کے تیار ہو جاؤ —— دلیمے کا بلاوا گیارہ

کا ہے۔ دور دراز کے مہمان جلدی آنا شروع کر دیں گے ——"

اچھا جی ——

شہباز نے کنگھا ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور ناشتے سے بھری ہوئی ٹپائی اپنی ماں کے ہاتھ سے پکڑ

اور خود اٹھا کر پلنگ کے آگے لگا دی۔ اس کی ماں پھر کچھ لینے کے لئے باہر چلی گئی۔

آ کر بولی —— "ہوا بھی تک نہیں نکلی غسل خانے سے"

"ابھی آ جائے گی ——" شہباز نے آہستہ سے کہا۔ وہ پھر باہر نکل گئی۔

شہباز دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔

اسے نیا کے تصور سے ہی نشہ آ رہا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کہ اتنی پیاری

لڑکی سے اس کی شادی ہو جائے گی۔

نیا تو پیار ہی پیار تھی ——

مدھ ہی مدھ تھی ——

سرور ہی سرور تھی ——

اپنی قسمت پر اسے خود ناز ہونے لگا۔ نہ جانے کس بات کا صلہ تھا یہ —— وہ
کے دروازے کی طرف دیکھتا۔ آج اس کا اس کمرے سے باہر جانے کو جی نہیں چاہ
رہا تھا۔ یہیں سے نیا کو بازوؤں پر اٹھا کر کسی اور ہی دنیا میں غائب ہو جاتے ——
رہیں۔ مگر وہ ایک دوسرے میں کھو جائیں۔ فنا ہو جائیں۔ اتنے میں نیا باہر آ گئی۔

شہباز نے والہانہ انداز میں اس کو دیکھا۔ جس طرح لدے ہوئے بادلوں میں بجلی ہو
اسی طرح گیلے گیلے سیاہ بالوں میں اس کا چہرہ ضیا پاشیاں کر رہا تھا۔

شہباز اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو انہوں نے جھٹ ایک دوسر
وصول کر لیا۔ نیا کے جسم میں سر سے پاؤں تک گرم گرم لہر دوڑ گئی۔ وہیں غسل خانے کے با
گئی۔ شہباز کے چہرے پر اتنی دیوانگی تھی کہ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ جانے اب وہ کیا کر بیٹھے گا۔
شکر ہے باہر سے اس کی ساس آ گئی۔

دونوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بڑی لگاوٹ سے بولی۔

آؤ بھئی ناشتہ کر لو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ نیا نے اپنے گیلے بالوں کے گرد تولیہ لپیٹا اور
آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ درمیان میں اس کی ساس بیٹھ گئی۔ اور پرلی طرف شہباز کو بیٹھنا پڑا۔
اس تو بہ شکن کا فر اور ہوشربا قاتل کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلانا چاہتا تھا۔ ایک ایک نو
دس دس بار نثار ہونا چاہتا تھا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔

ماں کے سامنے وہ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ آنکھوں ہی آنکھوں سے
پیتا رہے —— اور اپنی بے قراری کے پیغام بھیجتا رہے۔

ہر نوالے کے ساتھ وہ اس کی طرف اس انداز سے دیکھتا۔ جیسے اس کا دم نکل
اور ہر بار اس کا پیغام پا کر —— نیا دھیرے سے یوں مسکراتی جیسے اس نے اسے کلیجے
ماں کبھی بہو کی طرف دیکھتی اور کبھی بیٹے کی طرف مگر تینوں خاموشی سے ناشتہ کرتے رہے

نی بھوک لگی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ کل سے اس نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ جب ناشتہ ختم
شہباز کی امی نے کوکب کو آواز دی۔ وہ دوڑی آئی۔ بولی۔

اں سے ناشتہ کے برتن اٹھا لو اور آ کر بہو کو دلہن بنا دو۔ لوگ سلامیاں دینا چاہتے ہیں۔" پھر
رف دیکھ کر بولی "تم بھی تیار ہو کر اب ذرا باہر چلے جاؤ۔ دلہن کے پاس تو ساری زندگی بیٹھنا ہے۔ باہر
اموں اور خالو آئے بیٹھے ہیں اور جا کر ذرا ولیمے کا بندوبست دیکھ لو ابھی دوپہر ہو جائے گی لوگ تو
ہو گئے۔ کبھی شادی والے گھر میں بھی کوئی دیر سے اٹھتا ہے"۔

باز سر جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر کھڑا ہو گیا۔ نیا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس
ائی فرمانبردار بیٹا لگ رہا تھا۔ بڑی ہی معصومیت اس کے چہرے پر چھا گئی تھی۔ نیا کو دل ہی
ی آ گئی۔

سے رات کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔

رت بڑے گھنے معلوم ہوتے ہیں۔

ی ساس باہر نکل گئی۔ کوکب اندر آ گئی۔ پھر وہی صندوقوں کی تلاشی شروع ہو گئی۔ کیا پہنیں گی
گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ شہباز نے الماری میں سے اپنا سوٹ نکالا۔ اور کپڑے بدلنے کے لئے غسلخانے
نیا کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آج بھی اچکن پہنے۔ ویسا ہی دولہا لگے۔ جیسا کل لگ رہا تھا۔

جب وہ سوٹ پہن کر باہر آ گیا تو اس نے دیکھا وہ اس دھاریدار سوٹ میں کل سے بھی زیادہ
تھا۔ یہ سوٹ نیا نے اپنی پسند سے اس کے لئے خریدا تھا۔ ٹائی بھی اور جوتا بھی —— تیار ہو
ری نظروں سے نیا کی طرف دیکھا ——

ن نظروں کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

یا کرتی۔ کمرے میں اس وقت اس کی نند کوکب براجمان تھی۔ اور نیا کے نئے عزار اسوٹ
دھیڑ رہی تھی۔ جو اسے آج ولیمے کے روز پہننا تھا۔

انو ہی مڑ کر خوشبو لگانے لگا۔

نیا کا دل چاہا۔ وہ اسپرے اس کے ہاتھ سے لے لے۔ اور اس کے پورے چہرے
چھڑک چھڑک کر آج اسے خوشبو سے نہلا دے۔ شاید اتنی دیر میں شہباز نے کوئی راہ نکال
مڑ کر بولا ——

"کوکب ذرا ایک گلاس پانی تو لا دو"

اچھا کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ وہ جھپٹ کر نیا کی طرف بڑھا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا۔ کہ اس کی
نمودار ہوئی۔ وہ جھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے —— تم ابھی تک نیچے نہیں گئے۔ تیار ہو کر یہیں کھڑے ہو"؟

"وہ .... میں ذرا .... پانی پینا چاہتا تھا۔ اور کوکب پانی لینے گئی ہے"۔ وہ ہکلا

"آؤ میں تمہیں پانی پلاؤں"۔ اس کی ماں اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے گئی۔ وہ بھی جیسے
کے انداز میں چلتا گیا۔ اس کی یہ درگت بنتی دیکھ کر نیا کا دل ہی دل میں خوب لطف آیا۔

وہ جب کپڑے بدل کر آئینے کے آگے سنگھار کر کے لئے بیٹھی۔ تو اس کی نند کو
کے قریب آ گئی اور بڑی دلچسپی سے اسے میک اَپ کرتا ہوا دیکھنے لگی۔ نیا نہ صرف اس گ
سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ بلکہ فیشن کے بارے میں بھی زیادہ جانتی تھی۔ اور نئے زمانے
تقاضے سے آگاہ تھی۔ اس کے جہیز کے کپڑوں سے ہی انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا۔ او
خود سمجھ رہی تھی کہ وہ اندھوں میں کانا راجہ ہے۔ اس نے جب ہاتھوں کو لوشن لگا کے
کیا تو اس کی نند چونک اٹھی ——

پھر اس نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

ذرا رکنا نیا —— یہ تمہارے چہرے پر کیا ہے۔

نیا نے ہاتھ روک لئے۔

اس کو معلوم تھا کہ اس کا چہرہ بے عیب ہے۔ اس واسطے اس نے کوکب کو
دیکھنے دیا۔ کوکب نے اس کے رخسار کو انگلی سے چھو کر بار بار دیکھا۔ اور پھر معنی خیز انداز

یہ پتہ نہیں کیا نشان ہے —— نیلا نیلا ——

نیا نے چھوٹا آئینہ اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر ایک کیف آگیں احساس سے اس کی آنکھیں چھلک
یں۔ نیا نے چور آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی نند بھی مسکرا رہی تھی۔

بے وقوف! نیا نے دل میں کہا۔

کبھی ایسی باتیں واضح انداز میں پوچھتے ہیں! پھر اپنا چہرہ آئینے میں دیکھنے لگی۔

واہ ——

اس نے پوچھا —— چاند گہنا جاتا ہے۔ تو سب کو افسوس ہوتا ہے۔ کیا زمین چاند کے ساتھ
یہی سلوک کرتی ہے۔

ذرا سا داغ ہے اس کے چہرے پر تو لوگ کہتے ہیں۔ افسوس چاند داغدار ہے۔ مگر اس عورت
کو دیکھو۔ جب اس کے چہرے کو گہنایا جاتا ہے۔ داغ داغ کیا جاتا ہے۔ تو خوش ہوتی ہے۔

یہی اس کی خوشی اور تمنا کی انتہا ہوتی ہے۔

یہی اس کی آرزوؤں کا خواب ہوتا ہے۔

یہی جوانی کے خواب کی تعبیر بن جاتا ہے۔

واہ کیا کہنے اس عورت کے ——!

اس نے اپنے رخسار کے داغ پر اپنا خوبصورت ہاتھ رکھ دیا۔ رخسار ابھی تک تپ رہا تھا۔ جیسے اس
میں سے آگ نکل رہی ہو۔ وہ اس وقت آگہی اور انجان پنے کے بیچ کھڑی تھی۔

اتنا کچھ جاننے کو تھا ——

اتنا کچھ کھونے کو تھا ——

اور صرف ایک رات ملی تھی۔

بھئی یہ ایک رات لوگ اتنی اہم کیوں گردانتے ہیں۔؟ کیوں دنیا کی کتابیں اس تعریف میں بھری
پڑی ہیں۔ کیوں ساری شاعری اس رات کے گن گاتی ہے۔

ایک ذرا سی رات ——— !

اور اتنی لمبی تمہید ——— !

اور وہ تو پل میں گزر گئی۔ گزر بھی گئی اور اسے پتہ نہ چلا۔ اس کا خیال تھا۔ سہاگ را
دل میں ہمیشہ کے لئے ٹھہر جاتی ہو گی۔ کبھی نہ ختم ہوتی ہو گی۔

ہاں کچھ کچھ اندر..... احساس زیادہ ہو رہا تھا۔ یہ کیسا احساس تھا ——— جیسے اپنا
شے کہیں گر گئی ہو۔ کوئی پیاری سہیلی بچھڑ گئی ہو ———
قیمتی بُندہ بالوں میں اٹک کر ٹوٹ گیا ہو۔

یا .....

یا .....

کیا یہ احساس زیاں سہاگ رات ہر لڑکی کو ہوتا ہے۔ یا اسے ہی ہو رہا تھا۔!

اس کا اصلی نام تو احمدی بیگم تھا مگر جب وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہائی سکول میں پہنچ گئی تو اس نے اپنا
ں۔ لالہ رخ رکھ لیا۔ تخلص والے اوصاف اس میں قطعی نہیں تھے۔ اردو میں ہمیشہ بیس نمبر لئے۔ اور
ن دانی میں پانچ۔ تبھی اسکول کی لڑکیاں اسے لالہ رخ کی بجائے لال منہ والی کہنے لگیں۔ چہرہ اس کا
رہتا تھا مگر غصے سے

جلدی اس کی شادی ہو گئی۔ جب میاں نے گھر میں لالہ رُخ نہ کہا۔ اور جب نکاح میں لالہ رُخ نہ
گیا۔ تو کسی نے بھی اسے لالہ رُخ نہ کہا۔ سُسرال میں وہ احمدی بیگم بن کر ہی آئی۔ البتہ بعد ازاں اسے
ر نام مل گیا تھا۔ جو اس کے اپنے زورِ بازو کا نتیجہ تھا۔

شوہر کم گو، کم زور، حلیم اور صلح جُو تھا۔ مگر اس کی ساس بڑے دھڑلے کی عورت تھی۔ اس لئے
نے کے مطابق تعلیم یافتہ تھی۔ سمجھ دار تھی۔ دیندار تھی اور اصولوں والی عورت تھی۔ اصول
نت گیر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کبھی کم تر پر سمجھوتہ نہیں کرتا

سو بدزبان، بدسلیقہ، بدباطن اور نیم خواندہ بہو، اور ایک صاف ستھری، علم دوست مگر اصول
اس میں ہمیشہ جنگ رہی۔ اس سرد جنگ کا خمیازہ ایاز احمد خاں کو بھگتنا پڑا کہ نہ بیوی کو چھوڑ
ا نہ ماں سے الگ ہو سکتا تھا۔

تبھی شادی کے فوراً بعد بیمار رہنے لگا۔ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ شہباز
بالکل اپنے ابا پہ تھی۔ بلکہ دادی پہ تھی۔ اس لئے بچپن میں یہ ماں کے عتاب کا نشانہ بنا کرتا تھا
ماں پر تھیں۔ نہ صرف شکل وصورت میں بلکہ عادات وسکنات میں بھی ـــــ ایاز احمد
پٹھان تھے۔ مگر خاں صاحب کہلاتے تھے۔ فوڈ انسپکٹر تھے۔ مگر بیوی کے مجبور کرنے پر
لیتے تھے۔ نہ اس خاندان میں کبھی رشوت کا پیسہ آیا۔ کیونکہ ان کی اماں جان حلال کے کپڑوں
پنجگانہ ادا کرنا چاہتی تھیں۔ اور اپنے بیٹے کو انہوں نے قسم دے رکھی تھی جو اس نے
نبھائی۔ ناپ تول کے گزارا کرنا پڑتا تھا۔ گھر میں ساس کی چلتی تھی۔ اس واسطے احمدی بیگم
شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی احمدی بیگم کی آوازیں سارا محلہ سننے لگ گیا تھا۔ اور محلے
اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی ـــــ ہاں ایک دور اندیشی کی تھی اس کے میاں نے۔ اپنی زندگی
پالیسی خرید لی تھی۔ صرف اسی انداز سے وہ کچھ پس انداز کر رہے تھے۔ جب احمدی بیگم
نفرت کا بھوت سوار ہوتا تو انہیں خوب کوسا کرتیں۔ اور ہاتھ نچا نچا کر کہتیں۔

"اے یہ انشورنس اگر اپنی اماں جان کی خریدی ہوتی تو بات بھی تھی۔ تمہارے مرنے
میں کیا میں زندگی بھر بیٹھی رہوں گی ـــــ نہ بیٹے کو تعلیم دوں گی۔ نہ بیٹیوں کے ڈولے اٹھاؤں
سے کہوں گی میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میرا شوہر مرے گا تو مجھے بھاری رقم ملے گی۔"

"اے لوگو! قہر خدا کا ـــــ اب میں بھری جوانی میں شوہر کے مرنے کی دعا کروں
کرنے کے لئے بیوہ ہونا پسند کروں ـــــ اس کے علاوہ تو میری کوئی خواہش اس
ہیں ہو سکتی۔" اس کی ایسی دلخراش تقریر سن کر ایاز احمد باہر نکل جاتے۔ اور اماں بی
میں گر جاتیں۔

ہر چند وہ جانتی تھیں۔ کہ ـــــ

جواب جاہلاں باشد خموشی!

مگر کہاں تک خاموش رہتیں۔ کبھی کبھی کوئی آہ جواب کی صورت منہ سے نکل ہی

یم دونوں ماں بیٹے کو وہ وہ کوسنے دیتی۔ کہ محلے کی در و دیوار ہل جایا کرتی تھیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا جیسی
منا تھی۔ یعنی بھری جوانی میں شوہر ساتھ چھوڑ گیا۔

ایاز احمد کو کینسر ہو گیا تھا۔ بہت دن تک اس نے یہ خبر اپنی ماں اور بیوی سے چھپائی تھی۔ ماں
ں لئے کہ اس کا کلیجہ شق ہو جاتا۔ بیوی سے اس لئے کہ وہ اپنے سامنے اپنا ماتم برداشت
یکتا تھا۔ پھر بھی وہ آخری مہینہ جو اس نے بستر پائی پر گزارا اس کے لئے خاصا سوہانِ روح تھا
بیگم ہر آئے گئے کے آگے ٹسوے بہاتی۔ اور کہتی۔ لاش کو سہرا باندھ کر میرے حوالے کر دیا۔ آہ
پ نے سہاگ کے جوڑے کے بدلے مجھے بیوگی کا کفن دیا۔ جب اماں بی کے آنسو تسبیح کے
لی طرح مسلسل پھسلتے رہتے۔ تو بلند آواز میں کہتی۔

ہائے جن کا وقت ہوتا ہے۔ ان کو خدا نہیں بلاتا۔ ہاں بہن! ہر کسی نے اپنے گناہوں کی سزا اس
ابانی ہے۔ اس ماں سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا۔ جس کا جوان بیٹا بستر پر پڑا موت کی گھڑیاں
ہو۔

اماں بی کو چپ لگ گئی تھی۔

اس وقت بھی نہیں روئیں جب ان کے جوان بیٹے نے آخری ہچکی لی ـــــ اس وقت بھی
انسو نہ نکلا۔ جب ان کے خوبرو بیٹے کا جنازہ اٹھا۔ جب لوگوں نے واویلا کر کے انہیں رلانے کی
ی تو وہ سجدے میں گر گئیں۔

شاید وہ سجدے میں کچھ بولی ہوں۔ کیونکہ اس کے بعد لوگوں نے انہیں بولتے نہیں دیکھا۔ ہاں کبھی
میں کچھ کہہ دیں۔ تو اور بات ہے پھر یہ روزہ انہوں نے پورے دس سال رکھا۔ بیٹے کے بعد
دس سال زندہ رہیں۔ دس سال احمدی بیگم کی جوتیاں کھائیں۔ ہر طرح کی ذلت برداشت کی اور
سانی کی۔

وہ اس گھر میں اس لئے بیٹھی تھیں کہ احمدی بیگم ان کی بنی بنائی عزت خاک میں ملا دینے پر تلی ہوئی
انشورنس کے ایک لاکھ روپے مل جانے کے بعد اس کے لالچی رشتہ دار اور بہن بھائی گھر آ بیٹھے

تھے۔اس واسطے اماں بی اس محاذ پر ڈٹ گئیں۔جتنا بھی انہیں ذلیل کیا گیا وہ گھر سے
مگر ایک مصلّی نما عورت کو گھر سے دھکّے دے کر نکالنے کا حوصلہ کسی بھی خبیث النسا

چنانچہ انتقال سے ایک ماہ پہلے اپنے ایک رشتہ کے بھائی کے ہاں چلی گئیں۔شا
مزا منظور نہ تھا۔جہاں ان کی زندگی کو ہر قسم کی ذلّت سے دابستہ کیا گیا۔

جس وقت ایاز احمد فوت ہوا تھا۔شہباز دس سال کا تھا۔نسرین آٹھ کی، کوکب
چھ ماہ کی تھی۔اماں بی کے وصال کے وقت شہباز بیس برس کا تھا۔سمجھدار تھا۔دادی کی عزت
ان بڑی باتوں پر ٹوکا کرتا تھا۔اماں بی کی وفات کے بعد احمدی بیگم کی جوانی بھی جل دے
بھی جوان ہو چکے تھے۔اس لئے کھل کھیلنے کی عمر تو نہ رہی تھی۔پھر بھی اس نے اپنی من
پوری کرلی۔اپنی نقد رقم تو وہ پہلے ہی اپنے بھائیوں کو کاروبار میں لگانے کے لئے
ان کے کہنے پر اپنے شوہر کا مکان بھی فروخت کر دیا۔اور اس پیسے سے اپنے چھوٹے
خرید دیا تھا۔جس میں شہباز کو برابر کا حصّے دار ٹھہرایا۔

گھر بار بیچ کر احمدی بیگم میکے میں پہنچ گئی۔دو چار سال بھاوجوں کے ساتھ
چاروں طبق روشن ہو گئے۔بھاوجیں اسے مفت کا بوجھ سمجھ کر یوں برتاؤ کریں۔جیسے
پشتوں پر احسان کر رہی ہوں اور احمدی بیگم بات بات میں اپنی ٹانگ اوپر رکھتی،
اس کے پیسے پر عیش کر رہے ہیں۔

بہت جلدی اسے پتہ چل گیا کہ رشتے داروں کے ساتھ احسان والا معاملہ کبھی
وقت ان کی صورت اور ہوتی ہے دیتے وقت ان کا رویّہ بالکل بدل جاتا ہے۔
کرنے کے لئے وہ اپنی انا اور خودداری کو کسی عزیز کے قدموں تلے رکھ دیتے ہیں ان
جاتا ہے۔تو وہ تجوری کا سانپ بن جاتے ہیں اور ہر باریوں پھنکار کر ملتے ہیں کہ مانگ
دور چلا جائے جہاں ان کی پھنکار اس کا پیچھا نہ کر سکے۔

احمدی بیگم لوہے کے اعصاب کی عورت تھی۔نہ صرف لوہے کے چنے چ

ی۔زندگی بھر اس نے اپنے مجازی خدا — اور اپنی عبادت گزار ساس کی ایک نہ سنی تھی۔
بیوں اور بھائیوں کا رویّہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔
میدان میں اتر آئی۔
رہیں رہ کر ایک ایک کا وہ حشر کیا کہ ان لوگوں کے گھر جہنم کے نمونے بن گئے۔بالآخر احمدی بیگم
ال نشان بن گئی جس بھائی کے گھر جاتی بھائی کو اپنے گھر کی بنیادیں ہلتی ہوئی نظر آتیں۔زمانے
بار سُنا چکی تھی کہ اس نے اپنی ساری دولت بھائیوں کو دے دی ہے۔اور اب وہ خود
ہے ہیں اور اسے اور اس کے یتیم بچّوں کو دھتکار رہے ہیں۔
بچارے خاندان تو کیا شہر میں رہنے کے قابل نہ رہے — جو بھی ملتا ان پر پھٹکار بھیجتا۔
ب سبھی بھائی اور بھاوجیں احمدی بیگم کی گندی زبان اور بے فیض طبیعت سے دبنے لگے۔نہ
انہیں عافیت اسی بات میں نظر آئی کہ یا تو احمدی بیگم کا سرمایہ لوٹا دیں یا اس کا حصّہ مقرر کر کے
دیں۔
لوٹانا تو بہت مشکل تھا اس لئے دوسری تجویز پر سب بھائیوں نے اتفاق کیا۔مل کر بیٹھے اور
رام کرنے کی کوشش کرنے لگے۔
ی بیگم کو پتہ چل چکا تھا کہ اس وقت [redacted] کے حق میں ہیں اور جب دوسرا فریق خود بخود
تو اس کی کمر پر لات رکھ دینی چاہیئے — سو اس نے ان سے اپنی سب شرطیں منوائیں
ماہرہ مقرر کر لیا ہوٹل سارے کا سارا اپنے نام لکھوا لیا۔اپنا پیسہ بھی کاغذوں پر محفوظ کر لیا اور
لے کر الگ ہو گئی۔
بات ہے، دو چار سالوں میں ہی ہوٹل دیوالیہ ہو گیا اور اس کا بھائی اسے اونے پونے بیچ
گیا مگر احمدی بیگم کے کوسنے اور بددعائیں دبئی تک اس کا پیچھا کیا کرتی تھیں۔اس لئے
ان نہیں آیا۔بلکہ بال بچّوں کو وہاں بلوا لیا —
بیگم اپنے کارنامے اور زندگی کے ہر محاذ پر اپنی عقل کی جیت کے قصّے اپنے سامنے خاندان

کے آگے بیان کر کر کے بہت خوش ہوا کرتی۔ اس کا خیال تھا اگر وہ فوج میں جرنیل ہوتی تو [illegible] میں اس کی دانشمندی کے ڈنکے بج رہے ہوتے۔ پسپا ہونا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ [illegible] تک چال چلنا۔ اور حریف کو زک دینا، اس کی لغت کی موٹی سرخیاں تھیں۔ بلکہ وہ تو بھرے [illegible] چیلنج کیا کرتی تھی کہ ہے کوئی مائی کا لال جو اسے مات دینے کی ہمت رکھتا ہو۔

حلیہ بھی اس کا جنگجویانہ تھا ـــــ اونچا لمبا مردانہ وجود تھا۔ موٹے موٹے بھدے [illegible] پاؤں۔ چلتی تو زمین ہلتی ـــــ بولتی تو آسمان ہلتا ـــــ اس واسطے سب خاندان والے [illegible] احمدی آپا کی بجائے جرنیل آپا کہنا شروع کر دیا تھا۔

پہلے پہل تو یہ نام صیغۂ راز میں تھا کوئی ڈر کے مارے اس کے سامنے دہراتا نہیں تھا۔ [illegible] احمدی بیگم کو کسی طرح علم ہو گیا کہ سب خاندان والے اسے جرنیل آپا کہتے ہیں تو اس نے [illegible] کو ایک فوجی اعزاز جانا اور خوشی خوشی اپنے کاندھے پر سجا لیا پھر جب کوئی کہتا ـــــ

"اے جرنیل آپا! اب تمہاری جیسی عقل کوئی کہاں سے لاتے؟" تو اس کا سیروں خون [illegible] اسے ایسے محسوس ہوتا۔ جیسے اس کے چاروں طرف بینڈ بج رہے ہیں۔ مسلح سپاہی اور [illegible] اس کے ارد گرد کھڑے ہیں سلامی دے رہے ہیں۔ اور وہ بڑے وقار سے ـــــ

ٹھپ ٹھپ کرتی گزر رہی ہے ـــــ [illegible]

پھر تو رفتہ رفتہ، سارے محلے والے بھی اسے جرنیل آپا کہنے لگ گئے۔ یوں۔ اس کا [illegible] کی اصلی فطرت کی طرح جانے کہاں کھو گیا کہ وہ جگ بھر میں جرنیل آپا کے نام سے پہچانی جانے لگی۔

جرنیل آپا کو یہ بھی منظور نہیں تھا کہ اس کے بچے اسے امی جان یا اماں کہیں وہ کہتی تھیں دونوں لفظوں سے نفرت ہے اور ممی کو تو وہ بالکل گالی سمجھتی تھی۔ اس لئے اس کے بچے [illegible] تھے۔ ویسے فیشن کے طور پر کبھی کسی کے سامنے کہہ دیتے کہ یہ ہماری امی ہیں۔

شہباز صورت اور سیرت کے لحاظ سے بالکل اپنے باپ جیسا تھا غیرت مند بھی تھا [illegible] بھی ـــــ اس لئے ماں کو اس کی فطرت سمجھ میں نہ آتی۔ وہ چاہتی تھی کہ شہباز اپنے [illegible]

تھ کاروبار میں لگ جائے۔ مگر شہباز اپنی ماں کی فطرت کو خوب جانتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ سب [illegible] ران والے اس کی ماں سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر خوف کے مارے اظہار نہیں کرتے۔ اس [illegible] سلئے وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اس نے بی۔ کام کر کے بینکنگ کا کورس پاس کر لیا اور [illegible] ایک بینک میں ملازم ہو گیا۔

رفتہ رفتہ اپنی محنت اور دیانت داری سے وہ بینک مینجر ہو گیا۔ بینک کی طرف سے اسے [illegible] خوبصورت سا فلیٹ بھی مل گیا تھا۔ اور اب سب اس میں رہتے تھے۔

تینوں بہنیں شہباز سے چھوٹی تھیں مگر ماں کی خواہش تھی۔ کہ دو جوان لڑکیوں کو شہباز سے پہلے [illegible] دیا جائے۔ خدا کی قدرت کہ دونوں بڑی بہنیں شکل و صورت اور مزاج میں ماں کی ہم پلہ تھیں۔ پڑھائی کا [illegible] میں بالکل شوق نہیں تھا۔ لگائی بجھائی میں زیادہ دسترس رکھتی تھیں۔ آپا نے یہ عقلمندی کی کہ عقل سے [illegible] رے آدمی ڈھونڈ کے انہیں جلد جلد بیاہ دیا۔ اپنی ناں سے انہوں نے زندگی گزارنے کا ایک اصول [illegible] بھا تھا یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس ـــــ، اس واسطے نسرین اور کوکب کو سسرال میں کوئی [illegible] سکہ پیش نہ آیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ہر وقت لاٹھی رہتی تھی۔ اور جب ذرا لاٹھی کمزور پڑتی تو ماں کے [illegible] سے کشتۂ فولاد بن جاتے۔

تیسری لڑکی تزئین جسے گھر میں سب تانو کہتے تھے۔ ابھی پڑھ رہی تھی۔ بڑی دونوں تو میٹرک سے [illegible] گے نہ بڑھی تھیں۔ اس نے خیر سے میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا تھا اس لئے اسے کالج میں [illegible] خل کرا دیا گیا۔ اور وہ کالج میں داخلے پر ہی اترائی رہتی تھی) پچھلے تین سالوں سے جرنیل آپا شہباز کیلئے [illegible] لڑکی ڈھونڈ رہی تھی۔ رشتہ داروں نے تو حفظ ماتقدم کے طور پر بہت پہلے ہی جواب دے دیا تھا۔ ان کا خیال [illegible] تھا جرنیل آپا کی بھوبنانے سے بہتر ہے کہ لڑکی کو اندھے کنوئیں میں دھکا دیدیا جائے ـــــ

پاس پڑوس والے بھی بس آئیں بائیں شائیں کرتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ شہباز بہت [illegible] نیس لڑکا ہے۔ مگر شہباز کے والد کا انجام انہیں کبھی نہیں بھولتا تھا۔

رشتہ ڈھونڈنے کی مہم تین سال سے جاری تھی۔ جرنیل آپا باقاعدہ کمر کس کے ہر روز کہیں نہ کہیں لڑکی

دیکھنے جاتی اور کہہ سُن کر اپنی خوب تواضع کرواتی۔ بعض گھروں میں تو وہ کئی کئی دن جاتی رہتی۔ جی بھر کھا تی پھر ایک دن کہلوا دیتی کہ لڑکی اسے پسند نہیں آئی ـــــ اور اگر کسی جگہ بات شروع ہوتی بھی تو والے انہیں بروقت جرنیل آپا کے اوصاف سے آگاہ کر دیتے۔

بعض لوگوں نے لڑکے کو پسند کرنے کے بعد، علیحدہ رہنے کی پیش کش کی تھی۔ ان لوگوں کو جرنیل آپا نے اس طرح ان کے بخیئے ادھیڑے تھے کہ وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو گئے تھے۔

غرض شہباز کی شادی ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ بہت سوں کا خیال تھا کہ اس کی ماں اس نہیں ہونے دیگی۔ اکثر لوگوں کو شہباز پر ترس آتا تھا۔ وہ اس کو الگ لے جا کر مشورہ بھی دیتے تھے کہ پسند سے شادی کر کے ماں سے علیحدہ ہو جائے۔ بلکہ بعض تو اپنی لڑکی اس طرح دینے پر آمادہ بھی تھے۔ مگر شہباز ہمیشہ کہتا تھا کہ۔

"میں اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے سوا اس کا دُنیا میں کون ہے۔"؟

رشتہ دار تو منہ پھٹ ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا۔ شہباز کی سعادت مندی اس کو لے ڈ بالآخر جیلانی کو یہ بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ ایاز کے پرانے دوست تھے۔ اماں بی نے انہیں کے ساتھ اپنے بچّوں کی طرح پالا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی ایاز کے بچّوں کی خیر خبر لینے آتے تھے۔ اس میں وہی ایک ایسی ہستی تھے۔ جرنیل آپا جن کا لحاظ بھی کرتی تھی اور احترام بھی۔ اس میں جرنیل آپا کی نہ تھی۔ بلکہ جیلانی صاحب کا تقویٰ، منکسر المزاجی اور طبیعت کا استقلال سب کچھ کروا رہا تھا۔

ان کی خواجہ عبدالقدوس سے بھی دوستی تھی ـــــ دونوں گھرانوں کو وہ اچھی طرح جانتے ان کا خیال تھا ـــــ خدیجہ بیگم کی بیٹی، جرنیل آپا کے گھر میں گزارہ کرے گی۔ جو لڑکیاں سخت ماحول ہوں۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے ہنس کر گزر جاتی ہیں ـــــ یوں یہ رشتہ طے ہوا۔ اور آ بھی ہو گئی۔

جیلانی صاحب نے یہ دُور اندیشی کی کہ خواتین کو آپس میں ملنے نہیں دیا۔ ان کو معلوم تھا۔ اگر رشتہ مانگنے نکل کھڑی ہوئی تو یہاں بھی پہلے والے رشتوں کا حشر ہوگا۔ ادھر خدیجہ بیگم بھی اپنی سہ

صلت سے بالکل ناآشنا رہیں۔ ویسے بھی وہ اتنی کم گو تھیں کہ جرنیل آپا کی تہہ تک پہنچنا ان کے لئے بہت مشکل تھا۔

شادی کے زور تو ویسے بھی فریقین ایک دوسرے کو بہتر سے بہتر انداز میں ملتے ہیں۔ نیا کو تو بھی پتہ نہیں تھا۔ کہ اس کی ساس کو سب لوگ جرنیل آپا کہتے ہیں۔

شادی کے فوراً بعد جب وہ گھر میں اس قسم کی صدائیں سنتی۔

اے جرنیل آپا کہاں ہو ـــــ؟

واہ جرنیل آپا کو دلہن تو چاند سی مل گئی۔

یہ جرنیل آپا ہے قسمت کی دھنی۔!

تو نیا حیران ہو کر مخاطب کا منہ دیکھنے لگتی۔ ویسے اسے اس گھر میں جرنیل آپا سے ملنے کا بہت شوق ہو گیا تھا۔ اس نے بھی دُنیا میں طرح طرح کے بے معنی نام سُن رکھے تھے ـــــ مگر جرنیل آپا اپنی نوعیت کا انوکھا اور معنی خیز نام تھا۔ ممکن ہے والدین نے ہی یہ نام رکھا ہو۔ والدین کا کیا ہے۔ وہ تو اپنی بیٹیوں کو "پھول چنبیلی ستارہ بیگم" اور "نین سکھ کلیجے کی ٹھنڈک" جیسے ناموں سے بھی نوازتے رہتے ہیں۔

ایک دن اس کی ممانی ساس، جرنیل آپا، جرنیل آپا کا ذکر کرتی جب اس کی ساس کے پیچھے لپکتی ہوئی نیا کے کمرے میں آگئی تو تھوڑی دیر کے لئے نیا کا اوپر کا سانس اوپر تلے کا سانس تلے رہ گیا۔

ایک ٹھنڈے خوف کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ واقعی اس کی ساس گھر میں جرنیلوں کی مانند رہتی تھی۔ نامعلوم اسے یہ نام کیوں دیا گیا تھا۔ اب لوگ "ولایت بیگم" اور "سلطنت آرا" جیسے بھی تو نام رکھ ہی لیتے ہیں۔ نیا نے اپنے کمزور دل کو تسلی دی۔ پھر کچھ دنوں بعد جب وہ حسبِ روایت اس کو امّی امّی کہتی اس پر نثار ہو رہی تھی تو جرنیل آپا نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور کہا ـــــ

"میری جان، تم نے سُنا نہیں۔ اس گھر میں سب مجھے آپا کہتے ہیں۔ جرنیل آپا! ہمارے ہاں امّی کہنے کا رواج نہیں ـــــ" تب نیا کو جھٹ سمجھ آگئی کہ آج کے بعد وہ اپنی ساس کو آپا کہے گی۔ آپا کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ کوئی لڑکی اپنی ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت

کو امّی کہنا پسند نہیں کرتی۔ جتنی بھی لڑکیاں اپنے شوہر کی ماؤں کو امّی جان کہہ کر مخاطب کرتی ہیں مجبوری سے ایسا کرتی ہیں۔ یا پھر گھریلو سیاست کی خاطر ——— نیّا بھی کسی دوسری عورت کہنے پر راضی نہیں تھی۔ اس کا ایک مسئلہ حل ہو گیا۔

شہباز نے صرف دس دن کی چھٹّی لی تھی۔ کل اس کی چھٹّی پوری ہو گئی تھی۔ اور آج وہ دفتر چلا گیا تھا۔ صبح سات بجے وہ گھر سے نکل گیا تھا۔ رات اس نے نیّا کو بتا دیا تھا کہ وہ علی الصّبح اٹھے گا۔ وغیرہ وغیرہ، نیّا نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے اتنی کم چھٹّی کیوں لی ———

تو وہ بولا ———

خواہ مخواہ زیادہ چھٹّیاں لینے کا کیا فائدہ ہے؟ رہنا تو یہیں ہے ———

نیّا بھی تمام رات جاگتا اور صبح دیر سے اٹھنا چاہتی تھی ———

اس نے شہباز سے پوچھا بھی تھا کہ وہ "ہنی مون" کے لئے کہیں باہر کیوں نہیں جاتا۔ ہر نوجوان لڑکی کی طرح نیّا نے بھی "ہنی مون" کسی دوسرے شہر یا صحت افزا مقام پر گزارنے کا تصوّر باندھا ہوا تھا۔

شہباز نے صاف کہہ دیا کہ اس کے مالی حالات باہر سیر و تفریح کے لئے جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ پہلے ہی شادی پر بہت خرچہ اُٹھ گیا ہے۔ ویسے اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ گرمی کے موسم میں وہ ایک ماہ کی چھٹّی لے گا۔ پھر دونوں مِل کر مری چلیں گے۔ اسی خاطر تو اب اس نے زیادہ چھٹّیاں نہیں لی تھیں۔

اس بات نے نیّا کو بہت مطمئن کر دیا۔ وہ بھی ضد کر کے نہیں جانا چاہتی تھی۔ یونہی اس نے

ایک خواہش کا اظہار کیا تھا اور جب شہباز نے اس کو سمجھا دیا تو وہ سمجھ گئی۔ اس کو شہباز کی
پسند تھی۔ کیونکہ شہباز پسند تھا۔ شہباز اس کا محبوب تھا۔ پل پل اس پر نثار ہوتا تھا۔ ایسے شوہر
کیوں نہ مانے ——— ؟ اصل میں شادی کے ابتدائی دنوں میں ——— جب دو دل مل
مل جائیں اور جسم ایک دوسرے کو قبول کر لیں تو وہی ایک کمرہ ان کی کل کائنات بن جاتا ہے
جنت بھی وہی ہے اور زلالہ زار بھی وہی ——— ہر صبح اور ہر شام مری پیرس اور سوئیزرلینڈ
اترتے ہیں اور ہر نظارہ اور ہر مقام ان کی آنکھوں کے آگے ہیچ ہو جاتا ہے ——— کمرے کے
کیسی دنیا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے کے لئے وہ ان سب باتوں سے بے نیاز
ہیں وہ نہایت مطمئن اور مسرور تھی۔

شہباز کو رخصت کرنے کے بعد اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ گو رات وہ لوگ
سو گئے تھے مگر اس کی آنکھیں اب بھی نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ نہا دھو کر تھوڑی دیر
سو گئی۔ اٹھی تو نو بج رہے تھے۔ اس نے سوچا پہلے وہ کپڑے بدل لے۔ ممکن ہے کوئی گھر میں آ
اور پھر کوئی اور کام کرے گی۔ اس نے اپنا نیا جوڑا نکالا۔ پہنا اور میک اپ کرنے کے لئے وہ آ
کے آگے بیٹھ گئی۔

"تم آج کل کن وادیوں میں گھومتی ہو۔ تمہیں سنگھار کی ضرورت نہیں رہی" آئینے نے مسکرا کر
واقعی وہ اپنا رُوپ دیکھ کر خود ہی حیران ہوتی جاتی تھی۔

ٹھیک سُنا تھا اس نے عورت پر زندگی میں تین بار رُوپ آتا ہے۔ پہلی مرتبہ شادی کے فوراً بعد
آنکھیں جھپکتے ہوئے پیمانے بن جاتی ہیں۔ ہونٹ دہکتے ہوئے انگارے اور جسم شراب کی صراحی ——
ہر رات اسے لُوٹا جاتا ہے، اور ہر صبح وہ نئے جام کی طرح لبالب بھری ہوتی ہے جس
کلی رفتہ رفتہ پھول بنتی ہے۔ اسی طرح روز بروز اس کا چہرہ نکھر رہا تھا۔

جب پھول اچھی طرح کھل جائے گا۔ تو کیا ہو گا ——— ؟

تو کیا ہو گا ——— ؟

وہ سوچتی ——— کیا اس کو ثبات ہو گی یا نہیں ———،

لیکن اب تو یوں معلوم ہوتا چہرے کے رنگ پکتے ہو رہے ہیں۔ وہ کچی ڈال تھی نکھرتی جا رہی ہے
نہ جانے رات بھر کن ہوشربا وادیوں میں گھوم کر آتی کہ صبحدم اس کے چہرے پر موتی اور ستارے
بکھر جاتے۔ وصل اسی کو کہتے ہیں وہ سوچتی ——— کہ آدمی من تو شدی تو من شدم کی تفسیر بن جاتا ہے
——— اسے اکثر اپنے وجود سے شہباز کی مدہوش کُن خوشبو آیا کرتی۔ زندگی اتنی خوبصورت ہو جاتے
گی اسے کہاں پتہ تھا ——— پھر بھی ہر روز نئے سرے سے سنگھار کرنے کا لطف آتا تھا۔ وہ آئینے کے
آگے بیٹھی اپنی لمبی لمبی پلکوں کو برش سے موڑ رہی تھی کہ جرنیل آپا اندر آ گئی۔

نیا چونک گئی، ڈر گئی، شرما گئی اور جہاں اس کا ہاتھ تھا وہیں رک گیا۔

آپا کمر پر ہاتھ رکھے۔ بڑے غور سے اسے دیکھتی رہی اور اس عرصہ میں نیا کا ہاتھ برابر کانپتا رہا۔ پھر
اس نے سارے کمرے پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالی اور بولی ———

"بنو اٹھ گئی ہے"

نیا کو بالکل سمجھ نہیں آئی کہ یہ الفاظ اس نے کس انداز میں کہے تھے۔

اس نے ہاتھ میں پکڑا برش نیچے رکھ دیا۔

آپا نے لہجہ میں بناوٹ سمو کے کہا۔

"کوئی بات نہیں کر لو سنگھار ——— ؟"

جانے کو مڑی ——— لیکن جاتے جاتے پھر رک گئی اور کہنے لگی۔

"اماں نے سنگھار کے علاوہ بھی کچھ سکھایا ہے یا نہیں بنو کو ———"

نیا سر سے پاؤں تک لرز گئی مگر آپا ہنس پڑی، بولی "ہاں رفتہ رفتہ بتاؤ گی تو پتہ چلے گا"

اور باہر نکل گئی ———

نیا گھبرا کر کھڑی ہو گئی ———

اسے کچھ کرنا چاہیئے تھا مگر وہ تو سمجھ رہی تھی کہ ابھی مہینوں وہ اس گھر میں دلہن سمجھی جاتی رہے

گی۔ گھر والے تو کام کے لئے نہیں کہیں گے۔ مگر اسے کچھ کرنا ہی چاہیئے۔

سوچتے سوچتے وہ باہر نکل آئی۔

باورچی خانے میں ایک غلیظ سی مائی بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی اور اس کی ساس پلنگ پر کاری کاٹ رہی تھی۔ تانو غالباً کالج چلی گئی تھی۔ اور شادی کے سب مہمان بھی جا چکے تھے۔ سارا خالی خالی تھا اور اندر باہر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ پتہ نہیں صفائی ہو چکی تھی یا کی صفائی یہاں کرائی جاتی تھی۔ وہ پھر اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اور سوچنے لگی کیا کرنا چاہیئے

یہ علاقہ پورا بینک کالونی کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ یہاں زیادہ تر بینکوں کے ملا تھے ـــــ قطار اندر قطار دو منزلہ فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ ہر فلیٹ میں تین بیڈ روم، ڈرائینگ ڈائننگ کے علاوہ ایک کچن ایک سٹور اور ایک برآمدہ بھی تھا ـــــ جرنیل اوپر والے پورشن میں رہنا پسند کیا تھا۔ کیونکہ اوپر بیٹھ کر ہر طرف جھانکا جا سکتا تھا۔ اور بالا پیزیں مل جاتی ہیں اور پھر نیچے ٹرک کا شور بھی تو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی اگر نیچے والوں سے مزاج نہ ملے تو ان کے سینے پر مونگ اور بوٹ سب کچھ دلا جا سکتا ہے۔

مگر جتنے لوگ جرنیل آپا کے "سایہ عاطفت" میں رہتے تھے ـــــ ان کے "مزاج" سے کماحقہٗ واقف تھے۔ اس واسطے ان کی شان میں گستاخی کرنے کی جسارت نہ رکھتے تھے ان کی ساری نسلوں کی بہتری تھی۔

شان میں گستاخی تو ایک الگ سی بات ہے ... وہ ذہنی طور پر ان سے کئی فرلانگ دُور رہتے تھے۔ ان کے معاملات میں دخل نہ دینا۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانا ـــ زیادہ سے زیادہ ان کے ساتے سے بچنا ہی اس کالونی کی عورتوں کا "موٹو" تھا ـــ کچھ خوشامد پسند اور منافق قسم کی تھیں۔ انہی سے جرنیل آپا کا زیادہ تر ملنا جلنا تھا۔ اور انہی کے سے انہیں محلے میں ہونے والی ہر واردات اور واقعات کا علم ہوتا تھا۔

نیا کو انہوں نے ایک الگ کمرہ دے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک غسل خانہ اور ایک بر

تھا پہلے یہ کمرہ جرنیل آپا کے تصرف میں تھا۔ مگر اب بہت سوچ سمجھ کر دُلہن کو دے دیا گیا۔ میں ڈرائینگ ڈائننگ ملحقہ تھے اور دوسری طرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ جن کو ایک نسل خانہ لگتا تھا۔ برآمدے میں ہی ایک کچن اور ایک چھوٹا سا اسٹور تھا۔ جرنیل آپا اور تانو ان دونوں دنوں میں آ گئی تھیں۔ رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں اٹھا تھا۔

البتہ نیا کے جہیز کا بہت سا سامان ابھی تک باہر برآمدے میں پڑا تھا۔ یعنی کھانے کی میز اور یاں، کپڑوں کی الماری، کپڑوں کی بڑی پیٹی وغیرہ ـــــ

نیا اس انتظار میں تھی کہ وہ لوگ خود اشارہ کریں گے اور جرنیل آپا اس سوچ میں تھی کہ دیکھیں ر کے ارادے کیا ہیں۔؟

نیا بیٹھی سوچ رہی تھی ـــــ

اب اس کو کیا کرنا چاہیئے ـــــ بظاہر جرنیل آپا ایک سادہ سا فقرہ بڑی محبت سے کہہ کر ہر نکل گئی تھیں۔

عقل مند را اشارہ کافی است ـــــ

امی بھی ہمیشہ یہی محاورہ بولا کرتی تھیں اور آج اسے اس محاورے کی سمجھ آ رہی تھی ـــــ وہ کھڑی ہو گئی۔

سب سے پہلے تو اسے اپنا کمرہ ٹھیک کرنا چاہیئے۔ ہر شے بیہودگی اور بے ترتیبی سے ھی گئی تھی۔ جسے اس کے اعصاب قبول نہیں کر رہے تھے۔ صندوق ابھی تک پلنگ اور صوفے لے نیچے پڑے تھے۔ مگر اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ جو اس کا ہاتھ بٹاتا۔ کوئی بات نہیں اس نے دل میں سوچا ـــــ وہ گھر میں بھی بہت کام کر لیتی تھی، ہمت کر کے چیزیں ہلا لے گی۔ اس نے رسے اپنا چنا ہوا دوپٹہ باندھا اور اللہ کا نام لے کر شروع ہو گئی۔

بکس روم کا دروازہ کھولا۔ سارا کمرہ جالوں سے اٹا پڑا تھا۔ فرش گندہ تھا اور اسی طرح اس کا سامان لگا دیا گیا تھا۔ نیا کا دل ایک دم بُرا ہو گیا ـــــ بہت کام تھا۔ اور اگر اس نے آج ہی اس گھر

میں جھاڑو پکڑ لی۔ تو پھر زندگی بھر جھاڑو ہی اس کا مقدر رہے گا ——

لیکن اگر وہ نہیں کرے گی تو اور کون کرے گا ——؟

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ صفائی پسند اور سلیقے والے نہیں تھے۔ بس جس طرح ز
تھی —— وہ رہ رہے تھے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اپنی سلیقہ شعاری اور نفاست سے
دل جیت لے۔ انہیں اپنا معترف کرلے —— اور سسرال میں جا کر انہیں معترف کرنا ہی
سے بڑی جیت ہوتی ہے۔

ٹھیک ہے ——

اس نے پہلے کپڑے بدلے وہی رات والا سوٹ پہن لیا اور باہر برآمدے میں چلی
دیکھا۔ کہیں جھاڑو نظر نہیں آئی تو پھر باورچی خانے میں گئی اور آہستہ سے مائی سے پوچھا۔

مائی جھاڑو کہاں ہے ——

برتن مانجھتی ہوئی مائی اس کی آواز پر چونک اٹھی پھر اس کے استفسار پر حیرت سے اس کا
دیکھنے لگی۔

"دس دن کی دلہن اور جھاڑو ——" کافی دیر تک جب وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی تو نیا
آ گئی۔

"میں نے جھاڑو کا پوچھا ہے ——"

تب مائی کو ہوش آیا ——

دوسرے کونے میں آنکھ سے اشارہ کر دیا۔ نیا نے بڑھ کر جھاڑو اٹھالی۔ انتہائی گندی اور گ
امی کہا کرتی تھیں ——

"عورت کی صفائی اور ستھرائی کا اندازہ اس گھر کی جھاڑو سے لگانا چاہیئے۔ گندی عورتوں کی
بھی گندی ہوتی ہیں"۔

"واہ امی —— وہ ہنسا کرتی۔ کبھی جھاڑوئیں بھی صاف رہ سکتی ہیں۔ گندگی سمیٹنے والی چ

رہے گی"۔ آج اس جھاڑو کو دیکھ کر اسے امی یاد آ گئیں۔ امی سچ کہا کرتی تھیں۔ اگر جھاڑو گندی
ڑے سے بھری ہوئی ہو تو وہ کیسے صفائی کے کام آ سکتی ہے۔ اس نے خاموشی سے جھاڑو اٹھائی
پنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی ساس نے اسے کنکھیوں سے دیکھا مگر یوں بے نیاز بن کر بیٹھی رہی جیسے
کاٹنے کے علاوہ اسے دنیا میں اور کسی سے دلچسپی نہیں ہے۔ نیا نے غسل خانے میں جا کر جھاڑو
نی کی اور پھر کمر باندھ کر کام میں جت گئی ——

پہلے باکس روم کے جالے صاف کئے پھر فرش اور دیواریں صاف کیں۔ پرانے اخبار لا کر
ریوں میں بچھائے اور خود وزنی وزنی صندوق اٹھا کر کمرے میں لگا دیئے —— اپنے کمرے کا آدھا
ردی سامان اس نے باکس روم میں رکھ دیا تھا۔ پھر اپنے کمرے کی باری آئی ——

ڈبل بیڈ گھسیٹ کر اس نے اس کا سرہانہ پشت والی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ادھر ادھر سائڈ ٹیبلیں
یں۔ اسی طرح صوفوں کو ترتیب سے رکھا۔ ڈریسنگ ٹیبل ایسی جگہ رکھ دی جہاں روشنی چہرے پر پڑتی
پرانا سارا میک اپ کا سامان نکال کر اس پر لگا دیا —— نئے ڈنر سیٹ نکال کر بچھائے ——
یڈ کور لگایا۔ صوفے پر نئے کشن ڈالے۔ غرض کمرے کو صحیح معنوں میں دلہن بنا دیا۔ صرف پردے بدلنے
لئے تھے۔ کیونکہ سب نئی چیزوں کے ساتھ پرانے اور میلے پردے بہت برے لگ رہے تھے۔ اس نے
میں سوچا۔ جب وہ امی سے ملنے جائے گی۔ راستے میں بازار پڑتا ہے۔ سرخ حریری پردے لے آئے گی
ں کے صوفہ سیٹ اور بیڈ کے ساتھ میچ کریں گے اور پھر کسی دن پردے بھی بدل دے گی۔ سارا کمرہ
ن کر کے —— جب وہ آخری بار وہاں سے جھاڑو لگا رہی تھی تو اچانک اس کی ساس اندر آ گئی۔ وہ
دوسرے اندر سے گھسیٹنے اور اٹھانے کی آوازیں سن رہی تھی۔ مگر جب اسے یقین ہو گیا کہ اندر سب
ہو گیا ہے تو اس طرح آ کر کھڑی ہو گئی، جیسے چھاپہ مارنے آئی ہو۔

اسے دیکھ کر گھڑی بھر کو نیا کا جھاڑو والا ہاتھ رک گیا۔

اور جب اس نے کچھ نہیں کہا۔ تو نیا پھر جھاڑو لگانے لگی۔ وہ دروازے کے وسط میں کھڑی حیران
ول سے کمرے کو چاروں طرف سے دیکھ رہی تھی۔ جب اچھی طرح جائزہ لے لیا تو پھر آگے بڑھی اور

بوکس روم کا دروازہ کھول دیا۔ وہاں بھی نیا کا سلیقہ جگمگا رہا تھا۔ ہر شے اپنی جگہ پر اس سے رکھی گئی تھی۔ جیسے اسی جگہ کے لئے بنائی گئی ہو۔ سب کچھ دیکھنے کے بعد جرنیل آپا نرم پلنگ پر بیٹھ گئی اور بولی ——

"اے دلہن! تم کیوں جھاڑو لگا رہی ہو۔ اللہ رکھے۔ یہ تمہارے جھاڑو لگانے کے مائی کو بلا لیا ہوتا۔

"کوئی بات نہیں آپا، اپنے گھر کا کام کرنا کوئی بُری بات نہیں"

"اے ہے —— عمر پڑی ہے۔ گھر کا کام کرنے کی۔ اور تجھے ہی تو کرنا ہے"

ذرا دیکھ اپنی کیا شکل بنالی ہے۔ غضب خدا کا —— اتنا بھاری بھاری سامان تو نے لیا۔ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا —— دلہن کا تو پھول کی طرح نازک جسم ہوتا ہے۔ مجھے آواز دے نیا پھول کی طرح کھل اٹھی۔

اب وہ کوڑا لے کر دروازے تک پہنچ چکی تھی۔

"نہ میری بچی آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا —— تانو کا انتظار کر لیتی وہ کالج سے آتی تو اس مردود مائی کو بلا لیا ہوتا، وہ کم بخت تو صرف برتن مانجھنے میں ہی سارا دن غارت کرتی"

"کوئی بات نہیں آپا ——" یہ کہہ کر نیا نے سارا کوڑا جھاڑو کی نوک پہ رکھ کر باہر پھینک دیا۔ جرنیل آپا ایک دم کھڑی ہو گئی۔

اور بڑھ کر اس کے ہاتھ سے جھاڑو لیتے ہوئے بولی۔

"بس بس اب رہنے دو"

"اے مائی، اے مائی ——" برآمدے میں نکل کر مائی کو زور زور سے آوازیں آٹا گوندھ رہی تھی۔ اسی طرح کہنیوں اور کپڑوں پر آٹا لگا تھا۔ اندر آ گئی۔

"کم بخت! آٹا گوندھ لے —— اور پھر فرش صاف کرنے والی بوری لے کے اندر آ پر لگا دے، دیکھ تو دلہن بچاری صبح سے صفائی کر رہی ہے۔ اور ہلکان ہو رہی ہے"

بدبخت جب اس نے تجھ سے جھاڑو مانگی تو تو ساتھ ہی کیوں نہ چلی آئی۔ مجھے کیا پتہ کہ اندر کیا ہے"

مائی نے پلٹ کر کبھی آپا کو جواب نہیں دیا تھا۔ اس واسطے گزارہ ہو رہا تھا۔ وہ چلی گئی۔ آپا نے نیا بھری نظروں سے دیکھ کر کہا ——

ابھی مائی آ کے فرش چمکا دے گی تو جا نہا کر کپڑے بدل لے"۔ شہباز کے آنے سے پہلے تیار ہو

"جا شاباش"۔ اتنی سی بات پر نیا یوں خوش ہو گئی جیسے بہت بڑا میدان مار لیا ہو —— واقعی نے صفائی کر کے اپنی ساس کو متاثر کر لیا تھا ——

اور یہ پہلا تجربہ بہت کامیاب رہا تھا ——

اس نے وقت دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔ ابھی شہباز کے آنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے بتایا وہ شام کے پانچ بجے آئے گا۔ نیا نے کہا تھا۔

"آپ دوپہر کا کھانا کھانے بھی نہیں آئیں گے۔؟"

تو اس نے سر جھکا لیا تھا ——

پھر جب سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں ایک عجیب سی آگ میں جل رہی تھیں۔

بولا "میرا بینک گھر سے بہت دور ہے"

"مگر آپ کے پاس تو اسکوٹر ہے ——"

پھر وہ ہنس پڑا اور بولا۔

"بچی بات بتاؤں نیا —— اب تک تو میں نے گھر آنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی چپراسی کر کھانا منگوا لیا کرتا تھا۔ اب تمہارے آنے کے بعد میرا دل چاہتا ہے۔ میں کھانے کے وقت پر گھر آ جایا بلکہ ہر گھنٹے کے بعد گھر کا ایک چکر لگا آؤں۔ مگر ——"

"مگر ——" وہ بے تابی سے پوچھ بیٹھی۔

"مگر کیا کہیں گی ——؟"

"کیا کہیں گی۔؟

"کہیں گی میرا بیٹا دیوانہ ہوگیا ہے ـــــ بہو کا ـــــ" اس نے آہستہ سے فقرہ پو

اس بات سے نیّا کا دل جھوم اُٹھا۔

"تو آپ یہ بات سننا نہیں چاہتے"

"سننا نہیں چاہتا ـــــ" وہ ہنسا۔ یہی تو دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے

"مگر آپ تو بالکل ٹھیک ٹھاک دکھائی دیتے ہیں۔ ذرا بھی دیوانے نہیں لگتے"

"اچھا جی، گریبان چاک کرلوں۔ بالوں میں راکھ ڈال لوں ـــــ سینہ کوبی کروں۔

پہن لوں اور پھر گلی گلی کہتا پھروں ـــــ لوگو! میں نیّا کا دیوانہ ہوں۔ اپنی لیلیٰ کا

آوارہ ہوں، فقیر ہوں۔ اور شہر کے بچے مجھے پتھر مارا کریں۔ تب تمہیں یقین آئے گا

نیّا اس کے سینے میں سر چھپا کر اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــــ

"سچ مچ پاگل ہیں آپ ـــــ!"

دیکھا.... دیکھا..... شہباز نے ہنس کر اس کا چہرہ تھاما۔

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے

یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں!

پھر اس کے بعد کیا ہوا ـــــ؟ یہ سوچ کر ہی نیّا کا سارا بدن سرور میں ڈوب گیا۔

نیّا نے جلدی آنے کا تقاضا نہیں کیا۔ اور نہ مجبور کیا کہ وہ کھانے پر ضرور آیا کرے ـــــ

اپنے محبوب کے انتظار میں جل سکتی تھی۔ اس کی آہٹوں پر سارا دن تمام کر سکتی تھی۔ سو

دن تو صفائی میں گزر گیا تھا۔ اور اب نہا کر کپڑے بدلنا چاہتی تھی۔ وہ بڑے خوب صورت

انتخاب کرنا چاہتی تھی۔ آج پہلی بار اسے دفتر سے واپسی پر خوش آمدید کہنا تھا۔ اور پہلی جھلک

ہونی چاہیئے۔ کہ وہ کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی خاکستر ہو جاتے ـــــ!

جب وہ نہا کر باہر نکلی تو اس کی ساس پھر کمرے میں آ گئی اور بولی "بیٹی آؤ کھانا

رہیں ہم دونوں ہی تو ہیں۔ تم ہی باہر آ جاؤ ـــــ"

اچھا جی ـــــ"

نیّا نے بال خشک کر کے تولیہ پلنگ کے کٹہرے پر ڈال دیا۔ جرنیل آپا ابھی تک کمرے کے

طاہیں کھڑی تھیں، ادھر ادھر دیکھتی رہی، پھر بولی ـــــ

"بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تمہارا کمرہ ـــــ بالکل ٹھیک ہوگیا ہے۔ بس ایک ٹی وی کی

ہے۔

نیّا اپنے بال سلجھاتی رہی۔

"اس کونے میں جہاں تم نے برتنوں والی الماری رکھی ہے۔ وہاں اگر ٹی وی پڑا ہوتا تو بہت

ا ہوتا"

نیّا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو خود ہی بولی۔

"ڈرائینگ روم میں تو پڑا ہے ہمارا ٹی وی ـــــ دولہا دولہن اپنے کمرے میں دیکھیں تو اچھا

ہے.... بھلا ان کا باہر نکل کر بیٹھنے کو کب دل چاہتا ہے ـــــ"

اس بات پر نیّا نے شرما کر سر جھکا لیا۔

نیّا اس کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ دونوں ساس بہو نے باورچی خانے میں چوکی پر بیٹھ کر کھانا کھا لیا

لو اپنائیت کا یہ انداز بہت اچھا لگا جب وہ کمرے میں آئی تو تین بج رہے تھے ـــــ

شہباز کے آنے میں ابھی دو گھنٹے اور تھے۔ اس نے سوچا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے سو جاتے

وہ ساری رات کو پھر جگائے گا۔ ابھی وہ سونے کے لئے لیٹی ہی تھی کہ اس کی نند تانو جھپک سے

آ گئی۔

"ہیلو بھابی کیا حال ہے ـــــ؟ کیسا دن گزرا ـــــ"، دھم سے اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ نیّا

اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم سناؤ کیسا رہا کالج ـــــ"

"ہائے بھابی کچھ نہ پوچھیں ـــــ پورے ایک ہفتے بعد گئی تھی، لڑکیوں نے آپ
میں پوچھ پوچھ کر میرا ناک میں دم کر دیا۔ اب انہیں آپ سے ملنے کا اتنا اشتیاق ہو رہا ہے
بس ـــــ ایک دن پارٹی کرنی پڑے گی۔ اور سب کو بلا کر آپ کو دکھانا پڑے گا۔ تب انہیں
بات کا یقین آئے گا ـــــ" نیا مسکرانے لگی۔

"کون سی بات ـــــ؟"

"یہی کہ میں نے ان کو بتایا میری بھابھی اتنی سُندر ہے۔ جتنی پری۔ تو وہ میرا مذاق اڑاتی
جب وہ آپ کو دیکھ لیں گی۔ تو میں ان کا مذاق اڑاؤں گی ـــــ"

"ہائے اللہ ـــــ" وہ ایک دم چونک گئی۔ اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سارے کمرے
لگی۔ "میں نے تو غور ہی نہیں کیا ـــــ یہ کمرہ آپ نے صاف کیا ہے ـــــ؟" نیا نے
میں سر ہلایا۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی پھر اس نے بتی جلا دی۔

"واہ بھابھی، کتنا خوبصورت سجا لیتی ہیں آپ ـــــ" کیا آپ نے "انٹیریئر ڈیکوریشن" کا
"نہیں تو ـــــ"

"ہائے اللہ ـــــ پھر اتنا اچھا سجانا کہاں سے سیکھا ؟" خدا کی قسم کمرہ ہی بدل گیا
نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ پینگ اس جگہ اتنا مناسب لگے گا۔"

پھر وہ دور و نزدیک سے ایک ایک شے کو دیکھ کر، اور پھر چھو کر تعریفیں کر
ڈریسنگ ٹیبل کے آگے رک کر اس نے ٹھنڈی سانس چھوڑی ـــــ،

"اُف کتنی پیاری چیزیں ہیں۔"

"ہائے یہ پرفیوم کی بوتلیں ـــــ بھابی جب خالی ہو جائیں۔ تو مجھے دے دیں

"تم ابھی لے جاؤ ـــــ"

"سچ ـــــ!"

اسی وقت جرنیل آپا بھی کمرے میں آ گئیں۔

"آپا آپ نے دیکھا کمرہ کتنا خوبصورت ہو گیا ہے؟" تانو نے خوش دلی سے کہا۔ "یہ کمال ہوتا ہے
پڑھی لکھی بھابی کا۔ بھابی زندہ باد ـــــ اب میں آپ کے مشورے سے سارا گھر ٹھیک کروں گی۔
ہے نا آپا؟"

"بھلا بتاؤ تو اس کمرے میں کس چیز کی کمی ہے ـــــ؟" آپا نے وہیں کھڑے کہا۔

تانو نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر کہا ـــــ بولی "کمرہ تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ہاں یہ پرانے پردے
ان چیزوں کے ساتھ نہیں جچ رہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا آپا، کہ بھابی کے کمرے میں نئے پردے
ڈال دیں۔ آپ نے میری بات نہیں مانی ـــــ"

"ارے میں پردوں کی بات نہیں کر رہی۔" آپا صوفے پر نڈھال ہو کر بیٹھ گئیں۔ "اگر اس کمرے میں
ایک ٹی وی بھی رکھا ہوتا تو کیسا تھا ـــــ؟"

"ہاں اچھا تو لگتا ـــــ" تانو بولی ـــــ "اس سامنے والے کونے میں ـــــ ایسے کرتے ہیں۔
ڈرائنگ روم سے ٹی وی اٹھا کر یہاں رکھ دیتے ہیں ـــــ"

"بے وقوف ـــــ" آپا جھلا کر بولی۔ "کیا رات کو سب لوگ دُلہن کے کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی
دیکھیں گے ـــــ؟"

"تو کیا ہے ـــــ؟"

"پگلی ہے ....."

"بھئی میں تو دُلہن کے ٹی وی کی بات کر رہی ہوں۔ اگر یہ اپنا ٹی وی لائی ہوتی تو مزے سے میاں
بیوی رات گئے تک اپنے کمرے میں دیکھا کرتے ؟ اب کی بار نیا نے چونک کر آپا کی طرف دیکھا۔ تانو نے
جلدی سے نظر جھکا لی ـــــ اور آپا اس کو چونکا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

نیا نے جب نیچے شہباز کے اسکوٹر کے رُکنے کی آواز سنی تو اس کا دل اس طرح دھڑکا
حجلۂ عروسی میں پہلی بار اس کی چاپ سُن کر دھڑکا تھا۔ آج سارا دن وہ سوچتی رہی تھی کہ کس طرح
کا استقبال کرے گی۔ ساجن پہلے دن دفتر گیا تھا اور گوری نے سولہ سنگھار کئے تھے۔ اپنے آ
کو چوتھی کی دلہن بنا ڈالا تھا۔ سارا دن کام بھی تو بہت کیا تھا۔ کمرہ سجایا تھا۔ چھپر کھٹ کو نیا روپ
بخشا تھا۔ آج اتنی ڈھیر ساری باتوں کی داد لینا تھی۔ دن کیونکر گزارہ ـــــ پل پل کیسے بیتا ـــــ
بیقراری کی داستان سنانا تھی ـــــ سنانا کم تھا۔ سننا زیادہ تھا ـــــ وہ دشمنِ جاں بھی تو بے تاب
ہوگا۔ دفتر میں وقت کیسے بیتا ـــــ ؟ کتنی بار اس کی مہک آئی۔ کتنی بار چوڑیوں کی جھنکار نے دا
کی میکانکی بوریت میں ہلچل مچائی۔

ہزاروں خواب تھے۔ ہزاروں افسانے تھے ـــــ

اور اب وہ پہلو میں بے تابیاں لئے بن ٹھن کر بیٹھی تھی۔ سارا دن وہ سوچتی رہی تھی کہ شہبا
کس طرح ملے گی ـــــ کس طرح خوش آمدید کہے گی۔ یوں ـــــ ؟ نہیں ـــــ ! اس طرح ـــــ
نہیں ـــــ ! اس انداز میں ـــــ ؟

نہ جانے کتنے منصوبے اس نے باندھے اور کتنے نظارے جاگتی آنکھوں سے دیکھے، چا

سو سو بار سنبھالا۔ کئی بار کھڑکی کا پردہ اٹھا کر دیکھا۔ سڑک پر سینکڑوں لوگ آجا رہے تھے! اس کے
ز جیسا کوئی نہیں تھا۔ جی میں اتر جانے والا ـــــ آنکھوں میں سما جانے والا ـــــ اب وہ حیران
ی تھی کہ اتنی جلدی محبت کیسے ہو جاتی ہے۔ اس کی جتنی سہیلیوں کی شادی ہو گئی تھی وہ سب
اپنے شوہر کے بارے میں ایسے ہی اضطراب کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ اور نیا حیران ہوا کرتی تھی۔ کہ
لدی اتنا گہرا تعلق کیسے ہو جاتا ہے ـــــ

آج اسے احساس ہو رہا تھا۔ کہ جیسے یہ جادو کا تعلق ہے۔ کل تک جس کو ہم جانتے نہیں۔ آج وہ
ی زندگی کا واحد ارمان بن جاتا ہے۔ اسی کی خاطر تو لڑکی ایک نیا جہاں اور نئے جہاں کی سب آسائشیں
کر لیتی ہے۔ نیا کے کان دل بن چکے تھے۔ اگرچہ سڑک پر سے کئی اسکوٹر گزر رہے تھے مگر جب
کا اسکوٹر آکر نیچے رُکا تو اس نے اٹھ کر بطورِ خاص جھانکا۔ واقعی شہباز تھا

اسے دیکھ کر جیسے نیا کے دل کی کلی کھل گئی۔ سمٹ کر کھڑکی سے ہٹ گئی۔ ایک بار پھر اپنے چاند
ے مکھڑے کو دیکھا۔ اس پر روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔

وہیں کھڑی رہی۔ پہلے اس نے سوچا دروازے کے پیچھے چھپ جائے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہیں
سے پکارتا ہوا باہر نہ نکل جائے ـــــ وہ پلنگ کے پاس کھڑی رہی بلکہ ذرا سا منہ موڑ کے کھڑی ہو گئی
کے اندر آنے پر فیصلہ ہو گا۔ کس طرح پزیرائی کی جائے۔

مسکراہٹ تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دل لرز رہا تھا۔ اور
ے جسم میں رم جھم کی تال پر نغمے اتر رہے تھے۔

اس کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی ـــــ

اور پھر اس نے آپا کو سلام کیا ـــــ

آپا شاید باہر ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ "جیتے رہو" انہوں نے بلند آواز سے کہا۔

اور اب بس ایک قدم ـــــ اور پھر وہ اس کے کمرے میں ہو گا اس کی باہنوں میں ـــــ
"اے شہباز کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ ایک منٹ ادھر آنا ـــــ" آپا نے اسے جلد

جلد قدم اٹھاتے دیکھ کر عین کمرے میں داخل ہونے سے پہلے آواز دے لی۔

دروازے میں ایک سایہ لہرایا ——— اور پھر گم ہو گیا۔

نیا کارواں رواں انتظار بن گیا۔

"جی آپا ———" شہباز ماں کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"آج سارا دن میری طبیعت بہت خراب رہی ہے"۔ وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "لے جا اور ڈاکٹر کا نسخہ ہی دیکھ جا"۔ شہباز وہیں ان کے پاس کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے جیب پرانا نسخہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "یہ تو گھٹنے کے درد کی گولیاں ہیں آپا ——— وہی جو آ ہیں ———!"

"بس یہی اس نے دوبارہ کھانے کو کہا ہے ——— اتنے دن اپنے آپ سے بے پروا شادی میں لگی رہی۔ ہر تکلیف بھول گئی۔ آج صبح سے مجبور بن کے بیٹھی ہوں۔ درد کے مارے بھی نہیں جا رہا"۔ وہ کراہنے لگی۔

"میں آپ کو گولیاں لا دوں آپا ———؟"

"ارے نہیں ——— ابھی تو دفتر سے تھکا ہارا آیا ہے۔ اب کیا جائے گا۔ ہاں یہاں بیٹھ کے مجھے دبا دے تو شاید آرام آ جائے"۔

شہباز کا چہرہ اتر گیا۔

"جی اچھا آپا ——— "

اس نے مڑ کر اپنے کمرے کے دروازے کو بے بسی سے دیکھا کرسی گھسیٹ کر آپا کے پلنگ کے ساتھ لگا لی اور انتہائی تابعداری سے انہیں دبانے لگا۔ کھڑے کھڑے نیا کی ٹانگیں تھک گئی تھیں وہ اندر کھڑی سارے مکالمے سن رہی تھی۔ ایسی بھی کیا مروت اگر شہباز کہہ دیتا۔ "آپا ابھی آ کر ہوں۔ تو کون سی قیامت آ جاتی"۔ ایک منٹ میں اس سے مل کر واپس جا سکتا تھا۔ وہ شعلہ بنی کھڑی اور اسے پڑا ہی نہیں تھی۔

شہباز دبا تو آپا کو رہا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد مڑ کر اپنے کمرے کی طرف دیکھ لیتا کہ شاید اس ہوشربا پری کا جلوہ نظر آ جائے اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اپنی مجبوری بتا سکے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ آپا نے اسے شادی کے حساب کتاب سنانا شروع کر دیئے جو اس سے پہلے کئی مرتبہ بتا چکی تھی۔ جب اسے احساس ہو گیا کہ شہباز بالکل توجہ سے نہیں سن رہا۔ تو پھر ہائے وائے کے درمیان بولی۔ "میں ذرا چائے کے ساتھ ایک گولی کھا لوں۔ شاید آرام آ جائے"۔

"ضرور کھا لیں"۔ شہباز نے جلدی سے کہا۔

"نیا تو کہاں ہے۔ شاید سہیلی کے ہاں چلی گئی۔ ابھی تمہارے اور بہو کے لئے چائے بنا رہی تھی۔ نیا ——— اے بیٹی ———" اس نے زور زور سے نیا کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ نیا بالکل باہر نہ آنا چاہتی تھی۔ اول تو یہ کہ وہ اس بھاری سنگھار کی داد اندر ہی لینا چاہتی تھی اور اب تو اسے شہباز پر کچھ کچھ غصہ آ رہا تھا خود وہ اندر کیوں نہیں آیا۔ وہ باہر نکل کر اسے اپنا آپ نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ مگر جب آپا اس کے کمرے کی طرف منہ کر کے اسے مسلسل پکارے گئیں۔ تو اسے باہر آنا پڑا ———

اس نے مہندی رنگ کا جال والا دوپٹہ سر پر ڈالا اور منہ ٹیکائے باہر آ گئی۔ شہباز نے اسے جن پیاسی نظروں سے دیکھا وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ مگر اس نے مسکرانے کی بجائے ——— ماتھے پر ایک شکن پیدا کر لی۔

"جی آپا ———"

"بیٹی وہ سامنے میز پر چائے لگی ہے۔ ذرا ایک پیالی میرے لئے ——— اور ایک شہباز کے لئے بنا لا ———"

نیا سعادت مندی سے گئی اور چائے بنا لائی۔ چائے کچھ دو رہی نہ تھی۔ شہباز بھی بنا سکتا تھا۔ مگر اسے معلوم کیوں باہر بلایا گیا۔ "تم بھی ایک پیالی پی لو ———" آپا نے چائے اس کے ہاتھ سے لیکر کہا۔

"اچھا جی ——— نیا نے آہستہ سے کہا اور اپنے لئے چائے بنانے لگی۔ نیا جس طرف بھی جاتی۔ شہباز پاگلوں کی طرح اس کی جانب دیکھتا۔ مگر نیا اس سے آنکھ نہیں ملا رہی تھی ——— نہ اس

کا کوئی پیغام لیتی اور نہ اشارہ سمجھتی۔

خفا ہوگئی ہے ـــــ شہباز سمجھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ اسے کیسے منائے

کی پیالی لے کر اندر جانے لگی۔ تو آپا بولی۔

"آؤ دلہن تم بھی ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔" وہ کرسی اٹھا لائی اور اُن کے پاس بیٹھ گئی

گئی اور چائے پینے لگی ـــــ شہباز آنکھوں ہی آنکھوں میں نیا کو پینے لگا مگر نیا کا

شاید وہ اپنی خفگی چھپا رہی تھی ـــــ

"دلہن! تمہارے ہاتھ پاؤں کی مہندی ہلکی ہوگئی ہے اور کیوں نہیں لگاتی۔ نیا پر

تانو آتی ہے۔ تو اس سے کہتی ہوں اور مہندی لگا دے۔"

ایک اور مصیبت ـــــ

نیا نے دل میں سوچا ـــــ

ابھی وہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہ پاس پڑوس کے لوگ آ گئے۔

"آہا با ہر محفل جمی ہے ـــــ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ آپا اپنی بہو اور بیٹے کے

"بھئی کیا کروں ایک میری دائیں آنکھ ہے اور دوسری بائیں آنکھ ـــــ" آپا نے

نیا کا ماتھا چوما۔ نیا نے کھڑے ہو کر سب کو کرسیاں پیش کیں۔ پھر رات تک یہی عالم رہا کو

آ رہا ہے ـــــ کوئی مبارک باد دینے ـــــ نیا چائے بناتی رہی۔ مہمانوں کو پیش کر

تانو بھی آ کر اُن میں شامل ہوگئی ـــــ رات کو سبھوں نے اکٹھے صحن میں کھانا کھایا ـــــ

خفگی چھپا کر ہر ایک سے مسکرا مسکرا کر ملنا پڑا ـــــ

بارے ـــــ رات کے دس بجے کہیں آپا نے ان کی جان چھوڑی۔

نیا پہلے اندر آ گئی ـــــ جلدی سے کپڑے بدل کر اس نے کمرے کی بتی بجھا دی

پر لیٹ گئی۔ جانے کیوں آپ ہی آپ اس کی آنکھوں میں آنسو آتے گئے۔ شہباز اس

اندر آ گیا۔

اس نے دروازہ اندر سے بند کر کے بتی جلا دی۔

نیا نے تکیہ اٹھا کر اپنے منہ پر رکھ لیا۔ کتنے ارمانوں سے وہ تیار ہوئی تھی ـــــ کتنی امنگیں تھیں

اس کے دل میں ـــــ وہ آتے ہی اس کے گلے میں اپنی ہتھنلیں بانہوں کے ہار ڈالنا چاہتی تھی۔

آنکھوں کے ساغر اور ہونٹوں کی صراحی پیش کرنا چاہتی تھی ـــــ

وہ محبت کی ایک نئی ادا پیش کرنا چاہتی تھی ـــــ

دھک دھک کرتے دل سے جو وصل کے نغمے اُبل رہے تھے۔

اس کے سینے سے لگ کر اسے سنانا چاہتی تھی ـــــ

آج وہ ..... وہ ..... یہ سب اپنی مرضی سے کرنا چاہتی تھی۔

اور شہباز کو ذرا بھی تو اس کے معصوم دل کا خیال نہ آیا تھا۔ وہ یہ تو نہیں چاہتی کہ وہ اپنی ماں

کی خدمت نہ کرے۔ ہاں وہ لحظہ بھر کو اندر آ سکتا تھا ـــــ کسی بہانے ـــــ کسی حیلے سے ـــــ

شہباز بے تابی سے چلتا ہوا جب اس کے قریب آیا ـــــ اور تکیہ ہٹا کر اس کے آنسوؤں

سے بھرے چہرے پر جھکا ـــــ تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیل دیا ـــــ اور کروٹ

بدل کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

ت لی قو

اُس رات کو نیّا کو پتہ چلا کہ ذرا سی لڑائی وصل کے لمحوں کو کتنا خوبصورت بنا دیتی ہے۔ روٹھنے
مزہ ہے۔؟ اور منانا کتنا بھلا لگتا ہے؟ ہر کروٹ ایک نیا باب کھولتی ہے اور ہر باب کے
ہوتے ہیں۔

اور پیار کے ان لمحات میں کتنا بڑا مرد عورت کے ہاتھ کی انگشتری بن جاتا ہے۔ جسے جب
وہ مٹھی میں دبا لیتی ہے۔ نیّا پر جب یہ انکشاف ہوا۔ تو اسے شہباز سے کوئی گلہ نہ رہا۔ گو بڑا
ذرا سی بدمزگی تھی۔ شہباز نے سو بار، سو طرح سے معافی مانگ لی تھی اور پھر اس کا معافی مانگ
اتنا خوبصورت تھا کہ نیّا کے دل کا سارا میل جاتا رہا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ دفتر سے واپس
کے قدموں میں ___ جائے۔ دفتر سے لے کر گھر تک وہ منصوبے باندھتا آیا تھا۔ یوں کہ
اس طرح ملے گا۔ یہ کہے گا۔

مگر پھر ماں کے آگے مجبور ہو گیا۔

اس نے اپنی ماں کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی تھی۔ جوانی میں وہ بیوہ ہو گئی۔ تکلیفیں اٹھا کر
پوسا، سارے زمانے کا تنِ تنہا مقابلہ کیا۔

میرے سوا اور اب تمہارے سوا اس کا دُنیا میں کون ہے۔؟ میں نہیں چاہتا ہمارے

وہ روایتی بدمزگی پیدا ہو۔ لوگ یہ کہیں گے کہ اکلوتا بیٹا تھا۔ بہو کے آنے سے بدل گیا۔ پہلے
لوگ انہیں طرح طرح کی باتیں کہتے ہیں۔ تم پڑھی لکھی اور مہذب لڑکی ہو، مجھے امید ہے۔ تم
ری آپا کا خیال رکھو گی۔ اور اگر کبھی ان کی کوئی بات بُری بھی لگے تو نظر انداز کر دو گی۔ تم جوان ہو تم
برداشت کا مادہ ہے۔ اگر ان کی دل آزاری ہوئی تو تم میں سے کوئی بھی سکھی نہ رہ سکے گا۔ کیا
نے تمہارے بارے میں صحیح اندازہ لگایا ہے نیّا؟"

نیّا کو اپنے آپ سے شرم آنے لگی ___ پہلی بار کتنی معمولی بات پر اس خفگی کا اظہار کر دیا تھا
ی جلد بازی کر دی۔ اس نے اپنے مہکتے ہوئے کھُلے بالوں والا سر۔ شہباز کی خوب صورت چھاتی
کا دیا۔ گویا اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ اچھی بہو بن کر دکھائے گی۔ اپنے شوہر کا اعتماد حاصل کرنا اس
نیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ اور اس رشتے سے بڑھ کر کوئی رشتہ نہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔

"نیّا" شہباز نے اس کے معطر گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں اتنا اور بتا
ں میری آپا ذرا درشت مزاج ہیں ___"

"میں جان گئی ہوں"، نیّا نے آہستہ سے کہا۔

مگر دل کی بہت صاف ہیں۔ بعض دفعہ کھری کھری سنانے سے ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اگر
کشادہ دلی کا ثبوت دو گی تو اس گھر کی رنجشیں کبھی گھر سے باہر نہ جائیں گی۔ ورنہ تم جانتی ہو۔ دنیا میں
کوئی تماشائی ہے۔ اپنا ہو یا غیر تماشا ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر ہم میں برداشت کی قوت ہو۔ اور
ہم اپنی ذرا ذرا سی باتیں دل میں ہی رکھیں تو وہ افسانہ نہیں بنتیں۔" اس نے پرامید نظروں سے نیّا
کی جانب دیکھا۔

نیّا اس کی نظروں کو مایوس کرنا نہیں چاہتی تھی۔

نیّا ایک آئیڈیل بیوی اور آئیڈیل بہو بن کر دکھانا چاہتی تھی۔

لیٹے لیٹے نیّا ایک بہادر عورت بن گئی۔ ایسی بہادر عورت جو حالات کے سامنے چٹان کر
کھڑی ہو جاتی ہے اور دُنیا میں ایک مثال چھوڑ جاتی ہے۔

اور یہ ساس بہو کے تنازعے تو بالکل روایتی تھے۔ یوں سوچ لیا جاتا ہے۔ تو بدمزگی جاتی ہے۔ ورنہ کیا، تُو تُو مَیں مَیں۔ اپنی ماں کے ساتھ نہیں ہو جاتی۔ شکر رنجیاں تو اپنے شوہر کے ساتھ بھی ہو جاتی ہیں۔ جہاں کچھ لوگ رہتے ہیں۔ وہاں نظریات و سماجی اختلاف ضرور ہیں۔

ایک فریق صاحب عقل ہو اور تعلیم یافتہ ہو۔ تو بہت اچھا گزارہ ہو جاتا ہے۔ مسئلے تب سر اٹھاتے ہیں۔ جب دونوں فریق ایک ہی رکاب میں پاؤں ڈالنے کی کوشش اس دنیا میں کچھ لوگ اچھے بھیجے گئے اور کچھ بُرے۔ نہ تو ساری دنیا اچھی ہے اور نہ سبھی لوگ اچھے بُرے مل کر گزارہ کر رہے ہیں۔ اچھے ہمیشہ برائی پر پردہ ڈال دیتے ہیں ——"

اب نیّا اتنی بچّی نہ تھی کہ اس کی یہ باتیں نہ سمجھ سکتی۔ اس نے شہباز کے منہ پر ہاتھ رکھ کر "آپ تو بے حد سنجیدہ ہوتے جا رہے ہیں"۔ شہباز ہنس پڑا۔

"میں تم سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر بیٹھا ہوں"۔

"کچھ غلط نہیں کیا آپ نے ——"

"تم نہیں جانتیں تمہیں پانے کے بعد میں بزدل ہو گیا ہوں"۔

"دنیا کی کوئی بدمزگی ہم دونوں کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی"۔ نیّا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ سمجھتے ہیں میں شیشے کی عورت ہوں۔ اور ذرا سی ٹھوکر سے ٹوٹ جاؤں گی۔ میں ارادے کی عورت ہوں"۔

"اچھا ——"۔ شہباز کی آنکھوں میں مرد اتر آیا۔ "دِکھتی تو بالکل شیشے کی ہو۔ اور ہاتھ لگا یوں سمٹتی ہو جیسے ٹوٹ جاؤ گی ——"

"بے شرم ——"۔ نیّا نے دوبارہ لیٹ کر تکیہ اپنے منہ پر رکھ لیا۔ "بس اِدھر اُدھر کی آپ اپنے اصل موضوع پر آجاتے ہیں۔ ابھی کتنے سنجیدہ ہو رہے تھے۔ میں تو ڈر گئی تھی"۔

"میں تمہیں ڈرا رہا تھا؟ لیکن تم نہیں جانتیں۔ تمہیں دیکھ کر میرا دِل ڈرتا ہے"۔

"کیوں بھلا ——؟"

"کیوں بھلا ——" شہباز نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ "اتنی خوبصورت عورت اور وہ بھی مجھ جیسے کم مایہ آدمی کے مقدر میں ——"

"مگر یہ تو ایک حقیقت ہے ——؟"

"ہے تو ——"

"پھر کیوں ڈرتے ہیں؟"

"کہیں تم ——"

"کیا —— کہیئے نا ——"

"آپا ہے نا۔ آپا —— اگر تمہاری ان سے بنی تو ——"

"تو کیا ہو گا۔؟"

"یہی سوچ کر ڈر جاتا ہوں ——"

"ڈرپوک ہیں آپ —— بھلا کیوں نہ بنے گی آپا سے۔ میں انہیں سمجھنے کی کوشش کروں گی۔ ہم سب مل جل کر رہیں گے۔ اور جب تک میں زندہ ہوں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو گی"۔

"سچ نیّا ——"

"جی ہاں ——"

"تب میں تم سے عشق ہی نہیں کروں گا۔ تمہارا احسان مند بھی رہوں گا"۔

"جناب یہ احسان والا رشتہ بیچ میں سے ہٹا لیجئے —— وہ دوسری بات ٹھیک ہے۔ میں تم سے عشق کرتا رہوں گا"۔ نیّا نے آنکھیں بند کر کے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ زندگی بھر یونہی مجھ سے عشق کرتے رہیں۔ اسی انداز میں، ہمیشہ ہمیشہ اور میں آپ کے لئے ہر طوفان سے ٹکرا جاؤں گی"۔

"نیّا ——"

شہباز کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا۔ سو اسے اظہا

"آپ کو معلوم ہے وقت کیا ہوا ہے۔؟" کافی دیر بعد نیّا نے اسے احساس دا

"نہیں تو ——"

"تین بج رہے ہیں۔"

"سچ ——؟ یہ آج کل وقت اتنی جلد کیوں گزر جاتا ہے۔"

"آج کل آپ بے صبرے ہو رہے ہیں۔ ورنہ وقت اپنی چال نہیں بدلتا۔"

"اچھا اب مجھے سُلا دو ——"

"جگانا آپ کا کام ہے اور سلانا میرا —— یہی نا؟"

"ہاں" شہباز ہنسنے لگا۔

"صبح سات بجے آپ کو دفتر بھی تو جانا ہے۔"

"تم اطمینان سے سوتی رہنا۔ میں چلا جاؤں گا۔"

نیّا نے سرہانے پر سر رکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پھولوں اور پتیوں

ہے۔ نیند بھی جیسے تاک میں تھی۔ بے فکری اور آسودگی کی خوبصورت نیند، پلکوں کے جھ

ایک سہاگن کو لوریاں دینے لگی۔ لوری کے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے ——"

میں تمہاری رازداں ہوں۔

میں تمہارے بستر کی ہر شکن کا راز جانتی ہوں۔

میں تمہاری مہربان ہوں۔

تمہیں آرزوؤں کا جھولا جھلاؤں گی۔ مگر جب تم تھک جاؤ گی۔

اور سونا چاہو گی۔

لوری سنتی سنتی —— نیّا نیند کے ہلکورے کھاتی اِک بیہمانِ حسن و عشق میں کھو گ

سو گئی تھی۔

جانے شہباز کب اُٹھ کر دفتر چلا گیا تھا۔

وہ حسبِ معمول نو بجے اٹھی۔ اٹھنے کو کب دل چاہ رہا تھا۔ ذرا کروٹ بدلی تو سامنے گھڑی پر

ر پڑ گئی۔ سوئی کو نو کے ہندسے پر دیکھ کر فوراً ہی گڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ سُسرالی گھر میں اتنی دیر تک

ونا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اُٹھ کر نہائی دھوئی کپڑے بدلے۔ اور باہر برآمدے میں چلی گئی۔ جرنیل

حسبِ معمول سبزی صاف کر رہی تھیں۔ نیّا نے سلام کیا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف

یکھا۔ ایک بار اس کی طرف سرسری نظروں سے دیکھنے کے بعد —— جرنیل آپا گویا دوسری

ر دیکھنے پر مجبور ہو گئیں۔ نکھرا نکھرا، ستھرا ستھرا، چمکا چوندچہرہ —— جس سے کرنیں پھوٹ

ہی تھیں۔ وصل کے بعد دلہن کے مکھڑے سے چاند تاروں کی کرنیں پھوٹا کرتی ہیں۔ کبھی

ونٹوں سے —— کبھی رخساروں سے —— عجیب بات ہے —— اس پیمانے

ورات بھر میں جتنا خالی کیا جاتا ہے۔ دن کو اتنا ہی بھر جاتا ہے۔ رُوپ کا یہ سمندر شادی کے بعد

یلتا ہی جاتا ہے —— باغبان پھولوں اور کلیوں کو جی بھر کر نوچتا ہے۔ مگر صبحدم نئے شگوفے

رنتی کلیاں پھوٹ آتی ہیں۔

جرنیل آپا گو اپنے کام میں مصروف تھیں۔ مگر کنکھیوں سے نیّا کو بھی دیکھے جا رہی تھیں۔ نیّا

کے چہرے پر کوئی ایسی بات تھی جو انہیں بار بار دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اور جتنی بار اس کے صبیح

ہرے کی طرف دیکھتیں۔ اتنی ہی بار ان کے دل پر گھونسہ سا لگتا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے ——؟

رنیل آپا کے ذہن میں کوئی اسکیم ٹھیک نہیں بیٹھ رہی تھی۔ بالآخر انہوں نے بڑی بیدلی سے

ہا "باورچی خانے میں تمہارا ناشتہ پڑا ہے۔"

نیّا جلدی سے اٹھی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ غلیظ مائی حسبِ دستور برتن مانجھ رہی تھی

باورچی خانے سے عجیب و غریب بو آ رہی تھی۔ اور وہ اس گندے غلیظ باورچی خانے میں کنول

کا پھول بنی کھڑی تھی۔ یوں گھونٹ گھونٹ چائے پی رہی تھی —— جیسے فانوس تلے بیٹھی انگور

ارس پی رہی ہو۔

پھر پورا ہفتہ سکون سے گزر گیا۔

اور گھر کا ایک معمول سا بنتا گیا۔

شہباز دفتر سے آکر اپنی ماں کے پاس ضرور بیٹھتا تھا۔ اگر وہ کہیں کترا کر آگے جانے کی کوشش کرتا تو ماں روک لیتی تھی اور اس بات کی چونکہ شہباز نے کافی وضاحت کر دی تھی۔ اس وا
اب بُرا نہیں مانتی تھی۔ بلکہ اس نے بھی ایک حل ڈھونڈ لیا تھا۔ شام کو بن ٹھن کر وہ اپنی سا
پاس آکر بیٹھ جاتی۔ وہیں پر شہباز بھی آکر بیٹھ جاتا۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر نثار ہو
اپنی ماں کی موجودگی میں وہ بڑا شرمیلا اور فرمانبردار نظر آتا تھا۔ نہ بے حجابانہ اس کی طرف دیکھ
اور نہ بے تکلفانہ ہنسی مذاق کر سکتا تھا۔ کبھی سر جھکا لیتا اور کبھی کنکھیوں سے اس کا نظارہ
شہباز کی اس بے بسی والی کیفیت پر نیّا کو دل ہی دل میں بہت ہنسی آتی ـــــ اسے گد
کرتی رہتی، اور اس کے تڑپنے کا تماشا بھی کرتی رہتی ـــــ یوں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر چھوٹ
کام کرتی رہتی۔ کبھی چائے بنا کر لے آتی۔ کبھی شربت پیش کرتی ـــــ کبھی اچانک آجانے والے
کی تواضع کرتی ـــــ اور کبھی کوئی رسالہ لے کر بیٹھ جاتی۔ اور یوں ہر نیا دن خوبصورتی کے ساتھ

جمعرات کو نیّا نے اپنی امی کے گھر جانے کا پروگرام بنایا تھا وہ دونوں رات وہیں رہیں گ
اگلے دن جمعہ تھا۔ اور شادی کے بعد اب تک نیّا اپنے میکے نہیں گئی تھی۔ شہباز نے اسے
ہی بتا دیا تھا کہ اصولی طور پر اسے آپا سے اجازت لینا ہوگی۔ نیّا چاہتی تھی کہ شہباز خود
کو بتا دے۔ اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ آخر وہ اپنی ماں کے گھر جا رہی ہے ـــــ
شہباز کے کہنے پر اس نے صبح ہی آپا سے بات کر لی تھی، اور آپا نے بادلِ نخواستہ اجاز
دے دی تھی۔

جب شہباز دفتر سے واپس آگیا۔ تو وہ اپنے کمرے میں جا کر تیار ہونے لگی۔ ایک چ
اٹیچی میں اس نے ایک جوڑا اپنا اور ایک شہباز کا رکھ لیا اور ضرورت کی ہر چیز بند کر لی
اسی شہر میں تھا۔ مگر نیّا کو آج ایک نیا احساس ہو رہا تھا۔ ماں کے گھر جانا کتنا بھلا لگتا ہے

ماں کا گھر کیا ہوتا ہے بھلا ـــــ؟

جب تک لڑکی میکے میں رہتی ہے۔ والدین کے گھر کی قدر نہیں کرتی۔ مگر جب سُسرال
جاتی ہے۔ تو اپنا میکہ [illegible] کی طرح نظر آنے لگتا ہے ـــــ جہاں محبت کس رکھ کر
سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا۔

ابھی وہ سامان ٹھیک کر رہی تھی کہ جرنیل آپا اندر آگئیں۔ شہباز احتراماً کھڑا ہو گیا۔ وہ آتے ہی
پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ کمرے میں سے بڑی پیاری خوشبوئیں آرہی تھیں۔ جیسے اس کمرے
لہن ہی دلہن ہو ـــــ"

"کب تک آجاؤ گی بیٹی ـــــ؟" جرنیل آپا نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

حالانکہ صبح وہ انہیں پورا پروگرام بتا چکی تھی ـــــ نیّا نے پہلے شہباز کی طرف دیکھا۔ جب
ہیں بولا۔ تو خود ہی بولی ـــــ"

"کل شام کو آجائیں گے۔"

"جلدی آجانا بھئی ـــــ اب میرا تمہارے بنا دل نہیں لگتا۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑے گا۔"
جواب دیتی۔ جب اس نے کہہ دیا تھا، کہ وہ کل شام کو آئیں گے۔ پھر بھی اس نے آہستہ سے کہا۔

"جی اچھا ـــــ"

"اپنا کمرہ بند کر کے جاؤ گی ـــــ؟" جرنیل آپا نے پوچھا۔

نیّا کو ان کے لہجے سے بالکل پتہ نہ چلا کہ آخر وہ کیا چاہتی ہیں کمرہ بند کیا جائے یا کھلا چھوڑ دیا
ـــــ! مگر اس نے جواب فوراً سوچ لیا۔ بولی، "آپ جو ہیں گھر میں، کھلا چھوڑ جاؤں گی۔"

"نہ بابا میں ذمہ نہیں لیتی۔" انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "دلہن کے کمرے میں ہزاروں
یاں ہوتی ہیں۔ میں پہرہ نہیں دے سکتی۔"

"تو یہاں کون آئے گا۔" نیّا نے ہنس کر کہا۔

"وہ نامراد مائی بھی تو ہے ـــــ اپنے پوتے نواسے لے کر آجاتی ہے ـــــ میں سارا دن

گھر میں تو نہیں بیٹھی رہوں گی۔ تم جاؤ گے تو میں بھی اپنے کسی عزیز سے ملنے جاؤں گی۔

"ایسا کرو۔ تالا لگا کر چابی آپا کو دے دو ——" شہباز نے نرمی سے کہا۔

شہباز دفع ہے ——" نیا نے ہامی بھر لی۔ "کل آپ ماتی نہ کرنے کی بھی کرا دیں۔"

"نہ بابا، صفائی تو تم خود آ کے کروانا۔ میں اس ذلیل کو اندر نہ گھسنے دوں گی۔ اتنی محنت سے اپنا کمرہ سجایا ہے —— کہیں وہ کچھ توڑ پھوڑ نہ دے۔"

نیا ہنسنے لگی۔

جرنیل آپا کھڑی ہو گئیں۔ اور بولیں۔

"دیکھو تو کتنا خوبصورت لگ رہا ہے کمرہ —— صاف بول رہا ہے کہ ایک سگھڑ رہتی ہے مگر —— مجھے تو ہمیشہ دلہن کے کمرے میں ایک ٹی۔ وی کی کمی محسوس ہوتی اگر اس کے ابا ایک ٹی وی لے دیتے تو کیا ہو جاتا ——"

پہلی بار نیا اپنی جگہ پر لرز گئی۔ زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ جرنیل آپا باہر نکل گئیں اور شہباز نے صرف معذرت طلب نظروں سے نیا کی طرف دیکھا۔ جلد سنبھل گئی۔ سامان لے کر باہر آئی۔ تالا لگا کر چابیاں اپنی ساس کو دیں اور خدا حافظ کہہ گئی۔ نیچے اتر کر جب وہ شہباز کے اسکوٹر پر بیٹھی، اور زندگی میں پہلی بار اس نے کی کمر کے گرد بازو حمائل کیا تو وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی۔

امی جان کو منانا کچھ مشکل کام نہیں تھا۔ بیٹی سسرال کی ہو جائے۔ تو اس کی ماں کا دل دھڑکتا ہے۔ اس کی ذرا سی آرزو اس کی ماں سے دیکھی نہیں جاتی۔ نیا کا سے دیکھا نہیں گیا۔

"اگر آپ مجھے ٹی وی لے کر دے دیتے تو کیا کمی آ جاتی۔!"

"بیٹی تمہارے ابا نہیں مانتے تھے۔"

"آپ انہیں منا سکتی تھیں۔ اب دیکھیں نا، گھر گھر میں ٹی۔ وی چل رہا ہے۔

گھر کی ایک ضرورت ہے۔ کیا مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔"

"مگر تمہاری سسرال میں تو ٹی۔ وی ہے ——"

"وہ ان لوگوں کا ہے، اور پھر اسکرین بھی چھوٹی ہے۔ اگر میں اپنے کمرے میں رکھ کر دیکھنا چاہوں تو کیا کروں ——؟"

"کچھ دن صبر کرو۔ کسی موقع پر لا دیں گے۔"

"نہیں میں تو آج ہی —— ابھی لے کر جاؤں گی۔"

پہلی بار سسرال سے آ کر نیا نے فرمائش کی تھی۔ امی جان کا دل پسیج گیا۔ ابا جان سے اجازت لینے میں بہت سے مرحلے آتے۔ اور بھائی بھی چوں چرا کرتے۔ اس واسطے امی جان نے شہباز کے ہاتھ پر پیسے رکھ دیئے۔ خود نیا اور شہباز بازار جا کر اپنی پسند کا ٹی۔ وی لے آئیں۔

دوسرے دن شام کو جب نیا اپنی سسرال واپس آئی۔ تو ٹیکسی میں ایک بڑا ۲۶" کا رنگین ٹی وی بھی تھا۔

ساس نے یوں استقبال کیا۔ جیسے لکشمی گھر میں اتری ہو۔

اس رات ٹی وی ان کے گھر کا موضوع رہا۔ اسی وقت دلہن کے کمرے میں رکھ دیا گیا۔ محلے داروں کو دکھانے کے لئے دوسرا انٹینا ذرا زیادہ اونچا لگایا گیا۔ رنگین پروگرام دیکھنے کا سبھوں کو لطف آیا۔ نتیجتاً سب لوگ رات دیر تک نیا کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ اور نیا کو یہ بندوبست کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔

نیا اپنے کمرے کو جھاڑ صاف کر کے باہر نکلی تو دیکھا جرنیل آپا اپنی سہیلی کے ساتھ
خوب باتیں کر رہی ہیں ـــــ نیا سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔

"جیتی رہو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو ـــــ" آپا کی سہیلی نے لمبی چوڑی دعا دے

"کیا کر رہی تھیں بہو ـــــ ؟"

"جی میں اپنا کمرہ صاف کر رہی تھی۔" نیا مؤدبانہ بولی۔

"ماشاءاللہ بڑی اچھی بہو مل گئی ہے تمہیں ـــــ" وہ جو تھوڑی دیر پہلے بہو کو نکما
کے گر بتا رہی تھیں۔ خوشدلی سے گویا ہوئیں۔

"صدقے جاؤں ایک تو صورت اتنی پیاری ہے۔ اوپر سے طبیعت کی نفاست کہ
کہنے ـــــ !"

"میں دیکھ لوں تمہارا کمرہ بیٹی ـــــ ؟"

"جی ہاں ـــــ" نیا کھڑی ہو گئی۔

آگے آگے آپا درمیان میں ان کی سہیلی اور سب سے پیچھے نیا اندر داخل ہوئی۔

"واہ کیا کہنے ـــــ ؟" انہوں نے کمرے کی بتی جلا دی ـــــ "کتنا پیارا سجایا ہے کمرہ

صاف پتہ چل رہا ہے۔ ایک سلیقہ شعار بہو کے ہاتھ لگے ہیں۔"

نیا خوشی سے مسکرا دی۔

"ہوں۔ تو یہ سارا سامان بہو میکے سے لائی ہے۔" ؟

جرنیل آپا نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

"ارے کیا یہ ٹی۔ وی بھی دلہن کا ہے ـــــ شادی کے دن تو دکھا نہیں ؟"

"اب لائی ہے۔" جرنیل آپا منہ سکوڑ کر بولی۔ اماں کو بعد میں یاد آیا۔

"ماشاءاللہ ـــــ ماشاءاللہ ـــــ" ان کی سہیلی واری نیاری ہوتے ہوئے بولی: اللہ
نصیب کرے۔ سارا گھر بھر دیا ہے بہو نے ـــــ اللہ اس کی گود بھر دے۔"

اس دعا پر نیا شرما کر دہری ہو گئی۔

"بیٹھیں نا ؟" نیا نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں جلدی سے بیٹھ گئیں۔

"اے شمیمہ! بتانا تو کیا حال ہے بتول کا اور اس کی بہو کا۔" آپا نے بیٹھتے ہی ایک سوال داغا۔

اب نیا بھی پلنگ پر بیٹھ چکی تھی۔

"بہت مزے میں ہیں۔ بہو کے معاملے میں وہ بھی قسمت کی دھنی نکلی ہے۔"

"ہاں میں نے بھی سنا تو یہی ہے۔"

"نصیب سے ایسی لڑکی مل گئی ہے۔ دنیا جہان کی چیزیں وہ بھیز میں لاتی ہے۔ اور
طبیعت کی اتنی اچھی ہے کہ اپنے جہیز کا سارا سامان اس نے ڈرائینگ روم میں سجا دیا ہے۔
اپنا ٹی۔ وی۔ ریفریجریٹر۔ کراکری اور فرنیچر سب گھر میں استعمال کے لئے رکھ دیا ہے۔ اب تو ان
کا گھر دیکھا نہیں جاتا۔"

"ہاں بہن۔" جرنیل آپا نے ہاں کو ذرا لمبا کر دیا۔

"بڑی عالی دماغ لڑکی ہے۔ بڑے گھرانے کی بیٹی ہے۔ ماں نے اچھی تربیت کی ہو گی۔

میں نے تو پہلے بتول سے کہا تھا کہ تیرے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔ ارے اس کی ایک چھو
بھی ہے۔ ہمارے شہبّن کیلئے کہہ رہے تھے۔ میں نے دیکھی بھی تھی۔ رنگ ذرا زیادہ سانو
نے دل میں سوچا اتنی دولت لے کر کیا کریں گے۔ میرا شہبّن تو شہزادہ ہے۔ میں تو کوئی خوبرو
بھولا ڈل گی۔ دولت کا کیا ہے۔ یہ تو ہاتھ کا میل ہوتی ہے۔"

"تو تمہاری اللہ نے سُن لی کیسی پری اُڑا لائی ہو! اچھا بہن اب میں چلتی ہوں۔" آپا کی
کھڑی ہوگئی۔ آپا بھی کھڑی ہوگئیں۔ نیّا بھی کھڑی ہوگئی ـــــ مگر جیسے اس کا دل بیٹھ گیا۔ جا
یہ کیوں محسوس ہوا کہ یہ سب کچھ اسے سُنانے کو کیا جا رہا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ وہ بہت زیاد
نہیں لائی تھی۔ مگر کچھ ایسا کم بھی نہ تھا۔

پورا ہفتہ وہ دل ہی دل میں اُبلتی رہی ـــــ پھر جب جمعہ آیا تو وہ میکے نہیں گئی۔
کو ساتھ ملا کے صفائیاں کرنے کا پروگرام بنا ڈالا۔ پچھلے ہفتے جب وہ امّی سے مل کر آ رہی
بازار سے سرخ حریری پردے بھی لیتی آئی تھی۔ یہ پردے اس نے اپنے بیڈ روم کے لئے
تھے۔ مگر اب اس کا ارادہ بدل گیا تھا۔ پہلے اس نے اپنی مشین نکال کے ـــــ ڈرائینگ
لئے نئے پردے سیئے ـــــ اور پھر سارا سامان نکال کر باہر رکھ دیا۔ نئے پردے ٹنگا
بعد اس نے اپنے جہیز کا نیا صوفہ۔ ڈائننگ ٹیبل کرسیاں، سائڈ بورڈ۔ نئی کرسیاں سب
ڈرائینگ روم میں سجا دیا۔ حتّٰی کہ اپنا نیا ٹی وی بھی یہیں رکھ دیا۔ قالین جھاڑ کر دوبارہ بچھایا
کا استعمال شدہ پرانا صوفہ ٹی وی، اپنے بیڈ روم میں لگا لیا۔ شہباز نے کمرہ دیکھا تو ذرا
اداسی سے بولا۔

"تم نے اپنی سب چیزیں وہاں کیوں رکھ دیں نیّا۔"

"پھر کیا ہوا ـــــ؟ یہ بھی تو میرا گھر ہے۔"

"مگر ابھی تو تم خود دُلہن ہو۔ سب تمہارے کمرے میں آ کر بیٹھتے ہیں۔ تمہاری امی کیا کہیں
میری امّی ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتیں۔ انہوں نے مجھے سب کچھ دے دیا ہے۔ اب یہ مجھ

ہے۔ کیا کرنا ہے، اور کیا نہیں ـــــ ویسے بھی رات گئے تک لوگ میرے کمرے میں بیٹھ کر
رنگین ٹی۔ وی دیکھتے ہیں۔ اب ہمیں جلدی سونے کو وقت مل جایا کرے گا۔" وہ مسکراتی اسی وقت
آپا کمرے میں آ گئیں۔

"میں صدقے جاؤں، میں واری جاؤں ـــــ میری بیٹی نے تو کمال کر دیا۔ کتنے اچھے
نصیب ہیں تمہارے شہبّن، ماں کی دعا سے کیسی بھاگوان دلہن نصیب ہوئی ہے ـــــ"

شہباز شرما کر باہر نکل گیا۔ ویسے بھی وہ نیّا کا منہ دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اپنے
کمرے میں چلا گیا۔ اسے بہتر داد تو اپنے کمرے میں ہی دی جا سکتی تھی۔

آپا تھوڑی دیر ڈرائینگ روم میں بیٹھی رہیں۔ پردوں کی خاص طور پر تعریف کی۔ پھر کہنے لگی "سچ
پوچھو تو بیٹی۔ ٹی وی ڈرائینگ روم میں ہی اچھا لگ رہا ہے۔ تمہارے کمرے کے لئے وہی چھوٹا
ٹی وی موزوں ہے ـــــ واہ بھئی واہ ـــــ اب تو میں بتول کو بلا کر ڈرائینگ روم دکھاؤں گی ہاں"
وہ کھڑی ہوگئیں۔ "سب چیزوں میں یہ ایک پرانا قالین کتنا بُرا لگ رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے اس کو دھلوا لیں۔" نیّا بولی۔

"ارے دھلوانے سے کوئی اس کا سائز بدل جاتے گا۔ میرے خیال میں اگر پورے کمرے کے
برابر کا قالین آ جاتا تو کتنا اچھا ہوتا ـــــ"

"کتنا اچھا ہوتا ـــــ" صدائے بازگشت کی طرح نیّا کے کانوں میں یہ الفاظ گونجتے رہے۔

صبح سے کام کر رہی تھی۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ رات جب وہ سوئی تو شہباز اس کی پژمردگی
کو تھکاوٹ سے تعبیر کرتا رہا۔ بلاشبہ بہت زیادہ خوش تھا۔ لیکن نیّا ایک عجیب سے دوراہے
پر کھڑی تھی۔

اسے قالین کے بارے میں امّی جان سے کہنا چاہیئے یا نہیں ـــــ پچھلے ہفتے ہی تو انہوں
نے اتنا مہنگا ٹی وی لے کر دیا تھا۔ بہرحال موقع دیکھ کر بات تو ہو سکتی تھی نا ـــــ؟ جو نیل آپا کی بڑی
خواہش تھی۔ کہ ان کے گھر میں بجلی کی تمام چیزیں ہوں۔ مگر نیّا کو ٹوسٹر کے علاوہ امّی نے اور کچھ نہیں

دیا تھا۔ جب اس نے صبح کو اپنا ٹوسٹر لاکر میز پر رکھا تو آپا جھٹ بول اُٹھیں ——

"اے بہو! اب تو دو دو کوڑی کے لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لئے بجلی کی بے شمار چیزیں دیتے ہیں۔ باڑہ بھرا ہوا ہے۔ ان چیزوں سے —— تمہاری اماں نے کیوں نہ دیں۔ امی کہتی تھیں یہ چیزیں زیادہ تر لوگ دکھاوے کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ روزمرہ کے میں کام تو آتی نہیں۔"

"اور کیا دکھاوے سے دل کی تسکین نہیں ہوتی۔ اب سارا سال تو جوس پینے اور کافی بنانے رہے۔ مگر موسم کے موسم تو یہ چیزیں اچھی لگتی ہیں۔"

نیا کے حلق میں ایک کڑوا گولا ابھرا۔ جسے اس نے گھونٹ بھر کے نگل لیا۔ پہلے تو اس نے کہ شہباز کی تنخواہ آئے گی تو وہ یہ چیزیں لاکر رکھ دے گی۔ لیکن تنخواہ کے دن بھی اچھا خاصا

نیا نے اس دن بھی غلط سی توقع وابستہ کرلی تھی۔ سوچ رہی تھی آج شہباز اپنی تنخواہ اس کے ہاتھ پہ رکھ دے گا اور ... اور —— شام کو جب وہ آیا اس کی جیب کے ذہن بھی بوجھل تھا۔ نیا جان بوجھ کر برآمدے میں نہیں گئی۔ اور آپا بھی آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر اُن کے پاس کھڑا رہا۔ ان کو سوتا پاکر جب اندر کو قدم بڑھائے تو وہ جھٹ اُٹھ کر بیٹھ

"میرا چاند آگیا —— مجھے اُٹھا کیوں نہ لیا۔ صبح سے نیند کی گولی کھائی ہے۔ اس واسطے غنودگی چھا جاتی ہے۔ آجا میرے پاس بیٹھ جا ——" تنخواہ کے دن آپا میٹھی میٹھی باتیں کیا تھیں۔

شہباز نے پیسے نکال کر آپا کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"جیتے رہو۔ ہزاری عمر ہو۔ آپا نے باقاعدہ نوٹ گننا شروع کر دیتے۔ اس سے پہلے وہ کبھی گنا کرتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا شہباز کی تنخواہ کتنی ہے۔ ننھا سے سگریٹ کا شوق تھا۔ نہ پان کا چائے پانی کے لئے اسے پچاس روپے دے دیا کرتی تھیں۔ آج انہوں نے بطورِ خاص گنے —— اور گن کر دوبارہ دعا دی۔ تو شہباز کا دل خوش ہو گیا۔

آپا نے خوش ہو کر سو کا ایک نوٹ نکالا۔ اور شہباز کے ہاتھ پہ رکھ دیا —— پچاس تمہارے لئے

ں بہو کے۔"

اندر کمرے میں کھڑی کھڑی نیا کا دل ڈوب گیا۔

تو یہ تھی ارمان بھرے خوابوں کی تعبیر —— پچاس روپے تو وہ کالج کی ٹک شاپ پر ایک

ہیں خرچ کر دیا کرتی تھی۔

لیکن اس نے تو شہباز سے وعدہ کر رکھا تھا کہ .... اور ہاں اس نے اپنی آنکھوں میں آتے ئے آنسوؤں کو جلدی سے اپنی ہتھیلیوں سے مسل کر صاف کیا۔ کیونکہ شہباز کے اندر آنے کی آہٹ سوس ہو رہی تھی۔

کیا تھا جو آپا جھوٹوں ہی کہہ دیتیں۔ کہ اب اپنی تنخواہ اپنی بیوی کو دیا کرو۔ وہ کونسا سارے پیسے لے لیتی۔ اس نے بھی تو آپا کو ہی دے دینے تھے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی، کہ گھر کا سارا خرچ آپا چلاتی ہیں گر دل رکھنا بھی تو کوئی بات ہوتی ہے۔ اتنے میں شہباز اندر آگیا تھا۔ اس نے نیا کا چہرہ نہیں دیکھا مگر سو کا نوٹ اس کی گود میں رکھ دیا۔ نیا جانتی تھی۔ مگر پھر بھی انجان بن کر پوچھا۔

"یہ کیا ہے ——؟"

"تمہارا جیب خرچ ——" پھر خود ہی شہباز شرمندہ سا ہو گیا۔ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور بڑی محبت بھری باتیں کرنے لگا۔ جب نیا سنجیدہ ہی رہی۔ تو کہنے لگا۔ "نیا تم غم نہ کرنا۔ مجھے معلوم ہے آج کل کے زمانے میں ایک عورت کا جیب خرچ سو روپے بالکل ناکافی ہے —— مگر —— اگلے مہینے سے میں کچھ اور بندوبست کر دوں گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پہلے مہینے سے ہی آپا یہ سوچنے لگیں کہ بیوی کے آجانے سے میں بدل گیا ہوں۔

"کوئی بات نہیں ——" نیا نے ٹوٹے ہوتے لہجے میں کہا اور نوٹ اٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا۔ میرے لئے یہ پیسے بہت کافی ہیں، اور یہاں مجھے کس چیز کی کمی ہے۔"

"شکریہ نیا تم نے مجھے مطمئن کر دیا۔"

اب اس ایک سو روپے میں یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی ساس کی آئے دن کی فر
کرتی۔ اس نے ماں کا دامن پکڑ لیا۔ ہفتے میں ایک دن میکے جاتی تھی اور واپسی پر کوئی ذکر
آتی تھی۔ جس دن کھانے کے کمرے میں بجلی کی ساری چیزیں جمع ہوگئیں۔ اور نیا کے دل
گیا تو آپا بولیں۔

"کاش تیری ماں کو ذرا سی بھی عقل ہوتی۔ تو وہ یہ سب چیزیں شادی پہ دے دیتی
اور کچھ نہ ہوتا برادری میں ہماری ناک تو رہ جاتی۔ اب کیا فائدہ یہ الابلا اکٹھی کرنے سے۔"

نیا کا جی جل ہی تو گیا۔ کس کس طرح مجبور کر کے انہوں نے یہ چیزیں منگوائی تھیں۔
طرح اس نے اپنی کمزور ماں کو مجبور کیا تھا اور کتنی بیدردی سے انہوں نے اس کے خلوص کا
چڑا دیا تھا۔

نیا خاموش ہوگئی۔ شہباز سے کہنے کا یہ مطلب تھا۔ کہ بات آگے بڑھتی۔ اور بات بڑ
کی عقلمندی ہے۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا۔ کہ اب وہ میکے سے کچھ نہیں لائے گی۔ وہ
خالی ہاتھ آتی رہی ـــــ تو ایک دن جب شہباز گھر پر نہیں تھا۔ آپا کو کہنے کا موقع مل گیا۔

"اے دلہن! سُنا ہے تمہارے ابا کے قالین والوں سے مراسم ہیں۔ ایک بڑا قالین
دلوا دو، آہستہ آہستہ پیسے ادا کر دیں گے ـــــ"

نیا تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر بولی: "ابا جی سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گی"
ہفتے جب وہ گھر گئی۔ اور اپنی امی سے ذکر کیا تو وہ سناٹے میں آگئیں۔ بولیں۔ نیا تم معصوم
ناتجربہ کار ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا۔ ایک غلط رسم کی بنیاد مت ڈالو۔ اگر تم ہمیشہ کچھ لے کے
رہیں تو تمہاری ساس کے مطالبات بڑھتے جائیں گے۔ لالچ کی چادر سے پاؤں ہمیشہ باہر
جاتے ہیں۔ اب میری تو اتنی ہستی نہیں ہے کہ میں اتنا بڑا قالین لے کر دے سکوں۔"

"ابا جی سے بات کر کے دیکھیں۔"

"تم جانتی ہو تمہارے ابا کیا کہیں گے۔ پہلی چیزیں بھی ان کے علم میں نہیں ہیں وہ تو بنا

پا کر دیں گے۔ کہیں گے سارا قصور میرا ہے۔"

"اچھی امی آپ بات تو کریں۔ شاید آپ کی بات مان جائیں۔ ہو سکتا ہے۔ وہ شادی کے بعد
بری مجبوریاں سمجھتے ہوں۔"

"ہاں ان کا موڈ دیکھ کر میں بات کروں گی۔ مگر تم اپنی ساس کو کوئی آس نہ دلانا۔

اگلے دن جب نیا خالی ہاتھ سسرال چلی گئی تو بظاہر آپا نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ مگر ان کے رویے
کافی کھنچاوٹ آگئی تھی۔

اگلی شام کا ذکر ہے۔

شہباز جب دفتر سے لوٹا تو آپا حسب معمول برآمدے میں لیٹی تھی۔ جونہی شہباز قریب آیا۔
وں نے ہائے وائے کرنا شروع کر دیا۔

"خیر تو ہے آپا ـــــ؟" وہ انکی پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔

"اوئی میں مری۔ ہائے میرے موئے ـــــ مجھے بخش دیجیو میرے مولیٰ، بڑی گنہگار ہوں۔"

"آپا کیا ہوا ہے آپ کو ـــــ"

"ہائے ہائے کچھ نہیں ہوا۔ مگر بس۔ اب مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ اور ہمت نہیں ہے۔" آپا
آنکھیں جھپک جھپک کے دو آنسو نکال لیتے ـــــ

شہباز جھٹ ان کے پاؤں دبانے لگا۔

"کیا آج زیادہ تکلیف ہوگئی ہے آپا ـــــ؟" وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔ اور ادھر ادھر جاؤں
ت دیکھ رہا تھا۔ اسے نیا اور تانو کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ تانو تو خیر روز شام کو اپنی سہیلی کے
چلی جاتی تھی۔ یہ نیا آج کہاں تھی ـــــ؟ اسے علم نہیں تھا کہ آپا نے اپنا شیفون کا دوپٹہ دھونے
لئے غسل خانے میں بھیج دیا تھا اور ساتھ میں کہہ دیا تھا۔

"اب یہ دوپٹہ اسی روپے کا ملتا ہے۔ تمہاری اماں کو توفیق نہ ہوئی کہ ایسا دوپٹہ جوڑے
ساتھ لگاتیں۔ اب دھونے میں تباہ نہ کر دینا ـــــ"

مقصد تو ان کا یہ تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے نیّا کو شہباز سے دُور کر دیں۔

شہباز بڑی سعادت مندی سے ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ ایک دم انہوں نے پاؤں کیونکہ وہ وقت ضائع نہ کرنا چاہتی تھی ـــــ اور ہانپتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

بس کرو بس ـــــ وہاں کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ تھکے ہارے دفتر سے لوٹے ہو۔ میں اپنی اولاد بھی کیا عجب نعمت ہے۔ ذرا ماں کا تڑپنا نہیں دیکھا گیا۔ مگر بیٹے۔ اب تیری میں تڑپنا ہی تو رہ گیا ہے۔"

"کیوں آپا ـــــ ؟"

"بس کیا بتاؤں۔ زندگی تو تمام کرنا ہی ہے۔"

"مگر ایسی کوئی مجبوری بھی تو بتائیں۔"

"لے کوئی مجبوری ہو تو بتاؤں۔ اب یہ میرا گھر ہے۔ میں نہ دھیان رکھوں گی تو کون رکھے گا میری زندگی کا مقصد ہی بچّوں کی خدمت رہا ہے۔ مرتے مرتے اپنے بچّوں کی خدمت جاؤں گی۔ یہی ہوتی ہے ماں کی زندگی بیٹے ـــــ" شہباز کچھ نہیں سمجھا اور خاموش بیٹھ پھر شروع ہو گئیں۔

اب کیسے جا کر سناؤں کہ اس ضعیفی میں مجھ سے گھر کا کام نہیں ہوتا۔ میں تھک جا بیدم ہو جاتی ہوں۔ دم پھُول جاتا ہے ـــــ چولہے کے قریب جاؤں تو اختلاج ہو ہے۔ چوبیس گھنٹے بیل کی طرح رہٹ کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ "بیٹے تم ہی کہو۔ یہ کوئی باتیں ہیں۔ اور بتانے سے حاصل بھی کیا ہے؟ آخر میں نہ کروں گی تو کون کرے گا۔ یہ میرا اس میں میرے بچّے رہتے ہیں۔ مرتے دم تک اس گاڑی کو کھینچوں گی، چلاؤں گی.... رہوں گی۔ ہائے کام کرتی ہی رہوں گی۔ اور ایک دن کام کرتے کرتے تمہارے دربار اٹھ جاؤں گی۔ بس بیٹے یاد کرتے رہنا۔ یہی بڑی بات ہے۔ مرنے کے بعد دُعا تو د

"آپا ـــــ آپا ـــــ" شہباز ایک دم پریشان ہو اٹھا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہی ہ

ہوں۔ اب آپ کی صحت اس قابل نہیں رہی کہ گھر کا سارا کام کر سکیں۔ اسی خاطر تو آپ نے
ی شادی کی تھی۔ اب آپ آرام کیا کریں۔"

"اور گھر کو تالا لگا دوں ـــــ"

"تانو کہاں ہے۔ نیّا کیا کرتی رہتی ہے۔"

تانو بیچاری بھی کالج سے آ کر بہتیرا میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔ وہی تو کام بانٹ لیتی ہے۔ بچّی ہے پھر پڑھنے کے دن ہیں۔ میں اس کا حرج نہیں کرنا چاہتی۔ شام کو ذرا سہیلی کے گھر انگریزی ہنے چلی جاتی ہے۔" لیکن آپا نے دانستہ نیّا کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

شہباز تھوڑی دیر بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "آپا آپ گھر کا سارا کام نیّا کے سُپرد کر دیں۔ نیّا بڑی لڑکی ہے۔ میرا خیال ہے۔ وہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دے گی۔" شہباز نے یہ سب اتنے د سے کہا تھا کہ آپا کا جی جل گیا۔ ابھی وہ کوئی جواب دینے والی تھیں کہ نیّا ہاتھ میں دوپٹہ پکڑے ار ہوئی۔ اس نے دونوں ماں بیٹے کو یوں بیٹھے دیکھا۔ تو ٹھٹک گئی۔ پھر مسکرا کر آگے بڑھی اور پہ آپا کے آگے کر کے بولی۔

"دیکھیں آپا یہ ٹھیک دھویا ہے میں نے ـــــ ؟"

"بس بیٹی تمہاری مہربانی تم نے دھو دیا، اچھا ہے یا بُرا، سب ٹھیک ہے۔ آج مجھ میں یہ ٹھاک بھر کا دوپٹہ دھونے کی ہمّت بھی نہ تھی۔ ہائے ـــــ ہائے ـــــ" آپا پھر لیٹ گئیں۔ ائے والے کا ورد شروع کر دیا۔

نیّا دوپٹے کو جھاڑ کر رسی پر پھیلانے لگی۔ اس کی آپا کی طرف پشت تھی۔ مگر اسے آپا کے ہنے کی صاف آواز آ رہی تھی۔ کہ ایک بیک آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ کیونکہ آج صبح ناشتے کے بعد ھر سے نکل گئی تھیں، اور کہہ گئی تھیں۔ میں اپنی کچھ سہیلیوں کو ملنے جا رہی ہوں۔ تم کھانا پکا ور بھی کھا لینا اور شہباز کو دفتر میں بھی بھیج دینا۔ اور ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ آئیں تو کافی ہشاش شر تھیں۔

وہ دوپٹہ پھیلا کر واپس آئی۔ اور آپا کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گئی۔ شہباز آپا
رہا تھا۔ توقف کئے بغیر بڑی نرمی سے بولا۔

"نیا اب تم گھر کا سارا کام سنبھال لو۔ آپا بیمار رہتی ہیں۔ ان کے آرام کرنے کے
نیا نے نظر اٹھا کر پہلے شہباز کو دیکھا۔ پھر آپا کی جانب دیکھا۔ آپا نے آنکھیں بند
دل تو نیا کا چاہ رہا تھا کہ وہ صاف کہہ دے کہ سارا دن تمہاری ماں مجھ سے کام کرواتی
کپڑے بھی دھلواتی ہے۔ اب اور کونسا کام رہ گیا ہے۔ مگر اس نے صرف اتنا کہا۔

"اچھا جی ——" اور نظریں جھکا لیں۔

"ہائے چار دن کی دلہن۔ اور تم اس پر کام کا بوجھ ڈال رہے ہو۔ آپا نے آنکھ
کی طرف دیکھا۔ اور پھر شہباز سے گویا ہوئیں"۔ ساری زندگی بیچاری کو یہی کچھ کرنا ہے۔
بچوں اور چولہے میں فنا ہو جانے کے لئے ہی پیدا ہوتی ہے —— پھول سی بچی پہ یہ
رہے ہو"

"یہ بوجھ نہیں ہے آپا ——" نیا جھٹ بولی "گھر کا کام کرنا معیوب نہیں ہے
کہا کرتی تھیں، کہ خوش بخت عورت ہی سارے گھر کو سنبھال سکتی ہے۔ اور پھر
ہوتی ہوں۔ ہم گھر کے افراد ہی کتنے ہیں۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس
کیا کریں"

"جیتی رہو۔ اللہ خوش رکھے" آپا نے بڑی بے دلی سے دعا دی۔ مگر ان فقط
کے چہرے پر خوشی کا ایک نیا سورج طلوع ہوا۔ اور اس سورج کی شعاعیں نیا
کر لیں۔ سو اس نے دل میں سوچا۔ اس نے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔

تو نیا جی!

یہ ہے اصل زندگی کی ابتدا ——،

امی کہا کرتی تھیں نا؟ جب اگلے گھر جاؤ گی تو پتہ چلے گا۔ ادنہہ، امی کی اس بات سے ہمیشہ
آیا کرتا تھا۔ پتہ نہیں یہ مائیں لڑکیوں کو ہمیشہ سسرالی گھرانوں کا ڈراوا کیوں دیتی ہیں۔ پہلے لاڈ
سے پال پوس کر جوان کرتی ہیں۔ پھر بڑے ارمانوں سے ان کے لئے اچھے لڑکے تلاش کرتی
انہیں سہانے خواب دکھاتی ہیں۔ مگر بیچ بیچ میں سسرال کا "ہوا" بھی کھڑا کر دیتی ہیں۔

"جو سب لاڈ و نخرے نکل جائیں گے۔ پیا گھر جاؤ گی تو پتہ چلے گا۔ وہاں یہ سہل پسندیاں نہ
ہیں گی"

نیا اکثر سوچا کرتی تھی کہ ایسا کیوں نہیں ہوگا۔ امی جان کو تو خوف زدہ کرنے کی عادت ہے۔
میں ابا جی سے ڈراتی تھیں۔ جوانی میں سسرال سے ڈرانا شروع کر دیا۔ جب باورچی خانے
انی کا کام کروانے کو دل چاہا۔ مزے سے مستقبل کا کوئی بھوت لے آئیں۔
ساس کیا کہے گی۔ اماں نے یہ بھی نہیں سکھایا"
کہے گی تو کہتی رہے۔ نیا جل کر سوچتی۔ میں نے کونسا ساس کے ساتھ رہنا ہے۔ سیدھے

سیدھے میاں سے کہہ دوں گی۔ اپنی جنت الگ آباد کرنا چاہتے ہو تو مجھے لے کر الگ
شب و روز ہوں گے اور اپنی مرضی ——!

اور اب ——

اب نیا نے ایک طویل سانس چھوڑی۔ نہ شب و روز اپنے تھے، نہ مرضی اپنی
ساجن سے کہہ سکی کہ مجھے لے کر الگ ہو جاؤ۔ بلکہ اس نے اپنے ساجن سے وعدہ کر لیا
چلے گی۔ اور آنکھیں بند کر کے چلے گی۔

"یہ سب کیا ہے نیا ——؟" اس نے اپنے دل سے پوچھا۔!

پچھلے تین مہینوں سے اس نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔ گھر کا کام سنبھالا تو
ہوا پورا آسمان اس پر آ گرا ہے۔ ایک تو اس گھر کے طور طریقے ہی نرالے تھے۔ جس دن
خانے میں آئی مارے بدبو کے اس سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ اسے امی جان کی باتیں یا
گھر والی کا سلیقہ اس کے باورچی خانے سے پتہ چلتا ہے۔ غلیظ باورچی خانے میں پکا
کھانا بھی کوئی کھانا پسند نہیں کرتا۔

پورے دو دن لگے تھے اسے باورچی خانہ صاف کرتے ہوئے —— امی کو
اس نے سب کچھ باہر نکال دیا تھا اور دیواریں و فرش رگڑ رگڑ کر دھوئے تھے۔ آپا باہر
تماشا دیکھتی رہی تھیں، بلکہ ہر آئے گئے سے کہتیں۔

"یہ آجکل کی لڑکیاں نرا نخرہ ہوتی ہیں۔ آتا جاتا کچھ نہیں۔ صرف صفائیاں کو کر کے
ڈالتی رہتی ہیں۔ بھئی جہاں صبح و شام گندے برتن دھوئے جائیں گے۔ وہ جگہ کیسے صا
ہے۔ اب دیکھیں گے صاحب زادی کچھ پکانا بھی جانتی ہے یا نہیں —— اور جب
کھانا پکانا شروع کیا۔ تو گھر والے ایک نئی لذت سے آشنا ہوئے۔ آپا کو ہرگز یہ منظور
کھانے کے عادی لوگ نیا کے سلیقے طریقے کی تعریف کریں۔ اس لئے وہ صبح کو بچے
کے سپرد کر کے بن ٹھن کے اپنی سہیلیوں سے ملنے چلی جایا کرتیں اور دوپہر کو تین بجے

کاموں سے فارغ ہو کر، باورچی خانہ صاف کر کے نیا تھکی ہاری جا کر ذرا اپنے پلنگ پر لیٹتی تو آپا جن کی
طرح نمودار ہوتیں۔ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر زور زور سے چلاتیں —— "اے بہو! کیا گھوڑے
بیچ کر سو رہی ہو۔ کچھ پکایا بھی، یا سارا وقت سونے میں ہی گنوا دیا۔ مجھے زوروں کی بھوک لگی ہے۔
کچھ ہے تو کھلاؤ۔" نیا ہڑبڑا کر اٹھ جاتی۔ ابھی تو آنکھ لگی تھی۔ ابھی تو جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ آنکھیں
سوتی ہوئی باورچی خانے سے کھانا لانے چل دیتی۔

کتنی پیاری تھی اسے اپنی نیند —— اپنی جان کی طرح —— اپنے خوابوں کی طرح
بھی پہلی آواز پر نہیں اٹھا کرتی تھی۔ اسے اٹھانے میں امی کا پورا آدھ گھنٹہ صرف ہوتا تھا۔ اور منہ
دھو کر باہر نکلنے میں وہ مزید آدھ گھنٹہ لگا دیتی تھی —— اور امی جان گھنٹہ بھر باورچی خانے میں اس
ناشتہ لئے بیٹھی رہتی تھیں۔ نیند سے اسے یوں پیار تھا۔ جیسے بچیوں کو اپنی گڑیوں سے پیار ہوتا
ہے۔ جھٹ چوم لیا۔ جھٹ کلیجے سے لگا لیا۔ جوں جوں امی جگاتیں۔ وہ مچل کر نیند کی آغوش میں مکھڑا
چھپائے جاتی۔

مگر اب —— نہ دن کو نیند پہ اختیار تھا۔ نہ رات کو ——

اب وہ رات کو اس قدر تھک جاتی تھی کہ اسے جاگنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اور اگر جاگنا پڑتا تو
صبح اٹھنا برا لگتا تھا۔ لیکن اسے تو صبح ۶ بجے اٹھ کر شہباز اور تانو کے لئے ناشتہ بنانا ہوتا تھا ——
کیونکہ جس روز سے اس نے یہ سب ذمے داریاں قبول کی تھیں۔ آپا مزے سے پڑی سویا کرتیں۔
دس بجے اٹھ کر کہتیں۔ "بہو میرا ناشتہ لاؤ ——" تب نیا کو آپا پر رشک آتا۔ ایسے لگتا جیسے
امی نویلی دلہن ہوں۔ انہیں دیر سے اٹھنے کا ہر حق ہو —— ان کی راتیں قیمتی ہوں ——
تو یہ ہے زندگی نیا ——

نیا ہر روز خود کو بتایا کرتی۔ مگر یہ تو ابھی پہلا مرحلہ ہے۔ ابھی اور مرحلے بھی آئیں گے —— اسے
باورچی خانے میں بیٹھ کر روزی یاد آیا کرتی تھیں کس خوبصورتی سے ماں بیٹی کو بتا دیتی ہے کہ آگے کیا
ہوگا۔

اب وہ ہر ہفتے میکے نہیں جا سکتی تھی۔ ہفتہ وار کی بجائے پندرہ دن کے بعد
اور رات رہنے کی بجائے سرِ شام آجاتی ـــــ امی نے کبھی مجبور نہیں کیا تھا۔ شاید وہ جا
کہ شادی تو ایک جالا ہے۔ اور لڑکی مکڑی کی صفت ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس جالے میں
ہے۔ پھنس ہی جانی چاہیئے۔ ہاں ان تین مہینوں میں امی صرف ایک بار اس گے گھر آئی
بھی نیا کے بہت مجبور کرنے پر ـــــ ورنہ آپا جی کہتے تھے۔ شادی کے فوراً بعد، بار بار
گھر جانا عقلمندی نہیں ہے۔ امی جان لبس ولیمے پر آئی تھیں۔ اس کے بعد ایک دن
کو آئیں۔ نیا تو چائے وغیرہ بنانے میں مصروف رہی اور آپا ان کو، ان امراء کی فہرستیں سنا
جو اُن کے بیٹے کو نہ صرف بیٹی دینا چاہتے تھے۔ بلکہ کار، کوٹھی اور بینک بیلنس بھی دے
امی ہمیشہ سے کم گو تھیں۔ جونیل آپا کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا کر جلدی لوٹ گئیں

کتنے عجیب دستور ہیں زمانے کے ـــــ نیا کام کرتے وقت سوچا کرتی۔
لڑکی کے گھر آنا معیوب خیال کرتے ہیں۔ کیوں آخر ـــــ اسے سسرال بھیج کر یوں کان
ہیں جیسے اندھے کنوئیں میں لٹکا دیا ہے۔ اور اب اس کی چیخ و پکار نہیں سننا چاہتے
میں میکے والوں کا آنا جانا نہ ہو تو لگتا ہے لق و دق صحرا میں زندگی ایک ٹھنڈے جھونکے
گئی ہے ـــــ وہی امی کا گھر، وہ اپنا کمرہ ـــــ جس کو وہ کوئی اہمیت نہ دیتی تھی۔ ا
بارعب چہرہ بُرا لگا کرتا تھا۔ بھائی بڑے بے تعلق سے محسوس ہوتے تھے۔ سب کچھ
اور بے طرح یاد آتا تھا ـــــ آپا جی پیارے لگتے تھے۔ امی جان زندگی لگتی تھیں۔
میں کتنی ٹھنڈک تھی۔ چین سکھ آرام ـــــ ان یادوں کو اس نے اس طرح پہلوؤں میں
جیسے قیمتی مگر ناقابلِ استعمال چیزیں کوئی اٹھا کر پلنگ کے نیچے رکھ دے۔ اس خیال
محفوظ پڑی رہیں گی۔

میکہ زندگی کی میٹھی یاد بن جاتا ہے ـــــ
جس طرح ماں جیسا رشتہ دنیا میں کوئی بھی نہیں ملتا ـــــ!

چپکے چپکے سُلگنے والی، کھل کر بات نہ کرنے والی، گنجلک گنجلک امی اسے اکثر یاد آتیں۔ اور
ن کی محبت کے انداز بھی تڑپاتے ـــــ جب وہ یہ دیکھتی کہ جونیل آپا اپنے بیٹے کے ساتھ کیسی
ادی محبت کرتی تھیں۔

ایک دن دوپہر کے کھانے پر مہمان کچھ زیادہ ہی آگئے تھے۔ وہ تنہا کام کرتے کرتے تھک
ف گرانٹ نیند کی، جب وہ لوگ چلے گئے تو نیا تھک کر ٹوٹ چکی تھی۔ کھانا بھی نہ کھایا اور ڈرائنگ
روم میں جا کر قالین پر چت لیٹ گئی۔ یوں لیٹنے سے ذرا جسم کو آرام ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد جونیل آپا
کوئی چیز رکھنے اندر آگئیں۔ اسے دیکھا تو ٹھٹک گئیں۔

"آخاہ ـــــ تو دلہن یہاں آرام فرما رہی ہیں"

نیا نے کچھ نہیں کہا۔ آنکھیں موندے لیٹی رہی۔

"ارے قالین پر ہی لیٹنے کا شوق تھا تو ابا سے کہہ دیا ہوتا۔ ایک اچھا قالین جہیز میں لے دیتے
بھی لیٹ لیا کرتی۔ اور برادری میں ہم بھی سر اونچا کر کے چلتے ـــــ لڑکی دیتے وقت تو نہ سوچا کہ
کی ضروریات کیا ہیں۔ خالی خولی لڑکی پکڑا دی ـــــ"

نیا کچھ نہیں بولی۔

"ہاں دیئے ہوں گے زیور کپڑے ـــــ زیور کپڑا تو لوگ اپنی بیٹی کو ہی دیتے ہیں نا؟ وہ
ی کے کیا کام آسکتے۔ سو جوڑے دے دیئے تو کیا ہوا۔ چھ سیٹ دیئے تو کونسا بڑا کام کیا۔ میں
کون سادہ جوڑے اور سیٹ اپنی بیٹی کے جہیز میں دیتے ہیں۔ نہ بابا ـــــ اللہ کسی کا نہ کھلوائے۔
بڑی آبرومندانہ زندگی گزار رہے ہیں ہم ـــــ"

وہ باہر نکل گئیں۔ لیکن باہر جا کر بھی بلند آواز سے بولتی رہیں۔

ایک قالین تک بھی نہیں لا سکی ـــــ اونہہ ـــــ لوگ تو لڑکے کے نام جائدادیں لکھ دیتے
جانے وہ کیا کیا کہتی رہیں ـــــ

نیا یوں لیٹی رہی۔ جیسے اس میں جان نہیں ہے۔ نہ سُن سکتی ہے۔ نہ بول سکتی ہے اور نہ

ہی دیکھ سکتی ہے۔ اپنی تینوں زبردست قوتوں کو مفلوج کرنے کے باوجود وہ دل میں اُٹھنے والی ٹیس نہ دبا سکی۔ دل ہر وقت جاگتا ہے۔ دل ہر وقت سُنتا ہے۔ دل ہر وقت بولتا ہے۔ دل کو کون روک سکا ہے۔

سو دل کا درد آنکھ میں آنسو بن کر آ گیا۔ گرم گرم آنسوؤں کا ریلا یوں آیا جیسے کبوتروں کا تنگ دروازے سے نکلتا ہے۔ آنسو اس طرح گرم اور نرم تھے۔ جس طرح نومولود بچے کا۔ آدھے آنسو دائیں آنکھ سے لڑھک گئے۔ آدھے بائیں آنکھ سے آنکھیں بند تھیں۔ مگر گرنا جاری تھے۔ جلدی ہی اس کے کانوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے۔ سر جھٹک کر اس نے دونوں کٹورے خالی کر دیئے۔ اور پھر کروٹ کے بل ہو گئی۔

رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

جانے کیوں ——

ساتھ والے گھر سے ریڈیو کی آواز چیخ چیخ کر کھڑکی کے راستے آ رہی تھی۔

آنکھ پُرنم ہے اور اس پہ جگر جلتا ہے
کیا تماشا ہے کہ برسات میں گھر جلتا ہے

برسات میں گھر جلتا ہے —— نیا کو پھر رونا آ گیا۔ موسم بھی کچھ ایسا ہی تھا بھیگا بھیگا بدلیاں روز گھر گھر کر آیا کرتیں۔ مگر وہ چولہے میں سر دیئے بیٹھی رہتی۔ پھر یہ کونسی نئی بات آپا نے کہی تھیں۔ آپا تو روز اُٹھتے بیٹھتے ایسی دو چار پھلجھڑیاں اس کے کومل جگر پہ مارا کرتی تھیں۔ جنہیں اس طرح پی جاتی جیسے اس کا کلیجہ پتھر کا ہو۔ کئی بار اس کا دل چاہتا وہ پلٹ کر آپا کو جواب دے مگر پھر رک جاتی۔ اگر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا تو پھر سارا محلہ سنے گا۔ ذرا سی بات بڑا افسانہ بن جایا کرے گی اور سکون اس گھر سے اُٹھ جائے گا۔

لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی خاموشی اس کی بزدلی بن جائے۔ کہیں یہی مصلحت آمیز زندگی کی سب سے بڑی بھول نہ بن جائے۔ اس دنیا میں لوگ کم زور کو دباتے ہیں۔ اسی کو

ہیں۔ جو مرنے پر آمادہ ہو۔ مگر نیا زندہ رہنا چاہتی تھی۔ پھر وہ تو شہباز سے وعدہ کر چکی تھی۔ اور ابھی دن ہی کتنے گزرے تھے۔ اسب سے زیادہ خوف اسے محلے داروں سے آتا تھا۔ جب سے شادی ہوئی تھی سبھی کان لگائے بیٹھے تھے۔ لوگ چاہتے تھے ان کی پیشین گوئیاں درست ثابت ہوں۔ کارزارِ حیات میں، وہ دو انسانوں کا دنگل دیکھیں۔ بڑھاپا سانپ بنتا ہے یا جوانی نیولے کا روپ دھارتی ہے، لوگ تو سانپ اور نیولے کی لڑائی دیکھنا چاہتے ہیں اور نیا کو تماشا بننے سے نفرت تھی۔ حالانکہ لوگوں کی تمام ہمدردیاں تو اسی کے ساتھ ہوتیں۔ کبھی کبھی اسے اپنے آپ پر غصہ آتا۔ امی جان سے اتنا لڑ جھگڑ لیتی تھی۔ کسی دن آرام سے اپنی ساس کو اتنا ہی سمجھا دیتی کہ روز روز کی چخ چخ سے کوئی فائدہ نہیں۔ جس طرح میں نے آپ کو، اور آپ کے غریبانہ ماحول کو اپنا لیا ہے۔ اسی طرح آپ مجھے بھی اپنا لیں۔ ہاں اب بھی —— وہیں لیٹے لیٹے وہ کہنا چاہتی تھی۔ میں ذرا سستانے کے لئے پرانے یوسیدہ قالین پر ہی آ کر لیٹی ہوں نا؟ آپ سے میں نے تخت طاؤس تو نہیں مانگ لیا۔ کیا میرا فرش پر لیٹنا جُرم ہو گیا۔ اور یہ پرانا قالین تو یہاں سالوں سے ہے۔ اب تک آپ کو گوارا تھا۔ اب یک بیک بُرا کیوں لگنے لگا۔ اور پھر میرے ماں باپ نے ونسا ایسا جرم کیا ہے۔ جو ہر بار انہیں صلواتیں سنائی جائیں —— جو دے سکتے تھے دیا —— دے نہیں دے سکتے اس کے لئے انہیں معاف کر دیا جائے۔ اس بار بھی اس کی زبان کنگ ہو گئی۔ اور آنسو آنکھ سے نکلتے رہے۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ امی قالین لے کر دیں۔ ہر بار انہیں یاد دہانی بھی کرائی۔ اسے امید تھی امی جان ابا جی کو منا لیں گی۔

پچھلے ہفتے جب وہ میکے گئی۔ تو امی کا بجھا بجھا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گئی۔ امی نے کہا۔

"تمہارے ابا نہیں مانتے —— بالکل نہیں مانتے"

"امی آپ نے انہیں بتایا نہیں کہ اس میں میری زندگی کا سوال ہے"

"بتایا تھا"

"پھر انہوں نے کیا کہا"

"وہ پوچھتے تھے یہ نیا کی زندگی کا سوال کیسے بنا۔؟" تمہیں معلوم ہے وہ بڑے زیرک
ہیں۔ وہ سمجھ گئے تھے۔ اس سے پہلے کچھ شروعات ہو چکی ہیں۔ کرید کرید کر مجھ سے پوچھتے
بالآخر مجھے بتانا پڑا۔ چھپانا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ تم جانتی ہو ان کی طبیعت کو جو اس بڑھاپے
میری جس قدر بے عزتی کر سکتے تھے۔ انہوں نے کی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ نیا تو ناسمجھ ہے
ہے۔ تم اس سے بھی زیادہ بیوقوف نکلیں۔ ایک غلط رسم کی ابتدا کی۔ شیر کے منہ کو لہو لگ
مطالبے پر ہی تمہیں علم ہو جانا چاہیئے تھا کہ نیا کی ساس لالچی عورت ہے۔ لالچی عورت کی
کا بھی منہ کھلا رہتا ہے۔ تم رفتہ رفتہ اس کا گھر بھر دو گی۔ اور اپنا گھر خالی کر دو گی۔ تب بھی
نہ ہو گی۔ اگر دھن دولت دے کر لڑکیوں کے نصیب خریدے جا سکتے تو ہر امیر آدمی لڑکی
پیدائش پر مطمئن اور مسرور نظر آتا۔ نیا کو اپنی قسمت سے لڑنے دو۔ آزمائشوں کا مقابلہ کر
دو۔ اسی کشمکش میں وہ کہیں اپنی جگہ بنا لے گی۔ ورنہ وہ سدا بھکاریوں کی طرح میکے
دروازے کو دیکھتی رہے گی ——"

نیا سمجھ رہی تھی کہ ابا جی نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ بالکل درست کیا ہے۔ پھر بھی اسے
کی طرح ابا جی پر غصہ آ گیا تھا۔ "پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں ابا جی اپنے آپ کو —— ہمیشہ اپنی
منواتے ہیں۔ کسی کی زندگی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ کوئی ڈوبے یا پار اترے۔ انہیں
اپنے اصولوں سے کام —— تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے مجھے سکون مل جاتا۔ ان کا
"یہ تھوڑے سے پیسے والی بات نہیں ہے نیا —— یہ بات دودھ کی لسی کی طرح
ہی جائے گی۔"

"تو کیا ہے امی، والدین اپنی اولاد کے لئے کیا نہیں کرتے۔ آخر انہوں نے مجھے جائداد
سے بھی تو حصہ دینا ہے۔"

"اس حصے کی بات نہ کرو۔ تمہارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔ تمہاری ساس کے مطالبے
بڑھتے جائیں گے۔ آخر ضروریاتِ زندگی کی کوئی حد بھی تو ہو ——"

"بس اس مرتبہ آپ قالین لے دیں۔ میں آئندہ کے لئے خود انہیں منع کر دوں گی۔"

"لیکن تم ابھی کیوں نہ منع کر دو۔ اس بات کو کبھی نہ کبھی تو ہونا ہے۔"

"اب تو میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں۔"

"معافی مانگ لو۔ مجھے بھی اب احساس ہو رہا ہے۔ کہ میں بھی تمہارے ساتھ بیوقوف
بن گئی تھی۔ تمہاری پہلی فرمائش ہی پوری نہ کرنی چاہیئے تھی۔ اس وقت تم ذرا سی آزردہ ہوتیں
تمہاری ساس چار صلواتیں سناتی۔ مگر اسے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا کہ ان تلوں میں تیل نہیں
ہے —— اب وہ جان گئی ہے، کہ ذرا سے دباؤ سے سب کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس
لئے میں تم سے کہتی ہوں۔ یہ کام آج ہی سے شروع کر دو۔"

"اب ناممکن ہے امی جان ——"

"آئندہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہو جائے گا۔"

"اچھی امی آپ میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔" نیا سچ مچ رو پڑی۔

"میری جان۔ میں کیا کروں۔ سخت مجبور ہوں۔ میرے اختیار میں ہو تو اپنا دل نکال کر تم
پر سے وار دوں۔" نیا روتی رہی اور امی پاس بیٹھی رہیں۔

"تھوڑی سی رقم نہیں ہے۔ اتنے زیادہ پیسے میرے پاس نہیں ہیں۔ کوئی چھوٹی سی
چیز ہو تو آدمی چھپ کر دے سکتا ہے۔ اتنی بڑی بات چھپ بھی نہیں سکتی۔"

نیا روٹھ گئی تھی۔ اور امی اسے سمجھاتی رہیں۔

"بیٹی زندگی میں کئی مشکلیں آتی ہیں۔ لیکن انسانوں کو بے حوصلہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ابھی
تو کئی اور مرحلے آئیں گے۔ سسرال میں رہنا۔ گھر بسانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اسی لئے
تو ماں باپ رخصتی کے وقت روتے ہیں۔ عقلمند لڑکیاں شادی کے بعد اپنے ماں باپ
کو نہیں رلاتیں۔ نہ چھوٹے چھوٹے مسائل لے کر میکے بھاگی آتی ہیں۔ ابھی تو صرف چھ ماہ ہی
گزرے ہیں۔

میرا تو خیال تھا کہ کم از کم تم پانچ سال تک اپنا کوئی اندرونی مسئلہ نہیں بتاؤ گی ——
کے ساتھ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بچوں کے ساتھ حالات بدل جاتے ہیں۔ بُرے سے بُرے
میں بھی اچھی سے اچھی تبدیلی ہو سکتی ہے۔"

جانے دھیمے دھیمے لہجے میں امّی۔ بڑی بڑی نصیحتیں کیوں کر رہی تھیں۔ نیّا نے کچھ نہ
منہ موڑ کر لیٹ گئی۔ اور شام کو منہ پھُلا کر سسرال آ گئی —— دو چار دن بعد اسے خود بھی
ہو گیا کہ امّی سچ کہتی تھیں۔ ایک قالین کے آ جانے سے اس کی ساس کا رویّہ نہیں بدل
گا۔ دو چار دن کے بعد وہ کسی اور چیز کی فرمائش کر کے وہی صُورتِ حال پیدا کر دے گی۔
پہلی چیزیں لے کر وہ کون سی شکر گزار رہے۔ جب بھی کچھ کہا دل جلانے کو ہی کہا۔ اس عورت
لئے وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو ذہنی یا معاشی صدمہ کیوں پہنچاتے؟ کم سے کم ضمیر تو
ہو گا کہ اس نے ان کا کہا مان لیا۔ تب سے وہ کئی بار آپا صاحبہ کے زہر میں بجھے ہوئے
پر سہہ چکی تھی۔ اور اب لیٹے لیٹے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ گھُٹ کر مر جائے گی۔ آ
گی۔ مگر اس عورت کی مزید کوئی فرمائش نہ پوری کرے گی —— فیصلہ کرنے کے بعد جیسے
میں نئی طاقت آ گئی۔ آنسو صاف کئے اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

ابھی باہر سارے برتن بکھرے پڑے تھے۔ بہت کام باقی تھا۔ زندگی تو پل اور گ
میں بٹ گئی تھی۔ اور پھر شہباز کے آنے سے پہلے اسے تازہ دم اور خوش باش بھی نظ
ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی —— ابھی تک کھڑکی میں سے گیت کے بول فضا میں
رہے تھے۔

آنکھ پُرنم ہے اور اُس پہ جگر جلتا ہے

نیّا باورچی خانے میں مگن تھی۔ اور آپا باہر صحن میں بیٹھی اپنی ایک سہیلی سے گپ لگا رہی تھی۔ آپا کے دو ہی مشغلے تھے۔ جس دن سے نیّا نے رسوئی کو سنبھالا تھا، آپا صبح کو ناشتہ کر کے خوب بَن ٹھَن کے اپنی کسی سہیلی کے ہاں چلی جاتیں۔ اور تین چار بجے لوٹ آتیں۔ جس دن وہ بن سنور کر گھر بیٹھی رہتیں۔ نیّا کو خود ہی پتہ چل جاتا کہ آج کوئی محترمہ تشریف لائیں گی۔ زمانے بھر کی غیبت کریں گی۔ پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے خوب کھائیں گی، پئیں گی۔ اور پھر آخر میں نیّا پر بھی کچھ نہ کچھ تو نظرِ کرم ہو گی ہی —— سو آج بھی وہ کافی دیر سے منتظر تھی۔ باہر جاتی اور پھر جلدی سے اندر آ جاتی، ابھی غالباً ان کی اپنی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ پھر آخر نیّا کی باری آ ہی گئی —— آٹا گوندھ کر وہ تھک گئی تھی۔ ذرا کی ذرا باہر ستانے کو آ کر بیٹھی تو —— بیگم تجمّل نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"اے دلہن اچھی تو ہو ——"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"ذرا کچھ چہرا اُترا اُترا سا لگ رہا ہے۔"

"جی نہیں میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اے بہن" وہ جرنیل آپا کی طرف منہ کر کے بولی "کتنے مہینے ہو گئے شادی کو ۔"

"اب ساتواں لگا ہے" آپا نے مونگ پھلی کھاتے ہوئے کہا۔

"اے ابھی دلہن کا پاؤں بھاری نہیں ہوا ——"

نیا ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔ آج کل یہی ایک موضوع رہ گیا ہے اس گھر میں۔ وہ باورچی خانے میں آ گئی۔

"بس ایسی ہیں۔ آجکل کی لڑکیاں —— شوہروں سے تو ایک پل دور نہیں رہ سکتیں مگر بس کچھ نہ پوچھو —— بنجر ہیں بنجر۔ تم نے سنا نہیں بتول کی دلہن کا تو خیر سے پورا ہو گیا۔ ابھی اس کی شادی کو چار ماہ ہی تو ہوئے ہیں۔"

"اس کی کیا بات سناتی ہو ——" آپا نے منہ چلاتے ہوئے کہا "میری مثال تمہارے سامنے ہے۔ اے میں شادی کے پہلے مہینے میکے گئی تو الٹیاں ساتھ لے کر گئی —— ٹھیک نو مہینے بعد میرا شبّن پیدا ہو گیا۔ پھر چھلے کے بعد آئی تو جی الٹ گیا۔ ٹھیک نو مہینے بعد یہ فسرین آ گئی ——، پھر اس کے نو مہینے بعد کوکب، ہمارا تو یہی سلسلہ رہا۔ یہ نگوڑیاں، نہ روپ —— بس فیشن ہی فیشن ——"

نیا جانتی تھی کہ سب کچھ اسے سنانے کو کہا جا رہا ہے۔ کئی دنوں سے یہ سلسلہ جاری تھا آتا، پوچھتا —— "دلہن کو کچھ ہے" نیا کو اتنی الجھن ہوتی کہ بس پوچھو ہی نہیں۔ آخر یہ ساری دنیا مسئلہ کیوں بن کر رہ گیا۔ ایک مسئلہ جو خالصتاً نیا اور شہباز کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ غیر متعلق لوگوں کا اُکسا رہا ہے۔ پہلے یہ لوگ لڑکی لڑکے کی شادی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں —— اور شادی کے بعد بچہ ان کے اعصاب پر سوار ہو جاتا ہے جیسے بچے کا ہو جانا ان سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے —— دن میں ایک بار تو کسی نہ کسی طرح جرنیل آپا بھی نیا کو سنا دیتی تھیں۔

وہ دل میں سوچتی ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں ——؟ اور پھر یہ معاملے تو خدا وند تعالیٰ کے اپنے معاملے ہوتے ہیں۔ لوگ آخر خدائی ٹھیکے دار کیوں بن جاتے ہیں۔؟

ابھی سے —— ابھی سے کبھی اس کا جی بُری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتا وہ گھبرا جاتی۔ تھک جاتی۔ تب اسے امی یاد آ جاتیں۔ جیسے امی قریب آ کر کہتیں ——

اٹھو —— اُٹھ جاؤ۔ زندگی کا سفر بہت لمبا ہے۔ تم نے بہت دُور تک جانا ہے۔ اور یوں بے حوصلے پست کئے بیٹھی ہو۔

یہ ہوتا ہے اصلی گھر امی ——!

یہ ہوتی ہے اصل زندگی کی ابتداء امی —— اسی گھر کے لئے بیٹیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ اور پرائے پرائے کی طرح پرائے گھر بیاہ دی جاتی ہیں۔

تو پھر بیٹیاں اندھی، بہری، گونگی کیوں نہیں پیدا کی جاتیں۔ جب رسم و رواج اور شرم و حیا کا واسطہ دے کر آپ نے ان کی آنکھوں، کانوں اور ہونٹوں پر خاموشی کی مہریں لگانی ہوتی ہیں۔ یہ کیلیں ٹھونکنی ہوتی ہیں۔ اتنی پیاری صورتیں۔ مہکتے جسم اور ارمان بھرے دل کیوں سینچتی ہیں ——؟

جو ہم سوچتے ہیں وہ زندگی ہے —— یا ——

جو زمانہ دیتا ہے وہ زندگی ہے ——

کیا ہے یہ زندگی ——؟

کیا یہ کچا ریشم ہے جو ہاتھ میں آنے سے پہلے ٹوٹ جاتا ہے۔ یا —— وسیع و عریض، بے حس سمندر جس کا کوئی کنارا ہاتھ نہیں آتا؟ یا زندگی ایک روگ ہے۔ روٹی کپڑے کا روگ، آرزوؤں کا روگ —— حسرتوں کا روگ!

تم نے تو ابھی کتابِ زندگی کو شروع کیا ہے۔

ابھی صرف عنوان پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہو۔ اپنے نرم و کومل ہاتھ ہٹاؤ، نیچے لکھا ہو گا زندگی۔ اب آگے صفحے پلٹو گی تو زندگی کی اصل کہانی ملے گی۔!

ورق گردانی سے زندگی نہیں ملا کرتی —— ذرا صفحہ صفحہ الٹو اور غور سے پڑھو ——

ہر صفحے پر کئی پڑاؤ ہیں ـــــ دوراہے ہیں۔ ان سے گزرنا پڑے گا۔ کبھی لڑنا پڑ
مرنا پڑے گا۔ جلد جلد صفحے پلٹنے سے کہانی ختم نہ ہوگی۔ ایک ایک سطر کو پڑھو ایک
پر غور کرو ـــــ،

تب زندگی ہاتھ آئے گی ـــــ

تب زندگی کا سراغ ملے گا ـــــ

جب کسی بچے کا کھلونا ٹوٹ جاتا ہے تو وہ مچل مچل کر روتا ہے۔ چیختا ہے۔ چلاتا ہے۔ ضد
رتا ہے۔ اور آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ کبھی تو اس کا جی چاہتا ہے کہ ایڑیاں مار مار کر زمین کا
ینہ شق کر دے، اور کبھی جی چاہتا ہے کہ فلک شگاف چیخوں سے ماں کی سماعت لوٹ لے۔
یہی طریقہ ہے ایک نیا کھلونا حاصل کرنے کا، خواہش کے حصول کا، ہاں اس طرح اسے کبھی
یا کھلونا مل جاتا ہے۔ کبھی بہلاووں کے ساتھ وعدہ فردا ـــــ اور کبھی کبھی تشدد ـــــ

تشدد جو اُبھرتی عمر کی اُبھرتی خواہشوں کو سانپ بن کر ڈس لیتا ہے۔ ہر صورت میں بچہ بہل
جاتا ہے۔ کہ وہ زمانے کی اداؤں کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس کو بہلنا پڑتا ہے، بھولنا پڑتا
ہے، کل پڑ جانا پڑتا ہے۔ اس کی ننھی سی دُنیا میں جھوٹ کے گھروندے اور وعدہ خلافی کی
ڑیں نہیں ہوتیں ـــــ ہر نئی صبح کے ساتھ ـــــ ہر نئے وعدے کے ساتھ ـــــ،
ہر پرانے کھلونے سے بہل جاتا ہے۔

بچہ جو ہوا ـــــ،

نیا کتنی دیر سے اپنے پلنگ پر لیٹی رو رہی تھی، اور سوچ رہی تھی، کتنا خوش نصیب
ہوتا ہے بچہ ـــــ،

شاید اسے علم نہ ہوتا ہے کہ اس کے کھلونے بازار میں بکتے ہیں، ہر موڑ پر مل جا
نہیں تو کل مل ہی جائیں گے۔ یہ کھلونوں کا بازار ہے۔

یہاں قسم قسم کے کھلونے بکتے ہیں۔ دکاندار بھی یہی کہتے ہیں کہ کھلونے ٹوٹنے کے
ہیں ـــــ وہ مٹی کے ہوں، پلاسٹک کے یا کانچ کے ـــــ اگر ہر روز کھلونے
نہیں تو ان کا کاروبار کیسے چلے گا ـــــ؟

لیکن ....

لیکن کچھ کھلونے ایسے بھی ہوتے ہیں جو شکمِ مادر میں ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان
کون ہے۔؟ اور انہیں توڑنے والا کون ہے؟ اس کا شکوہ کاتبِ تقدیر سے کیا جا
سے۔ خالق سے ـــــ یا مخلوق سے ـــــ اور ردِ عمل کے طور پر رویا جائے، چیخا
آسمان سر پر اٹھایا جائے ـــــ یا فقط صبر کی مالا گلے میں ڈال لی جائے۔ اور پھر کون پو
گا۔ تشفی سے یا ـــــ کون وعدۂ فردا کا دیا ہتھیلی پر رکھے اس کے آنسو پونچھنے آ
دلاسا دے گا۔ کون کہے گا۔ میری گڑیا نہ رو۔ تیری کوکھ اجڑی ہے۔ پر تیری مانگ بھر
تیری گود خالی نہ رہے گی۔ پر یہاں پر تو بڑے سناٹے تھے.... اس کا دل آہیں بھ
رہا تھا۔ اس کی کوکھ سے آہیں اٹھنی کیا بند ہوتیں۔ سارے جگ میں سناٹا چھا گیا۔ وہ
دھار رونے لگی۔

ایک بار پہلے بھی وہ اسی طرح روئی تھی ـــــ ایک بار پہلے بھی اس کا کھلونا ٹوٹا
وقت سب کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ سب نے اسے چمکارا تھا۔ بہلایا تھا، تسلی
تھیں۔ پر اب تو جیسے ہر آیا گیا اسی پر الزام دھر رہا تھا۔ دیواریں اجنبی بن گئی تھیں اور لوگ
آج اسے اسپتال سے آئے دوسرا دن تھا۔ جسم کے درد کے علاوہ دل میں بھی
تھا۔ جسم کے درد کے لئے تو ڈاکٹر نے کئی گولیاں لکھ دی تھیں۔ مگر دل کے درد کے
اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا ـــــ یہ دل کا درد بھی عجیب درد ہے۔ جانے کہاں سے

کہاں ڈوب جاتا ہے ـــــ جب ابھرتا ہے تو سارے درد اس کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں
ی دھیمی آنچ سی جیسے تن کو جلائے جاتی ہے.....

پھر یہ ایسا درد ہے کہ دنیا بھر کے میسحا مل کر بھی اس کے لئے کوئی گولی نہیں ایجاد کر سکے۔ اس
دکا علاج صرف محبت سے ہوتا ہے۔ محبت بھرے دو بول جانِ ناتواں کو آسودگی بخش
تے ہیں۔ محبت کی لاٹھی پکڑ کر عورت درد کے بڑے پل صراط سے گزر جاتی ہے۔ ورنہ دو قدم
ابھی دو بھر ہو جاتا ہے۔

صبح اس کی ساس نے ایک پیالی چائے بنا کر دی تھی اور پھر سر درد کا بہانہ کر کے اپنی ایک
یلی کے گھر چلی گئی تھی۔ گویا اس سے کہہ گئی تھی کہ اگر کچھ پکانے کو دل چاہے تو اٹھ کر پکا لینا۔ اب
مر آگئی ہو۔ اسپتال میں جو میں نے تم کو کھانا بھیجا وہی بہت تھا۔

نیا اپنی ساس کے مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھنے لگ گئی تھی۔ اس کی شادی کو پورے تین
ل ہو چکے تھے۔ پورے تین سال زبان سی کر جرنیل آپا کے ساتھ رہنا، تین صدیاں گزارنے کے
ر تھا۔

کبھی کبھی وہ خود حیران ہوا کرتی کہ وہ تمام خواب کہاں چلے گئے۔ جو تین سال پہلے وہ دیکھا
تی تھی۔ عمر کے وہ جادوئی لمحے کہاں ہیں ـــــ جسم و جاں کی خوشبوئیں کدھر گئیں۔ چاندنی راتوں
جذبات کی آنکھ مچولی کیا ہوئی ـــــ؟ ارمانوں بھری راتیں ـــــ

اور سنہرے اُمنگوں بھرے دن کہاں گئے؟ کیا یہی ہے خوابِ جوانی کی تعبیر ـــــ؟

جوانی آرہی ہے ـــــ جوانی آرہی ہے ـــــ کہ جب سے آنکھ کھولی ہے۔ یہی نوبت
ا رہی تھی ـــــ جو مہارانی، اتنی دور سے اتنے کر و فر سے آتی ـــــ وہ چھب دکھلا کر کہاں روپوش
گئی ـــــ جوانی کس شے کا نام ہے؟ میکے سے سسرال آنے کا نام۔ ہاں ابھی تو اسے یہی معلوم
را تھا۔ میکے سے سسرال آنا ہی جوانی کا سب سے بڑا مرحلہ ہے ـــــ شادی ہوتی ہے، تو ایک
مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ بچے کا ہوتا ہے۔

نیّا کی ساس نے تو چھ مہینے گزرنے کے بعد ہی بچّے کا تقاضا شروع کر دیا تھا۔ اصل
اسے اپنی بد باطنی ظاہر کرنے کا کوئی موقع ہی نہ دیا تھا۔ شکل و صورت اس کی پہلے ہی اچھی
ماں سے ملی تھی۔ شوہر سے دل مل گیا تو آپ ہی آپ ساس کی تابعداری اختیار کر لی۔ اسے
خاموش رہنے میں عافیت نظر آئی۔ تو اس نے منہ کو تالے لگا لئے۔ جب اس پر گھرداری کا
تو اس نے بڑی خوش اسلوبی سے اُٹھا لیا گو وہ اپنے گھر میں باقاعدہ کام نہیں کرتی تھی۔ گر
برابر ہاتھ بٹاتی تھی اور انہیں بچپن سے کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

ماں ایک خاموش مکتب ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کے صبح و شام درس گاہیں ہو
کے عادات و اطوار بچّوں کے لئے کتابیں ہوتی ہیں۔ ماں ایک صدی ہوتی ہے۔ ایک
ہے ـــــ ایک خاندان ہوتی ہے۔! اپنی اپنی استعداد کے مطابق بچے اس درس گ
کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہیں اور لڑکی تو خاص طور پر اپنی ماں کا عکس بن جاتی ہے۔

جب تک وہ اپنی ماں کے گھر ہوتی ہے ـــــ لاأبالی، بے فکرے ـــــ کا ہل اور لاپ
ہے۔ لیکن جب وہ اپنا گھر بساتی ہے۔ تو اس کے اندر سے اس کی ماں سر اٹھاتی ہے
واسطے اگلے وقتوں کے لوگ نانی اور ماں کو دیکھ کر لڑکی کی فطرت کا اندازہ کرتے تھے۔

جب تک لڑکی اپنے گھر والی نہیں ہو جاتی۔ ماں اس کے بارے میں غلط فہمی میں
رہتی ہے۔ خود دنیا کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ کہ وہ اتنا کچھ جانتی ہے۔ امّی سے ہمیشہ ڈانٹ
رہی۔ امّی کہا کرتی تھیں۔ اسے کھانے اور سونے کے سوا کیا آتا ہے۔ کاش امّی اب آ
وہ باورچی خانے میں کھڑی سوچا کرتی ـــــ میں نے کس طرح اتنے بڑے گھر کو سنبھالا ہو
اور وہ "سونے اور کھانے" کا طعنہ میری زندگی سے نکل گیا ہے۔ روٹی کپڑا بہت بڑ
ہے۔ اور اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ روٹی کپڑا ـــــ بغیر کسی محنت اور معاوضے
والدین کے گھر ہی مل سکتا ہے۔ اور یہ اتنی بڑی حقیقت بڑی جلدی اس پر عیاں ہو گئی تھی
نیّا ہر کام بڑی دل جمعی سے کرتی۔ ہر ایک کے ساتھ مروّت اور شفقت سے پیش

تے جرنیل آپا کے اُس نے ہر ایک کا دل جیت لیا تھا۔ سب کہتے تھے کہ اس کے آنے
گھر میں خوشحالی آ گئی ہے۔ باورچی خانے سے خوشبوئیں آتی ہیں۔ اور یوں نیّا کی خوشبو
سارے محلے میں پھیل گئی۔ ہر آئے گئے کی زبان پر اسی کا نام رہنے لگا تو جرنیل آپا کو اپنی زندگی
کمی سی لگتی ہوئی نظر آئی۔ جب عیب ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ تھک گئیں تو پھر انہوں نے ایک
ے زاویے سے حملے کرنے شروع کر دیئے۔ اگر کوئی بھولے سے پوچھ بیٹھتا کہ شادی کو
عرصہ ہوا ہے یا ابھی دُلہن کی گود ہری ہوتی ہے یا نہیں تو پھر وہ شروع ہو جاتیں۔

"میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ مجھے تو اس کے بچّے کا بڑا ارمان ہے۔ ہائے کونسا دن ہوگا جب
آنگن میں منا کھیلتا نظر آئے گا۔ میں تو بہت دن انتظار نہیں کروں گی ـــ میں نے تو صرف بچّے
لئے ہی جلدی شادی کی ہے۔ ہاں بہن! عورت کا حسن تو بچّے کے ساتھ ہے ـــ کلموہی بھی
کے ساتھ شہزادی نظر آتی ہے۔ پھٹکار ایسی عورت پر جس کے بچہ نہ ہو۔ نہ بابا میں تو ایسی عورت
در سے سلام کروں"

کبھی کبھی نیّا جی جان سے لرز جاتی۔ اگر خدانخواستہ ـــ خدانخواستہ بچہ نہ ہوا ـــ تو ـــ
ایسی سہاگن راتیں، اور پھول پھول دن ..... کیسے خوف میں بسر ہو رہے تھے ـــ یوں
سے اللہ سے اُمید تو تھی، پر کبھی کبھی جرنیل آپا کی تلخ و تند باتیں اس کے سر پر خوف کا نیزہ تان دیتیں
وہ جی ہی جی میں اللہ میاں سے التجائیں کرنے لگتی ـــ التجا کرتی کرتی وہ چونک جاتی اور سوچتی
ـــ وہ کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ کل تک وہ بچّے کے نام سے گھبراتی تھی۔ اور آج وہ ایک بچّے
لئے سراپا دعا بنی جا رہی تھی ـــ کیسی کیسی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ شادی کے بعد!!

یونہی آس اور نراش کے ساتھ کھیلتے کھیلتے دن بیتے جا رہے تھے کہ ایک دن ہنڈیا بھونتے
ہوئے اسے زور کی ابکائی آ گئی۔ دوڑ کر غسل خانے میں گئی۔ ہلکی ہو کر واپس آئی۔ اور چیخ چلانے لگی۔
وڑی دیر بعد پھر وہی کیفیت پیدا ہو گئی ..... پھر دوڑی گئی ..... اور جب یہ سلسلہ ختم ہونے کی
باسے آگے چلتا رہا۔ تو گھبرا گئی اوندھے منہ بستر پر لیٹ گئی۔ اور زار و قطار رونے لگی جب

وہ کافی دیر باورچی خانے میں پلٹ کر نہیں آئی۔ تو آپا کو اشتعال ہونے لگا۔ آپا دبے پاؤں کے کمرے میں گئیں۔ تاکہ دیکھیں بتو ہنڈیا چھوڑ کر کیا کر رہی ہے۔ مگر اسے یوں زار و قطار تو آپا کا ماتھا ٹھنکا۔ کمر پہ ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں ـــــ اور کرخت سے لہجے میں بولیں

"اے بہو! کیا ہوا ہے۔؟" نیا نے ڈر سے سر اٹھایا۔ آنسو بھری آنکھوں سے اپنی دیکھا، اور پھر بولی۔

"مجھے فوڈ پائزن ہو گیا ہے۔"

"اے وہ کیا ہوتا ہے تماشا" جرنیل آپا نے چڑ کر کہا۔

"مجھے الٹیاں آ رہی ہیں۔ صبح میں نے باسی دال کھا لی تھی۔ معدہ زہر زہر ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کے ہاں لے چلئے۔"

"اے کب سے یہ حالت ہے۔"

"صبح سے دل متلا رہا تھا۔ ابھی ہنڈیا بھون رہی تھی تو قے شروع ہو گئی۔"

"اونہہ ـــــ" آپا نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ لئے اور بکتی جھکتی باہر کو چلیں۔

یہ آج کل کی پڑھی لکھی لونڈیا ـــــ واہ واہ ـــــ آفرین ہے ان پر ـــــ عقل تو چھو کر نہ جانے اب تک اس نے کتنی کتابیں پڑھ چھوڑی ہوں گی۔ اماں بھی خوش ہوں گی کر ہو گئی۔ اس سے تو اچھا تھا۔ اماں جی نے ایک گدھا پالا ہوتا اور اس پر سو دو سو کتابیں لاد دا ہاں آج یہ دن تو دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔۔۔۔ بس بی بی کچھ نہ کہو اس موتی نئی نسل کو ـــــ وہ برآمدے میں نکل کر مونڈھے پہ بیٹھ گئیں اور بلند آواز میں پھر شروع ہو گئیں۔ "بڑی عاقل اور یہ نئی نسل، بہت ہی سمجھدار ہے یہ بھئی۔ دنیا بھر کے تجربے ہیں ان کے پاس ـــــ جرنیلی کا نعرہ اسی زعم پہ لگاتے ہیں یہ ـــــ بزرگوں کے تجربوں کو جہالت کہتے ہیں۔ ہاں۔۔۔۔ سی بات بٹیا کی عقل میں نہیں آ سکتی کہ ـــــ الٹیاں آنے کا کوئی اور سبب بھی ہو سکتا جھٹ کہہ دیا وہ نگوڑا فوڈ ـــــ کیا کہتے ہیں زہر ہو گیا ہے۔ منیا جلی کو یہ نہیں پتہ کہ پاؤں بھا

گیا ہے ـــــ کچھ دن چڑھ گئے ہوں گے۔ نصیبوں کی مار کہتی ہے، مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ اے میں تو کئی دن سے اس کا اڑا اڑا چہرہ اور چڑھی چڑھی آنکھیں دیکھ رہی ہوں۔ چال ہی تبدیل ہو گئی ہے اس کی ـــــ اے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ ان آنکھوں کی بینائی بناتی میں ضائع نہیں کی زمانہ اچھی طرح دیکھا ہے۔ میں تو پہلی رات سے ہی پہچان جاتی ہوں اے جی میں نے تو پل پل کا حساب رکھا ہوتا ہے ـــــ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں۔ بتو رو رو کر دکھا رہی ہے۔ ہنستے کھیلتے چار بچے جن لئے تھے میں نے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یونہی ٹسوے بہا رہی ہے" ـــــ بکتے جھکتے جرنیل آپا اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

نیا روتے روتے چونک گئی ـــــ اور پھر چپ ہو گئی۔ تو یہ یوں ہوتا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ من کے اندر جیسے ننھے ننھے گھنگرو رقص کرنے لگے۔ چاروں طرف منے منے ہاتھ پیاری پیاری تالیاں یوں بجانے لگے جیسے پھولوں اور پتیوں کی بارش ہوتی ہے۔ تب اسے سمجھ آئی کہ بچے کو سنہری زنجیر کیوں کہتے ہیں؟ یہ کتنا خوبصورت آسرا ہوتا ہے ـــــ عورت کی سب سے بڑی سیکیورٹی بچہ کیوں ہے؟ یہ پاؤں بھاری ہونا کیسا محاورہ ہے؟ عورت کی تو ساری زندگی وزن دار ہو جاتی ہے۔ بھاری اور بھرکم۔!

پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ یہ طبیعت کی خرابی کتنی خوشگوار اور روح پرور ہوتی ہے۔ یہ واحد آزار ہے۔ جسے عورت دل سے پسند کرتی ہے اور جس میں مبتلا ہو کر مسرور ہو جاتی ہے پچھی پچھی ـــــ شادی سے پہلے اسے بچوں سے کس قدر کراہت آتی تھی۔ یوں لگتا تھا یہ جنجال ہیں اس کے گھر میں تو کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا۔ ویسے بھی وہ دوسروں کے بچے دیکھ کر منہ پھیر لیا کرتی تھی۔ اور اب ایک پل میں وہ ماں بن گئی تھی ـــــ مامتا کے ٹھنڈے ٹھنڈے گولے اس کے اعصاب پہ برف کی طرح اتر رہے تھے۔ دل آپ ہی آپ نرم ہو رہا تھا۔ شریانوں میں خون کی جگہ دودھ کا احساس ہونے لگا تھا۔ تو یوں پہلے دن سے ہی عورت میں تبدیلی آنی شروع ہو جاتی ہے۔!

سارا دن وہ لیٹی رہی۔ اُس کی ساس نے بھی اُسے کوئی کام نہ بتایا۔ دو تین بار اُٹھ کر غسل خانے میں گئی۔ مگر ابکائیوں نے کچھ بھی نہ کرنے دیا۔ نہ کچھ پکانے کو دل چاہا۔ نہ باہر گئی۔

شام کو جب شہباز آیا تو وہ کوشش کے باوجود باہر نہ نکل سکی۔ وہ تھوڑی دیر ماں کے پاس بیٹھا رہا۔ اور پھر اٹھ کر اندر آگیا ــــ گو نیّا نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ مگر اب دل متلا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ اور بہت زیادہ نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ جب میں اسے شہباز کی شدّت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اور اب جب شہباز نے اس کمرے میں قدم رکھا تو آنسو آپ ہی آپ قطار اندر قطار اس کی آنکھوں میں چلے آئے۔ اپنائیت کا احساس ہی کیسی عجیب شے ہے۔ حالانکہ سارا دن وہ سوچتی رہی تھی کہ وہ کی اتنی بڑی خوشی اسے کیونکر بتائے گی۔؟ بتانے کا انداز بھی جداگانہ ہونا چاہیئے۔ جس سے بھی واضح ہو جائے اور شرم بھی نہیں آئے ــــ،

"ہماری محبّت کے شجر پر نیا پھول آ رہا ہے ــــ" اونہوں ــــ اس نے سو تو بالکل کتابی فقرہ ہو جائے گا۔ اور خدا جانے وہ سمجھ بھی سکے گا یا نہیں ــــ کیا خبر دو وضاحت کرنی پڑے۔

"محبّت رنگ لا رہی ہے ــــ" نہیں نہیں ــــ وہ اتنا سیانا کہاں کہ تہہ جائے۔ ٹکا ٹک ٹوئیاں مارے گا۔"

ہاں تو سیدھے سیدھے کہہ دوں گی "میرا جی اچھا نہیں ہے۔"

"کیوں کیا ہوا ہے۔"؟ وہ پوچھے گا۔

"جناب کیا دھرا سب آپ کا ہے ــــ اب کیسے معصوم بن کے پوچھتے ہیں"؟

"مجھتی میں نے کیا کیا ہے۔" وہ بار بار پوچھے گا۔

"آخر کچھ تو بتلاؤ۔ میں نے کیا کیا ہے۔؟" تو کھلکھلا کر ہنس دے گی "کچھ نہیں کیا، بس شب کو پی صبح کو توبہ کر لی۔ واہ جی، کیسے انجان بن رہے ہیں"؟

"خدا کے واسطے جلدی بتاؤ نیّا مجھے تو اختلاج ہو رہا ہے۔"

وہ تصوّر ہی تصوّر میں مسکرانے لگی "بھلا میں کیوں بتلاؤں گی۔ میں تو بس پہیلیاں بجھواؤں گی۔ وہ پھر آگے بڑھے گا۔ گدگدائے گا۔ چھوئے گا میں اُف کر کے سمٹ جاؤں گی۔ پرے ہٹ جی۔ وہ پریشان ہو جائے گا۔ تو صاف کہہ دوں گی۔ اب تو تن میں بھی تم سما چکے ہو دیکھو مجھے پھولوں کی طرح چھوؤ میں کانچ بن گئی ہوں۔ میرے تن میں ــــ ہاں میرے تن میں ایک اور شہباز ہے۔ اور وہ تم سے زیادہ نازک ہے ــــ

"اُف اللہ ــــ" اس کا سارا خون چہرے پر آگیا۔ کیا اس سے یہ سب کچھ کہا جائے گا۔ نہیں یوں نہیں کہا جائے گا۔؟ تو پھر یہ سب آخر کس طرح کہا جائے گا؟ سارا دن خیالوں سے لڑ لڑ کر اور فقرے سوچ سوچ کر نیّا تھک گئی تھی۔ بھوک سے نڈھال ہو گئی تھی ــــ اور اس طبیعت کے نئے جھگڑے سے عاجز آگئی تھی۔ جب شہباز نے اندر قدم رکھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح آہستہ سے اس کے پلنگ کے کنارے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور اس کے چہرے پر جھک کر بولا۔ "نیّا تمہیں کیا ہوا ہے۔؟" آج اس طرح کیوں لیٹی ہو۔؟

اتنی اپنائیت اور پیار تھا اس کے لہجے میں کہ نیّا کی ساری تجویزیں کاغذ کی کشتیوں کی طرح اس کے آنسوؤں میں بہہ گئیں ــــ بس آنکھوں نے جھر جھر نیر بہانے پر اکتفا کیا۔ جتنا جتنا اس کا لہجہ شفیق ہوتا گیا۔ نیّا کا دل رقیق ہوتا گیا۔ آنسو ناسفتہ موتیوں کی طرح لڑھکتے ہی چلے آتے نیّا نے بہت چاہا درمیان میں کہیں آنسوؤں کو روک کر اُسے ایک آدھ اشارہ دے دے۔ مگر نہ جانے گلے میں کیا پھنس گیا تھا کہ اس سے بولا ہی نہ گیا۔ اس نے سوچا جب تک آنسوؤں کا یہ تیز و تند ریلا بہہ نہیں جائے گا۔ اس سے کچھ بھی نہ کہا جائے گا۔ اور شہباز اپنے طور پر سمجھ رہا تھا کہ غالباً اماں اباسے کچھ تلخ و ترش بات ہو گئی ہے۔ اس کے سوا نیّا کی آزردگی کا سبب اور کیا ہو سکتا ہے

کیا ہوا ہے جان؟ ــــ کیا ہوا ہے نیّا ــــ وہ بار بار اسے یوں چمکار رہا تھا۔ جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہے۔

"کچھ نہیں" اتنا کہہ کر وہ ہر بار گلا صاف کرتی۔ تو پھر ایک جھرتا آنسوؤں کا نکل آتا
میں کوئی غبار سا پھنس جاتا۔ شہباز اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ بوکھلا کر باہر نکل گیا۔ باورچی
سے گلاس اٹھایا پانی بھرا، اور لپک کر اندر آنے لگا تو آپا نے کرخت سے لہجے میں پوچھا کیا
"کچھ نہیں آپا" وہ اپنی جگہ پر لرز گیا "وہ ذرا... نیا کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے
ہے — بہت نروس ہو رہی ہے"

"ادنہہ — نروس ہو رہی ہے — صبح اسے فوڈز زہر ہو گیا تھا، اور اب نروس
ہے۔ نکو ڑ ماری لڑکیاں، اور چھلا دے لڑکے۔ عقل کے کورے — طبیعت وبیت کے
مت رہنا۔ دن چڑھ جائیں تو یہی کچھ ہوتا ہے"

"باؤلا کہیں کا — دولہا بنا ہے۔ تو کیا ابا نہ بنے گا —؟ یہ رونے کی بات ہے
خوش ہونے کی۔!"

جب شہباز پاگلوں کی طرح اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے گیا تو اس نے چلا کر کہا "بہو دو
جی سے ہے۔ ایسی حالت میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اسے بیماری نہیں کہتے۔ کہیں ڈاکٹر کے
مت لے جانا۔ وہ پوچھے گا۔ گھر میں تیری کوئی اماں ہے یا نہیں۔ جو نصیبوں جلی یہ بھی نہیں
تب شہباز کی سمجھ میں آیا، شکر ہے۔ مارے خوشی کے اس کے ہاتھ سے گلاس نہ گر گیا۔
نیا نے کیا کیا نہ سوچا تھا۔ برا ہو ان آنسوؤں کا — کچھ بھی نہ کہنے دیا اور آپا نے کر
بھونڈے طریقے سے ساری بات بتا دی۔ نیا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور اٹھ کر بیٹھ
شہباز پانی کا گلاس اٹھائے اس کے قریب آ گیا۔ پھر اس کی سوجی سوجی آنکھوں میں جھانکا
"تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا نیا — خدا کی قسم میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ مگر تم نے مجھے جلا
کیوں نہ بتا دیا۔

"کیا کہتی" — نیا نے مصنوعی غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا "یہی کہ
کی طرف دیکھ کر ہنس دیا۔ اور نیا کو گلے سے لگا لیا۔

"ہاں —" نیا نے اس کے کندھے پر سر رکھے رکھے سوچا "جو بات تم اپنی زبان سے نہیں
کہہ سکے۔ وہ میں کیسے کہہ دیتی۔ مگر نیا نے محسوس کر لیا تھا کہ شہباز کے چہرے پر ایک ساتھ کئی چراغ
جل اٹھے تھے۔

اور پھر اس کے بعد اس کے پیار کا انداز اتنا والہانہ ہو گیا تھا کہ خود نیا کو محسوس ہونے لگا تھا
کہ پہلے شادی کی بنیادیں کیوں مضبوط کر دیتا ہے؟ یہی نہیں، اس کے علاوہ بھی شہباز میں بہت
تبدیلیاں آ گئی تھیں اب وہ اس کے آرام کا بہت خیال رکھتا۔ صبح ناشتے کے لئے اسے نہیں
جگاتا تھا۔ بلکہ اس نے آپا سے صاف صاف کہہ دیا تھا، کہ جب تک نیا کی طبیعت خراب ہے
وہ باورچی خانے میں نہیں جائے گی۔ اور نہ کھانا پکائے گی۔ شام کو جب دفتر سے واپس آتا، تو
کھٹ میٹھی اور چٹ پٹی چیزیں لاتا۔ صبح کو نیا سے پوچھ پوچھ کر جاتا کہ اس کا کیا کھانے کو دل چاہتا
ہے۔ پہلے تو نیا اس کی زندگی تھی۔ اب آنکھوں کی جوت بن گئی تھی۔ وہ جدھر جدھر جاتی۔ یہ اُدھر
اُدھر دیکھتا رہتا۔ اور آپا کی زمانہ بین نظریں اپنے بیٹے کے تعاقب میں رہتیں۔

دو مہینے تو انہی چاؤ چونچلوں میں گزر گئے۔ اب کچھ کچھ نیا کی طبیعت بھی سنبھل گئی تھی۔ ایک
دن آپا اس کے پاس جا بیٹھیں۔ اور پیار سے بولیں۔ "اب تو میری رانی کی طبیعت کچھ ٹھیک لگ
رہی ہے"

"جی آپا —" نیا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اللہ تجھے چاند سا بیٹا دے۔ میں تو بس اپنے شہباز کا بیٹا دیکھنے کو ہی زندہ بیٹھی ہوں"
نیا نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

"لا بیٹی تیرے سر میں تیل ڈال دوں۔ کیسا جھاڑ بنا رکھا ہے۔ بالوں کا"

"نہیں آپا — نہیں — میں خود ڈال لوں گی"

"لے میں جانتی ہوں فیشن نے تیرا بھی ناس مار دیا ہے" آپا زبردستی تیل کی شیشی اٹھا لائیں
اور نیا کے سر میں انڈیل دی۔ نیا بے چاری نہ نہ — کرتی رہ گئی۔ پھر باتوں باتوں میں آپا کہنے لگیں۔

ایسی حالت میں سارا دن لیٹے رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ ایک تو تجھ پر چربی چڑھ جائے گی۔ بچہ وزنی ہو جائے گا۔

"اچھا ——" نیا گھبرا گئی۔ پھر میں کیا کروں آپا ——؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ تو باورچی خانے میں نہیں جا سکتی —— نگوڑی خوشبو میں ابھی کہاں! گی۔ کوئی اور چھوٹا موٹا کام کیا کر ——"

"کون سا کام آپا —— آپ ہی بتائیں نا؟"

"بھئی صفائی کرا دیا کرو۔ جھاڑ پونچھ —— دھلائی وغیرہ ——"

نیا چپ ہو گئی۔ آپا پھر بولیں "میرے تو پیٹ میں جب بھی بچہ ہوتا تھا۔ میں بہت کام کرتی بھر بھراؤ پر لاتی تھی۔ فرش دھوتی تھی۔ کپڑے دھوتی تھی۔ دن دن کرتی پھرتی تھی۔ نتیجتاً خود بھی چاق رہتی تھی اور بچہ بھی ماشاءاللہ دس بارہ پونڈ کا پیدا ہوتا تھا۔"

"دس بارہ پونڈ" —— نیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اے اسی شہباز کی بات سنو، بارہ پونڈ کا تھا خیر سے پہلا بچہ تھا۔ سب لوگ مجھ سے ہا تھے —— بھئی تم بچوں کو پیٹ میں ہی کشتے کھلانے شروع کر دیتی ہو؟ حالانکہ کیا کھلا کھانا —— ؟ بس جان مار کے کام کرتے تھے۔ جی بھر کے کھانا کھاتے تھے۔ اور نیند بھر سو تھے۔ ماشاءاللہ ایسے صحت مند اور پیارے بچے ہوتے تھے۔ جو بھی دیکھتا گود میں اٹھا چوم لیتا۔"

نیا کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ اس کی بانہوں میں ایک نرم نرم اور گرم و گداز ج پھسلنے لگا۔ کتنا بھلا لگتا ہو گا گھلا گھلا بچہ۔ ہاں اس پر تو خواہ مخواہ ہی پیار آتا ہو گا —— نیا ایک نئی ہمت سر اٹھانے لگی۔ دو تین مہینے سے بالکل کاہل بنی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ کپڑے بدلنے کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ سارا دن لیٹی یا تو کتابیں پڑھا کرتی یا کھٹی میٹھی چیزیں کھایا کرتی۔ وقت گزارنا کس قدر مشکل تھا۔ اگلے دن وہ کمر کس کے کھڑی ہو گئی۔ اور گھر کی صفائیاں اور دھلا

اس نے اپنے ذمے لے لیں۔ نجانے آپا پر بھی کیا دھن سوار ہوئی کہ انہیں گھر چمکانے کا جنون ہو گیا۔ ہر روز سارا سامان باہر نکلتا اور فرش چمکائے جاتے۔ نیا سارے گھر کے فرش دھوتی حتیٰ کہ سیڑھیاں بھی دھو ڈالتی۔ اگر پانی ختم ہو جاتا تو نیچے جا کر اور بھر لاتی۔ واقعی وہ اپنے آپ کو تنومند محسوس کرنے لگی تھی۔ رات کو بھی خوب مزے کی نیند آتی۔ نیند آنے لگی تو بھوک بھی لگنے لگی۔ اب اس کا زیادہ سے زیادہ کام کرنے کو جی چاہتا۔ گھر صاف کرنے کے بعد ڈھیروں ڈھیر کپڑے دھو لیتی۔ پھر انہیں استری بھی خود کرتی۔ جب وقت بچ جاتا تو مشین لے کر بیٹھ جاتی۔ اس کا دل چاہتا وہ ننھے ننھے کپڑے سیئے۔ لیکن جب سینے بیٹھتی تو اسے سمجھ نہ آتی کہ کیا سیئے ——؟

"لڑکی ہو گی یا لڑکا ——؟"

پتہ نہیں کیا ہو گا۔ اسے فراک سینے چاہئیں۔ یا کرتے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس کی ساس ہر وقت اپنے لڑکے کی رٹ لگاتی رہتی تھی۔ فرض کرو اگر لڑکی ہو گئی تو کیا ہو گا ——؟" اونہہ —— پھر کیا ہے اگر لڑکی ہو گئی تو اسے تو لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔ پیارے پیارے رنگین کپڑوں میں ملبوس —— اس کی کوئی بہن بھی نہ تھی۔ اس لئے اسے لڑکی ہی پسند تھی۔ مگر —— جو اللہ کو منظور ——،

اور ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہو —— ایک دن جو فرش دھوتے ہوئے پھسلی۔ تو دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ آپا گھر میں نہیں تھیں۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چوٹیں کافی آئی تھیں۔ مگر اس نے سوچا۔ کام ختم کر کے اندر جانا چاہیئے۔ طوعاً و کرہاً سارے فرش دھوئے۔ جا کر نہائی۔ کپڑے بدل کر لیٹ گئی۔ لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد جیسے جسم دہائیاں دینے لگا —— درد کی عجیب و غریب ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ایسا درد تو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ گولی پہ گولی کھائے گئی۔ جب آپا آئیں تو اس نے سب کچھ انہیں بتا دیا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ پھر بولیں ——

"ذری صبر کرو۔ شہباز دفتر سے آ جائے۔ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔"

شہباز کے آنے تک وہ تڑپتی رہی۔ شام کو جب وہ آیا تو آپا نے بڑی تسلی سے سب اسے بتایا اور کہا۔ ابھی اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھنے کے بعد جو خبر سنائی وہ بڑی روح فرسا تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ فرش نہیں دھونے چاہئیں تھے اور اگر پھسل گئی تھی تو فوراً ڈاکٹر کو رجوع کرتی۔ اور یہ بھی کہ اسے اس حالت میں اسکوٹر پر بیٹھ کر نہیں آنا چاہیئے تھا ـــــ اس نے آنے میں دیر کر دی۔ معاملہ انسانی اختیار میں نہیں تھا اس نے اسی وقت نیا کو اسپتال میں داخل کر لیا۔

صبح جب نیا کی آنکھ کھلی تو اسپتال کے ویران کمرے میں وہ اکیلی پڑی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں سے زرد دھوپ اندر آ رہی تھی۔ نرس نے آکر اس کا ٹمپریچر لیا۔ اور اسے بتایا کہ اس کا شوہر دفتر جا اور تھوڑی دیر بعد اس کی ساس چائے وغیرہ لے کر آئے گی ـــــ

نیا کو محسوس ہوا جیسے اس کی جھولی خالی ہو گئی ہے۔ وہ ایک خول ہے جو اس فضا میں رہ رہا ہے۔

رات اسے شہباز نے بھی تسلیاں دی تھیں۔ اس نے کہا تھا ـــــ "اللہ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی میں تمہاری اور میری بہتری ہو گی" مگر اس کے آنسو رکتے ہی نہ تھے وہ کیوں رو رہی تھی۔ حالانکہ ایک فصل اُجڑی تھی۔ کھیتی تو ویران نہیں ہوئی تھی ـــــ

اب پھر ساری باتیں یاد کر کے اسے رونا آ گیا۔ وہ بستر سے ٹیک لگائے بیٹھی رو رہی تھی کہ ساس آ گئی۔ "اے ہے" انہوں نے آتے ہی نیا کا ماتھا چوما۔ نیا اور زیادہ رونے لگی ـــــ "کیوں روتی ہے پگلی ـــــ اللہ تجھے چاند سے سات بیٹے دے گا۔ میری بات یاد رکھ سلامت رہے۔ میرا شہباز جگ جگ جیئے۔ اے پھر کیا ہوا ـــــ تم دونوں کا صدقہ اوتار نیا کا دل دھک سے ہو ـــــ ہر ماں کو اپنے بچے کا خیال ہوتا ہے ـــــ اپنے بچے کے لئے رو رہی تھی۔

منہ صاف کر کے ناشتہ کر لے۔ میں تجھے ابھی واپس لے کے جاؤں گی۔ اس منحوس جگہ میں تو رو دو کر تو اپنے آپ کو بیمار کر لے گی۔

اور پھر میں اکیلی جان ـــــ بار بار آ جا نہیں سکتی۔

ایک عجیب سی بات نے نیا کے دل میں گرہ ڈال دی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اسپتال سے چلتے وقت ڈاکٹر نے اسے کہا تھا کہ وہ کم از کم ایک مہینہ آرام کرے۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے خود ہی پوچھ لیا تھا کہ آئندہ کوئی خطرے کی بات تو نہیں ـــــ میرا مطلب ہے آئندہ ایسا تو نہیں کہ بچہ ہو گا ہی نہیں"

"نہیں نہیں ـــــ ڈاکٹر ہنس دی" ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو ایک اتفاق ہے۔ ہو زندگی میں ہو جاتا ہے"

"کوئی پرہیز وغیرہ ـــــ" وہ پھر جھجکتے ہوئے بولی۔

"کوئی پرہیز نہیں ـــــ کوئی خطرہ نہیں، کوئی خدشہ نہیں۔ ڈاکٹر نے اس کا سرد ہاتھ تھام کر کہا۔ کم از کم میں ان باتوں کی قائل نہیں ہوں۔ صرف ایک مہینہ آرام کرو۔ کھاؤ پیو، خوش رہو۔ کوئی وہم یا وسوسہ قریب نہ آنے دو۔ قدرت بہت فراخ دل ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ دوبارہ حمل کے دوران بہت احتیاط کرنی ہو گی۔ کم از کم تین مہینے تک ـــــ اس کے بعد سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں اچھا ـــــ" ڈاکٹر نے اس کے مایوس چہرے کی طرف دیکھ کر اسے مزید تسلی دی تھی۔

نتیجتاً جب وہ اسپتال سے نکلی تو اداس ضرور تھی۔ مگر مایوس نہیں تھی۔ مایوسی کی بات ہی کیا تھی۔ پھل پھول کچے ہی گر جاتے ہیں۔ اور کچھ پک کر اترتے ہیں۔ اگر ڈال سے کچا پھل گر جائے تو شاخ بیکار نہیں ہو جاتی۔ نئے موسم میں پھر نئے شگوفے اور پھول آ جاتے ہیں ـــــ یہی نظام قدرت ہے ـــــ

کچھ دن تو اس کی ساس نے اس کی خوب تیمار داری کی۔ تسلیاں دیتی رہی۔ لیکن ایک ہفتے کے بعد پھر زندگی کا وہی چلن ہو گیا۔ نیا نے خود ہی اٹھ کر گھر کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اکتا کے بیٹھتے وہ لیٹے رہنے کا طعنہ نہیں سننا چاہتی تھی ننھی منی فراکیں، سوئٹر اور چادریں اس نے ایک بکس میں بند کر دیئے۔

یوں ایک مہینہ گزر گیا۔ لیکن آپا کا کڑا پہرہ دور نہیں ہوا۔ وہ اب بھی نیا پر نگاہ رکھتیں، پورا ایک

مہینہ آپا نے نیا کو اپنے کمرے میں سلایا تھا، ان کا خیال تھا کہ اس کو آرام اور احتیاط دونوں ضرورت ہے۔ اتنی بات تو نیا کی سمجھ میں بھی آگئی تھی۔ مگر اس سے آگے کی بات نیا کی سمجھ آدہی تھی ——— آپا کے کمرے میں سونا عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ رات کو بڑے سمع خراش خرّاٹے لیا کرتی تھیں۔ اور پھر ہر کروٹ پر بڑبڑاتیں۔ رات کو انہیں پیاس بھی ضرور لگتی تھی۔

"اے بہو! جاگ رہی ہو۔؟" وہ پہلے اسے جگالیتیں اور پھر کہتیں۔ "اگر جاگ ہی گئی ہو پانی پلا دو" اور پھر صبح اُٹھ کر۔ سارے محلّے کے سامنے یوں اعتراف کرتیں کہ تمام رات کر بہو کو دیکھتی رہتی ہوں۔ کہیں کراہ تو نہیں رہی۔ اللہ رکھے۔ سرسوں کا پھول ہوگئی ہے دونوں میں ———"

رات کو سوتے وقت نیا سوچا کرتی۔ کبھی تو یہ مہینہ ختم ہوگا۔ اور وہ اپنے کمرے میں جا اپنے ساجن کے پاس ——— اس پورے گھر میں اپنا چھوٹا سا کمرہ اسے جنت معلوم ہوتا چار دیواری کے اندر کتنا سکھ اور کتنا سکون تھا۔ آپا کی خارزار زبان سے تنگ آکر اور گھر کے دھ سے گھبرا کر وہ اپنے کمرے میں گھس جاتی۔ دروازہ بند کر لیتی۔ پھر چاہے روتی یا ہنستی۔ اندر اس تھا۔ یہی ایک چھوٹا سا کمرہ سمٹ کر اس کی کائنات بن گیا تھا۔ کیا شادی کے بعد آرزو اتنی محدود ہے؟ وہ سوچا کرتی۔

اس محدود سی کائنات میں اس نے بچوں کی آہٹیں اپنے من میں بسائی تھیں۔ وہ بھی قدرت کو کب منظور تھا ———؟ کیا منظور تھا۔ پھولوں کی آرزو میں کانٹے دامن سے لپٹتے ہیں۔

آپا نے ایک اور بندش لگادی تھی۔ ابھی تم اپنے شوہر کے کمرے میں نہیں جاؤ گی۔

"کیوں نہیں ———؟" اس کا دل چاہتا۔ آپا کا گریبان پکڑ کر پوچھے۔ آخر کیوں نہیں؟ آخر یہ کیسا دوزخ ہے۔ جہاں شوہر کے کمرے میں سونے پر پابندیاں لگتی ہیں۔ یہ دنیا بنائے ہوئے رواجوں کا ہی مذاق اڑانے لگتی ہے۔

"دیکھو تمہیں ڈاکٹر نے احتیاط کرنے کے لئے کہا ہے۔" ایک دن آپا نے اسے یہ بات

ی۔ تو اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ مگر صرف ایک مہینے کے لئے ——— ڈاکٹر نے تو اس کی اچھی طرح لی کرادی تھی۔ تو اس نے آپا کی چارپائی کے ساتھ چارپائی لگا کے ایک مہینے کی تپسیا کاٹ لی تھی۔ اب کیوں بندش تھی۔ پر اب اس نے سوچا وہ اپنا بستر اٹھا کر خود ہی اپنے کمرے میں چلی جائے گی ین رات کو جب وہ جانے لگی، تو آپا نے پکارا۔ "اے کہاں جا رہی ہو بہو ———؟"

"جی وہ ———" رک گئی۔

"ہاں ہاں مجھے پتہ ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں تو ایک رات بھی خصم کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اپنا بڑا دیکھیں نہ بھلا۔ ایک ہم تھے کہ عین جوانی میں بیوہ ہوگئے۔ کڑکڑاتے دن اور جھم جھماتی راتیں اللہ اللہ کر کے گزار دیں ——— اے تجھ سے دو چار مہینے بھی نہیں گزرتے۔"

"دو چار مہینے" ——— نیا سُن سی ہوگئی۔

"ڈاکٹر نے مجھے خود بتایا تھا کہ تمہیں پورے چھ ماہ اپنے شوہر سے الگ رہنا چاہیئے۔ میں کوئی ماری دشمن ہوں۔ میں بھی چاہتی ہوں۔ تمہارے بچہ ہو۔ مگر اس طرح نہیں ——— کہ ہر بار ں۔ لیٹ جا ادھر آ کے، ورنہ چٹیا سے پکڑ کر ماں کے گھر چھوڑ آؤں گی۔"

نیا واپس آکر اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شہباز اپنے کمرے میں بیٹھا یہ سب سُن رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر ادھر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی نیا رونے لگی۔ شہباز چپ چاپ کھڑا رہا۔ تو آپا نے پھر بولنا شروع کر دیا۔

اپنے پاس سلاتی ہوں۔ رات کو اُٹھ کے دباتی ہوں۔ پانی پلاتی ہوں۔ سو سو طرح اس کے ناز نخرے اٹھا رہی ہوں۔ اور اس کا صلہ یہ ہے کہ ذرا سمجھانے کی بات کہہ دوں تو بہو لٹھ لے بہانے لگتی ہے۔ جیسے میں اس پر ظلم ہی تو ڈھا رہی ہوں۔" شہباز چپ کھڑا رہا۔

"ادھر آؤ بیٹا۔ تم ہی میری بات سنو۔" انہوں نے شہباز کو اپنے پاس بلایا۔ "مجھے خود لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ چھ ماہ تک اسے آرام کرنا چاہیئے۔ یہ بہت کم زور ہوگئی ہے۔ ورنہ ہمیشہ بچہ ضائع ہو جایا کرے گا۔ مجھے تو تم دونوں سے زیادہ اپنی نسل عزیز ہے۔ میں جانتی ہوں تم دونوں ابھی بچے

ہو۔ جوان ہو۔ نادانی کی عمر ہے۔ یہ کچھ دن میرے پاس رہے گی تو کیا میں اسے کھا
ساری عمر تمہارے پاس ہی سونا ہے اسے یہ چلی تھی بیگم بستر اٹھا کے ——"

اتنی بات سُن کر شہباز کھڑا ہو گیا۔ اسے شرم آ گئی۔ پھر آپا بولتی رہیں اور وہ
میں چلا گیا۔ نیا کا دل جل گیا۔ آپا صریحاً جھوٹ بول رہی تھیں۔ نیا نے بڑے دکھ سے
اتنا پڑھا لکھا ہونے کے باوجود ہمیشہ آپا کی باتوں میں آ جاتا ہے۔ اس نے کبھی زبان
کی طرف داری نہیں کی تھی۔ ہمیشہ گردن ڈال کر نکل جاتا۔ اور وہ تنہا آپا کی جھک جھک
پر سہتی رہ جاتی تھی۔ اب بھی وہ بستر پر لیٹی یہی سوچتی رہی تھی کہ یہ کیسا شوہر ہے کہ
یہ —— اتنے دنوں سے اپنی بیوی سے جُدا ہے۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ اور
..... اس کو احساس نہیں —— بوقدم شہباز کو اٹھانا چاہیئے۔ وہ نیا کیوں اٹھائے۔
دل میں شہباز کے خلاف عتاب اکٹھا ہونے لگا۔

صبح جب وہ باورچی خانے میں ناشتا بنا رہی تھی۔ تو شہباز چپکے سے اس کے
اس نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ آج صبح وہ اپنے کمرے میں معمول کے مطابق منہ دھونے
گئی تھی اور نہ صبح اُٹھ کر شہباز کی آنکھوں پہ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ رکھ کر اسے
"تم مجھ سے ناراض ہو نیا ——" شہباز نے آہستہ سے پوچھا۔
"میری یہ جرأت کہ میں اس گھر کے کسی فرد سے ناراض ہو سکوں۔"؟
"یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو"
"آج ہی تو مجھے ہر بات کی سمجھ آئی ہے"
"نیا مجھے غلط نہ سمجھو ——"
"میرے اندر سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اگر صلاحیت ہوتی تو اب تک میں
کو سمجھ لیا ہوتا"
"نیا آپا بھی تمہاری دشمن نہیں ہیں"

"اپنی دشمن تو میں آپ ہی ہوں"
"نیا میری بات سمجھنے کی کوشش کرو"
"آپ مہربانی کر کے باہر تشریف لے جائیں۔ ورنہ میرے ساتھ بات کرنے کے لئے اپنی والدہ
صاحبہ کا پروانہ لے کر آئیں"
"نیا ——" شہباز نے جھلا کر نیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"چھوڑیئے میرا ہاتھ، آپ کی اماں نے دیکھ لیا تو کوئی اور فتویٰ صادر کر دیں گی۔ اس گھر میں میاں
بیوی کا آپس میں ملنا بھی جُرم ہے۔ نیا نے اتنی زور سے اپنا ہاتھ چھڑایا کہ شہباز لڑکھڑا سا گیا۔ اس
نے دروازہ پکڑ لیا۔ دروازہ زور سے بجا۔ اور اسی وقت آپا نمودار ہو گئیں۔ جھانک کر اندر دیکھا اور
ہر نکل گئیں۔ ساتھ ہی یہ بھی سُناتی گئیں کہ ساڑھے سات ہو گئے ہیں۔ ابھی ناشتہ ہی نہیں بنا۔ انہیں
دن بتاتے کہ یہ دفتر کا وقت ہے۔ ناز و انداز کا نہیں"

آپا کی آواز سُن کر شہباز باہر نکل آیا۔ اور آ کر میز پر بیٹھ گیا۔ آپا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر
رہیں "کیا آج باورچی خانے کے اندر بیٹھ کر ناشتہ کرو گے"؟ نیا اسی وقت ٹرے میں ناشتہ لگائے
ہر آئی۔ آپا نے نیا کا چہرہ دیکھا۔ غصّے سے لال سرخ ہو رہا تھا۔ وہ لوٹا اٹھا کر غسل خانے میں
ہی گئیں۔

شہباز یتیم سی شکل بنائے ناشتہ کرتا رہا۔ نیا باورچی خانے میں آ گئی۔ اُسے رہ رہ کر شہباز پر
غصہ آ رہا تھا۔ تین سال سے شہباز اپنے گھر میں سانپ اور نیولے کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔ اور تین
سال سے شہباز خاموش تھا۔

"کیوں تم کامرد ہے" کبھی کبھی نیا سوچا کرتی۔ "والدین کا احترام اپنی جگہ درست —— مگر
والدین کی زیادتیوں پر اُف تک نہ کرنا۔ اور اپنے حقوق کی پامالی کا تماشا دیکھتے رہنا کہاں کی انسانیت
ہے —— وہ کبھی آپا کے سامنے زبان نہیں چلاتی تھی کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ آپا کے
آگے زبان، ہاتھ، عقل، دماغ کچھ نہیں چلتا تھا —— سوائے خاموشی کے —— خاموشی بڑی اچھی

چیز ہے۔ خاموشی دانش مندی کی علامت ہے ـــــ احمقوں کے لئے خاموشی خوف
اور موزوں ترین جواب ہے ـــــ خاموشی ایک سمندر ہے۔ جس میں ڈوب جانے سے
نفس کا عرفان ہوتا ہے ـــــ خاموشی انسان کے اندر کی دنیا میں ہلچل مچا دیتی ہے!
ہاں خاموشی کی ہزار خوبیاں ہیں۔ مگر خاموشی میں ایک ہی عیب ہے۔ لاوا بن جاتی ہے
زلزلے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے ـــ توڑ پھوڑ بربادیاں ـــــ

زمین کے نیچے جو گاتے ہے۔ اُسے بھی سینگ بدلنے کی حاجت ہوتی ہے۔ جو
گائے تھی۔ جس نے سارا وزن دونوں سینگوں پر اُٹھا کر رکھا تھا۔ اس لئے اسے سینگ بدلنے
حاجت نہیں ہوتی تھی ـــ اس لئے اس کی خاموشی ابھی تک لاوا نہیں بنی تھی۔

لیکن اب پہلی بار ـــــ اُسے شہباز پر ٹوٹ ٹوٹ کر غصہ آ رہا تھا۔ اگر وہ اپنے
لئے بول نہیں سکتا تو اس نے شادی کیوں کی ـــــ اُس نے شہباز کے ساتھ بول چال
بند کر دی۔ جب وہ دفتر سے آتا تو اس کے سامنے نہ جاتی۔ باورچی خانے میں ہی بیٹھی رہتی
اس کے آنے سے پیشتر ہی اپنے کمرے سے اپنی ضرورت کی سب چیزیں اٹھا لاتی۔ اپنی
چھ ماہ کی قید لگائی تھی۔ اور ابھی تو تین مہینے ہی گزرے تھے۔ خدا جانے وہ ستم شعار رات
پلنگ پر کیسے سو جاتا ہے۔ وہ دل میں سوچتی ـــ چھ ماہ تو کیا ـــ وہ چھ سال بھی اس
کمرے میں نہیں جائے گی۔

آپا کے لئے میدان صاف ہو گیا تھا۔ بیٹے اور بہو کی بول چال بند تھی۔ اور بھی
سکیم تھی۔ جب شہباز دفتر سے واپس آتا تو اس پر خواہ مخواہ نثار ہوتی رہتیں۔ اپنے پاس
کھانا کھلاتیں۔ چمکارتیں ـــــ

مگر جب وہ کام کرتی ہوتی نیا کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا تو اس کی نظروں میں حسرت
حسرتیں ہوتیں ـــــ نیا کا دل جل جاتا ـــــ اسے مظلوم قسم کے لوگ اچھے نہیں لگتے
اور مظلوم مرد تو بالکل ہی مضحکہ خیز سے بن جاتا ہے۔

شہباز دفتر سے آنے کے بعد اس کوشش میں رہتا کہ ذرا آپا ادھر ادھر ہوں اور وہ نیا سے
بات کرے ـــــ لیکن اسے موقع مل بھی جاتا تو نیا طرح دے جاتی۔ وہ اپنے غصے کا کھلم کھلا
اظہار کر رہی تھی۔

اُس رات شہباز کچھ زیادہ ہی بے تاب تھا۔ نیا رسالہ اٹھا کر آپا کے کمرے میں چلی گئی تھی
بغیر مقصد کے شہباز کئی بار دروازے کے آگے سے گزرا تھا۔ مگر نیا نے اس کی طرف
میں دیکھا تھا ـــــ پھر وہ آپا کے کمرے میں چلا آیا اور آپا کے پاس بیٹھ گیا۔ آپا بھی اِدھر اُدھر
باتیں کرتی رہیں۔ جب گیارہ بج گئے تو کروٹ لے کر بولیں "جاؤ اب تم بھی جا کر سو جاؤ ـــــ
نیند آ رہی ہے"۔ شہباز کھڑا ہو گیا۔ مگر اس کی نظریں نیا پر لگی تھیں۔ نیا نے جان بوجھ کر اس کی
طرف نہیں دیکھا۔ بس رسالہ پڑھتی رہی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے شہباز نے نیا کا
دوپٹہ کھینچا ـــــ اور جب اس نے چونک کر رسالہ ہٹا کر دیکھا تو شہباز نے اسے آنکھوں سے
آنے کا اشارہ کیا ـــــ یہ اشارہ آپا نے دیکھ لیا ـــــ انہوں نے گھور کر نیا کی طرف دیکھا۔ نیا نے
فوراً اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تھا ـــــ شہباز نے دُور جا کر پھر مُڑ کر دیکھا۔ آپا اسے دیکھ رہی تھیں وہ
شرمندہ سا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ نیا نے اُٹھ کر بتی بجھا دی۔ ایسے میں آپا کے دل میں ایک
لطرے نے سر اٹھایا۔ وہ سیدھی ہو کر لیٹ گئیں ـــــ اور بولیں "اے بہو! ذرا میری ٹانگیں
دبا دے۔ آج بہت درد ہو رہا ہے" ـــــ سارا دن کام کرنے سے نیا کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا
مگر اس نے کچھ نہیں کہا ـــــ پلنگ پر بیٹھ کر اپنے نازک نازک ہاتھوں سے آپا کی ستون نما ٹانگیں
دبانے لگی ـــ دباتے دباتے اسے اُونگھ آ جاتی تو پھر آپا ـــــ ہنکاری بھرتیں۔ اور اُسے ہوشیار کر
دیتیں۔ جب نیا پوری طرح بے دم ہو گئی اور اس کے اعصاب نے جواب دے دیا۔ تب آپا
نے اسے سو جانے کو کہا ـــــ اس پر بھی بس نہیں۔ آپا تھوڑی تھوڑی دیر بعد نیا کے بستر پر ہاتھ
مار کر دیکھتیں ـــــ آیا وہ اپنے بستر پر ہے۔ یا اُٹھ کر چلی گئی ہے۔ اس صورتِ حال پر نیا کو مزید
غصہ آ رہا تھا۔ سب کیا دھرا شہباز کا تھا۔ نہ اتنی بے تابی سے دروازے میں منڈلاتا نہ آپا اس

پر پیر سے کڑے کرتیں۔

اُس کے بعد ہر رات آپا کا یہ معمول ہوگیا۔ کہ سونے سے پہلے نیا سے کہتیں کہ
پاؤں دبا دے ——— اور جب تک وہ تھک کر چور نہ ہو جاتی۔ اسے سونے نہ دیتیں
نیا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آدھی رات کو اُٹھ کر وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ اِدھر
بستر پر ہاتھ مارا نیا کو نہ پا کر بوکھلا گئیں۔ کمرے کی بتی جلائی۔ اور سیدھی شہباز کے کمرے
دوڑیں۔

"اے نیا ———"

"اے نیا ———" آپا نے اتنی زور زور سے دروازہ پیٹا کہ سویا ہوا شہباز گھبرا
دروازہ کھولا تو دیکھا ماں کھڑی ہے!

"کیا ہوا ہے آپا ———؟"

عین اسی وقت نیا آپا کے کمرے سے برآمد ہوگئی ——— بڑے طنزیہ انداز میں بولی
یہاں ہوں آپا ——— آپ پریشان کیوں ہوگئی تھیں۔ مجھے بھی اس کمرے میں جانے
نہیں ہے ———" شرمندہ سی آپا لنگڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئیں۔ اور بیٹھ کر
دبانے لگیں ——— وہ بہو اور بیٹے کے سامنے اتنی شرمندہ تھیں کہ کچھ دیر تو ان سے کچھ
جا سکا ——— نیا کا دل چاہ رہا تھا کوئی شے اُٹھا کر آپا کے سر پر دے مارے۔ بڑھیا
سٹھیا جائے گی۔ اسے امید نہ تھی۔

"آپا آپ میری ایک بات مانیں گی ———" وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ اور بڑی
چادر اوڑھ کر آپا سے مخاطب ہوئی ———

"کیا ہے ———؟" آپا نے جیسے کراہ کر کہا۔

"آپ ایسا کریں۔ شہباز کے کمرے میں سو جایا کریں۔"

"کیوں ———" وہ غرائیں ——— نیا تھوڑی دیر چپ رہی۔ اور پھر بولی۔

"تب تو کوئی فکر نہیں رہے گا نا ———"

یہ فقرہ کہہ کر نیا کو بہت مزہ آیا ——— لیکن سارا مزہ آپا نے کرکرا کر دیا ——— تکیہ
اٹھا کر زور سے نیا کے منہ پر دے مارا ——— "حرافہ، کمینی، میرے ساتھ مذاق کرتی ہے"

دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ نیّا اپنا کمرہ صاف کر رہی تھی کہ ایک دم دروازہ بجا اور اندر آگیا۔ شہباز کو دیکھ کر نیا ششدر رہ گئی۔ اُس کے آنے کا یہ وقت نہیں تھا اور جب سے اُن کی شادی ہوئی تھی وہ کبھی دوپہر کو گھر نہیں آیا تھا۔ آج اُسے کمرے میں کھڑے اس طرح ہراساں ہوگئی جس طرح کوئی دوشیزہ اپنے کمرے میں کسی راہ زن کو دیکھ لیتی۔ شہباز اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ" نیّا کے ہاتھ سے جھاڑو گر گئی۔ شہباز ہنستا رہا۔

"اگر آپا نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔"

"مجھے معلوم ہے آپا اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔"

"مگر وہ کسی بھی وقت آسکتی ہیں۔"

"وہ جب کلثوم خالہ کے ہاں جاتی ہیں تو چار بجے سے پہلے نہیں آتیں ۔" نیّا نہیں تھا کہ آپا نے صبح اپنا پروگرام شہباز کو بتا دیا تھا۔

"پھر بھی آپ اس وقت کمرے سے چلے جائیں۔ یا مجھے جانے دیں۔" نیّا آگے آ

"نہ میں خود جاؤں گا۔ نہ تمہیں جانے دوں گا۔"

"مجھ میں اور بے عزتی کروانے کی ہمت نہیں ہے۔" نیّا کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ دروازے کی طرف بڑھی تاکہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائے۔ شہباز نے ہنس کر اُس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ "دیکھتا ہوں کیسے جاتی ہو۔"

"اپنی اماں کی اجازت کے بغیر مجھے ہاتھ مت لگائیے گا ۔ جائیے پہلے ان سے تحریری اجازت نامہ لائیے کہ آپ اپنی بیوی کو چھو سکتے ہیں۔"

"یہ طعنہ دینے کا وقت نہیں ہے نیّا!"

"مجھے معلوم ہے اس گھر میں کسی بات کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔"

"خدا کے واسطے میری بات سنو۔" شہباز نے نیّا کو پکڑ لیا۔

"میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔" نیّا اپنا آپ چھڑانے لگی۔

"تم کیسے نہیں سنو گی۔ میں تمہیں زبردستی سناؤں گا۔" شہباز کا لہجہ کرخت ہو گیا۔

"واہ ۔ آج تو آپ مردوں کی طرح بول رہے ہیں۔"

"تم نے ابھی میرا غصہ نہیں دیکھا ۔"

"اچھا ۔ آپ کو بھی غصہ آتا ہے۔ میں نے تو صرف آپ کی اماں کا غصہ دیکھا ہے اور خیار کے لئے کافی ہے۔ ویسے اتنا ضرور بتا دیں کہ آپ کو بھی کمزوروں اور مجبوروں پر ہی غصہ آتا ہے ۔" شہباز نے بڑھ کر نیّا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خدا کے لئے نیّا ۔ خدا کے لئے نیّا ۔ مجھے اتنا شرمندہ نہ کرو کہ میں اپنی نظروں گر جاؤں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ واقعی مجبور ہوں۔ بے بس ہوں۔ میں نے تمہیں پہلے دن بتا تھا ۔ نیّا! مجھ پر رحم کرو ۔" شہباز کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ اس لئے نیّا دل ہو گئی ۔ کچھ کہنا فضول تھا۔

"میں بہت اُداس ہوں نیّا۔ بہت اُداس ہوں ۔" نیّا کے لبوں پر ایک طنزیہ تبسم ا "جی ۔ صرف اپنے غم کو غم کہتے ہیں آپ، اور میرا غم تو گویا غم نہیں ؟"

"مجھے معلوم ہے میں تمہاری حالت کا اندازہ کر سکتا ہوں۔" شہباز نیا کی طرف بڑھا وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ، اب تشریف لے جائیں۔ کافی وقت ہو گیا ہے۔"

"جب تک تم صلح نہیں کرو گی۔ میں نہیں جاؤں گا۔"

"اچھا میں صلح کرتی ہوں۔ وہ جلدی سے بولی۔ اب جائیے کہیں آپا نہ آجائیں۔"

"آجائیں گی تو کیا ہو گا؟"

"ہو گا کیا آپ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے نیچے اتر جائیں گے اور وہ بلی کی طرح نوچ نوچ کھائیں گی۔"

شہباز کو ہنسی آگئی۔ "دیکھو تم میری ماں کی شان میں گستاخانہ کلمات کہہ رہی ہو۔"

"اور آپ کی اماں جو سارا دن میرے آباؤ اجداد کی شان میں فرماتی ہیں وہ کبھی سنا۔ آپ نے ——؟"

"نیا —— نیا —— میں سب جانتا ہوں۔ اسی واسطے تو تمہاری عزت کرتا ہوں۔ احترام کرتا ہوں —— تمہارے قدموں پر سر رکھتا ہوں ——"

کتنے مہینوں سے نہیں رکھا قدموں پر سر —— یاد ہے" —— نیا نے اس سے کہا کہ شہباز کھسیانا سا ہو کر ہنس پڑا —— آگے بڑھ کر اس نے نیا کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اب اس کی گرفت سے نیا کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ نکل نہ سکے گی۔

"جب سے تم نے میرے ساتھ بولنا چھوڑا ہے میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ میں بھی دل نہیں لگتا۔ کئی دنوں سے موقعے کی تلاش میں تھا۔ آج ایک کام کا بہانہ کر کے اٹھ آیا ہوں۔ اگر آج صلح نہیں کرو گی —— تو اس کھڑکی سے کود جاؤں گا۔" اس کی گرم سانسیں نیا کے چہرے کو چھونے لگیں۔

"یہ کام بھی آپ سے نہ ہو گا۔ میرا خیال ہے ایک دن مجھے ہی کودنا پڑے گا۔"

نیا نے چہرہ پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ایک بات ہے۔" شہباز ہنس کر بولا "آپا کے ساتھ رہ رہ کے تم طعنے اچھے دینے لگ گئی ہو۔"

اس مرتبہ نیا کو ہنسی آگئی۔ اور پھر شہباز نے اسے کچھ اور کہنے کا موقع نہیں دیا۔

میاں بیوی کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے —— لڑائی میں ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں ایسی کڑوی کڑوی باتیں ہوتی ہیں کہ یوں لگتا ہے زندگی بھر منہ کا یہ کڑواپن نہیں جائے گا۔ ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی بیچ میں صدیوں کے فاصلے حائل ہو جاتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے یہ فاصلے کبھی کم نہ ہوں گے، یہ خلیجیں کبھی نہ پٹیں گی —— یہ کھائیاں اور وسیع ہو جائیں گی —— وہ ایک دوسرے سے کبھی نہ بولیں گے —— کبھی نہ ہنسیں گے۔ کبھی ایک دوسرے سے محبت نہ کر سکیں گے مگر جب صلح ہو جاتی ہے اور آخر کار صلح ہو ہی جاتی ہے تو ساری قسمیں اور عہد جھاگ کی طرح بہہ جاتے ہیں —— لڑائی کے بعد صلح بھی بڑی کیف آور ہوتی ہے۔ اس لئے کہ فریقین اپنا زہر اور غبار نکال چکے ہوتے ہیں۔ دل آئینے کی طرح صاف ہو جاتا ہے —— تب محبت کے سارے عکس جھلملانے لگتے ہیں۔ غبار آلود آئینے پر محبت کا سایہ ٹھیرتا نہیں۔ اور پھر اگر اتنی خطرناک لڑائیاں نہ ہوں تو محبت کے نت نئے روپ کیسے نظر آئیں ——؟

نیا اور شہباز تو کئی مہینوں سے دوریاں کاٹ رہے تھے۔ ایک دوسرے کی سانس کی آنچ پہنچی تو موم کی طرح پگھلنے لگے۔ آج شہباز کا والہانہ پن نیا کو ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگا دونوں بھول گئے کہ وہ کہاں ہیں؟ —— اور وقت کا کون سا پہر ہے —— نیا کو لاشعوری طور پر اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ شہباز نے بالآخر اپنی اماں سے بغاوت کر دی گو وہ علی الاعلان ایسا نہیں کر سکا مگر اس کا چھپ کر آنا بھی —— اس کی جرأت مندی کی دلیل تھی —— رفتہ رفتہ وہ اسے اپنے ڈھب پر لے آئے گی —— نیا کے دل کا سارا غبار

ڈھل چکا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ اس ظالم کے لیئے وہ کیا کچھ نہیں سہہ سکتی۔

شہباز اُٹھ کر جانے لگا تو نیّا نے اس کے کوٹ کا کونا پکڑ لیا۔

"حضور! ارادے کیا ہیں؟" وہ ہنسنے لگا۔ کوٹ چھڑایا۔ پھر کنگھی اُٹھا کر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا ـــــ اور اپنے بال سنوارنے لگا۔

"اب چلوں، کہیں آپا نہ آجائیں۔"

"تھوڑی دیر پہلے تو آپ کو آپا کی اتنی پروا نہیں تھی۔"

"وہ تھوڑی دیر پہلے کی بات تھی ـــــ" شہباز نے ایک آنکھ بند کر کے کہا۔

"اور اب میں جانے نہیں دوں گی۔" نیّا بھی کھڑی ہو گئی۔

نیّا پلیز مجھے جانے دو۔ میں دفتر سے ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا تھا اب دو گھنٹے ہو

تم نے منت کروانے میں ہی سارا وقت لے لیا۔"

"بے ایمان ـــــ" نیّا اس کے پیچھے دوڑی مگر وہ دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اتر گ

کے بعد بھی ہفتے میں دو ایک بار شہباز دوپہر کو گھر آجاتا۔ جبکہ اس کی ماں گھر پر نہ ہوتی اور یہ نیّا ہمسائے کے فون پر دیا کرتی تھی۔ آپا اس بات سے بالکل بے خبر تھیں۔ انہیں یہ بھی اندا کہ آج کل پھر نیّا کا حلیہ درست رہنے لگا ہے۔ وہ کپڑے بدلتی ہے۔ سنگھار کرتی ہے وقت گنگناتی بھی ہے اور ہر کام خوش دلی سے کرتی ہے۔ وہ تو صرف اتنا دیکھ رہی تھیں رات کو جلدی سو جاتی ہے۔ بار بار شوہر کے دروازے کی طرف نہیں دیکھتی۔ برتن ادھر پٹختی۔ نہ رات گئے تک رسالہ پڑھتی ہے بلکہ جلدی بتّی بجھا دیتی ہے۔

"بٹیا کا دماغ درست ہو گیا ہے اب" ـــــ یہ سوچ کر انہوں نے پھر سہیلیو ہاں جانے کی مہم شروع کر دی تھی۔

ہنڈیا بھونتے بھونتے ایک دم نیّا کا سر چکرایا اور پھر اس کا جی متلانے لگا۔ غسل خانے کی طرف بھاگی۔ جب حواس بجا کر کے کمرے میں آئی تو مارے خوف کے جی جان سے لرز گئی۔ اب اُسے پتہ چل چکا تھا کہ یہ انگڑائیاں کیوں آتی ہیں؟ ہاں یہ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ مگر..... مگر..... آپا نے اس پر بندشیں لگا رکھی تھیں..... اُس نے کئی بار شہباز سے اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا۔ مگر وہ اس کی سُننا کب تھا۔ ہر بار ٹال جاتا۔ اور اب اس کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کا بھید کھلنے والا تھا۔

"ظلم ہے یہ تو" ـــــ اُس نے دل میں سوچا ـــــ وہ شادی شدہ تھی ـــــ شوہر والی تھی مگر اس موڑ پر خوفزدہ تھی، جیسے اُس نے کوئی گناہ کر لیا ہو، کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو اس سے اُلجھی بڑی جہاندیدہ عورت تھی اور اس سے یہ سب کچھ چھپانا کس قدر مشکل لگ رہا تھا۔

"خداوندا! میں کیا کروں؟"

سارا دن بہت پریشان رہی۔ ناک پر کپڑا رکھ رکھ کے باورچی خانے میں کام کرتی رہی ـــــ شام کو جب شہباز آیا تو اس نے موقع پا کر اُسے بتا دیا۔ پہلے تو وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔

نیّا تم ذرا ہمّت کرو اور یہ ایک مہینہ کسی نہ کسی طرح خود پر جبر کر کے گزار لو۔ پھر آپا کی میعاد

بھی پوری ہو جائے گی اور بندش بھی نہ رہے گی تو ——"

"اونہہ" —— نیا کو پھر غصہ آنے لگا —— "بزدل، کمینہ —— اتنا نہیں کر سکتا کہہ دے۔ میری بیوی ہے —— میرا بچہ ہے —— کون ہے جو مجھ سے یہ حق چھین سکتا ہے۔ اب بھی سارا بوجھ مجھی پر ڈال رہا ہے" —— نیا سارا دن جلتی کڑھتی رہی۔ اسے پتا تھا کہ شہباز ازلی بزدل ہے۔ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کرے گا۔ سبھی کچھ اس کو کرنا پڑے گا۔ اس کی طبیعت ایک دم سست ہو گئی تھی۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ خوشبو بھی بری اور بدبو بھی —— ایسے میں اسے دل پر جبر کر کے گھر کا سارا کام کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی تو اس کا چھت پر سے کود جانے —— طبیعت میں وہی چڑچڑا پن دوبارہ عود کر آیا تھا —— اور کئی دن سے اس کی اڑی اڑی رنگت اور بکھری بکھری حالت دیکھ رہی تھیں۔ کئی بار بڑے مؤدبانہ انداز میں انہوں نے پوچھا ——

"اے بتو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہوں جی بالکل"

"پھر کچھ کھا کیوں نہیں رہی"

"جی ساری رات میرے سر میں درد ہوتا رہا ہے تو میرا جی متلاتا ہے۔ میں کچھ کھا نہیں سکتی"

"یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہے" اور آپا کی سمجھ میں کوئی دوسری بات بھی نہیں آتی تھی۔ انہوں نے اس پر کڑا پہرہ رکھا تھا۔ حتیٰ کہ ماں کے گھر بھی اسے تنہا ہی بھیجا کرتیں یہ کہہ کر کہ ان دن چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ سو طرح کے کام ہوتے ہیں اور ملنے جلنے والے آتے ہیں۔ تم کو اپنی اماں سے مل آیا کرو" صبح کو شہباز دفتر جانے کے بعد وہ بس پر چلی جاتی اور شام کے آنے سے پہلے اس کا بھائی اسے گھر چھوڑ جاتا۔ ایسی صورت میں بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ اپنی طرف سے تو آپا بہت مطمئن تھیں۔ مگر نیا کی حالت بھی خاصی مشکوک تھی۔ منہ سے وہ کچھ پھوٹتی نہیں تھی اور نہ انہیں پکڑنے کا کوئی موقع دیتی تھی۔ پھر کچھ دن

کے بعد آپا پر یکایک گھر کی صفائیوں کا بھوت سوار ہوا —— کبھی تو وہ نیا سے بھاری بھاری بکسے اٹھوا کر باہر رکھواتیں۔ کبھی اندر رکھواتیں —— کبھی اسے سیڑھی پر چڑھا کر گھر کے جالے صاف کروانے لگتیں۔ کبھی سارے گھر کے فرش دھلوانے لگتیں۔ نیا یہ کام بالکل نہیں کرنا چاہتی تھی —— کبھی کبھی دل چاہتا صاف کہہ دے —— کہ اب وہ اپنی جان پر یہ ظلم برداشت نہیں کرے گی —— پھر وہ ڈر جاتی۔ اس کے بعد نہ جانے یہ عورت کیا حشر کرے —— ؟ یہ بات تو —— شہباز ہی کہے تو ٹھیک ہے —— پھر بھی وہ دل میں دعائیں مانگتی ہوئی ہر کام میں جت جاتی۔ ہر گھڑی اس کے دل کو ایک کھٹکا سا لگا رہتا ——

ایک صبح نہ جانے کیا ہوا کہ گھر کا نل ہی خراب ہو گیا۔ کسی ٹونٹی میں پانی نہیں آ رہا تھا۔ آپا نے اس کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ نیچے سے پانی بھر کر لائے —— ایک دن —— دو دن —— اور تین دن —— کسی کو خیال ہی نہ تھا کہ نل ٹھیک کروا دے۔ اس نے پہلے دن ہی شہباز سے کہہ دیا تھا کہ یہ کام اس سے نہیں ہو سکے گا۔ وہ اپنی اماں کو بتا دے سب کچھ —— مگر شہباز اسے ایک جھوٹی تسلی دے کر چلا گیا تھا۔ . . . اور پھر جو ڈرتا ہے وہ مرتا ہے —— وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس بار اس نے آپا کو نہیں بتایا —— درد کو اپنے سینے میں دبائے کمرے میں پڑی روتی رہی۔ شام کو جب شہباز آیا تو اس نے رو رو کر سب کہہ سنایا ——

"اب کیا ہو گا" —— ؟

"میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں"

"اپنی اماں سے کیا کہو گے"

"تم پہلے ڈاکٹر کے پاس چلو۔ میں آپا کو بعد میں آ کر بتا دوں گا" لیکن اندر کھسر پھسر کی آواز سن کر آپا خود آ نمودار ہوئی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے ؟"

"نیا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں ذرا اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں"

"کیا ہوا اس کی طبیعت کو یک لخت" ـــــ آپا نے کرختگی سے پوچھا۔

"ابھی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں" نیا کھڑی ہو گئی ـــــ شہباز نے اسے کا اشارہ کیا۔

"کیسے چلیں گے ؟" اس نے شہباز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اسکوٹر پر"

"میں اسکوٹر پر نہیں بیٹھوں گی"

"اے تو اپنے ابا سے کہا ہوتا۔ وہ جہیز میں موٹر دے دیتے اپنی لاڈلی کو"

آپا جو غصے کو دبائے کھڑی تھیں۔ جھٹ بولیں۔ اس وقت تو خالی خالی لڑکا ہمیں ـــــ داماد کو سلامی میں موٹر ہی دے دیتے ـــــ اور موٹر نہیں تھی تو تیس چالیس نقد دے دیتے تو آج بنو کو نخرہ نہ کرنا پڑتا"

نیا نے درد کو دبا کر بے بسی سے شہباز کی طرف دیکھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آپا نے بھی نہیں کہا بلکہ سہارا دے کر نیا کو سیڑھیوں سے نیچے اتارنے لگا ـــــ نیا کی پلکیں جھر جھر آنسو بہنے لگے ـــــ ہر سیڑھی پر ایک آہ پھسلتا اور اس کے قدموں تلے آ کر جاتا ـــــ پتہ نہیں درد و کرب کے اور کتنے مرحلے ابھی اور باقی تھے ـــــ وہ چلا کر رونا چاہتی تھی۔ مگر ڈاکٹر نے اسے منع کر دیا تھا۔

"دوسری بار ایسا اتفاق ہو تو اسے ہم بے وقوفی کہتے ہیں"

نیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا کہتی ـــــ کس طرح اپنا کلیجہ چیر کر ڈاکٹر کو دکھا ـــــ شہباز سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا ـــــ

اور جب شام ڈھلے تک وہ دونوں گھر واپس نہیں آئے تو آپا خود اسپتال گئیں ـــــ ڈاکٹر نے اسی وقت نیا کو اپنے کمرے میں لا کر لٹایا تھا اور شہباز سے کہا

"میں نے انہیں سونے کا انجکشن لگا دیا ہے۔ انہیں ڈسٹرب نہ کریں اور نہ رونے دیں۔ یہ بہت کمزور ہو گئی ہیں ـــــ"

شہباز سے ملنے سے پہلے آپا ڈاکٹر سے سب کچھ پوچھ چکی تھیں۔ کمرے میں آ کر شہباز کے روبرو کھڑی ہو گئیں اور خونخوار انداز میں غرا کر پوچھا۔

"یہ سب ہوا کیسے" ـــــ ؟ شہباز خاموش رہا۔

میں پوچھتی ہوں۔ یہ سب ہوا کیسے" ـــــ ؟

اور جب تیسری مرتبہ انہوں نے یہی فقرہ دہرایا تو گم صم شہباز نے سر اٹھایا ـــــ اور بڑے سکون سے بولا ـــــ جس طرح ہوتا ہے . . . "

اپنی جگہ پر آپا کو جھٹکا لگا۔ انہیں امید نہ تھی کہ شہباز اس قسم کا جواب دے گا۔ اور پھر کتنی نامعقول بات وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔ یہ وقت ان باتوں کے پوچھنے کا نہ تھا۔ آخر زمانہ سازی بھی تو کوئی چیز ہے۔ تو ڈی دیر سراسیمگی کے انداز میں ادھر ادھر دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔

بڑوں کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ تم لوگ نہیں سمجھتے کہ یہ بندشیں کیوں لگائی جاتی ہیں ـــــ دیکھ لیا اپنی ہٹ دھرمی کا انجام ـــــ اب یہی کچھ ہوتا رہے گا تمہارے ساتھ ـــــ یہ عورت کبھی بچہ پیدا نہ کر سکے گی ـــــ یاد رکھنا میری بات"

اسی وقت زرد رو نیا نے کراہ کر اپنی آنکھیں کھول دیں (وہ اس وقت غنودگی کے عالم میں تھی۔ ابھی تک اس پر ٹیکے کا اثر تھا) مگر کچھ بھی تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہاں آپا کی کرخت آواز سماعت سے ضرور ٹکرا رہی تھی اور ان کا چہرہ بھوت کی مانند نظر آ رہا تھا۔ بار بار کراہ کے ساتھ نیا سر ادھر ادھر پٹکتی رہی۔

کسی نہ کسی طرح رات بھی گزر گئی۔ شہباز اسے صبح کو ہی گھر لے آیا۔ کیونکہ اس کے ساتھ رہنے والا کوئی نہ تھا! ورنہ کوئی اسپتال میں کھانا پہنچانے والا تھا۔ گھر آئی تو چاروں طبق روشن ہو گئے

جب تک شہباز گھر پر رہا آپا چپ رہیں۔ جب وہ دفتر چلا گیا تو غراتی ہوئی اس
آئیں اور اس کی چٹیا کھینچ کر بولیں۔

"کیوں ری حرافہ ——— یہ چھن کہاں سے سیکھے ہیں تو نے اشکل سے تو اتنی معص
دیتی ہے اور کرتوت تیرے یہ ہیں۔ یہ سب باتیں کیا پالنے میں سیکھ کے آئی ہے۔ چلی تھی
——— مقابلہ بھی کیا تو میرے ساتھ ——— مجھ سے تو میرا بیٹا چھیننا چاہتی ہے تو ایسا
تک نہ ہوگا۔ میں جرنیل آپا ہوں جرنیل آپا ——— جس نے شوہر کو قبر کے حوالے کر دیا مگر مال
تک نہ دیا۔ میں اپنے بیٹے اور بہو کا بھی وہی حشر کر سکتی ہوں۔ تیری بوٹیاں نوچ کے چیلوں
ڈال دوں گی اور تیری منّا کو خبر تک نہ ہونے دوں گی ——— سمجھ کیا رکھا ہے تو نے مجھے
دن کی لونڈیا اور میری آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے ——— چار حرف پڑھ کر میرے
ٹکر لے رہی ہے ——— میرے ساتھ ٹکر لینے کے لئے بھیجا بھی بڑا ہونا چاہیئے اور کلیجہ
حرام زادی ——— حرافہ ——— یہاں یہ عشق و عاشقی نہیں چلے گی۔ تو سمجھتی ہوگی تو نے
خصم کو قابو میں کر لیا ہے۔ میں تو تیرا سایہ نہ پڑنے دوں گی اس پر ..... دیکھ تو سہی میں
کیا کرتی ہوں ——— اسی بچے کے لئے تو ترس ترس کے مر جائے گی ..... تیرے سا
سوت لاؤں گی ..... اس صحن میں تیری قبر بناؤں گی ..... تو ذرا میری حکم عدولی
دیکھ ——— آج تو میں نے تجھے بیمار جان کے چھوڑ دیا ہے ——— آئندہ میری مرضی
قدم بھی اٹھایا تو مار مار کے بھرکس نکال دوں گی ....."

نیا گم صم بیٹھی تھی۔ ابھی اس کے حواس بھی درست نہیں ہوئے تھے کہ بے بھاؤ کی
ہو گئیں ..... اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس نے جرم کیا کیا ہے؟ اپنے شوہر کو شوہر سمجھ
ہے۔ یا ———

یہ کیسا جہاں ہے۔ جہاں اس پر بلاوجہ الزام آ رہا ہے۔ جب اسے کچھ سمجھ نہیں آنے لگی .....

"یہ چھنالیں، یہ آج کل کی چھنالیں" آپا پھر دہاڑیں! "خصم سے دور نہیں رہ سکتیں۔ پتہ نہیں
شادی سے پہلے کیا کرتی ہوں گی ..... یہ تو سرا اٹھاتے ہی خصم مانگتی ہیں ..... ہاں ہاں انہوں
نے چار کتابیں جو پڑھ لی ہیں۔ سب کچھ جان لیا ہے ——— میں نے اس پر کڑا پہرہ بٹھایا ———
جانے کم بخت نے کب ——— کب یعنی گھر میں میرے ہوتے ہوئے ———" وہ ہانپنے لگی تھیں
لیکن غصہ تھا کہ کم ہونے میں نہ آتا تھا۔

"اب تو اپنے شوہر کی شکل دیکھنے کو ترسے گی۔ سنا تو نے ——— اب تو بیوہ کی طرح زندہ رہے
گی ——— سنا تو نے ——— وہ دانت کچکچا کر کہہ رہی تھیں اور نیا زار و قطار روئے جا رہی تھی۔
وہ تو اللہ بھلا کرے ہمسائی کا وہ شور سن کر اوپر آ گئی۔ آپا جلدی سے چپ ہو گئیں .....

"آؤ بہن آؤ بیٹھو!" انہوں نے اتنی شفقت سے کہا جیسے لحظہ پہلے ان کی زبان انگارے
نہیں پھول برسا رہی تھی۔

پڑوسن بیٹھ گئیں۔ مگر انہوں نے بہو کے جھر جھر بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر سارے معاملے کو
سمجھ لیا تھا۔ نیا بھی منہ پھیرے اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ اسے ڈر آ رہا تھا۔ اگر آپا ہمسائی کے سامنے
اس کے لتے لینے لگیں اور ساری کہانی اسے سنا دی تو کیا ہوگا ———

"وہ اٹھ کر اندر چائے بنانے چلی گئیں ——— بی ہمسائی تھوڑی دیر آپا سے گپ شپ لگاتی
رہی۔ پھر بولی۔

"نیا دلہن کیوں رو رہی ہے ———"

"اونہہ ———" آپا نے برا سا منہ بنایا۔

"اس کے ابا مر گئے ہیں۔ ابھی اطلاع آئی ہے"

"کیا سچ ———" بی ہمسائی نے حیرت سے کہا۔

"بابا کے مرنے پر ہی ہم نے تو لوگوں کو اس طرح روتے پیٹتے دیکھا ہے ——— ہاں اچھا
ہے اس کی نحوست میکے پر ہی پڑے ———"

نیا بستر پر بیٹھی لرز گئی ـــــ پھر اس سے اور نہیں بیٹھا گیا۔ کھڑی ہوتی اور لڑکھڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی ـــــ بہت سے زہر میں بجھے ہوئے تیر پھینکے تھے آپا نے..... بہت برچھیاں اس کے کلیجے میں ماری تھیں..... بہت سے اوچھے وار کیے تھے ـــــ مگر سب سے کاری تھا۔

اور یہ وار وہ سہہ سکتی تھی۔ اندر آکر بستر پر گر گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی "آباجی، پیارے ـــــ او میرے آباجی ـــــ آکر دیکھو میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیا اسی دن کے لئے آپ نے پالا تھا۔ کتنی بے دردی سے آپ نے اپنے جگر کا ٹکڑا قصائی کے حوالے کر دیا"

وہ روتی رہی اور آباجی اور امی جی کو یاد کرتی رہی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اُڑ کر اپنے پہنچ جائے۔ امی کی چھاتی میں منہ چھپا لے، آباجی کے کندھے سے لگ جائے ـــ اپنے بھا سے آسرا مانگے۔ آخر وہ بیٹھے بیٹھے کٹی پتنگ کیوں بن گئی تھی۔؟

آپا ایک پیالی چائے کی اُس کے پاس رکھ کے سہیلیوں سے ملنے چل دی تھی اور وہ رو رو بے حال ہو چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس گھر میں کیا ہونے والا ہے ـــــ

شام کو جب شہباز دفتر سے آیا تو آپا ابھی تک نہ لوٹی تھیں۔ اس نے رو رو کر شہباز سے کی کہ اسے میکے پہنچا دیا جائے۔ وہ بہت بیمار ہے اور یہاں کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ آپا کی ساری باتیں اس نے شہباز کو بتا دی تھیں۔ وہ آپا کے آنے سے پہلے ہی اسے چھوڑ آیا ـــــ

امی اس کی صورت دیکھ کر ہی پریشان ہو گئی تھیں ـــــ اتنی زرد اور بھیانک لگ رہی تھی اس کا کمرہ ٹھیک کر کے امی نے اُسے وہاں لٹا دیا تھا۔ شہباز اُسے چھوڑ کر اور مختصراً ساری بات بتا چلا گیا تھا۔ امی نے اس کے لئے سوپ بنایا اور کتنی اور کھانے کی چیزیں بنائیں۔ آباجی اُسے دیکھ آتے۔ سب بھائی بھی آتے۔ سب کے چہرے محبت کے آئینہ دار تھے۔ سب ہی اس کے با میں فکر مند تھے ـــــ سبھوں نے اس کے لئے دُعا کی ـــــ آہ ان کے چہروں کے لئے اور ان

کے لئے وہ کیسے کیسے ترستی رہی تھی۔ وہ بے سُدھ لیٹی رہی جیسے یقین اور بے یقینی کی درمیانی کیفیت میں ہو۔ رات کو جب سونے سے پہلے امی جان اس کے پاس آئیں اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو اس کی زخمی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ اگر ماں بیٹی کے آنسوؤں کی زبان سمجھ سکتی ہے تو امی کو ضرور پتہ چل گیا ہوگا کہ یہ آنسو کیا کہہ رہے ہیں۔

امی جان اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھے۔ کھوئی کھوئی نظروں سے نیا کو دیکھ رہی تھیں! وہ دیکھے جا رہی تھیں۔

نیا نے آنسو پونچھ کر اپنی ماں کو دیکھا کو پھر سوچا ـــــ وہ تھک گئی ہے۔ آبلہ پا ہے ـــــ اپنی ماں کو اپنی چند سالہ ازدواجی زندگی کی کہانی سنا ہی دے۔

اب تک تو اس نے اپنی ماں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ میکے میں زیادہ آکر نہیں رہتی تھی۔ ایک ت کے علاوہ اسے یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ امی شاید اس کی مجبوری کو سمجھتی تھیں۔ اس سلئے کبھی مجبور نہیں کرتی تھیں اور اگر وہ مجبور بھی کرتیں تو وہ اپنی ساس کی حکم عدولی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے جب بھی آتی، تھوڑا سا ہنس بول کر چلی جاتی۔ آپا نے تو اسے اس کے بڑے بھائی کی شادی پر بھی رات سے زیادہ نہیں رُکنے دیا تھا۔ دو سال ہوئے غیاث بھائی کی شادی ہو گئی تھی۔ غیاث بھائی کرن پر ہیرو نہیں بن سکے تھے تو انہوں نے اصل ہیرو بن کر دکھا دیا تھا۔ ایک بڑی فیشن ایبل لڑکی کو پنے عشق میں گرفتار کیا پھر ابا جی کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے شادی کر کے گھر لے آئے

ہ وہ اسی گھر میں اوپر والی منزل میں رہتی تھی۔ اپنے امیر باپ کا رُعب دکھاتی تھی۔ موڈ ہوتا تو نیچے تی ورنہ اوپر بیٹھی رہتی اور امی جان صبح و شام کھانا پکوا کر اوپر بھیج دیا کرتی تھیں ـــــ وہ کب آتی ہے۔ ب جاتی ہے؟ اس کے کیا مشاغل ہیں؟ کسی بات میں ساس، سُسر کو دخل اندازی کی اجازت نہ تھی۔ ماتحت پر نیا بہت کڑھا کرتی تھی۔ نصیب کی بات ہے۔ وہ سوچتی، اس دنیا میں اسی کو دبایا جاتا ہے ب لکھا ہے! امی اپنی بہو کے رویے سے خوش نہیں تھیں۔ اس لئے وہ اور انہیں پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ ان کے اپنے ڈھیروں مسائل تھے۔ جنہیں وہ سُن کر کبھی ہنستی اور کبھی روتی ہوئی۔

سُسرال چلی جاتی تھی۔

آج اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ امّی کو بھی رُلاتے ـــــ دل پر جو بوجھ ہے اس کو ہلکا کر دے ورنہ اس کا کلیجہ شق ہو جائے گا۔ اس نے امّی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور دھیرے دھیرے ساری کہانی سنا دی۔ اس گھر میں اس پر جو کچھ بیت رہی تھی من وعن کہہ سناتی ـــــ نہ وہ مُرادؔ نے خوف کھایا ـــــ اب وہ اپنی ماں کی پناہ میں تھی ـــــ گویا خدا کی پناہ میں تھی ـــــ امّی رخسار رکھے یوں سن رہی تھیں۔ جیسے وہ کوئی مجسمہ ہوں اور صدیوں سے اسی عالم میں بیٹھی ساری کہانی سننے کے بعد امّی جان نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ اور نظریں جھکا لیں ـــــ نیّا احساس ہوا جیسے امّی ایک خاموش سمندر ہیں ..... خاموش، سرد، بے حس۔ مگر وسیع و بیکراں جو بھی اس میں ڈال دو گے گم ہو جائے گا ـــــ کھو جائے گا۔ اور جو تہہ میں کھوجنے جاؤ تو گوہر اور سیپیاں ہاتھ آئیں گی ـــــ اس کا دل چاہا وہ امّی کو جھنجوڑ دے، ان کا گریبان پھاڑ ڈالے۔ ان سے کہے۔

"مجھے سمندر کی نہیں ماں کی ضرورت ہے ..... نہیں تو مَیں سمندر کو ماں بنا لوں گی۔"

امّی جان کچھ نہیں بولیں۔ یہ تو ان کی ہمیشہ سے عادت تھی۔ جب بولنے کا وقت آتا وہ ہو جاتیں ـــــ نیّا روتی رہی ـــــ اور گم صُم سی امّی جانے کب اٹھ کر چلی گئیں۔ بہرحال وہ اپنا نکال چکی تھی۔ دوسرے دن اس کی طبیعت کچھ بشاش تھی۔ دل کا دکھ کہہ دینے سے جی ہلکا ہو گیا کتنا گہرا کنواں ہوتی ہے اور اس کنویں کی زندگی کو کتنی ضرورت ہوتی ہے ـــــ کنویں سے بازگشت ابھرتی ہے۔ اس کی اپنی آواز نہیں آتی۔ مگر اس میں ڈھیلے اور کنکر پھینک کر کتنا مزا اور ماں کا گھر کتنی پیاری شے ہے ـــــ!

دھوپ اب بھی آنگن میں اسی طرح اترتی ہے۔ امّی صُبح صُبح اٹھ کر سب کے لئے پراٹھوں کی خوشبو سارے گھر میں پھیل جاتی۔ ابّا جی زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتے۔ ان کا کمرہ تاریک اور سرد سرد ہوتا۔ وہاں اخباروں کی خوشبو، دواؤں کی خوشبو، باسی پھولوں کی خوشبو

کی اسی طرح تھیں تسبیح اور مصلے کا وہی مقام تھا۔ گھر کے وہی معمولات تھے۔ صرف بھائی لوگ ذرا سنجیدہ ہو گئے تھے۔ چھوٹے دونوں ملازم ہو گئے تھے۔ اویس تو فوج میں تھا کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی ـــــ نیّا کو یہ گھر، اس کے در و دیوار، بچپن کی سہیلیوں کی طرح بہت پیار سے لگ رہے تھے۔ جب وہ یہاں رہتی تھی تو خود کو دنیا کی بدنصیب لڑکی سمجھا کرتی تھی، اسے یہ گھر جہنم لگتا تھا۔ قید خانہ لگتا تھا ـــــ ابّا جی کی جھڑکیاں زہر لگتی تھیں۔ امّی کی چُپ فضول لگتی تھی ـــــ مگر اب ـــــ اب تو یہاں کی ایک ایک اینٹ کو چُوم لینے کو دل چاہتا تھا۔ کاش بیٹیوں کو جُدا کرنے کا رواج نہ ہوتا۔ اے کاش والدین یہ ظلم نہ کیا کرتے ـــــ!

کبھی کبھی وہ سوچتی اگر اس کی بیٹی پیدا ہوئی تو وہ کبھی اس کا بیاہ نہ کرے گی لیکن ـــــ یہاں پر رُک کر اسے بہت کچھ سوچنا پڑتا۔ بیٹی تو دل کا درد ہوتی ہے۔ اس کے کئی دکھ برداشت کرنے پڑتے ہیں ایک صرف جدائی کا دکھ ہوتا تو بات بھی تھی ـــــ

"نہیں نہیں ـــــ اللہ کرے اس کی بیٹی نہ ہو۔"

پر ایسی ایک بددُعا تو اس کی ساس نے بھی دی تھی۔ وہ تو ہر روز ایسی ہی بددعائیں دیا کرتی تھی ساس کی کوکھ اُجڑ گئی۔ اب پتہ نہیں آگے کیا حالات ہوں ـــــ

وہ اپنی ساس سے پوچھے بنا آ گئی تھی۔

شہباز ہر روز دوپہر کو اس کی خبر لینے آتا تھا۔ جس سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ دفتر سے اُٹھ کر آتا ہوگا۔ اس کی ساس ایک بار بھی اسے پوچھنے نہ آئی تھی۔ البتہ شہباز روز کہتا تھا۔ کب واپس چلو گی ـــــ ٹالتے ٹالتے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ وہ اس جنّت سے نکل کر دوزخ میں نہ جانا چاہتی تھی۔ وہ کوئی فیصلہ کُن بات کرنا چاہتی تھی۔ کئی بار امّی سے ذکر کیا۔ مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر ایک دن اس نے امّی کا دامن تھام لیا۔

"امّی جان میں واپس اُس گھر میں نہیں جانا چاہتی۔ مَیں ـــــ" .....

"مَیں نے تمہارے ابّا سے بات کی تھی۔" امّی نے اسے فقرہ پورا نہ کرنے دیا ..... نیّا نے

امید و بیم کے بیچوں بیچ خوف زدہ ہو کر امّی کی طرف دیکھا..... اور مری ہوئی آواز میں

"پھر انہوں نے کیا کہا ——— ؟؟؟"

"اس کی حالت پھانسی کے تختے کی طرف لے جائے جانے والے مجرم کی سی ہو رہی تھی جسے فیصلے کا علم ہوتا ہے۔ مگر جو آخری قدم تک، آخری سانس تک کسی معجزے کی اُمید کرتا

"تمہارے ابا جی کہتے ہیں" ——— امّی پل بھر کو بھر رک گئیں۔ نیّا کو فوراً پتہ چل گیا کہ امّی اب کہا گی۔

"لڑکی کا اصل گھر اس کی سُسرال ہے۔ اگر وہ میکے کو محاذِ جنگ بنانے پہ آمادہ ہو گی تو ہم اس گھر میں آنا بند کر دیں گے۔"

"بند کر دیں گے ——؟" آنسوؤں کی ایک بوچھاڑ نیّا کی پلکیں توڑ کر نکلی اور رخساروں پر

قہرِ خدا کا لو گو ——!

کبھی سُنا تم نے باپ بیٹی کو میکے آنے سے منع کر دے گا۔

نیّا روتی رہی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اُسے معلوم تھا۔ کچھ کہنے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ نے ذرا بھی احتجاج کیا تو ابّا جی واقعی اس پہ بندش لگا دیں گے۔ ابّا جی کے اصول دنیا سے نرالے اسی واسطے تو وہ ہر میدان میں مار کھا رہے تھے۔ ذرا بیٹی سُسرال سے روتی ہوئی آئے باپ اس پر نثار ہونے لگتے ہیں۔ سو سو تسلیاں دیتے ہیں۔ اگر مرتبے والے ہوں تو دامادوں پکڑ لیتے ہیں۔ ہر ماں کو اپنی بیٹی کا سکھ عزیز ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ہی کتنی واقعات ہے کیوں جائیں شیریں بھابی کی مثال لے لیں۔ غیاث بھائی نے تو باقاعدہ لکھ کر دیا تھا کہ میرے اس کی زندگی میں دخل انداز نہیں ہوں گے۔ کیسے دھڑتے سے رہ رہی تھی سُسر مر رہا ہو بیمار ہو ——— نند کی جان پر بنی ہو۔ وہ تو کبھی نیچے نہیں اُترتی تھی اُسے تو کوئی کچھ نہیں کہتا تو اور ابّا جی بھی منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے تھے اور لے دے کے سارا غصّہ اپنی اکلوتی نکال رہے تھے۔

"اگر تمہیں میکے آنا ہے تو ہنستے ہنستے آؤ۔ روتے ہوئے آؤ گی تو ہم تمہیں گلے نہیں لگائیں گے۔"

امّی اسے چُپ ہوتے دیکھ کر بھر گویا ہوئیں۔

"تمہارے ابا جی کہتے ہیں، میکہ لڑکی کی منزل نہیں ہوتا۔ پڑاؤ ہوتا ہے۔ اس طرح جس طرح یہ دُنیا ایک پڑاؤ ہے ——— نہ دُنیا میں دل لگاؤ، نہ میکے سے محبت کرو۔" (بس سیدھے سیدھے جہنم میں چلے جاؤ۔ نیّا نے دل میں کہا)

"اور..... وہ کہتے ہیں۔ اگر آئندہ تم گلے شکوے لے کر آئیں۔ تو یہ دروازہ تم پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔ وہیں۔ اُس گھر میں اپنی جگہ بناؤ۔"

"بس امّی ——— بس ———" نیّا نے لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ امّی کے منہ پہ اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دیا "مجھ میں اور سُننے کی تاب نہیں ہے امّی۔"

اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

کافی رو چکنے کے بعد نیّا نے اپنا منہ اور آنکھیں صاف کیں۔ اور سوجی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے امّی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ کیا کہتی ہیں امّی ——؟ آپ کا دل کیا کہتا ہے۔؟"

امّی نے جلدی سے نظریں جھکا لیں ——— ایک بے یار و مددگار آنسو ان کی دائیں آنکھ سے لڑھک کر نیّا کے اس ہاتھ پر گرا۔ جس سے اُس نے امّی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

"تم جانتی ہو میرا دل کیا کہتا ہے؟ ——— میرا دل تم سے جُدا نہیں۔"

"آپ ابا جی کو کیوں نہیں سمجھاتیں۔"

"تمہیں پتہ ہے میں نے آج تک ان سے کچھ نہیں کہا۔"

"کیوں نہیں کہا۔؟"

"جب عورت کو اندازہ ہو جائے کہ اس کی شنوائی نہیں ہو گی۔ وہ خاموش ہو جاتی ہے۔"

"تو وہ مر کیوں نہیں جاتی؟" نیّا نے غصّے سے کہا۔

"یہ بھی ایک طرح کی موت ہوتی ہے بیٹی" امّی نے سوگواری سے مسکرا کر کہا۔

"اگر اب تک اپنی کوئی بات نہیں منوائی۔ تو اب اپنی اکلوتی بچی کی خاطر فریاد کیجئے" نیا نے ضد کر کہا۔

"کیا کہوں اُن سے ——؟"

"اُن سے کہہ دیں۔ میں واپس جرمنی آپا کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ مجھے اپنے پاس رکھیں۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا نیا۔؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"لوگ کیا کہیں گے ——؟"

اُف خدایا! یہ کتنا بدنصیب معاشرہ ہے۔ یہاں نوّے فیصد لوگ، صرف لوگوں کی خاطر جیتے لوگوں سے ڈرتے ہیں اور عمر بھر زہر پیتے ہیں" ——

"میں معاشرے سے نہیں ڈرتی"

"اسی معاشرے میں ہمیں رہنا ہے"

"تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔؟ زمانے نے کچھ دستور بنائے ہیں۔ شادی کے بعد لڑکی کو اپنی سسرال میں رہنا چاہیئے۔ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ اور اگر وہاں نہیں رہے گی تو لوگ سو طرح کی باتیں بنائیں گے"

"بناتے ہیں باتیں تو بنائیں۔ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے"

"تم ابھی بچی ہو۔ زمانہ خراب ہے۔ جوان لڑکی کو یوں گھر میں نہیں بٹھایا جا سکتا۔ انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں"

"زمانہ —— زمانہ ——" نیا بپھر اُٹھی

"سارا زمانہ اسی گھر میں کیوں آگیا ہے۔ کسی اور کے گھر میں تو کوئی زمانہ نہیں۔ لوگ اپنے آپ میں مست ہیں۔ ایک ہمارا گھر ہے جو زمانے کی زد میں آیا ہوا ہے۔ جب سے میں پیدا ہوئی ہوں

یہ بُرا زمانہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہے۔ خیال تھا شادی کے بعد یہ بھوت میرا پیچھا چھوڑ دے گا۔ مگر آخو —— اس ہوّے سے آپ کب ڈرانا چھوڑیں گی۔ یہ زمانہ میرا پیچھا کب چھوڑے گا جب میرا دم نکل جائے گا۔؟"

"بیٹی تو اس وقت جذباتی ہو رہی ہے۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی"

"کیوں نہیں سمجھ سکتی۔ پہلے میں معصوم تھی۔ کنواری تھی۔ آپ کو ہزار ہا خطرے تھے اس واسطے مجھے ڈراتی تھیں اب شادی شدہ ہوں زمانہ مجھے کچھ حقوق دیتا ہے۔ مجھے بھی اور لوگوں کی طرح زندہ رہنے دیجئے۔"

"بیٹی ازدواجی زندگی میں ایک قدم بھی غلط پڑ جائے تو ساری بساط الٹ جاتی ہے"

ایسی نصیحتیں آپ شادی سے پہلے بھی کیا کرتی تھیں۔ اور ان کو میں نے پلّو میں باندھ لیا تھا۔ مگر ان سے مجھے کیا حاصل ہوا۔؟ میری بساط تو ویسے بھی الٹ چکی ہے"

"صبر سے جھیل لوگی تو اچھا وقت بھی آجائے گا"

"آپ نے بھی تو صبر سے جھیلا ہے"

"میں کوئی رو تو نہیں رہی۔ خوش ہوں"

"کس بات سے خوش ہیں۔؟"

"کہ میرا خاتمہ بالخیر ہوگا" امّی نے آنسو پی کر کہا۔

"اونہہ —— اس کو آپ خاتمہ بالخیر کہتی ہیں" نیا نے جھنجلا کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔

"جس کو یہی پتہ نہ ہو کہ اس کا خاتمہ کیسے ہوگا۔ وہ کس آس پر جیئے"

"اللہ سے ہمیشہ آس رکھنی چاہیئے"

"مجھ میں آپ جتنا حوصلہ نہیں ہے"

"اب تم شہباز کے ساتھ جاؤ۔ ہم سوچیں گے۔ کیا کرنا ہے"

"مجھے معلوم ہے آپ لوگ کیا سوچیں گے۔؟"

امّی خاموش ہو گئیں۔ نیا کے جذبات کا لاوا ایک بار پھر بہہ نکلا۔

"آپ کو تو اللہ نے اتنی توفیق بھی نہیں دی کہ کبھی میری سسرال آتیں۔ آکر دیکھیں مجھ پر کیا کیا ستم ٹوٹتے ہیں۔ اور بھی تو لڑکیاں ہیں۔ ہنستی بستی نظر آتی ہیں۔ ایک میں ہی بدنصیب ہوں۔ جس کو والدین بھی بُرا سمجھتے ہیں۔"

"کوئی بُرا نہیں سمجھتا۔" امّی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اور سب لڑکیوں کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہر لڑکی کو اپنے گھر میں کوئی نہ کوئی دکھ ضرور ہوتا ہے۔ سب ہی ہنس ہنس کر جھیل رہی ہیں۔"

"یہاں ایک ہی نہیں ہزار دکھ ہیں۔" نیّا نے احتجاج کیا۔ "جب سے شادی ہوئی ہے ایک پیسہ خرچ کرنے کو نصیب نہیں ہوا۔ ڈھنگ کا کپڑا نہیں بنوایا ـــــ کسی سے میل ملاپ نہیں رکھ سکتے۔ اس روکھی سوکھی کے لئے میں تو عمر قید میں آگئی ہوں۔"

"زندگی اسی کو کہتے ہیں بیٹی۔" ماں نے تلقین کی۔ "ہنس ہنس کر جینا سیکھ لو۔"

"چار سال ہوگئے ہیں۔ اب تو میں ہنسنا بھی بھول گئی ہوں۔"

"بچے ہو جائیں گے۔ تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اونہہ ـــــ" نیّا کا منہ غصّے سے سرخ ہوگیا۔ "اُس گھر میں میرے کبھی بچہ نہ ہوگا۔ مجھے پتہ چل گیا ہے میری ساس نہیں چاہتی کہ میرے بچہ ہو۔ وہ میری کوکھ ویران رکھنا چاہتی ہے۔ اسی واسطے اُمید کے دنوں میں اس کے مظالم سوا ہو جاتے ہیں۔ وہ مجھے زندگی کی محرومیاں دینا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ حاسد عورت ہے۔ وہ اپنا بیٹا اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔ خواہ اس کی قیمت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ جانتی ہے۔ بچے کے بعد وہ میری طرف آئے گا۔ اور زنجیر مضبوط ہو جائے گی۔ ایسا وہ کبھی نہ ہونے دے گی ـــــ کبھی نہیں ـــــ" نیّا آج ساری حدود پھلانگنے پر تلی ہوئی تھی۔ ذرا سانس لیکر اس نے کہا۔ "خدا جانے آپ نے کیا سوچ کر میرا ناطہ ان سے جوڑ دیا۔"

"بیٹی یہ سب تو مقدر کے کھیل ہیں۔" امّی نے آہ بھر کر کہا۔ "جوڑے تو آسمان پر بنائے جاتے ہیں اور پھر یہ سختی کس گھر میں نہیں۔ میرے تو کوئی ساس نہ تھی۔ مگر تمہارا باپ ہی میرے لئے ساس

ن گیا۔"

"ابّا جان کبھی ایسا غیر انسانی سلوک آپ سے نہ کرتے ہوں گے۔" نیّا نے ابھی تک ہمت نہیں

ری تھی۔

"ہاں ـــــ" امّی ہنس پڑیں۔ "ہر بیٹی کو اپنا باپ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ جس تن لاگے، سو تن جانے۔ م از کم تمہارا شوہر تو اچھا ہے۔ شریف ہے۔ آوارہ نہیں۔ شرابی نہیں۔ تمہیں مارتا پیٹتا نہیں۔ تمہاری فرت کرتا ہے۔ دھیمی آواز میں بولتا ہے۔"

جلے آوارہ اور شرابی ہوتا۔ مگر اس قدر بزدل نہ ہوتا۔" نیّا نے نفرت سے کہا۔ "ایسی شرافت بھی س کام کی۔!"

"تم نہیں جانتیں نیّا۔" امّی نے کہا۔ "آوارہ اور شرابی شوہروں کے دیے ہوئے زخم کتنے گہرے ہوتے ہیں۔ بے موت مار دیتے ہیں۔ تم نے شاید ان عورتوں کو روتے ہوتے نہیں دیکھا۔ جن کے س بے شمار دولت ہے۔ مگر جن کے شوہر رات رات بھر گھر سے باہر رہتے ہیں۔"

"مجھے دُنیا میں کوئی ظلم اتنا بڑا نہیں لگتا۔ جو میں ساس کے ساتھ رہ کر اٹھاتی ہوں۔ کاش میرا شوہر آوارہ ہوتا۔ بدقماش ہوتا۔ ساری ساری رات گھر نہ آتا۔ مگر مجھے اپنی ماں سے الگ رکھتا۔ اس عورت کا سایہ بھی مجھ پر نہ ڈالتا۔ تب بھی میں اس کی شکر گزار رہتی۔"

"یہ تو کہنے کی بات ہے نیّا۔!"

"آخر آپ شہباز سے بات کیوں نہیں کرتیں۔؟" نیّا مچل گئی۔

"کیا بات کروں ـــــ؟" امّی نے آہستہ سے کہا۔

"اُس سے کہیں مجھے اپنی ماں سے علیحدہ رکھے۔"

"نہیں بیٹی۔ میں یہ نہ کہہ سکوں گی۔ میں جانتی ہوں۔ وہ مجبور ہے۔ اُس کے انکار سے ہمارے درمیان جو لحاظ کا پردہ ہے وہ اُٹھ جائے گا۔"

"وہ کیوں مجبور ہے؟"

"ماں کا ایک ہی بیٹا ہے۔ کیسی بھی ماں کیوں نہ ہو۔ بیٹے کا فرض ہے۔ اسکی کفالت کرے
کو سہارا دے۔"

"یہ سہارا الگ رکھ کر بھی تو دیا جا سکتا ہے۔"

"شاید اس کی آمدنی یہ بوجھ برداشت نہ کر سکے۔ پھر اس کی ایک جوان بہن بھی ہے۔"

"پھر آپ اپنی جوان بیٹی کو رو بیٹھیں۔ کسی نہ کسی دن مجھے ہی خودکشی کرنی ہوگی۔ نیا نے

"ماں باپ کس کے ہمیشہ سلامت رہتے ہیں بیٹی۔ کچھ عرصے کی بات ہے۔ برداشت کر

امی جان۔ آپ میری بات مانیں یا نہیں"۔ نیا مایوسی سے بولی۔ "یہ جو نیل آپا ہے نا۔ یہ کبھی
مرے گی۔ قیامت تک نہیں مرے گی۔ جو لوگ دوسروں کا لہو پیتے ہیں۔ موت بھی ان سے
بھاگتی ہے۔"

"دیکھ لیجئے گا۔ اگر کسی روز بھولے سے عزرائیل ان کے گھر چلا بھی گیا تو ان کی زبان دراز
ڈر کر آپا کو چھوڑ چھاڑ بھاگ جائے گا۔ اور اگر خالی ہاتھ جانے پر راضی نہ ہوا تو پھر مجھی کو بوجھ لے گا
اس گھر میں ایک فالتو شے میں ہی ہوں۔"

"بے وقوف ——" نیا کی بات پر امی کو ہنسی آگئی کہنے لگیں۔ "پگلی کیا تو خدا سے بھی
ہو گئی ہے۔"

"میرا کوئی نہیں ہے —— میرا کوئی نہیں"۔ یہ کہہ کر نیا پھر رونے کا دورہ پڑا۔ امی نے
سینے سے لگا لیا۔ انہوں نے نیا کا ماتھا چوم کر کہا۔ "ہم سب تیرے ہیں۔ اور تیرے ہی بھلے کو
ہیں۔ تیرے ابا جی تیرا بہت غم کرتے ہیں۔ تو اتنے دن سے یہاں ہے، اور ان کا کھانا پینا
بیمار رہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا خیال کر۔"

"بس میں ہی سب کا خیال کروں۔ میں خیال رکھنے کے لئے پیدا کی گئی ہوں"۔ نیا
امی اسے تسلی دیتی رہیں۔

اپنے کمرے کی کھڑکی کا پردہ سرکا کر نیا نیچے سڑک پر دیکھ رہی تھی۔ وہ کافی دیر سے یہاں
سنڈہ سی کھڑی تھی۔ سڑک پر معمول کے مطابق گہما گہمی تھی۔ لوگ آجا رہے تھے۔ موٹریں، سائیکلیں
کٹے، اسکوٹر —— آواز کے ساتھ ساتھ اُبھر ڈوب رہے تھے۔ کوئی اِدھر سے آتا اُدھر نکل جاتا۔
ئی اُدھر سے آتا اِدھر نکل جاتا..... ایسے لگ رہا تھا ہر کوئی جلدی میں ہے۔ آنے کی جلدی یا جانے
جلدی —— کیا ہے یہ دُنیا بھی! نیا کھڑی کھڑی سوچ رہی تھی۔ کوئی کار میں مگن ہے۔ کوئی اسکوٹر
ہواؤں کو چھو رہا ہے۔ کسی کو رکشا منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔ کسی نے سائیکل کو حاصلِ تمنا
سمجھ رکھا ہے۔ زندگی جذبے کے ساتھ ہے۔

جذبے زندہ رہنے کے ——
زندگی کے ساتھ چلنے کے ——

دنیا تو یونہی مگن رہتی ہے۔ یونہی رواں رہتی ہے۔ جس طرح یہ سڑک —— اس پہ ہمیشہ کوئی
یا جا رہتا ہے۔ یہ کبھی خالی نہیں ہوتی —— رات گئے جب دنیا خوابوں کے پروں پر سوار
تی ہے —— تب بھی اس سڑک پر اِکا دُکا موٹر، روشنی، ہارن یا کوئی سایہ چلتا ہوا نظر آتا ہے ——
ٹریفک اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ جب یہ سڑک کبھی سُونی نہیں ہوتی۔ تو پھر دل کی راہ گزر اتنی جلدی

کیوں سونی ہو جاتی ہے۔ ؟ زندہ رہنے کے لئے اُمنگوں کے ایندھن کی ضرورت ہے
اُمنگ ٹوٹ جائے تو پھر زندگی کو حرارت کہاں سے ملے گی ؟

اُمنگ یا اُمنگیں ـــــ یہ سب کی سب کہاں چلی گئیں ـــــ شادی

نہ خواب دیکھا کرتی تھی۔ اور ان سب میں نمایاں خواب ایک ہی تھا۔ جب بھی وہ سڑک
جاتی ہوئی دیکھتی جس میں آگے میاں بیوی بیٹھے ہوتے اور پیچھے دو تین بچے ـــــ تو
دھڑک اٹھتا۔ یہی منظر اس کی زندگی کا خواب بن گیا تھا۔ وہ بھی سوچتی شادی کے بعد
بچے ہو جائیں گے۔ تو وہ بھی شام کے وقت اپنے بچوں کو لے کر یوں ہی شوہر کے ساتھ
کرے گی۔ وہ کبھی کون آئس کریم کھانا چاہیں گے، کبھی ٹافیاں لینا پسند کریں گے۔ کبھی
کے گھر جائیں گے ـــــ

پتہ نہیں کتنے بچے ہوں گے اس کے ـــ ؟ دو، تین، چار، وہ کوئی حد متعین
مگر اسے ایک خاندان اچھا لگتا تھا۔ بچوں سے بھرا گھر اچھا لگتا تھا۔

شام کو بچوں کے ساتھ گھومنا اس کا آئیڈیل بن چکا تھا۔

روز شام کو وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر سڑک پر جاتی ہوئی ان موٹروں کو حسرت سے تکا
میاں بیوی اور بچے سوار ہوتے۔

لیکن زندگی نے اسے کیا دیا تھا۔ ؟

حسرتیں، کچلی ہوئی تمنائیں۔

ایک بزدل سا شوہر اور بے شمار مسائل۔

چلو موٹر مقدر میں نہ تھی۔ بچہ تو ہو جاتا۔ جی تو بہل جاتا ہے ـــــ وہ اپنے بچے کو
اسکوٹر کے پیچھے بٹھا جایا کرتی۔ اور بھی تو جوڑے اسکوٹروں پر بچوں کو ساتھ بٹھا کے گھومنے جا
مگر یہاں تو کچھ بھی ممکن نہیں رہا۔

بچے کی حسرت میں تو خدا جانے زندگی بھر تڑپنا پڑے گا۔ یوں بھی اور کیا تھا جینے کو

ے ساتھ گھومنے پھرنے کا موقع نہ ملا۔ شروع شادی میں کبھی کبھار وہ آپا سے پوچھ کر فلم دیکھ آتے
دوست کے ہاں چلے جاتے تھے۔ اب وہ بھی بند تھا۔ سربراہ جو اس کی کوئی سہیلی مل جاتی تو
نہیں بلاتی تھی۔ کوئی اس کے گھر آنے پر مصر ہوتی تو وہ ٹال جاتی۔ اور اگر برسوں بعد کبھی کوئی
تی تو جو نیل آپا ہمہ وقت سر پہ سوار رہتیں۔ ایک منٹ کے لئے ان کو تنہا نہ چھوڑتیں۔ سب
اور روزن بند ہو گئے تھے۔

پتی نہیں تو کیا ہے۔!

چتے سوچتے نیا تھک گئی۔ اور کھڑکی سے ہٹ کر اپنے پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔ آنکھوں کے
ھیرا سا آ گیا تھا اور یہ اندھیرا تو اس کی ساری زندگی پر چھا گیا تھا۔

گھر کے اندر اس پر کیا کیا ستم توڑے جا رہے تھے۔ کون جان سکتا تھا۔

دن اتی کے مجبور کرنے پر وہ آ تو گئی تھی۔ مگر اس طرح جیسے آنکھیں بند کر کے کوئی جہنم کی طرف
ے۔

ی شام جب شہباز اسے لینے آیا تھا تو مسمسی شکل بنا کر بولا۔ "تمہارے بغیر گھر بڑا سونا لگتا ہے
یا بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔"

ل۔ اس نے جل کر دل میں سوچا تھا۔ "مجھے معلوم ہے۔ آپا مجھے کس قدر یاد کرتی ہوں گی۔" مگر اس
جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ جب اپنے والدین نے ہی رکھنے سے انکار کر دیا تو پھر جھوٹی سچی
نے میں ہی بھلائی تھی۔

ا اٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ شہباز خوش ہو گیا۔ کیونکہ آپا نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا جس
ئی ہے۔ اسی منہ سے واپس آ جائے گی تو بہتر ہو گا۔ ورنہ میں تو ساری زندگی نہ لینے جاؤں گی۔"
ی وہ شہباز کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئی۔ آپا نے اسے دیکھ کر عجیب سا منہ بنایا۔ پتہ نہیں
ی یا تعجب تھا۔ پھر اپنے کام میں مگن ہو گئیں۔ نیا نے قریب جا کر سلام کیا۔ تو اوپری دل سے
یا اور اپنے کمرے میں گھس گئیں۔ پھر نیا بھی اپنے کمرے میں چلی گئی، اور اس انتظار میں رہی کہ آپا

کوئی برچھی، کوئی نیزہ پھینکیں گی۔ مگر خاموشی طاری رہی۔

وہ اپنا کمرہ ٹھیک کرنے لگی۔ نیّا کا کمرہ بے حد گندہ ہو رہا تھا۔ جیسے اسے جی بھر کر
مگر صاف کبھی نہیں کیا گیا۔ اس گھر کی فضا میں داخل ہوتے ہی ویسے بھی اس کے ا
تھے۔ اس پر سرد اور غلیظ کمرہ دیکھ کر اور وحشت ہونے لگی۔ پندرہ دن امّی کے گھر رہ کر
ہو گئی تھی۔ اور رنگ روپ بھی واپس آ گیا تھا۔ یکایک اسے کمزوری سی محسوس ہونے
چاہا۔ سیڑھیاں اتر کر سڑک پر بھاگ جائے۔ اور کھلی فضا میں سانس لے۔ مگر بڑھ کر
لی اور کمرہ صاف کرنے لگی۔

رات تو گزر گئی۔ صبح جب شہباز دفتر چلا گیا۔ تو وہ بھی باہر نکل آئی۔ اس نے
کاج میں ہاتھ بٹانا چاہیئے ——— باورچی خانہ بہت گندہ تھا وہ جھاڑو اٹھا لائی۔ تاکہ
کر دے۔

وہی جھاڑو ——— وہی ہاتھ ———

دل سے قطرہ قطرہ لہو ٹپکنے لگا۔ اس کا جی چاہا۔ جس طرح جھاڑو سارا گند
جاتی ہے۔ اسی طرح اپنے سارے خواب اپنے ہاتھوں سمیٹ کر گندگی والے
ذرا سا کام کرنے سے اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اس لئے منہ ہاتھ دھویا
بیٹھ گئی۔ کمزوری ابھی تک دور نہ ہوئی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی آپا اپنے کمرے
اور بولیں۔

"اماں نے اتنی جلدی بھیج دیا ———؟"

نیّا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کو معلوم تھا۔ اس وقت خاموش رہنا بہتر
ہے۔ اس کے بعد پتھروں کی بوچھاڑ ہو گی۔ دھماکے ہوں گے۔ بم بھی گریں گے۔
ہو گا ———؟

کچھ دن اور نہ کلیجے سے لگا کے رکھا امڑی نے ——— ہائے مٹیا کو کچھ تو آرام

ی باتیں بھی دنا سپتی گھی کی مانند ہیں۔ چاہے جتنی چکنی ہوں۔ غذائیت تو نہیں ہوتی نا ———؟"

یا برا بولے چلی گئیں۔

نیّا چپ بیٹھی رہی۔

ہم نے تو ہرگز نہیں بلایا تھا۔ ہم نے کہا تھا۔ جی بھر کے اپنی اماں کے پاس رہ لے۔ چاہے تو
ندگی وہیں بیٹھی رہے۔ ہمیں کیوں اعتراض ہونے لگا ———؟"

نیّا جی جان سے لرز گئی۔

جاتے وقت تو ایسے گئی جیسے کوئی کچھ چرا کے بھاگتا ہے۔ خصم کو اشاروں پر نچایا۔ بھئی اگر
ہی آنا تھا۔ تو اس طرح جانے کا کیا فائدہ ہوا ———؟" آپا دل کے سارے پھپھولے پھوڑنے پر
تھیں۔ پتہ نہیں ابھی وہ اور کیا کچھ کہتیں کہ اچانک اُن کی ایک ہمسائی نمودار ہوئی۔ سیڑھیاں
ان کا دم پھول گیا تھا۔ وہ ذرا سانس لینے کو رکیں اور انہوں نے ساس بہو کا بھی جائزہ لیا۔ آپا
دیکھ کر ایک دم چپ ہو گئیں۔ اور پھر بولیں۔

"آؤ آؤ سلطانہ کی امّی۔ وہاں کیوں کھڑی ہو۔"

کم بخت سانس درست ہو لے تو آؤں۔" وہ آگے آ گئیں۔ "آہا دلہن آ گئی ہے۔"

"ہاں آ گئی ہے ———!" آپا نے ناک چڑھا کر کہا۔

"کیا حال ہے تمہارا بہو۔" انہوں نے براہِ راست نیّا سے پوچھ لیا۔

"ٹھیک ہوں جی۔" نیّا نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

رنگت تو دیکھو، سرسوں کا پھول ہو گئی ہے۔ غم بھی کیا ہو گا تو نے ——— ؟" (غم۔ نیّا کو ہنسی آ گئی۔
بات کا غم یا کس کس بات کا غم)

نے آجکل کی چھوکریوں کو کوئی غم نہیں ہوتا۔ آؤ بیٹھو، کوئی اور بات کرو۔" آپا نے کرسی آگے کھسکائی
ہے۔ گھر کی کھیتی ہے۔ پھر اگ آئے گی۔ اس لئے بچے کو مذاق سمجھتی ہے۔" آپا جیسے اپنے آپ
مخاطب تھیں، کہنے لگیں۔

"بس بہن، شادی کے فوراً بعد اگر ایک دو بچے ضائع ہو جائیں تو سمجھو محمود گیا۔ اب ہماری بہو کے کبھی بچہ نہ ہوگا۔"

نیا کا دل لرز گیا۔

"بہن ایسا نہ کہو۔" بی ہمسائی بولی۔ "ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اور پھر اگر اللہ دینے پر آئے تو کیا کر سکتا ہے۔"؟

"اے مجھے اسپتال کی لیڈی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ یہ بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اب اگر ہو جائے گی۔"

"کتنا مزا آئے اگر وہ مر جائے ——" نیا نے دل میں سوچا۔

مگر وہ کیوں مرے ——؟ بھری جوانی میں موت کو کیوں گلے لگائے۔ یہ اچھی جرنیل آپا کو کیوں دے جائے۔!

اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ لیڈی ڈاکٹر نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ ہاں ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ بہت کمزور ہے۔ اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ کم از کم چھ ماہ —— اور ٹھہرے تو اسے پورے چار ماہ مکمل آرام کرنا ہوگا۔ اور کسی ایسی جگہ رہنا ہوگا۔ جہاں دھواں جلے کڑھے نہیں۔

آپا جب چائے بنانے اندر چلی گئیں۔ تو بی ہمسائی نے بڑی ہمدردی سے کہا

"تم نے اچھا کیا ہو۔ جو آ گئی ہو۔ تمہارے بنا تو یہ گھر بالکل ویرانہ لگتا ہے۔"

باہر نکلتی ہوئی آپا نے آخری الفاظ سن لئے تھے۔ فوراً بولیں۔

"مجھے تو بچے کے بنا یہ گھر ویرانہ لگتا ہے۔ بس نہیں چلتا کہیں سے شبّن کا بچہ"

پھر چائے کا گھونٹ بھرتے ہی جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔ تیوری چڑھا کر بولیں

"اے اسے تو آنا ہی تھا۔ اسے کہاں جانا تھا ——؟ اماں باوا نے دھکے آرہی —— وہ اور ماں باپ ہوتے ہیں۔ جو بیٹیوں کی شادی کے بعد بھی دیکھ بھال

کے ہاں فالتو رزق نہیں ہے کہ اپنی اکلوتی بیٹی کے مطالبات پورے کر سکیں —— میں اس کے باوا کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ کنجوس مکھی چوس ہیں۔ جس طرح ننگی بوچی لڑکی ہمیں پکڑا دی۔ وہ ہماری شرافت تھی کہ لے آئے۔ اب کون سے انہوں نے گھی کے کنستر لگا رکھے ہیں۔ بیٹی بیمار ہو یا رے انہیں کیا —— موئی ہر گھڑی کی بیمار —— ہماری تو اس نے کمر توڑ کے رکھ دی ہے۔"

نیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ زندگی میں اتنی مجبوریاں کیوں ہوتی ہیں۔ اُس نے بڑے کھ سے سوچا۔ کچھ مجبوریاں زبان کھلوا دیتی ہیں تو کچھ مجبوریاں زبان بند کروا دیتی ہیں۔ بھیک مانگنے یہ انداز بھی نرالا تھا۔ مگر کوئی دینے والا بھی ہوتا۔ بی ہمسائی نے نظر اٹھا کر نیا کی طرف دیکھا۔ تو انہیں ں پر بڑا ترس آیا۔ اُسے چمکارتے ہوئے بولیں۔

"دِل چھوٹا نہ کرو بہو، اے رونے کیوں لگیں۔ بڑوں کی بات کا بُرا نہیں مانتے۔"

"رونے دو اس کو، اس کی تو تقدیر میں رونا لکھا ہے۔" جرنیل آپا پھر گرجیں۔ "اللہ کرے اماں مرے س کی اور یہ جی بھر کے رو لے۔ تاکہ اس کی حسرت بھی پوری ہو جائے اور اس کی نحوست اس کے اپنے خاندان پر پڑ جائے۔"

نیا جلدی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی ——

اتنی زیادہ برداشت کی قوت اس میں نہیں تھی۔ بی ہمسائی نے چائے پیتے پیتے پیالی پائی پر رکھ دی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ شاید اس وقت وہ بھی اس قسم کی صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ منہ پھیر کر خدا حافظ کہا اور چلی گئیں۔

اور تو اور آپا کی اپنی بیٹیاں بھی انہیں سمجھا یا کر تھیں۔ کہ بہو کے ساتھ اپنا رویہ ذرا نرم کریں انہیں صاف نظر آتا تھا کہ آپا سارا وقت بلا وجہ بکتی جھکتی رہتی ہیں۔ حالانکہ نیا ہر بات بڑے حوصلے ر صبر سے برداشت کر رہی تھی۔ سارے گھر کا کام بھی کرتی تھی۔ پہلے تو تانو اپنی ماں کو منع کیا کرتی لڑائی تعلیم یافتہ لڑکی کیساتھ یہ سلوک نہ کیا کریں۔ جب ماں نے دو چار بار اسے لتاڑا۔ اور چپ رہنے کو کہا۔ تو وہ خاموش ہو گئی بلکہ بے پرواہ ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اس نے بھی نیا کا ادب کرنا چھوڑ دیا۔ اور وقت

بے وقت حکم چلانا شروع کر دیا۔

"بھابی میری سہیلیاں آئی ہیں۔ ذرا چائے اندر بھجوا دیں۔"

"بھابی پلیز جب میں کالج سے آؤں، تو میرے کپڑے استری کئے رکھے ہوں۔"

"بھابی میں پڑھ رہی ہوں۔ ذرا میری قمیض دھو دیں۔"

یہ کر دیں۔ وہ کر دیں ـــــ پہلے ہی وہ گھر کے کاموں میں حصّہ نہیں لیتی تھی۔ نیا کے آ
اور بھی آرام طلب ہو گئی۔

باقی دونوں نسرین اور کوکب ـــــ اکثر اپنے بچّے لے کر آ جاتی تھیں۔ ان کے آ
کے کام کاج بڑھ جاتے تھے۔ پھر ماں بیٹیوں کو سوائے بازاروں میں گھومنے اور رشتے دا
جانے کے اور کوئی کام نہ ہوتا۔ نیا ان کے غلیظ بچّوں کو بھی سنبھالا کرتی اور ان کے لئے کا
کرتی۔ کبھی کبھی نسرین نیا کا اداس چہرہ دیکھ کر آپا سے کہتی۔

"آپا اپنے رویّے میں ذرا لچک پیدا کریں۔ نیا بھلے گھر کی لڑکی ہے۔ اس واسطے
رہی ہے۔ اگر ایسی ویسی ہوتی تو آپ کو مزا چکھا دیتی۔"

"اسی واسطے تو اس کو دبا کر رکھتی ہوں کہ کبھی سر اٹھا ہی نہ سکے۔" آپا بے نیازی سے
دیتیں۔ جاتے جاتے کوکب اور نسرین پھر سے ماں کو تاکید کرتیں۔ مگر جو نیل آپا کسی کی نہیں
اُن کی اپنی ایک لغت تھی۔ جس میں جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

جس کسی کو اپنا ماتحت رکھنا ہو۔ اس کے سر پہ جوتا رکھ دینا چاہیئے۔ اس کو اس
پامال کرو کہ اُسے خود اپنی پہچان نہ رہے ـــــ"

پھر رفتہ رفتہ نیا اس عمارت کی طرح بن گئی۔ جو باہر سے مضبوط نظر آتی ہے۔ مگر اندر سے
بھربھری ہو جاتی ہے۔ اس کا بھربھر کر گرنا کسی کو نظر نہیں آتا۔

گو دل میں لاوا پھوٹتا تھا۔ مگر وہ زلزلے کا باعث نہیں بن سکتا تھا۔

اتنا سوچ چکی تھی کہ اب تھک گئی تھی۔

اتنا رو چکی تھی کہ اب رونا فضول لگتا تھا۔

اب ذہن میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

اگر بغاوت کی ساری راہیں بند ہو جائیں تو آدمی بے حس ہو جاتا ہے۔ بے حسی بڑی کربناک
موت ہے۔ مگر نیا اس موت کو گلے سے لگاتے پڑی تھی۔

وہ کیا کرتی ـــــ! معجزے تو اس زمانے میں رونما نہیں ہوتے۔ اُس نے دل ہی دل
جو نیل آپا کے مرنے کی بہت دعائیں مانگی تھیں۔ مگر صبح اٹھ کر جب آپا کا چمکتا ہوا لال سرخ
چہرہ دیکھتی۔ تو اسے اپنی موت کا یقین ہو جاتا۔

اُس کو سب سے زیادہ تکلیف شہباز کے رویّے نے دی تھی۔ جوں جوں دن گزر رہے
تھے۔ اُس پر شہباز کا رویّہ عیاں ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں شہباز کس قسم کا مرد تھا ـــــ؟ پتہ نہیں وہ کس

مٹی کا بنا ہوا تھا۔ پتہ نہیں وہ ماں کے سامنے اتنا لاچار کیوں تھا۔؟

مٹی کے مادھو کی طرح ماں کے اشاروں پر چلتا۔ اسے کبھی اپنی ماں کا غیر انسانی رویہ نہیں آتا تھا۔ نہ اس کی بے ہودہ گفتگو پر کوئی اعتراض ہوتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے سامنے ایسا بیٹھ جاتا جیسے اس پر مسمریزم کر دیا گیا ہو۔

چلیے احتجاج کرنا تو الگ بات ہے ـــــ کم از کم حالات کا ادراک تو ہو ـــــ مگر اس کبوتر کی طرح آنکھیں بند کی ہوئی تھیں اور آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ تو صاف صاف کہہ دیا تھا۔ میں تجھے تیرے خصم سے چھڑا کر رہوں گی۔ کس طرح چھڑانا چاہتی تھی بات نیا کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر کچھ دنوں بعد سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔

گرمیاں شروع ہو گئی تھیں اور سب لوگ باہر صحن میں پلنگ بچھا کر سوتے تھے۔ دو پلنگ پنکھے کے بالکل سامنے لگائے جاتے تھے۔ سب سے اگلے پلنگ پر آپا سوتی تھی چار من کی لاش پنکھے کے آگے ڈھیر ہو جاتی تو پھر ہوا بے چاری لیسا رکوشش کے باوجود نہیں نکل سکتی تھی۔ انہوں نے حکم دیا کہ شہباز رات کو ان کے پاؤں دبایا کرے۔ اور پھر یہی کرے کیونکہ وہ بیمار رہتی ہیں۔ نہ معلوم رات کو کس وقت طبیعت خراب ہو جائے۔ بیٹے کے پاس، سب سے آخر میں نیا کی چارپائی ہوتی تھی۔ اور اگر حبس اور گرمی کے مارے وہ تو پھر کمرے میں چلی جاتی۔ اور پنکھا چلا کر سو جاتی۔

اب تو نیا کی طبیعت کے لحاظ اور حجاب اُٹھ گئے تھے۔

آئے دن اُس کی شہباز کے ساتھ لڑائی رہتی۔ پہلے شہباز خاموشی سے اُس کی باتیں سنتا تھا۔ مگر اب تُرکی بہ تُرکی جواب دیتا تھا۔ بلکہ سختی سے اس کا منہ بند کر دیتا تھا کتنی دفعہ نیا نے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم الگ گھر لے کر رہتے ہیں۔ مگر اس نے صاف جواب دے دیا۔

"میری آمدنی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی۔"؟

"میں دو گھروں کا خرچہ نہیں چلا سکتا۔ پھر تم اس بات کے لئے رویا کرو گی کہ میرے پاس کپڑے نہیں روٹی نہیں۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں کہوں گی۔"

"مگر میں اپنی ماں کو الگ نہیں رکھ سکتا۔"

"ٹھیک ہے مجھے الگ گھر لے دیں۔ میں تمہارہ لوں گی۔"

"تمہارا گزارا کس طرح ہو گا۔"

"میں نوکری کر لوں گی۔"

"ہمارے ہاں بیویوں کے نوکری کرنے کا رواج نہیں ہے۔"

"اب نوکری کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ آخر جو لڑکیاں نوکریاں کرتی ہیں۔ وہ مجھ جیسی ہی ہوتی ہیں۔"

"تو یوں کہو اب تم گھر سے باہر نکلنا چاہتی ہو۔"

"زندگی بہتر طریق پر گزارنے کے لئے باہر نکلنا بُرا نہیں ہے۔"

"یا یوں کہہ لیں کہ اب تم دُنیا کو اپنا آپ دکھانا چاہتی ہو۔"

مجھ میں کیا رہ گیا ہے۔ جو میں دکھانا چاہتی ہوں۔"

"خود پسندی تو ہے۔"

"اتنے عرصے سے آپ کی ماں کے جوتے کھا رہی ہوں۔ اگر خود پسند ہوتی تو پہلے دن ہی لی گئی ہوتی۔"

"اگر پہلے دن ایسا قدم نہیں اٹھایا تو پھر خاموش رہو۔"

"اب میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ یہاں رہ کر میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔"

"میں تمہیں نوکری کی اجازت نہیں دے سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے۔"؟

"لوگوں کا مسئلہ کس طرح ہو گیا۔؟ مجھے لوگوں کی پروا نہیں ہے۔"

"اس معاشرے میں کوئی شخص بھی لوگوں کی پروا کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"مگر لوگ ہماری کتنی پروا کرتے ہیں۔ جو جس کے جی میں آتا ہے۔ ہم بھی اپنی مرضی سے رہنے کا حق رکھتے ہیں۔"

"میں تمہیں گھر سے نکلنے اور نوکری کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ تم نہیں جانتیں خراب ہے؛ باہر نکلو گی تو پتہ چلے گا ——"

افوہ —— یہ زمانہ زمانہ —— نیا چڑ جاتی، یہ زمانہ میری ہی راہ میں کیوں آ کے کھڑا ہو جاتا سب لوگ خوش باش ہیں۔ زمانہ کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ ایک میں باہر نکلوں گی تو مجھے کاٹ کھائے گا میری ناک کاٹ لے گا۔ میں کیا چیز ہوں آخر ——!

مگر اسے بکتا جھکتا چھوڑ کر شہباز باہر نکل جاتا۔ اس گھر میں تو لڑنے کے لئے بھی مناسب نہیں ملتا تھا۔ اور پھر جیسے جرنیل آپا ہر دیوار سے کان لگائے رکھتی تھیں۔ دن رات ہوا دے سنا کرتیں۔ اور جب بیٹھتیں تو بیٹے کو خوب شہ دیتیں۔

نیا نے بھی ایک دم پینترا بدل لیا تھا۔

نہ دلجمعی سے کام کرتی نہ بڑھ چڑھ کر صفائیاں کرتی۔ بیدلی سے کھانا پکاتی۔ گندے برتن ڈھیر چھوڑ کر اٹھ جاتی۔ کئی کئی دن تک کپڑے نہ دھوتی۔ مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ ہنڈیا جلنے آتی رہتی —— وہ اپنے کمرے کی کنڈی بند کئے اندر لیٹی رہتی —— ضرورت کے وقت اپنے حصے کا کام کرتی۔ اور پھر اندر جا گھستی۔ جرنیل آپا بکتی جھکتی رہ جاتیں۔ اور جو کبھی دل بہت تو رکشہ لے کر امی کے گھر چلی جاتی۔ پہلے وہ امی کے گھر زیادہ نہیں جایا کرتی تھی۔ رات نہیں اس سے کیا حاصل ہوا؛ امی کو اپنے ہاں رکھنے کی عادت نہ رہی۔ اور جرنیل آپا نے سمجھ لیا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اب وہ بڑے آرام سے کہہ دیتی۔

"میں اپنی امی کے ہاں جا رہی ہوں۔ ہفتے بعد آؤں گی ——"

"اسے یہ یکایک ماں کی محبت کا دورہ کیوں اسے پڑنے لگا ہے" وہ بعد میں شہباز سے ہر چند شہباز نیا سے الجھ پڑتا تھا۔ اسے برا بھلا کہتا تھا۔ مگر آپا کے سامنے اس کی بالکل شکایت

چپ بیٹھا رہتا۔

اگر نیا کا دہاں سے آنے کو جی نہ چاہتا، تو صاف کہہ دیتی میرے آپا جی بیمار ہیں۔ پندرہ دن بعد

ں گی"

اس طرح وہ مہینے میں کچھ دن آرام سے گزار آیا کرتی تھی۔ امی کے بہت مجبور کرنے پر آجاتی تھی

بعض اوقات جب وہ پورا مہینہ نہ آتی تو شہباز اسے لینے جاتا۔ پہلے تو وہ جی بھر کے شہباز سے جھگڑا کرتی اور پھر چل پڑتی، کبھی کبھی شہباز کو بھی وہیں رکنے پر مجبور کرتی۔ گو شہباز اپنی ماں سے ت ڈرتا تھا مگر نیا سے بھی محبت کرتا تھا۔ اس کے مجبور کرنے پر رات وہاں رہ جاتا۔ مگر صبح کو نیا ضرور ساتھ لے کر آتا۔ تاکہ آپا اپنی زبان کے مارے تیر اسی پر چلا کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرلے اور شہباز اف بچ جائے۔

نیا بھی شہباز کی اس چال کو سمجھتی تھی۔

مگر کیا کرتی ——؟

اس سے بڑا انتقام وہ آپا سے اور کیا لے سکتی تھی، کہ کبھی کبھار مجبور کر کے شہباز کو میکے میں رک جائے۔ اس بات کے لئے اسے آپا کی بے شمار گالیاں سننی پڑتی تھیں مگر آپا کو جلا کر مزا بھی تو بہت آتا تھا۔ اس کا دل چاہتا خواہ مخواہ آپا کا نقصان کر دے۔ دوپٹہ جلا دے —— برتن توڑ ڈالے مگر آپا کے چلانے سے بھی ڈرتی تھی؛ ابھی تک آپا نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ اس نے لوگوں سے سنا تھا، کہ مار دھاڑ کے معاملے میں بھی آپا جنگجویانہ قسم کا رویہ رکھتی ہیں۔ وہ ڈرتی تھی۔ اگر آپا کا ہاتھ اٹھ گیا تو پھر حالات اور بگڑ جائیں گے۔

جب نیا کو فرار کی کوئی صورت نظر نہ آتی۔ تو پھر وہ مرنے کی ترکیبیں سوچا کرتی۔ کبھی سوچتی بجلی کے ننگے تار کو چھو لے یا اپنے اوپر تیل چھڑک کر آگ لگا لے —— یا چھت پر سے کود جائے —— توبہ توبہ مرنے کے یہ طریقے بڑے ہولناک تھے۔ سوچ کر ہی جی ڈرنے لگتا تھا۔ وہ کیسے اپنا مردہ خراب کر سکتی تھی۔ جانے بعد میں اس پر کیا کیا الزام لگائے جائیں۔ تب اسے اچانک یاد

آجاتا کہ وہ شادی سے پہلے اخباروں میں اس قسم کی خبریں پڑھا کرتی تھی۔ کہ "ساس کے مظالم سے تنگ آکر بہو نے کپڑوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگالی"۔

اونہہ کس قدر بے وقوف بہو تھی۔ تب وہ سوچا کرتی۔ یہی آگ اس نے اپنی ساس کو لگادی۔ ساس بھلا بہو سے زیادہ زور آور کیونکر ہو سکتی ہے۔ اسے دل میں بہت غصہ آتا کہ اس کی بہو کی جگہ ہوتی نا؟ تو بڑھیا کو مزا چکھا دیتی۔ اب اسے وہ ساری خبریں اور وہ جذبے آتے تھے۔

آدمی زندگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر موت کو گلے کیوں لگا لیتا ہے۔ اب اسے اچھی طرح آگئی تھی۔

زندگی سے تو سبھی پیار کرتے ہیں۔ کوئی اپنے ہاتھوں اپنا گلا نہیں گھونٹنا چاہتا۔ مگر جب ایسے ہوں کہ سانس لینا دوبھر ہو جائے تو پھر مرنا ہی اچھا لگتا ہے۔ بڑی عجیب و غریب باتیں وہ سوچا کرتی تھی۔ راتیں سلگتی لکڑیوں کی طرح دھواں دھواں اور دن مکھر سے پتوں کی طرح ہو گئے تھے — سوچ کا کلکنا ڈوبنا — یا سانسوں کا آنا جانا — ہر بات کی اہمیت نظروں میں کم ہو گئی تھی۔

زندگی کی سوئی ایک ہی مقام پر اٹک گئی تھی۔

اس کی پیاسی روح اذیت کے سوا نیزے پر ٹنگی تھی۔ جب اچانک — بالکل اچانک اس پر ایک انکشاف ہوا۔

وہ حیران رہ گئی۔ حیرت سے کبھی اپنے مرجھائے چہرے کو دیکھتی۔ اور کبھی اپنے گرد کو، مایوسیوں میں وہ آس کا ایک دیا جلا دیتا ہے۔ وہ بڑا شعبدہ باز ہے — نیا کی آنکھوں میں آگئے۔

خالی آنسو بہانا اگر ان آنکھوں کی ریت ہوتی۔ تو یہ کٹورے کب کے بے نور ہو چکے ہوتے ان آنسوؤں نے اُسے زندگی کی آگہی بھی دی تھی — لٹنے کے مناظر دکھاتے تھے۔ تو بچانے

ادبھی سکھا دیتے تھے —

اب وہ فیصلہ کر سکتی تھی۔ اُس میں فیصلے کی قوت تھی۔ وہ دُنیا کو اپنا یہ کارنامہ دکھا سکتی تھی۔

کچھ دن وہ خاموش رہی۔ پھر ایک دن فیصلہ کن ارادے کے ساتھ اٹھی اور اپنا سارا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ ضرورت کی سب چیزیں ایک صندوق میں رکھیں — بے ضرورت سامان الگ بوروں میں بند کر دیا۔ اس نے کمرے کی ہر چیز کو اس طرح سے اوجھل کیا کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلا — کپڑے ہی چکے دو تین بکسے بنا لئے۔ اور ایک دن جب جرنیل آپا گھر نہیں تھیں ٹیکسی منگائی۔ اس کا سامان رکھا۔ بی ہمسائی کو گھر کی چابی دی اور امی کے گھر چل پڑی۔

امی نے جو اُس کو ساز و سامان کے ساتھ ٹیکسی سے اترتے دیکھا۔ تو ہکا بکا سی رہ گئیں۔ سلام کا جواب دینا اور پیار کرنا بھول گئیں۔ نیا نے وہیں کھڑے کھڑے سامان امی کے حوالے کیا۔ اور دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ کر بولی "میں ذرا بینک جا رہی ہوں۔ شہباز سے ایک ضروری کام ہے — آدھے گھنٹے میں واپس آجاتی ہوں"۔

نیا آدھے گھنٹے کی بجائے پورے ایک گھنٹے کے بعد واپس آئی۔ ٹیکسی والے کو پیسے دے کر جب وہ گھر کے اندر آئی تو اس نے دیکھا —

اُس کا سامان ابھی تک باہر برآمدے میں ہی پڑا ہوا تھا۔ اور حیران و ششدر امی، ایک اسٹول پر بیٹھی خالی خالی نظروں سے اس کے سامان کو دیکھ رہی تھیں۔

"سامان اندر تو رکھوایئے امّی۔"

نیّا نے اندر داخل ہو کر یوں مسکرا کر کہا کہ امّی کی حیرت دوچند ہو گئی۔ امّی ایسے بیٹھی رہیں ان میں ہلنے جلنے کی سکت نہ ہو۔ نیّا خود ہی مائی کو بلا لائی اور اپنا سامان اٹھوا کر اپنے کمرے میں رکھوا کمرے پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈال کر اس نے جلدی سے فیصلہ کر لیا کہ کون سی چیز کس جگہ رکھی گی۔ اپنا پرس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بال درست کرنے اللہ چند سالوں میں اس کا چہرہ کیسا ہو گیا تھا، بجھا بجھا۔ اُداس اُداس۔ یہی وہ چہرہ تھا۔ جس پر گل کھلا کرتے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ مڑی تو دیکھا تھکی آئیں اور آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

آج نیا کے چہرے پر ایک خاص قسم کی طمانیت تھی، سرور تھا۔ مگر وہ پہلے سے کافی گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ رنگت جھلس گئی تھی مگر ایک خاص قسم کی خوشی اس کے سے عیاں تھی۔ زرد چہرے پر ایک موہوم سی سرخی تھی۔ موڈ بھی خوشگوار تھا اور پیشانی بھی شکن آلود تھی۔ امّی جان حیرتوں میں ڈوب ڈوب کر ابھر بھی گنگ ہوئی جا رہی تھیں۔ اپنی مخصوص ادا کے پر ٹھوڑی رکھے یوں اسے دیکھے جا رہی تھیں جیسے آج پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہوں۔

یہی وہ نیا ہے۔ جو پچھلے ماہ اُن سے اچھی طرح لڑ جھگڑ کر گئی تھی۔ رو رہی تھی، چلا رہی تھی اور پاؤں پٹخ پٹخ کر کہہ رہی تھی۔

"دیکھ لیجئے گا۔ میں کسی دن زہر کھا لوں گی، مر جاؤں گی، اس جہنم سے نجات حاصل کر لوں گی۔ مگر آپ کے گھر ایک دن بھی نہ آؤں گی۔

کسی سمندر میں ڈوب مروں گی۔ دریا میں کود جاؤں گی۔

ایسی زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔

مر جاؤں گی تو آپ کی جان بھی چھوٹ جائے گی۔

روتی ہوئی وہ سسرال چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد امّی کا دل کئی دن تک روتا رہا تھا! اپنی بیٹی کی اس جنونی کیفیت نے انہیں بہت بے سکون کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نیا بہت صبر والی لڑکی ہے جب تک معاملات حد سے نہ گزر جائیں وہ واویلا کرنے والی نہیں۔ وہ دن رات اس کے لئے دعائیں کرتی تھیں۔ ان کا دل چاہتا نیا کو اپنے کلیجے میں چھپا لیں۔ مگر میاں کے خوف سے وہ ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے شوہر نے تو خود انہیں کبھی میکے نہ جانے دیا۔ کبھی میکے کا نام لیا تو، ہمیشہ یہی کہا۔

"وہاں اب کیا رکھا ہے جو تم جانا چاہتی ہو، شادی کے بعد میکہ چھوٹ جاتا ہے۔ ماں باپ کا رشتہ فارمی ہوتا ہے۔ ویسے تمہارے لئے دلچسپی کا کوئی اور سامان ہو تو اور بات ہے۔"

ہاں کبھی کبھی خدیجہ بیگم دبی زبان سے صرف اتنا کہہ دیتی تھیں۔

"دیکھوں گی جب آپ اپنی بیٹی سے بھی یہی کہیں گے۔"

"کیوں نہیں کہوں گا؟" وہ غرا کر جواب دیتے۔ "کیا مجھے اپنی بیٹی کا گھر نہیں بسانا ہے۔"

اور اب خدیجہ بیگم دیکھ رہی تھیں وہ اپنی بیٹی کا گھر بسانے کی سعی کر رہے تھے جانے انجام کیا ہو گا کبھی کبھی وہ خود ہی لرز جاتیں۔

آج بیٹی کو خوش دیکھا تو ایک دھڑکا سا لگ گیا۔ گو انہوں نے سالوں بعد اپنی بیٹی کو یوں خوش دیکھا تھا۔ وہ کبھی اپنے آپ نہیں مسکرائی تھی۔ جب بھی گھر میں داخل ہوئی اس کی پیشانی شکن آلود ہوتی تھی اور

جب اس گھر سے باہر نکلی روتی ہوئی نکلی۔ چوٹ چوٹی اتنی ہو گئی تھی کہ بات بات میں لڑ پڑا کرتی تھی سے بے زار ہوئی بیٹھی تھی۔ وہی نیا آج بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ پنجرے کا پنچھی تبلیوں کے خوش نظر آئے تو بات تشویش کی ہوتی ہے اور زیادہ تشویش اس بات کی ہو رہی تھی کہ وہ ا بھی اٹھا لائی تھی۔ گو یہ سامان زیادہ تو نہیں تھا مگر اس سے پہلے نیا اتنے ساز و سامان کے نہیں آئی تھی۔ پہننے کے لئے بھی لاتی تو صرف دو جوڑے کپڑوں کے لے کر آتی۔

امی کو اس حالت میں یوں بیٹھا دیکھ کر نیا کو ہنسی آ گئی۔ آج امی کی بوکھلاہٹ اسے مزا دے رہی تھی۔ اس نے ہنس کر امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اپنا رخسار امی کے رخسار کے ساتھ امی کا ٹھنڈا رخسار اس کے جذبات میں ہلچل مچانے لگا۔ جیسے امی خاموش فریاد کر رہی ہوں۔ پھر گھسیٹ کر امی کے قریب بیٹھ گئی۔ امی کو زیادہ دیر اپنے جھنجھٹ میں رکھنا اس نے پسند نہ کیا۔ اس واسطے ٹھنڈا ٹھنڈا جھرلوں بھرا ہاتھ تھام کر اس نے ساری بات کہہ سنائی۔ اس نے سب کچھ امی کے گوش گزار تھا کہ مزید سوالات کرنے کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ ساری بات سن کر امی نے اطمینان کی ایک سانس کھینچی۔ اور پھر نظریں یوں جھکا لیں جیسے نیا سے اختلاف کرنے کا حوصلہ ان میں نہیں ہے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیا نے لاچار ہو کر یہ موقف اختیار کیا تھا۔ اس کے سوا نیا کے پاس راستہ بھی نہیں تھا۔ ان کے پاس بھی اس کا کوئی دوسرا حل نہ تھا۔ اور یہ وہ آخری چال تھی۔ بازی لئے جس کا چلنا ناگزیر سا ہو گیا تھا۔

"میں تمہارے لئے ناشتہ بھیجتی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔

نیا کا جی کھل اٹھا۔ امی کی خاموشی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں نیا کی تجویز سے اتفاق ہے کی بات سمجھ گئی ہیں تو اب وہ ابا جی کو بھی قائل کر لیں گی مگر وہ ابا جی کے بارے میں کبھی بھی دعوٰی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے دل میں سوچا۔ اس بار وہ اپنے حق کے لئے لڑے گی اور خو لڑے گی۔ زمانے نے اسے بہادر بنا دیا تھا۔

شہباز نے بھی کہا تھا وہ شام کو ضرور آئے گا۔ وہ اس کے بینک چلی گئی تھی تاکہ اسے

دے مگر بینک میں اس وقت رش بہت تھا اور شہباز کو بات سننے کی فرصت نہیں تھی۔ اس لئے نے کہہ دیا تھا کہ وہ شام کو وہیں پر آ کر ساری بات سن لے گا۔ ہاں اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہے جس کے لئے آج نیا بینک تک آ گئی ہے۔

امی جان نے بھی شاید زندگی میں پہلی بار ابا جی سے ایک بات کھل کر کی تھی۔ ان کو ساری اونچ نیچ طرح سمجھائی کہ بات ابا جی کی سمجھ میں آ گئی۔ اتنا ہی کیا کم تھا کہ انہوں نے نیا کے اس طرح چلے آنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ امی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے علاوہ نیا کے مسئلے کا اور کوئی حل نہیں ہے۔ کی پوری زندگی کا سوال ہے۔

"خوب سوچ سمجھ لو۔ اس سے معاملہ اور بھی زیادہ خراب ہو سکتا ہے"۔ پھر بھی انہوں نے یہ کہا تھا۔

"پہلے ایک مسئلہ حل ہو جانا چاہیئے۔ باقی مسائل کا حل خود بخود نکل آئے گا۔ بظاہر تو نیا کی بے سکونی ایک ہی وجہ نظر آتی ہے۔ چلئے اس بار اس کا کہنا مان لیتے ہیں"۔

"اگر تم کہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ بعد میں ہونے والے واقعات کی ذمہ داری بھی تم پر ہو گی"۔

"توبہ ہے"۔ امی نے دل میں جل کر سوچا تھا۔

لیکن اس کے بعد ابا جی نے کچھ نہیں کہا۔ شاید وہ جان گئے تھے کہ اس مسئلے کا واقعی کوئی اور نہیں ہے۔

شام کو جب بوکھلایا ہوا شہباز گھر میں داخل ہوا تو خلافِ معمول نیا خوب چہک رہی تھی۔ ورنہ اس پہلے تو وہ جب بھی اسے لینے آتا تھا۔ نیا کا چہرہ لٹک جاتا تھا۔

اس کی پیشوائی کو بڑھی اور پھر اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ جب تک ے اسے سب کچھ بتا دیا وہ اسی طرح ہونق بنا رہا۔ ساری بات سننے کے بعد بولا "مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ تمہیں یقین نیا"

"ہاں! ہاں۔! صبح آپ سے مل کر میں اپنی لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھی گئی تھی۔ اس نے تصدیق کر ہے اور میری اس تجویز کو پسند بھی کیا ہے۔ اس نے مجھے صاف کہہ دیا ہے کہ اب مجھے یوں بے

نو ماہ اپنے میکے میں رہنا چاہیئے۔ مکمل آرام کرنا چاہیئے۔ لڑائی جھگڑے اور پریشانی سے دور رہنا چاہیئے اور بڑی اچھی خوراک کھانی چاہیئے۔ یہ سب سوچ کر میں یہاں آگئی ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ ہے تو بڑی اچھی بات۔" شہباز کے سر سے جیسے بوجھ اُتر گیا۔ ورنہ وہ تو ہم عجیب طرح کی اُلجھن میں گرفتار تھا۔ بار بار سوچتا۔ پتہ نہیں آپا نے کیا کہا ہوگا گھر میں کیا تماشہ ہوا ہوگا۔ نیا اپنا سامان اٹھا کر میکے چلی گئی۔ لڑائی تو روز ہوتی تھی۔ آج کوئی خاص بات ہوگئی ہوگی۔

"تم اپنا سامان لے آئی ہو؟" تھوڑی دیر بعد شہباز نے پوچھا۔

"تقریباً تین چار ماہ کی چیزیں تو لے ہی آئی ہوں۔"

"اچھا ہوتا تم آپا کو بتا کر آتیں۔"

"ہاں بتا دیتی تاکہ وہ مجھے یہاں بھیجنے کی بجائے جہنم رسید کر دیتیں۔ ہے نا؟" نیا نے چھیڑا۔

یہ سب کچھ شہباز بھی جانتا تھا مگر وہ سدا کا بزدل تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آپا سے سب کچھ کیسے کہے گا۔

"آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔" نیا نے مچل کر کہا۔

"کیا؟"

"تین چار مہینے آپ آپا کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"وہ تمہاری اتنی لمبی غیر حاضری کی وجہ پوچھیں گی۔" شہباز نے گھبرا کر کہا۔

"کچھ بھی کہہ کر ٹال دیجیے گا۔"

"مگر کب تک ٹالوں گا۔"

"جب تک ممکن ہو سکے۔"

"کیا تم چار ماہ تک آنہ جاؤ گی؟"

"نہیں۔" نیا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں بچے کی پیدائش تک یہاں رہوں گی۔ میں جب جاؤں گی میری گود میں میرا بچہ ہوگا، یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ آج تک میں نے دوسروں

کے آگے سر جھکایا ہے۔ مجھے اِس سے کیا حاصل ہوا؟ محرومی اور نامرادی۔ میں اپنے دامن سے یہ داغ دھونا چاہتی ہوں۔"

"مگر آپا تو..... تم جانتی ہو۔" شہباز ڈر ڈر کر بولا۔ "آپا تو یہ بات ہرگز پسند نہ کریں گی۔"

"آپا تو مجھے بھی پسند نہیں کرتیں۔ وہ آپ کے ہونے والے بچے کو بھی پسند نہیں کریں۔ ان کی خوشی تو اس بات میں ہے کہ کسی دن اپنے ہاتھ سے میرا گلا گھونٹ دیں۔ آپ نے دیکھا نہیں چار سال سے اس گھر میں میرے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟"

"کیا تم نے یہ سب بتانے کے لئے مجھے یہاں بُلوایا ہے۔؟"

"نہیں۔ میں نے آپ سے یہ کہنے کے لئے آپ کو بُلوایا ہے کہ میں اتنی نادان نہیں ہوں کہ اپنی کوکھ کو بنجر کر لوں۔ میں عورت ہوں۔ ماں بننا میرا پیدائشی حق ہے۔ اِسی حق کے سہارے مجھے اس گھر میں رہنا بھی ہے۔ ورنہ کسی بھی وقت دھتکاری جاؤں گی۔ آپ نے سُنا نہیں؟ آپا نے تو باقاعدہ مجھے یہ سُنانے کی مہم شروع کر رکھی ہے کہ وہ کسی بھی وقت آپ کی دوسری شادی کرا دیں گی۔"

شہباز کھسیانا سا ہو کر ہنس پڑا۔

"اور تم سمجھتی ہو کہ یہ سب کچھ آسان ہے۔ بہت ممکن ہے۔"

"آپا کے لئے کوئی بات بھی ناممکن نہیں۔ وہ ہتھیلی پر سرسوں جما سکتی ہیں اور رائی کا پربت بنا لیتی ہیں۔ اور آپ کا کیا ہے آپ ٹھیرے انتہائی فرمانبردار بیٹے۔ محض ماں کی خوشنودی کی خاطر گردن ڈال دیں گے۔"

نیا نے دیکھا کہ یہ بات سُن کر شہباز کا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ اِسی لئے پھر جلدی سے بولی۔

"خدا ہم اِس بحث میں کیوں پڑیں۔ جب حشر کا وقت آئے گا اس وقت دیکھا جائیگا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ایک موقع دیا ہے تو اسے کیوں گنوائیں۔ تھوڑی سی احتیاط کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

شہباز چپ بیٹھا رہا تو وہ آپ ہی آپ بولتی چلی گئی۔

"شہباز اب آپ کو بہادر بن کر دکھانا چاہیئے۔ اپنے بچے کی خاطر، میری خاطر، اپنی ازدوا
زندگی کی خاطر، بعض اوقات بچہ زندگی کی تقدیر بن جاتا ہے۔ اس کے آنے سے حالات بد
ہیں۔ ستارے بدل جاتے ہیں۔ بہت سی اچھی تبدیلیوں کی راہ نکل آتی ہے۔ ممکن ہے بچے کی
آپا کے دل میں ماما اُتر آئے۔ ان کا دل پسیج جائے، وہ مجھے قبول کرلیں۔ اُن کے رویے میں
پیدا ہوجائے۔ اور پھر مجھے جینے کا جواز مل جائے گا۔ سارا دن پڑی جلتی کڑھتی رہتی ہوں۔ پر
تو میں اپنی زندگی سے اُکتا گئی ہوں۔ مگر اب جینے کو دل چاہتا ہے۔ اب . . . اب میرا جی
ہے کہ میرا بچہ ہو۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" بالآخر شہباز نے کہا۔ "ہمیشہ بہتری کی اُمید رکھنی چاہیئے۔" شہباز کا
مسئلے کا اور کوئی حل نہیں مل رہا تھا۔ وہ جب سے آکر بیٹھا تھا مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ وہ نیا
اس کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ نیا جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ ہے۔ وہ
آپا پر بھروسہ کیا تھا، دونوں مرتبہ اُس کی کوکھ ویران ہوگئی تھی۔ سب کچھ نیا نے بڑے صبر
نیا عورت ہے اور بچے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے اس کا حق ملنا چاہیئے۔ اس کا
صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ پورے نو ماہ آپا سے دُور رہے۔ ممکن ہے اس مرتبہ ضد کرے
نیا کی جان کو خطرہ پیدا ہوجائے۔ پچھلی مرتبہ تو وہ مرمر کر بچی تھی۔ نیا بزدل نہیں تھی، بے وقوف نہیں
جذباتی نہیں تھی۔ وہ اپنا حق مانگتی ہے۔ اسے اس کا حق ملنا چاہیئے۔

اور یہی ایک صورت تھی جو نیا نے اختیار کی تھی۔ یہ شہباز بھی جانتا تھا۔ اس واسطے اس نے
کے یہاں آکر رہنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ گو اسے آپا سے خوف آرہا تھا۔ جانے کیا کچھ سنا
مگر اس وقت اس نے نیا کی ضد کے آگے گردن جھکا دی تھی۔ ازدواجی زندگی میں پہلی بار شہباز
چاہا تھا کہ وہ نیا کی بات مان لے۔

"ٹھیک ہے نیا۔" اس نے نیا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں آرام سے
دوسرے تیسرے دن تمہاری خبر لینے آتا رہوں گا۔ اور جب تک ممکن ہوسکے گا اس

چھپاؤں گا۔"

"سچ شہباز۔؟" نیا نے پاگلوں کی طرح شہباز کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"بعد میں پھر تم خود نمٹتی رہنا۔ یہ میں صاف کہہ دوں۔"

"بعد کی آپ فکر نہ کریں مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں بچہ لے کر جاؤں گی اور آپا کو خود راضی کروں گی۔" جواب
جب شہباز نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے تو وہ فوراً کھڑی ہوگئی اور بولی۔

"میں آپ کے لئے چائے بنا لاؤں۔"

"ارے بیٹھو میرے پاس، اب چائے کی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں میں چائے ضرور پلاؤں گی آپ کو، مجھے معلوم ہے آپ دفتر سے آکر چائے پیتے ہیں۔" نیا
ہرکی۔ اس کے دل کا بوجھ اُتر گیا تھا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ آج کا دن کتنا خوب صورت تھا اور
گار بھی۔ صبح سے ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔

اسے رہ رہ کر اپنی ساس کے الفاظ یاد آنے لگے۔

"یہ تو اب کبھی بچہ نہ جن سکے گی۔"

"واہ جرنیل آپا۔ تو بھی کا بتیاں چیز ہے۔ مگر اس بار میں تجھ سے بازی لے جاؤں گی۔ عورت،
ورت سے مات نہیں کھا سکتی۔"

"اے وہ کمبخت ابھی تک آئی کیوں نہیں۔ اب کے اُس کے ابا کو مرگی کا دور
یا اماں کو باؤلے کتّے نے کاٹ لیا ہے۔" پورا ایک مہینہ نیا کا انتظار کر کے آخر ایک
پڑیں۔ شہباز اسی وقت نیا سے مِل کر آرہا تھا۔ اب اُس نے معمول بنا لیا تھا کہ ہفتے
دو بار نیا کو ضرور دیکھنے جاتا۔ اس دن وہ دفتر سے ذرا جلدی اٹھ جاتا، پھر اس کے پا
وقت گزار کے گھر واپس آجاتا۔ نیا میں ایک خوشگوار تبدیلی آرہی تھی۔ وہ شہباز سے
پن سے ملتی جس طرح شادی کے بعد ملا کرتی تھی۔ اس کی صحت بھی اچھی ہو رہی تھی ا
دل میں شہباز بھی بہت خوش تھا۔

گو نیا اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بتائے بغیر میکے چلی جاتی تھی مگر ایک ہفتے بعد
چپکے سے لوٹ آتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ دن رہ لیتی تھی۔ مگر اب پورا ایک
تھا اور آپا کو بہت بے چینی ہو رہی تھی۔ کچھ ان کی زبان میں کھبلی بہت ہو رہی تھی
کے کاموں نے انہیں تھکا دیا تھا۔ نیا کے آنے کے بعد تو انہیں کام کرنے کی عاد
رہی تھی۔ دو ایک بار انہوں نے دبی زبان سے نیا کے نہ آنے کا شکوہ کیا اور اپنی
بھی کیا مگر ہر بار شہباز خاموش رہ کر ٹال گیا۔ شہباز کا رویہ بھی عجیب ہو گیا تھا۔ بظاہر

اور مطمئن نظر آتا کہ آپا کی جان جل جاتی۔

آج جب وہ گھر میں داخل ہوا تو آپا اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئیں۔ وہ سُنی اَن سُنی کر کے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اتنا سخت فقرہ بھی اُس نے ہضم کر لیا تھا۔ آپا کو اور بھی طیش آگیا۔ لپک کر اس کے پیچھے کمرے میں چلی گئیں۔ اور زیادہ سخت لہجے میں بولیں۔

"میں پوچھتی ہوں اب اس کا کون مر گیا ہے نہ صفِ ماتم اٹھتی ہے اور نہ وہ آتی ہے۔"

"آپا کبھی تو ڈھنگ کی بات کیا کریں۔" شہباز نے جیسے چڑ کر کہا۔ "آپ کی انہی باتوں سے تنگ آکر نیا نے اِس گھر سے دُور رہنا شروع کر دیا ہے۔"

"واہ رے۔" وہ اُس کے قریب آگئیں۔ "آج تو تو بھی جورو کے انداز میں بول رہا ہے۔ ماں کو آنکھیں دِکھا رہا ہے۔ لگتا ہے تجھے اُلّو کھلا کے گئی ہے۔"

شہباز نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ خواہ مخواہ زبان کھولی، اب لینے کے دینے پڑیں گے۔

"چار دن ہوئے اس چھوکری کو آئے اور صاحبزادے ماں کے احسانات کو بھول گئے۔ او تیری مجال تو ماں کے مُنہ آرہا ہے۔"

"آپا میں نے کیا کہا ہے۔" شہباز بولا۔ "جو کچھ آپ پُوچھ رہی ہیں وہ کسی مہذّب طریقے سے بھی تو پوچھا جا سکتا ہے۔"

"اچھا اب تو مجھے تہذیب سکھانے چلا ہے۔ تیرے گُو مُوت صاف کر کے میں نے تجھے اس قابل جو بنا دیا ہے۔ اور جو تیرے پاس تعلیم اور تہذیب ہے وہ تو نے کہاں سے سیکھی؟ کیا وہ تیری جورو میکے سے لائی تھی۔؟"

"اوہ! آپ خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہی ہیں۔"

"اور تو خواہ مخواہ جورو کو اہمیت دے رہا ہے۔"

"میں یہ بات اس کے سامنے تو نہیں کہہ رہا حالانکہ بعض اوقات آپ اس پر صریحاً زیادتی کرتی ہیں۔ میں سب دیکھتا ہوں اور چُپ بیٹھا رہتا ہوں۔ یہی سوچ کر کہ ایک دن اگر میں بیچ

میں آگیا تو آپ کی عزت اس کی نظروں گھٹ جائے گی۔"

"ہاں ہاں بول کے دیکھ لے آج وہ مجھے دو کوڑی کا سمجھے گی تو کل تجھے بھی جوتے کی نوک پر رکھے گی۔ اس کے لچھن اچھے نہیں ہیں۔"

"میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"پھر تو تو یہ بھی جانتا ہوگا کہ وہ میکے میں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔"

"یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے میں کیا جانوں۔"

"ہاں اگر تو نے اسی طرح ڈھیل دے دی تو ذاتی معاملے کچھ زیادہ طویل ہوتے جائیں گے۔"

"ہم دونوں میں سے ایک شخص ہی سختی کر سکتا ہے نا؟"

"اچھا تو اب میں سخت گیر ہو گئی ظالم ہو گئی۔ لو گو! مغضب ہو گیا۔" آپا ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئیں اور زانو پر دوہتڑ مار کر رونا شروع کر دیا۔ شہباز جانتا تھا کہ رونا آپا کا آخری حربہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقابل کو شکست نہیں دے سکتیں تو رونا اور چلانا شروع کر دیتی ہیں۔

"ہائے مجھ نصیبوں جلی کے مقدر میں یہ دن دیکھنا تھا۔ بیوگی میں اس بیٹے کو پالا کیا کیا قربانیاں نہ دیں اس کے لیے۔ اور آج یہ مجھے ظالم سنگدل اور بداخلاق کہہ رہا ہے۔"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا آپا۔" شہباز آہستگی سے بولا۔

"اگر کچھ اور کہنے کو رہ گیا ہے تو وہ بھی کہہ لے، تو اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لے۔"

شہباز خاموش ہو گیا۔ اب کچھ کہنا ہی فضول تھا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ جو بات آپا پوچھنا چاہتی تھیں وہ ٹل گئی تھی۔ خواہ عارضی طور پر سہی۔

آپا روتی رہیں اور اپنے بیٹے کو کوسنے دیتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب انھوں نے دیکھا کہ بیٹے پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اپنا پینترا بدل لیا۔

"خدا غارت کرے اس ذلیل لڑکی کو، نحوست کا سایہ بن کر ہمارے گھر آ گئی تھی۔ مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا۔ میرا بیٹا ایسا نہیں تھا۔ ہائے وہ تو ماں کے آگے نظر نہیں اٹھاتا تھا

آواز میں بات نہیں کرتا تھا۔ دُنیا میرے بیٹے پر رشک کرتی تھی۔ میں تو اپنے بیٹے کے سہارے زندہ تھی۔ ہائے جس دن میرا بیٹا باغی ہوا اسی دن میں مر جاؤں گی۔ بس اب میں مر ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ میری اس گھر میں کسی کو ضرورت نہیں ہے۔ میں کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔"

وہ روتی رہیں اور بلند آواز سے بولتی رہیں۔ شہباز چپ بیٹھا رہا۔ اس نے تردید کی نہ تائید تو آپا نے ایک اور انداز اختیار کیا۔

"بیمار جان ہے میری۔ جانے کیا کیا مرض لگے ہیں۔ کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی۔ ان کے ساتھ جان ماری کر رہی ہوں۔ گھرداری کا سارا بوجھ اٹھاتی ہوں میں کوئی مفت کی روٹیاں نہیں توڑتی۔ سب کی خدمت کرتی ہوں اور مجھے یہ صلہ مل رہا ہے۔"

پھر آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"ہاں ایک یہ موئی زبان ہے۔ زبان سے بیج نکل جاتا ہے اور بیج کڑوا ہوتا ہے۔ کڑوا ہٹ تو کسی کو اچھی نہیں لگتی۔ جب اپنی اولاد کو اچھی نہیں لگتی تو غیروں کا کیا دوش۔"

شہباز اب بھی چپ بیٹھا رہا۔

وہ جانتا تھا اب رفتہ رفتہ آپا پھر پہلے موضوع کی طرف آ جائیں گی اور کسی نہ کسی طرح اس سے سب کچھ اگلوا لیں گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ وہ کوئی بہانہ کر کے اُٹھ جائے۔

وہ کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہا ہے؟" آپا نے جلدی سے آنکھیں صاف کر کے کہا۔ "اب تجھے دُکھیا ماں کے پاس بیٹھنا بھی گوارا نہیں۔"

"آپا میں ذرا صدیقی صاحب کے ہاں سے ایک ضروری فون کرنے جا رہا ہوں، ابھی آ جاؤں گا۔"

وہ جب باہر جانے لگا تو آپا بھی کھڑی ہو گئیں۔

"دُکھوں کا ڈول بھر رہا ہے میرا بیٹا! گھر میں بیوی ہو اور پھر بھی گھر کا سکون میسر نہ ہو میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں۔ میرے بس میں ہو تو اسے چٹیا سے پکڑ کر گھسیٹ لاؤں۔ یوں بھاگ کر میکے وہ لڑکیاں جاتی

ہیں جن کے لئے میکے میں "دلچسپی" کے سامان ہوتے ہیں۔ شریف لڑکیاں اپنی سسرال کو ہی اپنا گھر ٹھکانہ سمجھتی ہیں۔"

شہباز جلدی جلدی سیڑھیاں اُترنے لگا۔

"آئے صاحبزادی، اب کے مزاج درست کردوں گی، دیکھوں گی میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر کیسے قدم نکالتی ہے۔"

شہباز نے آپا کے آخری الفاظ بھی سُن لئے تھے۔ مگر وہ انجان بن کر نیچے چلا گیا تھا وہ جانتا تھا ایک دن ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اب جو اس نے نیّا کی عدم موجودگی میں اس کی طرف داری کی تھی ان سے اور بھی خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ آپا جب تک پوری پوری تفتیش نہ کرلیں گی آرام سے نہ بیٹھیں گی اور ابھی تو ایک مہینہ ہی گزرا تھا۔

ادھر آپا کو شہباز کا لب ولہجہ کھل رہا تھا۔ شہباز نے آج تک اس لہجے میں بات نہیں کی تھی آپا نیّا کے بارے میں کچھ بھی کہہ لیں وہ کبھی زبان نہیں ہلاتا تھا۔ معاملہ کیا ہے؟ آپا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مگر وہ اتنا جانتی تھیں کہ اس ساری گڑبڑ میں بیٹے سے ہاتھ نہیں دھونے۔ بہتر ہے شہباز کے ساتھ وہی رویہ رکھا جائے اور بالا بالا سارے معاملے کی چھان بین کی جائے۔ یہ تو فکر ہوا کہ گھر پر نہ تھی۔ واقعی اگر شہباز بیوی کے سامنے اس کی طرف داری میں زبان کھول بیٹھتا تو وہ کہیں کی نہ رہتیں۔

ادھر شہباز سوچ رہا تھا کاش وہ کبھی نیّا کے سامنے اس کی حمایت کرتا تو نیّا کو اس کے جذبات اور محبت کا علم ہو جاتا وہ بھی جان سکتی کہ شہباز کو اس کے ساتھ کس قدر والہانہ لگاؤ ہے۔

ایک ہفتہ خاموشی میں گزر گیا۔ دوسرے ہفتے آپا چاپلوسی سے کام لیتی رہیں۔ انہوں نے شہباز سے نیّا کے بارے میں کچھ نہیں کہا مگر ذہن میں برابر کوئی پلان بناتی رہیں۔ کبھی ان کا دل چاہتا خود ہی جا کے نیّا کے میکے چلی جائیں اور اسے چمکار کر اپنے ساتھ لے آئیں مگر اس میں انہیں اپنی سبکی محسوس ہوتی تھی۔ فرض کرو نیّا ان کے ساتھ آنے سے انکار کردے۔ یا پھر دل میں سمجھ بیٹھے کہ وہ اس قدر اہم ہستی

بن گئی ہے کہ آپا اسے لینے آتی ہیں۔ اور پھر آئندہ کے لئے یہ رسم ہی بن جائے گی۔ وہ ہمیشہ چاہے گی کہ آپا اسے لینے آئیں۔

"نہ بابا۔ اس تجربے سے میں باز آئی۔ تدبیر کوئی ایسی ہونی چاہیئے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے...."

ایک دن انہیں اچانک خیال آگیا کہ تانو کو بھیجنا چاہیئے۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ بھلا پہلے انہیں خیال کیوں نہ آیا۔

دوسری صبح انہوں نے تانو کو اچھی طرح سکھایا پڑھایا کہ وہاں دو تین گھنٹے بیٹھنا۔ خوب باتیں کرے اور گفتگو کے دوران پتہ لگاتے کہ نیّا اتنے دنوں سے اپنے ماں باپ کے گھر کیوں ہے۔

اس روز کالج سے واپسی پر بالکل اچانک تانو نیّا کے میکے چلی گئی۔ امّی تو اسے دیکھ کر حیران ہی رہ گئیں۔ اس نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ نیّا کے کمرے میں گھس گئی۔ خدا کی قدرت کہ اسی دن نیّا کی طبیعت کچھ زیادہ خراب تھی کمر میں درد ہو رہا تھا اور بار بار چکر آتے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے نیند کی گولی دیکر سلا چھوڑا تھا۔ صبح سے وہ بستر میں پڑی تھی۔ بستر میں پڑے رہنے سے بال بکھر گئے تھے اور رنگت ہمیشہ سے زیادہ زرد لگ رہی تھی۔

جونہی تانو نے اندر گھس کر اس کے مُنہ سے چادر ہٹائی اور چلّا کر کہا۔ "السلام علیکم بھابی جان"

کتنی ہی دیر تک نیّا اسے پہچان نہ سکی۔ اپنی ادھ کھلی، لال لال آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ کچھ تو گولی کا نشہ تھا اور کچھ اس کا دماغ تانو کو دیکھ کر چکرا گیا تھا۔ اُس کے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ جرور آپا بھی آئی ہوں گی۔ اُن کا سامنا کرنے سے وہ گھبرا رہی تھی۔ گو اُس نے امّی جان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر کبھی جرور آپا آجائیں تو اس کو بڑی سنجیدگی سے بیمار بنا کر پیش کیا جائے۔ بیماری کی نوعیت پوچھی جائے تو کہہ دیا جائے پیٹ میں رسولی ہے اور اس کا اپریشن ہوگا۔ ہر چند امی جان ایسی منحوس بیماری کا نام نہ لینا چاہتی تھیں۔ مگر گیارہ تیرہ مصلحت کے تحت سب کچھ گوارا کرنے پر مجبور ہوگئیں تھیں۔ مگر انہوں نے نیّا سے کہہ دیا تھا۔

بیماریوں کی تفصیل تو خود بتاتے گی میں اتنے زیادہ جھوٹ نہیں بولونگی۔ بعد میں منہ بھی تو دکھانا ہوگا۔"

بہت دیر تک جب نیا تانو کو ایک ٹک دیکھے گئی اور منہ سے کچھ بھی نہ کہا تو تانو شرمندگی سے بولی۔

"کیا بات ہے بھابی۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" تو نیا نے مسکرا کر آنکھیں موند لیں۔ پھر جلدی سے تانو کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اتفاق سے اس وقت نیا کے ہاتھ بھی بہت گرم تھے۔

"کیا آپ کو بخار ہے بھابی؟" تانو نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں۔" نیا نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"پلیز آپ لیٹی رہیں بھابی۔"

لیکن نیا کوشش کر کے اٹھ بیٹھی۔

"کیا آپا بھی آئی ہیں؟" اس نے بھاری بھاری آواز میں پوچھا۔

"نہیں تو۔ میں سیدھی کالج سے آرہی ہوں۔ آپ نے اتنے دنوں سے خبر نہیں بھیجی۔ میں نے سوچا آپ کی خبر لے آؤں۔"

"شکر ہے کسی کو تو میرا خیال آیا۔" نیا نے کڑھ کر ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاتے بھابی، بھیّوں کو آپ کا خیال ہے۔ روز ہی شہباز بھیّا سے پوچھتی تھی۔ آپا بھی آپ کا بہت پوچھ چکی ہیں۔ بلکہ تنگ آکر انہوں نے مجھے..... بلکہ میں نے خود ہی سوچا کہ میں آپ کی خبر لے جاؤں۔ نہیں بھابی جان مجھے کب لے کر جائیں گے۔"

نیا نے دل میں سوچا مجھے معلوم تھا کہ اونگھ سونگھ لینے کے لئے اسے آپا ہی نے بھیجا ہوگا۔ اللہ کا شکر ہے وہ خود نہیں آئیں۔ اسے جیسے تسلی سی ہوگئی۔ کراہتی ہوئی وہ پھر لیٹ گئی۔ اب اسے بیمار بننے کی ایکٹنگ بھی خوب آگئی تھی۔ اس لئے اس نے دل میں سوچا وہ بیمار بننے کی جتنی ایکٹنگ تانو کے سامنے کر سکتی ہے۔ کر لے، کیونکہ تانو کو آپا نے جاسوس بنا کر بھیجا تھا۔

"آپ کب سے بیمار ہیں بھابی؟" تانو نے پوچھا۔

"جب سے یہاں آئی ہوں۔ بیمار تو میں وہیں پڑ گئی تھی۔ مگر کسی سے کہتی نہیں تھی۔ ایک دن سوچا تھا۔ امی جان کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے ہاں جاؤں گی۔ مگر ڈاکٹر نے مجھے جو ٹیکہ لگایا اس کا ری ایکشن ہو گیا اور ساری رات بے ہوش پڑی رہی۔ تب سے اب تک بیمار ہوں۔ تانو میں تو مر مر کے بچی ہوں۔ اچھا ہوتا اگر میرا کام تمام ہو جاتا۔ آپ لوگوں کی جان تو چھوٹ جاتی۔"

"ہائے بھابی، آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔" تانو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیا آپ ہمیں اتنا برا سمجھتی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں اس گھر میں کوئی مجھے پیار نہیں کرتا۔ اسی واسطے تو دو مہینے ہونے کو آئے کسی نے میری خبر نہیں لی۔ اور شہباز بھی نہیں آئے۔" نیا نے جھوٹ تو بول دیا لیکن اس کا دل ڈرنے لگا۔ آج شہباز کے آنے کا دن تھا۔ اگر وہ تانو کے سامنے آگیا تو سارے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ نیا کا دل چاہ رہا تھا کہ تانو جلد سے جلد اٹھ جائے۔ مگر وہ مارے محبت کے نیا کا سر دبانے لگی۔

"دیکھیں تو بھابی آپ کی حالت کیا ہو گئی ہے۔ پہلے سے بھی کمزور ہو گئی ہیں۔ کم از کم اطلاع تو دی ہوتی۔"

"کئی دن تک تو مجھے اطلاع دینے کا ہوش تک نہیں رہا۔ بعد میں، میں نے سوچا ان لوگوں کو کیوں تکلیف دوں۔ وہاں کون ہے مجھے سنبھالنے والا۔ تم کالج چلی جاتی ہو اور آپا بے چاری خود بیمار رہتی ہیں۔ اس لئے یہیں رہ گئی۔ یہ تردد تو اپنی ماں ہی کر سکتی ہے۔"

تانو کو بالکل سمجھ نہ آئی کہ اس نے آپا کی تعریف کی ہے یا ان پر طنز کیا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ نیا کا سر دبانے لگی۔

اتنے میں چاپ ہوئی اور امی اندر داخل ہوئیں۔

امی کی چاپ سن کر نیا کا دل دھڑکا تھا کہ کہیں شہباز نہ ہو مگر امی کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ امی بھی جان بوجھ کر ذرا دیر سے آئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں۔ سچ جھوٹ جو بھی ہونا ہے۔ وہ دونوں نند بھاوج میں ہو جائے تو پھر وہ اندر جائیں۔

امّی کو دیکھ کر تانو پھر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو بیٹی!" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"خالہ جان بھابی اتنی بیمار ہیں اور آپ نے ہمیں اطلاع بھی نہیں دی؟"

"بیٹی! اسی نے منع کر دیا تھا۔" امّی نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر بولیں۔ "چائے اندر بھیج دو۔ نیا نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ کچھ کھا ہی لو۔"

"امّی پہلے کھانا بھجوا دیں میرا خیال ہے تانو نے بھی نہیں کھایا۔ یہ کالج سے سیدھی ادھر آ رہی ہے۔"

"نہیں بھابی مجھے تو بھوک نہیں ہے۔"

"اچھا اب تکلف نہ کرو تمہارے بہانے میں بھی کچھ کھا لوں گی۔ ہاں امّی آپ پہلے کھانا بھیجیں بعد میں چائے پئیں گے۔" مگر وہ امّی کی طرف تجسّسانہ دیکھ رہی تھی، وہ امّی سے کہنا چاہ رہی تھی کہ اگر شہباز آ جائے تو اسے باہر ہی روک لیں۔ لیکن امّی اس کی نظروں کا اشارہ نہیں سمجھ رہی تھیں اور وہ تانو کی موجودگی میں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ بہرحال امی کچھ نہ سمجھتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ کھانا بھجوایا۔ پھر چائے بھجوائی۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ نیا نے تو برائے نام کھایا اور بار بار اصرار کھاتیں کہ شانو کو یقین ہو گیا کہ واقعی وہ بہت بیمار ہے۔

نیا دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ شہباز آج نہ آئے۔ جبکہ روزانہ وہ بے چینی سے انتظار کیا کرتی تھی۔

کبھی کبھی اللہ میاں کھٹ سے سُن لیتا ہے۔

شہباز کو دفتر میں ایک ضروری کام پڑ گیا تھا۔ اس واسطے وہ نہ آیا۔ تانو شام تک بیٹھی دونوں بڑی محبت سے باتیں کرتی رہیں مستقبل کے منصوبے بناتی رہیں۔ بالآخر نیا نے ڈھیر سلام بھجواتے اور شانو سے کہہ دیا "میرا کمرہ صاف کر دیا کرو۔"

گھر میں آپا تانو کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں اسے دیکھتے ہی جھپٹ کر پوچھا ایک بات کئی کئی بار پوچھی۔

تانو نے بھی نیا کی بیماری کا نقشہ اتنے دردناک انداز میں کھینچا کہ تھوڑی دیر کے لئے انہیں بھی یقین ہو گیا کہ نیا شدید علیل ہے۔

"اے بیماری کیا تھی؟ تو نے پوچھا نہیں؟"

"جب وہ صاف صدیوں کی بیمار لگ رہی تھیں تو میں کیا پوچھتی؟"

"بے وقوف پتہ تو کرنا چاہیئے تھا، کیا تکلیف ہے۔"

"بس انہیں بخار آ رہا تھا۔"

"اے اتنا لمبا بخار بھی کبھی آیا ہے۔"

"ممکن ہے ٹائیفائڈ ہو گیا ہو۔"

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ پتہ کیوں نہ لگایا۔"

"اگر پتہ لگا لیتی تو آپ کیا کر لیتیں؟"

"کم بخت!" آپا کو غصہ آ گیا۔ "بس یہ آج کل کی لڑکیاں عقل سے کوری ہیں۔"

گویا آپا کو یقین آ گیا تھا کہ نیا بیمار ہے۔ مگر بیماری کی نوعیت کیا ہے۔ یہ جاننے کے لئے ان کے دل میں کھُد بُدگی ہو رہی تھی۔ انہیں اس سے سروکار نہیں تھا کہ وہ کیوں بیمار ہے؟ کیا بیماری ہے یہ جاننا چاہتی تھیں۔ بلا سے وہ زندگی بھر ٹھیک نہ ہوتی۔ انہیں اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

نیا کا کمرہ کھلا ضرور ہے۔ مگر ضرورت کی ہر چیز تالے میں تھی۔ حتیٰ کہ ڈریسنگ ٹیبل پر سنگھار کی چیزیں بھی نہ تھیں جو ہمیشہ وہاں پڑی رہتی تھیں۔ اس سے کبھی کبھی انہیں شک گزرتا کہ نیا کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت گئی ہے۔

اس کے بعد بھی انہوں نے تانو کو اس کی خبر لینے کے بہانے دو تین بار بھیجا تھا مگر تانو ہر دفعہ بھابی کی محبت میں ڈوب کر واپس آتی۔ نیا اس کی بہت خاطر مدارات کرتی کبھی کبھی واپسی پر ٹیکسی کا کرایہ بھی دے دیتی۔ وہ تانو کو زیادہ سوالات کرنے کا موقع نہ دیتی اور پھر یہ بھی کہہ دیتی تم ذرا کردو میرا دل نہیں جانتا ہے۔

"بھابی آپ کب آئیں گی؟" وہ چلتے وقت پوچھتی۔

"بس تانو جب گھر کا کام کرنے کے قابل ہو جاؤں گی آجاؤں گی۔ آخو کو اپنے ہ
تانو جانتی تھی کہ نیا کیا کہہ رہی ہے۔ آپا اس سے سارے گھر کا کام کرواتی تھیں
کو منع کر سکتی تھی نہ نیا کی بات کی تردید کر سکتی تھی۔ اس لئے چپ کر کے آجاتی۔

کئی دفعہ تانو آپا سے کہہ چکی تھی کہ آپ بھی جا کر بھابی کو دیکھ آئیں مگر وہ ہمیشہ کہہ دیتیں
"میری جاتی ہے بیزار۔ جب تک مجھے پتہ نہ ہو موتی کو کیا روگ ہے میں کیوں جاؤں
بے غیرت بنی کسی دن آجائے گی۔"

اسی طرح چار مہینے گزر گئے۔ ایسی کون سی بیماری ہے کہ نیا ابھی تک صحت یاب نہیں
آپا کو حیرت ہو رہی تھی۔

کرنا خدا کا یوں ہوا کہ انہی دنوں آپا کی بڑی لڑکی نسرین اپنے بال بچوں سمیت آگئی
بھی آتے ہی نیا کے بارے میں پوچھا تو آپا نے خوب بڑھا چڑھا کر اس کے نہ آنے کے
نسرین کو سناتے۔

"ممکن ہے آپا وہ سچ مچ ہی بیمار ہو۔" نسرین نے کہا۔ "آپ کو خود جا کر اس کی خبر لینی
"اب ایسا کرو پہلے تم چلی جاؤ۔ یہی کہنا میکے آئی تھی تم سے ملنے آگئی ہوں۔ اس کے
دن میں بھی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" نسرین نے ہامی بھر لی۔

نسرین جب گھر کے اندر داخل ہوئی تو سامنے پلنگ پر بیٹھی نیا سلائیاں ہاتھ میں لئے نقش
بُن رہی تھی۔ گلابی جاڑوں کی شام اُتر آئی تھی۔ اس نے ہلکی سی شال کندھوں پر ڈالی ہوئی تھی
کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا مگر بڑے سلیقے سے اس نے سلائیاں اور اُون تکیئے کے نیچے رکھا
چادر اپنے اوپر لپیٹتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ نسرین نے بڑی لگاوٹ سے آگر اس کے گلے سے لگ
زیادہ قریب ہونے سے احتراز کیا۔ مگر نسرین کو اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ نیا پہلے سے کچھ بھاری

حالانکہ وہ بیمار سنی جاتی ہے۔
چلئے اندر چل کر بیٹھتے ہیں"۔ نیا نے خود ہی کہہ دیا تاکہ بار بار چل کر اسے نہ دکھانا پڑے۔ "امی
اندر ہی بھجوا دیں۔"

وہ دونوں اندر جا کر باتیں کرنے لگیں۔ نیا اس طرح شال لپیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی کہ نسرین کو اس
بھاری بھرکم ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بظاہر وہ بیمار بھی نہیں لگ رہی تھی بلکہ اب
سے پہلے کچھ اچھی خاصی رونق تھی۔ مگر نسرین نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بے ہودہ سا سوال کرے اور نہ
تھی کہ نیا کو اس کے آنے کا عندیہ معلوم ہو۔ اس لیے رسمی سی گفتگو کرنے لگی۔

"سنا تھا تم بیمار ہو۔ اب کیا حال ہے؟"

"اب تو اللہ کا شکر ہے۔ پہلے سے بہت بہتر ہوں۔"

"میں کچھ دنوں کے لئے آپا کے ہاں آئی تھی سوچا تم سے ملتی جاؤں۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔"

"تم کب تک آؤ گی؟"

"میں بھی انشاء اللہ بہت جلد آجاؤں گی۔"

"تمہارے بغیر تو آپا کو گھر بالکل سونا سونا لگتا ہے۔"

"اب یہ سُونا پن ہمیشہ کے لئے دُور ہو جائے گا انشاء اللہ۔" نیا نے ہنس کر کہا۔

"تو کیا میں شہباز کو تمہیں لینے کے لئے بھیجوں؟"

"نہیں نہیں۔ میں کوئی خدانخواستہ لڑ کر تو نہیں آئی۔"

"تو پھر چلو، میرے ساتھ چلو۔"

"ابھی نہیں۔"

"ابھی کیوں نہیں؟"

"جب میرے آنے کا وقت ہو گا میں خود ہی آجاؤں گی۔"

"اے پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو۔ صاف صاف کہو نا!"

"نیا صرف مسکرا کر رہ گئی۔"

"کیا آپا سے خفا ہو؟"

"نہیں تو! اُن سے تو میں کبھی خفا ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ جانتی ہیں میں نے ہمیشہ
کی ہے۔"

"تو کیا شہباز سے کوئی گِلہ ہے؟"

"بالکل نہیں۔" نیا زور سے ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ "نسرین باجی آپ ناحق فکر کر رہی
کہہ دیا۔ میں عنقریب آ جاؤں گی۔"

"مجھے وجہ بتاؤ۔ ورنہ میں آج تمہیں لیکر ہی جاؤں گی۔"

اسی وقت امّی جان چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں آئیں۔ سب کچھ
کے آگے کر دیا۔ نیا نے نسرین کی طرف پہلے خالی پلیٹ بڑھائی۔ پھر مٹھائی کی پلیٹ امّی

"خالہ جان آپ نے کس قدر تکلف کیا ہے۔" وہ قلاقند اٹھاتے ہوئے بولی۔

"بیٹا تم کون سا روز آتی ہو، جانے آج کیسے بھول پڑیں۔"

اصل میں، میں یہاں اتنے کم دنوں کے لئے آتی ہوں۔ پھر بچے بھی ساتھ ہو
ہی کئی لوگوں سے ملنے کی حسرت دل میں لے کر چلی جاتی ہوں۔"

"اے تمہارے بچے کہاں ہیں۔ انہیں کیوں ساتھ نہیں لائیں۔"

بس ایسے ہی آپا نے انہیں روک لیا تھا۔ ویسے بھی سُنا تھا نیا بیمار ہے تو میں نے
مزاج پرسی کو جائیں تو بچوں کو ساتھ لے جانا کچھ زیب نہیں دیتا۔"

امّی جان نے چائے بنا کر نسرین کی طرف بڑھائی۔

"نہیں کچھ ایسی فکر انگیز بیماری نہیں ہے۔ نیا تم اپنی بہن کو بتا کیوں نہیں دیتیں
نیا نے شرما کر گردن جھکا لی اور دل میں سوچنے لگی۔ کب تک یہ بات چھپاتی جاتی

چل جاتے گا۔ پورے چار ماہ ہو گئے تھے اور اب تو جسم بھی چغلی کھانے لگا تھا۔ پھر وہ انتہائی
زمانہ بھی گزر گیا تھا۔
ں کے باوجود وہ اپنے مُنہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔
مالا جان آپ ہی بتا دیں۔" نسرین نے نیا کو چُپ دیکھ کر کہا۔
بیٹی نیا تمہارے گھر کی امانت ہے اور تمہارے گھر کی ایک خوشی اپنے اندر چھپاتے بیٹھی ہے
ینے والی ہے۔"
سچ؟" نسرین نے واقعی خوش ہو کر نیا کے ہاتھ چوم لئے۔ "تو ہمیں اب تک بتایا کیوں نہیں
؟"
بیٹی تم تو جانتی ہو پہلے دو مرتبہ اس کا بچہ ضائع ہو چکا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ
ے پورے نو مہینے یہ چارپائی پر لیٹ کر آرام کرے، خوش رہے۔ اور کوئی اس کی دیکھ بھال
والا ہو۔"
یہ تو آپ نے بہت بڑی خوشخبری سنائی واقعی۔"
بیٹی میں نے اسے اپنے پاس روک لیا تھا۔ ایسی حالت میں اپنی ماں ہی بہتر دیکھ بھال کر سکتی
اب کہیں جا کر اس کی حالت بہتر ہوئی ہے۔"
نہیں۔ نیا اب بھی بڑی زرد ہے، ڈاکٹر کو دکھا رہی ہیں؟"
ہاں ہر ماہ لے کر جاتی ہوں۔ ٹیکے لگ رہے ہیں۔ گولیاں کھا رہی ہے۔ دُعا کرا اللہ تعالیٰ اس کی
پاری کرے اور یہ گود میں بچہ لے کر اپنے گھر جائے۔"
آمین!" نسرین نے کہا۔
آپا تو ناحق فکر کر رہی تھیں۔ آپ نے انہیں کیوں نہ بتایا؟"
اس بار امّی نے نیا کی طرف دیکھا تو نیا جھٹ بولی۔
وہ خود تو آئی نہیں تھیں۔ تانو کو انہوں نے بھیجا تھا۔ اب میں بچی کو کیا بتاتی؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"مگر شہباز بھیا تو آتے ہوں گے۔"

"کبھی کبھار آجاتے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ آپا کو بتا دیں مگر انہوں نے کہا

"ہاں وہ تو ازلی شرمیلے ہیں، ویسے کتنی خوشی کی بات ہے۔" نسرین نے ایک اور لڈو منہ میں ڈالا۔

امّی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ چائے پی کر نسرین نے اجازت چاہی تو نیّا نے اس کا ہا

"پلیز نسرین باجی ذرا آپا کو سمجھا دیجئے گا زیادہ ناراض نہ ہوں۔ میں فارغ ہوتے ہی میں حاضر ہو جاؤں گی۔"

"تم فکر ہی نہ کرو میں سب اُونچ نیچ سمجھا دوں گی۔ ویسے اچھا ہے اب تم یہیں رہ سیڑھیاں بھی تو ہیں۔"

"اور .... اور .... باجی اب مجھ میں ہمّت بھی تو نہیں کہ ...." نیّا نے بات ا اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ہاں ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔ تم خوش خوش رہا کرو۔ ہمیں تو شہباز بھیا کا بچّہ دیکھنے ہے۔ اللہ خیر سے تمہیں فارغ کرے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔"

نسرین کے جانے کے بعد نیّا پر پژمردگی سی طاری ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی۔ جانے نسرین کو بتا کے اچھا کیا یا بُرا۔ یہ تو اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے آپا نے ہی بھیجا پتہ نہیں آپا کا کیا ردِّ عمل ہو گا۔ وہ آپا کی فطرت کو اچھی طرح جانتی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا نسرین کو تو ٹال دیا تھا۔ مگر نسرین کے آگے بات نہ بنائی جا سکی اس صورت میں جبکہ اس کا شو بھانڈا پھوڑ سکتا تھا۔

بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔

اب تو اسے نتائج کا انتظار تھا۔

ادھر نسرین گھر میں داخل ہوئی تو جیسے آپا اسی کے انتظار میں تھیں۔ گو نسرین آپا ہی کی بیٹی تھی مگر یا کو دل سے پسند کرتی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ آپا کی انا کی خاطر نیّا کی زندگی برباد ہو جاتے۔ آپا نے ہی بے چینی سے پوچھا۔

"کیا خبر لائی ہو؟"

"سب ٹھیک ہے آپا۔" یہ کہہ کر نسرین اپنے بچّوں کے ساتھ لگ گئی۔

"اے وہ تو مجھے بھی پتہ ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ میں جو سننا چاہتی ہوں وہ کیوں نہیں تی۔"

"ذرا صبر کریں آپا میں بچّوں کو کھانا کھلا کر سُلا دوں پھر آپ سے باتیں کروں گی۔"

تو کوئی خاص بات ہے۔ آپا نے دل میں سوچا۔ دِل پہ صبر کی سِل رکھ کر وہ گویا ایک ایک پل نے لگیں۔ رات کو نسرین آپا کی پائنتی آ کر بیٹھ گئی اور بڑی آہستگی سے کہنا شروع کیا۔

"آپا آپ اب ذرا اپنے خیالات اور رویّہ بدلیں۔"

"کیوں؟ میرے خیالات اور رویّے کو یکایک کیا ہوا ہے۔" آپا جھلّا کر بولیں۔ وہ یہ تو ہرگز ین سے سننا نہیں چاہتی تھیں۔

"دیکھیں نا! نیّا بھی آخر ایک عورت ہے۔ اُس کا بھی دل چاہتا ہو گا اس کا ایک گھر ہو، بچّے ہوں۔"

"بچّے دینا نہ دینا تو خدا کے اختیار میں ہے، باقی رہا گھر۔ تو اگر وہ اس گھر کو اپنا گھر نہ سمجھے تو میں کیا لتی ہوں۔"

"آپا آپ جانتی ہیں۔ دو مرتبہ اس کے ساتھ ٹریجڈی ہوتی ہے۔ اب وہ دل برداشتہ ہو گئی ہے ستا رہ جائے تو پھر اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے لئے ہر قسم کی احتیاطی تدابیر کرے یا جو بھی طرزِ عمل ختیار کرے۔"

"کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ میرے پلّے تو خاک نہیں پڑا۔"

"آپا بھولی سی بات ہے۔ اگر آپ دل سے غصّہ نکال کر سنیں تو میں سناؤں۔"

"اے میں نے غصّے کے مرتبان بھر کے دل میں رکھے ہوتے ہیں۔ چلی ہے نیا کو لینے"

"نہیں آپا، آپ کی عادت ہے کہ آپ پوری بات سُنے بغیر ہی فیصلہ صادر کر دیتی ہیں"

"لے میں چپ کر جاتی ہوں تو ہی سنا لے اپنی بات"

"آپا، بات دراصل یہ ہے کہ نیا کا بچّہ ہونے والا ہے"

"ہیں" آپا نے اس قدر تعجب سے کہا جیسے اُن کے سر پر بم آ گرا ہو۔

"ہاں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ نیا بھی چاہتی ہے اس کا بچّہ ہو۔ ڈاکٹر نے بتائی ہے۔ اس لئے وہ اپنے میکے میں رک گئی ہے"

"اور اگر مجھے بتا دیتی تو کیا میں ڈائن بن کر اسے چبا جاتی"

"اچھا اگر اس نے نہیں بتایا تو آپ ہی مصلحتاً خاموشی اختیار کر لیں"

"اے میں تو مہینوں سے خاموش ہوں میرا کیا پوچھتی ہو"

"حمل کے دوران اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں سیڑھیاں بھی زیادہ ہیں اور مرتبہ کام کرنے کے قابل بھی نہیں ہے"

"ہاں ہاں جن لوگوں کے کئی کئی منزلہ گھر ہوتے ہیں وہ تو شاید بچّہ پیدا ہی نہیں کرتے ہیں میں چلے جاتے ہیں"

"خیر آپا آپ اس بحث میں نہ پڑیں تو اچھا ہے"

"میں اس بحث نہ پڑوں، میں بات نہ کروں، میں خاموش رہوں۔ تم لوگ میرا گلا کیوں نہیں دبا دیتے یا مجھے اس گھر سے دفعان کیوں نہیں کر دیتے"

نسرین خاموش ہو گئی۔ وہ جانتی تھی اس کی ماں بکے گی۔ جھکے گی، واویلا کرے گی اور پھر دھو کر خاموش ہو جائے۔

"کیا شہباز کو اس بات کا پتہ ہے؟"

"ہاں انہیں تو پہلے دن سے پتہ ہے"

"پھر اُس گھنّے نے مجھے کیوں نہیں بتایا"

"شرم آتی ہو گی"

"ہاں ہاں ماں کے سامنے زبان چلانے سے تو شرم نہیں آتی۔ جھوٹ بولنے سے شرم نہیں آتی۔ سچ کہتے ہوئے ضرور شرم آتی ہو گی اُس حرافہ نے کچھ گھول کر پلا دیا ہے میرے بیٹے کو۔ یہ تو ایسا نہیں تھا"

"آپا اب آپ بھتیا سے کچھ بھی نہ کہیں اس طرح بات بڑھ جائے گی"

"کیا کروں اور کیا نہ کروں یہ سب مجھے پڑھاتی جا۔ کیونکہ میں تو باؤلی ہوں کہیں تیرے جانے کے بعد لوگوں کو کاٹتی نہ پھروں"

نسرین نے نظریں اٹھا کر دیکھا آپا کا موڈ سخت خراب تھا۔ چہرہ غصّے سے پھولا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

نسرین آپا کی کیفیت کا خوب اندازہ لگا رہی تھی اس لئے اس وقت یہاں سے اُٹھ جانے میں ہی اس نے عافیت سمجھی۔

اور وہ آپا کے ہاں رہی اور برابر آپا کو نیا کے بارے میں ہموار کرتی رہی۔ آپا نے نسرین کی مجبوری میں نہ تو زبان کھولی اور نہ اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

جس دن نسرین گئی اس دن شام کو شہباز ذرا دیر سے آیا۔ کیونکہ دفتر سے اُٹھ کر وہ نیا کے ہاں چلا گیا تھا۔ وہاں نیا اس سے بار بار پوچھ رہی تھی۔

"آپا خفا تو نہیں ہیں۔ انہوں نے کچھ کہا تو نہیں؟"

"کچھ بھی تو نہیں کہا۔ تم ناحق وہم میں گھلی جا رہی ہو" شہباز نے اسے کہا تھا۔

"لیکن آپا اپنا غصّہ ضرور نکالیں گی۔ شاید نسرین باجی کی وجہ سے چُپ ہیں" نیا نے کہا تھا۔

نیا کے سب واہموں کو احمقانہ قرار دے کر شہباز چلا آیا تھا۔

اگر وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہی تھا کہ آپا وارد ہوئیں۔

"اچھا تو تو اب اپنی ماں سے بھی جھوٹ بولنے لگا ہے۔"

"جھوٹ۔" شہباز نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "کیسا جھوٹ آپا؟"

"تجھے تیری بیوی نے اپنے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔"

"جی آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"تو سب سمجھ رہا ہے میں جو کہہ رہی ہوں۔ صد افسوس اپنی اولاد پر۔ میں تجھے اتنا گرا ہوا سمجھتی تھی۔"

شہباز خاموش ہو گیا۔

"اگر تو مجھے نیا کے وہاں رہنے کی وجہ بتا دیتا تو میں ناحق پریشان نہ ہوتی۔" آپا نے ذرا توقف کر کے مناسب سمجھا کیونکہ پہلے سب واراد چھپے پڑ چکے تھے۔

شہباز پھر بھی چپ بیٹھا رہا۔

"یہ تو میرے لئے بھی خوشی کی بات ہے۔ آخر مجھ سے چھپانے کا مطلب۔ میرا دل بھی اس گھر میں تیرا بچہ کھیلتا نظر آتے۔"

شہباز کچھ نہیں بولا۔ وہ آپا کے تمام داؤ پیچ جانتا تھا اور پھر اسے یہ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا کہے۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ جانے آپا کون سی بات سے چوٹ کھا کیا کہہ بیٹھیں۔

"بہت دن ہو گئے ہیں۔ بیوی کو گھر سے گئے۔ اب تو لوگ بھی باتیں بنانے لگے ہیں۔ محلے کوے آخیر سے چار مہینے تو گزر ہی گئے ہیں۔ اب خطرے کا وقت نہیں رہا۔" انہوں نے پیار سے کہا کہ شہباز نے ایک بار تو بے اعتباری سے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا۔ پھر سر جھکا کر بولا۔

"میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہوں گا آپا۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے اپنی مرضی سے جائے گی۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے وہ تجھ سے اجازت لے کر نہیں گئی۔ لیکن چھوڑ اب پچھلی باتوں کو۔

وہ ہے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ جا آج اسے لے آ۔"

"آپا میں نہیں جاؤں گا۔" شہباز نے بات ختم کر دی۔

"آپا میں نہیں جاتے گا۔" آپا نے ایسے کہا جیسے انہیں ہر دیسے تو روز چلا جاتا ہے۔ ماں کے کہنے پہ نہیں جائے گا۔

ت کی خبر ہے۔

"وہ تیرے ساتھ نہیں آتے گی۔"

"وہ تیرے ساتھ نہیں آتے گی۔"

"کیسے نہیں آتے گی تو اس کا شوہر ہے یا وہ تیری شوہر ہے۔"

"آپا اگر آپ اسے بلانا چاہتی ہیں تو خود لے آئیں جا کر۔"

یہ بات شہباز نے کہہ تو دی مگر اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آپا تو شاید اسی بات کا مانہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اگر وہ سچ مچ چلی گئیں اور نیا مارے لحاظ کے ان کے ساتھ آ گئی تو کیا ہو گا؟ اس جہنم میں وہ کہاں سکون سے رہ سکے گی۔ آپا گن گن کے اس سے بدلے لیں گی اور پھر ہی ہو گا۔۔۔۔ وہی۔۔۔۔۔

شہباز لرز گیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

شاید آپا بھی یہی چاہتی تھیں کہ شہباز خود انہیں جانے کے لئے کہے مگر بظاہر شہباز کی بات سن کر کھڑی ہو گئیں اور بولیں۔

"مجھ میں اتنی ہمت کہاں ہے کہ جاؤں۔ صحت کہیں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر آجکل کی بہو میں لحاظ مروت تو کچھ ہے نہیں۔ یونہی جا کر اپنی بے عزتی کروا دوں گی۔"

شہباز کو یہ سن کر خوشی ہوئی۔ لیکن جاتے جاتے آپا نے دبی زبان میں اتنا کہا "دیکھو گی کسی دن۔ اب تیری خاطر کچھ تو کرنا پڑے گا۔"

دوسرے دن جب شہباز نیا سے ملنے گیا تو اس نے اسے آپا کے ارادوں سے آگاہ کر دیا۔ نیا کو پہلے ہی خطرے کی بو آ رہی تھی۔ اس نے جب امی جان سے مشورہ کیا تو وہ بولیں۔

"تمہارے اپنے معاملے ہیں۔ تم خود فیصلہ کرو۔"

نیا نے آپا کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو ایک دم کھڑی ہو گئی گو اس کا دل دھڑکنے لگا اس کی چھٹی حس نے اسے لال جھنڈی دکھا دی تھی مگر اس کا چہرہ پُرسکون تھا بلکہ اس نے چہرے پر کافی بشاشت پیدا کر لی تھی۔ آپا کے استقبال کو یوں آگے بڑھی جیسے بے چینی سے منتظر ہو۔ آپا بھی چادر لٹکاتی ہوئی یوں آ کر اس کے گلے سے لگیں جیسے مدتوں کی پیاس بجھ

"آئیں بیٹھیں۔" نیا نے آپا کو بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا "کیا حال ہے آپ کا۔ آپ کمزور لگ رہی ہیں۔"

"اے میری بات چھوڑ، کچھ اپنی سُنا دیکھ تو کیسی سرسوں جیسی رنگت نکل آئی ہے، ہونٹ پڑ گئے ہیں۔ کیسی طبیعت ہے تیری۔"

نیا نے نظریں جھکا لیں۔

"جب سے تیری طبیعت کا سُنا تھا ایک پل چین نہیں آ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اُڑ کر پاس جاؤں۔ اس کی بلائیں لوں۔"

"آپا میں بھی آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔"

"اے بس رہنے دے دیکھ لی ہے تیری محبت۔"

نیا کو دل میں ہنسی آئی اب باقاعدہ ڈرامہ ہو رہا ہے۔ یہ نیا بھی جانتی تھی اور شاید آپا بھی۔

"کہاں ہے تیری اماں؟" انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

نیا نے باہر نکل کر امی کو آواز دی اور انہیں بتایا بھی کہ آپا آئی ہیں۔ پر تکلف چائے منگوائیں۔ نیا آ کر بیٹھی تو اس کے پیچھے امی بھی ہاتھ پونچھتے ہوئے آ گئیں۔

"بسم اللہ آج تو میری سمدھن آتی ہیں۔" انہوں نے آپا کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم کون سی میری خبر لیتی ہو۔ بس منہ دیکھا اور بسم اللہ پڑھ دی۔"

"دل میں تو آپ کو بہت یاد کرتی ہوں۔"

"یہ موئے دل کی یادیں بھی کبھی کسی کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔"

"جب سے نیا آئی ہے روز ہی آپ کا ذکر رہتا ہے۔"

"اے بہن! نیا کے آجانے سے تو میرا گھر ہی سُونا ہو گیا ہے۔ لونگوڑی عقل آپ کو مبارک ہو تے بہت بہن، بیٹی کی گود ہری ہو گئی۔"

"مبارک تو آپ کو ہو آپا۔ آپ کے گھر میں اُجالا ہونے والا ہے۔"

"بے شک بے شک۔ جب سے میں نے سُنا ہے دعائیں مانگتے نہیں تھکتی۔ مسجد میں گھی کے چراغ جلاتے ہیں۔ مسکینوں کو کھانا کھلایا ہے، سو سو منتیں مانی ہیں کہ میری بہو خیریت سے فارغ ہو کر گھر آئے۔"

"آمین!" امی نے کہا۔

"لیکن بہن ایک شکوہ ہے مجھے تم سے۔ مجھ سے کیوں چھپایا۔ کیا میں دشمن تھی؟"

"آپا! یہ آپ اپنی بہو اور بیٹے سے پوچھیں میں کچھ نہیں جانتی۔" یہ کہہ کر امی کھڑی ہو گئیں۔ "ذرا میں چائے لے آؤں۔"

جب امی باہر نکل گئیں تو آپا نے اپنی آنکھوں میں ساری کرختگی اور سختی سمو کر کہا۔

"دیکھو بہو! میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ تم نے بن بتائے یہاں آ کر ہمیں بہت بدنام کیا ہے۔ سب

لوگ پوچھتے ہیں آپ کی بہو کہاں چلی گئی۔ اب تم نے اپنی ضد پوری کر لی ہے۔ آج ہی
کے جاؤں گی۔"

نیا کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ آپا کا لب و لہجہ ان کے ارادوں کی چغلی کھا
"میں ابھی نہیں جاؤں گی آپا۔" نیا نے دھیرج سے کہا۔

"کیوں؟" آپا غرّائیں۔ "کیا ہم آدم خور ہیں؟"

"آپا میں فراغت کے بعد ہی آؤں گی۔ آپ لوگوں سے کہہ دیں ویسے بھی پہلے بچے کی
عام طور پر میکے میں ہی ہوتی ہے۔"

"تم تھوڑے دنوں کے لئے چلو۔ قاعدے کے مطابق جب آٹھواں شروع ہوگا تو
"اچھا میں سوچوں گی۔" نیا نے مصلحتاً کہا۔

"سوچنے کا موقع نہیں ہے۔ تمہیں آج ابھی اسی وقت میرے ساتھ جانا ہوگا۔"

"آپا مجھے افسوس ہے۔"

"اے یہ افسوس زندگی بھر کا بن جائے گا پھر ہاتھ مل کر روتی رہنا۔"

نہ جانے نیا کو کیا ہوا وہ ایک دم پتھر کی عورت بن گئی۔ اس نے چٹان پر ہاتھ رکھ دیا اور
فیصلہ کر لیا کہ آپا جو سوچ کر آئی ہیں وہ اس مرتبہ نہیں ہوگا۔ ہرگز نہیں ہوگا۔ اسے چپ دیکھ کر
بولیں۔

"یاد رکھو زندگی بھر پچھتانا پڑے گا، آج اگر تم نے مجھے خالی ہاتھ لوٹا دیا تو اس گھر کے دروا
تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے زندگی بھر تم وہاں نہ آسکو گی۔"

نیا کو بھی غصہ آگیا۔ وہ جانتی تھی کہ آپا ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنی بات منوانے کی
آج اس کو پھر نیچا دکھانا چاہتی ہیں۔ پھر وہی صورتِ حال پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ اس کو معلوم تھا
اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔

لیکن اب۔ اس کا جگر گوشہ اس کے پیٹ میں تھا۔ وہ جب پیٹ میں اس کی حرکت

تو ماتا کے جذبات سے چھلک چھلک جاتی اپنے بچے کو گود میں لینے کی خاطر وہ ہر قسم کا رسک
نے کو تیار تھی۔ آپا کی کوئی دھمکی اس پر اثر نہیں کر رہی تھی۔

"سوچ لو۔" آپا نے اسے گم صم دیکھ کر کہا۔ "اب" میں تمہیں عزت و آبرو کے ساتھ لے جا رہی
ں لیکن اگر تم نے میری بات رد کر دی تو زندگی بھر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر روؤ گی۔"

اسی وقت امّی چائے لئے اندر داخل ہوئیں۔

آپا کا موڈ ایک دم بدل گیا۔

چہرہ ہی بدل گیا۔

"اے بہن تم کیوں تکلیف کر رہی ہو۔ میں تو ذرا سی دیر کو آئی تھی۔ چائے وائے سے مجھے کوئی
رغبت نہیں۔ اور تم اتنی مٹھائیاں لے آئی ہو۔ میں نے تو میٹھا کھانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اے رہنے دو۔"

"بہن کچھ تو لیجئے۔ آپ کا تو آنا ہی ہمارے لیے باعثِ برکت ہے۔" یہ کہہ کر امّی نے مٹھائی
کی پلیٹ ان کے آگے بڑھائی۔

گم صم سی نیا نے بھی جلدی سے اپنا موڈ ٹھیک کیا اور چائے بنانے لگی۔ نیا کو معلوم تھا کہ آپا
کھانے پینے کی بہت شوقین ہیں۔ نہ نہ بھی کرتی جائیں گی اور کھاتی بھی جائیں گی۔ وہی ہوا۔ پلیٹ
بھر کے انہوں نے کھایا، چائے پی اور ایک بڑی سی ڈکار لینے کے بعد انھیں یاد آیا کہ ان کی تو
طبیعت خراب رہتی ہے۔

نیا کا چہرہ دیکھتے ہی امّی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آپا نے کچھ کہا ہے نیا سے۔ مگر بظاہر وہ بھی انجان
بن کر ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتی رہیں۔

"تم بھی کچھ کھا لو نیا۔" امّی نے کہا تو نیا چونک گئی۔

"نہیں امّی مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"کچھ کھا لیا کرو بیٹی۔ آج کل تم دودھ زیادہ پیا کرو، ہر گھنٹے بعد ایک گلاس پیا کرو۔" آپا نے اتنی
کارڈ سے کہا جیسے کچھ دیر پہلے ذرا بھی نہیں دھمکا رہی تھیں۔ "میں صدقے جاؤں میں واری جاؤں

میری بچی کس قدر کمزور ہو گئی ہے۔"

نیا سوگواری سے ذرا مسکرائی۔

"اچھا اب میں چلوں۔" آپا نے اتنا ہی کہا مگر نہ اُٹھ کر کھڑی ہوتیں اور نہ چادر سنبھالی۔

نیا اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے کھانا کھا کر جایئے گا۔"

"رات کا کھانا تو میں نے کب کا چھوڑ رکھا ہے۔ اب کیا بیٹھوں گی۔"

امی نے جلدی سے برتن اٹھائے اور باہر کو لپکیں تاکہ ان کے جانے سے پہلے برتن

کر آجائیں۔ امی کے باہر نکلتے ہی جیسے آپا غرّانے لگیں۔ "جلدی فیصلہ کر دو نیا اگر تم جانا چاہتی

کچھ دیر اور بیٹھ جاؤں گی۔ تم جا کر اپنا سامان اکٹھا کر لو۔"

"اس وقت میں نہیں جا سکتی آپا۔ بعد میں آجاؤں گی۔"

"بعد میں بھی آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" آپا چادر اٹھا کر کھڑی ہو گئیں۔ "اب تمہاری

میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں خود تمہیں لینے آئی تھی۔ مگر آج تم نے اپنی قسمت کو خود لات مار

تم ایک بدنصیب عورت ہو۔"

نیا چپ بیٹھی رہی۔

"یہ نہ سمجھنا کہ شہباز تمہیں لینے آئے گا۔ اب تمہیں کوئی لینے نہیں آئے گا۔ اپنی ماں

ہی اپنی قبر بنوا لینا۔"

نیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے آپا جلدی سے باہر نکل آئیں۔

"چل دیں آپا ذرا رُک تو جائیں۔" امی بھاگ کر آ گئیں۔ "میں کوئی سواری ہی منگوا دیتی۔"

"اتنی ہمت ہے مجھ میں کہ خود سڑک پر جا کر سواری روک لوں۔"

"یکایک آپا کا موڈ کیوں خراب ہو گیا؟" یہ سوچتے ہوئے امی اور قریب آ گئیں۔

"اب کہنے سننے کو کیا رہ گیا ہے مگر میں تو خدا لگتی کہوں گی اپنی بیٹی کی تربیت ٹھیک نہیں

تم نے۔ اب زندگی بھر اسے گھٹنے سے لگا کے بٹھائے رکھو۔" یہ کہہ کر آپا باہر نکل گئیں۔

امی حیران و ششدر کھڑی رہ گئیں۔

اندر جا کر دیکھا تو نیا زار و قطار رو رہی تھی۔

"کیا بات ہے نیا تمہاری ساس معمّہ بن کر آئی اور پہیلی بن کر چلی گئی۔ آخر بات کیا ہوئی ہے؟"

پہلے تو نیا روتی رہی پھر آنسو صاف کر کے ساری بات امی کو بتا دی۔

امی کو کافی اچنبھا ہوا۔

"اب کیا ہو گا نیا؟" بالآخر انہوں نے نیا سے پوچھا۔

"جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔"

"حالات کچھ زیادہ خراب نہ ہو جائیں۔"

"جس قدر خراب ہونے تھے ہو چکے۔"

"کچھ دنوں کے لئے چلی ہی جاتیں۔"

"واہ امی۔ آپ مجھے پھانسی کیوں نہیں دے دیتیں۔ وہ جس مقصد کے لئے مجھے لینے آئی تھیں

پتہ نہیں جانتیں۔ ورنہ اس طرح ان کی مامتا نہیں چھلکتی۔"

"وہ تو میں جانتی ہوں۔"

"بس پھر اللہ ہی پر چھوڑ دیں۔ میری قسمت کا لکھا میرے آگے آئے گا۔"

شام کو جب شہباز آیا تو نیا بڑی ملول سی بیٹھی تھی۔ آج اس نے اسے اتنا افسردہ دیکھا تو کریدکریدکر

پوچھا۔ تب نیا نے ساری باتیں اسے کہہ سنائیں۔ شہباز بھی دفتر سے اٹھ کر سیدھا اس طرف آ رہا تھا

اس لئے اس کی آپا سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی ورنہ ان باتوں کا اسے گھر میں ہی علم ہو جاتا۔

"جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو دھمکوں سے کیوں ڈرتی ہو؟"

"میں ڈرتی نہیں۔ مجھے معلوم تھا کوئی نہ کوئی بدمزگی ضرور ہو گی۔ خوف تو اس بات کا ہے کہ کہیں

پھر تم مجھ سے بدظن ہو جاؤ۔"

"میں۔؟" شہباز ہنس پڑا۔ "خیر میرے بارے میں تو تم قیامت تک بھی ایسا نہ سوچنا۔"

"آپ ہی کے سہارے پر میں زندگی کے یہ کٹھن ترین دن کاٹ رہی ہوں۔ آپ جانتے ہیں اس بچے کے علاوہ کوئی بات میرے پیشِ نظر نہیں ہے۔ مگر آپا مجھے بے سکون کر گئی ہیں۔"

"تم اپنے آپ کو بے سکون نہ کرو ریتا میں آپا کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

"اب جبکہ وہ مجھے دھمکا کر گئی ہیں۔ میں بالکل وہاں نہیں جا سکتی۔ ویسے بھی میرا دل اتنا کمزور ہے کہ ذرا کوئی اونچی آواز میں بولے مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے۔"

"تم اپنے آپ کو سنبھالو اور بہتری کی امید رکھو۔"

اس روز شہباز خلافِ معمول کافی دیر تک بیٹھا رہا اور ریتا کو تسلیاں دیتا رہا۔ اسے گھر پہنچنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ دل میں ڈر رہا تھا۔ آج اسے یقین تھا کہ آپا اس کے لتے لیں گی۔

لیکن عجیب بات ہوئی۔ آپا نے کچھ نہیں کہا۔ یوں انجان بن کر بیٹھی رہیں جیسے آج کچھ بھی نہ ہوا۔ حالانکہ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ شہباز ریتا کے ہاں گیا ہو گا۔ کئی بار شہباز جان بوجھ کر ان کے قریب سے گزرا بھی مگر انہوں نے بالکل شہباز کا نوٹس نہیں لیا بلکہ رات کا کھانا اتنے پیار سے کھلایا کہ شہباز کو خوف سا آنے لگا۔

آپا کو جب ٹوٹ ٹوٹ کر پیار آیا کرتا تھا تو سمجھ لو کہ کوئی خطرناک منصوبہ ان کے ذہن میں آ گیا۔ تاہم شہباز نے خود کوئی ذکر نہیں چھیڑا بلکہ سکون سے سو گیا۔ کچھ دن سکون سے گزر گئے۔ شہباز اسی روز ریتا کے ہاں جاتا رہا۔

جب دونوں کو تسلی ہو گئی کہ آپا اپنی ہار مان چکی ہیں تو ایک دن آپا نے یوں سر اٹھایا جیسے طوفان اٹھاتا ہے۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟" انہوں نے خونخوار نظروں سے شہباز کو دیکھ کر پوچھا۔

"جی وہ۔۔۔۔"

ہاں میں جانتی ہوں تو دفتر سے اٹھ کر روزانہ اس حرام زادی کے پاس جاتا ہے۔ مجھے سب

تجھے آج کل کتنا سکھا رہی ہے۔ اس نے تو میرے سفید چونڈے پر بھی تھوک دیا ہے صاف انکار کر دیا تھا میرے ساتھ آنے سے۔ آنکھیں کھول۔ ہوش کے ناخن لے۔ میں اس مُردار کو اچھی طرح جانتی ہوں۔"

تو اب تابڑ توڑ حملے ہوں گے۔

شہباز جا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

"سب اتا پتہ کر لیا ہے میں نے اس بدبخت کا۔ تیری آنکھوں میں دھول جھونک سکتی ہے میری آنکھوں میں نہیں۔ مجھے تو شروع سے ہی اس کے لچھن ٹھیک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ محلے میں بھی اس کی ہوا ٹھیک نہیں تھی اور اب تصدیق بھی ہو گئی ہے۔"

شہباز کو بالکل سمجھ نہیں آیا کہ آپا کیا کہنا چاہتی ہیں یا کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ حیران سا ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگا۔

"یہ تو بچپن ہی سے عشق و عاشقی کے کھیل کھیلتی آتی ہے۔"

"آپا!"

"ہاں ہاں تجھے تو آگ لگے گی اور بھی آگ لگے گی جب میں کہوں گی وہ اپنا گناہ چھپانے کے لئے میکے میں منہ چھپاتے بیٹھی ہے۔"

"آپا!" شہباز چیخ اٹھا۔ "کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ ذرا آہستہ بولیں۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے ہم اتنے گر گئے ہیں۔"

"ہاں ہاں ہمی کو کہیں گے ہم گر گئے ہیں۔ اس گشتی کو کچھ نہیں کہیں گے۔"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ نے کچھ سوچا بھی ہے؟"

سب سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں اور اپنے ہوش و حواس میں کہہ رہی ہوں۔"

"آپا آپ اپنے حواسوں میں نہیں ہیں۔ مخالفت میں آدمی کو اتنا نہیں گرنا چاہیئے۔" یہ کہہ کر شہباز نیچے اتر گیا۔

آپا کو تو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ اپنی بیوی کی خاطر وہ آپا کو اتنی بڑی بات کہہ گیا اُس کے جانے کے بعد آپا بھی خوب بولیں۔ خوب چلائیں جس جس گھر میں آواز گئی وہاں کہ باہر آگیا۔

یوں یہ بات سارے محلے میں پھیل گئی۔

آپا بھی یہی چاہتی تھیں گو لوگ نیا کے بارے میں ایسی بات ماننے کو تیار نہ تھے زبان ہلانے کی مجال کسی میں نہ تھی۔ آپا نے یہ وطیرہ بنالیا کہ گھر گھر جا کر اپنی بہو کی بدچلنی کی داستان کرنی شروع کر دیں۔

کچھ لوگوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

کچھ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

کچھ نے زمانے کو بُرا بھلا کہا۔

یوں یہ ایک ایسا دلچسپ قصہ بن گیا جو ہر گھر میں کھانے کی میز پر سنایا جانے لگا۔ لوگ اس کے منتظر تھے کہ نیا منظر پر آئے اور اپنی صفائی میں کچھ کہے۔

نیا بے چاری کو کیا خبر کہ تقدیر ایک نئی چال چل رہی ہے۔ وہ تو گزرتے وقت کے ساتھ آگے اور آگے جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اس سُست روی سے وہ تنگ آجاتی اور اس کا دل چاہتا کہ وہ وقت سے آگے نکل جائے۔ دوڑ لگا لے۔ بگٹٹ بھاگے۔ پتہ نہیں ایسے عالم میں وقت آگے کھڑا کیوں ہے۔ ایک تو یوں زندگی بوجھل ہوئی پڑی تھی کہ ایک ایک قدم من من کا ہو رہا تھا۔ اس پر اٹھتے بیٹھتے عجیب سے ہول آتے تھے۔ واہمے ستاتے تھے۔ اپنے دل کے ٹکڑے کو مجسم دیکھنے کا خیال ہی ہیجان طاری کر دیتا۔ خدا معلوم یہ سب دیکھنا اس کی قسمت میں ہے بھی یا نہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو گا بھی بچے کے آخری مراحل تک پہنچتے پہنچتے عورت اتنی رقیق القلب اور اعصابی طور پر کمزور ہو جاتی ہے کہ اپنی زندگی اسے داؤ پر لگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پھر نیا کا تجربہ تو بالکل پہلا اور نیا تھا۔ درد اور کرب کا ایک دریا تھا، بچہ حاصل کرنے کے لئے جسے پار کرنا تھا۔ لوگ اسے بہت

تسلیاں دیتے تھے۔ جب وہ گھبرا جاتی تو چاہتی کہ حشر کا وقت جلدی سے آجائے جتنی جلدی ممکن ہو وہ پل صراط سے گزر جاتے۔ جو بھی ہونا ہے وہ ہو جائے۔ بس بچہ اس کی گود میں آجائے۔ ان وسوسوں میں وہ باقی سب غم بھلائے بیٹھی تھی۔ شہباز بھی اسے تسلیاں دیا کرتا تھا۔ یوں وہ چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہتی تھی۔

اسی طرح ایک دن بیٹھی ننھی منی فراکیں سی رہی تھی کہ ان کی ایک ہمسائی آگئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ ذرا نیا کے قریب ہو کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"بھئی تمہارے سُسرالی گھر کے قریب ہماری ایک رشتے کی بہن رہتی ہیں۔"

"اچھا کس نمبر میں رہتی ہیں؟"

نیا نے بتایا۔

"اچھا۔"

"ہاں وہ تو ہمارے گھر سے بس ایک فرلانگ ہی ہو گا۔"

"کبھی کبھی مجھے ملنے آتی ہیں۔ تمہاری ساس کو اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"اس اچھی طرح" والی بات پر نیا ذرا سا مسکرائی۔

"اب آئیں تو انہیں میرے پاس ضرور لائیں۔"

"وہ تو خود آنا چاہ رہی تھی مگر میں نے ہی نہیں آنے دیا۔"

"کیوں؟"

"ایسے وہ کوئی الٹی سیدھی باتیں کر رہی تھی۔ میں نے سوچا تم سے کوئی الٹی سیدھی لگا جائے گی اور تم اس حالت میں کڑھتی رہو گی۔"

"نہیں۔" نیا ہنس کر بولی۔ "میں اتنی بزدل نہیں ہوں اور میں اپنی ساس کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ کیا کہہ سکتی ہیں کیا نہیں۔"

"اچھا۔" وہ حیرت سے نیا کا منہ دیکھتی رہی۔ "پھر تو تمہیں بھی معلوم ہو گا کہ انہوں نے آج کل تمہارے بارے میں کیا مشہور کر رکھا ہے۔"

"آج کل؟"

"ماں جب سے یہاں سے ہو کر گئی ہیں۔"

"نہیں مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم"۔ یہ کہتے وقت نیا کا رنگ اُڑ گیا۔

"اچھا پھر کچھ دنوں میں تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔"

"اچھی خالہ اب بتا بھی دیں۔"

"نہ بیٹی۔ ایسی بات میرے منہ سے نہیں نکلتی، آخر ہم بھی بیٹیوں والے ہیں۔"

"نہیں میں بُرا نہیں مانوں گی۔ میری ساس کچھ بھی کہہ سکتی ہیں ان سے کچھ بعید نہیں۔"

"اچھا بیٹی اب مجھے تو اجازت دو۔"

نیا نے ان کو پکڑ کر بٹھا لیا۔ "اب میں پوچھے بنا آپ کو جانے نہ دوں گی۔ آپ

اور بی ہمسائی نے جو کچھ سنا تھا من وعن نیا کو بتا دیا۔

تھوڑی دیر کے لئے نیا سُن ہو گئی۔ وہ آپا سے ہر گری ہوئی حرکت کی توقع کر سکتی تھی یہ سب سُن کر اس کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اس کا سرمایہ اس کی پاک دامنی ہی تو تھی۔

آخری وار آپا نے اِسی پر کیا۔

"وہ تو محلے میں گھر گھر میں جا کر کہتی ہیں ہماری بہو بدچلن ہے۔ اِسی لئے منہ چھپا کر ماں باپ کے گھر پڑی ہوتی ہے۔"

"کون، کون؟" امی اچانک صحن میں نکل آئیں اور تخت پر بیٹھتے ہوتے استفسار کیا۔

"اے میں تو اب چلوں۔" بی ہمسائی پھر کھڑی ہو گئی۔

"میں آتی ہوں اور تم اُٹھ کے جا رہی ہو۔ ذرا بیٹھو تو۔ اور یہ کیا قصہ سُنا رہی تھیں تم؟"

"بہن! میں تو اللہ سے سو سو بار معافی مانگتی ہوں۔ نیا مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح لگتی ہے۔ میں نے جو کچھ سُنا تھا وہی بتایا ہے۔"

"کیا سنا تھا ذرا مجھے بھی بتا دو۔"

توبہ توبہ کرنے کے باوجود بی ہمسائی نے پھر ساری بات مزے لے لے کر امی جان کو سنا دی۔

امی جان کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے گلے میں رسّہ ڈال کے انہیں کھینچا ہو اور وہ ایک جان کنی کی کیفیت میں ہوں۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر امی بولیں۔

"تو یہ بات سارے محلے میں مشہور ہو گئی ہے؟"

"ان کے محلے میں ہی نہیں۔ بلکہ یہ بات تو ہمارے محلے میں بھی پھیل گئی ہے۔"

"تعجب ہے۔" امی نے کہا۔ "اور ہمیں کچھ علم ہی نہیں۔"

"بہن! میری عادت نہیں لگائی بجھائی کرنے کی اور میں قسم کھاتی ہوں جو میں نے خود سے کسی سے کہی ہو۔ آج بھی نیا نے مجبور کیا تو اصل بات بتا دی کہ کہیں تم ماں بیٹی لاعلمی میں نہ ماری جاؤ۔"

"بھلا ہو تمہارا بہن تم نے اتنا تو سوچا۔" امی نے سوگواری سے کہا۔

"ہم تو نیا کو بچپن سے جانتے ہیں۔ ہمارے سامنے پل کر جوان ہوئی۔ آج تک اس کی کوئی بات سنی نہ دیکھی۔ توبہ توبہ اس محلے میں اور بھی جوان لڑکیاں ہیں۔ ایسے ایسے قصّے روز سنتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اب تو لڑکیوں کو شرم ہے نہ حیا۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ ہی ختم ہو گیا۔ پہلے لڑکی جوان ہو کر چھپ جاتی تھی۔ اب جوان ہوتے ہی اعلان کرتی ہے۔ کوئی نہ کوئی افواہ نکلتی ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ فلاں لڑکی جوان ہو گئی ہے۔"

امی حسب عادت گم صُم ہو گئی تھیں اور نیا فراک کی تُرپائی میں کھو گئی تھی۔ وہی سوئی جو پہلے تیز تیز چل رہی تھی اب سُست ہو گئی تھی۔ نیا کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا دل بیٹھا جا رہا ہے۔

"ہاں وہ شیدا ہے ناکم بخت۔ زمانہ گزرا ایک بار اُس نے مجھے بتایا تھا کہ نیا بی بی سامنے والے لڑکے کے بارے میں کُرید کُرید کر پوچھ رہی تھی۔

خدا گواہ ہے بہن! میں نے تب بھی اس بات کا یقین نہیں کیا تھا۔"

اچانک نیا کی سوئی اس کی اپنی پور میں لگ گئی اور سُرخ سُرخ خون کا ایک جلد باز سا قطرہ یوں

پور پہ آکر بیٹھ گیا۔ جیسے چوزہ انڈے سے نکل آتا ہے۔ نیا نے سوئی ہاتھ سے چھوڑ دی اور انگلی دبا کر خون نکالنے لگی۔ امی نے یہ بات سنتے ہی تصدیق طلب نظروں سے نیا کی جانب دیکھا نہیں دیکھ رہی تھی اس قطرہ قطرہ نکلتے خون کو دیکھ رہی تھی۔

"اے سُنا تم نے۔ اس بدبخت شیداں کا قصہ بھی سُن تو" بی ہمسائی نے جلدی سے بات خاطر کہا۔ "جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش اور وہ ہیں نا؟ وہ سردار صاحب۔ ان کے خانساماں بھاگ گئی ہے۔ بس ان چنڈالوں کو اچھا کھانے کو ملے تو ان کا نفس خراب ہو جاتا ہے۔"

امی جان اب کوئی بات دلچسپی نہیں سُن رہی تھیں۔ انہیں افواہوں سے ویسے بھی دلچسپی لیکن اب جو باتوں باتوں میں بی ہمسائی نے ایک برچھی اُن کے کلیجے کے پار اُتاری تھی تو اس کا جی اُلٹ پلٹ ہو رہا تھا۔

اور نیا سوچ رہی تھی۔

اک ذرا سی سوئی چبھی تھی۔ یہ لہو قطار اندر قطار نکلا چلا آ رہا ہے۔ میرا دوش کون سا پارینہ۔ وہ بچپن کی اک لغزش، کیا اس افسانے کا عنوان بننے جا رہی ہے۔ کس قدر ظلم ہو گا یہ اور بی ہمسائی جانے اور کس کس کو بتائیں گی اور جو جنیل آپا کے کانوں تک پہنچ گئی تو پھر ان کی ہر بات ہو جائے گی۔ ان دونوں کو اپنے اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں دیکھ کر بی ہمسائی نے اُٹھ جانے عافیت جانی۔ "اچھا اب میں چلتی ہوں۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ بہن!" امی بھی کھڑی ہو گئیں۔

"میری طرف سے کوئی اندیشہ دل میں نہ لانا نیا کی امی!" اس نے محبت سے کہا۔ "میں جان سنتی ہوں وہیں چھوڑ دیتی ہوں۔ نیا تو مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہے۔"

ویسے یہ بات امی جان بڑی اچھی جانتی تھیں کہ محلے کی ہر نئی بات ہمیشہ ان خاتون کے گھر ہی نکلی۔ بہرحال اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔

واپس آئیں تو نیا نے سلائی کا سارا سامان سمیٹ دیا تھا اور اندر جا رہی تھی اس کی صورت

امی جان کو اس کے دلی کرب کا اندازہ ہو گیا۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں آ گئیں اور بولیں۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا نیا۔ تمہاری ساس نے تم پر رکیک الزام لگانے شروع کر دیئے ہیں۔"

"یہ سب میری تقدیر کا لکھا ہے امی۔" نیا رونے لگی۔ "میں ہوں ہی بدقسمت۔ کہاں تک اپنی قسمت سے لڑوں گی۔"

"یوں اپنی قسمت کو نہ کوسو۔ کوئی تدبیر سوچو۔"

"موت کے آگے کوئی تدبیر چل سکتی ہے مگر آپا کے آگے کوئی تدبیر نہیں چل سکتی۔" نیا اور شدت سے رونے لگی۔

"رو رو کر اپنی طبیعت خراب نہ کرو۔ دن بہت قریب ہیں۔ ایسا نہ ہو تمہاری طبیعت زیادہ بگڑ جائے۔"

"بس اب مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ کسی کی پرواہ نہیں۔ مجھے بچہ بھی نہیں چاہیئے۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔"

امی نیا کے پلنگ پر بیٹھ گئیں اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا۔ نیا بھی جی بھر کر روتی رہی سے اس کے دل کا غبار نکل گیا تھا اس لئے امی کا کندھا چھوڑ کر لیٹ گئی۔

"آپ یہ بات ابا جی کو نہ بتایئے گا امی ورنہ وہ مجھے فی الفور اس جہنم میں بھجوا دیں گے"

"مجھے معلوم ہے آج کل تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں، اللہ کے سوا اور کوئی آسرا بھی نہیں"

"تو پھر اللہ پر چھوڑ دیجیے جو میری تقدیر میں ہو گا ظہور میں آجائے گا"

"سب ٹھیک ہو جائے گا" امی اس کی کمر سہلاتے ہوئے بولیں۔

"لوگ تو ویسے ہی موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ کچھ انہوں نے اپنے اگلے پچھلے حسا کرنے ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں" نیا رک کر بولی۔ ایک دن میں نے شیدا سے اتنا ہی تھا کہ سامنے والے مکان میں کون آیا ہے۔ اور پرانے کرائے دار کہاں گئے ہیں۔ اور یہ بات اپنی منگنی کے بعد پوچھی تھی"

"اچھا اب جانے دو" امی نے اسے جلدی سے ٹوک دیا۔ "ان چھوٹی چھوٹی باتوں دل میلا نہ کرو۔ کیا میں تمہیں نہیں جانتی"

امی نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر دونوں ماں بیٹیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ نظر

اس شام شہباز بھی نہیں آیا تھا اور اس کے بعد کئی روز تک نہ آیا تو نیا کو اختلاج سا ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے زندگی میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنا بند ہو گئے ہیں۔

امی اس کے روز افزوں اضطراب کو دیکھ رہی تھیں۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔

ایک شام شہباز اس طرح گھر میں داخل ہوا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو، اس کا چہرہ اتنا بجھا بجھا سا تھا کہ نیا کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے دیکھتے ہی نیا رونے لگی۔ امی آگئیں اور انہوں نے بے ہمسائی کی ساری گفتگو اسے سنا ڈالی۔ شہباز جانتا تھا دیر سویر یہ خبر نیا تک ضرور پہنچے گی اور اسے صدمہ بھی ہو گا۔

اسے خاموش دیکھ کر امی باہر چلی گئیں تو نیا نے روتے ہوئے پوچھا۔

"شہباز! آپ تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کو تو سب پتہ تھا۔ سب سے پہلے میں نے آپ کو بتایا تھا"

"ہاں میں کب انکار کرتا ہوں"

"پھر آپ نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ میرے دامن پر اتنا بڑا داغ لگا دیا جائے"

"نیا تمہیں معلوم تو ہے تم نے آپا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا اور انہوں نے غصے میں جانے کیا کیا کہہ دیا"

"یہ غصہ نہیں شہباز یہ انتقام ہے۔ وہ مجھ سے میرے ہونے کا بدلہ لینا چاہتی ہیں۔ اور خوب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایسا کر رہی ہیں"

"اب بھی صبر سے کام لو نیا، تم نے ہمیشہ صبر کیا ہے"

"اور صبر کا اجر مجھے کیا ملا ہے؟"

"میں تو تمہارا ممنون ہوں نا"

"شہباز خدا کے واسطے آپ مجھ سے بدظن کبھی نہ ہوں۔ ایسا ہوا تو میں مر جاؤں گی"

شہباز کرسی سے اٹھ کر اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں تم کتنی پاک باز اور بہادر عورت ہو۔"

نیا کے آنسو بہنے لگے۔ اُسے ایسے ہی الفاظ کی، ایسے ہی سہارے کی اُسے ضرورت تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں نیا کا جی بہل گیا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے اَن دیکھے بچے کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

شہباز جب جانے لگا تو بولا۔ "نیا! آپا میرا یہاں آنا پسند نہیں کرتیں۔ وہ سمجھتی ہیں ہم دونوں مل کر اُن کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اس لئے اب میں ذرا کم آیا کروں گا۔ ویسے تم فون پر مجھے اپنی ہر خیریت بتا دیا کرنا۔"

نیا رات گئے تک جاگتی رہی اور سوچتی رہی کہ جب حالات کا دھاگا اُلجھ جاتا ہے تو پھر سرا ہاتھ نہیں آتا۔ اُس نے تو بڑی خوش نیتی سے یہ قدم اٹھایا تھا، مگر قسمت نہ جانے کون سی چال چلنا چاہتی ہے۔ حالات کا دھاگا سُلجھنے کی بجائے اور اُلجھتا جا رہا ہے اُدھڑی ہوئی اُون کی طرح۔ کبھی کبھی بُنائی کے دوران اس کی اُون اس بُری طرح اُلجھ جایا کرتی تھی کہ وہ دھاگے سُلجھا سُلجھا کر تھک جایا کرتی تھی۔ بالآخر کسی نہ کسی گرہ سے دھاگا توڑ کر وہ سرا نکالا کرتی۔

بعض اوقات اُون کو سُلجھانے کے لئے دھاگا توڑنا پڑتا ہے۔ نیا کو جھرجھری آ گئی۔ اور پھر اُون کی تو ذرہ گرہ لگ جاتی ہے اور گرہ بناتی میں چھُپ بھی جاتی ہے۔

کیا زندگی کے معاملات میں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟

اللہ نہ کرے، خدا نہ کرے۔

آج کل نیا درد ہی درد بنی ہوتی تھی۔ جس کروٹ لیٹتی اُف نکل جاتی۔ جس جگہ ہاتھ رکھ دیتی آہ نکل جاتی۔ اس پر دماغ نے بھی کتنا دکھنا شروع کر دیا تھا۔

شہباز نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

اس کے معمول میں کمی آ گئی تھی۔ کبھی کبھار کھڑے آنا اور پھر چلے جانا۔ نیا کا دل چاہتا کہ اسے فون پر اپنی خیریت بتائے تو وہ ایسا بھی نہ کر سکتی۔ اصل میں گھر میں تو ابا جی نے کبھی فون لگوانے کی

ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ اب جب سے شیریں بھابی آ گئی تھی اس نے اوپر فون لگوا لیا تھا۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی اور کہتی تھی اپنی ماں سے بات کئے بغیر مجھے چین نہیں آتا۔ فون کا خرچ ماں باپ نے برداشت کیا تو جھٹ سے فون بھی لگ گیا کبھی کبھار وہیں سے نیا اِدھر اُدھر فون کر لیتی تھی اب اِس کے لئے اتنی سیڑھیاں اوپر چڑھ کر جانا محال ہو گیا تھا اس پر بھابی کا رویہ بھی کافی مل جلا سا تھا۔

"تم سُسرال کیوں نہیں جاتیں؟"

"تمہاری ساس تمہیں بُرا کیوں سمجھتی ہے؟"

"اپنے شوہر کو چھُپ چھُپ کر فون کیوں کرتی ہو؟"

"میں تمہاری جگہ ہوتی تو اب تک اپنی ساس کو باہر نکال چکی ہوتی۔"

اس قسم کے بیسیوں سوال کرتی کہ نیا جل کر اُٹھ آتی اور پھر وہ بڑی ڈھٹائی سے نیا کے پاس جُڑ کر بیٹھی رہتی۔ نیا دو چار باتوں کے علاوہ شہباز سے اور کچھ بھی نہ کہہ سکتی۔ اور اگر کبھی شہباز فون کر کے اسے کہہ دیتا کہ ذرا نیا کو بلا دیں تو جھٹ اس سے کہہ دیتی۔ "آپ تھوڑی دیر بعد فون کیجئے گا۔ میں نیا کو بلوا چھوڑوں گی اس وقت میرے پاس کوئی آدمی نہیں ہے جو اُسے بُلا لائے۔"

خود نیچے آنا تو وہ شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ جب بھی سامنا ہوتا، کسی نہ کسی طرح یہ ضرور سنا دیتی کہ وہ اس تنگ مکان میں ایک قیدی کی حیثیت سے رہ رہی ہے۔ عنقریب اس کے ابا اس کے حصّے کی زمین دیں گے۔ جس پر وہ ایک ماڈرن بنگلہ بنواتے گی اور اس جہنّم کو چھوڑ دے گی۔

نیا اس کشتی کی مانند تھی جس کے مقدر میں کوئی کنارا نہ ہو۔ اس واسطے وہ بھابی کے منہ نہیں لگتی تھی اپنا آپ چھُپائے جیسے تیسے میعاد کے دن پورے کر رہی تھی۔

امّی جان بھی اب اپنے دوسرے بیٹے وقاص کی شادی کے درپے تھیں۔ نیا لاکھ کہتی امّی آپ ان بکھیڑوں میں نہ پڑیں اپنی صحت کا خیال رکھا کریں اور انہیں اجازت دیں جہاں اُن کا دل چاہے شادیاں رچالیں مگر امّی جان تو ممتا کی رسم نبھانے کی قائل تھیں۔ وہ تو نیا کے آجانے کی وجہ سے انہوں نے

یہ کام پسِ پُشت ڈال دیا تھا ورنہ جب سے وقاص کو لائل پور میں مستقل ملازمت ملی تھی وہ اس کے لئے لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ اب تو اویس بھی کیپٹن ہو گیا تھا اور اس نے امی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے شادی کرے گا۔ وقاص اور اویس تو ویسے بھی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں رہتے تھے اور بڑے بھائی کا یہ حال تھا کہ بیوی کے سوا کسی کو پہچانتا نہیں تھا۔ کبھی پیار کر سر پر ہاتھ رکھ کر نہ پوچھا کہ کیسی ہو اور آج کل یہاں کیوں آئی ہو؟

اگر کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو یوں بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ جاتا جیسے اس کا ماں اور بہن سے ملنا بھی جرم بن جائے گا۔

اس دیاس کے گھروندے بناتے ڈھاتے، رفتہ رفتہ وہ دن آ گیا جس کا نیّا کو برسوں سے انتظار تھا اور جس کے لئے نیّا نے زندگی کی سب سے بڑی بازی لگا دی تھی۔ واقعی کرب کا یہ مرحلہ سب سے عظیم ہے۔

اس نے وہاں اسپتال میں لیٹے لیٹے سوچا۔

اس نے بہت سے دکھ درد سہے تھے اور طبعاً برداشت کا مادہ رکھتی تھی۔ مگر جب اپنی نوعیت کے اس انوکھے اور جان لیوا درد سے واسطہ پڑا تو اسے فوراً پتہ چل گیا کہ ماں کے قدموں تلے جنت کیوں رکھ دی گئی ہے۔

کرب کی ان اذیت ناک گھڑیوں میں اس کا دل چاہنے لگا، اس کا شوہر اس کا پریمی اس کے پاس ہو۔

اس نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔

شہباز کہیں نہیں تھا۔ امّی سہمی ہوئی سی پنجہ مریم لئے ایک کونے میں کھڑی تھیں اور مشینی قسم کی نرسیں کرخت چہرے لئے ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔

وہ کہاں ہے؟

وہ کہاں ہے؟

کہ جس نے دُکھ سُکھ میں ساتھ دینے کی قسم کھائی تھی جس کی روشنی سے اس نے نئی زندگی کی تمنا کی تھی۔

جس کے خواب اس نے مجسم کرنا چاہے تھے۔

اب تمنا مجسم ہونے والی تھی

ایک تپتی ہوئی درد کی بھٹی میں اسے جھونک دیا گیا تھا۔ کیا ماں بننے کے لئے قہر کو پار کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی تنِ تنہا!

وہ قریب ہوتا۔

اس کے ٹھنڈے ہاتھ تھام لیتا۔ اُس کے ماتھے سے بار بار پسینہ پونچھتا۔ سرگوشیوں میں اسے

جس قدر وہ بے دم ہوتی اتنی ہی اس کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی۔ یہ ہاتھ پاؤں لاچار جاتے ہیں۔ یہ جسم خود اپنے اختیار میں نہیں۔

اُسے بُلاؤ۔ اسے بُلاؤ۔

اُس کی بے ترتیب سانسیں دُہائی دینے لگیں۔ اس کے نیلے ہونٹ کراہنے لگے۔ ا

ٹھنڈے ہاتھ سکڑنے لگے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ زمین پر ہے نہ آسمان پر۔ وہ کہیں ف

معلق ہے اور چاروں طرف سے درد کے بادلوں نے اسے گھیر رکھا ہے — ان میں

فرشتۂ اجل کہیں بھی نظر نہیں آرہا۔ مگر یوں لگتا ہے۔ یہی موت کی گھڑی ہے۔ یہی وہ گھڑی ہے

اپنا وجود اپنے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ جب زندگی پر اپنا بھی اختیار نہیں رہتا۔

ایک لمحہ۔

ایک درد آفرین، کرب انگیز لمحہ۔

سولی کی طرح آ کے جسم میں اٹک جاتا ہے۔ پڑ جاتا۔

تلوار بن جاتا ہے۔

آگ بن جاتا ہے۔

نشتر بن جاتا ہے۔

دونوں عالم کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں۔

ذرا سی دیر کو زندگی راستہ بھول جاتی ہے۔

حواس ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

درد زندگی اور موت کے درمیان ایک پُل ہے۔

اور وہ اِس پُل کے عین سرے پر پہنچ گئی ہے۔

اور وہ تمنگر نہ جانے کہاں تھا۔ آہ و کراہ کے اس سمندر میں، درد کی لہروں کے ساتھ ساتھ وہ اِدھر اُدھر لڑھکنے لگی۔

عین اسی وقت گم شدہ حواسوں کے بیچوں بیچ ایک ننھی سی چیخ نے اسے زندگی کی نوید دے ڈالی۔ جیسے گھپ اندھیاروں میں سورج طلوع ہو گیا۔ آبشاروں میں چاند نے جھانکا اور... اور...

دل نے کہا میں موجود ہوں۔ یہیں تمہارے پہلو میں، دھڑکن کو محسوس تو کرو۔

تب اسے ڈاکٹر کی آواز آئی "مبارک ہو بیٹا پیدا ہوا ہے"

یہی نوید سُننے کے لئے شاید اُس نے اپنی ایک حس بچا کے رکھی ہوئی تھی۔ خوشی اور تھکن کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر وہ بے ہوش ہو گئی۔

موت سے گزر کر زندگی کتنی پیاری لگتی ہے۔

اور جب زندگی کی گود میں ایک اور زندگی ہو۔

بچہ ہی تو اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

جب اس نے بچے کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کیا تو رواں رواں ماں بنتا گیا۔

نس نس پر مامتا کے پہرے لگ گئے۔

وہ دشمن جاں اب بھی نہیں آیا تھا۔

ہوش میں آتے ہی اس نے امّی جان سے کہا تھا کہ شہباز کو فوراً اطلاع دے دیں۔ ساتھ ہی روشنیوں میں لپٹی ہوئی وہ گھڑیوں کا حساب بھول گئی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ پچھلے پہر کے جاگ اس کا آنگن روشن کر دیا تھا۔

مگر اس وقت شہباز کو اطلاع نہیں بھجوائی جا سکتی تھی۔ شہباز تو میٹھی نیند سو رہا ہوگا۔ تے درد کی ایک کڑی منزل اس کے بنا ہی طے کر لی تھی۔ حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ کائنات پردہ اس کا ہاتھ تھام کر چلتی وہ پاس بیٹھا اس کے چہرے پر آنے والے ٹھنڈے پسینے پونچھتا اس کی گرفت فولادی بنتی جاتی اس کی سرگوشیاں بے ہوشی میں پناہ دیتیں۔

اسے کیا خبر تھی، وہ کیا جانتا ہوگا۔

صبح کو جمعہ تھا۔ اس کا دفتر بند تھا۔ گھر میں فون نہیں تھا اور تنیا کا اصرار تھا کہ اسے جلد اطلاع دی جائے۔

امّی جان نے رقعہ لکھ کر ایک نوکر کے ہاتھ بھجوایا۔

علی الصبح جب نوکر نے دروازہ کھٹکھٹایا تو آپا کا ماتھا ٹھنکا، فوراً اٹھ کر باہر آ گئیں۔ اس وقت دروازہ کھٹکھٹانے کا مطلب کوئی اہم خبر تھی۔ سو آپا نے نوکر سے رقعہ لے لیا۔ پڑھا اور کر کے مٹھی میں دبا لیا۔ نوکر سے کہہ دیا تم جاؤ صاحب آ جائیں گے۔

شہباز جب سو کر اٹھا تو اسے یکایک آپا کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ دوڑ کر گیا تو پتہ آپا کو دل کا دورہ پڑا ہے۔

"دل کا دورہ۔ اچھا تو میں ڈاکٹر کو بلا کے لاتا ہوں۔"

"ڈاکٹر کو مت بلا میرے چاند یہاں میرے پاس بیٹھ جا، اگر زندگی ہوتی تو بچ جاؤں گی۔"

"نہیں آپا، یہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔ اگر آپ کو دل میں تکلیف محسوس ہو رہی ہے تو میں نہیں کروں گا۔"

"اے ماں کے لاڈلے میری دو باتیں تو سن لے، پھر جو تیرا دل چاہے کر لینا ایسا نہ ہو کہ

پڑے۔"

شہباز آپا کے پاس بیٹھ گیا۔ آپا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"اللہ تجھے سلامت رکھے، اللہ اس گھر کو آباد رکھے۔"

آپا نے شہباز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور بولیں۔

"میرے سر کی قسم کھا کہ تو تنیا سے کبھی نہیں بولے گا۔ اسے کبھی گھر میں نہیں لائے گا۔ اس نے مجھے دکھایا ہے اور وہ درد کے ایک تکلیف پہنچی ہے کہ آج میری حالت ہو گئی ہے۔"

آپا! شہباز نے اپنا ہاتھ

نہیں پہلے تو قسم کھا، مجھے احساس ہوتا، ابھی ورنہ میں تیرے سامنے یہیں پھڑک پھڑک کر مر جاؤں گی۔"

آپا... آپا...."

نہیں میں تیرا ہاتھ یونہی اپنے سر پر رکھے رہوں گی اگر تو تنیا کا یا اپنے بچے کا منہ بھی دیکھے تو اپنی جنازہ دیکھے۔ اگر آج تو قسم نہیں کھائے گا تو میں وصیت کر جاؤں گی کہ تو میرے جنازے کو کاندھا نہیں دے گا اور میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی۔"

بے بس شہباز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

امی جان۔

بول جلدی بول وقت بہت کم ہے۔ قسم کھا اور لڈو اُنہو، جا اپنے بچے کو چھوئے گا بھی نہیں اپنی شکل بھی نہیں۔ اُن کو چھوڑ دے گا۔"

آپا کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ "جلدی بول۔" انہوں نے تکیے کے نیچے سے ایک کاغذ نکالا۔ "یہ وصیت نامہ میں نے لکھ کر رکھا ہوا ہے۔ تو اسے پڑھ سکتا ہے۔ اگر تو قسم کھالے گا تو میں اسے ابھی پھاڑ دوں گی۔ ورنہ دنیا جان جائے گی کہ تو میری موت کا سبب بن گیا ہے۔"

وصیت نامہ دیکھ کر شہباز کی سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں مفقود ہو گئیں۔ آپا نے ابھی تک اس پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ شہباز کی آنکھوں سے دو آنسو نکل آئے اور اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"اچھا آپا جیسے آپ کی مرضی۔"

"قسم کھا"

"قسم کھاتا ہوں"۔ اس نے چیخ گلے میں دبا کر کہا۔

"جیتا رہ۔ خوش رہ۔ ہزاری عمر ہو" آپا نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

واہ۔ زندگی چھین کر جینے کی دُعا دی جا رہی ہے۔

"جا اب جا کر ڈاکٹر کو بُلا لا۔ اگر میری کچھ سانسیں باقی ہیں تو تیرے ساتھ کر

شہباز جب ڈاکٹر کو لے آیا تو آپا بالکل اچھی بھلی لگ رہی تھی۔ تھکن کے پسینے کا

ہوا تھا جیسے کسی کو کاندھا دے کر آیا ہو۔ پناہ دیتیں۔

ڈاکٹر نے آپا کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ آپا نے اسے اُ

بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس نے کچھ مسکن اور ہاضمے کی دوائیں تجویز کر دیں اور ساتھ ہی کہہ دیا

خاطر ای سی جی ضرور کرا دی جائے۔ لیکن اُس روز شہباز سارا دن سوچتا رہا، کاش اس کا

وہ ختم ہو گیا ہوتا۔ آپا کے روپے نے اسے بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔

گو آپا نے اُسے قسم دے دی تھی پھر بھی اس نے اپنے دوست سے کہہ کر نیا

کیونکہ اُس کا دل کہہ رہا تھا کہ آج کوئی خاص بات ضرور ہو گئی ہے۔ وہاں سے شیریں

اسپتال میں ہے اور اس کے ہاں بیٹا ہوا ہے آجائیں

سو شہباز کو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔

نیا خود تو اسپتال کے بستر پر تھی مگر اس کی نگاہیں ہمہ وقت دروازے پر لگی رہتیں

چونک جاتی، دل دھڑک اٹھتا۔ جانے دن میں کتنی بار وہ شہباز کی آہٹوں کا فریب کھا

کتنا دل تڑپ تڑپ جاتا اس کا۔ اللہ تعالیٰ نے اتنی بہت بڑی خوشی سے اسے نوا

خوشی میں کانٹا کیوں چبھ گیا تھا۔

اُس نے بینک بھی فون کرایا تھا۔

اُس کے نہ آنے کی وجہ بھی پوچھی تھی۔

مگر اُدھر سے ایک کمزور نے اسی کی خاطر لیا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ سب سے

اتی اسے روز مجھوتی سب خوشی کے لئے میں نے بہت بڑا دان دیا ہے۔ زندگی کا سب سے

شاید بیمار ہو یا کوئی اور کام پڑ لیا ہو گا۔ وہ سچا اس کے ہاتھ

مگر وہ جانتی تھی دنیا میں اپنے بچے سے اہم کوئی کام نہیں ہوتا۔ یہ ایسی بات نہیں جو یاد داشت

جائے۔

وہ تو سمجھتی تھی کہ وہ درد کے ایک طوفان سے گزر چکی۔ مگر اس کے بعد بھی درد و کرب کے اور

ن گا اسے معلوم نہ تھا۔

وہاں لیٹے لیٹے اسے احساس ہوتا، عورت کیسے کیسے نازک مرحلوں سے گزرتی ہے۔ شاید مرد

ا احساس نہ ہو سکے۔

کلیفیں اٹھانے کی یہ سکت اللہ تعالیٰ نے عورت کے جسم میں کیوں رکھی؟ اور پھر بچہ تمام تر مرد کا

ہے۔

یہ کیسے فارمولے ہیں؟

ساتویں دن نیا اسپتال سے گھر آ گئی۔ اسی روز امی جان نے عقیقے کے بکرے ذبح کرائے اور لڈو

ارے محلے میں تقسیم کرائے۔ شام کو گوشت اور لڈو اُنہوں نے مبارک بادی کے ساتھ جو نیلی آپا

بھجوائے۔ قاعدے کے مطابق انہیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ مگر اُدھر سے جواب آیا اس نے

ب کے پیروں تلے سے زمین نکال دی۔ انہوں نے گوشت اور لڈو واپس کر دیئے اور کہلا بھیجا۔

جس کا بچہ ہے۔ اسی کے گھر یہ چیزیں بھیجیں ہمارا نیا سے کوئی ناطہ نہیں"۔

نیا نے سوگواری سے بچے کی طرف دیکھا۔ پیارا پیارا معصوم سا فرشتہ، مہکتا ہوا پھول اس کی گود

بادو دھو رہا تھا۔

ہائے یہ کیسا مقام ہے خداوندا!

جب بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے تو ماں کیا محسوس کرتی ہے۔ اس رشتے کو فرشتے کیا سمجھ سکیں گے کہ

"قسم کھا"

"قسم کھاتا ہوں" اس نے چیخ گلے میں دبا کر کہا۔

سیں ر... ہزاری عمر ہو" آپا نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

یہ ننھا سا پھول، جو اپنے سدھ ہونے سے ماں کا دل پوں رہا ہے۔ اس پر میں اپنی جان، اپنی زندگی، اپنا آرام، سب کچھ نچھاور کر سکتی ہوں۔ اس ظالم رشتے کی ابھی ہوتی ہے۔ میں کیا بتاؤں کہ مامتا کیسا روگ ہے۔ ہاں روک ہی تو ہے۔ التجائیں کر کے مانگا۔ پہلے میرے جسم میں ایک دل تھا۔ اب میرا رواں رواں دل بن کر دھڑ

شہباز تم میری خبر نہ بھی لو گے تو میں اس ننھی لاٹھی کو تھام کر جیون گزار دوں گی۔ شہباز نہیں بنانا چاہتی۔ میں ظالم ماں نہیں کہلانا چاہتی۔ کوئی بیا جانے ماں کا دودھ کی خیرات تو ماں اپنی مامتا کے صدقے میں یونہی لٹا دیتی ہے۔ اس خیرات کی قیمت نہیں کا خراج نہیں مانگتی۔ لہو کا مول نہیں چاہتی۔

جو ایسا کرتی ہے وہ ماں نہیں ہوتی۔

اور مائیں تو جانوروں کی بھی ہوتی ہیں۔

نیا کو اب شہباز کے نہ آنے کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی کیونکہ ایک دن وہ اپنی چوری چوری شیریں بھابی کے گھر چلی گئی تھی اور اس نے خود شہباز سے بات کرنے کے لئے مگر دوسری طرف سے تھوڑی دیر بعد جواب دیا گیا کہ شہباز صاحب اس وقت آفس جانتی تھی یہ جھوٹ ہے۔ شہباز نے خود کہلوایا ہے۔

مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟

کبھی سوچتی شاید شہباز بھی اس پر شک کرنے لگا ہے۔ اس سے متنفر ہو گیا ہے نے کوئی مشکل کھڑی کر دی ہو گی۔

سوچتے سوچتے جب اُس کی نظر اپنے بچے پر جاتی تو اس کا جی نہال ہو جاتا کتنی ظالم ہے۔

یہ جوگ میں نے اسی کی خاطر لیا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ سب سے اونچا مینار ہے۔ اسی خوشی کے لئے میں نے بہت بڑا دان دیا ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا تاوان ادا کیا ہے۔ کبھی تو شہباز سے سامنا ہو گا۔ وہ بچہ اس کے ہاتھ میں دے کر کہے گا "تم لکھا کر بتاؤ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟ کیا یہ بچہ تمہارا نہیں؟ اس کی آنکھیں، اس کے گھونگھریالے بال، اس کے ہونٹ، اس کی ناک، یہ سب تمہارا نہیں۔

اپنے آپ کو پہچانو، اپنی خوشبو کو سونگھو۔ بچہ واقعی شہباز کا ہمشکل تھا، بلکہ چھوٹا سا شہباز لگتا، سوائے رنگت کے، سرخ و سفید رنگت اُس نے اپنی ماں کی لے لی تھی یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا ہے۔ شہباز! میری چاہت کی مُہر اس کے چہرے پر لگی ہے۔ تمہارے سوا میں نے کچھ نہیں سوچا۔ تمہارے سوا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ تم سے اچھا میرے لئے کوئی اور نہیں تھا۔ تم کتنے کھٹور بن گئے ہو۔ تم میری آنکھوں کی جوت ہو اور یہ میرے من کا موتی ہے۔ موتی! ہاں موتی ہی تو ہے۔ جو نو مہینے سیپ کی آغوش میں رہتا ہے۔ پھر نکھر کر سنور کر نکلتا ہے اور کسی تاج میں کسی زیور میں سج جاتا ہے۔ یہ میرا موتی ہے۔ میں اسے موتی کہوں گی۔

ویسے تو نیا نے ہمیشہ سوچا تھا کہ بچے کا نام شہباز رکھے گا۔ بچے کی پیدائش سے پہلے بھی وہ اگر ہونے کی کہ ہم اپنے بچے کا کیا نام رکھیں گے تو شہباز شرما کر گردن جھکا لیتا۔ پہلے بچہ تو ہو لینے دو۔ پتہ نہیں لڑکا ہو گا یا لڑکی۔

تو دو نام سوچ رکھتے ہیں۔ ایک لڑکی کے لئے ایک لڑکے کے لئے۔

نہیں بعد میں رکھیں گے۔

شہباز اسے ٹال جاتا، اسے نیا کے جنون سے ڈر آتا تھا۔ اگر نیا کی یہ خواہش مجسم نہ ہوتی تو کیا ہو گا۔ مگر نیا کو یقین تھا۔ اور پھر جوش میں کبھی کبھی وہ یہ بھی کہہ دیتی تھی "دیکھئے آپ چاہے شہباز یا ایاز میں سے کوئی نام نہیں رکھوں گی۔ میں اپنے بیٹے کا کوئی جلالی سا نام رکھوں گی ہاں۔ میں ضد چاہتی وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔" پھر رُک جاتی۔ اتنی زیادہ شرافت بھی کس کام کی۔

"تمہیں معلوم ہے جلالی بچے پہلے تو اپنے والدین کی زندگی اجیرن کرتے ہیں"

"بلا سے کرتے رہیں۔ مگر زمانے سے لڑ بھی تو سکتے ہیں"

شہ یہ نیا رتھا وہ صریحاً اس کی بزدلی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مگر وہ اسے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ساری خوشیاں سارے ارمان بچے پر بھی نکال لے۔

اور اب شہباز نہیں تھا تو وہ بچے کا نام بھی نہیں رکھنا چاہتی تھی اور نام کے بغیر [illegible] مشکل تھا۔ اس لئے نیا نے اسے موتی کہنا شروع کر دیا۔ امی جان کا خیال تھا کہ سوا مہینہ ہی نیا کو سسرال چلے جانا چاہیئے۔ خود بخود سب حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ نیا کو بھی اس کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچتی جس طرح بن بتائے وہ ایک دن اس گھر سے اٹھ کر آئی اسی طرح بن بلائے ایک دن اس گھر میں جانا پڑے گا۔

لیکن ابھی ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ نیا کے نام ایک نوٹس آ گیا۔

شہباز کی طرف سے طلاق کا نوٹس۔

اسے پڑھتے ہی نیا بے ہوش ہو گئی۔ امی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ابا جی غصہ سنبھالے سے باہر نکل آتے انہوں نے امی سے کہہ دیا کہ یہ بات گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلے۔

بات بھی چھپائی گئی اور نیا کو بھی سنبھالا گیا۔

مگر نیا کا دل جیسے کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ موتی کو سینے سے لگا کر روتی تو پھر روتی ہی چلی

"ان دنوں روتے گی تو آنکھوں کا نور کھو بیٹھے گی" امی اسے چمکارتے ہوئے کہتیں۔

"اندھی ہی ہو جاؤں تو اچھا ہے۔ جو دیکھنا تھا میں نے دیکھ لیا"

ابا جی مسلسل اس کوشش میں تھے کہ نوٹس واپس لے لیا جائے اور نیا اپنی سسرال چلی

مگر طلاق کا معاملہ شہباز کے اختیار میں نہ تھا وہ تو جنیل آپا کے اختیار میں تھا۔ انہوں نے بھی اپنی ایک سہیلی کا بیٹا کیا تھا اور مقدمے کو مضبوط کرنے کے لئے نیا کے جعلی عشقیہ خطوط لکھ گئے۔ نیا کی تصویریں ایک دوسرے آدمی کے ساتھ بنوائی گئیں۔ سب کچھ اتنا منظم اور مضبوط

نیا کے بچاؤ کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا اور تو اور انہوں نے تو یہ بھی ایک پوائنٹ بنایا تھا کہ اس کے شوہر کے حلب سے جب بھی اسے بچہ ہونے والا ہوا اس نے ضائع کر دیا۔

ابا جی کا ہر روز امی سے جھگڑا ہوتا اور وہ کہتے۔

جس کی ماں تم جیسی بے وقوف ہو اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ میں نے منع کیا تھا لڑکی کو اتنے دنوں کے لئے گھر میں نہ بٹھاؤ۔ اب تم دونوں بھگتو"

بات چھپائی بھی جا رہی تھی اور بنانے کی کوشش بھی کی جا رہی تھی۔ وکیلوں کے چکر بھی لگ رہے تھے اور شہباز سے بالمشافہ گفتگو کی کوشش بھی کی جا رہی تھی۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی روزن سے یہ معاملات باہر نکل ہی جاتے ہیں۔ اس دنیا کی چھلنی میں بہت چھید ہیں۔ اس دنیا میں کوئی راز، راز نہیں رہتا۔ یہاں ہتا پانی بھی افواہیں لے اڑتا ہے۔

جیلانی صاحب فوت ہو چکے تھے۔ جنہوں نے یہ رشتہ کرایا تھا۔ پھر ابا جی نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ایک با اعتماد وکیل سے رابطہ قائم کیا اور اس کوشش میں لگ گئے کہ نوٹس تین مہینے کے اندر اندر واپس لے لیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے ہر شرط ماننے کا اقرار کیا تھا۔

لیکن یہ معاملہ شہباز کے اختیار میں نہیں تھا۔ جب آپا نے شہباز سے کاغذ پر دستخط کروائے تھے اس کو اس وقت بھی پتہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ اسے کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنے بھائی سے ایک اقرار نامہ کرنا چاہتی ہیں کاروبار کے سلسلے میں جس کے لئے شہباز کے دستخطوں کا ہونا ضروری ہے، شہباز ان دنوں اپنے آپ سے، زندگی سے، آپا سے، سب سے اتنا بے زار تھا کہ اس نے آپا سے زیادہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور جانتا تھا کہ آپا جو چاہتی ہیں۔ کر والیتی ہیں، اس واسطے بحث و مباحثے کا فائدہ ہی کیا ہے۔

آپا نے جب نوٹس بھجوایا۔ تب شہباز کو بتایا۔

شہباز جیسے خواب سے چونکا۔

"آپ نے ایسا کیوں کیا آپا؟"

"لے اور سن۔ کیا تو نے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر قسم نہیں کھائی تھی کہ تو نیا سے اپنا ناطہ توڑ لے گا؟"

"اوہ تو آپ کا یہ مطلب تھا" شہباز نے سر جھکا لیا۔ اس دن پہلی بار اُسے محسوس ہوا انتہائی بُزدل ہے۔ نیّا تو کیا وہ کسی بھی عورت کا شوہر بننے کا اہل نہیں۔ اسے آپا کو کبھی شادی نہیں کرنی چاہیئے تھی۔

کاش وہ اتنا بڑا ظلم نہ ہونے دیتا۔

موتی چار مہینے کا ہو گیا تھا۔

انتہائی خوب صورت اور صحت مند بچہ تھا۔ گو نیّا یہ سارا عرصہ ایک ذہنی خلجان اور جذباتی انتشار میں گرفتار رہی تھی۔ پھر بھی بچے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ دیکھنے میں چھ ماہ کا بچہ لگتا۔ اب تو مخاطب کو دیکھ کر مسکرانے بھی لگا تھا۔

نیّا اس کی مسکراہٹ کا استقبال اپنے آنسوؤں سے کرتی۔

ابھی تک شہباز کی طرف سے طلاق کا نوٹس واپس نہیں لیا گیا تھا۔ نیّا نے شہباز کو بینک کے پتے پہ دو تین خط بھی لکھے تھے ایک بار گھر آنے کی استدعا کی تھی۔ ایک بار ملنا چاہا تھا۔ اپنی تمام تر خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر صُلح کی ہر شرط ماننے کا اظہار کیا تھا مگر

واں اک خامشی سب کے جواب میں

امی جان تو اسے یہی مشورہ دے رہی تھیں کہ بچہ لے کر ایک دن اپنے گھر چلی جاؤ۔ بچے کو دیکھ کر شہباز کے جذبات جاگ اٹھیں گے اور ممکن ہے جرنیل آپا کو بھی شرم آجائے مگر نیّا آپا کو اچھی طرح جانتی تھی اسے یہ بھی خوف تھا کہیں وہ غصّے میں طیش کھا کر بچہ اس کے ہاتھ سے لے کر چھت سے نیچے نہ پھینک دیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں تھا۔ نیّا کو جھرجھری آجاتی۔

وہ یہ رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔
پھر بھی اس نے ڈوبنے سے پہلے تنکے کا سہارا لینا چاہا۔

اگلی صبح وہ بہت سے نئے ارادوں کے ساتھ اٹھی، خود تیار ہوئی بچے کو تیار کیا۔ ایک رکشا منگایا اور بینک چلی گئی۔

بینک کے راتقل بردار چوکیدار کو اس نے شہباز کے نام رقعہ لکھ کر دیا اور خود باہر کھڑی ہو کر انتظار کرنے لگی۔ اور سوچنے لگی یہ خیال اُسے پہلے کیوں نہ آیا۔

تھوڑی دیر بعد بوکھلایا ہوا شہباز باہر نکل آیا۔ اس نے ابھی تک ہاتھ میں وہی چٹ پکڑی ہوئی تھی۔ نیا کو دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔ آج پورے چھ ماہ بعد دونوں کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ آہ۔ ان چھ مہینوں میں اجنبیت کی ایک دیوار خود بخود ان کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ شہباز کو دیکھ کر نیا کا دل بھر آیا۔ جیسے وہ ہجوم میں کھو گئی تھی اور اب یکایک اسے اپنا آپ نظر آ گیا تھا۔

اس کا دل چاہا ڈور کر شہباز کے گلے لگ جائے اور پھر اس کے وجود میں تحلیل ہو جائے۔ بہت ساری باتیں بہت سارے شکوے کہنے ہی نہ پڑیں۔

وہ آگے بڑھی اور۔۔۔ رُک گئی۔

کیسی ستم ظریفی تھی وہ دونوں تو سڑک پر کھڑے تھے اور سڑک پر اس کے گلے لگنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود ہی ڈرامہ بن جاتی۔ ان ظالم لوگوں کو کیا پتہ۔ کہ وہ پاپیادہ چلتی آ رہی ہے۔ اب ہانپ رہی ہے۔

پیاسی ہے اور ترس رہی ہے۔

وہ اپنا حق مانگنے آئی ہے۔

وہ تو اسے ایک فلمی سین سمجھ کر دوڑ دوڑ کر قریب آنا شروع کر دیں گے کہ اس ملک میں کرنے کے لئے ہر ایک کے پاس بے شمار وقت ہے۔

لیکن نیا کے پاس ہرگز وقت نہیں تھا۔

اس نے تو یہ چند گھڑیاں اپنی تقدیر سے مستعار لی تھیں۔ نہ جانے ان کا کیا سودا چکانا ہم

شہباز نے جب اس کے چہرے پر سرخ و سفید ابھرتی ڈوبتی لہریں دیکھیں تو اور بوکھلا گیا گیا۔ بہت سے لوگ جانتے تھے کہ ان کے درمیان طلاق کا مقدمہ چل رہا ہے اور اپنی منکوحہ سے چوری چھپے ملتے ہوئے وہ ڈر رہا تھا۔ اسے اسکینڈلز سے بہت ڈر لگتا تھا۔

وہ ازلی ڈرپوک تھا۔

کبھی اِدھر دیکھتا، کبھی اُدھر۔

اُسے سراسیمہ سا دیکھ کر نیا نے اسے فیصلہ کرنے کا موقع دیا اور خود آگے بڑھ کر رکشے میں سو بچہ اور دودھ کا تھیلا اٹھا لیا رکشے والے کو پیسے دیے اور پھر شہباز کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کا خیال تھا شہباز لپک کر بچے کو پکڑ لے گا، اس کو چومے گا اور پھر ان دونوں کو بنک لے جائے گا۔ اندر بھی مہمانوں کو بٹھانے کا ایک کمرہ تھا۔ مگر شہباز نے جلدی سے کوٹ کی جیبوں ہاتھ ڈال لئے اور رُک رُک کر بولا۔

"یہ تم... بچے کو بھی لے آئی ہو۔ مگر... یہاں تو بیٹھنے کی مناسب جگہ نہیں ہے... ہم میں بہت رش ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" نیا نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ مجھے کسی اسٹور میں بٹھا دیں۔ میں سے ایک ضروری بات کہنے آئی ہوں۔"

"اچھا آؤ۔" مگر پھر وہ رک گیا۔ "تم ذرا یہیں ٹھہرو، میں اندر کسی کو بتا آؤں پھر کسی اور جگہ چل کر بیٹھتے

وہ بنک کے اندر چلا گیا۔

اور نیا اذیت کے پُل صراط پر کھڑی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد شہباز باہر آ گیا اور اس کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ نیا کا خیال تھا اب وہ اُسے کسی اعلیٰ م کے ریستوران میں لے جائے گا۔ دس گیارہ بجے تو ویسے بھی ریستوراں خالی ہوتے ہیں۔ ہاں وہ اطمینان سے اس سے ایک ایک بات کر سکے گی۔ بلکہ اس کے پاؤں پکڑ سکے گی۔ مگر وہ اسے بنک کے عقب ں ایک گندے غلیظ ہوٹل میں لے گیا۔ جس کے باہر لکھا تھا۔ "اندر پردے کا انتظام ہے۔" اُس کے پیچھے پیچھے نیا بھی اندر چلی گئی۔ ایک کیبن کا میلا اور چکنا پردہ اٹھا کر دونوں اندر چلے گئے اور پتھر کی میز آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

پیاز کی بدبو میں بسا ہوا ایک لڑکا جھاڑن سے ہاتھ پونچھتا ہوا پردہ ہٹا کر دونوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

"دو چائے۔" کہہ کر شہباز نے اسے رخصت کر دیا۔

اتنے میں سویا ہوا بچہ جاگ گیا اور جاگتے ہی اس نے پہلے شہباز کی طرف دیکھا، اپنی چمکدار سیاہ آنکھوں سے وہ شہباز کو ایک ٹک دیکھے گیا اور پھر ایک دم مسکرایا۔ اور مسکراتے ہی ہمکنے لگا۔ جیسے اسپرنگ سے اس کے اعضاء ہلنے جلنے لگے۔ وہ بار بار شہباز کو دیکھتا اور مسکراتا۔ مسکرانے کے سوا بچے کو کچھ بھی نہ آتا تھا۔ اس کمسن بچے ہر نئی شکل کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ مگر پتہ نہیں کیوں اس کے اس طرح مسکرانے پر نیا کو بار بار رونا آ رہا تھا۔ بچہ ہمک ہمک کر شہباز کی جانب لپکتا اور نیا ہر بار اسے سنبھال سنبھال لیتی۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ کب باپ کا خون جوش مارتا ہے۔ موتی تو اتنا خوب صورت بچہ تھا کہ جو بھی اسے دیکھتا جھٹ گود میں اٹھا لیتا۔ مگر شہباز اسے حسرت سے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے مسکرانے پر مسکراتا بھی نہیں تھا شہباز کی آنکھوں میں کوئی جوت نہیں جاگی تھی۔

اماں یونہی کہتی تھیں باپ کا خون جوش مارے گا۔"

شہباز کے رویے پر نیا کا جگر کٹ رہا تھا۔

"آپ مجھے اس جگہ کیوں لے آئے ہیں؟" بالآخر نیّا نے اپنی چیخیں گلے میں دبا کر پوچھا۔

"یہاں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔"

"کیا اپنے بچے اور بیوی سے ملنا جرم ہے؟"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں نیّا کہ ....."

"آپ مجھے کیا سمجھائیں گے میں تو خود دیکھ رہی ہوں کہ آپ ڈر کے مارے بچے کو پیار نہیں رہے ہیں۔"

"نہیں نیّا یہ بات نہیں ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ مجھے آپا نے ایک فضول سی قسم دی تھی کہ اپنے بچے کو دیکھوں یا چھوؤں تو.... تو...."

"تو کیا ہے۔ میں نہیں مانتی ان قسموں کو۔ ان قسموں سے باپ کی محبت عظیم ہے! بالآخر میں خود آپ کا بچہ آپ کے پاس لائی ہوں۔ میں ایسی فضول قسموں سے نہیں ڈرتی۔ ماں باپ ہر فرسودہ قسم کو توڑ دیتا ہے۔ آپ اس بچے کو اس کا حق دیجیے۔ اس کو سینے سے لگائیے۔" شہباز نے نظریں جھکا لیں۔

نیّا تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی اور پھر جب دو دو بار بولی تو شہباز نے اس کے لب و لہجہ میں صاف محسوس کیا۔

"شہباز تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ آخر تم کیا چاہتے ہو، میں آج تم سے یہی پوچھنے آئی ہوں۔" شہباز نے اچھی طرح محسوس کیا کہ اس سے پہلے نیّا نے اسے کبھی تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ آج بیوی نہیں ماں بول رہی تھی۔

نیّا میں بہت تبدیلی آگئی۔ وہ بڑی پُراعتماد اور سمجھداری بھری عورت لگ رہی تھی۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو یہ بچہ تمہارا ہے۔ تمہارے گھر سے آنے سے پہلے یہ بات میں نے تمہیں بتائی تھی اور پھر میری ڈاکٹر گواہ ہے۔ تم اپنی ماں کو یقین دلا سکتے تھے کہ بچے کی ماں کہلانا ہر عورت کا پیدائشی حق ہے۔ اس حق سے عورت کو اللہ تعالیٰ تو محروم رکھ سکتا ہے۔ مگر دنیا میں کسی دوسرے

کو کسی عورت کا یہ پیدائشی حق غصب کرنے کا استحقاق نہیں ہے۔ میں نے اپنا حق مانگنے کے لئے کوئی غلط یا غیر شرعی قدم نہیں اٹھایا، صرف مہلت مانگی، چند مہینوں کی چھٹی مانگی، لوگ بیماری کے عالم میں کئی کئی مہینے اسپتال میں بھی تو گزار آتے ہیں۔ تمہاری ماں نے مجھ پر بے ہودہ قسم کے الزام لگائے۔ میرا ماضی اور میرا حال تمہارے سامنے ہے۔ کیا تم اندھے، بہرے اور گونگے ہو کر مجھے نہ بچا سکے۔ تمہاری ماں نے دھوکے سے تم سے طلاق نامے پر دستخط کروا لئے، چلو مانا۔ مگر کیا تم اس طلاق نامے کو منسوخ نہیں کر سکتے تھے؟ پچھلے تین مہینے سے میرے ضعیف ابا جی تمہارے آگے ہاتھ جوڑتے پھر رہے ہیں، اتنی خاموشی بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

"میں کیا کروں نیّا! تمہی بتاؤ میں کیا کروں؟" بالآخر شہباز نے قفلِ سکوت توڑا۔

"یہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟" نیّا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "اگر پوچھ ہی لیا ہے تو میں بتاتی ہوں، آج تمہیں ایک آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔ تم ماں کو چھوڑ دو یا ہم دونوں کو چھوڑ دو۔"

یہ کہہ کر نیّا رونے لگی۔ روتے روتے اس نے اپنا بچہ شہباز کی گود میں پٹخ دیا۔ شہباز اس بات کے لئے تیار نہ تھا۔ بچہ اس سے سنبھالا نہ گیا۔ اس کا سر چھوٹی میز سے جا ٹکرایا اور وہ چلا چلا کر رونے لگا۔ شہباز نے اناڑی پن سے اسے اٹھایا اور بے بسی سے نیّا کی طرف دیکھا۔ نیّا زار و قطار رو رہی تھی۔ موتی مچل مچل کر کبھی ادھر پھسل جاتا اور کبھی اُدھر پھسل جاتا۔ بچہ اینٹھ اینٹھ کر اور زیادہ رونے لگا۔ روتی ہوئی نیّا نے خود ہی آگے بڑھ کر بچہ اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ اس نے بچے کو سینے سے لگایا اور اس کا منہ تھپکا اور پھر تھیلے سے بوتل نکالی جو اس نے احتیاطاً رکھ لی تھی اور موتی کو دودھ پلانے لگی۔ موتی چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر دودھ پینے کے دوران وہ سسکیاں لیتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ نیّا ابھی تک رو رہی تھی۔ ایک بازو پر اس نے بچہ لٹایا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بوتل پکڑی ہوئی تھی۔ آنسو تھے کہ اس کے اپنے رخساروں پر مسلسل گر رہے تھے، جیسے چھجے کے اوپر سے موسلا دھار بارش کے قطرے گرتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی آنسو بچے کے چہرے پر بھی گر جاتا۔ وہ ڈر کر آنکھیں کھولتا اور پھر بند کر لیتا۔ نیّا جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر گرے ہوئے آنسو صاف

کر دیتی اور پھر اس نے اپنا چہرہ ہی دوسری طرف کر لیا۔

بچہ سو گیا اور دودھ کی بوتل ختم ہو گئی تو نیا نے بوتل دوبارہ پلیٹ کر تھیلے میں رکھ دی اور اپنے سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا۔

"تم نے بچے کا نام کیا رکھا ہے نیا؟" اچانک شہباز نے پوچھ لیا۔

"پہلے تم یہ بتاؤ اس بچے کا گھر کہاں ہے؟" یہ کہاں رہے گا۔ اس کا باپ کہاں ہے؟" اپنی سرخ سرخ آنسو بھری آنکھیں جب شہباز کے چہرے پر گاڑیں تو شہباز سے کچھ جواب نہ بن

"تم تو کہتے تھے بچے کی پیدائش کے بعد اس کا نام رکھیں گے۔ یہ کریں گے وہ کریں گے۔ اس نام کیا دیتے خود اس سے اپنا نام بھی چھین رہے ہو۔"

"تم . . . . تم چل کر آپا کے پاؤں پکڑ لو" بالآخر شہباز نے دل کی بات کہہ دی۔ "وہی کاغذ واپس لے سکتی ہیں۔"

"کیوں۔ میں ان کے پاؤں پکڑوں؟ میں ان سے بھیک کیوں مانگوں؟ میں نے کون سا کیا ہے۔ ہاں میں تمہارے پاؤں پکڑ لیتی ہوں۔ تم سے بھیک مانگ لیتی ہوں، اور ساری زندگی ایسا کرنے کو تیار ہوں۔"

"تمہارے ایسا کرنے سے شاید اُن کے دل کا میل دُور ہو جائے۔"

"اُن کے دل کا رنگ ہی میلا ہے۔ اس لئے کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کبھی صاف ہوا صرف میرے خون سے صاف ہو گا۔ تو تم خود ہی کیوں نہ میرا گلا گھونٹ دو۔"

"حالات اب میرے اختیار میں نہیں ہیں نیا۔"

"تم مرد ہو۔ یہ جہان مرد کا جہاں ہے، یہاں مرد کا قانون چلتا ہے، یہاں مرد کا زور چلتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہے۔ تم لاٹھی اٹھا لاؤ۔ بھینس خود بخود تمہاری ہو جائے گی۔ میاں بیوی کو ان کی مرضی کے بغیر کوئی جُدا نہیں کر سکتا۔"

"اگر اس وقت میں نے اپنا فیصلہ استعمال کیا تو آپا زندگی بھر کے لیے مجھ سے قطع تعلق کر

لیں گی۔"

"ناں باپ کی ناراضگی ایک نہ ایک دن رفع ہو جاتی ہے۔ ہم دونوں مل کر انہیں راضی کر لیں گے۔ مگر میاں بیوی کا ٹوٹا ہوا رشتہ کبھی نہیں جُڑ سکتا۔"

"تم آپا کو نہیں جانتیں، اگر انہوں نے قسم کھا لی تو وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے روٹھ جائیں گی۔"

"تم یہ چاہتے ہو کہ ایک عارضی بندھن کے لئے ایک مستقل بندھن توڑ دو۔"

"میں ناں کا گنہگار بن کے خدا کا گنہگار نہیں بننا چاہتا۔"

"اور سب جانتے ہیں کہ تمہاری ماں کو ثواب کا کام تم سے نہیں کروا رہی ہے۔"

"اس کے باوجود جب تک آپا زندہ ہیں میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"پھر ایسا کرو کہ مجھے طلاق نہ دو، میں اپنا بچہ لے کر الگ رہوں گی تم آپا کے ساتھ رہنا اور میں نہیں کبھی تنگ نہ کروں گی۔"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں طلاق کا نوٹس اب صرف آپا ہی واپس لے سکتی ہیں۔ تم جا کر ان سے فریاد کرو۔"

"آپا کا حکم کوئی خدا کا حکم نہیں ہے کہ بدلا نہیں جا سکتا۔"

"نیا مجھ میں اُن کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"تم تو مجھے اپنی زندگی، اپنا فلسفہ، اپنی خوشی کہا کرتے تھے!"

"وہ ثواب بھی کہتا ہوں۔"

"تو اس خوشی کے لئے کیا قربانی دے سکتے ہو؟"

"میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے دُکھی کر لیا ہے۔"

"واہ وا۔ کیا بات کی ہے تم نے۔ اب اس کے بعد کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ میں گھر سے بہت سا امیدیں لے کر چلی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اپنے بچے کو دیکھ کر تمہارا خون جوش میں آئے گا، تمہاری غیرت جاگے گی، میرے حالِ زار پر ترس آئے گا۔ تمہارے اندر اس زمانے سے

حوصلہ لینے کی قوت پیدا ہو جائے گی۔ میں عورت ہو کر اپنی انا کو پاؤں تلے روندتی ہوئی یہاں تک آ گئی تھی۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی تھی، کم تر پر سمجھوتہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ تمہارے ساتھ زندگی گزار کر بچے کو باپ کی محبت دینا چاہتی تھی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم . . . . تم . . . . تم اتنے . . . ." پھر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے وہ کیا کہے۔ "بے حس، بزدل، نیچ، گھٹیا، عاقبت . . . آج یہ سب الفاظ بے کار اور مہمل نظر آ رہے تھے۔ اس کے جذبات کی ترجمانی یہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے اندر ایک الاؤ سلگ رہا تھا۔ طوفان اٹھ رہا تھا۔ زلزلہ آ رہا تھا۔ لاوا ابل رہا تھا۔ جانے کیا کیا ہو رہا تھا۔

اتنے میں ہوٹل کا بیرا لمگجی پیالیوں میں چائے بنا کر لے آیا۔ شہباز نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر پتھر کی میز پر رکھ دی۔ خاکستری رنگ کی چائے میں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔

مگر نیا کے دل سے بھی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ برف پانی بن جاتی ہے تبھی مطلع صاف ہوتا ہے۔

اب مزید کچھ کہنا فضول تھا۔

موتی اس کی گود میں سو گیا تھا۔ اس نے پرس سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا۔ پھر طرح کمبل میں لپیٹا، پھر اس کو اپنے کندھے سے لگایا۔ پرس کو تھیلے میں ڈالا اور تھیلا دوسرے ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"نیا"۔

شہباز بھی کھڑا ہو گیا۔

پتہ نہیں اب وہ کیا کہنا چاہتا تھا مگر وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ ہوٹل سے تیز تیز قدم سڑک پر آ گئی۔ اسی وقت ہوٹل کے آگے ایک رکشا نے سواریاں اتاری تھیں اور جانے کے اشارے سے اسے روکا اور جلدی سے اس میں بیٹھ گئی۔ شہباز تیز تیز چلتا ہوا اس کے پیچھے مگر رکشا چلا گیا اور وہ کھڑا رہ گیا۔

یہ آخری سنگم ہے میرا تمہارا۔

نیا ہر سے لے کر پیر تک سُن ہو گئی۔ وہ ایک آس جس نے اُسے زندہ رکھا ہوا تھا آج وہ ٹوٹ گئی تھی اور یک بیک اسے اپنے مُردہ ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ نہ اُس کی نبض چل رہی تھی نہ دل دھڑک رہا تھا، نہ سانسیں چل رہی تھیں، نہ پلکیں جھپک رہی تھیں۔

(کہیں کوئی شے مُتحرک نہ تھی۔)

سب کچھ ساکت تھا۔ تماموش، بے جان۔

آج اُس نے سب کچھ ہار دیا تھا۔

پہلی چال اس نے اس لئے چلی تھی کہ وہ چاہتی تھی بازی کا سب سے بڑا پتا اُس کے ہاتھ میں آ جائے۔ آج تاش کا سب سے بڑا پتہ اس کی گود میں تھا۔

وہ پھر بھی بازی ہار گئی تھی۔

حالانکہ اس کا خیال تھا بچہ ہو جانے کے بعد اس کی تقدیر بدل جائے گی۔ شوہر بدل جائے گا۔ ماں بدل جائے گی۔ دن رات بدل جائیں گے۔

مگر بدلا کون؟

ستارے۔

ستارے بدل گئے تھے۔

اس نے گود میں سوئے ہوئے خوب صورت اور معطر بچے کو بھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ بچے نے بچے کھچے میں سوئی چبھو دی، پھر آنسو اسی رفتار سے بہنے لگے۔

جب رکشا گھر کے قریب رُکا تو اس نے پہلے اپنا چہرہ صاف کیا اور پھر باہر نکلی۔ رکشے والے کو پیسے دے کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ امّی جان برآمدے میں بیٹھی تھیں مگر اُس نے ان کے طرف نہیں ڈالی۔ امّی جان نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اسے جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔ اس کی یہ روداد نہیں سمجھ جاتے وقت تھی۔

تکستہ شکستہ سی چال نے امّی کو اس کے پیچھے جانے پر مجبور کر دیا۔

کمرے میں جاتے ہی اُس نے بچّے کو اتنی زور سے پلنگ پر پٹخ دیا کہ وہ معصوم ڈر کر چیخ مار چلّانے لگا۔ نیّا چُپ چاپ جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی شکن آلود تھی۔ سُرخ آنکھوں میں بجھی ہوئی تھی۔ چہرے پر اُمید کا کوئی بھی چراغ روشن نہ تھا۔

اور نیّا یوں بیٹھی تھی جیسے ایک طویل و بے معنی سفر سے تھک کر آدمی بیٹھ جاتا ہے۔

"نیّا موتی رو رہا ہے۔"

مگر نیّا یوں بیٹھی رہی جیسے زبردست طوفان میں کوئی بہرہ آدمی بیٹھا ہو۔ جس پر ہواؤں کا شور دھماکے بھی اثر نہیں کرتے۔ وہ ایک ٹک ایک کونے میں دیکھے جا رہی تھی۔ اس پر سے زمانے گزر چلے جا رہے تھے۔

اور امّی اس کی صورت دیکھے جا رہی تھیں۔

بالآخر انہوں نے خود ہی بچّے کو گود میں اٹھا لیا اور باہر لے گئیں۔ اسے چمکارا۔ سہلایا اور سُلا لا کر اسے بستر پر لٹا دیا۔ لیکن رات تک نیّا بولنے کے قابل نہ ہو سکی۔ وہ یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی جوگی میں اپنی روح تلاش کرتا پھر رہا ہو۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا! کہ آدمی کو پیاس لگتی ہے۔ وہ پانی پینا چاہتا ہے۔ کانچ کا گلاس سے بھر لیتا ہے۔ مگر پانی کو منہ تک لے جانے کی بجائے وہ دونوں ہاتھوں سے زمین پر پٹخ دیتا ایک دلخراش آواز کے ساتھ چٹخ جاتا ہے۔ کرچیاں خوابوں کی طرح دُور دُور تک بکھر جاتی ہیں اور پا کی طرح خاک میں مل جاتا ہے۔ ان کرچیوں کے بکھر جانے کا نظارہ اگرچہ خوب صورت ہوتا ہے زلیت ان کرچیوں کو سمیٹ نہ سکنے کا رنج زندگی کو کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ نیّا نے پانی سے لبالب زور سے زمین پر گرا دیا۔ اور اب بیٹھی دیکھ رہی تھی کہ کرچیاں کہاں کہاں تک گئی ہیں۔

اسے زندگی میں پہلی مرتبہ۔ پہلی بار شہباز سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ ایسی نفرت کرنے کے لئے الفاظ نہیں تھے۔

اتنے بزدل آدمی پر اس نے اپنی زندگی کے پانچ سال نچھاور کر دیے اور آنکھ کھلی بھی تو کب۔

اب کیا جواز تھا اس کے پاس رہنے کا!

اب کیا رہ گیا تھا سمیٹنے کو۔

بکھرے خواب، بکھری کرچیاں، گزرے دن، بیتی عمر۔ کون سمیٹ سکا ہے ان کو۔

کون واپس لایا ہے انھیں؟

خواب

نیا گھر سے نکلی اور مین روڈ پر آگئی، یہاں ایک بس اسٹاپ تھا اور یہیں سے اُسے بس پکڑنی تھی۔ بس اسٹاپ بھی ریلوے اسٹیشنوں کی طرح کبھی ویران نہیں ہوتے۔ اور نہیں تو تھکے ماندے راہگیر ہی ان کے سائبانوں تلے آکر سستانے کو لیٹ جاتے ہیں۔ مگر اس وقت تو بس اسٹاپ پر بہت رش تھا۔ صبح کے نو بجے ہوں گے۔ اسکولوں اور دفتروں کا وقت بھی کم و بیش یہی ہوتا ہے، روزانہ نیا صبح آٹھ بجے گھر سے نکلا کرتی تھی، آج اسے ذرا دیر ہوگئی۔ پہلی بسوں میں جلدی جگہ مل جاتی تھی۔ پھر وہ نو بجے تک پارلر پہنچ بھی جایا کرتی تھی۔ آٹھ بجے کے بعد بسوں میں بھی رش ہو جاتا ہے اور ہر شخص کو جلدی بھی ہوتی ہے۔

آج بس بھی نہیں آرہی تھی۔ بس اسٹاپ پر بھی معمول سے زیادہ رش تھا، اور وہ گھر سے بھی دیر سے نکلی تھی۔ حالانکہ کہکشاں کو معلوم تھا کہ وہ نو بجے تک ضرور پہنچ جایا کرتی ہے۔ اور یہی اس کے ساتھ طے بھی ہوا تھا، لیکن کہکشاں ہمیشہ دس بجے کے قریب آیا کرتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر بس میں جگہ مل گئی تو وہ ساڑھے نو تک ضرور پہنچ جائے گی۔

نیا نے وہیں سائبان کے کھمبے کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ اور ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ لی۔ یوں تو اس نے بس اسٹاپ پر آتے ہی محسوس کر لیا تھا جیسے اس کے آنے سے بس اسٹاپ پر رنگ آگیا تھا، نور آیا تھا، زندگی آگئی تھی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایسے تماشے وہ ہر روز دیکھا کرتی تھی اور ایسے تماشائی نظاروں نے اُسے غرور آمیز خود اعتمادی دی تھی۔

ہر سال وہ نئی اور بہادر لڑکی ہوتی اور پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوتی۔

اب بھی۔ جب سے وہ بس اسٹاپ پر کھڑی تھی یہی محسوس کر رہی تھی۔ جیسے اس کے آنے سے

پہلے سب مرے پڑے تھے۔ ایک جھلک اس کی دیکھ کر سب جی اٹھے ہیں!

کالج کے لڑکے تو خیر ہوتے ہی چلبلے ہیں۔ عمر، رنگ، نسل دیکھے بغیر ہر عورت پر آوازے ہیں۔ مگر ادھر اُدھر دو ادھیڑ عمر حضرات بھی بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے شیروانیاں پہنی ہوئی تھیں اپنے آپ میں گم صم بیٹھے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ نیا کو دیکھا تو جیسے دونوں نیند سے جاگ ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ نیا جانتی تھی کہ کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر بھی بلند آواز میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ بیماری تقریباً سبھی کو ہے۔

دو کالج جانے والی لڑکیاں جو سب کی نظروں سے بچ کر ذرا دور کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ کو دیکھ رہی تھیں۔

ایک فقیر جس کی آمدنی کا وقت ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور دور بیٹھا چرس کا سگریٹ پی اطمینان سے سگریٹ کے مرغولوں کے بیچوں بیچ نیا کو گھورے جا رہا تھا۔ آخر دل تو فقیر کے

دو برقع پوش خواتین جنہوں نے نقاب الٹ رکھے تھے وہ بھی نیا کی جانب دیکھ کر ہی رہی تھیں کیونکہ نیا کے آنے سے پیشتر لوگ انہیں بے تحاشا گھور رہے تھے۔

"گوجرانوالہ کے مرغ چھولے"۔ والی ریڑھی پر خاصا رش تھا۔ ناشتہ کرنے والے بھی بس اسٹاپ ہی دیکھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی چائے والا کھوکھا تھا۔ پرلی طرف جوتیاں گانٹھنے والا بیٹھا تھا۔ ابھی ہر طرف زندگی کا کاروبار شروع ہی ہوا تھا۔ کسی کی زبان تیز تیز چلنے لگی تھی اور کسی کا ہاتھ

سُرخ رنگ کی مزدا کار تیسری بار نیا کے قریب سے گزری تھی۔ نیا کو دل میں تو بہت مگر بظاہر وہ سنجیدہ بنی کھڑی تھی۔ حضرت ہر بار بس اسٹاپ کا چکر لگا کر دور چلے جاتے اور پھر واپس آجاتے۔ اور نیا کی طرف یوں التجا بھری نظروں سے دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں: "خدا اور گاڑی میں بیٹھ جا۔"

حالانکہ سب جان رہے تھے کہ یہ سُرخ مزدا صرف نیا کی خاطر ڈانواں ڈول پھر رہی ہے۔ والے کو شرم نہیں آرہی تھی۔ کیا وہ اس قدر بے وقوف ہے کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ فقط ایک کوئی لڑکی اپنی موتیوں بھری جوانی داؤ پر لگا دے گی!

اونہہ — ایسے نظارے تو نیا روز سڑک پر کھڑی ہو کر دیکھا کرتی تھی۔ کون موٹر والا تھا جو مُڑ کر اس کو نہیں دیکھتا تھا۔ اور کون راہ گیر تھا جس کا دل اُسے دیکھ کر نہیں دھڑکتا تھا — ؟

ایک تو اُس کا حُسن ہی جلا دینے والا شعلہ تھا۔

اُس پر اُس کا حُلیہ جان کھینچ لینے والا تھا۔

تنگ پائنچوں کی جینز کے اوپر اس نے ہائی نیک کا فل سلیوز بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ تنگ بلاؤز اس کے قیامت خیز جسم سے یوں چمٹا ہوا تھا جیسے اس کے انگ انگ کی چغلی کھانا ہی اس کا اصل مقصد ہو۔ لمبے بال کھلے تھے انہیں نیچے سے کاٹ کر ان کی سطح برابر کر دی گئی تھی۔ سنہرے سنہرے بالوں کے اوپر سنہری کرنیں دمک رہی تھیں۔ گوری رنگت پر کھُلے بال، قیامت ڈھا دیتے ہیں۔ اس نے تو بڑے سلیقے سے میک اَپ بھی کر رکھا تھا۔ خوب صورت آنکھوں کے اندر کاجل نے حصار کھینچا تھا۔ ایسا حصار — جس کے قریب آتے ہی ہر دل پھڑکنے لگتا ہے۔

جوانی تو چاندنی ہوتی ہے۔

اور چاندنی پر کون پہرے بٹھا سکا ہے۔

چاندنی کو گو چھُوا نہیں جا سکتا مگر چاندنی پر ہر غریب، امیر کا برابر حق ہوتا ہے۔

اور اگر چاندنی سڑکوں پر نکل آئے۔

تو کون کافر ہے جو منہ پھیر کر گزر جاتے؟

پھر بھی نیا نے اتنی بے شمار، طلبگار اور نوخوار نظروں کی چبھن محسوس کر کے ناگواری سے سوچا۔ اِن مردوں کے اندر پتہ نہیں کون سی خوبی ہے۔ سبھی ایک جیسے ہیں اور جس عورت کو دیکھتے ہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کھا پی جانا چاہتے ہیں۔ آخر ہم عورتیں بھی ہیں، سڑک پر جاتے ہوتے کبھی پروا ہی نہیں کرتیں۔ کہ کیسا مرد گزرا تھا اور کیوں گزرا تھا!

اسنے میں بس آگئی۔

نیا نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ یہی نیا کی مطلوبہ بس تھی۔ دوڑ کر سوار ہونے لگی تو سب نے راستہ چھوڑ دیا کون تو شہنشاہ ہوتا ہے۔ بس پر چڑھتے وقت اُس نے ایک خوشبودار جھونکا اپنے پیچھے چھوڑا۔ اور

پھر بس کے اندر ہلچل مچانے کے لئے وہ شیشوں کے پیچھے گم ہوگئی۔

شادمان کے موڑ پر جب بس رکی تو نیا یوں چھلانگ لگا کر اتری جیسے بھوتوں کے دیس سے کسی جل پری نے جنم لیا ہو۔

تیز تیز قدم اٹھاتی اور پرس جھلاتی وہ سڑک پار کر گئی۔ مین روڈ سے ذرا اندر کی طرف ایک گلی میں، ایک خوب صورت سی انیکسی کے اوپر، رنگ برنگی روشنیوں کے ساتھ لکھا تھا "بیوٹی پارلر"۔ نیا اسی طرف چلی گئی۔ اس نے نیلے پردوں والا دروازہ ہینڈل گھما کے کھولا اور اندر چلی گئی۔

کمرہ صاف تھا اور ائرکنڈیشنر چل رہا تھا، جس کا مطلب تھا کہ حسینہ اور مریم آچکی ہیں۔ ایک طویل سانس لے کر نیا پرس صوفے پر رکھ دیا اور پھر سامنے دیوار پر لگے ہوئے آئینوں میں سے ایک شیشے کے آگے جا کر کھڑی ہوگئی۔

"توبہ ہے۔ بس کا سفر کتنا ذلیل ہے"۔ اس نے اپنا سراپا دیکھ کر کہا۔ "کتنی بھی احتیاط کرو خراب ہو ہی جاتا ہے۔ اور پھر ایسے ذلیل لوگ بسوں میں سفر کرتے ہیں کہ بال اور کپڑے تک روئے گزرتے ہیں۔

نیا نے اپنا تنگ بلاؤز کھینچ کر برابر کیا۔ لپ اسٹک اٹھا کر اپنے اوپر والے ہونٹ کا خم درست کیا۔ برش سے چمکتے بالوں کو برابر کیا، اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ کولون کی بوتل اٹھا کر سارے اسپرے کیا۔ ایر کنڈیشنر کی ہوا میں اسپرے کی خوشبو جلد ہی سارے کمرے میں پھیل گئی۔

اپنا آپ درست کر کے نیا دو چار قدم پیچھے ہٹ گئی اور پھر پیٹھ موڑ کر اس نے آئینے میں پورے سراپے کا جائزہ لیا۔

نیا کو اپنے خوش رساماں جسم کا پورا پورا احساس تھا۔

دو ابھار آگے اور دو پیچھے۔ درمیان میں پتلی سی کمر چاندی کے گلدان کی طرح۔ خوبصورت گوری رنگت، صراحی دار گردن کے ساتھ ساتھ اترتے ہوئے شانوں سے جاتی ہوئی دو سفید اور گلابی بانہیں۔۔۔ جیسے کہساروں کی آغوش سے نکلتی ہوئی دودھ کی نہریں۔

پیٹ اس طرح کمر کے ساتھ چپکا ہوا تھا کہ سانس لینا بھی بار گزرتا تھا۔

جسم کیا تھا، چاند کا ہالہ تھا۔ اطراف سے چاند نباں چٹکیاں کھاتی تھیں ـــــ اپنے سراپا کو دیکھ کر نیا پر ایک نشہ سا چھا گیا۔۔۔۔۔

اس نے دور و نزدیک سے اپنے آپ کو اچھی طرح دیکھا۔

اسے معلوم تھا کہ اس کی صورت ایمان شکن ہے۔ مگر اس کا جسم کس حد تک توبہ شکن ہے۔ وہ اسے آج بیوٹی پارلر میں آ کر معلوم ہوا تھا۔

ہاں یہیں پر آ کر اسے معلوم ہوا تھا کہ قدرت نے اسے بہت سی نعمتوں اور سوغاتوں سے مالا مال کیا ہے اپنے خزانے کا پورا ادراک پاتے ہی وہ ساتویں آسمان پر پہنچ گئی تھی۔ اسے گزرے دنوں کا بالکل ملال نہیں تھا۔

گزرے دنوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ بلکہ اب تو اس نے ایک بالکل نیا جنم لیا تھا۔ وہ اپنے جسم یا اپنی صورت سے ایک بچے کی ماں نہیں لگتی تھی۔ حالانکہ اب موتی تین سال کا ہو گیا تھا۔ تین سال کتنی جلدی گزر گئے تھے! پچھلے پانچ سال وہ اپنی زندگی میں شمار کرنا نہیں چاہتی تھی اور اگر کر بھی لیتی تو بھی اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ وہ اٹھارہ سال کی تھی جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ اور تئیس برس کی تھی تو طلاق لے کر گھر آ گئی۔ یوں تو عام طور پر لڑکیوں کی اس عمر میں شادی ہوتی ہے جس عمر میں اس کو طلاق ہو گئی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

تین برس گزر گئے تھے۔

اور اس نے اپنی عمر کا سرا پیچھے سے جا کر پکڑ لیا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس وقت چھبیس سال کی حسینہ ہے، اب بھی وہ بائیس برس کی لگتی تھی اور یہ سارا کمال اس بیوٹی پارلر کا تھا۔

اپنا بہکتی ہوئی سانسوں میں مگن ہو کر نیا صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

کمرے میں ایر کنڈیشنر کی آواز اور اسپرے کی خوشبو کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ایکسرسائز روم سے نکل کر حسینہ نے ایک بار ادھر جھانکا تھا، پھر واپس جا کر چربی پگھلانے والی مشینوں کو صاف کرنے لگی تھی۔ اب کوئی گاہک نہیں آیا تھا۔ نیا ریلیکس ہونے کے لئے ویسے ہی نیم دراز رہی۔

اپنے آپ کو پالینا کس قدر خوبصورت حقیقت ہے۔ بہت سے ایسے بدنصیب لوگ ہیں جو زندگی بھر اپنا سراغ نہیں پا سکتے۔ مگر نیا نے اپنے آپ کو ڈھونڈ لیا تھا، پا لیا تھا، دیکھ لیا تھا۔

اور اب وہ اپنے ہی عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔

فنافی الوجود کا نشہ بھی بڑا ظالم نشہ ہوتا ہے۔

کھٹاک سے دروازہ کھلا اور ایک موٹی سی عورت اندر داخل ہوئی۔ نیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ عورت پچھلے دو مہینوں سے اپنا وزن کم کرنے کے لئے آ رہی تھی۔ کیا وزن کم کرنے سے یہ خوبصورت ہو جائے گی؟

اس عورت نے اپنا تھیلا زمین پر رکھا اور ایکسرسائز روم میں چلی گئی۔ نیا اس عورت کے بارے میں کرتے گوشت اور صوفہ نما کولھوں کو دیکھ کر کراہیت سی محسوس کرنے لگی... تو یہ بھی کوئی ہم سے اس کا دل چاہا وہ اپنے سارے وجود کو بازوؤں میں بھر لے اور پھر... پھر کیا کرے؟

اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور ایک سوکھی ساکھی لڑکی داخل ہوئی، یہ لڑکی اپنا جوڑا لینے آئی اور یہ محترمہ جب بھی تشریف لاتیں۔ موٹے ہونے کے نسخے پوچھا کرتیں۔ عجیب۔

یہ دنیا بھی ——!

نیا اٹھ کر مختلف قسم کے ڈبے ٹٹولنے لگی۔ تاکہ اس کی چٹ ڈھونڈ کر اس کا جوڑا نکال دے نیا نے جلدی ہی اس کا جوڑا ڈھونڈ کر اسے دے دیا۔

کسٹمرز آنا شروع ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی کہکشاں بھی آئی تھی۔

کہکشاں ایک اٹھائیس سالہ خاتون تھی جو لندن سے آرائش جمال و آرائش گیسو کی ٹریننگ لے آئی تھی۔ اس نے آتے ہی یہاں ایک "بیوٹی پارلر" کھول لیا تھا۔

نیا نہ صرف اس کے ہاں ملازم تھی بلکہ حصے دار بھی تھی۔ اور یہ کام نیا کو بہت پسند آیا تھا۔ کہکشاں نے دو اور لڑکیاں بھی ملازم رکھی ہوئی تھیں، حسینہ ایکسرسائز روم میں خواتین کی مدد کرتی تھی۔ اور مریم تھریڈنگ اور جوڑے بنوانے میں معاونت کرتی تھی۔

"ہیلو نیا" کہکشاں نے آتے ہی اپنا پرس میز پر رکھ دیا۔ اور آئینے کے آگے کھڑی ہو کر اپنا جوڑا

ست کرنے لگی۔

"ہیلو کہکشاں" نیا نے خوش دلی سے کہا۔

"مسز ملک تو نہیں آئیں" کہکشاں نے پوچھا۔

"نہیں تو"

"میں نے انہیں دس بجے کا ٹائم دیا تھا، نیا پلیز تم ذرا ان کا جوڑا ان کے آنے سے پہلے بنا دو"

نیا نے کہکشاں کے ہاتھوں سے لمبے بالوں کی وگ لی اور پلاسٹک کی گولڈن کنگھی پکڑ کے کرسی پر جا بیٹھی، اس نے بڑی نفاست سے بالوں کو سلجھانا شروع کر دیا۔

پھر تو پارلر میں آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

کوئی بال سیٹ کروانے آ رہی تھی۔ کسی کو تھریڈنگ کروانی تھی۔ کوئی پتلا ہونا چاہتی تھی۔ کسی کو جوڑا لگوانا تھا۔

نیا جوڑا بنا کر اٹھی تو اس نے دیکھا ایک کیبن میں کہکشاں بیٹھی ایک لڑکی کو دلہن بنا رہی ہے۔ بے اختیار ہو کر وہاں جا کر کھڑی ہو گئی، لڑکی معمولی شکل و صورت کی تھی، مگر آج اس کے چہرے پر شیوں کا وہ نور تھا جسے شادی کہا جاتا ہے۔

یونہی۔ نیا بے خیالی میں سوچنے لگی کہ اسے معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ یہ پنج تن کو رکس چاؤ سے سنوار رہی ہے!

"نیا پلیز! کہکشاں بولی۔ "میں نے اسے تیار کر دیا ہے، اب تم اس کے بال سنوار کے یہ والا ہار لگا دو، اور سارے زیور پہنا دو۔ ابھی ایک اور دلہن آنے والی ہے، میں اس کی چیزیں تیار کر دوں"

نیا جا کر اس لڑکی کے سامنے بیٹھ گئی۔

"آپ کے شوہر آپ کے رشتے دار ہیں؟"

"نہیں" لڑکی نے شرما کر کہا۔

"شادی کے بعد کہاں جانا ہے؟"

"کراچی ——"

"انہوں نے پہلے آپ کو دیکھا ہے؟"

"ہاں منگنی کے روز دیکھا تھا۔"

"آپ اپنی ساس کے ساتھ رہیں گی؟"

"شاید ——" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

نیّا نے اس کی مصنوعی پلکوں پر ذرا سا اور مسکارا لگا دیا۔ برش پکڑ کر جب نیّا اس کی پلکوں پر
اس نے صاف پڑھ لیا کہ لڑکی کی آنکھوں میں بے چین خواب مچل رہے تھے۔

نیّا کے دل میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ لڑکی کو صاف بتا دے کہ
اور کپڑے کے عوض بیچی جا رہی ہے۔ تیرے خواب بیچے جا رہے ہیں۔ تیرا تن بیچا جا رہا ہے
تجھے پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کب معاشرے کے گدھ تیرا گوشت نوچ لیں گے!

لیکن وہ چپ چاپ اسے سجاتی رہی۔

اس پر خوشبوئیں چھڑکتی رہی۔

تیار ہو کر جب لڑکی نے گھونگٹ نکالا۔ تو اس کی چھب ہی بدل گئی۔ اس کا چہرہ ارمانوں کی
سنورش سے اور سرخ ہو گیا تھا۔

شاید اسی کو دلہن کا روپ کہتے ہیں۔

اس انجان پنے اور مغالطے کا نام لوگوں نے روپ رکھ چھوڑا ہے۔

نیّا کو ایک دم وہ لڑکی بے وقوف نظر آنے لگی۔ اس کا دل گھبرانے لگا وہ اس کے آگے سے
گئی اور دور جا کر ہاتھ دھونے لگی ابھی وہ تولیئے سے ہاتھ صاف کر رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک
عورت داخل ہوئی، اس کی صورت سے ہی معلوم دے رہا تھا کہ وہ اس قسم کے پارلر میں پہلی دفعہ
ہو رہی ہے۔ بڑے سادہ سے اور بے ڈھنگے کپڑے پہن رکھے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں
اور حرکات و سکنات سے بھی بے اعتباری سی ظاہر ہو رہی تھی۔

"فرمائیے ——" نیّا مستعدی سے اس کے قریب گئی۔

"مَیں..... میں....." وہ ہکلائی۔ "مجھے ساڑھی باندھنا سکھا دیجئے۔" بمشکل اس نے

الفاظ ادا کئے۔

نیّا اندر ہی اندر مسکرائی۔ مگر بظاہر سنجیدگی سے بولی۔ "ساڑھی لائی ہیں آپ؟"

"جی ہاں ——"

"بلاؤز اور پیٹی کوٹ بھی ——"

"جی بلاؤز تو لائی ہوں۔ مگر پیٹی کوٹ کا مجھے پتہ نہیں تھا۔"

"خیر میں بندوبست کر دیتی ہوں۔ آپ اس کمرے میں چلئے۔" اس نے ریٹائرنگ روم کی
طرف اشارہ کیا۔

نیّا اس کے پیچھے اندر چلی گئی۔ الماری سے ایک پیٹی کوٹ نکالا اور ساڑھی کی تہہ کھولنے لگی۔

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

"جی میں ساہیوال کی رہنے والی ہوں۔"

"تعلیم کتنی ہے؟"

"جی میں میٹرک میں پڑھتی تھی کہ شادی ہو گئی۔"

"شادی کو کتنے سال ہوئے ہیں؟"

"چھ سال ہوتے ہیں۔"

"اور آپ کو اب ساڑھی پہننے کا خیال آیا ہے؟"

"جی کیا کروں؟ میرے میاں کی ٹرانسفر لاہور ہو گئی ہے۔ انہوں نے یہاں آ کر میرا پردہ اتروا دیا
ہے۔ اور وہ کہتے ہیں۔ میں شہر کی عورت کی طرح ساڑھی پہنوں، جوڑے بنا کر ان کے ساتھ چلوں۔۔۔
اور مجھے ڈانٹتے ہیں اور جی مجھے تو ساڑھی باندھنا بھی نہیں آتا۔ آج مجبور ہو کر یہاں آ گئی ہوں۔"

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"جی تین بچے ہیں۔"

"یہاں آ جائیے۔ اس آئینے کے سامنے۔" نیّا باتوں کے دوران اسے ساڑھی پہناتی جا رہی تھی۔
لڑکی کی کوئی خاص اچھا نہیں سلا ہوا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا سا بے تکا سا تھا۔ وہ جو ذرا سا پیٹ نظر آ

رہا تھا، اسی کو آئینے میں دیکھ کر وہ چھوٹی موٹی بنتی جا رہی تھی، بُری طرح لجا رہی تھی۔

اور اس کا شوہر اس کے ساتھ ظلم کرنے والا ہے۔ اس کی یہ شرم چھیننا چاہتا ہے۔

نیّا نے بڑی خوب صورتی سے ساڑھی کے فال بنائے۔ پھر انہیں موڑنے کا طریقہ کندھے پر پلو ٹھکایا۔ اور اسے سمجھایا کہ کس قسم کی ساڑی کا پلو کس طرح رکھتے ہیں، عام طور پر جو والی ساڑیوں کے پلو پھیلے ہوتے اچھے لگتے ہیں۔

"اب ذرا چل کر دکھایئے۔"

مگر اس غریب کو ساڑھی کے ساتھ چلنا نہیں آ رہا تھا۔

"آپ ہمیشہ ساڑھی کے ساتھ ہائی ہیل کے سینڈل پہنا کریں۔"

"اور اس طرح چلا کریں۔" نیّا نے چل کر دکھایا۔

"ساڑھی پہن کر چلنے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ ساڑھی جسم کے ساتھ اس طرح لپٹی ہو کہ جسم کے خط واضح اور خوب صورت نظر آئیں اور یوں محسوس ہو جیسے آپ چل نہیں رہیں تیر رہی ہوں، اگر ایڑیاں نہیں دیں گی۔ تو یوں محسوس ہو گا جیسے بانس کے گرد کپڑا لپٹا ہوا ہے! اور آپ اپنا بلاؤز کسی اچھے درزی سے سلوائیں۔ اتنا ڈھیلا بلاؤز تو بالکل لفافہ لگتا ہے۔"

"جی یہ میں نے بغیر ناپ کے سلوایا تھا، کیونکہ درزی کو ناپ دیتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ناپ تو صرف ایک مرتبہ ہی دینا پڑتا ہے نا؟"

"اچھا جی — اب میں جاؤں؟"

"ہاں آپ جا سکتی ہیں۔"

"کتنے پیسے جی —؟"

نیّا ہنس پڑی۔ "آپ سے کوئی پیسے نہیں لوں گی، آپ دو چار بار گھر جا کر ساڑھی باندھیں اگر طریقہ نہ آتے تو پھر تشریف لائیں۔" نیّا نے کاروباری اخلاق سے کہا۔ "جب تک آپ مطمئن ہو جائیں میں کوئی پیسہ نہیں لوں گی۔"

"جی شکریہ بہت بہت۔"

وہ عورت دروازہ کھول کر جانے لگی۔ تو نیّا اس کے پیچھے لپکی۔ "اس طرح سے نہیں چلتے....

اس طرح آپ چل رہی ہیں۔ اس سے تو صاف پتہ چل رہا ہے کہ آج آپ نے پہلی بار ساڑھی پہنی ہے۔ اور آپ نے تو ساڑھی کو آگے سے یوں پکڑا ہوا ہے۔ جیسے کیچڑ سے بچ کر چل رہی ہوں، آگے چھوڑ دیں — ذرا پنجوں کے بل چلیں — پلو کو کندھے پر رہنے دیں — بالکل نہیں گرے گا۔"

"ہاں — ایسے — اب چلتی جاتیں — ڈریں نہیں .... گھر کیسے جاتیں گی —؟"

"باہر میرے شوہر کھڑے ہیں۔"

"ٹھیک ہے —"

وہ عورت باہر نکل گئی تو نیّا نے پردہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کا شوہر کوئی خاص اسمارٹ نہیں تھا ٹ پہننے کے باوجود گاؤں کا لگ رہا تھا۔ اس نے پردہ چھوڑ دیا۔ مڑ کر دیکھا تو کہکشاں اس کی ن دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

"توبہ ہے۔" نیّا نے ادا سے کہا۔ "میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی کہ ایسے بے وقوف لوگ اس ا میں بستے ہیں۔"

"کیوں —؟"

"اب یہ محترمہ اس عمر میں ساڑھی نہیں پہنیں گی۔ تو کیا ہو جائے گا!"

"بھئی اپنے شوہر کی خوشنودی کی خاطر عورت کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا!"

"اونہہ — کل کو شوہر کہہ دیں آگ میں کود جاؤ۔ تو یہ کود جائیں گی۔"

"کرنا ہی پڑتا ہے نیّا بیگم۔"

ابھی نیّا برا سا منہ بنا رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک چھوٹے سے قد کی عورت اندر داخل ہوئی۔

"فرمایئے —" نیّا آگے بڑھی۔

"میں فیشل کے لئے آئی ہوں۔"

نیّا نے کہکشاں کی طرف دیکھا۔

"میرے پاس ابھی ایک دلہن آئے گی، تم ذرا ان کا فیشل کر دو۔"

"ٹھیک ہے۔" نیّا اسے دوسرے کیبن میں لے گئی، اُسے کرسی پر بٹھایا اس کے گرد
بب نما کپڑا باندھا اور بولی۔ "آپ کی جلد کیسی ہے۔"

"خشک ہے جی۔"

"خشک جلد کا بہت زیادہ دھیان رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وقت سے پہلے
چٹخ جاتی ہے۔"

"جی ہاں۔ دیکھیں نا میرے چہرے پر جھُرّیاں پڑ گئی ہیں۔ پلیز آپ اِن کا کچھ کریں۔"

نیّا نے محسوس کیا جیسے اس عورت کی عمر پینتیس برس کی ہوگی پینتیس برس کی عمر میں
نہیں پڑیں گی تو کیا پھول کھلیں گے! پتہ نہیں یہ عورتیں ہمیشہ خود فریبی میں کیوں مبتلا رہتی ہیں۔
ان عورتوں کو سدا حسین اور جوان رہنے کی ہوس کیوں ہے۔! ایک دن گزرتی عمر کے کچھ لمحے
نہیں کر لیتیں۔!

"آپ نے کبھی پہلے فیس مساج کرایا ہے۔"

"جی نہیں۔"

"پھر اب اچانک کیسے خیال آ گیا۔؟"

"بس جی میں تو بال بچوں میں اپنا آپ بھُول چکی تھی۔ میرے شوہر ذرا شوقین مزاج واقع
ہوئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں۔ میں پہلے کی طرح شگفتہ نظر آؤں۔ اور آپ جانتی ہیں کرنا ہے
مطابق چلنا پڑتا ہے۔"

(اد نہہ، نیّا کو غصہ آیا۔ ایک جوتا مارو اپنے شوہر کے مُنہ پر اور کہو میں ایسے ہی ٹھیک
"میں پہلے آپ کو انڈے کا ایک ماسک لگاؤں گی۔ آدھے گھنٹے کے بعد بھاپ دوں گی
جب چہرہ صاف ہو جائے گا تو پھر ایک ماسک ویجی ٹیبل کا لگانا ہوگا۔ اس سارے کام میں
گھنٹے لگ جائیں گے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" اس عورت نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا چہرہ تو ٹھیک ہو جائے
"فرق تو ضرور پڑ جائے گا۔ مگر صرف ایک بار فیشل کروانے سے کچھ نہ ہوگا، آپ کم از کم

ہیں ایک بار ضرور آیا کریں۔"

"بہت اچھا۔"

نیّا نے جلدی جلدی انڈے سے ایک محلول تیار کیا اور اس خاتون کے چہرے پر لیپ کر دیا۔
"آپ تیس منٹ تک یونہی بیٹھی رہیں۔ بالکل ہلیں جلیں نہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔ یہ کہہ کر
نیّا باہر نکل آئی۔

کہکشاں ایک نئی لڑکی کو دُلہن بنا رہی تھی۔ دو لڑکیاں رولرز لگا کر ڈرائیر میں بیٹھی ہوئی تھیں
حسینہ ایک وگ کو رولر لگا رہی تھی۔ ایک موٹی عورت دروازے کے پاس کھڑی تھی، نیّا کو دیکھ
کر وہ اس کے قریب آ گئی۔

"فرمائیے۔"

"میرا وزن بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ سے مشورہ لینے آئی ہوں۔"

"میرا مشورہ تو یہی ہے بی بی کہ آپ ہر ممکن طریقے سے وزن کم کریں۔"

نیّا اسے ایکسرسائز روم میں لے گئی۔ اسے سب مشینوں کے بارے میں سمجھایا، اس کے بعد
خوراک کا چارٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ فیس کے بارے میں بتایا اور پھر لیکچر بھی دیا۔ "خالی ورزش
سے کچھ نہیں ہوگا محترمہ! جب تک آپ ڈائیٹ کنٹرول نہیں کریں گی، یہاں بہت سی خواتین
آتی ہیں، بہت زیادہ ورزش کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی شکوہ کرتی ہیں کہ ہمارا وزن کم نہیں ہوا۔ مگر وہ
اپنے ساتھ ایک ظلم بھی کرتی ہیں۔ جس قدر ورزش کرتی ہیں گھر جا کر اُسی قدر کھا لیتی ہیں۔ متناسب
جسم رکھنا چاہتی ہیں تو متناسب خوراک کھانی ہوگی۔"

"جی۔ میں پورا پورا پرہیز کروں گی۔ پہلے ہی میرے شوہر نے طعنے دے دے کر میرا جینا
حرام کر دیا ہے، کہتے ہیں اگر میں نے وزن کم نہ کیا تو وہ دوسری شادی کر لیں گے۔" نیّا کا خون کھول گیا۔
"تو یہ آپ کا جسم بے ڈول کیسے ہوا؟"

"بچّے کی پیدائش کے بعد۔"

"کس نے کیا یہ سب؟"

"وہ عورت شرما کر ہنسنے لگی۔ "شوہر کے ساتھ سوال جواب تو نہیں ہو سکتا نا؟"

نیا کو وہ عورت بھی احمق لگی۔ وہ اُسے چھوڑ کر اندر گئی۔ تیس منٹ ہو گئے تھے۔ عورت آوازیں دے رہی تھی۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد فارغ ہو کر نیا بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ ایک اور لڑکی نمودار ہوئی۔ "کام ہے، نیا نے بیٹھے بیٹھے پوچھا۔"

"میرے چہرے پر رُوداں بہت ہے — اور" کیا کروانا چاہتی ہیں آپ —"

"میرا چہرہ صاف کر دیں۔"

"تھریڈنگ کروائیں گی یا کاٹری —؟"

"جو بھی آپ مناسب سمجھیں۔"

"میرے خیال میں تھریڈنگ کروالو۔ کیونکہ کاٹری سے جلد پر نشان رہ جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تھریڈنگ کر دیں۔ مگر کیا بال ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے؟"

"بی بی یہ تو آپ کی جلد پر منحصر ہے — آپ کے بالوں پر منحصر ہے — آپ تھریڈنگ کرواتی رہیں — پتہ چل جائے گا۔"

"جی دراصل — میری اگلے مہینے شادی ہونے والی ہے — اور مجھے — ڈر لگتا ہے۔"

"خواہ مخواہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ بہت خوب ہیں تھریڈنگ نہ بھی کروائیں تو اچھی لگیں گی، خیر —" اُس نے مریم کو بلایا اور بولی "تھریڈنگ کر دو۔"

گو زندگی کو تیز تر رکھنے کے لئے لہو گرم رکھنا پڑتا ہے۔ پلٹنا جھپٹنا اور کام میں لگے رہنا۔ شام ہوتے ہوتے نیا تھک جاتی تھی، جسم کا جوڑ جوڑ دُکھنے لگ جاتا تھا۔ مگر یہ دلچسپ قسم کی آزادی تھی یہاں، پھر بھی مسلسل بول بول کر اُٹھ بیٹھ کر نیا تھک جاتی، نیا نے کہہ دن ہی کہہ دیا تھا کہ وہ شام کے چھ بجے چلی جایا کرے گی۔ کیونکہ وہ جس محلے میں رہتی رات کو جلدی نہ پہنچنا آفت مچا دے گا اور پھر اسے موتی کا بھی خیال تھا، جسے صبح

کے پاس چھوڑ آتی تھی۔ ویسے تو پارلر رات کے نو بجے تک کھلا رہتا تھا۔ مگر نیا چھ بجے رخصت ہو کر آجاتی۔

گھڑی نے چھ بجائے تو نیا نے اپنا پرس اٹھا لیا — آئینے کے آگے کھڑی ہو کر اپنے ریشمیں اور چمکدار بال درست کیے، برش کرنے سے ان میں سے روشنی کے تار نکلنے لگے تھے۔ میک اپ تو ٹھیک ہی تھا۔ مگر اس نے حسبِ معمول لپ اسٹک اٹھا کر اپنے ہونٹوں پر ایک اور تہہ جمائی اور کہکشاں کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

باہر ابھی دو تین موٹریں کھڑی تھیں۔ ایک لمبی سی موٹر ابھی ابھی آکر رُکی تھی اور اس میں سے ایک انتہائی خوب صورت خاتون نکل کر اندر جا رہی تھیں۔ اسٹیئرنگ پر غالباً ان کا شوہر بیٹھا تھا۔ بہت دلکش تھا وہ بھی۔

طمانیت کے نشے سے لدی ہوئی وہ عورت اندر چلی گئی۔

لیکن نیا کو باہر جانا تھا۔

جاتے جاتے اُس نے اس کے شوہر کی جانب دیکھا۔ وہ نیا کو یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے پہلی مرتبہ کسی عورت کو دیکھا ہو۔ آنکھوں میں وہی بھوک، ہونٹوں پر وہی پیاس — ادھ سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہا تھا۔ اور اس طرح بیٹھا تھا۔ جیسے نیا کو دیکھ کر اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ سر سے پاؤں تک گھورے چلا جا رہا تھا۔

ایک بے نیازانہ ادا کے ساتھ نیا اُس کے قریب سے گزر گئی۔ گیٹ کے پاس جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک گردن باہر نکالے مڑ کر اسی کو دیکھ رہا تھا۔ چھی — نیا کو بڑی گھن آئی۔

کتنی خوب صورت ہے اس کی بیوی... اُسے تو چاہیئے کہ دنیا کی کسی عورت کی پروا نہ کرے، مگر یوں دیکھ رہا تھا جیسے کھا ہی تو جائے گا۔

کیا چیز ہوتے ہیں یہ مرد۔

کیا ہر عورت پر ان کا دل آجاتا ہے — یا نگاہ آجاتی ہے۔

آخر یہ ہی انوکھی نرالی ہو نیا، اس کے دِل نے کہا، بھلا تمہیں کوئی نظر انداز کر سکتا ہے؟

پھر جب وہ سڑک پار کرنے لگی تو وہی عالم تھا۔ سڑک کے ہر راہ گیر نے اس کی جانب تیز رفتار موٹر والوں نے، طوفان میل رکشا والوں، آوارہ خرام سائیکل والوں نے۔ اور گرد بسوں کی سواریوں نے بھی۔

یہ زندگی ہے۔

عورت کے اوپر ہر روزن سے دو آنکھیں لگی ہیں۔

اور کیا ان آنکھوں سے بچ کر وہ کہیں جا سکتی ہے؟

کہیں نہیں۔

انہی آنکھوں کو شاید امی جان زمانہ کہتی ہیں۔!

انہیں تو نیا کی ہر بات سے خوف آتا ہے۔ کہتی ہیں، تم طلاق ہو، اچھے کپڑے نہ پہنا آپ نہ کرو، بازار میں کھلے منہ نہ چلو، لوگ کیا کہیں گے! محلہ باتیں بناتا ہے۔

بناتا ہے باتیں تو بناتے۔ بھری بہار میں کسی نے اس کی جوانی کو آگ لگا دی، تو کیا وہ اس میں جل مرے۔؟

نہیں، وہ اس آگ میں کندن بنے گی، کندن۔

امی جان کو اس بات کی کیا خبر؟

اس نے جلدی سے دوڑ کر سڑک پار کی، کیونکہ دوسری طرف اس کی بس کھڑی ہوئی تھی پھر لپک کر بس میں سوار ہو گئی۔

بس اسے گھر سے ذرا دور ہی اتار دیتی تھی۔ تھوڑا سا فاصلہ اسے پیدل چل کر طے کرنا اس ذرا سے فاصلے سے ہی اسے ڈر آتا تھا، گھر کے قریب ہر شخص بزدل کیوں ہو جاتا ہے؟ محاورہ یہ ہے کہ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے!

اس نے مڑ کر دیکھا۔

وہی کار اس کے پیچھے آ رہی تھی جو کئی دنوں سے اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

جانے اسے یہ احساس کیسے ہو گیا تھا کہ جب بھی وہ اپنے گھر کے بس اسٹاپ پر اترتی

ایک کالے رنگ کی کار کہیں سے لپک کر آتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلتی رہتی ہے تو آگے نکلتی ہے اور نہ اسے بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کبھی اس میں ایک آدمی ہوتا ہے، کبھی دو یا زیادہ ہوتے ہیں۔

اندھیرے میں وہ زیادہ تو نہیں دیکھ سکتی تھی مگر پھر بھی کار چلانے والے آدمی کی شکل دیکھ کر ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ کیسی یتیمی برستی تھی۔ اس کی صورت پر۔ اُف اللہ اسے کیا معلوم ایسے مظلوم صورتوں والے مردوں سے اسے کتنی نفرت تھی۔! جن کے چہروں پر التجا ہی التجا ہو، طلب ہی طلب ہو۔ روتی صورتیں، بسورتے جذبے، یہ تو بس دنیا میں بچے پیدا کرنے کو بھیجے جاتے ہیں۔

گھر پہنچی تو دیکھا، موتی حسب معمول ڈیوڑھی میں ہی کھیل رہا تھا۔ موتی شیریں بھابی کی تینوں بیٹیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ عائشہ، آمنہ اور فائقہ حسب معمول صاف ستھری تھیں۔ مگر موتی کے کپڑے میلے چکٹ تھے۔ کیچڑ میں لت پت تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس کی ماں گھر پر نہیں ہے اور پتہ نہیں امی جان روزانہ اسے نہلا کر اس کے کپڑے کیوں نہیں بدلتیں، ہاں اپنی پوتیوں کے نخرے اٹھانے سے ہی انہیں فرصت نہ ملتی ہوگی۔ غصّے سے کھولتی نیا گھر کے اندر چلی گئی۔ ابھی وہ امی جان سے کچھ کہہ نہ پائی تھی کہ بچیوں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ پرس رکھ کر دوڑتی ہوئی ڈیوڑھی میں نکل آئی۔

شیریں بھابی کی تینوں بچیاں چلا رہی تھیں، موتی نے تینوں کو باری باری مارا تھا۔ چھوٹی کی کلائی پر دانت گاڑے تھے۔ ایک کے بال نوچے تھے۔ دوسری کو دیوار کے ساتھ دھکا دے دیا تھا۔

یہ نیا جانتی تھی کہ موتی نے بری طرح مارا ہوگا۔ موتی بڑا ایگریسو AGGRESSIVE بچہ تھا اور پھر نیا نے کسی بات سے بھی منع نہیں کرتی تھی، ایک تو اس کے پاس منع کرنے کا وقت ہی نہیں تھا، دوسرے وہ موتی کی پرورش بالکل الگ انداز سے کرنا چاہتی تھی۔ اتنے میں شیریں بھابی بکتی جھکتی سر پہ آ پہنچی۔ نیا نے کچھ نہیں کہا صرف موتی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور کمرے کی طرف لے چلی۔

موتی خواہ مخواہ رُعب ڈالنے کو رونے لگا۔

لیکن شیریں بھابی کے کوسنے، نیّا کو دُور تک سنائی دیتے رہے۔

"جنگلی، وحشی، کمینے کی اولاد، کُتا۔

"مرجائے اللہ کرے۔

"روز میری بچیوں کا لہو پیتا ہے۔

"پتہ نہیں یہاں کیوں آمرا ہے، کم بخت کا دُنیا میں اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

"ماں کو تو اپنے فیشنوں سے ہی فرصت نہیں ہے۔

"جن کے چھوڑ دیا ہمارے لئے"۔

پھر جب کوئی جواب نہیں ملا تو وہ اپنی بچیوں کو دھمکانے لگی۔

"کم بختو! چلو اوپر اگر اب میں نے تمہیں اس سؤر کے ساتھ کھیلتے دیکھا۔ تو جان نکال لوں گی"

نیّا بڑے اطمینان سے روتے ہوئے موتی کے کپڑے اتار رہی تھی۔

شیریں بھابی کی گالیوں سے اسے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

کاش میرا موتی اس کابل ہو سکے کہ اس دنیا کے تپتے ہوئے رخسار پر بھرپور طمانچہ مار کے اگن کے ایک ایک سے بدلے لے۔ اور..... اور..... ان سب سے بدلا لے جنہوں نے مجھے دکھ دیئے ہیں۔!

سونے سے پہلے نیّا نے اپنے چہرے، گردن اور بازوؤں پر کلینزنگ کریم سے مساج کیا، جب سے اس نے "بیوٹی پارلر" جوائن کیا تھا اسے اپنا بہت خیال رہنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حُسن ایک عارضی شے ہے اور جوانی زیادہ دن تک نہیں رہتی اگر وہ اپنا خیال نہیں رکھے گی تو تباہ ہو جائے گی اور پھر یہی تو اُسے پارلر میں جا کر ہی معلوم ہوا تھا، کہ ایک قیامت جیسے جسم پر اللہ تعالےٰ نے ایک چاند جیسا چہرہ لگا دیا ہے یہ اتفاقات کبھی کبھی رُونما ہوتے ہیں۔ گو چاند کو داغ لگ چکا تھا، مگر داغدار چاند کو بھی لوگ چاند ہی کہتے ہیں۔!

وہ باقاعدہ صبح اٹھ کر ورزش کرتی تھی اور رات کو سونے سے پہلے مختلف کریمیں لگا کر چہرے کا مساج کرتی تھی..... فیشن کے مطابق خوب صورت کپڑے سلواتی تھی اور بڑے قرینے سے میک اَپ کرتی تھی۔ "کہکشاں بیوٹی پارلر" کی وہ جان تھی، اسے اتنا خوب صورت اور طرحدار بن کر جانا پڑتا تھا کہ سارا دن گاہکوں کے آگے اسے نمونے کے طور پر پیش کیا جائے۔ تبھی ہر عورت کہتی تھی۔

آپ کی رنگت بہت عمدہ ہے۔ چہرہ کس قدر شفاف، اور جلد کتنی ملائم ہے۔ جیسے بچے کے چہرے کی جلد ہوتی ہے۔

آپ کیا استعمال کرتی ہیں؟

پلیز آپ ہمارا بھی فیس ایسا کر دیں۔

نیا مسکراتی رہتی، وہ یہ نہ کہہ سکتی تھی۔ کہ بعض عطیات قدرت کی خاص مہربانیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں مگر وہ اپنے حسن کی بہت حفاظت کرنے لگی تھی۔

اچھی طرح مساج کرنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں اور چہرے کو ایک نرم کپڑے سے صاف کیا۔ اور پھر بستر ٹھیک کر کے اس پر لیٹ گئی۔

کروٹ کے بل لیٹ کر جب اس نے ایک بازو اپنے سر کے نیچے رکھا تو اس کا سارا وجود اس بازوؤں کی گرفت میں آ گیا۔ گریبان سے چاندنیاں ابل پڑیں اور ساتھ ہی ایک گرم اور خوابیدہ بو سی نکلی۔ اپنے وجود کی اس جان لیوا مہک سے جیسے وہ خود ہی سرشار ہو گئی، اس نے آنکھیں موند لیں۔ اور خود اپنے آپ کو جیسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

خوشبوؤں کی دودھیا چاندنی کے بیچوں بیچ کہیں دل دھڑک رہا تھا، جیسے کہساروں میں ندی بہتی ہے۔

اور دل کی دھڑکن وہ صاف سن رہی تھی۔

دل کی دھڑکن وہ ہر رات سونے سے پہلے سنا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ سننے کو اس کے پاس کیا تھا؟۔

دل دھڑک رہا تھا۔ تو اس میں ارمان بھی زندہ تھے۔

جس کا مطلب تھا وہ جوان بھی ہے اور امنگوں سے بے نیاز بھی نہیں ہوئی، ہر بار انسان ہار نہیں لیتا۔ مگر ٹوٹ کر جڑنے کے بعد۔ نفس کی پالکی ہر بار ارمانوں اور آرزوؤں سے کیوں لدوائے

پیچھے کوئی روشنی نہ تھی۔

اور آگے کوئی چراغ نہ تھا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی جس میں محرومی زیادہ اور طمانیت کم تھی۔

وہی گھر تھا، وہی کمرہ تھا، وہی بستر تھا، وہی چھت تھی۔ مگر حالات بدل گئے تھے۔ خیالات بدل

گئے تھے۔ شاید گردشِ لیل و نہار اسی کو کہتے ہیں!

جس دن اُسے طلاق ہوئی، اس کے ٹھیک پندرہ دن بعد ابا جی کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ انہیں ہسپتال لے جایا گیا، وہیں پر انہیں اوپر تلے دو اور اٹیک ہوئے اور ابا جی خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔

سچی کہتے تھے انہیں اکلوتی بیٹی کی طلاق نے کھا لیا۔

مگر کیا وہ کبھی، نہ مرنے کے لئے آئے تھے؟

نیا سوچا کرتی، آخر جانے والے ہمیشہ کوئی بہانہ کیوں ڈھونڈتے ہیں۔ یہ بہانے موت کو تو مل جاتے ہیں، جبکہ زندگی کو کبھی کوئی بہانہ نہیں ملا۔!

زندگی بھر وہ ابا جی کے فیصلوں کے آگے سر جھکاتی آئی تھی۔ اس نے ایک ہی فیصلہ کیا تھا اور ابا جی بزدلوں کی طرح قبر میں جا سوئے تھے۔ ابا جی کا بھی نہیں، زندگی بھر من مانیاں کر کے وہ دوسروں کا فیصلہ ماننے کے قابل ہی نہ رہے تھے۔

مگر وہ کیا کرتی!

اُس آخری ملاقات کے بعد اُسے شہباز سے دلی نفرت محسوس ہوئی تھی، شہباز اس قابل نہیں تھا کہ وہ کسی بھی لڑکی کا شوہر کہلوا سکتا، ایک مرد کے ساتھ تو عورت زندگی کا ہر دکھ جھیل سکتی ہے مگر کاٹھ کے پتلے کے ساتھ وہ جنت میں بھی سیج نہیں سجا سکتی۔!

جب چُپ کا دروازہ کھلا تو اس نے امی جان سے صاف کہہ دیا تھا "مجھے یہ فیصلہ منظور ہے یہ طلاق ہی میری قسمت بدل سکتی ہے، یہ نوٹس واپس نہ بھیجا جائے، اب اگر طلاق نہ ہوئی تو میں زہر کھا لوں گی، مر جاؤں گی، آپ کے گھر سے نکل جاؤں گی"۔

امی دنگ رہ گئیں اور ابا جی سر پیٹنے لگے۔ وہ خود وکیل صاحب سے ملنے چلی گئی تھی، عجیب بات ہے اس آخری ملاقات کے بعد، شہباز نے اسے تین پیغام بھجوائے تھے۔ ایک بار فون بھی کیا تھا۔ وہ اس سے ملنے کا خواہش مند تھا، مگر کیوں ــــ؟

خواہشیں سراب ہوتی ہیں۔ اندھا کر دیتی ہیں۔

اُس نے ایک ہی جواب دیا۔ طلاق ـــــ طلاق اور صرف طلاق۔

آخر طلاق اتنا بدنما دھبا کیوں ہے؟ میں اِسے زیور بنا کے اپنی پیشانی پر سجالوں گی اگر
اور بُزدل شوہر کے ساتھ رہنے کی نسبت، طلاق زیادہ دِلکش ہے۔

نیّا ایک دم بہادر عورت بن گئی۔

ذلّت کی طویل زندگی سے۔ عزت کے چند لمحے اچھے!

وہ اپنی عزتِ نفس کی خود حفاظت کر سکتی تھی۔

اور جب میاں بیوی کے درمیان محبت، پیار اور اعتماد و عزت کا رشتہ نہ ہو تو انہیں ایک
کے ساتھ رہنے پر شرع بھی مجبور نہیں کر سکتی، ماں باپ تو یہی چاہتے ہیں کہ رو پیٹ کر گزارہ کر لیا جا
مگر گزارہ کیوں۔؟

زندگی بسر کرنے کے لئے ہوتی ہے، گزارنے کے لئے نہیں۔!

نیّا تو جیسے ۔ بدلے لینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

جب جونیل آپا نے اپنے ترکش کا آخری تیر پھینکا اور یہ کہلوایا کہ اگر نیّا بچہ اپنے پاس رکھنا چاہ
ہے تو مہر معاف کر دے۔ تو نیّا نے صاف کہلوا دیا۔ "یہ بچہ آپ کا نہیں ہے۔ اس واسطے مہر کی رقم
معاف نہیں کی جائے گی۔ کچھ بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔"

ایسے میں جانے کیوں شہباز بیچ میں آ گیا تھا، اس نے کہا تھا۔ نیّا کی ہر بات مانی جائے گی۔
اس کا ہر مطالبہ پورا کیا جائے گا۔ شہباز نے مہر کے علاوہ اس کے سامان کا ایک ایک تنکا بھجوا دیا تھا،
بلکہ اپنے بچے کے لئے ایک ماہانہ رقم بینک میں مخصوص کرا دی تھی کہ زندگی بھر اسے ملتی رہے۔ مگر نیّا
نے صاف کہہ دیا تھا۔ "مجھے اس بھیک کی ضرورت نہیں، میرا بچہ ہے میں اسے پال لوں گی۔" یہ مہربانیاں
وہ شرمندگیاں تھیں جو نیّا کا دل صاف کرنے کی بجائے اُسے برہم کر رہی تھیں۔

ثواب لوٹتے ہیں خاک میں ملا کے مجھے!

کتنے عرصے تک نیّا کا مزاج کچھ اس طرح برہم رہا کہ جیسے اس کے وجود میں زہر ہلاہل گھل گیا ہو

ی بات کرے گا۔ اس کو کاٹ کھائے گی۔ نیّا مقدر کا گلہ نہیں کرنا چاہتی تھی، نہ اسے ہمدردیوں کی طلب
اللہ ہمدردی کرتا بھی تو کون ـــ اور وہ بھی طلاق یافتہ عورت سے !

بھائیوں نے بھی سارا الزام اسی پر دھرا، یہ وہی بھائی تھے جو سدا ابا جی سے نفرت کرتے رہے
کے نوابوں کی دھجیاں اڑاتے رہے انہیں جلاتے رہے، دکھ دیتے رہے، اور اب پسِ مرگ
ث بن بیٹھے تھے اور کہتے تھے۔ "نیّا نے ابا جی کی جان لے لی۔"

کیا یہ سب ابا جی کی وفات سے خوش نہیں ہوتے؟

سبھی کے جی کو قرار آ گیا۔

عنایت بھائی نے جلدی سے اپنی فلم کمپنی کھول لی اور ادیس بھائی اپنی من پسند دُلہن لے آئے،
کے مرنے کے بعد چھ ماہ بھی انتظار نہ کیا۔ اور اب انہیں نیّا کی ایک ایک حرکت پر اعتراض تھا۔

پورے چھ ماہ وہ گھر بیٹھی رہی۔۔۔۔ جلتی رہی، کُڑھتی رہی، منصوبے باندھ باندھ کر توڑتی رہی
چھ مہینوں میں بھائیوں اور بھابیوں نے اسے ہر قسم کی اذیت دے ڈالی۔ نیّا نے ٹوٹ کر خود سے
ت کی بچے کو کوسا، رشتے داروں کے پتھر کلیجے پر سہے۔ اور پھر ایک دن یوں کھڑی ہو گئی جس طرح
ر کے پہلے راؤنڈ میں نیچے گرا ہوا کھلاڑی کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر بھاگنا شروع کر دیتا ہے
جونہی اس نے پہلا قدم باہر نکالا، گھر میں ایک دھماکہ ہوا۔ امّی اب بیٹوں کی محتاج تھیں اس
لئے اب اُن کی عقل اور آنکھوں پر بھی پردے پڑے تھے، بھائیوں نے کہا۔ "اگر نیّا گھر سے قدم
نکالے گی تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔"

"تو پھر میں کیا کروں امّی، زندگی بھر بیٹھ کر اپنے نصیبوں کو رویا کروں؟"

"تم نہیں جانتیں نیّا، تم جوان ہو۔ اور زمانہ بہت بُرا ہے۔"

"ہاں اب مجھے بھی سمجھ آ گئی ہے امّی! کہ زمانہ بہت بُرا ہے۔ اب میں ایسے بُرے زمانے کے
بُری بن جانا چاہتی ہوں۔"

"جب تمہارے سر پر کوئی سائبان نہیں ہے نیّا، عورت کے دو ہی سہارے ہوتے ہیں۔ باپ

یا شوہر۔ تم دونوں سہاروں سے محروم ہو، زمانہ تمہیں نہیں بخشے گا۔"

"میں کون سا زمانے کے آگے ہاتھ پھیلا رہی ہوں۔"

"جو عورت ننگے سر ہوتی ہے سب اس کے بال نوچتے ہیں۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں، مَیں اب زمانے کا مقابلہ کروں گی اور ننگے سر کروں گی۔"

"نہیں بیٹی! تم اس زمانے کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اتنا بڑا دعویٰ نہ کرو، جب عورت کے شوہر کا ہاتھ نہ ہو۔ تو وہ بکاؤ مال سمجھی جاتی ہے، وہ بازار میں پڑی ہوئی وہ خوبصورت چیز ہے جس پر للچائی ہوئی نظر ڈالتا ہے۔ خرید سکے یا نہیں، مگر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

شوہر، شوہر، شوہر۔!

کیا بکواس ہے یہ لفظ۔ نیا چیخ پڑتی۔

"دیکھ لیا ہے میں نے شوہر، ایک ایسا مجبور اور معذور انسان جو اپنی بیوی اور بچے کو کچھ نہیں دے سکتا۔!!"

"ضروری نہیں کہ سب آدمی ایک سے ہوں۔" امّی جان نے اپنا لہجہ بڑا ٹھنڈا بنا کے کہا۔

"میری نظروں میں سب آدمی ذلیل ہیں، سبھی عورت کا خون چوستے ہیں، کبھی باپ بن کر، کبھی بھائی بن کر، کبھی شوہر بن کر۔"

"تم آج کل بہت جذباتی ہو رہی ہو۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ مجھے عقل آگئی ہے، ورنہ اندھوں کی طرح آپ کے بنائے ہوئے راستوں پر چلی جا رہی تھی۔"

امّی جان چُپ ہو جاتیں۔

"بچپن میں اس قدر نہ دبایا ہوتا، اپنا حق چھیننا سکھایا ہوتا، صحیح فیصلہ کرنے کا حق دیا ہوتا، آج یوں بے آسرا نہ ہوتی۔"

امّی جان پھر بھی نہ بولتیں۔

"مگر میں کیوں اپنے آپ کو بے آسرا سمجھ رہی ہوں، دُنیا میں صرف باپ، بھائی اور شوہر ہی تو سہارا نہیں ہوتے، سہارا تو یہ اولاد بھی نہیں بنتی جس کے لئے ماں زندگی کے پُل صراط سے گزر جاتی ہے۔" نیا قریب ہی سوتے ہوئے موتی کی طرف اشارہ کر کے کہتی۔ "عورت کو اپنا سہارا خود بننا چاہیئے۔ خود..." کبھی وہ کہتی۔ "مرد نے اپنی ذاتی غرض کی خاطر عورت کو اپاہج کر کے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ یہ سب مرد کے بنائے ہوئے قانون ہیں اور میں ان کو نہیں مانتی۔"

"میں ٹھکرائی ہوئی عورت ہوں۔ میں آپ کو زندہ رہ کر دکھاؤں گی اور بڑی شان سے زندہ رہ کر دکھاؤں گی۔"

امّی جان اپنا سفید بالوں والا سر اٹھاتیں اور بڑی محبت سے کہتیں۔ "بیٹی میری مانو تو کوئی شریف آدمی ڈھونڈ کر شادی کر لو، ابھی بچہ چھوٹا ہے۔ اور تم جوان ہو، یہ پہاڑ سا جیون۔"

"ہاں یہ پہاڑ سا جیون ایک بار پھر عذاب بنا ڈالوں۔" نیا بپھرنے لگتی۔ "آسمان سے گری ہوں تو کھجور میں اٹک جاؤں! ایک آدمی اپنے بچے کو تحفظ نہیں دے سکا۔ تو دوسرا آدمی کسی دوسرے کے بچے کو کیا تحفظ دے گا؟ آج میں خود مختار ہوں، اپنے بچے کو بہتر مستقبل دینے کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں، کل میرے پاؤں میں کسی اور کی زنجیر ہو... اور پھر اپنے بچے پر ظلم ہوتا ہوا دیکھوں اور لہو کے گھونٹ پیتی رہوں، یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

"بیٹی ایک جوان عورت کے لئے تن تنہا زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتیں۔"

"ہاں اب آپ اپنا وہی پرانا محاورہ بولیئے، زمانہ خراب ہے۔ دنیا بہت بُری ہے، وغیرہ وغیرہ" اس مسئلے پر وہ ماں سے بار بار الجھتی رہی۔

"میں نے زمانے کی خرابی دیکھ لی ہے، اس سے بُرا اور کیا ہوگا زمانہ۔ اب میں زمانے کو دکھاؤں گی کہ میں کتنی بُری ہوں۔"

"نہیں، نیا عورت کو کبھی چیلنج نہیں کرنا چاہیئے۔"

"کیوں۔ کیوں آخر۔؟ مجھ میں کیا کمی ہے۔ دماغ نہیں، دل نہیں، یا عقل نہیں؟ میں کیا

نہیں کر سکتی ؟ زمانے سے ڈرتے ڈرتے یہ دن آگیا کہ مجھے طلاق یافتہ کہلانا پڑا۔ اب اور کیا کرنا چاہتی ہیں آپ مجھے ــــ ؟"

"تمہارے بھائی ــــ" بالآخر امی نے ایک دن بات صاف کرنی چاہی، لیکن فقرہ پورا ہونے سے پہلے نیا نے اچک لیا۔

"یہ بھائی، جو سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے، جو مجھے گھر بٹھا کر عزت سے روٹی نہ دے سکتے، چھ ماہ سے میرے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے اس گھر میں ــــ ! جو کچھ بھی میں ہوں، ان کی ستائی ہوئی ہوں، اِن کی بہن ہوں، ان کی ذمے داری ہوں، کسی نے کبھی چمکار کر میرے سر پہ ہاتھ رکھا ــــ ؟ جب بھائی عزت نہیں کرتے تو بھابیوں سے کیا شکوہ ــــ ؟

"میں اپنے باپ کے گھر رہتی ہوں، سنا آپ نے امی ؟ اور اس گھر پہ میرا بھی حق ہے، کوئی اس گھر سے بیدخل نہیں کر سکتا ــــ کہہ دیجیے گا اُن قینیوں سے ــــ

"میں اُن سے روٹی کپڑا نہیں مانگتی۔ اپنی زندگی کی گاڑی خود کھینچوں گی ــــ اپنی مرضی سے رہوں گی ــــ کسی کی زندگی مجھ پہ نہیں ٹھونسی جا سکتی ــــ میں اب خود مختار ہوں۔ نہ صرف خود بلکہ خونخوار بھی!" امی خاموش ہو جاتیں۔

نیا کی بات میں کچھ حقیقت بھی تھی، مگر ہر ماں کی طرح امی تو یہی چاہتی تھیں کہ پھر کوئی شریف سا آدمی دیکھ کر نیا کی شادی کر دیں، لیکن اب نیا وہ پہلے والی گم گو اور حلیم الطبع نیا نہیں تھی۔ ایسے جواب دیتا تھا نیا نے کینچلی بدل لی ہے۔ یا کوئی دوسرا جنم لے لیا ہے۔ چھ ماہ تک وہ امی جان سے الجھتی رہی۔ پھر ایک دن اس نے کمر ہمت باندھ لی اور اپنے منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کا تہیہ کر لیا۔ نیا چاہتی تھی کہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرے۔ اب اس زمانے میں بی اے کو کون پوچھتا ہے۔ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ پڑھنے کا عذر کر کے وہ گھر سے باہر نکلی تو کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا کہ تعلیم حاصل کرنا تو ہر مومن عورت اور ہر مومن مرد کا فرض ہے اور وہ آخر دم تک اس فرض کی بجا آوری کر سکتا ہے۔

یونیورسٹی میں کچھ مہینے رہنے کے بعد نیا کو محسوس ہوا کہ اس ساری ہلچل میں اپنا دماغ گنوا بیٹھی ہے، وہ ذہن جو خوب صورت باتیں سوچتا تھا اور کلیوں اور شگوفوں کی طرح ہر روز چٹک اٹھتا تھا اب وہ ذہن نہیں رہا تھا۔ بہت سی خواہشیں، بہت سی دراڑیں ــــ چور چور احساس کمتری پلتے نہیں پڑتا تھا، جبکہ باقی سب لڑکیاں چاق و چوبند تھیں۔

گھٹ گھٹ کے چلنا اُس کو اچھا نہ لگا تو اس نے سوچا کوئی ملازمت کر لینی چاہیئے۔ اس نے بہت پہلے سوچ رکھا تھا کہ وہ بینک میں ملازمت کرے گی۔ شاید شہباز کو نیچا دکھانے کا اسے یہی راستہ نظر آتا تھا، اپنی ازدواجی زندگی کے دوران بھی اس نے کئی بار شہباز سے کہا تھا کہ اسے بینک میں ملازمت دلا دے۔ کیونکہ اب تو ہر بینک میں خواتین نظر آتی ہیں.... لیکن شہباز ہر بار اس کے منہ پر حوصلہ شکنی کا جوتا مار دیتا۔

"تم نوکری نہیں کر سکتیں، وہ لڑکیاں اور ہوتی ہیں جو کما سکتی ہیں۔"

"تم جس ماحول سے آئی ہو، وہاں لڑکی کی ہر صلاحیت کچل دی جاتی ہے۔"

"مگر آپ کے گھر میں تو وہ ماحول نہیں ہے، نہیں ہے نا ؟ ــــ آپ تو مجھے وہ حوصلہ افزائی دے سکتے ہیں جس سے میں اپنی صلاحیتیں منوا سکوں۔"

"میں عورت کا نوکری کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"ہاں تم عورت سے "چاکری" کروانا جو پسند کرتے ہو۔"

شہباز خاموش ہو جاتا

"اس ذلت آمیز نوکری سے یقیناً دفتر کی نوکری بہتر ہو گی۔"

"تم دفتر میں نوکری نہیں کر سکتیں۔" وہ چیختا۔

"کیوں ــــ کیوں ــــ ؟" وہ بھی جواب میں چلاتی۔ آخر کیا ہے جو میں نہیں کر سکتی اور وہ جو دفتروں اور بینکوں میں نوکریاں کرتی ہیں۔ کیا وہ عرش سے اُتر کر آتی ہیں۔ یا اُن کے جسم پہ پر لگے ہوتے ہیں ؟"

"ہاں نوکری کرنے کے لئے ایک الگ مزاج چاہیئے۔"

"میں تو سمجھتی ہوں کہ ساس کے ساتھ رہنے کے لئے بھی ایک الگ مزاج کی ضرورت ہے اگر میں اس بوچڑ خانے میں گزارا کر رہی ہوں تو نوکری کیوں نہیں کر سکتی!"

"اچھا تو تم اس گھر سے فرار حاصل کرنے کے لیے نوکری کرنا چاہتی ہو؟"

"فرار حاصل کر کے کہاں جاؤں گی؟ شام کو دفتر سے گھر آنا ہوگا۔ اور وہی گھر کی چخ چخ جھک کشی۔"

"تو تم مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہو؟"

"آپ کے ساتھ مل کر زندگی کی گاڑی کھینچنا چاہتی ہوں، آپ کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہوں۔ آپ انتقام کہنا چاہتے ہیں تو کہہ لیں۔"

"میرے خیال میں تو تم صرف اپنی حسین صورت لوگوں کو دکھانا چاہتی ہو۔"

"فرض کریں۔ ایسا ہے تو اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا، اس حسین صورت پہ مہر آپ ہے، پھر آپ کو کیا خوف ہے؟"

"میں ایک عزت دار آدمی ہوں اور پسند نہیں کرتا، کہ میری بیوی دفتروں کی خاک چھانے پھرے۔" (عزت دار آدمی کو باشعور اور بہادر بھی ہونا چاہیئے)

مگر وہ خاموش ہو جاتی۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی اور جلتی کڑھتی رہ جاتی۔ وہ سوچتی

کسی بھی بزدل آدمی کو possessive ہونے کا حق نہیں ہے۔ تم حاسد بھی ہو اور کم ظرف بھی

کس برتے پہ آخر—!

مگر اب نیا نے سوچ لیا تھا کہ آگے پڑھنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس واسطے بینک میں ملازمت کر لے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بے شمار صلاحیتیں عطا کی تھیں، مگر اب

پر ثابت کرنا ہے! وہ اپنے دل سے پوچھتی۔

اُسی زمانے پہ جو ہر بار اُس کی راہ میں آ کھڑا ہوتا ہے! وہ اپنے ہی سوال کا جواب

دے ڈالتی۔

ایک دن اس نے اخبار دیکھ کر ایک بینک میں درخواست دے دی۔ کچھ دنوں بعد جواب آگیا۔ انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا، پھر وہ تربیت کے لئے منتخب کر لی گئی چھ ماہ وہ ٹریننگ لیتی رہی مگر گھر میں کسی کو نہیں بتایا، گھر والوں کو اس روز پتہ چلا جس روز اس نے باقاعدہ بینک کی ملازمت

کو پندرہ دن ہو گئے تھے پہلے پہل اس کی تقرری ایک لیڈیز برانچ میں ہوئی تھی۔

امی نے سنا تو واویلا کرنے لگیں، بھائیوں نے بھی خوب دھونس دی، مگر وہ لیڈیز برانچ کی آڑ لے کر صاف بچ گئی تھی۔

یوں بھی اب اس نے دوسروں کے فیصلوں کی طرف سے اپنے کان بند کر لئے تھے اس نے دل کی بھڑاس نکال کر سب خاموش ہو گئے۔

وہیں بینک میں ایک دن اس کی ملاقات کہکشاں سے ہو گئی۔ کہکشاں حال ہی میں لندن سے آئی تھی۔ اس کا شوہر ایک حادثے میں فوت ہو گیا تھا۔ اس کے دو بچے تھے، وہ لندن سے ایک جدید طرز کے بیوٹی پارلر کا سامان لے کر آئی تھی اور اس شہر میں بڑے پیمانے پر ایک ادارہ کھولنا چاہتی تھی، اسی سلسلے میں اسے بار بار بینک میں جانا پڑتا تھا۔ دو چار ملاقاتوں میں وہ نیا سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ نیا بھی اسے نت نئے مشورے دیا کرتی، پھر ایک دن اس نے نیا سے کہہ دیا کہ تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔

نیا سوچ میں پڑ گئی، حقیقتاً نیا کو بینک کی خشک نوکری پسند نہیں آئی تھی۔ گھر جاتے جاتے شام ہو جاتی۔ گو موتی اب ڈیڑھ سال کا ہو گیا تھا۔ پھر بھی ماں کی عدم موجودگی میں پریشان رہتا تھا۔ شام کو بچوں کے دھکے کھا کر نیا جب تھکی ہاری گھر پہنچتی تو اس کا کچھ بھی کرنے کو دل نہ چاہتا تب وہ رات کو تنہائی میں سوچا کرتی، اس بینک کی خشک پگڈنڈی پر چل کر زندگی کی اتنی لمبی راہ گزر کیسے پار ہو گی؟

کہکشاں نے اسے گومگو میں دیکھ کر اپنا پورا زورِ بیاں صرف کر دیا، اسے نیا جیسی ہی ایک

اور لڑکی کی ضرورت تھی، جو زمانے سے بے نیاز ہو کر اس کا ساتھ دے سکے اور ہر
بھی ضرورت تھی۔ اس نے نیّا کو سمجھایا کہ اگر وہ سرمایہ بھی فراہم کرے گی تو برابر کی حصّہ
بھی دلچسپ ہے، دونوں مل کر اسے عُروج پہ پہنچا دیں گی۔ کہکشاں کی اسکیم بہت وزنی
سے پہلے شہر میں اس طرح کا کوئی بیوٹی پارلر نہ تھا، وہ چاہتی تھی کہ ایک کوٹھی کرائے پ
میں اس میں ایک حصّہ بیوٹی پارلر کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ ایک حصے میں وہ
جائے اور ایک حصّے میں صرف خواتین کے لئے اسنیک بار ہو۔

نیّا کو کہکشاں کا آئیڈیا بہت اچھا لگا۔

ایک کٹی ہوئی پتنگ سدا ڈولتی رہتی ہے۔

نیّا نے بینک کی نوکری چھوڑ دی اور کہکشاں کے ساتھ مل گئی۔

کہکشاں نے پہلے چھ ماہ نیّا کو ہر قسم کی ٹریننگ دی۔ "آرائشِ گیسو" "آرائشِ جمال" اور
کا ہر گُر اور ہر نکتہ سمجھا دیا، بلکہ ہر گُر اور ہر نکتہ نیّا نے اپنے اوپر آزمایا۔ بچّے کی پیدائش کے بعد
ہو گئی تھی، کولھے پھیل گئے تھے۔ پیٹ لٹک گیا تھا، چہرے پر سوگوار سی مُردنی چھائی رہتی، بال پ
گئے تھے اور پھر وہ جس گھر میں رہتی تھی۔ وہاں صبح و شام اُسے سننا پڑتا تھا کہ وہ طلاق یافتہ ہے
رُخ بدلے تو بہن بھائیوں اور والدین کے نظریات بھی بدل جاتے ہیں۔ اُن کی نظر کے زاویے
تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ان کی زبان اور ان کا سلوک بدل جاتا ہے۔

واہ کاتبِ تقدیر!

نیّا نے اپنا بدلا ہوا حلیہ دیکھا تو از حد خوش ہوئی، باقاعدہ ورزش کرنے سے اس کا جسم بہت
خوبصورت ہو گیا تھا، اتنا خوبصورت کہ شادی سے پہلے بھی نہ تھا۔

اُس کا چہرہ کبھی گلاب کا پھول رہا ہو گا۔ پھر ایک خزاں رسیدہ پیڑ بن گیا تھا۔

پر اب — اب ہر روز کے فیشل ٹریٹ منٹ کے بعد وہ اپنے چہرے کو ہر زاویے
دیکھتی اور حیران ہوتی تھی۔

تب کہکشاں نے اسے سمجھایا تھا۔ کہ پگلی، شادی کے بعد، خصوصاً پہلے بچّے کے بعد عورت
نہائی خوبصورت ہو جاتی ہے اور اس کا جسم توبہ شکن ہو جاتا ہے، اس لئے کہ شادی سے پہلے وہ
کچی کلی کی مانند ہوتی ہے، جب پھول کھِلتا ہے تو کلی کو صحیح صورت ملتی ہے، اسی طرح جب بچّہ پیدا
دیتا ہے تو قدرت عورت کے جسم کو مکمل کر دیتی ہے، ساری کمی، سارے خلا پُر کر دیتی ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ حمل کے دوران، عام طور پر عورتیں زیادہ حسین لگتی ہیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ قدرت کے اس انعام
عورت قدر نہیں کرتی، بلکہ اپنی کسلمندی سے اپنا سب کچھ گنوا دیتی ہے، اسے چاہیئے کہ صبح و شام
ورزش کرے اور اپنا آپ ٹھیک رکھے! اصل چیز حسین صورت نہیں، اصل چیز صحت اور متناسب اعضاء
ہے کہ انہی سے حسن اور جوانی قائم ہے۔

پھر یہ تقریر جو کہکشاں ہر نئی عورت کے سامنے کرتی تھی۔ نیّا کے ذہن نشین ہو گئی۔

اپنا آپ نکھر کر سامنے آیا۔ تو نیّا کو اپنے وجود سے عشق ہو گیا، اب وہ باقاعدہ ورزش کرتی
تھی، چہرے، گردن اور بازوؤں پر مساج کرتی تھی۔ خوبصورت لباس پہنتی تھی۔ امّی جان کی ہر وقت
کی مخالفت کے باوجود میک اَپ کرتی تھی۔ نت نئے بال بناتی تھی۔

غرض اس نے زندہ رہنے کی ادا سیکھ لی تھی۔

اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی، غرور آ گیا تھا۔ اور زندگی سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ
پیدا ہو گیا تھا۔

نیّا نے ابھی ابھی ایک دلہن کا سنگھار مکمل کیا تھا، اس نے ہاتھ دھو کر تولئے سے ہا
کمر سیدھی کی تو گرم گرم چائے کی طلب جاگ اٹھی، حسینہ سے کہا۔ ذرا وہ ایک پیالی چا
کر لائے۔

مڑ کر ادھر آئی تو دیکھا تو صوفے پہ شوشہ خانم بڑی تمکنت سے بیٹھی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم"۔ نیا نے بڑی خوشدلی سے کہا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو نیا"۔ وہ بھی ہنس کر بولی۔

"بالکل ٹھیک ہوں"۔ نیا جیسے کھل اٹھی۔

"بلکہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی ہو"۔ شکریہ خانم"۔ نیا کو سُرور آگیا۔ شوشہ خانم کی بہت اہمیّت دیتے تھے۔ وہ ایسی عورتوں میں سے تھی جو آتے ہی محفل پہ چھا جاتی ہیں

"واقعی آج بہت اچھّی لگ رہی ہو۔ خیر مجھے تو ہمیشہ ہی اچھّی لگتی ہو"

آج نیّا نے اسٹرائپ والا میچنگ سوٹ پہنا ہوا تھا، بہت پتلی اور لمبی دکھائی د
سر کے پیچھے عین گردن کے اوپر گول سا جُوڑا کیا ہوا تھا۔ رخساروں پہ دو لٹیں جھول رہی تھ
آپ میں تو خیر وہ ایکسپرٹ ہو گئی تھی۔ نیا آکر شوشہ خانم کے پاس بیٹھ گئی۔ وہیں پہ حسینہ نے

یالیاں چائے کی لا کر دیں۔

"کہکشاں تم چائے لوگی"؟ اس نے پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی کہکشاں کو مخاطب کر کے کہا۔

"ابھی نہیں"۔ اِس وقت وہ ایک عورت کے چہرے کو بھاپ دے رہی تھی، اس لئے اس نے
کار کر دیا۔ نیا کے پاس اس وقت کوئی کسٹمر نہ تھا اس لئے وہ اطمینان سے بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

شوشہ خانم ایک بہت ہی نفیس، طرحدار اور خوش اخلاق خاتون تھی۔ حقیقت میں وہ ایک ایرانی
ورت تھی، مگر عرصہ دراز سے پاکستان میں تھی، اس لئے اس کا لباس اور زبان بدل گئی تھی، بہت
روانی سے اردو بولتی تھی اور اکثر ساڑھی میں نظر آتی تھی، اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ مگر
ں کے نقش و نگار اب بھی خوبصورت اور پُرکشش تھے، خصوصاً موٹی موٹی آنکھیں بیحد اثر انگیز تھیں،
وانی میں یقیناً وہ بہت خُوب صورت رہی ہو گی، وہ کافی عرصے سے "کہکشاں بیوٹی پارلر" میں آ رہی
تی۔ رفتہ رفتہ سب کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے، خصوصاً نیّا کے ساتھ۔

نیّا اُسے بہت پسند آئی تھی۔ وہ نیّا کو دیکھ کر ہمیشہ کہتی کہ عرصۂ دراز بعد میں نے ایک ملاوٹ
ے بغیر حسین لڑکی دیکھی ہے اور وہ اکثر کہتی تھی کہ نیّا خود اپنی قدر و قیمت سے واقف نہیں ہے۔
تھی تو اس کے آتے ہی نیّا سارے کسٹمر چھوڑ دیتی اور اس کا سارا کام اپنے ذمے لیتی۔ عام طور پر شوشہ
انم تین ماہ کے بعد آیا کرتی تھی، ویسے تو وہ مستقل کراچی میں رہتی تھی۔ مگر اس کی تین بیٹیاں لاہور میں
لعلمی تھیں اور ہوسٹلوں میں رہتی تھیں، وہ کہتی تھی کہ جب بھی وہ کراچی کی تیز رفتار زندگی سے گھبرا جاتی
ہے تو لاہور میں پناہ گزیں ہو جاتی ہے، غالباً کراچی میں وہ کوئی کاروبار کرتی تھی، اس کے ہر انداز
سے خود مختاری اور آزاد زندگی کی بُو آتی تھی۔ جتنے دن وہ لاہور میں رہتی باقاعدہ "پارلر" میں آیا کرتی اور
ہر قسم کا ٹریٹ منٹ لیتی۔ پہلے وہ اپنے بال رنگوایا کرتی، پھر چہرے اور بازوؤں کی تھریڈنگ کرواتی
اس کے بعد چہرے کا مساج کرواتی، بجلی کی مشینیں اور لوشن اس کے اپنے ہوتے، جانے ایسی ایسی
نایاب چیزیں وہ کہاں سے منگوایا کرتی تھی۔ پھر ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن ترشواتی۔ غرض وہ مجسم بہار
بن کر یہاں سے نکلا کرتی۔ اور پھر اتنا زیادہ بل یوں ہنسی خوشی دے جاتی، جیسے وہ روپوں کا بوجھ

اٹھانے سے قاصر ہو۔ تبھی پارلر والوں پر اس کی امارت کا خاصا رعب پڑ گیا تھا۔

"خانم، سنا ہے کراچی میں تو بے شمار بیوٹی کلینک ہیں اور لاہور کے مقابلے میں کہیں کہیں کبھی کبھی نیا پوچھ بیٹھتی۔ تو وہ ہنس کر کہتی "کراچی میں تو مجھے زہر کھانے کی بھی فرصت نہیں آتی ہوں تو زیادہ کام نہیں ہوتے، زیادہ ملنے جلنے والے نہیں ہیں اس لئے جہاں جی چاہے بیٹھ جاتی ہوں اور پھر یہاں کے لوگوں کے پاس بھی وقت ہے، خلوص ہے۔ کبھی کبھی بناوٹ بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہاں مجھے ہر ایک ساتھ ملتے وقت ماسک چڑھانا پڑتا ہے۔"

شوشہ خانم گفتگو کی شہنشاہ تھی۔ منٹوں میں مخاطب کا دل موہ لیتی۔ شاندار لباس اعلیٰ برانڈ کے سگریٹ پیتی تھی، نیا کو اس کی شخصیت بڑی جاندار اور پُراسرار لگا کرتی تھی۔ ایسے جیسے شوشہ خانم قہقہے لگانے، سگریٹ پینے یا پھر فیشن کرنے کے لئے ہی دنیا میں بھیجی گئی ہے۔

ایک دن نیا نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھ ہی لیا کہ آپ کے شوہر کہاں ہوتے ہیں۔ پر اُس نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ نیا شرمندہ سی ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ مگر وہ قہقہے پر قہقہے لگاتی گئی، نیا حیران تھی کہ اس نے ایسی کون سی مضحکہ خیز بات کہہ دی ہے! اس کی سسکیاں تھیں کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی تو کیا یہ سب بغیر شادی کے یہاں بھی ممکن ہے! جب شوشہ خانم اچھی طرح ہنس چکی تو اپنی آنکھیں صاف کر کے اس نے پرس میں سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی، سگریٹ منہ میں لگایا۔ لائٹر سے اسے سلگایا اور لمبا کش لے کر بولی "پر انہ ماننا، میں اس لئے ہنسی ہوں کہ تم میرے کون سے شوہر کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔"

"تو کیا ایک سے زیادہ بھی شوہر ہوتے ہیں؟" نیا نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیوں نہیں ہوتے۔"

"بیک وقت ــــ!"

"پاگل" شوشہ خانم پھر ہنسنے لگی۔ نیا کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی مگر ڈر گئی کہ کہیں کچھ بتا دو نہ ہو۔

"ڈرو نہیں، میں تمہیں بتاتی ہوں۔" اُسے شش و پنج میں دیکھ کر شوشہ خانم خود ہی بولی۔

شوہر تھے۔"

"تین ــ!" نیا نے اس کے بالوں کو رنگتے رنگتے برش کھینچ لیا۔ "یعنی ایک ساتھ۔"

"ایڈیٹ۔" وہ ہنس پڑی۔ "ایک ساتھ کیسے تین ہو سکتے ہیں؟ یہ تو صرف عورت کا حصہ ہے، سوتن کو برداشت کر لیتی ہے، مرد بڑا تنگ نظر ہے، وہ تو اپنی بیوی کے عادت ہے، بدنہیں سوتن کو برداشت کرتی۔"

پھر ــ!" نیا اب اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہشمند نظر آتی تھی۔

"پھر ایسا ہوا کہ..... میں نے یکے بعد دیگرے تین شوہر ٹرائی کیے۔" خانم نے سگریٹ کا کش لیکر کہا۔

"طلاق لے کر ــ!"

"ہاں اور کیا ــ کیا تمہارا خیال ہے زہر دے کر ــ!" وہ پھر ہنسنے لگی۔ "پہلی شادی تو جوانی کی بھرپور کا نتیجہ تھی۔ عماد سے میری ملاقات تہران میں ہوئی تھی، اس سے ملنے کے بعد مجھے پڑھائی لکھائی سب بھول گئی، ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، وہ مجھے اتنی دور بھیجنا نہ چاہتے تھے، میں عماد کے لئے دل و جان سے نثار ہو گئی، شادی ہو گئی اور عماد مجھے پاکستان لے آیا۔ میں اس وقت اٹھارہ سال کی اور عماد پچیس سال کا تھا۔ ایک بیٹی کی پیدائش کے بعد ہم ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے، لیکن اس سے پیشتر کہ ہم ایک دوسرے کو توڑ پھوڑ دیتے، ہم جدا ہو گئے۔"

"پھر ــ!" نیا نے خانم کے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے بے دھیانی سے پوچھا۔

"پھر" شوشہ خانم نے قہقہہ لگایا۔ "میں نے دوسرے آدمی سے شادی کر لی۔"

"کیا دوسری بار محبت ہو جاتی ہے۔" نیا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ضرور ہو جاتی ہے، مگر دوسری بار مجھے نہیں، اس کم بخت کو محبت ہوئی تھی اور جب اس کی محبت نفرت میں بدلنے لگی۔ تو میں نے اُسے چھوڑ دیا۔"

"بچے نہیں تھے۔"

"ہاں اس سے بھی ایک بچی ہوئی۔"

"آپ نے اسے کیوں چھوڑا؟"

"مرد جب شوہر بننے لگتا ہے تو مجھے اچھا نہیں لگتا، عاشقی کے زمانے میں یہ کم بخت بھی کبھی بیوی کا اشارے کو حکم سمجھتا ہے، مگر شادی کے بعد ایک دم شوہر بن جاتا ہے وہ نہ کرو تو زیادہ کام نہیں۔ اور اس طرح حکم چلاتا ہے۔ جس طرح کوئی اپنے زر خرید غلام پر یہ باتیں مجھے پسند نہیں تھیں۔ میں نے کہا جاؤ اپنا رستہ ناپو۔"

"پھر تیسری بار یہ غلطی کیوں کی۔؟"

"انسان خطا کا پتلا ہے، ہے نا؟" شوشہ خانم نے قہقہہ لگایا۔ "بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں بار بار اعادہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ میں چوتھی غلطی بھی کر بیٹھوں۔"

"اچھا!" نیا نے حیرت سے سوال کیا۔ "ہاں" خانم نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب

"میں تو سمجھتی ہوں کہ ایک بار اگر عورت کو طلاق ہو جائے تو پھر دنیا کی منڈی میں اس قیمت نہیں ہوتی۔" نیا نے اپنے تجربے کی بنیاد پر بات بڑھانے کی کوشش کی۔

"تم غلط سمجھتی ہو۔" خانم بولی۔ "یہ جو عورت ہے نا! یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس عمر میں فرار نہیں۔ یہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں!"

نیا اُس کی بات سمجھ نہ سکی اور ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو پاگل لڑکی۔!"

"کیا زندگی میں بار بار محبت مل جاتی ہے؟"

"کیوں نہیں مل سکتی، تلاش کرنے کا انداز صحیح ہونا چاہیئے۔"

"مگر پھر..... پھر..... ساری زندگی آدمی خوب سے خوب تر کی تلاش میں گزار دے تو

کیا ہوا۔؟"

"تجربہ"

"مگر عورت تو اپنی آخری عمر اچھی طرح گزارنا چاہتی ہے۔"

"یہ سب فرسودہ باتیں ہیں، مجھے دیکھو، میں تیسرے شوہر سے طلاق لے کر بھی مطمئن ہوں، ہمیشہ زیادہ خوش ہوں۔"

"آپ نے تیسرے شوہر سے طلاق کیوں لی؟"

"ہاں آپ نے تیسرے شوہر سے طلاق کیوں لی؟"

"وہی بک بک، برقع پہنو، گھر بیٹھو۔ کام نہ کرو، جبکہ کام کرنے کی مجھے عادت ہے، میں کبھی بیت بیگم نہیں رہی، عورت کی سیکورٹی اس کی "جاب" ہوتی ہے، ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہنر اپنے میں رکھنا چاہیئے۔ ایک بچی اس سے بھی ہوئی۔ وہ خود کوئی کام نہیں کرتا تھا اور مجھ پر طرح طرح الزام دھرتا تھا۔"

"تو آپ ہی سمجھوتہ کر لیتیں۔" نیا بولی۔

"ہاں سمجھوتہ ہو سکتا تھا۔" خانم نے کہا۔ "اگر وہ شوہر بن کر نہ دکھاتا، دوست بن کر رہتا، یہ تو بیٹھے بٹھائے اُن داتا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"طلاق دیتے وقت یہ لوگ تنگ نہیں کرتے؟"

"کرتے ہیں، مثلاً میرے تیسرے شوہر علی سے ابھی تک مقدمہ چل رہا ہے، کہتا ہے۔ اپنی بیٹی دلوں گا، تمہیں اغوا کرا لوں گا، وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ کو ڈر نہیں لگتا۔"

"نہیں، جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں، اس ملک میں دھمکیاں دینے کا رواج ہے۔"

"تو آپ اُس کی بیٹی اُسے دے دیں۔"

"بیٹی کے سوا اُس نے مجھے کیا دیا ہے؟ میری دولت پر اکڑتا تھا اور مجھی پر دھونس جماتا تھا اور اوپر سے یہ کہ بالا بالا دوسری عورتوں کے ساتھ عیش بھی کرتا تھا۔"

نیا کی زبان گنگ ہو گئی۔ اُسے علم نہیں تھا کہ دنیا میں اتنی بہادر عورتیں بھی ہیں، اس نے شوشہ خانم کے بال رنگ دیئے تھے، اب اُنہیں سمیٹ کر سر پر اکٹھا کر دیا۔ تاکہ سوکھ جائیں۔ پھر دستانے اُتار کر ہاتھ دھوئے۔ اور "مینی کیور" سیٹ اٹھا کر لے آئی۔ سارا وقت وہ اپنی ہی سوچوں میں گم رہی۔ "پہلے ہاتھوں

کے ناخن درست کر دوں ؟"

"نہیں" شوشہ خانم نے اپنا گورا گورا پاؤں جوتے میں سے نکال کر اس کے آگے کر

پاؤں ۔"

نیّا نے نیچی تپائی پر بیٹھ کر اس کا پاؤں اپنے گھٹنے پر یوں رکھ لیا جیسے وہ کوئی

پھر اس کے ناخن درست کرنے لگی۔

"مرد کے ظلم و ستم سہتے جاؤ تو وہ آدم خور بن جاتا ہے، اس کو سینے پر چڑھنے کا موقع

تو خون پی جاتا ہے۔ سُنا تم نے نیّا۔ شاہ رگ پر اپنا منہ رکھ دیتا ہے۔ عورت اسے پیا

بیٹھتی ہے۔ آنکھ اس وقت کھُلتی ہے، جب دل میں لہو کی بوند بھی نہیں رہتی۔" نیّا نے

سی آنکھیں اٹھائیں اور شوشہ خانم کا چہرہ دیکھا، شوشہ خانم ہمیشہ شگفتہ شگفتہ اور بہار

رہی ۔۔ تو اس نے کسی کو لہو پینے کا موقع نہیں دیا ۔۔!

"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا نیّا ۔۔؟" اچانک شوشہ خانم کی آواز نے نیّا کی سوچوں کا

"کچھ نہیں ۔۔" نیّا کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"اب مجھ سے نہ چھپاؤ، تمہارے حُسن میں ایک حزن ہے، تمام تر رعنائی اور طلا

باوجود تمہارے چہرے پر کرب کی ایک لکیر ہے، میں نے پہلے دن ہی سمجھ لیا تھا کہ کہیں پر

ٹھوکر کھائی ہے، پھر ایک روز مجھے کہکشاں نے بتا دیا تھا کہ تمہاری طلاق ہو گئی ہے اور تمہارا

بھی ہے۔ اپنے دل کے داغ نہ چھپاؤ۔ اپنی ناکامیوں کا مذاق اڑانا چاہیئے تاکہ بار بار

مقدّر میں نہ آئیں۔ ہنس ہنس کر بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا! تم اتنی خوب صورت

ضرور تمہارے حُسن سے جلتا ہو گا۔"

"نہیں یہ بات نہیں تھی ۔۔"

"میں جانتی ہوں۔ پہلے مرد حسین عورت کو تلاش کرتا ہے۔ اس پر مرتا ہے۔ پھر جب

منکوحہ بنا لیتا ہے تو اس کے حُسن سے ہی حسد محسوس کرنے لگتا ہے۔"

"نہیں میری ساس ۔"

"ہاں ساس۔ اس ملک میں، مَیں نے ساس کے مظالم کے بھی بہت قصّے سُنے ہیں، دراصل بی بی،

بھی شوہر کا ایک خاموش انتقام ہوتا ہے کہ وہ بیوی کو اپنی ماں کے حوالے کر کے، گھر میں اکھاڑے

ساں پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن کیوں ۔ ؟ بچپن میں اس کی ماں نے اسے بہت زیادہ دبایا ہوتا

وہ ماں کا بدلہ بیوی سے لے لیتا ہے، جب بلّی کے پنجے میں ایک غریب چوہا آ جاتا ہے تو دوسرے

چوہے کو خوشی ہوتی ہے کہ چلو وہ تو بچ گیا۔"

نیّا خاموش رہی۔ اس موضوع پر وہ بالکل بات نہ کرنا چاہتی تھی، یہ موضوع اُس کی دُکھتی رگ

اس واقعے کو وہ ذہن سے کُریچ دینا چاہتی تھی، وہ لوگوں کو ہرگز نہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ طلاق

تھی ہے، نہ اس کا چہرہ یا جسم اس حادثے کی چغلی کھاتا تھا، لوگ اسے دیکھ کر مسرور ہو جاتے تھے

ں زندگی گزارنے کے لئے یہی کافی تھا۔ بار بار ماضی کی راکھ کُریدنے سے فائدہ ۔!

"ویسے مجھے حیرت ہوتی ہے، جب میں دیکھتی ہوں کہ کسی خوب صورت لڑکی کو طلاق ہو

گئی ہے۔" شوشہ خانم نے یہ بات جیسے خود سے کہی تھی۔ نیّا اب بھی خاموش رہی۔

"ضرور تمہارے شوہر کو احساسِ کمتری ہو گا!"

نیّا بول کر یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ شہباز کے لئے اس کے دل میں کتنی نفرت ہے، وہ شہباز کا

ہلکا بھول جانا چاہتی تھی کیونکہ ابھی تک اسے شہباز کی شبیہہ ہر مرد میں نظر آتی تھی اور وہ ہر مرد کو

قابلِ نفرت سمجھتی تھی۔

نیّا نے شوشہ خانم کے ناخن سنوار لئے تھے۔ اوپر کرسی پر بیٹھ کر اس نے خانم کا ہاتھ تھام لیا کبھی

شوشہ خانم کے ہاتھ بہت خوب صورت رہے ہوں گے۔ مگر اب ایسے تھے جیسے ایک چالیس سالہ

عورت کے ہو سکتے ہیں۔

"تم نے کیا کیا کردہ؟" بائیں ہاتھ میں سگریٹ پکڑ کے شوشہ خانم نے دُھواں چھوڑا، اس کی آواز بھاری

ہو گئی تھی۔ "ختم کرنے سے حُسن ختم ہو جاتا ہے۔ حسین عورت ہمیشہ قدرت کے خزانوں سے

مالا مال ہوتی ہے، چونکہ قدرت اس پر فیاضی کرتی ہے اس لئے اس کے مقدر میں کچھ محرومیاں بھی دی جاتی ہیں، اِن ٹھوکروں کو زندگی کا معمول سمجھ کر، ہنس کر، مُسکرا کر زندگی گزار لینی چاہیئے، اگر ٹھوکر کھا کر گر پڑو، کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہو جاؤ۔

"سُنا تم نے ــــ حسین عورت کسی بھی عمر میں تہی دست نہیں ہوتی۔ مجھے دیکھو، کبھی میں بھی ٹکڑا تھی۔ اب میں حسین نہیں ہوں، مگر اب ہمیشہ سے زیادہ خوش ہوں۔ مجھے خوش رہنا آتا ہے۔"

"نہیں آپ تو اب بھی بڑی خوبصورت ہیں۔" نیّا نے بڑی دیر کے بعد زبان کھولی۔

"خیر ــــ یہ تو تم مروّتاً کہہ رہی ہو، عمر ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ حُسن ایک سراب ہے۔ واسطے میں کہہ رہی ہوں اپنی عمر کی قدر کرو، اپنے حسن کی قدر کرو، عورت کے پاس عقل ہو تو وہ ہزار میں مرد کو مسخر کر سکتی ہے۔" خانم کچھ دیر کے لئے رُکی جیسے کچھ سوچ رہی ہو، پھر بولی۔

"آج میں تمہیں ایک راز کی بات بتا رہی ہوں۔"

"بیس سال تک عورت اپنے چہرے سے ساری دنیا کے دل مسخر کر سکتی ہے۔ تیس سال تک اپنا جسم اس سے حکومت کرواتا ہے اور چالیس سال تک وہ اپنی عقل استعمال کر کے دلوں کو جیت لیتی ہے۔"

"اِس کے بعد ــــ" نیّا نے بے ساختہ پوچھا۔

"اِس کے بعد ــــ کوئی حسرت نہیں رہتی!"

"نیّا نے حیران ہو کر شوشہ خانم کی موٹی موٹی، سُوجی سُوجی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے رنگے ہوئے بالوں کو دیکھا۔ اس چالیس سالہ جسم کو دیکھا۔ جو ابھی تک کسا کسایا تھا۔ اس کے بے رنگ ہونٹوں کو دیکھا۔ اس کے کھُردرے ہاتھوں کو دیکھا۔ جس میں اس نے سگریٹ تھام رکھا تھا اور مسلسل پیئے جا رہی تھی۔ نیّا کے پلّے کچھ نہیں پڑا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

یہاں ایک آدمی سے چھٹکارا حاصل کر کے زندگی اجیرن ہو رہی تھی اور کہاں وہ زندگی کو گلے لگانے کی بات کر رہی تھی۔

"کبھی اگر زندگی کی بھول بھلیّوں میں راستہ نہ ملے تو میرے پاس چلی آنا۔" شوشہ خانم نے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھا کے کہا۔ "میں تمہاری ہر قسم کی مدد کروں گی۔ مجھے حسین لڑکیوں کا بے مول ہو جانا اچھا نہیں لگتا۔"

"شکریہ۔" نیّا ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ ایک بوکھلائی ہوئی لڑکی دروازہ کھول کر اندر آ گئی اور بریزن کے قریب کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے بی بی۔" نیّا نے خالص کاروباری انداز میں پوچھا۔ "جی مجھے"

"ہاں، ہاں بتاؤ۔" نیّا نے سیانے پن سے کہا۔

"مجھے آپ لپ اسٹک لگانا سکھا دیں۔" ــــ "ہائیں تمہیں لپ اسٹک لگانی نہیں آتی۔"

نیّا نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، یہ دُکان اُنہوں نے ایسے ہی لوگوں کے لئے لگائی تھی۔ اور ایسے ہی لوگوں کے طفیل اُن کی دکان چل رہی تھی۔ ہر کوئی شوشہ خانم کی ٹکر کا تو نہیں ہوتا نا؟

"اچھا اِدھر بیٹھو بی بی، میں ابھی فارغ ہو کر آتی ہوں۔"

"نہیں۔" شوشہ خانم نے اپنے ہاتھ اور پاؤں سمیٹ لیئے۔ "جاؤ پہلے اسے فارغ کر کے آؤ۔ میں تو ابھی بیٹھوں گی۔"

نیّا اُدھر چلی گئی۔ لڑکی کو آئینے کے آگے بٹھایا اور بولی۔ "پہلے میں اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتی ہوں، غور سے دیکھتی جاؤ۔ اس کے بعد تم خود لگانا۔" نیّا نے بڑے قرینے سے نارنجی رنگ کی لپ اسٹک اپنے ہونٹوں پر لگائی اور بولی ــــ "اس بات کا دھیان رہے کہ لپ اسٹک ہونٹوں کے کناروں سے باہر نہ جائے اور اوپر والے ہونٹ کا خم خوبصورتی سے بنایا جائے، نیچے والے ہونٹ کو اوپر والے ہونٹ سے جُدا کرتا ہے اور ہمیشہ لپ اسٹک اس طرح لگانی چاہیئے کہ اوپر والا ہونٹ قدرے باریک نظر آئے اور نیچے والا ہونٹ قدرے موٹا اور ہمیشہ بھرے بھرے ہونٹ خوبصورتی کی نشانی ہوتے ہیں۔ دیکھو تمہارے ہونٹ بہت اچھے

ہیں، اگر زیادہ باریک ہوتے تو مسئلہ بن جاتے۔ ہاں اب ذرا قرینے سے لگاؤ۔"

لڑکی کے ہاتھ لپ اسٹک لگاتے وقت کانپ رہے تھے۔

تمہاری شادی ہوگئی ہے؟" نیّا نے پوچھا۔

"جی ہاں ــ"

"کتنا عرصہ ہوا؟"

"تین مہینے ہوتے ہیں۔"

"اور تم اب میک اَپ کے بارے میں سیکھ رہی ہو!"

"جی، میرے ماں باپ نے زبردستی میری شادی میرے چچازاد سے کردی ہے، وہ مجھے پسند نہیں کرتا، کہتا ہے تمہیں تو میک اپ کرنا بھی نہیں آتا، آخر بہت دنوں تک سوچ سوچ کر آج میں آ گئی۔" لڑکی کی آواز میں آنسوؤں کی لرزش تھی!

نیّا نے اُسے دو تین بار لپ اسٹک لگا کر اچھی طرح سمجھا دیا، مگر جانے کیوں نیّا کے دل میں لڑکی کے لئے ایک درد سا اٹھا۔ بولی۔ "تم دو تین روز وقت نکال کر آتی رہنا۔ میں تمہیں میک اَپ سکھا دوں گی، تمہاری شکل میں بہت کشش ہے، خواہ مخواہ احساسِ کمتری میں نہ مبتلا ہو جانا، تم ابھی کم عمر ہو ــ اور یہ تمہاری ساری زندگی کا سوال ہے۔۔۔۔"

پھر غصّے میں بھری ہوئی وہ شوشہ خانم کے پاس آ بیٹھی اور کہنے لگی۔ "میرا جی چاہتا ہے۔۔۔ کے سارے مردوں کا ــــ سارے مردوں کا گلا گھونٹ دوں۔" اسے اپنے جذبات کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل سکے تھے۔

شوشہ خانم نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ اور زور سے ہنس پڑی۔ بولی۔ "حالانکہ تم نہیں کر سکتیں۔" پھر اُس نے نیّا کی کیفیت دیکھ کر پوچھا۔

"اب کیا ہوا ہے بھئی، ان بیچارے مردوں نے کیا کیا ہے؟"

کہکشاں فارغ ہو کر آ گئی تھی اور براہِ راست اِن کی گفتگو میں شامل ہو گئی۔

"دیکھو نا،" نیّا بولی۔ "ساری عورتوں کو مردوں نے کسی نہ کسی مشکل میں ڈالا ہوا ہے۔ ایک ذرا سے مرد نے اچھی خاصی عورت کو منتشر کر ڈالا ہے!"

"اے بی بی، مرد ذرا سا نہیں ہوتا، ذرا سی عورت ہوتی ہے۔" کہکشاں نے ہنس کر کہا۔ "عقل کے ناخن لو۔"

"اب یہی دیکھو نا،" نیّا غصّے میں بولتی گئی۔ "یہاں جتنی عورتیں بھی آتی ہیں، سب کی سب مردوں کے ہاتھوں تنگ ہو کر آتی ہیں۔ کوئی کہتی ہے، میرا شوہر کہتا ہے پتلی ہو جاؤ، کوئی کہتی ہے۔ میرے شوہر کو کٹے ہوئے بال پسند ہیں۔ کوئی کہتی ہے۔ اگر ساڑھی نہیں پہنوں گی تو وہ مجھے نکال دے گا، کسی کو شوہر کی خوشنودی کے لئے چہرہ ٹھیک کروانا ہوتا ہے، کسی کو شوہر کی خاطر میک اَپ سیکھنا ہوتا ہے۔ کوئی موٹا ہونا چاہتی ہے ــ کوئی دبلی ہونا چاہتی ہے ــ آخر یہ مرد چیز کیا ہے، ہر عورت کو اُس کے اصلی روپ میں کیوں نہیں قبول کرتا۔ آخر مرد بھی تو عمر کے ساتھ ساتھ بدصورت ہو جاتے ہیں، اُن کے سر کے بال اُڑ جاتے ہیں۔ چہرے پر جھُریاں پڑ جاتی ہیں۔ توند نکل آتی ہے، یہ عورتیں ان سے کیوں نہیں کہتیں تم بھی اپنا فیشل کراؤ، وزن کم کرو۔ ایکسرسائز کیا کرو۔ یا وِگ لگا کے آؤ ــ مجھے اس طرح بُرے لگتے ہو، میں تمہیں طلاق دے دوں گی وغیرہ وغیرہ ــ"

"یہ بات اگر عورت کہہ دے تو اسے گھر میں کون رکھے گا؟" رولرز لگاتے دُور بیٹھی ہوئی ایک عورت نے گفتگو میں حصّہ لیا۔

"بس یہی تو خرابی ہے عورتوں میں کہ اپنا حق نہیں جتاتیں۔"

"پہلے مرد اس کا حق تو تسلیم کرے۔" ایک دوسری عورت نے جو جُوڑا بنوانے آئی تھی۔ جواب دیا۔

"مرد نے شروع ہی سے ایسا کوئی حق عورت کو نہیں دیا۔"

اب باقاعدہ ساری عورتیں گفتگو میں شامل ہو گئی تھیں، شاید ساری زخم خوردہ تھیں۔ یا یہ اِن کا من پسند موضوع تھا۔

"آخر یہ مرد زندگی بھر عورت کو تڑپنی کا ناچ نچاتا رہتا ہے۔ اور یہ اس کے اشاروں پر ناچتی رہتی ہے،

میں کہتی ہوں آخر عورت اتنی بے وقوف کیوں ہے؟" یہ نیا کی آواز تھی۔

"بے وقوف نہیں بزدل ہے۔" جواب ملا۔

"بزدل کیوں ہے۔؟"

"اسی طرح پیدا ہو گئی ہے۔"

تو آپ اپنے آپ کو بدل لے۔" نیا بولی۔

"بدلنے کے لئے بھی اتنی ہی صدیاں درکار ہیں جتنی اس سانچے میں ڈھلنے کے لئے لگی ہیں۔"

"اونہہ۔!" نیا کے چہرے پر نفرت کی سلوٹیں ابھریں۔ جب تک یہ عورت مرد سے ڈرے گی اُسے ڈراتے گا۔ آخر قدرت نے دونوں کو ایک جیسے ناک، منہ، کان، زبان، دل اور دماغ عطا کئے ہیں۔ کہا ہے قدرت نے کہ ان میں سے ایک پاؤں کی جوتی ہے اور دوسرا سر کا تاج ہے، عورتوں کو چاہیے بغاوت کر دیں، مردوں سے قطع تعلق کر لیں، ایک الگ جہان بسا لیں۔ جس میں مردوں کا داخلہ بند ہو اور صرف عورتوں کی حکومت ہو۔"

"تم تو بالکل فلموں والی باتیں کر رہی ہو نیا۔" کہکشاں نے مسکرا کر کہا۔ "ایسا جہان فلموں میں تو پیدا کیا جا سکتا ہے، اصل زندگی میں نہیں۔"

"مردوں سے منکر ہونے کا مطلب ہے کہ سب لوگ اپنے باپ، بھائیوں اور بیٹوں سے بھی منکر ہو جائیں! آخر کس کس رشتے کو توڑا جا سکے گا۔" کسی نے گرہ لگائی۔

"سب ہو سکتا ہے، اگر عورت تہیہ کر لے، تو سب ہو سکتا ہے۔" نیا نے اصرار کیا۔

"کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" ایک عورت نے کہا۔ "نکاح کے دو بول عورت کو دو کوڑی کا بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکتی۔"

"عورت ہمیشہ اور ہر صدی میں عورت ہی رہے گی۔ اس لئے کہ مرد نے اسے صرف ایک ضرورت سمجھا ہے۔" بڑی دیر سے چپ چاپ بیٹھی ہوئی شوشہ خانم نے آخری شوشہ چھوڑا۔

دیکھیں سب سے بڑا عیب احساسِ کمتری ہوتا ہے اور دنیا میں سب سے بڑا حسن جوانی ہے آپ نے سنا ہو گا لوگ کہتے ہیں کہ جوانی جب گدھی پر بھی آتی ہے۔ تو وہ بھی پری معلوم ہوتی ہے، مجھے اس بات پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ کہ ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ لڑکیاں بھی ان باتوں سے نابلد ہیں۔ ہر لڑکی جو یہاں آتی ہے۔ کسی نہ کسی احساسِ کمتری کی ماری ہوئی ہوتی ہے۔ اگر موٹی ہے تو شرم سے گڑی جا رہی ہے۔ اگر ذرا رنگ سانولہ ہے تو رو رہی ہے۔ اگر چہرے پر روپیں ہیں تو دروازے بند کر کے بیٹھ گئی۔ اگر ذرا دُبلی ہے تو لوگوں سے ملنے سے کتراتی ہے، قد چھوٹا ہے تو اپنے آپ کو بدقسمت کہتی ہے ضرورت سے زیادہ لمبا ہے تو منہ چھپائے بیٹھی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔؟ صرف ایک عیب کے لئے قدرت کی عطا کی ہوئی باقی نعمتوں کو جھٹلانا کہاں کی دانشمندی ہے۔!

"اگر انسان سلیقے سے تیار ہو، اپنے چہرے کے مطابق اُسے میک اپ کرنا آتا ہو اور اپنے جسم مناسبت سے وہ ملبوسات پہننا جانتی ہو تو کبھی احساسِ کم تری میں مبتلا نہیں ہو سکتی، البتہ یہ نہیں کہ قدرت کسی کے ساتھ بخل کرتی ہے، اور کسی کے ساتھ فیاضی برتتی ہے، البتہ یہ ہے کہ ہم ہی اپنی اداؤں سے واقف نہیں ہوتے، جسم اور چہرے کی خوبیوں کو اُبھارنا چاہیئے۔ تاکہ خامیاں خود بخود دب جائیں۔ اور اس فن کی خدمات کے لئے ہم نے یہ پارلر کھولا ہے۔ ہمارے ہاں آرائش اور سلیمنگ

کی ہر قسم کی ٹریننگ دی جاتی ہے ۔۔۔ اور پھر ہماری بوتیک شاپ پر خواتین کے حجم اور قد و قامت کے مطابق ملبوسات بھی مل سکتے ہیں ۔۔۔"

"چلیئے میں آپ کو اُس طرف لے چلوں، اگر آپ اسی طرح بسورتی رہیں ۔۔۔ تو اپنا راستہ بھی خواب کر لیں گی۔"

"کتنے دن رہ گئے ہیں آپ کی شادی میں ۔۔۔"

"پندرہ ۔۔۔"

"صرف پندرہ ۔۔۔ میں ان پندرہ دنوں میں آپ کو دُنیا کی انتہائی خوبصورت لڑکی بنا دوں گی۔"

"ہیئر ۔۔۔ ہیئر ۔۔۔"

نیّا نے اپنی تقریر ختم کر کے پلٹ کر دیکھا تو وہاں شوشہ خانم کھڑی تالیاں بجا رہی تھیں۔

"نیّا تم اتنی اچھی تقریر کر لیتی ہو، مجھے تو آج ہی پتہ چلا ہے۔"

"کاروباری نکتہ ۔۔۔" نیّا نے شوشہ خانم کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔ "پلیز اس وقت چپ رہیں۔ میں اس لڑکی کو بوتیک شاپ دکھا کر واپس آجاتی ہوں۔"

شوشہ خانم نے ایک کوک کا آرڈر دے دیا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ کب آئیں ۔۔۔؟" واپس آکر نیّا نے پوچھا۔ "اس مرتبہ تو لاہور جلدی آنا ہو گیا۔"

"ہاں اسکول اچانک بند ہو گئے تھے، میں نے سوچا جا کر خود ہی بچیوں کو لے آؤں ۔۔۔ اور پھر جانتی ہو جب بھی لاہور آؤں۔ تم سے ملے بغیر نہیں جا سکتی۔"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی ۔۔۔" نیّا نے سر جھکا کر کہا۔

"دراصل تم نہیں جانتیں، میں اس پارلر میں صرف تمہاری وجہ سے آتی ہوں ۔۔۔"

یہ بات نیّا سے کم و بیش ہر عورت نے کہی تھی۔ یہ تو سچ ہے کہ وہ بہت خوب صورت تھی مگر نیّا کی زبان میں بھی بہت اثر تھا۔ وہ بڑے خلوص سے خواتین کو مشورے دیتی تھی اور عورتوں کے لئے ہمیشہ اپنے دل میں ایک درد محسوس کرتی تھی۔

"مجھے آپ کے آنے سے بڑا حوصلہ ہوتا ہے۔"

"بہشتاں کہاں ہے ۔۔۔؟"

"اُدھر بوتیک شاپ کی طرف گئی ہے، ابھی آجائے گی۔"

کوک آگیا تھا۔ شوشہ خانم نے نفاست سے بوتل پکڑ لی، تنکا نکال کر ٹوکری میں پھینک دیا۔ پھر گھونٹ پینے لگی ۔۔۔

"یہاں بہت گرمی ہو گئی ہے۔"

"گرمی اسی طرح اچانک آیا کرتی ہے۔"

"اصل میں یہاں درمیانہ موسم ہی نہیں ہے۔ سخت سردی کے بعد ایک دم سخت گرمی شروع ہو جاتی ہے۔"

"نیّا تم اپنا آپ ضائع کر رہی ہو ۔۔۔" کوک کا ایک گھونٹ لے کر شوشہ خانم نے اچانک کہا۔

"میں سمجھی نہیں ۔۔۔" نیّا حیرانی سے بولی۔

"تم اس جگہ کے لئے نہیں ہو۔"

"تو کیا کروں ۔۔۔"

"اپنی قیمت جانو!"

"میں اس کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہوں؟ میری تعلیم بھی کم ہے۔"

"تعلیم کم ہے ۔۔۔ عقل تو کم نہیں ۔۔۔ اپنی عقل سے اس دنیا میں اپنا مقام پیدا کرو ۔۔۔ اوروں کو بناؤ سنگھار کے مشورے دینے میں ہی عمر نہ تمام کر دینا ۔۔۔"

نیّا خاموش ہو گئی ..... اس طرح جیسے ندیا کی شفاف سطح کے نیچے ننھے بلبلے ہلچل مچاتے ہیں .....

ایک دم کہکشاں کپڑوں کے بنڈل اٹھائے اندر داخل ہوئی ۔۔۔ کہکشاں ہو کہکشاں

"اوہیلو خانم ـــــ خوش آمدید ـــــ کب آئیں؟"

"ابھی آئی ہوں ـــــ یہ اتنے ڈھیر سارے کپڑے سلوا کے لائی ہو۔!"

"نہیں خانم، بُرا ہو فیشن کا، ابھی پوری طرح سارے کپڑے پہننے بھی نہیں نصیب ہوتے فیشن بدل جاتا ہے۔ کچھ نئے سوٹ پڑے تھے ـــــ جن کے پائنچے چھوٹے کروانے گئی تھی۔"

"اچھا اتنے چھوٹے کرواتے ہیں ـــــ!" شوشہ خانم نے شلوار اٹھا کر دیکھی۔

"بی بی ابھی پائنچہ اور چھوٹا ہوگا۔"

"ارے اس سے چھوٹا اور کیا ہوگا، اب ہمارے ملک میں فیشن نہیں بدلے گا۔" ایکہ نے آتے ہی جواب دے مارا۔

"یہاں کیوں نہیں بدلے گا فیشن۔" نیا نے اُسے گھور کر دیکھا۔ "کیا یہاں انسان نہیں بستے۔ ٹی۔ وی اور فلم کی بدولت بڑھتے فیشن جلد نظر آجاتے ہیں ـــــ دیکھ لیجئے گا دنوں میں فیشن بدل

"ہاں ـــــ مگر ہمارے یہاں فیشن بھی مرحلوں میں آتا ہے ـــــ" شوشہ خانم نے کہا۔

"مرحلوں سے کیا مُراد ہے آپ کی ـــــ" کہکشاں نے پوچھا۔

بات یہ ہے کہ ہم غریب لوگ ہیں، ایک دم فیشن بدل کر اپنے سب ملبوسات ضائع نہیں اس واسطے پہلے چھوٹی قمیض کے ساتھ شلواروں کے پائنچے تنگ کرلیں گے، پھر رفتہ رفتہ لمبی قمیض آئے گا۔"

"قمیض بھی لمبی ہوگی کیا ـــــ؟" نیا نے پوچھا ـــــ

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ کیوں نہیں، قمیض سُکڑ کر جتنی چھوٹی ہوگئی تھی اُتنی ہی لمبی بھی ہوجا

"ہائے لمبی قمیض میں سب کتنے بے وقوف لگیں گے۔" ایک عورت بولی۔ "کوئی یہ فیشن کرے گا۔"

"سب کریں گے یہ فیشن، مگر ذرا دیر سے ـــــ" نیا نے کہا۔

"پہلے پہلے ہر فیشن کو تنقید کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔"

"مگر یہ فیشن بہت عجیب لگے گا ـــــ" دوسری عورت بولی۔

"پہلے جو شے عجیب لگتی ہے۔ بعد میں وہی دلپذیر ہوجاتی ہے۔" نیا نے کہا۔

"آپ نے اچھا کیا۔ خانم مجھے تو بتا دیا۔ اب میں نئے کپڑے سوچ سمجھ کر سلواؤں گی۔"

"میں نے تو گزشتہ سال سے ہی نئی طرز کے کپڑے سلوانے شروع کر دیئے ہیں۔" شوشہ خانم نے پچھلے سال میں یورپ گئی تھی اور میں نے دیکھا تھا، وہاں فیشن بدل گیا تھا، وہاں بھی نیا فیشن پہلے نئی پود اپناتی ہے، مثلاً نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ٹائٹ جینز اور لمبی قمیصیں پہن رہے تھے اور کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارا کُرتا وہاں بہت مقبول ہو رہا تھا ـــــ"

"آپ کہاں کہاں گئی تھیں خانم ـــــ!"

"ارے جہاں جہاں مقدر لے جاتا ہے۔ میں خاک چھانتی پھرتی ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"مجھے آپ پر بہت رشک آتا ہے ـــــ" نیا نے واقعی رشک بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"اچھا پہلے میرا فیشل کردو ـــــ پھر گپ لگائیں گے ـــــ"

دو گھنٹے بعد جب شوشہ خانم جانے لگی تو نیا اسے چھوڑنے دروازے تک آئی۔

شوشہ خانم نے آواز آہستہ کر کے کہا۔ "نیا میں سیریس ہوں، چاہتی ہوں کہ تم یہ جاب چھوڑ کر میرے ساتھ چلو ـــــ"

"مگر میں کیسے جاسکتی ہوں؟"

"تم سب کرسکتی ہو ـــــ وہاں کراچی میں میرے پاس تمہارے لئے ایک بہت اچھی جاب ہے۔"

"آپ میری امّی کو نہیں جانتیں۔ بہت پرانے خیالات کی ہیں۔ مجھے کبھی جانے کی اجازت نہیں دیں گی۔"

"گولڈن چانس ہے یہ ـــــ اچھی جاب کرنے سے زندگی میں اچھے چانس مل جاتے ہیں۔"

نیا نے مایوسی سے گردن ڈال دی۔ اور صرف اتنا کہا۔ "سوچوں گی۔"

"سوچنے کی بات نہ کرو۔ فیصلہ کرو۔" شوشہ خانم نے اصرار کیا۔

"امّی سے بات کروں گی ــــ" نیّا بولی۔

شوشہ خانم جاتے جاتے رُک گئی اور کہنے لگی۔ "امّی سے اس طرح بات نہ کرو۔"

"کس طرح کروں ــــ؟"

"اُن سے کہو کہ تم کسی ضروری کام سے کراچی جا رہی ہو۔"

"ہمارے ہاں اس طرح اجازت نہیں ملا کرتی، جس طرح تمھارے میں رپٹ لکھوانی اس طرح سب کچھ بتا کے جانا پڑتا ہے۔"

"تو بہانہ کردو، کہ میری سہیلی کی شادی ہے، یا پارلر کا کوئی کام ہے ــ یا کسی ٹریننگ کا دو تین مہینے کے لئے میرے ساتھ چلو ــــ چل کر رہو ــ رہ کر دیکھو ــ اگر بات دل کو لگے وہاں رہنا ــــ ورنہ واپس آکر اپنا پارلر پھر جوائن کر لینا ــــ"

"اور بچّہ ــــ!"

"بچّے کو یہیں چھوڑ جاؤ، جب سیٹل ہو جاؤ گی ــــ تو پھر امّی جان کو سب کچھ کہہ کر بچّے کو لے لینا ٹھیک ہے ــــ!"

"ٹھیک لگتا ہے ــــ" نیّا نے زبردستی مُسکرا کر کہا۔

"میں ایک ہفتے بعد چلی جاؤں گی، یہ لو میرا فون نمبر ــــ" شوشہ خانم نے اسے ایک کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ "اگر ارادہ بن جائے تو مجھے فون کر دینا ــــ اچھا خدا حافظ۔"

"خُدا حافظ خانم ــــ"

کارڈ کو مٹھی میں دبا کر نیّا اس طرح اندر داخل ہوئی جیسے زندگی میں پہلی بار محبوب سے بھیجا ہو ــــ!

کراچی کے ہوائی اڈے پر جب نیّا اتری تو اسے یوں محسوس ہوا کہ ہوا نے اُسے ایک زناٹے دار تھپڑ مارا ہے ــــ پہلا تھپیڑ کھاتے ہی وہ ڈول گئی، اِدھر اُدھر ہو کر بڑی مشکل سے اپنے پاؤں زمین پر جماتے، پاؤں جما لئے تو پھر محسوس ہوا کہ کپڑے اپنے اختیار میں نہیں ہیں جدھر جدھر یہ بیدرد ہوا جاتی ہے ــ اُدھر اُدھر اڑے چلے جا رہے ہیں ــــ اور اُس نے آج جانے کیا سوچ کر ساڑھی پہن لی تھی، زندگی میں پہلی بار جہاز میں سفر کر رہی تھی تو سوچا کیوں نہ ساڑھی پہنی جائے پھر اس نے سُن رکھا تھا کہ ساڑھی کراچی والوں کا دل پسند پہناوا ہے ــــ ساڑھی کا پلّو سنبھالا، تو احساس ہوا کہ گیسو مچل رہے ہیں، بکھر رہے ہیں۔ آج اُس نے اپنے لمبے بالوں کے "رنگ لٹ" بنائے تھے، بڑے قرینے سے میک اَپ کیا تھا۔ سبز ساڑھی کی مناسبت سے آنکھوں کو سبز شیڈ دیا تھا۔ تیز گلابی لپ اسٹک لگائی تھی، اس کے رخساروں پر ویسے ہی تیز گلابی رنگ آگیا تھا ایک ہاتھ سے بالوں کو، اور دوسرے ہاتھ سے ساڑی کو سنبھالتی۔ وہ شوشہ خانم کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اور شوشہ خانم اس مزے سے جا رہی تھی۔ جیسے اسے ہوا کی پروا نہ ہو ــــ یا ہوا اس سے ڈر رہی ہو ــــ، اس کے بھی کپڑے اڑ رہے تھے ــــ، بال پریشان ہو رہے تھے مگر وہ خود پریشان نہیں تھی، بڑے سکون میں تھی ــــ

نیّا کے لئے اتنی بے باک اور نڈر ہوا کا تجربہ پہلا تھا ——

شوشہ خانم کے پیچھے وہ لپک کر بس میں سوار ہو گئی، بس میں بیٹھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے چاروں طرف دیکھنے کا موقع ملا۔

کراچی کا ہوائی اڈہ —— اس کے ہر تصوّر سے بڑا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ جہاز میں سفر کرے گی۔ اور وہ بھی فرسٹ کلاس میں —— !

شوشہ خانم نے اپنے ساتھ ہی اس کا ٹکٹ بھی فرسٹ کلاس کا لے لیا تھا، یوں اس نے فضا میں کئی بار جہاز اور ہوائی اڈے دیکھے تھے، لوگوں کو جہاز پر چڑھتے اور اُترتے دیکھا تھا۔ مگر جب اس نے لاہور میں پہلی مرتبہ ہوائی جہاز کی سیڑھی پر قدم رکھا تو اس کے جذبات بالکل ایسے تھے جیسے نیل آرم اسٹرانگ کے چاند کی سطح پر پہلا قدم رکھتے وقت تھے، گو وہ چاند کو دریافت کرنے نہیں نکلی تھی، مگر ایک نئی دنیا اس کے خوابوں میں ضرور تھی، مسافروں کے قدموں سے سیڑھی لرز رہی تھی —— اور ساڑھی کے اندر اس کا دل لرز رہا تھا۔

اگلی سیڑھیوں سے چڑھ کر جب وہ فرسٹ کلاس میں پہنچی —— تو تجسّس کے سارے پٹ وا ہو گئے۔

باہر سے اتنا خوفناک جہاز اندر سے کس قدر دلکش تھا! اندر تو دنیا ہی مختلف تھی، اندر تو پریوں کا دیس تھا اور سج دھج پریاں اور پریزاد ایک مخصوص لباس میں اِدھر اُدھر اڑتے پھر رہے تھے۔

نیّا شوشہ خانم کی تقلید میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی —— نرم و گداز خوبصورت سیٹ —— جیسے ماں کی گود —— پھر اچانک اسے موتی کا خیال آ گیا —— جانے مچل رہا ہو گا، یا امّی جان کی گود میں سو گیا ہو گا۔ !

لیکن جہاز کے اندر دیکھنے کو اتنا کچھ تھا —— کہ وہ موتی کو وہیں چھوڑ کر پھر جہاز کے اندر لوٹ آئی۔

بچپن میں جب وہ جہاز کو دیکھ کر تالیاں بجایا کرتی تھی، تو اُسے کوئی اندازہ نہ تھا کہ جہاز کے اندر ایسی دنیا ہوتی ہے —— ! وہ اب بھی سوچا کرتی تھی کہ بھلا لوگ جہاز میں کیوں سفر کرتے ہیں! یوں

ایک دبا پھل نکلی ہے۔ یا مارے فیشن کے —— مگر اب اُسے بیٹھے بیٹھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوہ قاف کی شہزادی ہے۔ اور عنقریب فضاؤں میں اڑنے والی ہے۔

اس نے شیشے میں سے جھانک کر باہر دیکھا . . . . سوائے جہازوں اور عملے کے لوگوں کے باہر کچھ نظر نہیں آیا، لاہور کے ہوائی اڈے پر بتیاں جھلملا رہی تھیں، دُور جنگلے کے پاس بہت سے لوگ اپنے عزیزوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔ شکر ہے ان لوگوں میں اس کا کوئی عزیز نہیں تھا۔ اور امّی جان کے سوا تو کسی کو پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ کراچی جا رہی ہے۔

دروازے بند ہو گئے اور سیڑھی ہٹا لی گئی —— تو اندر کی دُنیا جیسے ایک دم بیدار ہو گئی —— ایئر ہوسٹسوں کے چہروں پر ایک کاروباری سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اسٹیورڈ حضرات بڑی مستعدی سے آگے پیچھے دوڑنے لگے —— جہاز کے اندر وہی روزمرّہ کا معمول شروع ہو گیا۔ گولیاں، ٹافیاں، سوئف —— آؤ بھگت —— مگر نیّا سمجھ رہی تھی۔ جیسے یہ سب کچھ اسی کی خاطر کیا جا رہا ہے، اتنی تواضع، اتنی آؤ بھگت، اس کے لئے کی جا رہی ہے —— کہ آج وہ پہلی بار فضائی مہمان بنی ہے۔

"ممکن ہے جہاز اڑتے وقت تمہارا دِل متلائے۔" شوشہ خانم نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "اُس وقت سوئف والی چھالیا منہ میں رکھ لینا۔"

"اچھا دل متلاتا ہے ——" نیّا نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"گھبرانے کی بات نہیں —— یہاں تقریباً ہر مسافر کے ساتھ اس قسم کے حالات پیش آ سکتے ہیں —— یہ لفافہ دیکھ رہی ہو —— ؟"

شوشہ خانم نے اگلی نشست کی پشت پر لگی جیب میں سے لفافہ نکال کر نیّا کو دکھایا۔ "یہ اسی مقصد کے لئے ہے —— اِسے غور سے پڑھ لو۔" نیّا نے سبز رنگ کا موٹا سا لفافہ شوشہ خانم کے ہاتھ سے لے لیا —— اور پھر اسے اچھی طرح پڑھنے لگی —— لفافے پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ ہر جگہ لکھی ہوئی ہر تحریر کو پڑھے —— اردو اور انگلش میں، جہاز میں جگہ جگہ ہدایات اور سہولتیں لکھی ہوئی تھیں —— نیّا انہیں باقاعدہ ترتیب وار پڑھنے لگی، جس طرح پہلے

روز بچہ چڑیا گھر میں جاتا ہے اور ایک ایک پنجرے کو دیکھتا ہے۔ اس پر جو لکھا ہوتا ہے اسے غور سے پڑھتا ہے۔

اپنے آگے سیٹ کی پشت پر جو جیب لگی تھی، اس میں ہاتھ ڈال کے اُس نے رسالہ اور سارے کاغذ نکال لئے۔ اور پھر ایک ایک کر کے انہیں پڑھنے لگی۔ ایک ہدایت پڑھتے اس کا سر چکرا گیا، دِل ڈوبنے لگا۔ ہاتھ، پاؤں سرد ہونے لگے ــــ

"یہ ..... یہ ..... سیفٹی بیلٹ ..... کہاں ہوتی ہے ــــ؟" نیّا نے ہکلاتے ہوئے شوشہ خانم سے پوچھا۔

تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کارڈ اس کے ہاتھ سے لے کر واپس جیب میں رکھ دیا۔ اور بولی "جب پہلی بار ہوائی سفر کرتے ہیں تو اس کو نہیں پڑھتے۔"

"یہ کیا ہے ــــ؟" نیّا نے اُسی گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"حادثے کی صورت میں ــــ لیکن تم بے فکر رہو، ہماری ہوائی سروس بہت اچھی ہے" میں بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں سوچنی چاہئیں، اچھی گفتگو کرنی چاہیئے۔ اچھی کتاب پڑھنی چاہیئے۔ ابھی میں تمہیں ایک کتاب دوں گی۔"

پھر شوشہ خانم نیّا کو سیٹ بیلٹ باندھنے کا طریقہ اور اس کے فوائد سمجھانے لگی نیّا تھوڑی نروس ہو رہی تھی، جہاز اُترے گا تو جانے کیا ہوگا ــــ وہ گھبرا جائے گی! یا چلّا اٹھے گی یا شاید بیہوش ہو جائے گی ــــ!!!

شوشہ خانم نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا ــــ اور پھر اس پسینے کی طرف جو اُس کی ناک پر نمودار ہو رہا تھا ــــ اس نے نیّا کو تسلّی دینے کی کوشش کی، اور جہاز کے سفر کے محفوظ ہونے کا یقین دلایا ــــ

نیّا نے زبردستی مُسکرا کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا اور پھر تھیلے میں سے ایک ڈائجسٹ نکال ایک دم سے کھولا ــــ تو بیچ والا صفحہ سامنے آ گیا ــــ اوپر لکھا تھا "موت کے سائے

نیّا نے گھبرا کر ڈائجسٹ بند کر دیا، دل دھک دھک کرنے لگا، سارے توہمات اور وسوسے اُس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

اُسی وقت لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ جہاز کراچی کے لئے پرواز کرنے والا ہے۔ بولنے والی کی آواز دلکش تھی مگر اُس کے الفاظ صاف سنائی نہیں دے رہے تھے۔ نیّا نے دو چار الفاظ سن کر اندازہ لگا لیا۔ کہ اب جہاز پرواز کے لئے پر تول رہا ہے۔

"اب .... اب ....." اس نے سوچا۔ "وہ دل ہلا دینے والا حادثہ رونما ہوگا۔ جہاز اڑے گا۔ بہت سی گڑگڑاہٹ ہوگی۔ بہت سا شور اُٹھے گا۔ سب الٹ پلٹ ہوگا۔ اور جانے وہ کیا کیا گُل کھلائے گی۔ اور اپنے ساتھ شوشہ خانم کو بھی شرمندہ کرے گی، اس نے دل کو بہت سمجھایا۔ مگر دِل ڈوبتا ہی گیا۔ ایک بار دھڑکن بے اختیار ہو جائے تو پھر اُسے کب قابو میں لایا جا سکتا ہے!

وہ انتظار میں بیٹھی رہی ــــ کتنے ہی لمحے گزر گئے ــــ لوگ مگن ہو گئے ــــ بلکہ انہوں نے خود ہی بیلٹیں کھولنی شروع کر دیں، نیّا نے گھبرا کر شوشہ خانم کی طرف دیکھا ــــ اور پوچھا۔

"جہاز کب اڑے گا ــــ!"

شوشہ خانم کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اوڈیئر ..... جہاز تو کب کا فضا میں بلند ہو چکا ہے۔"

نیّا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھالیا کو دیکھا ــــ جو اسے "بوقتِ ضرورت" پھانکنی تھی اور پھر سامنے نمودار ہونے والی روشنی کو دیکھنے لگی ــــ جو بیلٹ سے آزاد ہونے کا اشارہ کر رہی تھی۔

پھر سارے سفر میں کچھ نہیں ہوا۔

پرواز کے تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا ــــ خوبصورت برتن، نیا انداز، چھری کانٹے ــــ نیّا ہر بات میں شوشہ خانم کی تقلید کر رہی تھی، کھانا کھانے سے پہلے بھی اُس نے کنکھیوں سے خانم

کی طرف دیکھا تھا۔ چھری کس ہاتھ میں ہے۔ اور کانٹا کس ہاتھ میں ــــ پہلے اس نے کون سا کھولا ہے۔ کس طرح کھانا شروع کیا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے کا سفر بڑی جلدی ختم ہوگیا ــــ جہاز کے اترتے وقت قدرے شور ہوا۔ ایسے محسوس ہوا کہ جہاز لڑھکتا چلا جا رہا ہے ــــ ذرا سی اس کی کمر میں کھنچاوٹ پیدا ہوئی۔ اور پھر جہاز ساکن ہوگیا۔!

"تو یہ تھی لینڈنگ۔" نیا نے سوچا۔

وہ اتنی بزدل تو نہ تھی ــــ آج اُسے اپنے مضبوط اعصاب پر بہت فخر محسوس ہوا۔ سفر کا پہلا مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوگیا تھا۔

مگر آتش شوق اندر ہی اندر بھڑک رہی تھی۔

کراچی جانے اور کراچی دریافت کرنے کی لگن!

بس نے مسافروں کو لاؤنج کے قریب اتار دیا ــــ لاؤنج میں بے حد رش تھا۔ لوگ اپنے سامان کے انتظار میں یوں کھڑے تھے۔ جیسے میدانِ حشر میں اپنے اپنے اعمال نامے کے انتظار ہو ــــ!

یہ ہوائی اڈے، کچھ میدانِ حشر سے کم تو نہیں ہوتے ــــ نیا نے وہاں کھڑے کھڑے سوچا، ہر ایک کو جلدی ہے ــــ کسی کو جانے کی، کسی کو آنے کی ــــ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ جھٹپٹی کی کیفیت، اتنا بے شمار ہجوم ــــ مگر پھر بھی ہر کوئی اپنے آپ میں مگن ــــ اپنے ہی لئے بھاگ رہا ہے ــــ اپنی ہی خاطر دوڑ رہا ہے ــــ!

شوشہ خانم سامان اٹھالائی تھی ــــ دونوں باہر نکل آئیں ــــ باہر فضا زیادہ گرم تھی۔ اور خانم کی لمبی سی کار اور باوردی شوفر اُن کا انتظار کر رہا تھا۔

رات کے گیارہ بجے تھے، جب وہ 'خانم خانہ' میں پہنچیں۔

رات کو گو کراچی بہت روشن تھا ــــ مگر اسے اندازہ نہ ہوا؛ خانم کے بہت بڑے گھر کا

پھاٹک اور کار اندر چلی گئی ــــ سامان اٹھانے کے لئے ایک اور ملازم دوڑا آیا۔

"بچیاں پہنچ گئی ہیں۔" خانم نے اپنے ملازم سے پوچھا۔

"جی سرکار، اور اب آرام کر رہی ہیں۔"

ایک جہاز میں ساری سیٹیں نہیں مل رہی تھیں، اس لئے خانم نے بچیوں کو صبح والے جہاز سے روانہ کیا تھا۔ اور اب نیا کو ساتھ لے کر خود آئی تھی۔ خانم اسے ایک کمرے میں لے آئی۔ اور بولی "نیا، تمہارا کمرہ ہے۔ اب آرام کرو، تم تھک گئی ہوگی، باقی باتیں صبح ہوں گی ــــ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو، تو یہ بٹن دبا دینا، ملازم آکر دے جائے گا۔"

"بہت اچھا خانم۔" نیا نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا بھئی شب بخیر ــــ"

"شب بخیر" نیا نے جواباً کہا۔ اور خانم بغیر آواز نکالے دروازہ بند کر کے چلی گئی ــــ نیا ابھی تک کمرے کے وسط میں کھڑی تھی ــــ وہ بالکل نہیں تھکی تھی ــــ بلکہ تازہ دم تھی ــــ اور حیران بھی تھی، اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کراچی پہنچ گئی ہے۔ اور یہاں ہے، شوشہ خانم کے گھر کے ایک کمرے میں!

کمرہ بہت خوبصورت تھا، ایک ڈبل بیڈ پڑا تھا، فرش پر قالین بچھا تھا، خوبصورت رنگ کے کھڑکی پردے لٹک رہے تھے، کمرے میں ائر کنڈیشنر چل رہا تھا ــــ ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اور ملازم زمرد کرسیاں....

نیا کا معمولی سا بیگ ابھی تک اس کے قدموں کے قریب پڑا تھا ــــ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر بڑھ کر دروازے کا لاک لگا دیا۔ اپنا سوٹ کیس کھولا۔ اور رات کے کپڑے نکالے، کراچی آنے کے لئے اس نے بطورِ خاص نائٹی سلوائی تھی۔ جسے پہننے کا تو اسے ہمیشہ سے شوق تھا مگر وہاں خواجہ عبدالرحیم کے گھر پہن نہ سکتی تھی۔

اپنی گلابی رنگ کی باریک سی نائٹی اٹھا کر وہ غسلخانے میں چلی گئی۔

"آخاہ ـــ" غسل خانے میں کھڑی ہو کر اُس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔

کس قدر خوبصورت غسل خانہ تھا ـــ! اُسے غسلخانہ کون کہہ سکتا ہے.... آبگینے
خوبصورت.... کاسنی رنگ کے خوبصورت ٹائلوں کے درمیان چمچاتا ریشمیں فرش تھا۔
اس پہ چلتے ہوئے شرمار ہے تھے۔ زمین کے اندر کاسنی رنگ کا ٹب پول کھبا ہوا تھا
ایک دلربا حسینہ، انداز بے نیازی سے سو رہی ہو۔ ٹب کے اُوپر کاسنی پھولدار پردے
لٹک رہے تھے۔ اسی رنگ کا بیسن تھا، ایک قدِ آدم شیشہ دیوار میں لگا تھا۔ دو کاسنی
تولئے لٹک رہے تھے ٹونٹیاں اس قدر صاف اور چمکدار تھیں ـ مانو ابھی دکان سے
لگائی گئی ہوں۔ پتہ نہیں، اس غسلخانے کو کبھی استعمال بھی کیا گیا ہے ـ یا نہیں ـ!

نیّا نے ڈرتے ڈرتے فرش پہ قدم رکھے۔ اور پھر بیسن کی ٹونٹی کھول دی ـ جس سے
پانی فوارے کی صورت فراخدلی سے بہہ نکلا ـــ سفید سفید مصفّا اور جھاگ دار پانی ـ
نلکے تلے ہاتھ دھو کر خوب مزا آیا ـــ

نیّا نے کپڑے بدلے، منہ دھویا۔ اور پھر آکر اپنے پلنگ کا ریشمیں سُرخ بیڈ کور اٹھا
کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اور بستر پہ بیٹھ گئی۔

اُف اللہ ـــ! بیٹھتے ہی گدگدی ہونے لگی ـــ اتنا نرم ـــ اتنا ٹھنڈا ـــ گدگدی
ـــ کیسا بستر تھا کہ اس کے وزن سے بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ جس طرف ہوتی۔ وہیں سے بیٹھا
جاتا۔ جیسے کورنش بجالایا ہو ـــ

اتنے نرم بستر پہ وہ کبھی نہیں سوتی تھی ـــ اتنی نرم تو کسی کی باہیں بھی نہ تھیں۔ یقیناً
بستر ہوگا۔ اُس نے دل میں سوچا کیونکہ قوم کے بہت سے خوفناک قسم کے اشتہار وہ پڑھ
چکی تھی۔ پھر اسے اس حسینہ کا خیال آگیا۔ جو اشتہار والے بستر پہ محوِ استراحت ہوتی ہے
لوگوں کے دلوں میں ہلچل مچانے کے لئے اسے بار بار دِکھایا جاتا ہے۔

نیّا نے اپنی نائٹ کریم نکالی۔ اور حسبِ معمول اپنے چہرے اور بازوؤں کا مساج

لگانے کے بعد اس نے کمبل گھسیٹا، جو لفافہ بن کر گدّے میں دبا ہوا تھا۔ اپنی ٹانگوں پہ کمبل ڈالا
کروٹ لے کر بل لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی اس کے گریبان سے ایک خوشبو نکلی۔ جس کے نکلتے ہی
ے ہوتی یاد آگیا۔

ہوتی کو روزانہ وہ خود سُلایا کرتی تھی۔ آج وہ ضرور مچلا ہوگا، مگر امّی جان نے اسے سنبھال لیا
چہ بھی نیّا کو نہ پاکر وہ کتنا پریشان ہوا ہوگا ! نیّا کو اس کا بخوبی اندازہ تھا، باپ ویسے اس
ے سر پر نہیں تھا۔ ماں بھی سارا دن باہر رہتی تھی، لیکن شام کو گھر تو آجاتی تھی اور ساری شام اس
ے ساتھ کھیلنے میں گزار دیتی تھی، اب جب ماں بھی نظر نہیں آئے گی۔ تو اس غریب کا کیا حال
گا، پتہ نہیں، اس نے کراچی آکر اچھا کیا ہے۔ یا بُرا ـــ!

کسی کو نہیں معلوم، وہ کیوں آئی ہے ـــ!

اور یہ تو خود اسے بھی نہیں معلوم، کہ اس نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا ہے؟

ہاں دل میں کوئی تڑپ ہے، جو اسے ہمیشہ آگے جانے پر مجبور کرتی ہے۔ آگے اور آگے۔

شوشہ خانم ایک شمع کی صورت نظر آئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چل پڑی۔

نیّا اگر امّی جان کو اصل بات بتا دیتی، تو وہ اسے کبھی نہ آنے دیتیں، امّی کو تو اب بھی ہول اٹھ
ے ہوں گے۔ لیکن شوشہ خانم کی پیش کش ایسی تھی جسے وہ ٹھکرا نہ سکی، دو چار دن تک سوچنے کے
د نیّا اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اگر وہ اس ماحول سے نکل جائے تو اچھا ہے، یہ تو ٹھیک ہے کہ کہکشاں
ازمں وقت بہت اچھا گزر رہا تھا، آمدنی بھی اچھی خاصی تھی، اس کا سرمایہ بڑھ رہا تھا، منجمد نہیں ہو
یا تھا، مگر اس کی زندگی ضرور ٹھیر گئی تھی۔

شوشہ خانم کی پیش کش کے بعد اس نے کئی بار سوچا تھا۔ کہ واقعی وہ اپنی ساری زندگی اسی
ازمں تمام کر دے گی ـ؟

اور زندگی بھر صرف عورتوں کو مشورے ہی دیتی رہے گی!

اس بھلا اُس کو کیا حاصل ہوگا۔

وہ کہ ایک جہان کو فتح کر لینا چاہتی ہے۔ وہ کہاں جائے! اس نے ہزار بار سوچا۔ اب شوشہ خانم نے ایک راہ پیدا کی تھی۔ ایک روزن کھلا تھا ــــ ہوا کا ایک جھونکا آیا تھا ــــ تو وہ کیوں نہ قسمت آزمائی کرے۔

یہی سوچ کر نیّا کا جی ڈول گیا تھا ــــ مرحلہ تھا تو امّی سے اجازت لینے کا ــــ

"امّی جان، ہمارے پارلر کی کچھ لڑکیاں کراچی جا رہی ہیں۔" اس نے بہت سوچ سمجھ کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

امّی جان نے حسبِ معمول اپنا گونگا چہرہ اٹھایا اور بولتی آنکھیں نیّا کے چہرے پر جما دیں۔

"کچھ لڑکیوں کو ضروری کراچی جانا ہے۔"

"کس لئے ــــ!"

"وہ ــــ دراصل بات یہ ہے کہ جن لڑکیوں نے باقاعدہ ٹریننگ نہیں لی تھی، ان کو کراچی کے لئے کراچی جانا ہے ــــ وہاں ایک ٹریننگ اسکول ہے، صرف تین مہینے میں تربیت دے کر سرٹیفکیٹ دے دیتے ہیں۔"

"اور تم جانا چاہتی ہو۔" امّی نے اتنے آرام سے کہا تھا کہ نیّا کو تعجب ہوا کہ امّی کتنی جلدی کی تہہ تک پہنچ گئی تھیں۔

"اور بھی لڑکیاں ہیں ــــ" نیّا نے نظریں جھکا کر جھوٹ بولا۔

"تم لوگوں کو اس سے کیا فرق پڑے گا ــــ"

"پارلر کا قانون ہے ــــ"

"مگر دو سال تو تم ٹریننگ کے بغیر کام کرتی رہی ہو۔"

"اس سے پہلے ضرورت نہیں پڑی تھی امّی ــــ لیکن اب بہت سی تربیت یافتہ دوسرے ملکوں سے بھی آگئی ہیں، بڑا کمپیٹیشن ہو گیا ہے، کہکشاں کا خیال ہے کہ میں بھی کے ساتھ چلی جاؤں، تین مہینے کی کوئی بات نہیں ــــ چونکہ میں پارلر کے مالکوں میں سے

لئے لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ان ٹرینڈ مالک کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ میری بھی نہ بڑھے۔ اور کہکشاں کسی تربیت یافتہ لڑکی کو اپنے ساتھ ملا لے۔" امّی خاموش ہو کچھ نہیں بولیں۔

سب لڑکیاں وہاں ایک ہوسٹل میں رہیں گی، کوئی فکر کی بات نہیں ہو گی۔"

"تم تیار ہے بھائی ــــ"

"امّی اب آپ خود ہی سوچیں نا! یہ بھائی مجھے کیا دے رہے ہیں۔ میرے معصوم بچے سر پر ہاتھ بھی نہیں رکھ سکتے۔ چلیں پیسہ نہیں دیتے تو نہ دیں۔ میٹھا بول بھی نہیں بول سکتے۔ باپ نہیں، تو کیا کوئی بھی اُسے باپ کی شفقت نہیں دے سکتا!" نیّا کی آنکھوں میں آنسو ئے.....

دل امّی کا بھی دُکھا ــــ پر وہ کیا کرتیں ــــ جب بہن بھائیوں میں محبت ہی نہیں رہ امّی تو وہ کیا کر سکتی تھیں۔

نیّا نے ان کی ذہنی کیفیت بھانپ لی، اور چند لمحوں کے توقّف کے بعد بولی۔

میں دُنیا میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے لئے، اپنے بچے کے لئے، کس کس کے آگے پھیلاؤں گی؟"

تمہیں ہاتھ پھیلانے کو کون کہتا ہے؟ جب تک میں زندہ ہوں۔ اس گھر سے تمہیں کوئی دخل نہیں کر سکتا اور جب تک میں یہاں ہوں ــــ تمہیں روٹی ٹپڑا ملتا رہے گا۔"

روٹی ٹپڑا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا امّی ــــ آج عزت اُس کی ہے جس کے پاس ہے۔ دولت ہو ــــ کار ہو ــــ اور ــــ اور ــــ سب کچھ ہو ــــ"

امّی نے افسردگی سے نیّا کی طرف دیکھا، ایک عورت چلی ہے، زمانے سے لڑنے۔ ہماری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

اگر دُنیا میں ہر کوئی اپنی بات دوسروں کو سمجھا سکتا۔ تو یہ دُنیا جنّت بن گئی ہوتی امّی، المیہ

تو ہی ہے کہ یہاں کوئی کسی کی بات نہیں سمجھتا۔"

امّی خاموش ہو گئیں۔

"آپ ان کو سمجھا دیجئے گا، خواہ مخواہ مجھ پر دھونس نہ جمائیں۔ میں اپنا بڑا بوریا بستر
تین مہینے کے لئے جا رہی ہوں، کہکشاں کے پاس میرا پتہ ہو گا، وہاں جا کر خواہ
آپ مہربانی کر کے موتی کا خیال رکھیں۔ بس مجھے اُس کی فکر ہے۔"

"تم اس کی فکر نہ کر، اس کا دھیان رکھنے کے علاوہ مجھے اور کیا کام ہے۔
میرا دل ڈرتا ہے — عورت ہمیشہ کانچ کی مانند ہوتی ہے — مرتے دم تک
"پتہ نہیں، یہ آپ اس کانچ سے کب تک ڈرتی رہیں گی۔ پہلے کنوار پنے کا
دیتی تھیں — تب زندگی ابیرن کی ہوئی تھی — پھر میں شادی شدہ تھی — اب
رہی — اور اب — اب جبکہ حالات نے مجھے پتھر بنا دیا ہے۔ آپ کے نزدیک
کانچ ہوں، نہیں امّی نہیں — میں اب پتھر کی بن گئی ہوں۔ اب مجھے کوئی نہیں توڑ
گا، آپ یقین رکھیں —"

نیّا ایک عزم سے کھڑی ہو گئی۔ ایسے میں امّی کی حالت دیدنی ہوتی تھی، ایسے
قبض کی جا رہی ہو — مگر اُف کی اجازت بھی نہ ہو۔

"امّی کو کیا پتہ —" نیّا بڑبڑانے لگی۔ "اندر بیٹھی سارا دن کہانیاں گھڑا کرتی ہیں اور
کے لئے ہی ابّا جی انہیں چھوڑ گئے ہیں —" نیّا اٹھ کر موتی کے کپڑے الماری میں
امّی کو ان کے بارے سمجھانا تھا — اور بھی بہت کام تھے۔

گو اندر سے نیّا کا دل ڈر رہا تھا، مگر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر
میں کچھ کرنا چاہتی تھی۔

اپنی ناکامی کا داغ دھونا چاہتی تھی۔

اُس نے شوشہ خانم کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

اور آج وہ شوشہ خانم کے ساتھ کراچی آ گئی تھی۔

ایک مسئلہ تو حل ہوا۔

سونے سے پہلے اُسے موتی کا بار بار خیال آیا، رات کو نہلا دھلا کر وہ اسے بہت پیار کیا کرتی
اور وہ بھی خوب لاڈ کر کے سوتا تھا، سوتا تو اس کے بازوؤں میں تھا۔ وہ بعد میں اُٹھا کر پلنگ پر
دیتی تھی۔

اس کے دل میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا۔

موتی اسے واپس بلا رہا تھا، مامتا کے جذبوں سے اسے ڈر آنے لگا۔ اُس نے اُٹھ کر بتی بجھائی
بہت اندھیرا ہو گیا، پھر غسل خانے کی بتی جلا دی،
روشنی کا اہتمام کر کے وہ نرم نرم گدّے پر لیٹی، تو اس کے ذہن میں ایک اَن دیکھے جہان
اَن گنت خواب تھے!

صبح صبح اٹھ کر نیا جلدی سے تیار ہو گئی، جیسے انٹرویو کے لئے جانا ہو۔ مگر اس
تو صبح بہت دیر بعد آئی، آٹھ بجے تک خاموشی رہی ـــ اتنی خاموشی کہ نیا کو ڈر آنے لگا
نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی ـــ سارا گھر دیکھ لیا ـــ بہت بڑا اور خوب
ڈرائنگ روم تھا۔ سارا گھر جدید ڈیزائن کا تھا ـــ وہ ٹہلتی ٹہلتی گیٹ تک چلی گئی، وہاں کھ
کر اس نے گھر کو اچھی طرح دیکھا، اس کا ڈیزائن دیکھا، اور جی ہی جی میں سراہتی ہوئی اندر آ گئی
سارے بیڈ روم کے دروازے بند تھے اور اندر سے ائر کنڈیشنر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ظ
لوگ مزے سے سوئے ہوتے تھے ـــ نیا کی آنکھ عادت کے مطابق کھل گئی تھی۔ کچ
کے وہ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی، بستر پر دراز ہو کر ایک رسالہ پڑھنے لگی، بارے ـــ
نے دروازے پر دستک دی، وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی، شوشہ خانم کی بڑی بیٹی نتاشا کھڑی تھی
"ممی آپ کو ناشتے پر بلا رہی ہیں"۔

نیا نے ایک بار پھر آئینہ دیکھ کر اپنے بال اور لپ اسٹک ٹھیک کی ـــ اور باہر آ
لوگ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ چکے تھے، مگر سب ہی رات کے کپڑوں میں تھے ـــ ایک صرف
تیار ہو کر آئی تھی ـــ اس لیئے مہمان لگ رہی تھی۔

"صبح بخیر نیا ـــ کیسی ہو ـــ" خانم نے خوش دلی سے کہا۔

"صبح بخیر" نیا مسکرا کر بیٹھ گئی ـــ

"رات کیسی گزری؟"

"بہت اچھی ـــ"

"نیند آ گئی تھی"

"ہاں تھوڑی سی کوشش کے بعد ـــ"

"نئی جگہ ہو تو نیند مشکل سے آتی ہے ـــ"

"ہاں" نیا ہنس کر بولی ـــ "مجھے دراصل موتی کا خیال آنے لگا تھا ـــ"

"اوہ، سوئٹ موتی ـــ" شوشہ خانم نے پیار سے کہا، پھر بولی "معصوم بچہ جلدی بہل جاتا
ہے ـــ بی اے بریو گرل ـــ"

نیا صرف مسکرا دی ـــ اس نے تو خود ہی بہادر بن جانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

"لیا لو گی بھئی، شروع کرو ـــ اگر ناشتے پر کوئی خاص چیز لیتی ہو تو بتاؤ ـــ"

"کچھ نہیں ـــ" نیا نے ایک سلائس اٹھا لیا ـــ اور چھری اٹھا کر مکھن لگانے لگی۔

ناشتے کے بعد شوشہ خانم نے نیا کو اپنا گھر دکھایا ـــ خانم کا بیڈ روم دیکھنے کے قابل تھا ـــ
کمانیوں والا شبستان لگتا تھا اور وہ وہاں تنہا سوتی تھی۔

"خانم آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے" نیا نے آنکھیں بند کر کے خوابناک انداز میں کہا ـــ "میں
نے اتنا خوبصورت گھر آج تک نہیں دیکھا" خانم جھک کر سگریٹ سلگانے لگی ـــ پھر کش لیتی رہی،
اس نے کچھ نہیں کہا ـــ "میں تو حیران ہو رہی ہوں ـــ آپ نے اتنا شاندار گھر بنا کیسے لیا ـــ؟"

"بیٹھ جاؤ" خانم نے اپنے بیڈ کی طرف اشارہ کر کے نیا سے کہا ـــ "نیا ڈیئر! یہ زمانہ بہت بڑا
دھوکہ ہے ـــ مرد، عورت کو معاشی تحفظ دیتا ہے، اسی ایک زعم میں وہ عورت کو ہر طرح پامال کرتا
ہے بار بار توڑتا پھوڑتا ہے ـــ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ عورت کے پاس معاشی تحفظ ہونا

چاہیئے — صرف حُسن اور جوانی سے کچھ نہیں ہوتا — میں نے وقت ضائع نہیں کیا
کچھ حاصل کیا ہے — میں بُزدل عورت نہیں تھی کہ ٹھوکریں کھا کر زمین بوس ہو جاتی
نے ہی میری آنکھ کھول دی تھی، میں نے تین شادیاں کیں — تینوں شوہروں سے اپنا
ہے — بخشا کسی کو نہیں — ! اور مرد کو کبھی نہیں بخشنا چاہیئے، وہ عورت کو حقیر
اسی لئے ایک چھناکے سے زنجیر توڑ لیتا ہے، پھر ہلکا پھلکا ہو کر دوسری عورت کی جانب
ہے — زنجیر ٹوٹنے سے پہلے اپنا خسارہ پورا کر لینا چاہیئے —"

نیّا ہونقوں کی طرح خانم کا چہرہ دیکھنے لگی، خانم نے اپنی تقریر جاری رکھی — "عورت
اتنا ذلیل سمجھتے ہیں، کہ کہتے ہیں — عورت کی جوانی صرف ایک رات کی ہوتی ہے، ذرا سوچو
لوگ شادی کرتے ہیں اور صرف ایک رات کی قیمت لگاتے ہیں اور پھر باقی ساری زندگی
تنہائی کا عذاب بخش کر چلے جاتے ہیں، حالانکہ عورت کی جوانی ایک رات کی نہیں ہوتی —
اور مرد جوانی کا سفر ساتھ ساتھ ختم کرتے ہیں — یہ نفسیاتی موت ہے، جو مرد جان بوجھ کر عورت
میں پھونک دیتا ہے، اس واسطے اُسے بخشنا نہیں چاہیئے —" چند لمحے خاموشی طاری رہی
"تم نے اپنا مہر لے لیا تھا یا معاف کر دیا تھا؟" اچانک اس نے نیّا سے پوچھا۔
"میں نے تو لے لیا تھا"۔
"بہت اچھا کیا — اپنی گزری ہوئی عمر کی قیمت ضرور وصول کرنی چاہیئے۔ مجھے
بہت بے وقوف لگتی ہیں، جو مہر معاف کر دیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ یہ سب ان کے مقدر میں
عورت اپنا مقدر دوبارہ بنا سکتی ہے"۔

خانم نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا — "ایک راز کی بات تمہیں بتاؤں —
کہ جوانی بڑی ظالم شے ہے اور حُسن بڑا فتنہ پرور — مگر ایک بات اور بھی یاد رکھو —
سب پر حاوی ہے، اگر کوئی عورت جوان بھی ہو، حسین بھی ہو، اور پھر دولت مند بھی ہو —
مرد اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں ——

"میرا گھر دیکھ رہی ہو نا؟" خانم نے نیّا کی مسلسل خاموشی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا — "اسی گھر
کو دیکھ کر کئی آدمی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ میں چالیس برس کی ہو چکی ہوں"۔
نیّا اب بھی چپ رہی، اب خانم جیسے خود سے باتیں کر رہی تھی — وہ بولی — "میرا گھر ہے، میری
سکیورٹی ہے — میرے پاس سب کچھ ہے۔ اس لئے میں ہر اس مرد کو ٹھکرا سکتی ہوں، جو مجھ
سے ذرا بھی اُونچی آواز میں بات کرے گا"۔

نیّا کے خون میں ایک نئی سی لہر اٹھنے لگی — اُسے خانم بہت اُونچی اور اچھوتی عورت دکھائی
دینے لگی — وہ کہہ رہی تھی۔ "یہی وجہ ہے کہ جب میں کوئی جوان اور خوبصورت طلاق یافتہ لڑکی
دیکھتی ہوں، تو مجھے اس پر ترس آنے لگتا ہے، میں نہیں چاہتی کہ تم بدنصیبوں کی طرح زندگی گزارو۔
اپنے لئے جیو، مگر بہادروں کی طرح جیو — میں تمہیں زندہ رہنا سکھاؤں گی"۔

"شکریہ خانم" نیّا کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو آ گئے —

خانم کھڑی ہو گئی — اس نے کہا — "مجھے ذرا اپنے آفس جانا ہے، تم ایسا کرو، کہ میری
بچیوں کے ساتھ سیر سپاٹے کا پروگرام بنا لو — ان کی چھٹیاں ہیں، میں چاہتی ہوں، ان کے ساتھ مل
کے تم کراچی کا چپہ چپہ دیکھ ڈالو — تب تک میں فارغ ہو جاؤں گی — اور بیٹھ کر تمہارے لیے
پروگرام بنائیں گے — ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے" نیّا نے ہولے سے کہا —

"تم ذرا لیے دیئے رہتی ہو، اور پہلی مرتبہ گھر سے نکلی ہو — میں چاہتی ہوں — تم اس فضا
میں بے تکلف ہو جاؤ — خوش رہنا سیکھو"۔ خانم نے اسے سمجھایا۔

"میں ایسا ہی کروں گی خانم —" نیّا ایک فرماں بردار شاگرد کی طرح بولی۔

"اور دیکھو، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ یہاں کسی قسم کی گھٹن محسوس نہ کرنا — جہاں دل چاہے جانا،
جب وقت دل چاہے کھانا — ایسے رہو، جیسے میری بچیاں رہتی ہیں —"

"شکریہ خانم!"

"بار بار شکریہ کہنے کی ضرورت نہیں ——" خانم نے اُٹھ کر نیّا کے گال تھپتھپائے اور غسل خانے میں چلی گئی ——

نیّا اپنے کمرے میں آگئی، پھر فوراً نکل کر خانم کی بچیوں کے کمرے میں چلی گئی۔ خانم کی نتاشا جوان تھی اور ماں کی جوانی کی تصویر تھی، دوسری دو ابھی کم سن تھیں۔

اُجالا اور بازغہ —— جس طرح اُن کے نام مختلف تھے۔ اِسی طرح صورتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں، تینوں بچیوں کے چہروں پر عجیب سی سنجیدگی تھی —— اور خاص طور پر جب نیّا ان کی تعریف میں کوئی فقرہ کہہ دیتی —— تو تینوں کے چہروں پر ایک بے نام سا اندھیرا چھا جاتا۔ اُٹھنے کی بجائے وہ بجھ جاتیں ——

کلفٹن، کیماڑی، ہاکس بے، سینڈز پٹ اور جتنے بھی پکنک اسپاٹ تھے، سبھی نیّا نے دیکھ لئے تھے، سمندر کو دیکھ کر اس کا جی نہ بھرتا تھا —— اتنا وسیع، اتنا بیکراں۔

زمین کے سینے پر اتنا پانی اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا —— کس آزادی سے یہ پانی آتا جاتا تھا جیسے لاڈلا بچہ ماں کے سینے پر پڑا مچل رہا ہو، کاش وہ ایک سمندر ہوتی، جس کا کوئی کنارا نہ ہوتا۔ اور جو اس دھرتی کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے!

ساحل سمندر پر کھڑے ہو کر اس پر عجیب عجیب سے راز منکشف ہونے لگتے تھے۔

بچیاں ادھر اُدھر کھیل میں محو ہو گئی تھیں، اس کے قدموں تلے جھاگ جھاگ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی تھا اور ہوا اس کے چُنے ہوئے دوپٹے کو یوں اڑائے لئے جا رہی تھی —— جیسے وہ کوئی آسمانی مخلوق ہو جو سیر کے لئے زمین پر اتر آئی ہو، اپنی شلوار کے پائنچے اٹھائے —— جیسے وہ اَن دیکھے جزیروں کی طرف محوِ پرواز تھی ——

یہاں آ کے کسی پرانے زخم کے ٹانکے کھل گئے تھے۔

ہوا اُسے چھیڑتی تھی، تو اس کے سوئے ارمان جاگ اٹھتے تھے ——

زندگی کا اتنا طویل سفر، اور یہ پہاڑ سی تنہائی ——

ہوا کبھی اِدھر سے چھیڑ کے گزر جاتی، کبھی اُدھر سے چھیڑ کے گزر جاتی — وہ کبھی آگے
اور کبھی پیچھے — دور ہنستے کھیلتے ہوئے لوگوں کو دیکھتی اور خاص طور پر شادی شدہ جوڑوں کو
خدا معلوم وہ شادی شدہ تھے یا — ایک دوسرے کے محبوب — مگر جب وہ آس پاس کی
عورت کو ایک دوسرے میں ڈوبا ہوا دیکھتی — تو دل سے قطرہ قطرہ لہو ٹپکنے لگتا —
زندگی سے تمنائیں خارج کر دی جائیں، تو باقی کیا رہ جاتا ہے — !

یہاں اتنا بڑا جہاں تھا، فضا آزاد تھی — پھر بھی — وہ بیکل ہو گئی تھی، وہاں لاہور میں
مطمئن رہا کرتی تھی، پیچھے کوئی تاروں بھری راہ نہ تھی — اور آگے کوئی اُجالے کی کرن نہ تھی
یہاں مطلع صاف تھا —

جب پانی کی موتیوں بھری لہر دوڑ کر اُس کے پاؤں چھوتی تو وہ توازن برقرار نہ رکھ سکتی
لگتی — ایسے میں جی چاہتا، کوئی ہاتھ ہوں — جو بڑھ کر اسے تھام لیں — مگر وہ ہاتھ
کہاں تھے — ؟

کبھی لڑکیاں اسے پکچر دکھانے کو لے جاتیں — لڑکیاں بھی عجیب تھیں — ایک کہتی
میں اُردو پکچر دیکھوں — دوسری کہتی انگریزی فلم، اور تیسری صاف کہہ دیتی کہ وہ پنجابی فلم دیکھے
گی — خواہ وہ کتنے ہی واہیات سینما میں کیوں نہ لگی ہو — نیا ہمہ وقت قینچیوں میں مفاہمت
کرواتی رہتی —

پھر اسے ایک ہفتے میں تین فلمیں دیکھنا پڑتیں — اتنے بڑے بڑے ہنڈے ہنڈے
ہال، اتنے بے شمار لوگ — نیا نے ایسی فضا لاہور میں نہ دیکھی تھی — وہاں اب وہ اپنی
سہیلیوں کے ساتھ باقاعدہ فلم دیکھ آتی تھی، مگر وہاں ایک ڈراؤنا، دبا دبا ماحول تھا، پھر یہ بھی
ڈر رہتا تھا، کہیں کوئی بھائی نہ دیکھ لے، کوئی رشتہ دار نہ دیکھ لے۔

اُس روز وہ ایک انگریزی فلم دیکھنے کے لئے گئی تھیں — نیا جب ہال میں داخل ہوئی تو
جیسے ہر ایک کی نظر اس پر ٹک گئی تھی، مرد و زن سب اسی کو دیکھ رہے تھے، اس نے محسوس تو

فلم دیکھنے والا بنایا تھا، یعنی ٹراؤزرز کے ساتھ تنگ بلاؤز پہنا تھا، بغل میں لمبا پرس لٹکایا تھا
پر کالی عینک لگائی تھی، سر کی چوٹی پر ایک گول سا جوڑا بنایا تھا — مگر اس کا شاداب
چہرہ — سب سے الگ نظر آ رہا تھا — اس محلے کی اور بھی لڑکیاں تھیں یہاں
کا چہرہ اتنا چمکدار نہیں تھا —
اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی — اندر کتنا خوبصورت ماحول تھا — عورت،
سب مگن اور خوش نظر آ رہے تھے — سینما ہال کے اندر ایک الگ ہی جہان ہوتا ہے
لگتا ہے، سب لوگ اپنے چھوٹے بڑے غم، دروازے کے باہر چھوڑ آتے ہیں، یہ ایک
ہوتا ہے، جہاں صرف دل ہی دل ہیں، ذہن جیسی کوئی شے ساتھ نہیں آتی — زندگی
چند لمحوں کی خوشیاں چرانے آتے ہیں یہ لوگ !

فلم پردے پر چلنے لگی — سرگوشیاں مدھم ہو گئیں، سرسراہٹوں کے منہ بند ہو گئے —
ہال ریشمیں بن گیا، جس میں اسکرین پر ہونے والی روشنی کی دھار ایک آبشار کی صورت بہنے لگی،
آبشار — جس میں رنگ ہی رنگ ہوتا ہے — نور ہی نور ہوتا ہے —
اسی اندھیرے میں نیا نے چاروں طرف دیکھا — لیکن اندھیرے میں کیا نظر آتا ہے ؟
صرف پاس بیٹھے ہوئے ساتھی کا دھڑکتا ہوا دل اور گرم گرم ہاتھ ہی محسوس ہوتا ہے — !
نیا کو ایک بیک یوں محسوس ہوا جیسے وہ یکہ و تنہا ہے — ازل سے آج تک — ! اس
راستہ اکیلی ہے —
راستہ خارزار ہے —
اور روشنی دُور —

اس کا دل چاہا وہ روئے، حالانکہ پکچر ہنسنے والی تھی، ہال میں سب قہقہے لگا رہے تھے
نی کے جھرنے اُسے اُداس کئے دے رہے تھے،
پھر پکچر ختم ہو گئی اور وہ لوگ ہجوم کے ساتھ باہر نکل آئے — انسانوں کا اژدھام تھا، ہر

رنگ، ہر قد و قامت کے لوگ، ان میں سے ہر کوئی کسی دوسرے کے لئے تھا ۔ نیا یہاں سے بھی گزری ۔ شائقین نے نظر بھر کر اس کو دیکھا، پلٹ کر دیکھا اور پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر آہ بھی کھینچی ۔

مگر نیا تو کٹی ہوئی وہ پتنگ تھی جو کسی پرانی بسنت رُت کو، اونچے سے درخت کی ٹہنی پر اٹک گئی تھی ۔ نہ وہاں تک کوئی پہنچ پاتا، نہ اسے چھڑا کر لاتا ۔ ؟

کٹی ہوئی، اور لوٹی ہوئی پتنگ کو ویسے بھی لوگ ناکارہ سمجھتے ہیں ۔

بوجھل دل کے ساتھ نیا آ کر کار میں بیٹھ گئی، کار میں یوں بار بار بیٹھنا بھی اُسے زندگی میں بار نصیب ہوا تھا ۔ ورنہ اس کی خوبصورت جوانی تو بسوں میں دھکے کھاتے گزر رہی تھی ۔

یہاں کوئی کام کار کے بغیر نہیں ہو پاتا تھا ۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو کار میں جا کر لے آؤ ۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لئے سارا دن کار بازار کے چکر لگاتی تھی ۔ کبھی بچی کو، کبھی نہ کسی شے کی ضرورت پڑ ہی جاتی ۔ ویسے بھی نیا کو کراچی کے بازار دیکھنے کا شوق تھا، عام عورتوں کی طرح خرید و فروخت کی شیدائی وہ بھی تھی ۔ لیکن اسے تو موڑ دینے ہی نشہ آ جاتا ۔

شوفر بڑھ کر لمبی سی موٹر کا دروازہ کھول دیتا، وہ ادا سے اندر بیٹھ جاتی، سڑکوں پر ٹریفک گھومی تھی، مگر موٹر میں بیٹھ کر نظارہ کرنے کا مزا ہی جُداگانہ تھا اور پھر جب کسی بڑی سی دکان کے سامنے موٹر رُکتی ۔ اور شوفر ادب سے دروازہ کھول دیتا ۔ تو وہ یوں شان سے باہر نکلتی جیسے اپنے پاؤں سے موٹروں کو پامال کرتی رہی ہے ۔ یا پھر یہ موٹر اسی کی خاطر ایجاد ہوئی تھی ۔

بڑی سی موٹر کا دکانداروں پر بھی بڑا اچھا اثر ہوتا تھا ۔ وہ اسے یوں خوش آمدید کہتے جیسے اسی کے انتظار میں بیٹھے ہوں ۔ گو اس کا خیال تھا کہ نوے فیصد لوگ اُس کے حسن سے مسحور ہو جاتے ہیں ۔ پھر بھی، حُسن اور جوانی اگر موٹر سے باہر نکلے تو بات اور ہی ہوتی ہے ۔

شوشہ خانم ٹھیک ہی کہتی تھی، عورت کے پاس اگر دولت نہ ہو تو وہ مفلس ہی ہوتی ہے ۔

حالانکہ اس نے ہمیشہ یہ سوچا تھا کہ حسین عورت ہر عمر میں مالا مال ہوتی ہے اور اس کے خزانے عمر کے سوا کوئی نہیں چُرا سکتا ۔

کاش وہ شوشہ خانم جتنی باہمت اور بہادر عورت بن جاتے ۔ آخر جل جل، اور کڑھ کڑھ کر زندگی گزارنے کا فائدہ بھی کیا ہے ؟ ۔ حسین عورت کے پاس دولت ہو تو وہ سدا بہار ہوتی ہے ۔

مگر دولت کیسے آئے گی ۔ !

جب سے وہ کراچی آئی تھی، خانم سے اس کی مفصل ملاقات نہیں ہو سکی تھی، خانم ناشتے کے بعد اپنے دفتر چلی جاتی تھی اور شام کو عام طور پر اس کے پاس ملنے والوں کا تانتا بندھ جاتا تھا، گیٹ سے باہر بہت سی گاڑیاں نظر آتی تھیں، ڈرائنگ روم سے قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں ۔ اور بار بار چائے کے برتن کھنکتے تھے، کبھی اِدھر اُدھر سے گزرتے ہوئے نیا اندر کا نظارہ کر لیتی تھی ۔ لیکن خانم نے اسے اندر کبھی نہیں بلایا تھا ۔ ویسے بھی شام کو اس کا بچیوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی پروگرام ضرور ہوتا تھا، رات کے کھانے پر کبھی خانم ان کا ساتھ دیتی ۔ اور کبھی باہر چلی جاتی ۔

کبھی کبھی نیا کو یوں محسوس ہوتا جیسے خانم اُسے یہاں بلا کر بھول گئی ہے ۔ مگر صبح ناشتے پر ملاقات ہو جاتی جیسے رات بھر وہ نیا ہی کے خواب دیکھتی رہی ہے ۔ تو پھر نیا کے سارے شبہات دور ہو جاتے ۔

ایک دن خانم نے صبح ہی صبح اس کا حال پوچھا اور کہا ۔ "آج شام میں فارغ ہوں رات کا کھانا ہم سب مل کر باہر کھائیں گے اور گپ بھی لگائیں گے ۔"

جب سے نیا لاہور سے آئی تھی آج پہلی بار خانم کو اپنی بچیوں سے گپ لگانے کا خیال آیا تھا ۔ نیا نے لڑکیوں کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر کوئی چراغ نہیں جلے تھے ۔ ایسے چُپ چاپ بجھی بجھی رہیں جیسے خانم کا حکم بجا لانے میں ہی عافیت ہے ۔ پھر بھی نیا رات کو بڑے اہتمام سے تیار ہوئی ۔ اپنی ایک خوبصورت کامدانی ساڑی پہنی ۔ زیور کا ہلکا سا سیٹ پہنا، خوب

اچھا میک اَپ کیا ـــــ پہلی بار وہ کراچی کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں جا رہی تھی اور ہر بار باہر جانے سے پہلے جیسے وہ یہ سمجھتی۔ گویا سبھی لوگ صرف اسی کو دیکھیں گے ـــ کہ یہ تو اس کراچی میں نئی چیز ہے ـــ!

خانم آگے آگے، اور چاروں پیچھے پیچھے ـــ ہوٹل کے اندر داخل ہوئے تو مالک نے آداب بجالایا ـــ بیرے دوڑے آتے، ایک خاص میز اُن کے لئے ترتیب دی گئی جہاں لوگ بیٹھ گئے ـــ خانم نے اپنے گولڈن ایوننگ بیگ میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ منہ میں لگالیا، ابھی وہ سُلگانے کو تھی کہ ہوٹل کا مینیجر قریب ہی کھڑا تھا ـــ لائٹر جلا کر قریب لے آیا ـــ اس نے خانم کی سگریٹ کو شعلہ دکھایا، خانم نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبا کش لیا اور فضا میں دُھواں چھوڑ کر مسکراتی اور بولی ـــــ

"تھینک یو"

بیرے نے مینیو آگے کر دیا اور خانم ایک ایک سے پوچھ کر کھانوں کا آرڈر دینے لگی۔ نیا کچھ نہیں جانتی تھی، اسے صرف یہ معلوم تھا کہ ہوٹلوں میں دیسی کھانوں کے بھی عجیب و غریب نام ہوتے ہیں ـــ اس لئے اس نے خانم سے کہہ دیا کہ وہ خود ہی اس کے لئے آرڈر دے دے۔

خانم نے سب کے لئے آرڈر دے دیا ـــ لیکن وہ اطمینان سے نہ بیٹھ سکی ـــ ہال میں بیٹھے ہوئے کئی لوگ اسے جانتے تھے، کوئی اِدھر سے ہیلو کہتا ہوا نکل آتا، کوئی اُدھر سے لوگ تو اٹھ کر اس کی میز پر بھی آتے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر گپ لگا کر چلے گئے، ہر آدمی خواہ جوان تھا یا بوڑھا ـــ گفتگو کے دوران نیا کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا ـــ

شاید وہ لوگ نیا کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے تھے ـــ مگر ابھی پوچھنا نہ چاہتے تھے۔

نیا دل ہی دل میں نروس ہو رہی تھی، مگر اوپر سے خوب اِترا رہی تھی ـــ پھر کھانا آیا ـــ تو وہ کھانے کی سج دھج دیکھ کر حیران رہ گئی ـــ ہر کھانا ایک نئے انداز سے آرہا تھا ـــ اور خانم مشاقی سے سرو کر رہی تھی، بعض اوقات وہ کھانے کے اوصاف بھی بیان کرنے لگتی ـــ

نیا بہت میں خانم کی نقل کر رہی تھی ـــ کھانا بہت مزے دار تھا ـــ مگر اتنی نفاست سے کھا رہا تھا کہ بھوک مٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھی ـــ وہ بوکھلائی بوکھلائی ہال میں چاروں طرف دیکھ بھی جاتی ـــ گویا سب نظریں اس پر ٹکی ہیں، اگر ذرا سی بھی غلطی ہو گئی تو لوگ تالیاں بجانے لگے ـــ مگر ہر کوئی اپنی ہی میز پر مگن تھا، بے شمار مرد اور عورتیں تھیں، سب ہی ہنس بول رہے تھے۔ سب ہی بے فکرے، خوش فکرے لگ رہے تھے، ان کے چہروں پر ایسا اطمینان تھا ـــ جیسے انہیں زندگی میں کوئی غم نہیں ـــــ

خوش لباس اور فیشن ایبل خواتین مسلسل مسکرا رہی تھیں، خوش لباس اور مہذب مرد آنکھوں آنکھوں میں اُن پر نثار ہو رہے تھے ـــــ

اس خوبصورت دُنیا میں غم کی پرچھائیں نہ تھی ـــ سب لوگ مگن اور مسرور زندگی گزار رہے تھے ـــ ایسی ہی زندگی کی تمنا نیا نے بھی کی تھی ـــ مگر اب یہی تمنا ضرورت بنتی جا رہی تھی۔

نہ جانے کیا بات ہوتی تھی، جب سے وہ کراچی آئی تھی، اس کے اندر ایک شعلہ سا جاگ اٹھا تھا ـــ

وہ لاہور میں تھی تو اُسے اس قسم کا کوئی احساس نہ تھا، نہ یہ غم ستاتا کہ وہ تنہا ہے، زندگی کیسے گزارے گی ـــ کس طرح پا پیادہ چلے گی ـــ تنہا یہ سفر کیسے طے کرے گی ـــــ

وہاں خواجہ عبدالرحیم کے گھر میں، خواب نہیں آتے تھے، اور جو خواب اُس نے دیکھے تھے، ان کی تعبیر بڑی بھیانک ملی تھی ـــــ

اس لئے وہاں وہ زندگی گزارے چلی جا رہی تھی ـــــ

صبح اٹھ کر پارلر چلی جاتی تھی، اور شام کو تھکی ہاری آجاتی تھی ـــــ

پارلر میں وہ خوب ہنس بول لیتی، کبھی کبھی سہیلیوں کے ساتھ مل کر بازار بھی چلی جاتی ـــ لیکن گھر کے اندر داخل ہو کر وہ مُردہ ہو جاتی اور باہر کی باتیں بھول جاتی جیسے سرِ شام گھر کا دروازہ بند کر کے چوروں اُچکوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں ـــــ

تین سال تو گزر ہی گئے تھے، ان سالوں نے اُسے بہادر لڑکی بنا دیا تھا۔ وہ موتی کے بارے میں سوچا کرتی۔ اسے موتی کے مستقبل کی بہت فکر تھی، وہ موتی کا بچپن چاہتی تھی، موتی کی خاطر اس نے یہ آبلہ پائی قبول کر لی تھی ——

وہ یونہی چلتے رہنا چاہتی تھی ——

آہستہ آہستہ ..... ہولے ہولے !

مگر کراچی آکر اُس کا لہو گرم ہونے لگا تھا، اس کا تیز تر بھاگنے کو دل چاہتا تھا، زندگی روی پر اسے غصہ آنے لگا تھا۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ وقت اتنی تیزی سے بھاگ رہا ہے کا ساتھ نہ دیا گیا تو ہم پیچھے رہ جائیں گے ——!

یہاں تو موتی نے بھی اُس کا راستہ نہیں روکا تھا ——

ایسا نہیں کہ موتی اسے یاد نہیں آیا تھا، شروع شروع میں تو اس کی یاد ہر پل پھر رفتہ رفتہ وہ مصروف ہوتی گئی۔ مگر رات کو سونے سے پہلے موتی مجسم ہو کے اس کے میں آجاتا —— وہ اس کے آنسوؤں سے تر رخساروں پر کئی بوسے دیتی، اسے کلیجے سے پھر اس سے معافیاں مانگتے ہوئے سو جاتی ——

لیکن کچھ دنوں بعد اُسنے محسوس کیا موتی سے دُور رہنے کا حوصلہ اُس میں پیدا رہا ہے، اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لئے وہ موتی کی عارضی دُوری برداشت کر سکتی آخر ایک ننھے سے بچے کے لئے سالم زندگی تو داؤ پر نہیں لگا دینی چاہیئے ——!

اب —— اب کچھ دنوں سے اسے موتی کے علاوہ بھی خیال آتے تھے —— وہ سے اس طرح ڈرتی تھی جس طرح لوگ رات کو بھوتوں سے ڈرتے ہیں، بھوتوں سے بچنے لئے تو آیتیں پڑھ لیتے ہیں، حصار کھینچ لیتے ہیں —— دم درود کراتے ہیں، مگر خیالوں کے ارادے کے ہر حصار کو توڑ دیتے ہیں ——!

اس کی آنے والی پوری زندگی اس کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی اور بار بار پوچھتی

کیا بنے گا ؟ میرا کیا بنے گا ——؟"

تب اُسے کوئی جواب نہ سوجھتا ——

اور آج —— ہوٹل سے آنے کے بعد وہ اور بھی بیکل تھی —— اپنے بستر پر لیٹ تو گئی تھی، غنودگی اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی —— اس نے موتی کو بانہوں میں لے لیا، اس کے رخساروں پر اپنے رخسار رکھ کر جی بھر کر روئی، اتنا روئی کہ موتی کا چہرہ تر ہو گیا —— اس نے سوچا آج وہ اپنے موتی کو اپنے سینے سے الگ نہیں کرے گی، یونہی سو جائے گی ——!

مگر تھوڑی دیر بعد جانے کس طرح موتی الگ پلنگ پر چلا گیا تھا، اور وہ اپنے بستر پر تنہا تھی ——

اس طرح جیسے چمکتا ہوا چاند کھلے آسمان پر تنہا کھڑا ہو ——

نرم و گداز بستر سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے —— اثر کنڈیشنر کی آواز چیخوں میں بدل گئی —— نرم تکیے بانہوں کا بدل نہ بن سکے —— اس نے اپنے ہی بازوؤں کا حلقہ بنایا، مگر بار بار حلقہ ٹوٹ گیا۔

اس نے بے چینی سے سر اِدھر اُدھر پٹکا ..... آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہو گئے —— یہ اتنی بڑی دُنیا ہے —— اور کتنی خوب صورت دنیا ہے —— ساحلِ سمندر —— بڑے بڑے بازار خوبصورت ہوٹل —— جنت نظارہ سینما ہال —— ہنس مکھ لوگ !

مگر مجھے کیا دیا ہے تو نے

شباب اک زہر میں بجھا کر

خراب آنکھیں لہو رُلا کر

نہ ایک مونس بھی ایسا بخشا

کہ جس کی آغوش میں تڑپ کر

شکوں کے ساتھ مرسکوں میں !

صبح اٹھتے ہی نیا تیار ہوئی اور ایک نئے عزم کے ساتھ ناشتے کی میز پر گئی اور اس نے خاموشی سے کیا ——

وہ من کے اندر اٹھنے والے طوفان کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی ۔ پھر اس نے اُس نے آہستہ سے اتنا کہا۔ "خانم میرے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے ؟"

"ارے ——" خانم نے کانٹا ہاتھ سے رکھ دیا ۔ "تمہیں تو گھر لا کر میں اس طرح بھول گئی تھی۔ جیسے اپنی بچیوں کو بھول جاتی ہوں —— کیا تم اُداس ہو گئی ہو ؟"

"آپ کو معلوم ہے مجھے یہاں آئے ایک مہینہ ہو گیا ہے (اور اس ایک مہینے نے میرے نس نس میں نشتر چبھو دیے ہیں)

"اچھا ایک مہینہ ہو گیا ہے ——" خانم آہستہ آہستہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتی رہی۔ "تمہارے لئے تو میں نے بہت پہلے سوچ لیا تھا۔ مگر میں چاہتی تھی کہ تم ذرا کراچی سے مانوس ہو جاؤ ——"

"مگر آخر کیا سوچا ہے آپ نے ۔ مجھے بھی تو پتہ چلے۔" نیا نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔ خانم اس کی طرف دیکھ کر ہنسی اور بولی ——

"صبح تم میرے ساتھ دفتر چلنا، میں نے تمہیں بتایا نہیں شاید کہ میرا ایک دفتر ہے، میں کاروباری عورت ہوں، میں تمہیں اپنے دفتر میں رکھنا چاہتی ہوں۔"

"آپ کو معلوم ہے خانم، مجھے دفتری کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" نیا نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" خانم نے وثوق سے جواب دیا ۔ "اور تجربہ ہمیشہ کام کرنے سے ہوتا ہے۔"

"اگر میں ... " نیا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ... "اگر میں آپ کے دفتری معیار پر پوری نہ اتری تو ؟"

"میں ان وسوسوں میں نہیں پڑتی۔" شوشہ خانم نے سگریٹ کی ڈبیا پرس میں سے نکالی اور میز پر پڑا لائٹر اٹھا کر سگریٹ سلگانے لگی، پھر وہ ایک لمبا کش لے کر بولی۔ "یہ تو وہمی بات ہوتی، آدمی سوچے کہ اگر بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا تو کیا ہو گا ؟ پھر جب کوئی شخص کام کرنے کا تہیہ کر لے تو اُسے ناکامی کے بارے میں ہرگز نہیں سوچنا چاہیئے، جب بھی کسی نئے جذبے کے ساتھ نئی سرزمین پر قدم رکھو تو ہمت کی کشتیاں جلا دو !"

نیا خاموش ہو گئی ——

خانم کی خود اعتمادی اور ذاتی تجربے نے اسے بولنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

"تم صرف فیصلہ کرو ـــــ تہیہ کرو ـــــ آنے جانے کا راستہ صاف نظر آرہا ہو تو آنے جانے کے بارے میں سوچنا چاہیئے، پیچھے جانے کا خیال بھی کرنا حماقت ہے۔"

"آپ کے دفتر میں کس قسم کا کام ہوتا ہے؟" نیّا نے بہت دیر تک سوچنے کے بعد پوچھا۔

"بھئی میرا تو ایڈورٹائزنگ کا بزنس ہے۔ ٹی وی اور سینما ہالوں کے لئے فلمیں بھی بناتے ہیں ہم لوگ ـــ اشتہار بازی بہت بڑا اور دلچسپ آرٹ ہے تم کام کروگی تو تمہیں پتہ چلے گا۔"

"آپ کا اپنا دفتر ہے؟"

"کیا مطلب ـــــ؟"

"یعنی یہ دفتر اور ..... یہ کمپنی ..... آپ کی اپنی ہے؟"

"ہاں ہاں ـــــ میں ہی چلاتی ہوں، اس کمپنی کو، تم پوچھنا کیا چاہتی ہو؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ایک عورت تن تنہا اتنا بڑا کاروبار کیسے سنبھال سکتی ہے۔"

"صبح چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا کہ ایک عورت تن تنہا کیا نہیں کر سکتی! اور ہاں تم سے کہتی ہوں، ہر شخص کو اللہ تعالیٰ صلاحیتیں بھی دیتا ہے اور مواقع بھی ـــ اب یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور موقعوں سے کس قدر فائدہ اٹھاتا ہے۔"

"خانم ..... میں تو پھر وہی بات کہوں گی کہ ..... میں جس ماحول سے آئی ہوں، اس میں کو یہ سب نہیں سکھایا جاتا ـــــ اس لئے ـــــ"

"تم ذرا اپنی صورت دیکھو۔" خانم نے اس کی بات کاٹی۔ "سب سے اچھی بات تم میں یہ ہے کہ اچھی شکل کے ساتھ ساتھ تم ذہین بھی ہو، اور یہ ذہانت تمہارے بشرے سے ٹپکتی ہے۔ عام طور پر خوب صورت عورتیں فریم میں لگی ہوئی تصویریں ہوتی ہیں، قریب جاؤ تو پتہ چلتا ہے ٹھنڈے برف پتھر کو چھو لیا ہے، حسین صورت کے زعم میں وہ اور کچھ کرنا بھی نہیں چاہتی ہوں، تم اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرو ـــ میرے پاس رہو، تجربے حاصل کرو، اور پھر عقیل ہو جاؤ ـــ ہاں مگر قدم قدم پر ماضی کا دامن نہ پکڑو۔"

"میں کیا کروں خانم ـــ! میرا ماضی تو میری یادداشت سے اترتا ہی نہیں۔"

"اسی لئے تو میں تمہیں کراچی لے آئی ہوں ـــ ماحول اور جگہ کے ساتھ خیالات بھی بدل جاتے ہیں ـــ بی اے بریو گرل۔" خانم نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر دھوئیں کی ایک پھوار چھوڑی۔

نیّا بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کے سامنے خانم ایک مشعل کی صورت میں براجمان تھی، جس کے گرد سے روشنی کی کیریں چھن چھن کر نکل رہی تھیں ـــ اس وقت خانم اسے خضر کی صورت نظر آرہی تھی ـــ آخری چارہ گر اور آخری مسیحا! وہ بیچ بھنور میں کھڑی تھی اور خانم کے سوا نجات کا کوئی رستہ نظر نہیں آرہا تھا ـــ

نیّا گردن جھکا کر سوچنے لگی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" خانم نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" نیّا نے اداس سی مسکراہٹ سے کہا ـــ "اور پھر اب سوچنے کا وقت ہی کہاں ہے ـــ؟"

"شاباش ـــــ" خانم نے اسے تھپکی دی اور کھڑی ہو گئی۔ "جاؤ اب آرام کرو۔" خانم نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور ایک انگڑائی لے کر بولی۔ "مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ آج ضرورت سے زیادہ بول لینا پڑا ہے۔"

نیّا جانے لگی تو خانم نے روک لیا۔ "سنو، سارا دن کمرے میں بند ہو کے نہ بیٹھی رہا کرو۔ اب لڑکیاں لاہور چلی جائیں گی، ان کے اسکول کھل رہے ہیں، تم شام کو میرے پاس آجایا کرو ـــ کراچی کی نائٹ لائف بالکل مختلف ہے، یہاں میرے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، کاروبار میں تو ہر قسم کے لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے ..... آکر میرے مہمانوں کو انٹرٹین کیا کرو۔ اس سے تمہارا یہ بند کمرہ، زوال کا حجاب بھی ٹوٹے گا اور تمہیں آداب محفل بھی آئیں گے ـــ کاروبار میں، عورت کو نشست و برخاست کے گر اور گفت گو کے اصول آنے چاہئیں، عورت کی نام نہاد معصومیت کو تمہارے صرف افسانوں اور غزلوں میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ کوئی آدمی معصوم عورت سے امپریس

نہیں ہوتا۔ کیونکہ بے وقوفی کا دوسرا نام معصومیت ہے۔ مرد ہمیشہ تیز و طرار اور ذہین عورت سے متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ دبتا بھی ہے۔ جسمانی طور پر مرد بہت طاقتور شے ہے، لیکن عورت اگر اس پر مضبوط ہو تو اسے پچھاڑ دیتی ہے۔ سمجھیں، اسی لئے میرا مشورہ ہے کہ لوگوں سے ملنے جلنے میں اُترنے کا راز جانو ـــــ ہماری محفل میں بیٹھ کر کچھ سیکھو ـــ سب لوگ اسی طرح سیکھتے ہیں۔

خانم نے اپنی بات ختم کر کے نیّا کی آنکھوں میں دیکھا۔

"جی اچھا ـــ" نیّا نے جلدی سے ہامی بھر لی اور پھر کمرے سے باہر جانے سے پہلے اس نے بڑے ادب سے خانم کو شب بخیر کہا اور باہر نکل کر دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔

خانم کی سیاہ شیوا امپالا جس گیٹ کے اندر داخل ہوئی اس کے باہر ایک خوبصورت بورڈ لگا تھا، جس پر لکھا تھا۔ "پارس پبلسٹی"۔

شوفر نے بڑھ کر دروازہ کھولا، ایک طرف سے خانم اتری تو دوسری طرف سے نیّا بھی اتر گئی، اس نے شوفر کے آنے کا انتظار نہیں کیا

جہاں خانم کی کار کھڑی ہوئی تھی وہاں چار پانچ موٹریں اور بھی کھڑی تھیں۔ یہ ایک چار منزلہ عمارت تھی، برآمدے میں ایک چوکیدار کھڑا تھا، جس نے خانم کو سلیوٹ مارا، پھر خانم اپنا پرس جھلاتی ٹک ٹک کرتی اندر کو بڑھی اور سامنے لفٹ میں داخل ہو گئی۔

نیّا نے اس کی پیروی کی

آج خانم کا بریف کیس نیّا نے پکڑا ہوا تھا، ورنہ روزانہ شوفر اُسے اوپر تک چھوڑنے جایا کرتا تھا

خانم نے بٹن دبایا، لفٹ اوپر کو سرکنی شروع ہو گئی، چوتھی منزل پہ خانم کا دفتر تھا۔

جونہی وہ لفٹ سے باہر نکلیں، سامنے ایک اور چمکتے ہوئے بورڈ پر نظر پڑی جس پہ جلی حروف میں "پارس پبلسٹی" لکھا ہوا تھا۔ اور نیچے تیر کا نشان دائیں طرف اشارہ کر رہا تھا۔

دفتر کے باہر خانم کا اپنا باوردی ملازم کھڑا تھا، اس نے سلیوٹ مار کے خانم کے ہاتھ سے

بیگ اور نیا کے ہاتھ سے بریف کیس پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے چابی والا دروازہ کھولا
خانم اندر داخل ہوئی، اس کے پیچھے پیچھے نیا بھی!

یہ ایک لمبا کوریڈور تھا، جس کے دونوں طرف لکڑی کے کیبن سے بنے ہوئے تھے
میں کوئی نہ کوئی بیٹھا تھا، اس کے نام اور کام کی تختی باہر لگی تھی، کوئی کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا
ڈیزائن بنا رہا تھا — کوئی فون کر رہا تھا —

سب نے کھڑے ہو کر خانم کو سلام کیا — جہاں جہاں سے بھی خانم گزری ہر ایک سے
کا تعارف کرائی گئی —

ایک کمرے میں چار پانچ لڑکیاں بیٹھی تھیں — "تو خانم کے دفتر میں لڑکیاں بھی کام کرتی
نیا کو یہ سوچ کر بڑی تسلی ہوئی —

"یہ سب کی سب ماڈلنگ کرتی ہیں —" خانم نے اسے بتایا، سب لڑکیوں نے نیا کو بڑی
دلچسپی سے دیکھا، باوجود طرحدار لباس کے نیا بوکھلائی ہوئی نووارد لگ رہی تھی۔

نیا واقعی بوکھلائی ہوئی تھی، مگر یہ دیکھ کر وہ لڑکیاں گو بہت زیادہ فیشن ایبل تھیں، نیا سے
زیادہ خوبصورت نہ تھیں، نیا کو دل ہی دل میں بہت فخر محسوس ہوا — اس کے چہرے پر
ایک رنگ سا آ گیا —

پھر خانم ایک بڑے سے کمرے کے باہر رک گئی —

نیا نے نظر اٹھا کے دیکھا، باہر خانم کے نام کی سیاہ تختی سنہری حروف میں جگمگا رہی تھی
سمجھ گئی کہ یہی خانم کا کمرہ ہوگا۔

کمرہ اندر سے بھی خانم کی شخصیت کا جیتا جاگتا پرتو تھا، یہ خاصا کشادہ کمرہ تھا، درمیان میں
کی چمکدار آفس ٹیبل پڑی ہوئی تھی، اس پہ دو فون رکھے تھے، ایک گولڈن اور ایک کریم
فائلیں — قلمدان — پیڈ — لفافے — غرض دفتری ضرورت کی ہر چیز اس میز پر قرینے
سے لگی تھی، میز کے ارد گرد نرم گدیوں والی سیاہ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، البتہ خانم کی کرسی

کہرے والی تھی، صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ مالکن کی کرسی ہے —
چپراسی خانم کا بیگ اور بریف کیس پہلے ہی رکھ گیا تھا —

نیا نے ارد گرد دیکھا، ایک جامنی رنگ کا صوفہ ایک کونے میں پڑا تھا، جس کے درمیان شیشے
کی گول میز رکھی تھی، گولڈن رنگ کے ویلوٹ کے پردے لٹک رہے تھے اور گہرے نارنجی
اور براؤن پھولوں والا قالین فرش پر بچھا ہوا تھا۔ ہر شے سے نفاست اور خوش ذوقی ٹپک
رہی تھی — قالین سے لے کر ایش ٹرے تک!

اندر داخل ہوتے ہی نیا امپریس ہو گئی —
امپریس بھی اور ششدر بھی —

خانم تمکنت سے چلتی ہوئی آئی اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئی پھر اپنی سامنے والی کرسی کی
طرف اشارہ کیا — یعنی بیٹھو —

مگر نیا ادھر ادھر دیکھ کر رہ گئی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خانم کے سامنے بیٹھے یا
نہیں —

"بیٹھ جاؤ بھئی —" جب خانم نے دوبارہ بے تکلفی سے کہا، تو ڈرتے جھجکتے نیا
ایک کرسی کو کھسکا کر اس پر بیٹھ گئی —

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ جسے خانم نے اٹھا لیا۔ "بات کراؤ" خانم نے غالباً اپنی آپریٹر
سے یہ لفظ اس انداز سے کہے کہ نیا کو سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ اس کا لہجہ تمام تر مالکانہ اور آمرانہ
تھا، نیا سمجھ گئی کہ کسی ادارے کا مالک ہونا کیا معنی رکھتا ہے —

"آپ نے کب دیکھی —؟" خانم اب خوش دلی سے بول رہی تھی —

"اچھا رات —"

"بڑی خوشی کی بات ہے، کہ آپ کو یہ فلم پسند آئی —"

"کہ یہی ہماری محنت کا صلہ ہے — اور بھی جن لوگوں نے دیکھی پسند کی —"

"نہیں ——"

"مجھے کیچر ہاؤس جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔"

"ضرور جاؤں گی ——"

"شکریے کی ضرورت نہیں —— آپ کی خوشی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔"

"ایٹ یور سروس پلیز ——"

دھیرے سے خانم نے فون رکھ دیا —— سرسری نظر سے سامنے پڑے کاغذ دیکھے، پھر نیا کی طرف دیکھ کر بولی۔ "یہ ہمارا دفتر ہے۔ اور تمہیں یہاں کام کرنا ہے۔"

"میں یہاں کیا کروں گی خانم ——؟" نیا نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جو کام تمہیں پسند آئے! میں نے سب لوگوں سے تمہارا تعارف کرا دیا ہے۔ جو لوگ اس ادارے میں کام کرتے ہیں —— ان میں آرٹسٹ بھی ہیں —— منتظم بھی ہیں —— کیمرہ مین بھی ہیں —— ماڈل گرلز بھی —— تم اپنے لئے کوئی سا شعبہ پسند کر لو ——"

"لیکن مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا خانم ——" نیا نے جیسے رو کر کہا۔

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں کچھ بھی نہ آتا ہو؟"

"اب میں آپ کو کیسے بتاؤں —— ان کاموں میں سے مجھے کچھ بھی نہیں آتا..... واقعی سچی ——" نیا نے خانم کو بڑی معصومیت سے اپنی نالائقی کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

"باتیں کرنا تو آتا ہے —— نا؟"

"باتوں کا کیا ہے، وہ تو اچھی بُری سب کر لیتے ہیں"

"تم بتاؤ، تم باتیں کر سکتی ہو یا نہیں؟"

"کر تو لیتی ہوں ——"

"تو بس تم یہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرو ——"

"یہاں بیٹھ کر ——؟" اُس نے حیرت سے دفتر کی طرف اشارہ کیا ——

"ہاں ہاں ——" خانم نے پھر سگریٹ سلگا لیا۔ "سب سے بڑا فن گفتگو کا فن ہے۔ جس شخص کو یہ فن آتا ہے، وہ دنیا میں ہر کام کر سکتا ہے، یہی بے ضرری زبان اگر سلیقے سے استعمال کی جائے تو بڑے بڑے پہاڑ سر ہو سکتے ہیں ——"

"مگر اس کا آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟"

"اس کا تمہیں بھی فائدہ ہوگا ——"

"مگر کیسے —— کس طرح —— اور پھر کس سے گفتگو کرنا ہوگی۔ آخر گفتگو کا بھی تو کوئی مقصد ہے۔"

"میں ابھی کچھ ہفتوں کے لئے تمہیں اپنے کمرے میں بٹھاؤں گی، بظاہر تم میری سیکرٹری کے کام کرو گی، لیکن تمہارا اصل کام پبلک ریلیشننگ ہوگا، جانتی ہو۔ پی۔ آر کیا ہوتی ہے؟"

"جی نہیں ——" نیا نے سر ہلا دیا۔

"ہر کاروباری دفتر میں ایک پی آر او ہوتا ہے۔ جو بظاہر کچھ نہیں کرتا، مگر اسی فیصد کاروبار کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے —— اس کو ہمیشہ چوب زبانی سے کام لینا پڑتا ہے —— جتنا چوب زبان، اتنا ہی چاق و چوبند بھی ہو —— اور پھر ان دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ اگر پی آر او اتنا حسین بھی ہو جتنی تم ہو تو پھر پانچوں گھی میں سمجھو ——" خانم زور سے ہنس پڑی ——

"مگر..... ایسی گفتگو تو مجھے بالکل نہیں آتی ——" نیا نے پھر گھبرا کر کہا۔ ——

"تم سیکھو گی یہاں میرے پاس بیٹھ کر، اور تم کافی ذہین ہو —— یہ میں نے بہت پہلے جان لیا ——"

"مگر یہ گفتگو کس کے ساتھ کرنا ہوگی؟"

"سب کے ساتھ ——"

"سب کون ——؟"

"سب وہ لوگ ہیں۔ جو کاروباری موقف لے کر اس دفتر میں آتے ہیں۔" خانم بولی۔ "کاروباری

دنیا گھریلو دنیا سے بہت مختلف ہوتی ہے نیا ـــــ، یہاں ہر شخص اپنی بغل میں اپنی ذاتی چھری چھپائے ہوئے آتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ چھری موقع پاکر دوسرے کی بغل میں گھونپ دے ـــــ صبح صبح ہر کوئی اپنا اپنا چاقو تیز کرکے نکلتا ہے، اس چاقو سے اگر کوئی بچ نکلتا ہے تو بصورت عورت کی زبان ہے، تمہاری زبان میری ڈھال ہونی چاہیئے اور جو شخص کاروبار یہاں آئے وہ جاتے وقت تمہاری سحر انگیز باتوں اور مسکراہٹوں سے اس طرح مالا مال ہو کہ اُسے اپنی جیب کے کٹنے کا علم ہی نہ ہو سکے۔"

نیا کا دل دھڑکنے لگا اور ہونٹ خشک ہو گئے، اس نے جلدی جلدی اپنے خشک پر زبان پھیری۔ "میں تمہارے لئے ٹھنڈا منگواتی ہوں؟" خانم نے میز کے پہلو میں لگا ہوا بٹن دبا بوتل کے جن کی طرح چپراسی آموجود ہوا ـــــ

کوک کا آرڈر دے کر خانم اپنی ڈاک دیکھنے لگی، اس نے نیا کو سنبھلنے کا موقع دیا۔ بڑے قرینے سے چاندی کی ٹرے میں کوک رکھ کر لایا، کوک کے گرد گلابی رنگ کا ٹشو پیپر لپٹا ہوا تھا جیسے کسی حسین عورت نے شوقیہ فرغل لپیٹ لیا ہو ایک کاغذ کا سفید نگوڑا موٹا نیپکن ٹرے میں پڑا ہوا تھا ـــــ

نیا نے بوتل کو اس کی کمر سے نفاست سے پکڑا اور پھر دوسرا کاغذی رومال اٹھا کر زانو پر بچھا لیا ـــــ

گفتگو کا فن دنیا کا مشکل ترین فن ہے۔ وہ دل میں سوچنے لگی، اور پھر گفتگو بھی مردوں ـــــ مردوں سے تو وہ یوں دور رہتی تھی جس طرح لوگ سانپ سے دور رہتے ہیں اور اگر سامنا ہو بھی جاتا تو اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگتے ـــ ہتھیلیوں میں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے۔۔۔۔ زندگی بھر چار دیواری کے اندر جو رہی تھی۔

اور اب ـــــ

باوجود ایرکنڈیشنر کے، نیا کی پیشانی پر پسینے اور اضطراب کی بوندیں چمکنے لگیں۔

جب نیا نے شش و پنج کے دوران کوک پی کر بوتل میز کے ایک کنارے پر رکھ دی تو خانم نے فائلوں کے صفحے پلٹنے بند کر دیئے اور نیا کی طرف دیکھ کر مسکرائی ـــــ

نیا کے چہرے سے اُسے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوا ـــ اُس نے اپنے کمرے کے چاروں طرف دیکھا اور ایک خالی کونے کی طرف اشارہ کرکے بولی ـــ "فی الحال میں تمہاری میز وہاں لگوا دوں گی، تمہارا انگ فون ہوگا، تم میرے فون اٹینڈ کیا کرو، میں تمہیں چند ہی دنوں میں سمجھا دوں گی۔ کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔ پہلے میرے پاس ایک لڑکا تھا، بہت اچھا سیکرٹری تھا، اُس کے کام سے خوش ہو کر میں نے اُسے لیبیا بھجوا دیا ہے ـــ سات سال اُس نے میرے پاس کام کیا تھا، وہ بہت ذہین لڑکا تھا۔ یہ ساتھ والا بغلی کمرہ اسی کا تھا، اُسے میں دوسرے کمرے میں بٹھایا کرتی تھی، جب تمہیں کام کا تجربہ ہو جائے گا تو تم بھی اسی کمرے میں چلی جانا ـــــ"

مگر نیا کٹھ پتلی کی طرح بیٹھی رہی ـــ جدھر خانم دیکھتی۔ ادھر ہی دیکھنے لگتی ـــــ

پھر خانم نے لہجے میں مٹھاس بھر کے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "میں محنتی اور ذہین لوگوں کو پسند کرتی ہوں مگر کام کا بوجھ میں بڑی فیئر ڈیلنگ کرتی ہوں، میں جانتی ہوں تم ناتجربہ کار ہو، مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ انتہائی ذہین ہو، چند ہی دنوں میں میرے اشارے سمجھنے لگو گی۔ پھر تم نے آنکھیں بند کرکے مجھ پر بھروسہ کیا ہے۔ میں فی الحال تمہیں دو ہزار روپے ماہانہ دوں گی، رفتہ رفتہ تمہارا کام تمہارے لئے ترقی کے امکانات پیدا کرے گا ـــــ"

"دو ہزار روپے ماہانہ ـــ نیا چکرا گئی اُس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دم سے اُسے اتنی تنخواہ مل جائے گی۔

اس تنخواہ کے لئے تو وہ مشکل سے مشکل کام بھی کر سکتی ہے۔

یہ تو صرف گفتگو کرنے کے لئے کہہ رہی تھیں ـــــ

جب وہ گھر جانے کے لئے دفتر سے اُٹھی تو اس کے پاؤں میں دو ہزار روپے ماہانہ کی زنجیر پڑ چکی تھی ـــــ

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، نیّا نے لپک کر ریسیور اٹھالیا ــــ

"پارس پبلسٹی"

اُس نے بالکل خانم کی لے میں، مگر زیادہ دلکش آواز بنا کر کہا ــــ

"خانم ہیں؟" اُدھر سے پوچھا گیا ــــ

"مجھے افسوس ہے، اِس وقت خانم تشریف نہیں رکھتیں" نیّا نے انتہائی شستہ انداز میں کہا۔ "آپ اپنا اسمِ گرامی بتانا پسند کریں گے تاکہ میں نوٹ کر لوں اور خانم کے آتے ہی آپ کا یاد دہانی کرادوں ــــ"

بولنے والا تھوڑی دیر کے لئے چُپ ہوگیا . . . . نہ جانے کیوں ــــ پھر بولا ــــ

"میرا نام جان محمد جادو بھائی ہے، رات میری جو ایڈ ٹی وی پر چلی تھی، میں اُس کے بارے میں خانم سے بات کرنا چاہتا ہوں"

"یقیناً بات کیجئے گا" نیّا نے خوش دلی سے کہا۔ "لیکن جب وہ تشریف لے آئیں گی"

نیّا نے گویا ایک مسکراہٹ فون کے اندر پھینکی۔

"سُنیئے . . . ." وہ ریسیور رکھنے سے پہلے جھجکتے ہوئے بولا "آپ کون بول رہی ہیں؟"

"جی میں خانم کی سیکرٹری بول رہی ہوں ــــ"

"سیکرٹری . . . . . اچھا اچھا . . . . ٹھیک ہے . . . . ٹھیک ہے ــــ" پھر اُس نے خود

ں رکھ دیا ــــ

نیّا کو بڑی ہنسی آئی ــــ

ابھی ریسیور رکھا تھا کہ دوسرا فون بج اٹھا ــــ "پارس پبلسٹی جناب ــــ"

"خانم سے بات کرنا ہے ــــ" اُدھر سے کوئی بولا ــــ

"حضور خانم اس وقت دفتر میں موجود نہیں ہیں ــــ" وہ شاید بولنے والے کی بارُعب سے متاثر ہوگئی تھی ــــ

"کہاں گئی ہیں؟" وہ اِسی گمبھیر آواز میں گویا ہوا ــــ"

"جی وہ ذرا بینک تک گئی ہیں، ممکن ہے ابھی آجائیں، آپ براہِ نوازش مجھے اپنا نام اور نوٹ کرادیں، اُن کے آتے ہی میں آپ سے بات کرادوں گی ــــ"

"اس کی ضرورت نہیں، میں آدھے گھنٹے بعد خود رنگ کروں گا"

"اور بھی عنایت ہوگی" نیّا نے اپنے لہجے میں تمام تر مٹھاس سمو کر کہا ــــ

"شکریہ ــــ"

"وعلیکم سر!"

نیّا نے ریسیور رکھ دیا ــــ

تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجی ــــ نیّا نے ادا سے ریسیور کان سے لگایا اور پیارے پیارے لہجے میں بولی: "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"واہ واہ ــــ" وہ ہنس کر کہنے لگا۔ "وہاں بیٹھی بیٹھی ہی خدمت کرنا چاہتی ہیں"

"خدمت تو خدمت ہے جی ــــ اور خادم تو خادم ہوتا ہے ــــ وہ جہاں بھی ہو ــــ"

"تب بھلا وہاں خانم کے دفتر میں بیٹھ کر آپ میرے لئے کیا کر سکتی ہیں!"

نیّا نے ایک معطر سی ٹھنڈی سانس چھوڑی، پھر اپنے حواس مجتمع کر کے بولی "میں آپ اور کام خانم کو یاد دلا سکتی ہوں، دوبارہ آپ کو فون پر بُلا سکتی ہوں، آپ کے حق میں دعا گو ہوں ——"

بولنے والا کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "ہو تم بھی دلچسپ چیز، خانم کے پاس کب سے ہو؟ کیا کر رہی ہو ——؟"

"میں تو ہمیشہ سے خانم کے پاس ہوں اور جو آپ محسوس کر رہے ہیں وہی کر رہی ہوں"

وہ دوبارہ ہنسا۔ "تمہیں دیکھنے کے لئے آنا پڑے گا، تم تو خانم سے بھی اچھی گفتگو کرتی ہو"

"شکریہ حضور، یہ بھی انہی کا فیضان ہے"، نیّا نے کاروباری انداز میں کہا ——

"میں خانم کا دوست خاقانی بول رہا ہوں۔ چلتے چلتے اپنا تعارف کرا دوں"

"میں جانتی تھی آپ خانم کے دوست ہی ہوں گے، یہ لب و لہجہ ایک دوست کا ہی ہو سکتا ہے"

"تم ذہین بھی معلوم ہوتی ہو، آج تمہارے دفتر آنا پڑے گا"

"آپ ہی کا دفتر ہے جناب، ضرور تشریف لائیں۔ مگر جانے کے لئے ——"

اس پر وہ بے تحاشا ہنسنے لگا —— ہنستا رہا ——

نیّا نے فون بند کر دیا۔ اور پیغامات کی لسٹ تیار کرنے لگی۔ ابھی اُس نے لسٹ بنائی تھی کہ پھر گھنٹی بجنے لگی ——

"یہ پارس پبلسٹی کا دفتر ہے؟" دوسری طرف سے کسی نے پوچھا ——

"جی جناب ——"

"ہماری ایڈ تیار ہو گئی ہے"

"کون سی ایڈ ہے جی آپ کی ——"

"وہ جی ہم نے ..... میں جی" بے مثال ہیئر سیلون کے والوں کے ہاں سے بول رہا ہوں نے کہا تھا آج فون کر کے پتہ کر لوں"

"جی، میں ٹھیک ایک گھنٹے بعد فون کر کے آپ کو صورتِ حال سے مطلع کر دوں گی آپ اپنا نمبر مجھے دے دیں"

اُس نے فون نمبر بتایا، نیّا نے جلدی سے اپنی ڈائری میں لکھ لیا ——

"جی آپ کون ہیں؟" فون اٹھاتے ہی اس نے نیّا کی آواز پر چونک کر پوچھا ——

"میں خانم کی سیکریٹری بول رہی ہوں ——"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ——؟"

"ویسے آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایسا ہو چکا ہے ——"

"میرا مطلب ہے ——" وہ ذرا سا نروس ہو گیا —— "وہ تو ہمیشہ میل سیکریٹری رکھا کرتی ہیں"

"اس مرتبہ لیڈی سیکریٹری کا تجربہ کر رہی ہیں ....."

"اور وہ لڑکا کہاں گیا، جو یہاں ہوتا تھا ——"

"وہ کسی اور خانم کے پاس چلا گیا ہو گا ——"

اس پر مخاطب ذرا سا حیران ہوا، اور پھر ہنس کر بولا "سمجھ آ گئی آپ کو خانم نے کیوں رکھا ہے"

"آپ ضرورت سے زیادہ سمجھ دار معلوم ہوتے ہیں ——"

"نادان آپ بھی نہیں ہیں ——"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی —— ورنہ مجھے وہ شعر یاد آ رہا ہے ——

نادان سہی، پر اتنے بھی نادان نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے!

میں فارغ ہوتے ہی دفتر آ رہا ہوں" —— فون اُدھر سے بند ہو گیا ——

خانم آئی تو نیا نے حسبِ معمول ٹیلی فون کرنے والوں کی لسٹ خانم کے آگے کر دی
سے خانم فوراً بات کرنا چاہتی تھی اُن کے ناموں کے آگے اُس نے سُرخ مار کر دے دیا
نیا اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی اور نمبر ملانے لگی، سب سے پہلے اس نے سیٹھ جاوید بھا
ڈائل کیا — اور لائن ملتے ہی خانم کو اطلاع دی —

خانم نیا کے کام سے بڑی خوش تھی، ایک مہینہ ہو گیا تھا نیا کو دفتر میں بیٹھے ہو
اور خانم کا اندازہ صحیح نکلا تھا، نیا کی وجہ سے دفتر میں ہلچل مچ گئی تھی، زندگی آ گئی تھی

"فرمایئے سیٹھ صاحب، کیسے یاد فرمایا تھا؟" خانم نے ریسیور منہ سے لگاتے ہی کہا

"وہ تو ہماری عادت ہے کہ خود ہی یاد فرما لیتے ہیں"

"اور ہمیں آپ کی یہی عادت اچھی لگتی ہے"، خانم نے ہنس کر کہا —

"بھئی وہ میری کوسمیٹکس کی فیکٹری سامان تیار کرنے لگی تھی، سوچا کچھ پبلسٹی ہو جا

"ضرور، ضرور . . . . . میں حاضر ہوتی ہوں"، خانم نے کہا —

"اجی آپ تشریف نہ لائیں، میں خود حاضر ہوتا ہوں"

"ویلکم سیٹھ جی، ویلکم —"، خانم نے خوش دلی سے کہا —

بھئی . . . . وہ . . . . سیٹھ صاحب رُکتے رُکتے بولے . . . . "کچھ اور بھی سُنا ہے یعنی
آپ نے کوئی نئی سیکریٹری رکھ لی ہے —"

"آپ لوگوں کی خدمت جو کرنا ہے —"

"اور ہمیں بتایا تک نہیں —"

"بس آپ سے ملاقات نہ ہو سکی سیٹھ جی، پچھلے ہی مہینے تو رکھی ہے —"

"اچھا — میں اس وقت فارغ ہوں۔ سوچا آپ کے دفتر ہو آؤں —"

"ضرور تشریف لائیں، مجھے چشم براہ پائیں گے —"

خانم نے فون رکھ دیا — جب سے خانم اور سیٹھ جی کا لین دین شروع ہوا تھا، سیٹھ جی صرف
ایک بار خانم کے دفتر آئے تھے، زیادہ تر خانم اُن کے دفتر میں جا کر کاروباری بات چیت کر کے
آئی تھی، آج خانم کو سیٹھ صاحب کے بنفسِ نفیس تشریف لانے کی وجہ سمجھتے دیر نہ لگی —

خانم نے نیا کی طرف دیکھا اور بولی — "سیٹھ جان محمد جاوید بھائی آ رہے ہیں، اُن سے
ہمارا بہت بڑا بزنس ہے"

"ٹھیک ہے —" نیا اُٹھ کر ٹوائلٹ میں چلی گئی، اس نے اپنے بال دیکھے، بالکل ٹھیک
تھے، پلکوں پر مسکارا جما تھا، البتہ لپ اسٹک ذرا اکھڑ گئی تھی، اس نے بیگ میں سے گلابی رنگ
کا لپ اسٹک نکالی، نئی اور چمکدار تہہ ہونٹوں پر جمائی، گلابی سلکی ساڑی کے فال درست کئے
آگے پیچھے سے اپنا معائنہ کیا۔ پھر پرفیوم کی شیشی نکال کر اپنے اوپر اسپرے کیا — خوشبوؤں
کا مکس لے کر وہ باہر نکل آئی —

اُسے خانم نے پہلے دن ہی سمجھا دیا تھا کہ جب وہ لفظ بزنس استعمال کرے تو نیا کو خود بخود
سمجھ جانا چاہیئے کہ جو بھی شخص آ رہا ہے، اس کے ساتھ کمپنی کا تمام تر مفاد وابستہ ہے، اس پر نثار
ہونا ہے، اس کے لئے مسکراہٹوں اور دلآویزیوں کی ایسی سیج بچھا دینی ہے کہ جس پر بیٹھتے
ہی بے خود ہو جائے — اتنا کہ اُسے اپنے لُٹ جانے کا احساس ہی نہ رہے —

اور یہی اس ادارے میں نیّا کا اصل کام بھی تھا!

باہر بیل بجی، تو نیّا کھڑی ہوگئی، چپراسی، سیٹھ صاحب کا کارڈ چاندی کی طشتری میں لے آیا، نیّا نے سنہری حروف میں لکھا ہوا سفید کارڈ ہاتھ میں لے کر دیکھا، اُسے خانم کی اور خود پیشوائی کو باہر نکل گئی ——

ایک مکروہ صورت، مگر موٹا تازہ شخص، قیمتی ولایتی سوٹ پہنے باہر کورے ڈور پر نیّا اُسے دیکھ کر یوں مُسکرائی جیسے اپنے آنگن میں اُس نے چاند اُترتے دیکھا ہو، اُس وقت اس کے ہونٹ اِس قدر پھیلے کہ اس کے خوبصورت دانت موتیا کی کلیوں کی طرح نظر آئے ——

"سیٹھ جادو بھائی ——" نیّا نے قریب جاکر اپنی آواز کو زیادہ ملائم زیادہ دلکش بنا کر ایک تیر پھینکا —— پھر سر کو کورنش کے انداز میں جُھکایا اور بولی ——

"خوش آمدید! —— تشریف لائیے ——" اُس نے خانم کے کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو سخی کے ہاتھ کی طرح کھلا ہوا تھا ——

"بھئی آپ کون ہیں ——" سیٹھ صاحب نے اپنے بے ڈھنگے قدم اٹھانے سے پہلے

"نیازمند ہی سمجھیئے ——" یہ کہہ کر نیّا نے کمرے کا پردہ اٹھا دیا، سیٹھ صاحب اندر گئے، خانم کھڑی ہوگئی ——

ہر ایک کے آنے پر خانم کھڑی نہیں ہوتی تھی، وہ کسی اہم شخصیت کے اندر آنے کی طرح کھڑی ہو کر استقبال کرتی تھی،

خانم اپنی کرسی سے اُٹھ کر صوفوں کی طرف آگئی اور سیٹھ صاحب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا

نیّا جو چپراسی کو پُرتکلف چائے کا آرڈر پہلے ہی دے چکی تھی صوفے کے دوسری طرف گئی، اس کے بیٹھتے ہی سیٹھ صاحب بولے،

"خانم یہ ہیرا کہاں سے لائی ہو ——؟" انہوں نے صریحاً نیّا کی طرف اشارہ کیا اور بے

جھجک کا انتظار کئے بغیر کہنے لگے "تم خود ہی کیا کم تھیں اس دفتر میں، کہ ایک اور ایمان شکن کافر اے آئی ہو!"

نیّا نے اٹھ کر سگریٹ کیس سیٹھ صاحب کے آگے کھول دیا، اُنہوں نے ایک سگریٹ نیّا نے اٹھ کر سگریٹ کیس سیٹھ صاحب کے آگے کھول دیا، اُنہوں نے ایک سگریٹ ہ بے آگے کی طرف جُھک کر خانم نے لائٹر سے جلایا، پھر دوسرا سگریٹ سُلگا کر اپنے مُنہ میں لیا اور سگریٹ منہ میں دابے دابے بولی ——

"یہ آپ کی نئی خدمت گار ہے ——"

"تم دونوں مل کر یہ کیا سازش کر رہی ہو؟"

سیٹھ صاحب اِن دونوں کے درمیان بیٹھ کر جذبات کے بھنور میں پھنس گئے تھے ——

تے میں چپراسی چائے لے آیا —— نیّا نے اٹھ کر ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی، تپائی پر کھی اور پھر ٹرے قرینے سے چائے بنانے لگی، پہلے اس نے پیسٹری اسٹینڈ اٹھایا اور چاندی کی پلیٹ کے ساتھ سیٹھ صاحب کو پیش کیا، سیٹھ صاحب نے ایک پیسٹری اُٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لی، انہوں نے چمچ یا کانٹا استعمال نہیں کیا، اپنی بھدّی انگلیوں سے ویسے ہی مسل مسل کر کھانے لگے، ابھی اُنہوں نے پیسٹری ختم نہیں کی تھی کہ نیّا چائے کی پیالی لے کر یوں ان کے حضور جُھک گئی جیسے وہ کوئی اوتار ہوں اور نیّا دیوداسی ہو ——

"بھئی رکھ دو پیالی، لے کر کھڑی رہو گی تو یہ چھلک جائے گی"

"سیٹھ جی، یہ پیالی ہے، آپ کے صبر کا پیمانہ نہیں ——"

"واہ واہ ——" سیٹھ جی نیم بسمل ہو گئے، نظر بھر کر نیّا کی طرف دیکھا اور پھر کہا "زندگی میں یہ اتفاق دیکھنے کا پہلا موقع ہے"

"کون سا اتفاق سیٹھ صاحب ——" خانم نے اٹھ کر پیالی خود ہی پکڑ لی ——

"ٹیلی فونوں پر جو لڑکیاں سُریلی آواز میں گفتگو کیا کرتی ہیں عام طور پر ان سے مل کر مایوسی ہوتی ہے" جن کی آواز والی لڑکیاں اکثر بدصورت ہوا کرتی ہیں۔ کم از کم میں نے یہ پہلی خاتون دیکھی ہے۔ جس کی

آواز میں بھی جادو ہے اور شکل میں بھی ——"

"حالانکہ سیٹھ جادو بھائی آپ ہیں ——؟" نیّا نے برجستہ فقرہ چست کیا ——

"ارے واہ —— مار ڈالا ——" سیٹھ صاحب جھومے بغیر نہ رہ سکے "خانم! اس کی داد کیسے دوں ——!"

"حضور، اپنی نظر کو داد دیں" نیّا نے چہرا اٹھا کر کہا تو سیٹھ جی بل کھا کر رہ گئے، انھوں نے کی طرف چہرہ موڑ لیا۔ اور بولے ——

"داد تمہی کو دینا پڑے گی، جتنی نظر شناس تم ہو، شاید اور کوئی نہیں ——"

اس پر خانم نے ایک خوبصورت سا قہقہہ لگایا اور چائے پینے لگی ——

"لوگ ٹھیک کہتے ہیں، خوب صورت عورت کو ذہین نہیں ہونا چاہیئے" سیٹھ صاحب فلسفہ بگھارا ——

"کیوں سیٹھ جی ——؟" خانم نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا ——

"عورت خوبصورت بھی ہو اور اس کے پاس عقل بھی ہو تو وہ اس دنیا میں قیامت صغریٰ برپا کر سکتی ہے"

"پتہ نہیں آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے ——" خانم نے سیٹھ صاحب کے ہاتھ سے پیالہ لے کر نیّا کو پکڑا دی ——

"آپ دونوں کی طرف ہے، دو خوبصورت اور ذہین عورتیں ایک دفتر میں ہوں گی تو کیا کام ٹھیک ٹھاک ہوگا سیٹھ جی ——" خانم نے ایک سگریٹ سلگا کر سیٹھ صاحب کی طرف

"نہیں، میں اور نہیں پیوں گا، رات سے مجھے کھانسی ہو رہی ہے ——" یہ کہہ کر سیٹھ صاحب نے صوفے کے ساتھ ٹیک لگالی —— اسی وقت ایک بلند ڈکار اُن کے منہ سے نکل گئی، نیّا کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری مگر وہ بیٹھی مسکراتی رہی ——

"اِن کو کہاں سے لائی ہو اور ان کو اور کیا بنانے کا ارادہ ہے ——؟" سیٹھ صاحب نے پوچھا

نیّا کی طرف دیکھ کر پوچھا، اُن کی مخاطب خانم تھی ——،

"آپ جانتے ہیں سیٹھ جی" خانم بولی "یہ جگہ پارس ہے —— بس ذرا چھونے کی دیر ہے —— ہی سونا بکھرا ہوا نظر آئے گا —— ہم آپ کے سرمائے کو دو چند کرنے اور، چار چاند لگانے لئے پارس بنے بیٹھے ہیں، اب آپ جو بھی کہیں آپ کی ذرّہ نوازی ہے"

"پھر ہماری فیکٹری دیکھنے کب آ رہی ہو؟"

"جب بھی آپ بلائیں ——"

"بھئی اپنی سیکرٹری کو ضرور لے کر آنا"

"کہیئے تو صرف سیکرٹری کو ہی بھیج دوں"

"نہیں بھئی تمہارا آنا بھی ضروری ہے، میرا دل چاہتا ہے تم میری فیکٹری کی ساری مصنوعات دیکھو۔ اور پھر مشورہ دو کہ کس قسم کی پبلسٹی کی ضرورت ہے"

"میں ضرور آؤں گی انشاء اللہ ——"

سیٹھ صاحب کھڑے ہو گئے ——

"بس چل دیئے سیٹھ جی ——" خانم بھی کھڑی ہو گئی ——

"بارہ بجے ایک میٹنگ ہے۔ دفتر میں، میں تو صرف آدھے گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا تھا ——" نے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑے ——

سیٹھ صاحب جب دفتر سے نکلے تو گھائل ہو چکے تھے، نیّا حسب ہدایت انہیں موٹر بجوڑنے گئی، موٹر میں بیٹھ کر انہوں نے ایک حسرت ناک نگاہ نیّا پر ڈالی اور بولے ——

"پھر تم کس دن فارغ ہو، کاروباری بات چیت کے لئے ——"

"کسی روز بھی آپ فرمائیں" نیّا نے مسکرا کر کہا "آپ کے کام سے بڑی کوئی مصروفیت نہیں ہے صاحب!"

اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا ——

"میں فون پر ٹائم مقرر کر لوں گا ——"

"جیسے آپ کی خوشی ——" نیا نے انہیں خدا حافظ کہا۔ اور پھر اوپر چلی آئی ——

صرف ایک مہینہ ہوا تھا نیا کو خانم کے دفتر میں کام کرتے ہوئے مگر وہ اتنی خوش اسلوبی سے اپنا کام کر رہی تھی کہ خانم دل ہی دل میں اپنے انتخاب کو داد دینے لگی تھی ——

"سیٹھ جادو بھائی کے بہت سے کارخانے ہیں اور ٹیکسٹائل ملیں بھی ہیں، پہلے بھی دو کنٹریکٹ ہمارے پاس ہیں، مگر اب ختم ہونے والے ہیں ——" خانم نے نیا کے دائیں ہی کہنا شروع کیا ——"اب انہوں نے ایک جاپانی فرم کے ساتھ مل کر کوسمیٹکس کی فیکٹری ہے —— میں چاہتی ہوں اس فرم کے لئے کم از کم پانچ سال کا معاہدہ ہو جائے —— سیٹھ ایک موٹی اسامی ہے، ہر کمپنی کو ایسے دو تین مستقل کلائنٹس کی ضرورت ہوتی ہے میں چاہتی ہوں ان سب سے تمہیں ملا دوں اور پھر آئندہ ڈیلنگ میں تم اس بات کا خیال رکھو کہ ان سے نہ جانے پائیں، جس حد تک ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہوں اٹھائیں ——"

نیا ایک ٹک خانم کی شکل دیکھ رہی تھی —— اور پھر یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ خانم اس پر بے بھروسہ کرنے لگ گئی ہے، ابھی وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ کہ چپراسی ایک کارڈ لے کر آیا

"اندر بلاؤ ——" خانم ایک دم اپنی شاندار کرسی پر واپس چلی گئی ——

"آغا، خاقانی صاحب ——" خانم نے آنے والے کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے کہا۔ "آج کیا تھا جو تمہیں یاد ہماری آئی"

"ابھی میں نے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا ——" خاقانی صاحب کرسی پر بیٹھ گئے ——

"ہاں مجھے اطلاع ملی تھی، میں ابھی آپ کو جوابی فون کرنے والی تھی کہ سیٹھ جادو بھائی آ گئے اور سناؤ کیسے مزاج ہیں"

"مزاج تو الحمد للہ بالکل ٹھیک ہیں" یہ کہتے کہتے خاقانی صاحب کی نگاہ نیا پر پڑ گئی جیسے وہیں اٹک گئی ——

نیا انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہاں آنے والے ہر آدمی کو اُسے غور سے دیکھنا پڑتا تھا۔ اس کی گفتگو سننی پڑتی تھی —— اس کی نشست و برخاست پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی —— اس کے ساتھ اس کی عمر اور حیثیت کا اندازہ، محض اپنے علم کے لئے لگاتی رہتی تھی۔

خاقانی صاحب بھی پچاس اور پچپن کے درمیان لگتے تھے —— مگر صحت ماشاء اللہ بہت اچھی تھی، ہاتھ پاؤں صحت مند اور تگڑے تھے، رنگ بھی سُرخی مائل سفید تھا، صاف معلوم دے رہا تھا کہ زمانے کے سرد و گرم دیکھ چکے ہیں —— اور اب خود سرد و گرم دکھاتے کے قابل ہو چکے ہیں، پہلے وہ سمجھا کرتی تھی —— پچاس برس کا آدمی سوائے باپ اور دادا کے اور کچھ نہیں ہو سکتا —— مگر یہاں آ کر اسے ہر روز ایک نیا اندازہ ہوتا تھا —— یہاں پر پچاس پچپن کے آدمی یوں معلوم ہوتے تھے —— جیسے ریس جیتنے والا پرانا گھوڑا ہوتا ہے جسے ہر سال بڑے اہتمام سے میدان میں لایا جاتا ہے —— اس خیال سے کہ اگر نئے گھوڑے میدان نہ مار سکے تو اس پر بولی دی جاتے گی —— اور بہت سے شوقین مزاج، نئے گھوڑے کی نسبت پرانے گھوڑے پر شرطیں لگانے کو ترجیح دینے لگتے ہیں ——

"یہ ہے آپ کی نئی سیکرٹری جو انتہائی خوبصورت انداز میں بولتی ہے" نیا اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ادا سے مسکرائی —— بجلی سیدھی خاقانی کے دل پر گری ——

"ہاں —— یہ نیا ہے —— میری نئی سیکرٹری ہے۔ اور یہ خاقانی صاحب ہیں —— یہاں کے بہت بڑے صنعت کار اور سوشل ورکر"

نیا اٹھ کر آداب بجا لائی، پھر باہر چائے کا آرڈر دینے چلی گئی، خاقانی صاحب نے اسے آتے جاتے ہوئے اچھی طرح دیکھ لیا تھا —— اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ نیا سر سے پاؤں تک ایک قیامت ہے ——

خانم اور خاقانی صاحب دوستانہ سی گفتگو کرنے لگے، اتنے میں چائے آ گئی اور نیا پھر نئے سرے سے میزبانی کے فرائض انجام دینے لگی —— وہ جب چائے بنا کر خاقانی صاحب کے قریب لے

گئی تو انہوں نے نظر بھر کر نیّا کے گلابی چہرے اور مسکراہٹ میں لپٹی ہوئی انگارہ سی آنکھوں کو پیالی پکڑ کر بولے ——

"ایک خوبصورت عورت دوسری خوبصورت عورت کو کیسے سیکرٹری رکھ سکتی ہے۔"

"جس طرح ایک صنعت کار، سوشل ورکر بھی ہو جاتا ہے۔" نیّا نے جوابی حملے کے طور پر اُن کی زمانہ بین آنکھوں میں دیکھ کر کہا ——

"واہ ——" خاقانی صاحب مسکراتے ——"اچھی صورت کے ساتھ دماغ بھی اچھا پایا ہے"، پھر وہ خانم کی طرف مڑ کر بولے —— "خانم تم قسمت کی دھنی ہو —— یا تم پارس ہو!"

"بس جی اللہ کا کرم ہے یا آپ جیسے دوستوں کی عنایت ہے۔" خانم نے مصنوعی خجالت سے کہا ——

"اور سناؤ کاروبار کیسا جا رہا ہے ——" خاقانی صاحب نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے کہا ——

"ماشاءاللہ خوب جا رہا ہے —— آپ کی ایڈ تو سینما ہالوں میں چل رہی ہے نا؟"

"اور ہاں بہت پسند بھی کی جا رہی ہے۔"

"اِس سال آپ کا کنٹریکٹ ختم ہو رہا ہے —— اِس سال کے آخر میں ہم آپ کے لئے ایک نئی اور خوب صورت ایڈ بنائیں گے۔"

"اچھا ——"

"ہاں، میں نے سوچ لیا ہے ——" خانم نے اپنائیت سے کہا

"مگر اس میں خوبصورت لوگ ہونے چاہئیں۔" خاقانی نے نیّا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خوبصورت لوگ ہی ہوں گے ——" خانم نے انہیں یقین دلایا ——

"آپ . . . آپ . . ." نیّا نے مسکراتے ہوئے خاقانی صاحب کی طرف دیکھا اور پھر

خانم کی طرف —— اور رُکتے رُکتے بولی —— "آپ کا کاروبار . . . . . !"

"رات تم نے ٹی وی پر "تسکین سگریٹ" کا اشتہار دیکھا تھا،" خانم نے پوچھا۔

"ہاں جی۔" نیّا نے جواب دیا۔

"وہ انہی کے ہیں، آگ بھی لگاتے ہیں اور تسکین بھی پہنچاتے ہیں اور اب تو یہ ماچس کی ایک فیکٹری بھی لگا رہے ہیں —— تاکہ اِن کا کام مکمل ہو جائے۔"

"ماچس کا کیا نام رکھیں گے آپ ——؟"

"ابھی سوچا نہیں ——" خاقانی صاحب بولے۔

"میرا خیال ہے "بی جمالو" ٹھیک رہے گا،" نیّا نے لقمہ دیا۔

اس پر خانم نے پہلے قہقہہ لگایا اور خاقانی صاحب نے بعد میں —— تھوڑی دیر تک ہنسنے کے بعد خانم نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ اور کہا "دِس از ٹو مچ بھتی —— خاقانی تم بُرا نہ ماننا ——"

"ارے میں حسین لوگوں کی کسی بات کا بُرا نہیں مانتا —— یہ بخشے ہوتے لوگ ہوتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی خاقانی صاحب کھڑے ہو گئے —— نیّا انہیں دروازے تک چھوڑنے گئی۔

اسی طرح پھر دفتر میں آنے جانے والوں کا تانتا لگ گیا۔

نیّا صاف محسوس کر رہی تھی کہ جو بھی فون پر اس کی آواز سُنتا تھا، اِس کو دیکھنے اور اُس سے ملنے ضرور آتا تھا اور شاید خانم بھی یہی محسوس کر رہی تھی، اِسی واسطے اُس نے نیّا کو اپنے کمرے میں بٹھا چھوڑا تھا ——

یا شاید اِس طرح نیّا کی ٹریننگ کرنا مقصود تھی ——

نیّا دِن بھر چپ چاپ اپنی میز پر بیٹھی رہتی، مگر اُس کا دھیان اور اُس کے کان ہمیشہ خانم کی طرف لگے ہوتے —— خانم لوگوں سے کس انداز میں بات کرتی ہے۔ کس طرح لوگوں کو ٹریٹ کرتی ہے —— اور مخاطب کو کیسے لاجواب کرتی ہے؟

اِن سب باتوں پر نیّا غور کیا کرتی، بلاشبہ نیّا کے پاس خانم سے زیادہ صلاحیتیں تھیں پھر یہاں کی زبان اور معاشرت اس کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ خانم سے زیادہ ڈال سکتی تھی ——

مگر زیادہ تر اسے فارغ ہی بیٹھنا پڑتا تھا، ایک دِن اس نے خانم سے کہا "خانم! میں نے دیکھا ہے اِسی بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر ایک کمرشل کالج ہے، جس میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سکھاتے ہیں، اگر آپ مجھے اجازت دیں۔ تو میں ایک گھنٹہ وہاں لگا آیا کروں ——"

"تمہیں کس نے بتایا ہے ——؟"

"ایک دن میں نے خود ہی جاکر پتہ کر لیا تھا، سوچا ٹائپ ہی سیکھ لوں۔ ایک مکمل کورس کے لئے تو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ ضروری ہے نا!"

"ہے تو سہی —— تم نے پتہ کر لیا کتنا عرصہ لگے گا!"

"صرف ٹائپ سیکھنے کے لئے تین ماہ درکار ہیں اور شارٹ ہینڈ کے لئے چھ ماہ۔"

"تو تم ایسا کرو، صرف ٹائپ ہی سیکھ لو —— میرے پرانے سیکرٹری کا ٹائپ رائٹر پڑا ہے فارغ وقت میں وہیں پریکٹس کر لیا کرو —— کیونکہ ٹائپنگ تو پریکٹس سے ہی آتی ہے ٹھیک ہے خانم ——"

نیّا نے گویا ایک اور روزن کھلا پایا ——

نیّا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو خوشبوؤں کا ایک قافلہ اس کے ساتھ اندر داخل ہوا ——

"آؤ نیّا اِن سے ملو —— خانم نے مسکرا کر نیّا کا خیر مقدم کیا اور پھر حسبِ معمول اپنے ایک نئے دوست سے اس کا تعارف کرانے لگی ——

"یہ فیضی ہیں، سرامک انڈسٹریز کے مالک، بہت عرصہ میں نے ان کا کام کیا ہے —— تو ہمارے ملک میں اِن کے برتن چل رہے ہیں، بلکہ اِن کے برتن ٹوٹ رہے ہیں، . . . ."

"برتن ٹوٹنا تو خوش قسمتی کی علامت ہوتی ہے، دِل نہیں ٹوٹنے چاہئیں ——" یہ کہہ کر نیّا نے فیضی کو اداسے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آداب کیا —— اس وقت نیّا نے چوڑیدار پاجامہ اور حیدرآبادی کرتا پہنا ہوا تھا —— دو چوٹیاں گوندھ کر اِن میں ربر بینڈ لگائے ہوئے تھے اور چُنے ہوئے دوپٹے کو گلے سے لٹکائے وہ بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی ——

"فیضی —— یہ نیّا ہے۔" خانم نے پھر کہا "میری نئی سیکرٹری ——"

"کیا انہی کے چرچے ہیں تمہارے دفتر کے اندر، اور دفتر کے باہر ——!"

"شاید ——" خانم نے بڑے فخر سے خالی گلاس رکھا اور صوفے پر بیٹھ گئی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ لی۔

"کھڑی کیوں ہو نیا بیٹھ جاؤ ــــ" خانم سگریٹ سُلگانے لگی۔

"سوچ رہی ہوں، آپ کے لئے ٹھنڈا منگواؤں یا گرم ــــ کیونکہ آج کچھ جسن زیادہ

"ٹھنڈا تو ہم پی چکے ہیں جاناں" خانم نے محمور آنکھوں کے درمیان کش چھوڑا۔ "اب گرم

ہے ــــ"

اتنے میں بیرا چائے اور لوازمات سے لدی ہوئی ٹرالی لے کر کمرے میں داخل ہوا نیا

آگے ہو کر ٹرالی اس کے ہاتھ سے پکڑ لی اور پھر سروس شروع کر دی،

اُن کو چائے دے کر نیا ذرا دور ہٹ کر بیٹھ گئی، وہ محسوس کر رہی تھی کہ فیضی برابر کنکھیوں سے اُسے دیکھ رہا تھا ــــ

وہ خاصا جوان آدمی تھا ــــ چالیس کے لگ بھگ ہوگا ــــ اور دیکھنے میں بہت

تھا، اونچا لمبا، گورا چٹا اور صحت مند، کراچی میں یہ پہلا آدمی تھا، جسے دیکھ کر وہ متاثر ہوئی تھی

وہ تو سمجھے ہوئے تھی کہ سب کاروباری آدمی، ساٹھ کے قریب ہوتے ہیں ــــ اور ظاہر

دلکشی اور جاذبیت سے محروم ہوتے ہیں ــــ

نیا آج معمول سے زیادہ خاموش تھی، اِس واسطے دُور بیٹھ کر چائے پینے لگی فیضی اور

یوں آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ جس طرح راز و نیاز کرتے ہیں۔ نیا نے بھی

کرنا مناسب نہیں سمجھا، کیونکہ اب وہ خانم کے طور طریقے سمجھنے کے قابل ہوگئی تھی۔

روز شام کو خانم اُسے اپنے ڈرائنگ روم میں بُلا کر مہمانوں کو انٹرٹین کرنے کی ڈیوٹی

دیتی تھی۔ خانم کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے تھے اور نیا کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ شہر کی

ہستیاں بھی یہاں آتی تھیں، وہ جن لوگوں کی تصویریں روزانہ اخباروں میں چھپتی تھیں وہ بھی

خانم کے پاس بیٹھ کر گپ لگانے کو حاصلِ زندگی کہتے تھے ــــ نیا کے اوّلین حجاب بھی

ٹوٹے تھے، اب وہ مردوں کی محفل میں بیٹھنے سے گھبراتی نہیں تھی ــــ بلکہ بڑے اعتماد

ساتھ گفتگو میں حصہ لیتی تھی، نشست و برخاست کے آداب اُسے آ گئے تھے ... نفیس

رنے میں طاق ہوگئی تھی ــــ باتوں سے جادو جگانا اور جادو سے ہوش اڑانے کا مطلب

ے آگیا تھا ــــ خانم بھی اسے ہر مہمان سے متعارف کراتی اور پھر اُن کے ساتھ بے تکلف

ہونے کا موقع دیتی ــــ کبھی کبھی جب خانم کو کسی ضروری چائے یا ڈنر پہ جانا ہوتا تو وہ نیا کو مہمانوں

ے پاس چھوڑ جاتی اور نیا اس کی اچھی جانشین ثابت ہوتی ــــ

ہر شام نشست کے بعد خانم اُسے اپنے بیڈ روم میں بلاتی اور نئی ہدایات دیتی ــــ

یہ ہدایات آدابِ محفل سے لے کر ذاتی رکھ رکھاؤ کے بارے میں ہوتی تھیں ــــ

"جب تمہیں گلاس پیش کیا جائے تو دو انگلیوں اور ایک انگوٹھے کی مدد سے اٹھاؤ،

وں اس طرح اٹھاؤ کہ گلاس کی نزاکت کم اور تمہارے ہاتھ کی خوبصورتی زیادہ واضح ہو ــــ

شام کو ذرا اچھی قسم کی خوشبو لگانی چاہیئے ــــ ایسی خوشبو جو بولتی ہو ــــ پھیلتی ہو ــــ مسکراتی

ہوا اور لپٹ جاتی ہو ــــ

"خوشبو بھی شخصیت کا اظہار کرتی ہے ــــ اتنی تیز خوشبو کبھی نہ لگاؤ کہ پاس بیٹھنے والے

کا دماغ چکرانے لگے ــــ"

خانم نے اپنی میز کی بہت سی خوشبوئیں اُٹھا کر نیا کو دے دی تھیں اور اُن کے اوقات بھی

سمجھا دیئے تھے ــــ

"شام کو منہ میں الائچی رکھا کرو، بات کرتے وقت زیرِ لب مُسکرانا چاہیئے۔ لیکن یہ مُسکراہٹ

واضح نہ ہو ــــ یہ مُسکراہٹ صرف نچلے ہونٹ پر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ چہرے کا اِک اک

نقش مسکراتا نظر آئے ــــ"

"تم نے مونالیزا کی تصویر دیکھی ہے ــــ؟" ایک دن خانم نے نیا سے پوچھا، نیا نے انکار

میں سر ہلایا ــــ

"میں تمہیں دکھاؤں گی، اس کی تصویر میں یہی خوبی ہے ــــ اور اِس ایک خوبی کی وجہ سے

وہ تصویر ساری دُنیا میں مشہور ہوگئی ہے،

"گئی لوگ مسلسل مسکراتے رہتے ہیں، مگر ابرو کے درمیان ایک سوگیارہ کا بل
ہی رہتا ہے ——"

"ننھے منے قہقہے اچھے لگتے ہیں، محفل میں اس طرح نہیں ہنسنا چاہیئے کہ آدمی کی گا
کا اشتہار نظر آئے ——"

"ہجوم میں اس طرح بیٹھو۔ جیسے تم سب سے بے نیاز ہو۔۔۔ مگر سب پر
حسن کو بے نیاز نظر آنا چاہیئے، مگر ہوشیار رہنا چاہیئے ——"

"محفل میں کوئی ملے تو اس طرح ملو جیسے تم اس پر نثار ہو جاؤ گی —— لیکن تنہائی میں
تو سرد لوہا بن جاؤ۔ اس کا ہاتھ اپنے گریبان تک نہ آنے دو ——"

"جو ہاتھ تمہارے گریبان تک نہیں پہنچے گا، وہ ہاتھ بھکاری کی مانند ہمیشہ تمہارے
پھیلا رہے گا ——"

کبھی کبھی نیا ان ہدایات سے گھبرا جاتی۔۔۔ بے زار ہو جاتی —— اور اس کے دل میں
طرح کے خطرے سر اٹھانے لگتے، عجیب عجیب وسوسے اسے گھیر لیتے۔

یہ نوکری۔۔۔۔۔ یہ نوکری تو۔۔۔۔۔

وہ اندر سے تھرا جاتی ——

نہیں نہیں وہ جھرجھری لیتی —— نوکری تو نوکری ہوتی ہے —— اگر وہ نوکر
نہیں کرے گی، تو کیسے زندہ رہے گی، اپنے بچے کا مستقبل کس طرح سنوارے گی، کیا زندگی
ہاتھ پھیلاتے رکھے گی! بھابیوں کے آگے پھیلانے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ دنیا کے آگے
پھیلائے ——

اور وہ زندگی میں پہلی مرتبہ باہر نکلی ہے —— باہر کی دنیا دیکھی ہے —— پہلا تجربہ
ہے —— اس لئے عجیب لگ رہا ہے ——

مگر وہ کیوں ڈرے —— اور کس لئے ——؟

آخر خانم بھی تو ہے —— ایک دنیا کو اپنے آگے لگا چھوڑا ہے —— نیا کیا کسی سے کم
ہے —— وہ خانم سے بھی بڑی عورت بن کر دکھائے گی —— وہ اس دنیا کو اپنے کندھوں پر
لے گی —— وہ دنیا کے ہر مرد کو شکست دے گی —— اپنا ایک جہاں الگ بنائے گی۔

اور۔۔۔۔۔

دیکھتا تو سہی —— کیا کر کے دکھاتی ہے وہ ——"

"بڑی فضول سی لڑکی رکھ لی ہے۔ تم نے ——؟"

خیالوں میں کھوئی کھوئی نیا کا دل دھک سے رہ گیا —— فیضی خانم سے کہہ رہا تھا۔

"کیوں ——؟" خانم نے آواز اور آہستہ کر کے کہا ——

"مجھے تو پسند نہیں آئی، احمق سی لگتی ہے ——"

"احمق سی لگتی ہے، یا احمق سی ہے ——"

"بوجھ ہی ہے کوئی اچھی دریافت نہیں ہے تمہاری ——"

خانم نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا —— "دراصل تم اس سے حسد محسوس کر رہے ہو اور کوئی
بات نہیں ہے ——"

"خیر حسد محسوس کرنے والی تو کوئی بات نہیں —— خواہ مخواہ ہی چڑ چا ہے اس کا ——
قیامت بھی نہیں، جیسی سنی تھی ——"

اسی وقت خانم نے نظر اٹھا کر نیا کی طرف دیکھا —— نیا کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ چونک
اسے اندازہ ہو گیا کہ نیا نے ان کی باتیں سن لی ہوں گی ——، بڑی محبت سے بولی ——
قریب آ کر بیٹھو نیا، اتنی دور کیوں بیٹھی ہو ——"

نیا ان کے قریب آ گئی اور بولی —— "اور چائے دوں ——"

"نہیں بھئی شکریہ ——" فیضی نے خالی پیالی دوسری تپائی پر رکھ دی ——
نیا وہیں بیٹھ گئی —— فیضی بھی خانم کی طرح چین اسموکر تھا، لمحے بھر کو نیا نے اسے سگریٹ

کے بغیر نہیں دیکھا ـــــ اپنے چہرے کے اردگرد دھواں پھیلائے، دھوئیں کے پار سے مسلسل دیکھتا رہتا اور نیّا جان گئی کہ یہ بھی مردوں کے دیکھنے کا انداز ہوتا ہے۔ کسی عورت کو مسلسل گھورنا چاہتے ہیں تو دھوئیں کی آڑ لے لیتے ہیں ـــــ

"نیّا تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں ـــــ" خانم نے مستی میں ڈوب کر کہا ـــــ

"ضرور خانم ـــــ" نیّا بھی خوش دلی سے مسکرادی، ساتھ ہی بولی ـــــ "خانم! کچھ کچھ محسوس ہوتا ہے کہ آپ راز کی باتوں کا ایک ایسا دفینہ ہیں کہ یہ دفینہ چرانے کے لئے عمر یہیں گزارنی پڑے گی ـــــ"

خانم کو یہ بات اچھی لگی، ہنس کر اس نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور پھر بولی ـــــ "تم خود ایک دفینہ بن جاؤ گی اور کوئی تمہیں چرانے کے انتظار میں ہوگا ـــــ ہے نا ـــــ"

اس پر تینوں اپنے اپنے انداز میں ہنسنے لگے ـــــ

"اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تم میری ہر بات اپنے پلّو سے باندھ لو ـــــ" خانم بولی "آخر ایک دن تمہیں یہ پھانسی کا پھندہ پھر گلے میں ڈالنا ہے ـــــ یہ ٹوٹکے تمہارے کام آئیں گے رکھو، جب بھی کوئی مرد کسی خوبصورت عورت کی بدتعریفی کرے تو سمجھ لو کہ وہ اس کے عشق میں ہو چکا ہے ـــــ"

"یعنی ـــــ" نیّا نے بے چین ہو کر پوچھا ـــــ

"بھئی سیدھی سی بات ہے ـــــ جب کوئی مرد کسی عورت کی خواہ مخواہ برائی کرنے لگے تو سمجھ لو کہ وہ اسے دیکھ کر بے قابو ہو گیا ہے، بیویوں کو یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہئے۔"

اب بات فیضی کی سمجھ میں بھی آ گئی، وہ ایک دم بوکھلا کر بولا ـــــ "خانم! خدا کا خوف کرو، خواہ مخواہ بات کو کوئی اور رنگ دے رہی ہو۔"

"تم ابھی نیّا کو برا بھلا کہہ رہے تھے نا؟ اور نیّا بھی سن رہی تھی، میں نے سوچا، اصل بات کی وضاحت کر دوں ـــــ"

فیضی نے سچ مچ شرمندہ ہو کر گردن جھکا لی۔

"یہ فیضی جو ہے نا ـــــ" خانم نیّا کی طرف دیکھ کر بولی "یہ میرا بڑا پرانا ایڈمائرر ہے، ہر بار کوشش کرتا ہے کہ میں اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں الجھ کر اس سے شادی کر لوں، مگر میں کہتی ہوں دوستی اچھی ہے، شادی کر کے تو ہم ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔"

"کیا ہم شادی کے بغیر ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو سکتے ـــــ؟" ایک دم فیضی نے پوچھا ـــــ

"ہو سکتے ہیں ـــــ ایسی صورت میں کہ ایک خوبصورت لڑکی ہمارے درمیان آ جائے ـــــ" خانم نے فلسفیانہ انداز میں کہا ـــــ

ایسے میں نیّا کا رنگ آپ ہی آپ سرخ ہو گیا ـــــ اور دل ایک دم ڈوب کر ابھرا ـــــ

اب ملازم نمودار ہوا، اور خانم سے بولا ـــــ "آپ کا فون ہے ـــــ" خانم نے سگریٹ ایش ٹرے میں چھوڑ دیا اور اٹھ کر فون سننے چلی گئی، نیّا کا خیال تھا، فیضی تھوڑا سا شرمندہ ہو گا ـــــ معذرت کرے گا ـــــ تاویلیں پیش کرے گا ـــــ اور اپنی صفائی میں کچھ کہے گا، مگر ایسا نہیں ہوا ـــــ

خانم کے جاتے ہی اس نے نظر بھر کر نیّا کی طرف دیکھا، یوں جیسے اس سے پہلے نہ دیکھا ہو۔

"آپ نے خانم کی بات کا برا تو نہیں مانا ـــــ"

"نہیں تو ـــــ" نیّا نے معصومیت سے کہا۔

"خانم کی باتیں کڑوی ضرور لگتی ہیں، مگر کھری ہوتی ہیں۔"

نیّا حیرت سے فیضی کا چہرہ دیکھتی رہی ـــــ

"خانم بعض اوقات حیرت انگیز سچائیاں بیان کرتی ہے، اسی لئے میں اس کا مداح ہوں، جن کو پردوں میں لپیٹ کر نہیں کرتی ـــــ" نیّا اب بھی خاموش تھی اور فیضی کی صورت دیکھ رہی تھی... وہ کہہ رہا تھا ـــــ

"بات یہ ہے کہ میں نے آج تک آپ جتنی حسین لڑکی کوئی نہیں دیکھی ــــ کم از کم
ملک میں تو نہیں دیکھی ــــ آپ کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو جاتا ہے ــــ بعض چیزیں
میں ہی گرفتار کر لیتی ہیں ــــ پھر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا ــــ آپ کو دیکھ کر یقین کرنا
وہ بہت بڑا کاریگر ہے۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا ــــ

"کون کافر ہے ــــ" فیضی نے رُک کر سگریٹ کا کش لیا اور پھر دھوئیں کا
"جو آپ پر ایمان نہ لے آئے ــــ"

اپنے بے ناخن ایک دوسرے میں الجھا کے نیّا صرف ہنس دی، اتنے میں خانم
اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی ــــ

"فیضی تم اپنا کام کر گئے ہو گے" فیضی ہنسنے لگا ــــ

"بڑا ہنر مند ہے یہ ــــ" خانم نے مسکرا کر نیّا کی طرف دیکھا ــــ "تم نے کبھی کسی کو مچھلی
پکڑتے دیکھا ہے ــــ"

نیّا نے نفی میں سر ہلایا ــــ

یہ آدمی جال بچھانے میں دنیا کا ماہر ترین آدمی ہے ــــ تم چونکہ میرے دربار میں
اس لئے تمہیں خبردار کرنا میرا فرض ہے"

تینوں پھر اپنے اپنے انداز میں ہنسنے لگے،

پھر خانم نے گھڑی دیکھی اور بولی ــــ "آٹھ بجے مجھے ایک ضروری ڈنر پہ جانے
اجازت دو ــــ تاکہ تیار ہو جاؤں ــــ نیّا تم ان کے پاس بیٹھو، گپ لگاؤ" خانم نے کھڑے
کہا ــــ

"نہیں خانم، مجھے بھی اجازت دو" فیضی بھی کھڑا ہو گیا ــــ

اُن کے ساتھ ہی نیّا بھی کھڑی ہو گئی، اُس کا دل بھی آج گپ لگانے کو نہیں چاہ رہا

"کیوں! کیا اِس کے پاس بیٹھنے سے ڈرتے ہو؟" خانم نے فیضی کی آنکھوں میں

ل کر پوچھا ــــ
ایک عمر تمہارے ساتھ گزاری ہے خانم ــــ ایسا کچا بھی نہیں ہوں، مجھے بھی دراصل ایک
روری کام سے جانا ہے ــــ پھر کبھی سہی ــــ"

میرا خیال تھا، آج تم نیّا کو اپنے ساتھ ڈنر کے لئے لے جاتے تو اچھا ہوتا" خانم بولی ــــ
فیضی نے پُر امید نظروں سے نیّا کی جانب دیکھا ــــ مگر اس بار نیّا خود ہی بول اٹھی "نہیں
انم ــــ آج میں کہیں نہ جا سکوں گی، مجھے کچھ ضروری خط لکھنا ہیں۔ اور میرا موڈ بھی نہیں ہے۔
خانم نے کہا تھا۔ مردوں کے سامنے یہ کبھی نہیں کہتے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، بیمار رہنے
الی عورتوں کو مرد پسند نہیں کرتے اس لئے اُس نے موڈ پہ سارا زور دیا ــــ

اچھا تم لوگوں کی مرضی ــــ نیّا تم انہیں باہر تک چھوڑ آؤ" یہ کہہ کر خانم اپنے کمرے کی طرف
ل دی ــــ

پہلے بھی کئی بار خانم نے نیّا کو مختلف لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے کو بھیجا تھا، کبھی کبھی خود
بھی ساتھ جاتی تھی، وہ کہتی تھی ــــ مردوں کے ساتھ تنہا جایا کرو، اِن کی نیچر کو سمجھنے کا موقع ملے
ا، تب تک تم اُن کی فطرت سے واقف نہیں ہو سکتیں۔ اِن کی دُکھتی رگ پہ ہاتھ نہیں رکھ
سکیں اور پھر اکثر ہوٹلوں میں جانے سے کھانے پینے کے آداب کا پتہ چلتا ہے، واقفیت
بڑھتی ہے ــــ ذہن کشادہ ہوتا ہے ــــ

مگر آج ــــ

نیّا کا جی کچھ بوجھل تھا . . . اس لئے وہ باقاعدہ گفتگو میں حصہ بھی نہیں لے رہی تھی، خانم
کے کہنے پر وہ فیضی کو باہر تک چھوڑنے گئی ــــ موٹر میں بیٹھ کر فیضی نے اُسے بھرپور شوقیہ نظروں
سے دیکھا اور بولا "اگر کبھی آپ میرے ساتھ کھانا کھانا ناپسند فرمائیں تو یہ میری عین خوش قسمتی
ہو گی ــــ"

نیّا صرف مسکرائی ــــ

"میں آپ کو فون کروں، یا آپ خود دن مقرر کریں گی ——" فیضی نے بات آگے بڑھانی چاہی ——

"ابھی مجھے فرصت نہیں ہے ——" نیا نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

"میں انتظار کر سکتا ہوں —— زندگی بھر ——" اُس نے گیئر لگا کر کہا۔

نیا نے کوئی جواب نہیں دیا، بس اُس کی طرف دیکھتی رہی ——

وہ اُسے ایسی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ نیا کو گھن آنے لگی —— وہی نظریں، وہی التجا ——

کھڑے کھڑے نیا کا سر دُکھنے لگا ——

بمشکل اُس نے خدا حافظ کہہ کر گاڑی باہر نکالی —— اور نیا دوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر نیا نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کمرے کا ائر کنڈیشنر چلا دیا۔ باہر جس کچھ زیادہ ہی تھا چنانچہ اس نے پنکھا بھی چلا دیا —— کمرہ شور اور ہوا سے بھر گیا۔

نیا نے دوپٹہ اُتار کر پلنگ پر رکھ دیا ——

پھر جب کچھ اور نہیں سوجھا تو وہ غسل خانے میں چلی گئی —— شاید غسل لینے سے جی کا بوجھل پن اور طبیعت کی کسلمندی دُور ہو سکے!

اُس نے شاور کھول دیا —— ٹھنڈی ٹھنڈی جھاگ جھاگ پھوار اسے بہت اچھی لگی ——

آہستہ آہستہ جیسے اعصاب کا تناؤ کم ہونے لگا —— ایک ایک کر کے وزنی سلیں سی کھسکنا شروع ہو گئیں ——

پانی کا کھیل بھی کتنا اچھا کھیل ہے —— اس نے اپنے دل میں سوچا ——

کہ پانی اور آگ کے کھیل میں کتنا فرق ہے ——

کتنی عجیب بات ہے کہ پانی آگ بجھاتا بھی ہے اور لگاتا بھی ہے —— بہر حال —— اِس وقت نہانا بہت اچھا لگ رہا تھا ——

نہا کر اس نے اپنی ہلکے نیلے رنگ کی نائٹی پہنی، سوفٹ سلیپر پاؤں میں ڈالے اور اپنے سر پر

سے پلاسٹک کی ٹوپی اتار کر دہیں شاور پر لٹکا دی، اس نے کل ہی بال سیٹ کرائے تھے
اُنہیں گیلا نہیں کرنا چاہتی تھی ——

وہ ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے میں آئی —— تو جیسے جان میں جان آگئی ——
ساری قنوطیت آپ ہی آپ دُور ہو گئی ——

آئینے کے آگے کھڑی اپنے بال دُرست کر رہی تھی کہ —— بالکل اچانک موتی دوڑتا ہوا
اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا ——

نیا کے ہاتھ سے کنگھی گر گئی جسے اُس نے جُھک کر اُٹھا لیا ——
دِل میں ہُوک بھی اُٹھی تھی، جسے وہ نہ دبا سکی ——

پہلی بار اُس نے موتی کو خود سے جُدا کیا تھا، ہاں وہ تو دُنیا کی دوڑ میں نکل آئی تھی
کلیجے پر پتھر رکھ لیا تھا، مگر معصوم موتی کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی —— کیا سوچتا ہو گا۔

ماں ایسی کٹھور بن گئی ہے ——!

باپ تو ویسے ہی چھُٹ گیا ——
دُنیا میں آتے ہی اِس نے کیا دیکھا ——

موتی کا خیال اسے ویسے بھی ہر رات سونے سے پہلے آتا تھا، ہفتے میں ایک خط
لکھا کرتی تھی، دو بار اس نے موتی کے لیئے بہت سے کھلونے بھجوائے تھے۔ مگر اس میں
نہیں کہ یہاں آکر وہ بہت مگن ہو گئی تھی۔ وہ آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کی لگن کے ساتھ آئی
اس کے اندر بے شمار جذبے پڑے مچل رہے تھے —— اتنی طاقتِ پرواز تھی اس میں
آسمان کو چھُو لینے کی باتیں سوچتی تھی اُسے معلوم تھا کہ مامتا ایک بندش ہے، ایک رکاوٹ
ایک مجبوری ہے، اگر وہ مامتا کے جذبوں سے مغلوب ہو گئی تو اُس کی قوتِ پرواز
ہو جائے گی ——

اِسی لیئے اُس نے مامتا اور اُمنگ کو الگ الگ کر دیا تھا۔ سارا دن وہ بڑی اُمنگ

کے کاموں میں مشغول رہتی، مگر رات ہوتے ہی مامتا جیسے چھُپ چھُپ کے چھاپے مارتی۔
اور اس وقت کھڑے کھڑے اس کے سارے حوصلے جواب دے گئے —— جذبوں
نے نہ موڑ لیا —— موتی کو کلیجے سے لگانے اور پیار کرنے کی طلب بے تحاشا بڑھنے لگی ——
باتوں میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا —— دل مچلنے لگا ——
آنکھیں دھواں دھواں ہونے لگیں —— تو اس نے کنگھی چھوڑ کر قلم اور پیڈ سنبھال لیا ——
پیڈ پر پہلا حرف آنسو کی صورت میں گرا۔

جب سے نیا مصروف اور مگن ہوئی تھی اس نے مستقل کراچی میں رہنے کا تہیہ کر لیا تھا
یہاں آئے پورے تین ماہ ہو گئے تھے، اور اب وہ امّی جان کو اپنی ملازمت کی نوعیت
اور اپنا آئندہ پروگرام لکھ دینا چاہتی تھی ——

اُسے معلوم تھا تھوڑی سی مخالفت کے بعد امّی جان مان جائیں گی، انہیں سب کچھ لکھنے
سے پہلے وہ یہاں اپنے لیئے ایک الگ گھر کا بندوبست کرنا چاہتی تھی، جب اس نے خانم
سے ذکر کیا۔ تو وہ بولی ——

"بھئی الگ گھر لے کر رہنے کی کیا ضرورت ہے! میرا اتنا بڑا گھر ہے۔ اُوپر والے دو کمرے
لے لو۔ اپنی امّی اور بچے کو بلوا لو ——"

مگر نیا جانتی تھی، امّی جان اِس گھر کے ماحول کو بالکل پسند نہیں کریں گی اور پھر انہیں نوکری
کی تفاصیل بھی معلوم نہیں ہونی چاہئیں۔

"نہیں خانم، آپ کی بڑی عنایت ہو گی جو آپ میرے لیئے الگ گھر کا بندوبست کر دیں گی۔"

"تم نہیں جانتیں نیا —— کراچی میں رشتہ ملنا آسان ہے، گھر ڈھونڈنا مشکل ہے ——
اور پھر اتنے زیادہ کرائے ہیں —— تمہیں الگ رہنے کا فائدہ نہیں ہو گا ——"

"آپ مجھے کسی بلڈنگ میں دو کمروں کا کوئی فلیٹ لے دیں —— اتنی تو آپ کی واقفیت
ہے ——"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے ——" خانم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "میں دو ایک ہفتوں کے لئے ہوں ۔ تم اپنی امّی کو لکھ دو ——"

آج کل خانم نیّا کے لئے فلیٹ ڈھونڈتی پھر رہی تھی، جو دفتر سے زیادہ دُور نہ ہو۔ اس میں رہائش کی سب سہولتیں بھی ہوں۔

نیّا نے ہمّت کر کے امّی جان کو مفصّل خط لکھ ڈالا —— اپنی مستقل ملازمت کے بارے میں لکھا اور خانم کی شخصیّت پر بھی روشنی ڈالی، یہ بھی لکھا کہ وہ اس گھر میں عزّت و آبرو کے ساتھ رہ رہی ہے۔ پھر آخر میں امّی کو اپنی محبّت اور موتی کی زندگی کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ اُسے یہاں سے نہ کریں، جب گھر مل جائے گا تو وہ امّی جان کو اطلاع دے گی، اس کا ضروری سامان اور موتی کو لے کر امّی جان فوراً کراچی چلی آئیں ——

اُسے ڈر تھا کہ اس بار بھی بھائی لوگ ضرور کوئی جھگڑا کھڑا کر دیں گے، لیکن اب وہ بھائیوں کی دسترس سے دُور ہو گئی تھی اور چاہتی تھی موتی کو بھی جلد از جلد وہاں سے نکال لے۔

خط لکھنے کے بعد اور موتی کو ڈھیروں ڈھیر پیار بھیجنے کے بعد جیسے نیّا کو کچھ سکون سا آ گیا۔ خط لفافے میں ڈال کر اس نے اس کے اوپر ایڈریس لکھا اور پھر اپنے دفتری پرس میں رکھ لیا تاکہ دفتر جاتے ہوئے راستے میں پوسٹ کر دے ——

اتنے میں خانساماں نے دروازے پر دستک دی۔ اور پوچھا "کھانا کھائیں گی میم صاحب"

"نہیں ——" تھوڑی دیر سوچ کر نیّا نے جواب دیا ——

خانم گھر میں ہو یا گھر سے باہر، خانساماں باقاعدہ نیّا سے کھانے کا پوچھنے آتا تھا —— لیکن اب نیّا نے رات کا کھانا، کھانا بند کر دیا تھا، خانم نے کہا تھا رات کو کھانا کھا کر ذرہ جانے سے پیٹ بڑھ جاتا ہے —— رات کا کھانا اوّل وقت میں کھا کر تھوڑی سی چہل قدمی کرنی چاہیئے، اگر ایسا نہ کر سکو تو رات کا کھانا چھوڑ دو ——"

نیّا نے رات کا کھانا ہی چھوڑ دیا، چہل قدمی کی اُسے عادت ہی نہ تھی اور رات کا کھانا

سے کھایا جاتا تھا —— اور نیّا کو اپنا فگر بہت عزیز تھا —— اس نے غور کیا تھا کہ خانم صاحب کہیں پر جاتی تھی تو برائے نام ہی کھانا کھاتی تھی، عام طور پر سلاد یا روسٹ لیتی اور پھر باتوں کے دوران ہوں بھی نہ ہونے دیتی کہ وہ بالکل نہیں کھا رہی —— محض ٹرخا رہی ہے ——

ایک بار نیّا نے استفسار کیا تو اس نے کہا تھا "جانم —— یہ ڈنر تو کاروبار کا ایک حصّہ ہیں پر جانا ایک مجبوری ہے —— لیکن کھانے کی عادت ڈال کر اپنا دشمن بننا تو کوئی مجبوری نہیں —— پر احسان کرتے ہیں —— کھانا کھلاتے ہیں —— بس ہم قبول کر لیتے ہیں، کھانے پر بلانے کا مقصد پیٹ بھر کھلانا ہی نہیں ہوتا —— بلکہ کاروباری بات چیت دوستانہ ماحول میں ہو جاتی ہے، ت پاس ہو جاتا ہے، شناسائی بڑھ جاتی ہے —— لیکن ضروری نہیں کہ روز باہر کھانے کھا یار پڑ جاؤ ——"

تب سے نیّا نے خانم کا رویّہ اختیار کر لیا تھا —— اُسے بھی خالی سلاد اور ایک چکن پیس نے کی عادت ہو گئی تھی —— البتّہ ایک بار صُبح اُس نے ناشتہ نہیں کیا تو خانم نے اسے بُلا ما تھا —— "دیکھو نیا! صُبح کا ناشتہ ضرور کیا کرو، ناشتہ نہ کرنے سے چہرے پر جھُریاں پڑ جاتی ہیں رات سے خالی ہوتا ہے، اس لیے صُبح صُبح اُسے کچھ دینا چاہیئے۔ تاکہ مشینری صحت مند پر کام کر سکے، تم نے وہ روسی کہاوت سنی ہو گی۔ جس کا مطلب ہے —— صبح کا ناشتہ ڈٹ کر —— دوپہر کا کھانا بس چکھا کرو، لیکن رات کا کھانا اپنے دشمن کو دے دو ——" خانم نے ملنے پر نیّا کو پورا لیکچر پلا دیا، اُس نے کہا۔ "ہمارے ہاں المیّہ یہ ہے کہ ہم لوگ اپنی زیادہ تر زندگی نے اور کھانے میں ضائع کر دیتے ہیں، غضب خدا کا ہم دن میں چار مرتبہ کھاتے ہیں اور وہ بھی نہ نہ ڈنر میں یورپ میں لوگ صبح ناشتہ کر کے اپنے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں، لنچ ٹائم میں وہ سینڈوچ یا برگر کھا لیتے ہیں، پھر صحیح معنوں میں شام سات بجے وہ کھانا کھاتے ہیں —— اس برعکس ہم لوگ دن میں چار مرتبہ تو کھانے کا تردّد کرتے ہیں اور پھر جو وقت بچتا ہے۔ سوتے ہتے ہیں پر کوستے ہیں کہ ہماری قوم کچھ نہیں کرتی —— کاہل ہے —— وغیرہ وغیرہ ——"

خانم کی ہر بات نیا پلو سے باندھ لیتی تھی ——

یہاں آکر نیا کو اپنی اصل قیمت کا اندازہ بھی ہوا تھا، اس لئے وہ اپنا اور بھی زیادہ

رکھنے لگی تھی ——

خانساماں کے جانے کے بعد نیا نے پھر کنڈی لگالی —— فرش پر لیٹ کر تھوڑی دیر

کی —— پھر اٹھ کر مساج کیا —— اور ایک فیشن میگزین لے کر بستر پر دراز ہو گئی ——

آج پھر عرصہ دراز بعد نیند اُڑ گئی تھی ——

زندگی کی محرومیاں کچوکے لگا رہی تھیں —— اندر ہی اندر تو ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی —— اور جب

توڑ پھوڑ اس کے اندر ہونے لگتی تو وہ اپنے شعور کے سب روزن بند کر لیتی..... رسالے

فلمیں.... اچھے بھلاوے ہیں، مگر کبھی کبھی بھلاوے بھی اپنا منہ آپ چڑانے لگتے ہیں۔

نیا نے نرم نرم بستر پر لیٹ کر ایک سرد آہ کھینچی اور فیشن میگزین کے صفحے پلٹنے

خوبصورت عورتیں.... خوبصورت ملبوسات.... زندگی، رنگ، کیف.....

نہ جانے اس کی منزل کون سی ہو گی ——؟

سامنے روشنی کا کوئی نشان نہیں تھا ——

ٹھیک اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی ——

"کون ——؟" نیا نے لیٹے لیٹے سر اٹھا کر پوچھا ——

"میں ہوں نیا دروازہ کھولو ——" خانم کی آواز سن کر نیا چونک گئی —— جلدی سے گھڑی

گھڑی دیکھی، رات کے ساڑھے دس بجے تھے، اُس نے سوچا، آج خانم اتنی جلدی کیسے آ

نیا نے بستر سے اٹھ کر اپنا چائنیز نیک والا سلکی ڈریسنگ گاؤن پہنا اور پھر دروازہ کھولا

خوشبو کا ایک تیز بھبکا نیا کے نتھنوں سے ٹکرایا ——

سیاہ ساڑی میں ملبوس حسین ترین میک اپ کے ساتھ خانم یوں کھڑی مسکرا رہی تھی

کی جادوگرنی اُسے صبحدم تاج پوشی کی نوید دینے آئی ہو !!!

نیا نے پرے ہٹ کر جگہ دی۔ تو خانم آپ ہی آپ اندر چلی آئی۔ اس کے اندر آتے ہی خوشبو

ایک تازہ جھونکا بھی چلا آیا —— نیا نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ خانم مسکراتی ہوئی آگے بڑھی

اور نیا کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"ابھی تک جاگ رہی تھیں ——؟" خانم نے پلنگ پر پڑے ہوئے فیشن میگزین کی ورق

گردانی کرتے ہوئے کہا۔

"جی ——" نیا سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کھانا کھا لیا ہے تم نے ——؟"

"نہیں خانم آج بھوک نہیں تھی!"

"اچھا خوشخبری سنو، میں نے تمہارے لئے فلیٹ کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"سچ ——" نیا یوں خوش ہو گئی۔ جیسے زنداں کا پہلا روزن کھلا ہو ——

"آج ڈنر پر شعیب صاحب ملے تھے، انہوں نے کراچی میں کئی خوبصورت اور آرام دہ

عمارتیں بنائی ہیں۔ اتفاق دیکھو کہ "آسودہ مینشن" میں ان کے پاس دو اسپیشل فلیٹ خالی تھے ایک

اپنے لئے اور ایک کسی اور کے لئے —— انہوں نے رکھ چھوڑا تھا۔ دوسرا فلیٹ میں نے

تمہارے لئے لے لیا ہے۔"

"کب ملے گا ——؟" نیا نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں نے کہا ہے کہ لے لیا ہے۔" خانم نے پرس کھول کر ایک چابی نکالی، اور نیا کی طرف

بڑھائی۔

"آسودہ مینشن" کی تیسری منزل کا دسواں فلیٹ تمہارا ہے۔"

"میں کب جاؤں وہاں؟" نیا نے چابی پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر خانم نے دوبارہ چابی اپنے

پرس میں ڈال لی —— اور بولی۔

"قاعدے کے مطابق تمہیں پہلی تاریخ کو جانا چاہیئے۔ صبح چل کر اندر سے دیکھ لیں گے۔

اگر مزید کسی مرمت کی ضرورت ہوئی تو کرالیں گے۔ پھر تمہیں کچھ فرنیچر کی بھی ضرورت ہوگی
ہے فلیٹ کو سیٹ کرنے میں دس پندرہ دن لگ جائیں گے۔ اتنے میں تم امی کو خط لکھ دو
وہ بھی آجائیں اور تمہارا ضروری سامان بھی لے آئیں ——"

"کیا خیال ہے خانم؟ —— اگر میں خود جاکر امی کو لے آؤں۔ موتی کے لئے بھی میرا جانا
ہے" نیا نے سوگواری سے کہا۔

"میرا خیال ہے تم نہ جاؤ، ممکن ہے، تمہارے بھائی کوئی رخنہ کھڑا کردیں۔ خواہ مخواہ
پھر تمہارے لئے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔"

"لیکن امی میری ضرورت کا سامان کیسے لاسکیں گی؟ سب کچھ تو میں بند کرکے رکھ آئی
"تم انہیں تفصیل لکھ دو۔ جو لاسکیں گی لے آئیں گی، باقی پھر کبھی منگوالینا۔ اتنی جلدی تمہارا
واپس جانا بھی ٹھیک نہیں ہے"۔ خانم درست کہہ رہی تھی۔ نیا کو خوب اندازہ تھا۔ مگر نیا کے
میں موتی بڑا ہلچل مچا رہا تھا۔ آج نیا بہت بے تاب تھی۔ نیا کی افسردگی کو خانم نے بھی محسوس کر
تھا۔ اسی لئے تو سیدھی ادھر آگئی تھی۔

"ایک بات اور بھی مجھے تم سے کہنی تھی" نیا نے استفسارانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ کبھی کبھی میں گھر پر بزنس ڈنر دیا کرتی ہوں۔ عام طور پر مہینے میں
ایک بار ایسا ضرور ہوا کرتا ہے —— مگر جب سے تم آئی ہو، کام میں اس قدر مصروفیت رہی کہ
میں ڈنر نہ دے سکی۔ اب میں اتوار کی رات کو ڈنر دے رہی ہوں۔ جس میں کاروباری لوگوں کے
علاوہ میرا حلقۂ احباب بھی ہوگا"

"صرف دو تین دن باقی رہ گئے ہیں، انتظام کیسے ہوگا؟" نیا نے حیرت سے کہا۔

"انتظام کون سا مجھے کرنا ہے، وہ تو کسی ہوٹل کے سپرد کردیں گے" اس ڈنر پر کراچی کے ہر
طبقے کے لوگ ہوں گے، یوں سمجھو کہ ہر اہم ہستی مدعو کی جائے گی —— میں چاہتی ہوں اس
رات تمہارا لباس سب سے خوب صورت اور بہترین ہو، اور تمہارا تعارف ایک نئے انداز سے

کرایا جائے ... کیوں کہ بہتر کارکردگی میں —— ہماری کمپنی اپنی مثال آپ ہے"

"میں کیا پہنوں گی خانم؟" نیا نے تردد سے پوچھا۔

"کل" —— خانم کھڑی ہوگئی "کل طے کریں گے، اور بازار بھی چلیں گے اب تم سو جاؤ"

"اچھا —— شب بخیر" خانم نے باہر جانے کے لئے دروازہ کھولا۔

"شب بخیر ....." نیا نے آہستہ سے کہا اور خانم کے جاتے ہی دروازہ بند کرلیا۔

"بزنس ڈنر کیسا ہوگا —— اس روز وہ کیسی لگے گی —— کیا پہنے گی؟" پلنگ پر لیٹتے ہی نیا
کے خیالات کا دھارا اچانک بدل گیا تھا۔

"خانم واقعی بہت بڑی جادوگرنی تھی۔

اس کو خوابوں کی ایک نئی صلیب پر لٹکا گئی تھی۔

اس کے تصور میں پھر آرزوؤں کی کہکشاں بکھر گئی تھی .... دور دور بکھرے ہوئے ——
منتشر ... اور خوابناک ستارے اور بھی خوب صورت لگ رہے تھے اور نیا دور ہوتے
ہوئے ستاروں کو قریب سے دیکھ رہی تھی۔

نیا محفل میں یوں داخل ہوئی جیسے گپ اندھیرے میں کوئی شمع بردار آتا ہے۔ کیونکہ وقت صرف شمع اور شمع کے ہالے میں جو چہرہ ہوتا ہے وہی نظر آتا ہے۔ سب نظریں ہالے میں کھو جاتی ہیں۔ نیا نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ہر آنکھ اٹھی تھی اور پھر جھکی تھی اور ہر دل دھڑکا تھا۔ مگر چونکنے کے انداز میں۔ نیا کو اس بار بھی خانم کی عقل نے خانم نے نیا سے کہا تھا۔ تم تیار ہو کر اس وقت ہال میں داخل ہونا جب تقریباً سب مہمان گے۔ تاکہ ہر ایک سے تمہارا تعارف ایک ہی بار کرا دیا جائے۔ نیا کے لئے کپڑوں کا انتخاب ہی نے کیا تھا۔ سارے بازار میں گھوم کر انہوں نے ایک نیونی بلیو میکسی پسند کی تھی جس سفید تلے اور نقشی کا کام بنا ہوا تھا اور میکسی کا گلا بھی بہت نیچا تھا۔ آگے سے بھی اور بھی۔ نیا ذرا سا گھبرائی تو خانم نے کہا۔

"اپنی خوبصورت صراحی دار گردن میں سفید سچے موتیوں کا نیکلس پہن لینا۔ پھر دیکھنا آفت لگو گی۔" سفید سچے موتیوں کا پورا سیٹ اُسے آج رات خانم نے پہننے کو دیا تھا۔ اپنا سارا میک اَپ آج "پامیلا بارلز" سے کروایا تھا۔ آنکھوں کو سیاہ شیڈ دیتے وقت خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ اس کی اصلی لمبی پلکیں اور خوبصورت ڈارک براؤن آنکھیں زیادہ

ہوں۔ چونکہ کھلے گلے کی میکسی کے اوپر اُس نے خوبصورت گلے کا زیور پہننا تھا اس لئے اس نے آج اونچا سا جاپانی جوڑا بنوایا تھا جس میں پامیلا نے جا بجا سفید موتیوں والی پنیں لگا دی تھیں۔ اپنی صورت دیکھ کر خود نیا دنگ رہ گئی۔ خوبصورت گاؤدم بازو۔ آج ننگے تھے۔ ایک کلائی میں اسٹائلش ڈریس واچ تھی اور دوسری کلائی میں پرانی طرز کا خوبصورت کنگن تھا، جو نیا کی امی جان کے جہیز کی نشانی تھا۔ نیا کو معلوم تھا آج کس طرح چلنا ہے؟ اور کس طرح مسکرانا ہے۔؟ اب اس میں بلا کی خود اعتمادی آ گئی تھی۔ نیا کو پتہ چل گیا تھا کہ حسن ایک بہت بڑی طاقت ہے۔

مکر و فریب اور بارود اور دھوئیں سے بھری ہوئی سفاک اور بے درد دنیا کے پاس۔ بڑی بڑی طاقتیں ہیں، بڑی بڑی آفتیں ہیں۔ مگر عورت کے پاس صرف ایک ہی طاقت ہے جو ان سب پر حاوی ہے وہ چاہے تو دنیا کو بارود کا گولہ بنا دے ـــــ چاہے تو امن کی خوشبو بن کر دلوں میں اُتر جائے اور یہ طاقت حسن کی طاقت ہے۔

نیا یوں محفل میں آگے بڑھی جیسے وہ تاج دار ملکہ ہو، مسکرا کر سب کو یوں دیکھا گویا وہ کوئی دوراں نشے ہو۔ اور ذرا کی ذرا زمین پر اُتری ہو۔ اپنے کندھے برابر رکھ کے یوں قدم اٹھایا جیسے سر پر سیبوں سے بھرا ٹوکرہ رکھا ہو، اِدھر اُدھر سر گھمایا تو وہ گر جائیں گے ـــــ اس کے اسی پُروقار انداز نے ـــــ اور پُر اعتماد نگاہ نے سب کے دل لوٹ لیئے ـــــ

"آؤ نیا آؤ ـــــ" خانم نے مسکرا کر اُس کا سواگت کیا ـــــ تو اُس نے اپنے موتیوں ایسے دانت کھول یوں آداب کیا ـــــ جیسے اپنے دفینے کی بس ایک جھلک دکھانا مقصود ہو ـــــ وہاں بے شمار لوگ تھے۔ مرد و زن ـــــ جوان و بوڑھے ـــــ خواتین و لڑکیاں ـــــ ڈنر سوٹ ڈنر جیکٹ ـــــ بو ـــــ ٹائیاں ـــــ ساڑیاں، میکسیاں ـــــ ٹراؤزرز ـــــ شلوار قمیض، غرارہ پٹی دار پاجامہ ـــــ گویا ڈریس کوڈ نہیں تھا اچھا خاصا فینسی شو تھا ـــــ مگر مردانہ بھی! سگریٹ کی خوشبو ـــــ سنگار کی مہک ـــــ مختلف قسم کے اسپرے ـــــ یوڈی کلون، دیو دورانٹ اور "آؤ بسٹ" کی ملی جلی خوشبوئیں فضا میں بکھری ہوئی تھیں۔ مشروبات بھی آج دھنک رنگ تھے

دور سے تو تمیز بھی مشکل تھی کہ گلاس میں کیا ہے ؟ —— ہوٹل کے دو بیرے سفید لونگی اور سُرخ پگڑیوں میں جیب کے اوپری حصے پر اپنی سنہری نمبر پلیٹ لگاتے مستعدی سے ہر آنے والے کے آگے گلزنگ طشت بڑھا دیتے تھے۔

اس وقت خانم، نیّا کا تعارف ایک فلم پروڈیوسر سے کرا رہی تھی، جب بیرا خبردار ہوا طشت لے کر اس کے آگے جھکا —— نیّا نے بڑے غور سے طشت میں سجے تمام گلاس دیکھے کہ کہیں کوئی غلط گلاس نہ اٹھائے اور پھر بہت سوچ سمجھ کر اس نے ٹماٹر کا جوس اٹھایا۔ سُرخ بھی تھا اور شوخ بھی ——

"یہ میری سیکریٹری ہے نیّا ——" خانم نے ایک گھونٹ بھر کر کہا۔

"خوبصورت ہے۔ ساحل تک جائے گی" ——

"یہ شوقی صاحب ہیں۔ بڑی اچھی فلمیں پروڈیوس کرتے ہیں۔ آپ کی نئی پروڈکٹ کا کیا ہوا؟"

"آج کل ایڈیٹنگ ہو رہی ہے۔ ویسے میں جلد ہی نئی فلم بھی شروع کرنے والا ہوں۔ اس کا نام ہوگا "چاند کی شہزادی"۔ اس کے لئے ایک نئے چہرے کی ضرورت ہے۔ جو بالکل چاند جیسا ہو"

یہ کہہ کر شوقی صاحب نے براہِ راست نیّا کی آنکھوں میں دیکھا —— نیّا نے اپنی ساری مسکراہٹ اپنی آنکھوں ہی میں بھر لی جس سے اس کی آنکھیں اور بھی چمکدار ہو گئیں ..... نیّا نے ان کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ مگر انجان بن جانا چاہتی تھی۔

"یہ ہرجائی صاحب ہیں ہمارے شعلہ بیان شاعر" خانم نے ایک ادھیڑ عمر کے اچکن دار شخص کے پاس رُک کر کہا۔

"بہت خوب غزلیں کہتے ہیں"

"خوبصورت چہرے، خوبصورت غزلوں کا سبب بن جاتے ہیں" ہرجائی صاحب نے اپنا دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"خانم کیسی ہو جان" ہرجائی صاحب نے لہرا کر خانم سے پوچھا۔

"دیکھ لیجئے ۔ جیسی بھی ہوں۔ آپ کے سامنے ہوں ..... "

"اور ہمیشہ کی طرح آنکھوں میں کھُب رہی ہو" اس پر زوردار قہقہہ پڑا۔

"ارے بیکل صاحب! کیوں بیکل بیکل پھر رہے ہیں۔ اِدھر آئیں ہماری نیّا سے ملیں ——" موٹی کھوٹی شکل والے خوش پوش آدمی کو دیکھ کر چلّائی۔

"نیّا یہ بیکل صاحب ہیں۔ اور اب بے کلی ان کی فطرت بن چکی ہے۔ کیونکہ یہ ہمیشہ حسین چہروں میں رہتے ہیں۔ یہ ٹی وی پروڈیوسر ہیں"

"یہ کون محترمہ ہیں ؟" انہوں نے آنکھیں جھپک جھپک کر نیّا کو کئی بار دیکھا اور کہا —— "انہیں پہلی بار آپ کی محفل میں دیکھ رہا ہوں"

"اب آپ انہیں اکثر ہماری محفل میں دیکھا کریں گے۔ اور دفتر میں بھی —— یہ میری پرسنل اسسٹنٹ ہیں"

"واہ کیا خوبصورت اضافہ ہے، دفتر میں ——"

"آپ کو معلوم ہے، میں ایسے دفتری اضافے کرتی رہتی ہوں"

"جواب ہو تم اور بے مثال کام کرتی ہو" بیکل صاحب واقعی جھوم گئے۔

"حال کیا ہو رہا ہے بیگم ——" بہت روشنی نظر آ رہی ہے" سردار صاحب اپنی باری کا انتظار کر سکے اور خود ہی اِدھر آ گئے۔ نیّا نے ان کو پہچان لیا۔ گو ان کی پہچان ان کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اس کے علاوہ بھی ان کی تصویر تقریباً روز کسی نہ کسی اخبار میں چھپتی تھی۔ اور ساتھ میں ایک قصہ ہوتا تھا —— ڈنر سوٹ میں بڑے بانکے لگ رہے تھے۔ شاید مونچھوں کو کوئی بڑھیا کلر کیا تھا جبھی تو سر کے بالوں سے زیادہ کالی نظر آ رہی تھیں۔

"سردار جی! یہ میری نئی لڑکی ہے" خانم نے جب یہ کہا تو نیّا کو خانم کا یہ انداز بہت عجیب لگا۔ اس نے دیکھا —— سردار صاحب کی نگاہ اُس کے چہرے پر گئی تو تھی مگر پھر گریبان میں ہی گئی۔ یکایک نیّا کو اُلجھن سی ہونے لگی۔ اسے صاف پتہ تھا، کہ آج اس کا گریبان دلکش

چغلیاں کھا رہا ہے ـــــ مگر سردار صاحب کی نگاہ کا بار بار گریبان کے گرد منڈلانا مجھے
نہیں لگ رہا تھا ـــــ اس نے اپنے کندھے اُچکائے ـــــ جیسے سردار صاحب کی نگاہ کو
بھگانا چاہتی ہو ـــــ مگر سردار صاحب کی نگاہ ڈھیٹ کوّا بن گئی تھی ـــــ اِدھر سے بھگاؤ
بیٹھتا ہے ـــــ اُدھر سے بھگاؤ ـــــ تو پھر اِدھر آجاتا ہے ـــــ اس میں ان کا کیا قصور
نیّا نے جلدی سے سوچ لیا۔ قصور تو اس لباس کا بھی نہیں۔ قصور سارا خواجہ عبدالرحیم
کے سسٹم سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ـــــ وہاں قدوسی صاحب بھی
وہ صحافی تھے ـــــ پھر سیٹھ جاوید بھائی بھی وہیں آگئے۔ وہ نیّا سے دو چار دفعہ پہلے بھی مل چکے
اس لئے انہیں کھُلم کھُلا نثار ہونے کا حق پہنچتا تھا ـــــ نیّا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کراچی کی بڑی بڑی
مشہور و معروف ہستیاں وہاں موجود تھیں۔ بہت سے لوگ اپنی بیگمات کو ساتھ لائے تھے۔
مگر اپنی اپنی ـــــ کارروائی میں یوں مگن تھے، جیسے بیگمات کے ساتھ گھر سے ہی سمجھوتہ کر کے
ہوں۔ سارے مرد اور خواتین یوں مِل جُل کر بیٹھے اور کھڑے تھے جیسے شیر و شکر ہوں۔ لیکن کچھ
ایک دائرہ بناتے کھڑی تھیں اور کافی نمایاں لگ رہی تھیں۔ نیّا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ تمام
خُوش پوشاک اور زندہ دِل خواتین بھی مردوں کی طرح وسیع القلب اور وسیع النظر تھیں اور یہی
خیال تھا کیونکہ عورتیں تو عورتوں کی تعریف کرنے میں بخل سے کام لیتی ہیں، جبکہ مرد تعریف کرتے
لحاظ کی حدود سے بھی گزر جاتا ہے۔

نیّا کا جب عورتوں سے تعارف کرایا گیا تو انہوں نے بھی جی بھر کے نیّا کی تعریف کی
اندام خاتون جنہوں نے براتے نام ساڑھی پہن رکھی تھی اور جنہیں لوگ 'جوجو' کہہ کر بلا رہے تھے
کے بالکل قریب آکر بولیں۔

"او مائی گارڈ ـــــ اتنا خوبصورت فیگر اور وہ بھی یہاں ـــــ ایسا لگتا ہے، جیسے
تمہیں فرصت کے لمحوں میں بنایا ہے ایسی فیاضی قدرت سے کبھی بھُول کر ہو جائے تو
ـــــ ورنہ عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتی۔" نیّا نے جب اپنی ـــــ بھولی بھالی نظریں

آنکھوں میں ڈالیں تو وہ ننھّا سا جھنجھناتا ہوا قہقہہ لگا کر بولیں۔

"میں نے تو یہ دیکھا ہے ـــــ جس عورت کا چہرہ بہت خوب صورت ہوتا ہے اس کا جسم
بے ڈھب ہوتا ہے اور جس کو قدرت جسم بہت خوبصورت عطا کرتی ہے، وہ حسین چہرے سے
محروم ہو جاتی ہے۔ پھر چہرے اور جسم کے ساتھ آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ تم دُنیا کی خوش قسمت
ترین عورت ہو نیّا ـــــ لیکن ایسا نہ ہو کہ تمہیں زمانے کی نظر لگ جائے ـــــ" نیّا پر ایک جادو
سا چھا گیا ـــــ

"کالا ٹیک نہ لگا سکوں تو 'جوجو' کو ساتھ رکھا کرو۔" دوسری خاتون نے فِقرہ چُست کیا۔ نیّا نے
گھورے 'جوجو' کی طرف دیکھا، نہ صرف یہ کہ وہ سانولے رنگ کی تھی، اس نے ساڑی بھی سیاہ پہن
رکھی تھی ـــــ اس پر خواتین نے ایک بے باک سا قہقہہ لگایا۔ جیسے بے شمار پائلیں ایک ساتھ بج
اُٹھی ہوں۔ اس قہقہے پر مردوں نے پلٹ کر عورتوں کی طرف دیکھا، اور کچھ تو اس طرف چلے بھی
آئے ـــــ کہ اِن کے خیال میں یہاں قہقہوں کی سوغات تقسیم ہو رہی تھی۔

"کوئی بھی مرد تمہارا غلام ہو سکتا ہے ـــــ" 'جوجو' نے ہنسنے کے بعد کہا۔ "اور یہ دیکھو ثبوت
کے طور پر سب اِدھر ہی مُنہ اٹھائے چلے آرہے ہیں۔" اس نے آنے والے مردوں کی طرف دیکھ
کر کہا ـــــ وہاں پر خانم کی ایجنسی کے تمام لوگ بھی تھے اور کراچی کی مشہور و معروف ماڈل گرلز بھی
تھیں۔ انہوں نے نیّا سے ذرا سا بھی حسد محسوس نہیں کیا، بلکہ اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ ماڈلنگ شروع
کرے تو اس لائن کی ساری لڑکیوں کو پیچھے چھوڑ جائے گی۔

نیّا صرف مُسکراتی رہی ـــــ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ آج کی تقریب کی مہمانِ خصوصی ہو ـــــ
کہ یہی نظروں کا مرکز تھی ـــــ اور وہی گفتگو کا موضوع بھی! ابھی تک اسے یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا
کہ اس کی منزل کہاں ہے؟ اُسے کہاں تک جانا ہے؟ ـــــ اس کی تقدیر کی مہار کس کے ہاتھ
میں ہے ـــــ؟ جب لوگ زمین کی بات کرتے تھے تو وہ آسمانوں پر پہنچ جاتی تھی۔

"یہ جمالی صاحب ہیں، سپنا میگزین کے ایڈیٹر ـــــ" اچانک خانم ایک جوان سے اسمارٹ

آدمی کو ساتھ لے کر آئی۔ جس نے عینک لگا رکھی تھی۔

"یہ دیر سے آئے ہیں۔ کیونکہ اِن کو ایک اور پارٹی بھی بھگتنی تھی۔"

"اچھا۔۔۔۔ اچھا"۔۔۔۔ نیّا نے نظر بھر کر جوان آدمی کا جائزہ لیا "سپنا" میگزین اسے بہت پسند تھا۔ دنیا بھر کی خوبصورت تصویریں۔۔۔۔ ملبوسات کے ڈیزائن۔۔۔۔ خوبصورت کہانیاں۔ اور نجانے کیا کچھ تھا اُس میں ــــ جمالی صاحب نے بڑے انہماک سے عینک کے شیشوں سے نیّا کا جائزہ لیا، اور بڑی میٹھی میٹھی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر، بڑی انکساری سے بولے۔

"اگر آپ مجھے اعزاز بخشیں تو ایک بات کہوں؟"

"ضرور کہیئے ــــ"

"سپنا" کے ٹائیٹل کے لئے اپنی ایک تصویر عنایت فرما کر میرا سر فخر سے اُونچا کر دیجیئے۔"

"جی ــــ"۔۔۔۔ نیّا کو یقین نہیں آیا۔ اُس نے "سپنا" کے ٹائیٹل پر خوبصورت عورتوں کی تصویریں تو دیکھی تھیں، مگر اسے کبھی یقین نہ آیا تھا کہ وہ عورتیں اسی دنیا کی باسی ہیں ــــ چمکتے چہرے ــــ چکنے کندھے ــــ خمار آلود گریبان ــــ بے تاب ہیرے جیسی آنکھیں، لافانی مسکراہٹیں ــــ چھلکتی جوانیاں۔۔۔۔ یہ عورتیں نہیں مے کے پیالے تھیں ــــ گھنٹوں وہ اِن تصویروں کو دیکھا کرتی تھی۔۔۔۔ اور بارہا اس نے چشمِ تصوّر میں اپنے آپ کو اُن عورتوں کی جگہ پر محسوس کیا تھا۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اب جو اتنی بڑی پیش کش ملی تو جی ہی جی میں اِترانے لگی۔ غرور اور بے نیازی کو اپنے لہجے میں سمو کر بولی۔

"میں ذرا بھی فوٹو جینک نہیں ہوں۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیئے ــــ" وہ اور بھی زیادہ جُھک کر پوری انکساری سے بولا "اس کیمرے کی آگ لگا دوں گا جو آپ کی شبیہہ نہ اُتار سکے، میرا خیال ہے ایسی سُندر تصویر میرے رسالے میں آج تک نہ چھپی ہوگی، اور مجھے یقین ہے کہ ایک تصویر سے ہی اس رسالے کی سرکولیشن بڑھ جائے گی۔"

"جی ــــ یہ تو محض آپ کا خیال ہے۔"

"خیال نہیں ــــ یقین ہے ــــ" وہ اپنی آنکھوں میں بالآخر اپنی التجا سمیٹ لے آیا تھا۔

"پھر میں کل، دولت خانے پر حاضری دوں؟"

"ابھی تو میرا کوئی دولت خانہ نہیں"۔۔۔۔ جب کوئی ٹھکانہ میرا ہو گیا، آپ کو اطلاع دے دُوں گی۔"

"نوازش!" جمالی صاحب نے اپنا سر احتراماً جُھکایا، اور پھر جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر نیّا کی طرف بڑھایا۔

"آپ کا فون نمبر تو رسالے پر بھی ہوتا ہے۔" نیّا نے کارڈ پکڑے بغیر کہا۔

"رسالہ تو لاتعداد افراد خریدتے ہیں، مگر ہر ایک کے فون کا ہمیں انتظار نہیں ہوتا ــــ یہ کارڈ محض یاددہانی کے لئے ہے۔" نیّا نے سنہری حروف والا سفید کارڈ لے کر اپنے ایوننگ پرس میں ڈال لیا۔

"یہ ہمارے شہر کے سب سے بڑے مصوّر ہیں۔" خانم ایک سائیں بابا جیسے آدمی کو پکڑ لائی، لمبی لمبی سادھوؤں جیسی جٹائیں ــــ سفید کُرتا جس کا گریبان بٹنوں سے آزاد ــــ حیدرآبادی پاجامہ ــــ دُبلا پتلا ــــ نحیف و نزار ــــ آنکھوں کے گرد بڑے بڑے سیاہ حلقے ــــ اور ــــ ہونٹ سکوڑ کر اُس نے نیّا کی طرف دیکھا، تو پھر آنکھیں جھپکانا بھول گیا، اس کی لمبی لمبی پتلی پتلی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ ہولے ہولے کانپ رہا تھا ــــ انگلیوں کی پوریں دُھواں زدہ تھیں ــــ اور اس کے ہاتھ اور پتلی پتلی انگلیاں صاف چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ فن کار ہے۔ وہ اٹک اٹک کر بولتا تھا۔ یا تو ہمیشہ سوچ کر بولتا تھا۔ یا بولنے کے بعد سوچتا تھا ــــ یا الفاظ کی تصویر بنا کر بولتا تھا ــــ

"بہت سی صُورتیں ہم نے دیکھی ہیں اور بنائی بھی ہیں ــــ مگر جب کوئی حسین صورت دیکھتے ہیں تو نئے سرے سے اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے، واقعی سب سے بڑا مصوّر وہی ــــ ہے!"

ان کی بات سن کر سب نے قہقہہ لگایا، نیّا کو اس نئے انداز میں اپنی تعریف سن کر ایک سرور سا محسوس ہوا، اِن کا تخلص شرارتی ہے۔" خانم نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر کہا۔ وہ بچوں کی طرح ہنسا ــــ

"میں پیتا نہیں۔ مگر بدنام ہوں۔"

"پھر تو آپ کو اپنا تخلص بدنام رکھنا چاہیئے تھا" نیا نے برجستہ کہا۔

"یہاں ایک صاحب ہیں، جن کا تخلص ہے رسوا۔ بھیڑ میں انہیں پکڑ کر لاتی ہوں" میں غائب ہوگئیں۔

"آپ نے کبھی تصویر بنوائی ہے؟" شرابی نے براہِ راست نیا سے پوچھا۔

"جی نہیں"

"شوق ہے"

"کبھی سوچا ہی نہیں"

"اگر سوچ لیں، تو مجھے خدمت کا موقع دیں، میرا اسٹوڈیو سوسائٹی میں ہے۔ عنقریب میری تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے" اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی جیب میں سے اپنا کارڈ نکال کر نیا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ہم تصویر بناتے وقت عموماً اپنے تخیل سے کام لیتے ہیں، جب کبھی آپ جیسا شاہکار نظر آئے تو اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگتا ہے، جی چاہتا ہے، آپ کی تصویر بناؤں اور دیکھوں مصوری رنگوں کی آمیزش سے آپ کیسی لگتی ہیں؟"

"شکریہ ——" نیا نے ہنس کر کہا "کبھی جی چاہا تو آپ کو زحمت ضرور دوں گی" اتنے میں فاخر ایک بے ڈھب سے آدمی کو پکڑ کر لے آئیں ——

"یہ ہیں جناب رسوا —— یہ ہمارے فلمی ادیب ہیں کبھی کبھی ہمارے لئے بھی اسکرپٹ لکھتے ہیں ——"

"آپ رسوا کیوں ہیں؟" نیا نے اتنی معصومیت سے پوچھا کہ ساری محفل زعفران زار بن گئی۔ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا" رسوا صاحب جھوم کر بولے۔

"آپ اگر آج سے بارہ سال پہلے مل جاتیں، تو ہمیں رسوائی کا جواز مل جاتا"

اتنے میں کھانے کا بلاوا آگیا —— سب لان کی طرف چل پڑے —— مختلف الانواع خوشبوؤں

مرغن کھانوں سے میزیں بھری ہوئی تھیں۔ اور سب کی بھوک انتہا کو پہنچ چکی تھی —— اپنی اپنی پلیٹ، اپنی اپنی اشتہا کے مطابق سجا کر سب چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئے —— کھانے کے دوران جوڑوں کو بدل جانے کا موقع بھی مل گیا۔ بیکل صاحب بھی اپنی پلیٹ لے کر نیا کے قریب آگئے .... بڑی نفاست و نزاکت سے سلاد اور چکن روسٹ کا ایک پیس لئے کھڑی ادا سے کھا رہی تھی۔

"آپ نے کبھی ڈرامے میں کام کیا ہے؟" آتے ہی بیکل صاحب بولے۔

"جی نہیں"

"شوق ہے"

"جی نہیں"

"تعجب ہے"

"جی وہ بھی نہیں" اب نیا زور سے ہنس پڑی۔

"تعجب تو مجھے ہو رہا ہے"

"کیوں؟"

"آپ جیسی لڑکی کو ٹی وی پہ چانس ضرور لینا چاہیئے"

"آپ کا خیال ہے چانس لینے میں ہی زندگی تمام کر دینی چاہیئے" نیا بولی۔

"زندگی بھی تو ایک چانس ہے" بیکل صاحب نے فلسفہ بگھارا۔

"اگر زندگی چانس ہے تو میرے خیال میں یہی ایک چانس غنیمت ہے۔ دوسرا کوئی چانس نہیں لینا چاہیئے" بات سنجیدہ ہونے لگی تھی اس لئے بیکل صاحب نے ہی تیزی سے موضوع بدل دیا اور بولے۔

"میں آج کل ایک نیا ڈرامہ پروڈیوس کرنے والا ہوں" انہوں نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور نیا کے ہاتھ میں تھما دیا .....

"یہ کیا لین دین ہو رہا ہے بھئی . . . ." شوقی صاحب بھی اُن کے قریب آ گئے۔

"پیشے میں آپ میرے رقیب ہیں۔ اس لئے آپ دُور رہیں۔" بیکل صاحب نے ہنس کر کہا۔

"اس واسطے کہ ہم دونوں ہی اچھے چہروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔" شوقی صاحب بولے۔

"اور آپ نے میرے کئی اچھے چہرے اُڑائے ہیں۔ اس لئے میں آپ سے خفا ہوں۔" بیکل صاحب بولے۔

"میں نے تو ان چہروں کو بڑے سکرین پہ پیش کر کے اُنہیں شہرتِ دوام بخشی ہے۔" شوقی صاحب زندہ دلی سے مسکرائے۔ جانے کیوں ان لوگوں کی باتیں سُن کر نیّا کو یوں لگا جیسے وہ گزشتہ کی دوکان پر بھاؤ کر رہے ہوں —— وہ وہاں سے کھسک گئی۔ سیٹھ جادو بھائی تو سارا وقت نیّا کے اِرد گرد ہی گھومتے رہے —— گو وہ سردار صاحب جتنے چرب زبان نہیں تھے، کیونکہ وہ جاتے جاتے بھی سردار صاحب نے خانم کو مخاطب کیا، لیکن نیّا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"خانم ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا —— کافی عرصے سے تم نے کسی کام کے لئے نہیں کہا ——" تو خانم معنی خیز انداز میں ہنس پڑی۔

"حضور کی بندہ نوازی سے ہی تو میرے دن گزر رہے ہیں ——" یہ محفل کہیں رات کے دو بجے برخاست ہوئی تھی، اور جاتے جاتے بھی لوگوں نے تین بجا دیئے تھے —— نیّا نے جب اپنے کمرے میں آ کر پرس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا تو آئینے میں اپنا سراپا دیکھے بغیر نہ رہ سکی —— دلکش و بصورت چہرہ نیند کی تپش سے تمتما رہا تھا —— آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے —— اور ہلکی سی نمی ان کو دو آتشہ بنا رہی تھی اور نیند کے خمار سے جسم ٹوٹ رہا تھا —— بے شمار چبھتی ہوئی نگاہیں . . . اس کے اکیلے پن کے احساس کو ختم کر رہی تھیں ——

رازداں اپنے نظر آتے ہیں ہر سمت مگر
پھر بھی تنہائی کا احساس بھری محفل میں

رات کا آخری حصہ بھی ختم ہو رہا تھا، مگر اُسے تو جیسے ایک لمبی رات کا احساس ہی تھکا رہا تھا —— اس نے گلے میں پڑا ہوا سچے موتیوں کا نیکلیس بڑی احتیاط سے اتارا —— اور اسی طرح کانوں کی بالیاں اور انگوٹھیاں اتارنے لگی . . . . یہ زیورات صبح اسے شکریہ کے ساتھ خانم کو واپس کرنے تھے . . . . . اس نے پرس کھولا، تاکہ سب کچھ اس کے اندر رکھ دے —— پرس کے کھلتے ہی —— بے شمار وزیٹنگ کارڈ اِدھر اُدھر بکھر گئے —— نیّا نے انہیں اُٹھا کر جمع کر لیا اور گنتی کی تو وہ دس کارڈ تھے —— اس نے انہیں ڈریسنگ ٹیبل پر یوں پھیلایا، جیسے وہ تاش کے پتے ہوں —— اور کوئی بھی بازی کھیلنے کے کام آ سکتے ہوں —— یہ دس کارڈ نہیں —— دس اشارے تھے —— دس راستے تھے —— دس نشان تھے —— دس اسباب تھے . . . . . انگڑائی لے کر وہ ڈریسنگ ٹیبل سے ذرا دُور ہو گئی۔ ہاتھ پیچھے کر کے اپنا زپ کھولا —— اور ان کارڈوں کو دوبارہ اس طرح دیکھنے لگی . . . . جیسے وہ کوئی پہیلی بوجھنا چاہتی ہو —— کوئی انعامی معمّہ حل کر رہی ہو۔

نیا نے خانم کے کمرے میں قدم رکھا تو دیکھا وہاں دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازے پر ہی رُک گئی ـــــ پچھلے ہفتے سے خانم نے نیا کو الگ کمرے میں بٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ضرورت کے وقت وہ نیا کو بلا لیتی تھی ـــــ

"آؤ نیا ـــــ" خانم نے اسے دروازے پر رُکتے دیکھ کر اندر بلایا۔ اور خود ایک آدمی کی "پُل" کو دیکھنے لگی۔ نیا قریب آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ خانم کی میز پر بہت سے پوسٹ کارڈ سائز "سیل" پڑے تھے۔ نیا انہیں اٹھا کر دیکھنے لگی۔ گتے کے فریم میں ایسی اشتہاری تصویریں جو اکثر پرچون کی دکانوں یا بڑے بڑے اسٹوروں میں نظر آتی ہیں..... ان دو تصویروں میں ایک صابن اور ایک ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار تھے۔ دو اشتہاری لڑکیاں خوبصورت تھیں۔ صابن والی لڑکی کے چہرے پر پسینے کے جو قطرے دکھائے گئے تھے، وہ بالکل حقیقی معلوم دے رہے تھے اور ٹوتھ پیسٹ والی لڑکی کے دانت بہت خوبصورت تھے ـــــ

"اب دنیا میں ہر شے بکتی ہے ـــــ" نیا نے دل میں سوچا ـــــ دانت خوبصورت ہوں تو انہیں کا سودا ہو جاتا ہے ـــــ آنکھیں خوبصورت ہوں تو انہیں کوئی خرید لیتا ہے۔ ہونٹ خوبصورت ہوں تو اِن کی قیمت لگ جاتی ہے ـــــ ناک خوبصورت ہو تو نہ لے

گی کے لئے دھر لی جاتی ہے۔ پہلے زمانے میں، حُسن مکمل اور مجسم ہوتا تھا ـــــ مگر اب ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے۔ قدرت بخیل ہو گئی اور انسان سخی ہو گیا ہے جو ان چہرے پر اگر ایک تل بھی خوب صورت ہو تو ـــــ مارکیٹ میں اُس کے دام لگ جاتے ہیں۔

یہ دُنیا تو محض سوداگروں کی دنیا ہے ـــــ

یہاں خرید و فروخت کا کاروبار ہوتا ہے ـــــ

ازل سے ہوتا آرہا ہے ـــــ

البتہ ہر دور میں اس خرید و فروخت کے عنوان ضرور بدلتے رہتے ہیں اور اب اِسے "پبلسٹی" کا نام دیا جاتا ہے اور یہ مُسکراتی ہوئی لڑکیاں ـــــ رُوپ چھلکاتی ہوئی ـــــ تبسم کو بکھیرتی اٹھلاتی یہ لڑکیاں کل ہر دوکان پر لٹکی نظر آئیں گی۔ بکرے کے گوشت کی طرح ـــــ

"فلسفہ نہ بگھارو ..... نیا بیگم"..... اس کے ذہن نے کہا۔ "اصل میں تم ان سے حسد محسوس کر رہی ہو ـــــ ..... تمہارے کچے خواب ابھی اور جاگنا چاہتے ہیں"۔ اِسی وقت خانم نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ نیچے رکھ دیا، اور سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف دیکھ کر بولی ـــــ

"دلاور صاحب! آپ اپنا کام شروع کر دیں، سائز میں نے آپ کو بتا دیا ہے اور بورڈ کہاں کہاں نصب کرنے ہوں گے یہ فیصلہ بعد میں کر لیں گے"۔

"بہت اچھا خانم ـــــ" اُس آدمی نے بڑی سعادت مندی سے جواب دیا۔

"یہ دلاور صاحب ہیں نیا ـــــ" خانم نے نیا سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "ان کو اکثر ہم "ہورڈنگ" کا ٹھیکہ دیتے ہیں۔ عرصے سے ہمارے لئے کام کر رہے ہیں۔ اِن سے اچھے ٹھیکیدار بورڈ شہر میں کوئی نہیں بناتا"۔

"نوازش ہے آپ کی خانم ـــــ" دلاور صاحب کھڑے ہو گئے۔ "میں پھر حاضر ہوں گا"۔ پھر اُس نے جُھک کر خانم کو اس طرح خدا حافظ کہا، جیسے کہ کورنش بجا لایا ہو اور باہر نکل گیا۔ پھر خانم دوسرے آدمی سے مخاطب ہوئی۔

"یہ پوائنٹس بھی میں نے دیکھ لئے ہیں، بہت اچھے ہیں۔ آپ انہیں ڈسکس کیجئے۔"

"بہتر ہے خانم ——— وہ آدمی آداب بجا لا کر چلا گیا، اس کے بعد خانم اپنے آفس کی طرف متوجہ ہوئی جو بھیگی بلی بنا ایک کونے میں بیٹھا تھا۔

"اظفر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہارے کام کی رفتار اتنی سست کیوں ہو گئی ہے؟ مہینہ ہو گیا ہے اور تم ابھی تک پریشر کُکر والوں کے لئے کوئی آئیڈیا نہیں دے سکے۔"

"خانم میں نے آپ کو تین چار آئیڈیاز دیئے تو تھے۔"

"جو انتہائی لغو اور بے ہودہ تھے۔ ذرا سوچو بازار میں پہلے سے کئی پریشر کُکر موجود ہیں اور ان کی کافی پبلسٹی ہو رہی ہے۔ ان کے لئے تو ہمیں اسپیشل آئیڈیا پبلسٹی کرنی ہو گی۔ جب تک کہ اشتہار بازی میں دوسروں کو BEAT نہ کریں اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ جتنے بھی خیال تم بنا کر پیش کئے ہیں۔ کم و بیش وہ سب دہرائے جا چکے ہیں۔ کوئی فریش آئیڈیا دو ——— بنا منظر پر لاؤ ———"

"میں پھر سوچوں گا خانم ———"

"یہ کام ایک ہفتے کے اندر اندر ہونا چاہیئے اظفر ———" خانم نے قدرے غصے سے کہا۔ "ہمارے ہاں کام سُست رفتاری سے بالکل نہیں ہوتا۔۔۔ ایک ہفتے میں اگر تم آئیڈیا نہ پیش کر سکے ——— تو تمہاری ترقی روک دی جائے گی اور یہ کام کسی دوسرے آدمی کے سپرد کر دوں گی۔ ہمیں کُند ذہن لوگ نہیں چاہئیں ——— ہمیں ذہین اور بجلی کی طرح تیز لوگ درکار ہیں۔"

"بہت اچھا خانم ———" اظفر منہ لٹکا کر کھڑا ہو گیا اور میز پر بکھرے ہوئے اپنے کاغذات سمیٹ کر باہر نکل گیا۔

"حد ہو گئی ہے" ——— خانم ابھی تک غصے میں تھی۔ "وہ ہمارے پرانے کلائنٹس ہیں۔ ان واسطے خاموش ہیں، مگر ان کا حال دیکھو ——— لاپرواہی سے کام کر رہے ہیں۔ شہر میں اور بھی

ایجنسیاں ہیں۔ مگر ہمارا نام اُونچا ہے۔ کیونکہ ہماری کارکردگی ہمیشہ اعلا رہی ہے۔ ہمارے کی اساس دیانت داری پر ہے۔ اسی واسطے لوگ ہم سے رجوع کرتے ہیں، میں چاہتی کام جانفشانی سے کیا جائے ——— محنت کی جائے ——— وقت اور پیسہ خرچ کیا ——— مجھے سیکنڈ کلاس کام ——— اور سیکنڈ کلاس آئیڈیا کبھی اپیل نہیں کرتا۔"

"خانم ———" نیا جو سوچوں میں گم تھی، ایک دم بول اُٹھی۔ "خانم یہ جو لوگ اس قدر زیادہ پبلسٹی پر پیسہ خرچ کرتے ہیں، اور اس پر اتنا زیادہ پیسہ خرچ کرتے ہیں، تو اس سے ان کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔" خانم نے پُرانداز میں مُسکرا دی اور سگریٹ نکال کر سلگانے لگی۔ ایک لمبا سا کش لے کر۔۔۔ اس نے دھواں چھوڑا ——— اور پھر اُسی زیرِ لب تبسم سے بولی۔

"پبلسٹی پر اُن کا پیسہ خرچ نہیں ہوتا۔۔۔" دوسرا کش لے کر دوبارہ دُھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے اپنا فقرہ مکمل کیا۔ "ہمیشہ خریدار کا پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ راز کی بات ہے کسی کو بتانا نہیں۔"

"اچھا ———" نیا جیسے حیرتوں کے سمندر میں ڈوب گئی۔

"اس پبلسٹی پر جو کچھ خرچ آتا ہے، وہ قیمتِ خرید میں سے اُسے وصول کر لیتے ہیں۔ بعض ——— ہم لوگ پیکنگ خوبصورت بنا دیتے ہیں یا کسی پیکنگ کے اندر کوئی پنسل یا چمچہ دیتے ہیں اور نہیں تو بچوں کے لئے کوئی کھلونا رکھ دیتے ہیں تو اس کا خرچ بھی کسٹمر کی جیب سے آتا ہے۔"

"اچھا خانم ———" نیا نے اور بھی حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر پبلسٹی کسٹمر کی کاسٹ پر ہوتی ہے تو پھر اچھی چیز نہیں ہے ——— اس کا رواج کیوں پڑا۔۔۔۔" خانم ہنس پڑی۔

"ایسی بات نہ کہو۔۔۔ ورنہ ہم جیسی ایجنسیاں تو دیوالیہ ہو جائیں، نیا یہ دَور پبلسٹی کا دور ——— اشتہار بازی کا دَور ہے ——— SENSATIONALISM کا دور ہے ——— جس کی جتنی آواز بلند ہوتی ہے، وہ اتنی دُور تک جاتی ہے۔ تجارتی و صنعتی دُنیا میں تو یہ ایک جزو لازم بن چکی ہے۔ کوئی بھی کاروبار اشتہار بازی کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ یہ

ایک ایسی دوڑ ہے جس میں سب کو شامل ہونا پڑتا ہے۔"

اشتہار بازی کا مقصد کیا ہوتا ہے؟" نیّا جیسے آج ہی سب کچھ سیکھنے کا تہیہ کئے ہوئی تھی۔

اصل مقصد تو راتے عامہ ہموار کرنا ——— یا بے وقوف بنانا ہوتا ہے۔ لوگوں کو اس کی ضرورت کا احساس اس طرح دلایا جائے کہ پیسہ خود بخود اس کی جیب سے نکل پھر ایک ہی طرح کی چیزوں کے بے شمار کارخانے ہوتے ہیں اور ہر صنعت کار کی اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کی چیز زیادہ سے زیادہ فروخت ہو۔ جس چیز کی نفسیات اور معاشیات کے اصولوں کے مطابق ماہرانہ انداز میں کی جاتی ہے اسی طرف لوگ بھاگ پڑتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں ——— جب کبھی ہمارے ہاں "سیزنل سیل" کے اشتہار لگتے ہیں تو خلقت کا رُخ اسی جانب ہوتا ہے ——— اور کے دنوں میں ناقص اشیاء بھی نکل جاتی ہیں ——— کیونکہ اس کی پبلسٹی ایسے خوبصورت میں کی جاتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں واقعی سب چیزیں سستے داموں بک رہی دوکان دار صرف شرح منافع کم کر دیتے ہیں۔"

"اچھا ———" نیّا کو اس مرتبہ اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔

"اور پھر ہمارے پاس بے شمار MEDIAS ہیں"۔ خانم پھر گویا ہوئی۔ پرنٹ ——— ٹی وی ——— فلم ——— ساری دنیا میں بے شمار کمرشل سروسز چلتی ہیں۔ اگر ہوتا ہے کہ انہیں گھر بیٹھے پتہ چل جاتا ہے کہ کون سی چیز کہاں مل رہی ہے؛ ہر ردم میں بیٹھے بیٹھے وہ اتنی مرتبہ ایک چیز کے بارے میں سُنتے ہیں کہ اُن کے شے کی گونج سی رہ جاتی ہے ——— اور جب ضرورت پڑتی ہے تو وہ صدائے ان کو لاشعوری طور پر اسی چیز کی طرف لے جاتی ہے، بار بار . . . خوبصورت خوبصورت چہروں کا سہارا لے کر خریدار کی خواہش اور ضرورت کو اکسایا جاتا ہے

مجھے ایک قصہ یاد آگیا ——— پچھلے سال میں لندن میں تھی، اور اُن دنوں لندن میں "سیل" سیزن تھا۔"

"اچھا ——— وہاں بھی "سیل" لگتی ہے خانم؟" نیّا نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں پگلی یہ ساری بدعتیں وہیں سے آتی ہیں ——— "جولائی اور اگست میں سارے یورپ میں "سیل" لگتی ہے ——— انھی دنوں بے شمار ٹورسٹ آتے ہیں اور پھر دسمبر سے پہلے یہ دوکان اپنا سارا پرانا مال نکال دیتے ہیں تاکہ کرسمس سے پہلے اپنی دکانیں نئے اور جدید مال کے سامان سے دوبارہ بھر لیں . . . . ہاں تو میں تمہیں بتا رہی تھی ——— آکسفورڈ سٹریٹ میں ایک کھلونوں کی دوکان کے آگے سے گزری تو دیکھا ——— "سیل" کے بڑے بڑے بورڈ لگے ہیں۔ وہاں شوکیس میں مجھے اپنی چھوٹی بیٹی کے لئے ایک کھلونا نظر آگیا ——— جسے میں لینے گئی ——— جب میں کھلونا لے کر باہر نکلی تو شام کے سات بج چکے تھے ——— سب دوکانیں تقریباً بند ہو چکی تھیں اور کھلونے کی اس دکان کی خریداری بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی صرف لوگ باہر نکل رہے تھے جو بہت پہلے اندر جا چکے تھے ——— اس کے باوجود دکان کے باہر بھیڑ بڑھ رہا تھا ——— اور کچھ لوگ فرش پر یوں بیٹھے تھے جیسے رات بھر رہنے کا تہیہ کر کے آئے ہوں ——— اُن میں سے ایک شریف آدمی سے میں نے پوچھا ——— "بھائی دکان تو بند ہے، تم یہاں کیوں براجمان ہو؟" اُس نے "سیل" کے بورڈ کی طرف اشارہ کیا اور بولا ——— "کل صبح آٹھ بجے اس دکان پر "سیل" شروع ہو جائے گی۔ اگر میں پانچ منٹ بھی لیٹ ہو گیا تو لائن کا کیو اس قدر لمبا ہو جائے گا کہ مجھے ڈر ہے، میری مطلوبہ چیزیں میرے اندر پہنچنے سے پہلے فروخت ہو جائیں، اس لئے میں آج رات یہیں دوکان کے باہر بسر کروں گا تاکہ دوکان کھلتے ہی سب سے پہلے میں اندر داخل ہو سکوں۔ صبح ہونے تک میرے اور بھی ساتھی یہاں آجائیں گے۔"

"لیکن اس سارے تردد کا تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟"

"واہ ——" وہ ہنسا —— "میں یہاں سے گیمز کا کچھ سامان خریدنا چاہتا ہوں، گھڑیاں سیٹ اگر خرید لوں —— تو اس میں مجھے پورے دس پونڈ کا نفع ہوگا —— کیونکہ دوسرا وہ خاصا مہنگا بک رہا ہے —— اسی طرح میں جو بھی چیزیں یہاں سے سستے داموں خرید باہر نکل کر مہنگے داموں فروخت کر دوں گا۔"

"اس طرح کا کاریز ہوتا ہے لوگوں کو 'سیل' کے معاملے میں۔"

"کمپنیاں پبلسٹی پر پیسہ بھی تو بے دریغ خرچ کرتی ہیں۔" نیتا نے بڑے پتے کی بات

"کمپنیوں کو اپنی گرہ سے کچھ بھی نہیں خرچ کرنا پڑتا —— اگر وہ یہ پیسہ اشتہار بازی پر گی تو ٹیکس میں دینا پڑے گا —— سو ایک پنتھ دو کاج ہو جاتے ہیں ——"

"خانم آپ کو یہ اتنا ڈھیر سارا تجربہ کیسے ہوا؟" خانم زور سے ہنس پڑی۔

"تمہیں یہ سوال اتنی دیر بعد پوچھنے کا خیال کیوں آیا، دو چار سال تم میرے ساتھ رہ میں تم سے پوچھوں گی کہ تجربہ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟" اصل میں، میں شادی سے پہلے ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتی تھی۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تو یونہی الجھنوں میں گزر گیا۔ مجھے امریکہ میں دو چار سال رہنے کا اتفاق ہوا، تو وہاں بھی میں یہی کام کرتی رہی، بلکہ وہاں تو ماڈلنگ بھی کی تھی ....."

"پھر یہاں کیوں نہیں کی؟"

"اس زمانے میں یہاں ٹی وی نہیں تھا، اور ماڈلنگ کا بھی رواج نہیں تھا، پھر جب مستقل طور پر پاکستان آ گئی تو یہاں بھی دو تین اچھی ایجنسیوں میں، میں نے نوکری کی تھی..... اس طرح میرے اندر ایک ولولہ سا پیدا ہوا کہ اگر میں دوسروں کے لئے کام کر سکتی ہوں تو کیوں نہیں چلا سکتی۔" نیتا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر بھی ایک نیا جذبہ دھیرے سر اٹھا رہا ہے۔ وہ اپنے اس جذبے کو دبا کر بولی۔

"شروع شروع میں مشکلات تو پیش آتی ہوں گی؟"

"آتی تھیں۔" خانم نے بہادری سے جواب دیا۔ "کون سا ایسا کام ہے جس میں ابتدائی مشکلات نہیں ہوتیں .... اور پھر جب کوئی عورت کاروباری میدان میں قدم رکھے، تو لاتعداد سماجی چاروں طرف سے سر اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو کوئی عورت کی صلاحیتوں کو مانتا ہی نہیں ..... اپنے آپ کو منوانا پڑتا ہے —— صدیوں کے بنے ہوئے فرسودہ طلسم پاش پاش کرنے پڑتے ہیں —— بڑی جان ماری کرنی پڑتی ہے۔ نفس کشی اور ڈھٹائی دکھانی پڑتی ہے —— تب کہیں جا کر پاؤں جمتے ہیں۔ لوگ قدم قدم پر حوصلے پست کرنے والے داؤ کھیلتے ہیں، کیونکہ اس ملک میں تو یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ عورت پیدائشی طور پر ناقص العقل ہوتی ہے —— میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں نے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں۔ اس مقام تک پہنچنے کے لئے —— ہاں ایک بات تسلیم کرنی پڑے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ابتدا میں کچھ اچھے دوستوں کا تعاون مل گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں کاروبار میں دیانت داری کی قائل ہوں۔ کوئی بھی ایسا کاروبار جس کی بنیاد دیانت پر نہ رکھی گئی ہو کبھی پروان نہیں چڑھتے۔ مجھے درجۂ دوم قسم کے کام —— اور درجۂ دوم کے ہتھکنڈے کبھی پسند نہیں آتے۔ پیسہ لیتی ہوں تو جان مار کے کام کرتی ہوں، اللہ کے فضل سے ہماری ایجنسی نمبر ایک جا رہی ہے۔ ہمارے کئی مستقل کلائنٹس ہیں .... بعض کلائنٹس کے لئے ہم مستقل کام کرتے رہتے ہیں، اور وہ اپنی سہولت کے مطابق ہمیں پیسے ادا کر دیتے ہیں ہم پر جبر و تشدد نہیں کرتے ہیں۔ ہم ان پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہمارے کئی اشتہار اتنے زبان زدِ عام ہوئے کہ وہ لائف لائن آف سلوگن قرار دیئے گئے۔"

"ہر فیلڈ میں تو آپ نہیں جا سکتی تھیں، پھر آپ کو ہر فیلڈ میں کامیابی کیسے ہوئی؟"

"اصل میں ٹیلنٹ کی دیوانی ہوں۔ جہاں کہیں غیر معمولی ذہن یا باصلاحیت افراد کو دیکھتی ہوں پتہ نہیں کیسے کھنچ کر اس کے پاس آتی ہوں، خواہ اس کے لئے مجھے کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ اب تم کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بہت ذہین ہو مگر تمہاری صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں ..... تو میں نے سوچا تمہاری صلاحیتیں بھی اجاگر کر دوں —— اور ان سے خود بھی فائدہ

اٹھ گئیں۔"

"خانم! میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھول سکوں گی۔"

"چھوڑو یار! کیا لغو بات کہہ دی تم نے ـــــ ابھی تو میں نے تمہارے سامنے کچھ کیا نہیں۔" تھوڑی دیر نیا چپ رہی ـــــ پھر بولی،

"خانم آپ میرے کام سے مطمئن ہیں؟"

"بہت مطمئن ہوں۔" خانم نے جلدی سے کہا۔ "اگر مطمئن نہ ہوتی تو اتنی جلدی تمہاری ترقی بھی نہ ہوتی۔"

"میرا اور بھی لگن اور محنت سے کام کرنے کو جی چاہتا ہے خانم ـــــ میرا جی چاہتا ہے کچھ اور بھی کروں۔۔۔ کچھ اور ـــــ کچھ آگے ـــــ" بس اسی لگن کو جذبہ کہتے ہیں۔ جو انسان AMBITIOUS نہ ہو دُنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اپنے اس جذبے سے مزید کام

"اس کے علاوہ میں اور کیا کروں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"پورا میدان تمہارے سامنے ہے ـــــ جس طرف چاہو رُخ کرلو خود بخود ترقی کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔" ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اُن کا میڈیا منیجر صفدر آگیا۔ اُس نے کچھ کاغذات پکڑے ہوئے تھے۔ جن پر مختلف قسم کے اسکیچ تھے اور ان کے نیچے بے شمار فقرے لکھے ہوئے تھے۔ اجازت لے کر بیگ صاحب ایک کرسی پر

"یہ کیا ہے ـــــ؟" خانم نے پوچھا

"یہ میں نے "شاہانہ جیولرز" کا اشتہار بنایا ہے، آپ ذرا دیکھ لیں۔" خانم نے ان کاغذات کو دیکھنے لگی۔ غور سے پڑھ لینے کے بعد خانم نے وہ اشتہار نیا کی طرف بڑھا دیا۔

"تم بھی دیکھ لو نیا کہ یہ اشتہار کیسا لگتا ہے؟" نیا کاغذات کو بڑے انہماک سے دیکھنے اور پڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے خاموشی سے کاغذات میز پر رکھ دیئے۔

"کیوں کیسا لگا؟" خانم نے پوچھا۔

"اچھا ہے ـــــ" نیا نے آہستہ سے کہا۔

"برا خیال ہے تم کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہو۔" خانم نے اصرار کیا۔

"ہاں۔۔۔" نیا سوچنے کے انداز میں بولی، "زیورات کے اَن گنت اشتہارات سُننے اور دیکھنے میں آئے ہیں اس لئے اب اِن میں ایک نئی تبدیلی اور جدّت کی سخت ضرورت ہے۔"

"تم ہی کچھ بتاؤ؟" خانم نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ یعنی کہ میں۔" نیا ہنس پڑی۔ جیسے کہ خود اپنا مذاق اُڑا رہی ہو۔

"ہاں ہاں۔۔۔ سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں زیورات کا کس قسم کا اشتہار زیادہ اپیل کرے گا؟"

"مگر میری پسند سب کی پسند تو نہیں ہو سکتی؟"

"تمہاری پسند ایک فرد کی پسند تو ہو سکتی ہے نا؟"

"جی ہاں" ـــــ

"تو اس کا جائزہ لیں گے کہ کتنے آدمیوں کو وہ اپیل کر سکتی ہے۔؟"

"میں سوچ کر بتاؤں گی۔" نیا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "مگر آپ مجھے یہ تو بتا دیں کہ اشتہار بناتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

"صرف وقت کا ـــــ کہ وقت کی قیمت ادا کی جاتی ہے۔" پھر خانم نے بیگ صاحب کی طرف دیکھ کر کہا ـــــ "اچھا بیگ صاحب آپ چلیں، میں آپ سے پھر گفتگو کروں گی۔" صفدر صاحب اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ نیا صفدر صاحب کی لکھی ہوئی عبارت کو غور سے پڑھنے لگی۔

عام طور پر ٹوتھ پیسٹ کی ٹی وی پر زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کی پبلسٹی فلم چلائی جاتی ہے بعض اوقات اُس ایک منٹ کے حصّے بخرے کر لئے جاتے ہیں اور ہم اسے (REPEAT) (PUBLICITY) کہتے ہیں۔ تیس سیکنڈ، پندرہ سیکنڈ اور سات سیکنڈ کے ٹکڑے بھی دکھائے جاتے ہیں۔ زیورات کا یہ اشتہار جو ہم بنانا چاہتے ہیں۔ اس میں چونکہ کوئی ماڈل گرل دکھانا مقصود نہیں صرف دیدہ زیب زیورات کی تصاویر کے ساتھ ایک دلکش چہرہ ہوگا ـــــ اور دُوکان

کا نام و پتہ لکھا ہوگا ـــــ اِس کے ساتھ چند خوبصورت فقرے کہلوائے جائیں گے جو صرف سات سیکنڈ ہوگا ـــــ اس لئے سارا زور بیان صرف عبارت پر ہوگا یا عبارت کی ادائیگی پر ہوجاؤں ـــــ"

"خانم ـــــ میں کوشش کروں گی" نیا جلدی سے بولی۔ "ضروری نہیں کہ میں کامیاب ہوجاؤں ـــــ"

"جب تم خلوصِ دل سے کوشش کروگی تو انشاءاللہ کامیاب بھی ہوجاؤ گی۔ یہ کام اب تم ہے" کاغذ سمیٹ کر نیا کھڑی ہوگئی ـــــ

"اور ہاں" ـــــ خانم جیسے یاد کرتے ہوئے بولی۔

"فون پر سردار صاحب مہتیں دو تین بار پوچھ چکے ہیں ـــــ کیا خیال ہے؟"

"میں کیا کہوں خانم ـــــ؟"

"بھئی وہ ہمیں ڈنر پہ بلانا چاہتے ہیں۔ چلوگی؟"

"اگر آپ ہمراہ ہوں تو چلی چلوں گی"

"اچھا تو میں دن اور وقت طے کرلوں گی۔ مجھے اُن سے ایک کام بھی ہے، جو اُن کے سوا کوئی نہیں کرسکتا ـــــ"

"لیکن آپ جانتی ہیں خانم ـــــ اب امی آگئی ہیں اور میں رات کو زیادہ دیر تک باہر نہیں رہ سکتی"

"تو لنچ کا وقت لے لیں گے"

"جیسے آپ کی خوشی ـــــ" نیا نے تابعداری سے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ نیا کو جب نیا دفتر سے گھر جانے کے لئے نکلی تو ایک نئی سوچ سے اس کا ذہن بوجھل تھا۔

امی جان اور موتی کو کراچی آئے چار ماہ ہوچکے تھے۔ نیا کو اپنا فلیٹ بہت پسند آیا تھا۔ دو بیڈ روم ـــــ ایک ڈرائینگ ڈائننگ ـــــ اور ایک کچن روم اسٹور کے ساتھ تھا اور ان تینوں کے لئے یہ فلیٹ بہت کافی تھا۔ شروع میں تو کوئی خاص سامان نہیں تھا اور اُنہوں نے ضرورت کی چند چیزیں کرائے پر لے لی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ ـــــ نیا نے گھر کا فرنیچر خرید لیا تھا۔ اور اب گھر بھی مکمل گھر لگتا تھا۔ ایک بیڈ روم اُس نے امی جان اور موتی کو دے دیا تھا اور دوسرا بیڈ روم اپنے لئے رکھا تھا ـــــ

دفتر کا ڈرائیور صبح اُسے لے جاتا اور شام کو گھر چھوڑ آتا تھا ـــــ ایک تو اس کا فلیٹ دفتر سے دُور بہت تھا، دوسرے وہ ابھی تک کراچی کے راستوں سے واقف نہیں ہوئی تھی، اسی لئے بسوں کے چکّروں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ ڈرائیور نے اُسے اُس کے فلیٹ کے باہر اتار دیا۔ پرس ہلاتی وہ دوڑ کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اسے طمانیت کا احساس ہوا۔ موتی دوڑتا ہوا آیا اور نیا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ نیا نے اُسے دونوں بازوؤں میں پکڑ کر اٹھایا اور پھر اپنے سینے سے لگا کر چُوم لیا۔ امی جان حسبِ عادت بالکنی میں یوں کھڑی تھیں جیسے بجھی ہوئی موم بتی شمع دان میں رکھی ہو۔ نیا کی طرف ایک سرسری نگاہ پھینک کر اُنہوں

نے پھر سڑک کی جانب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ نیچے انسانوں کا اژدہام تھا۔ بے شمار ٹانگیں
اَن گنت سر ـــــ ٹانگیں جو مسلسل چلتی رہتی ہیں اور سیاہ سر جو مسلسل ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
موٹروں، ٹیکسیوں ـــــ رکشاؤں، سائیکلوں اور ٹراموں کے بیچ میں بے خطر گھومتے پھرتے
اللہ کے بندے ـــــ جن پر موسموں کا تغیر و تبدل کوئی اثر نہیں ڈالتا، جو چلنے کے لئے
ہیں ـــــ زمین کی ہر آفت اور نفس کی ہر شرارت کا مقابلہ کرتے ہیں ـــــ اور جیتے
ہیں . . . اللہ کے یہ بے شمار بندے ـــــ اللہ کی پھیلی ہوئی بیکراں زمین پر ـــــ
نیا، امی جان کو سوچوں کی الگنی پر چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی، اور موتی بھی اس کے پیچھے پیچھے
ـــــ موتی اب چار سال کا ہو گیا تھا، اور نیا نے اسے نرسری اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ وہ
کی بدولت داخلہ بھی بڑی جلدی مل گیا تھا۔ صبح کو دفتر جاتے وقت نیا اسے اسکول چھوڑ جایا کرتی
تھی، مگر دوپہر کو وکیل صاحب کا ڈرائیور اسے بھی لے آتا تھا۔ وکیل صاحب نیا کے ہمدرد
اور ان کی ایک بچی بھی موتی کے اسکول میں پڑھتی تھی۔ نیا سے ملنے کے بعد یہ ذمے داری انہوں نے
خود ہی قبول کر لی تھی۔ نیا جب پلنگ پر لیٹ گئی تو موتی دوڑ کر اس کے سینے پر چڑھ گیا۔

"آج اسکول میں کیا پڑھا تھا میرے بچے نے؟"

"اے۔ بی۔ سی ـــــ" موتی نے سر اٹھا کر جلدی سے کہا اور پھر سر نیا کے سینے پر رکھ دیا۔

"اے۔ بی۔ سی ہی سارے فساد کی جڑ ہے"، نیا نے سوچا ـــــ آگہی کا پہلا دروازہ کھول کر ہم
بچے کو اذیتوں کے سمندر میں ڈال دیتے ہیں ـــــ جاننا ـــــ جانتے رہنا ـــــ جان لینا ـــــ
کھوجنا ـــــ کھوجتے رہنا ـــــ کھوج لینا ـــــ نہ پانے کا دکھ ـــــ اور جان لینے کا کرب۔
کتنی معصومیت سے ہم کتنا بڑا جرم کرتے ہیں۔ مکتب کی پہلی لاٹھی تھامنے کے بعد آدمی علم کی
بیساکھیوں کا محتاج ہو جاتا ہے ـــــ کہاں ہوتی ہے اس کے علم اور تجسس کی انتہا ـــــ کوئی
نہیں جانتا ـــــ ہم اُس کی جہالت ـــــ لاعلمی ـــــ اور سچی خوشی اس سے چھین لیتے
ہیں۔ ہم ازلی غاصب ہیں۔

"ممی . . . ممی . . ." موتی نے پھر سر اٹھایا۔ "مس کہتی ہے تمہارا نام ہے فضیل خان۔
تو فضیل ہی ہے۔ سکول کا نام ہی اصلی نام ہوتا ہے۔"

"ممی اسکول کا نام اصلی نام کیوں ہوتا ہے؟" موتی بڑا تیز بچہ تھا اور اس کی زبان حیرت انگیز
طور پر صاف تھی۔

"اس لئے کہ ـــــ اس لئے کہ" ـــــ نیا پھر لاجواب ہو گئی۔ "موتی تو آپ کا پیار کا نام ہے
ـــــ بیٹا آپ کو اسکول اچھا لگا؟" اُس نے بات پلٹ دی۔

"مجھے تو موتی اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا میں اسکول کی مس سے کہہ دوں گی کہ تمہیں موتی کے نام سے بلایا کریں۔"

"نما . . . نما . . ." موتی نے اپنا رخسار نیا کے رخسار پر رکھ دیا اور بولا۔

"نما . . . مس کہتی ہیں بچوں کو اپنے ڈیڈی کا نام اپنے نام کے ساتھ لکھنا چاہیئے۔" نیا
دل ایک دم سے دھڑک اٹھا وہ یوں اُٹھ کر بیٹھ گئی جیسے کسی نے جادو کی چھڑی سے اٹھا
ہو ـــــ

"نہ ـــــ موتی ـــــ میں کپڑے بدل لوں ـــــ"

"پہلے مجھے ڈیڈی کا نام بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ وہ ابھی تک آئے کیوں نہیں؟" جب سے
نیا نے ہوش سنبھالا تھا، نیا اسے ہمیشہ بتاتی تھی کہ تمہارے ڈیڈی بہت دور گئے ہوئے
ہیں، ایک دن ڈھیر سارے کھلونے لے کر آئیں گے ـــــ! نیا کھڑی ہو گئی۔ اس کو معلوم تھا
کہ ایک ایسے لمحے ضرور آئیں گے، مگر یہ لمحے ذرا جلدی آ گئے تھے ـــــ ان لمحوں سے اُسے
ڈر لگتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ موتی کو ہوش آنے سے پہلے وہ کوئی جواب تلاش کر لے گی ـــــ
مگر موتی اس کے ہر اندازے سے زیادہ ذہین ثابت ہو رہا تھا۔

"دیکھو موتی میں تمہارے لئے ٹافیاں اور چاکلیٹ لائی ہوں۔" اس نے اپنا پرس کھولا

اور ساری ٹافیاں اور چاکلیٹ اُس کے آگے ڈھیر کر دیں۔ اِسی وقت امّی جان دروازے پر
کی طرح نمودار ہوئیں اور بولیں۔ چائے پیو گی نیّا؟"

"نہیں امّی ——" نیّا نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ "میں نے آج دفتر میں پی لی تھی۔ تو ٹی
لو —— میں ابھی کپڑے بدل کر آتی ہوں۔" وہ غسل خانے میں چلی گئی —— نیّا کا معمول
بدل کر وہ شام کو کافی دیر تک موتی کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔ شام کو وہ باہر جانا پ
تھی اور کوشش بھی یہی کرتی کہ دفتر کے تمام کام چار بجے سے پہلے پہلے نبٹا لے ——
کا کھانا اس نے موتی کو اپنے ہاتھ سے کھلایا —— نیّا سے بہت سی باتیں کر کے اور سکول کا
ورک ختم کرنے کے بعد موتی تھک ہار کر سو گیا۔ پہلے تو نیّا بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی ——
چھت کو مسلسل گھورتی رہی —— پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی . . . پرس میں سے وہ تمام کاغذات
جو خانم نے اسے دیئے تھے —— انہیں پھیلا کر دیکھا۔ بار بار پڑھا —— سوچا —— اور
قلم لے کر اس نے کچھ لکھنا شروع کر دیا —— بار بار لکھتی —— اور پھر کاٹ دیتی ——

نیّا ابھی دفتر میں آ کر بیٹھی تھی کہ جمالی صاحب آ گئے۔ وہ "سپنا" کے ایڈیٹر تھے —— اور کئی
بار نیّا کو فون کر چکے تھے۔ نیّا جانتی تھی وہ کیوں آتے ہیں ——؟ فون پر نیّا کا رویہ بے نیازانہ رہا۔
اور دفتر میں بھی۔ شاید نیّا کو پتہ چل گیا تھا کہ آگ کیسے بھڑکائی جاتی ہے۔ آگ لگانا اتنا مشکل
نہیں جتنا بھڑکانا مشکل ہے۔

"تشریف رکھیئے ——" نیّا نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نے آپ کو کئی بار فون کیا —— مگر آپ سے ملاقات کا وقت نہیں لے سکا تو آج سوچا
خود حاضری دوں اور اپنی التجا پیش کروں۔"

"بڑی نوازش ہے آپ کی ——! دراصل میں دفتر میں اتنی زیادہ مصروف ہوں کہ کسی کے
لئے بھی وقت نہیں نکال سکتی۔" نیّا نے بہانہ تراشا۔

اپنی مصروفیت میں سے کچھ غیر اہم کاموں کے لئے بھی وقت نکالنا کارِ ثواب ہے۔" ابھی
نیّا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ نیّا نے ریسیور اٹھا لیا اور کچھ دیر تک بات کرتی
رہی —— پھر ریسیور رکھ کے اُس نے جمالی کی طرف یوں دیکھا —— جیسے اُس کی بات سرے سے
بھول گئی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ حرفِ مدّعا دوبارہ زبان پر لائے۔

"میرے میگزین کا ایک "خصوصی نمبر" نکل رہا ہے جسے ہم سالِ رواں کا "فیشن نمبر" کہہ
میرا ایمان ہے کہ آپ کی شرکت کے بغیر یہ نمبر نامکمل رہے گا۔"

"میں کس طرح شرکت کر سکتی ہوں جناب؟" نیّا نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے

"اتنی کسرِ نفسی سے کام نہ لیجئے حضور میں نے سوچ لیا ہے، کہ اس کے سرورق
کی ہی تصویر چھپے گی۔ اور اندرونی صفحات میں آپ کا مفصل تعارف آئے گا۔"

"بھئی میری تصویر اور میرا تعارف آخر کس سلسلے میں چھپے گا۔ یہ باتیں تو مشہور و معرو
ادبی اور فلمی شخصیتوں کی چھپتی ہیں۔"

"ایک وجہ اور بھی ہوتی ہے؟"

"کیا؟" نیّا نے اپنی خمار آگیں آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"حُسن بے مثال۔" جمالی صاحب نے اس طرح برجستہ کہا کہ نیّا چھینپ گئی۔ مگر
کر خوشی بھی ہوئی کہ اس کے حُسن کو بے مثال کہا جاتا ہے۔ خوشی و مسرت کے احساس
نے بات بنانے کے لئے کہا۔

"یہ شہر تو حسینوں سے بھرا پڑا ہے۔"

"جب تک آپ اس شہر میں نہیں آئی تھیں، سب حسین تھے۔"

"اور اب کیا ہوا ہے؟"

"سب نے اپنی انگلیاں کاٹ لی ہیں۔" نیّا بڑے خوبصورت انداز میں ہنسنے لگی۔

"آپ کو معلوم ہے میرا رسالہ ہمیشہ خوبصورت اور نوخیز لڑکیوں کو متعارف کراتا رہا ہے
میں اپنے ریڈرز کو ایک شاہکار دکھانا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا شاہکار ——"

"لیکن مجھے اس سے کیا حاصل ہوگا؟" نیّا نے پوچھا۔

"APPRECIATION"..... یعنی تحسین —— خلقِ خدا کا خراج —— چاہتیں
وارفتگی —— پسندیدگی ——"

"آپ جانتے ہیں۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔" نیّا نے ذرا بنتے ہوئے کہا۔

"آپ کو نہ سہی ہمیں تو ضرورت ہے۔"

"تو کیا آپ آج تہیہ کر کے آئے ہیں؟"

"جی —— وہ تو میں نے عرض کر دیا نا؟ —— میں حُسن کے آگے بھیک مانگنا اور گڑگڑانا عیب
نہیں سمجھتا —— خاشق مزاج اور حُسن کا ساتھ دینے والا آدمی ہوں، اور آج آپ سے ہاں کرائے بغیر ٹلوں
انہیں ——"

"کس بات کے لئے؟"

"پہلے تو آپ مجھے تصویروں کے لئے وقت دیں گی، اور جگہ کا خود انتخاب کریں گی۔ اگر آپ
اپنے گھر پر تصویریں کھنچوانا چاہیں تو میں اپنا فوٹو گرافر لے کر آجاؤں گا۔ ملبوسات آپ کی پسند کے
ہوں گے۔ اگر آؤٹ ڈور میں تصویریں کھنچوانا ہو تو اپنی چوائس بتائیں۔ میں LOCATION کا
بندوبست کر دوں گا۔ کراچی کے مضافات —— یا ساحلِ سمندر پر....." نیّا مسلسل ہنستی
رہی ——

"آپ کے گھر پر فون ہے؟"

"نہیں جی ——" نیّا نے کہا —— "فون ایک دردِ سری ہے۔ خانم نے تو کہا تھا مگر میں نے
لگوایا نہیں —— وہ جو چند گھنٹے آرام کے مل جاتے ہیں اُن سے بھی محروم ہو جاؤں گی۔"

"پھر تو آپ میرے ساتھ آج ہی معاملہ طے کریں اور پہلے تصویروں کا وقت دیں ——"

"پھر ——"

"پھر ایک دن مانگوں گا انٹرویو کے لئے —— آپ دن اور تاریخ خود بتا دیں۔"

"پھر ——؟" نیّا نے قلم دانتوں تلے دبا کر ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔

"پھر میں شہر میں ایک دھماکہ کروں گا۔ ہاں ایک بات ابھی سے کہہ دوں آپ کو اپنا دفاع
کرنا ہوگا۔ بعد کا ذمے دار میں نہیں ہوں۔"

"یہ آپ میرے ساتھ دوستی کر رہے ہیں یا دشمنی؟"

"ایک روز آپ اعتراف کریں گی، کہ میں نے آپ کے ساتھ بڑی نیکی کی تھی۔"

"خیر۔" نیا نے کافی منت و سماجت کروالی تھی اس لئے جی جان سے رضامند ہو گئی۔ پھر بولی۔

"اگلے ہفتے میں آپ کو کوئی تاریخ دوں گی پ کا مقصد خانم سے بات کرنی ہے؟"

"ضرور کریں۔ میں بھی خانم سے سفارش کرا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" نیا فائل اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ جمالی صاحب بھی کھڑے ہو گئے۔

"اجازت ہے"۔۔۔ انھوں نے جھک کر یوں اجازت مانگی جیسے نیا کوئی ملکہ عالم ہو۔ وہ اس کا ادنیٰ سا درباری۔ اس کے جانے کے بعد نیا خانم کے کمرے میں چلی گئی۔

"خانم آپ نے کاغذات دیکھ لیے؟"۔۔۔

"بیٹھ جاؤ نیا۔" خانم نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارا آئیڈیا مجھے بہت پسند آیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ مجھے تو بے حد اپیل کرتا ہے اور ۔۔۔۔ نے اسے APPROVE بھی کر دیا ہے۔"

"اچھا۔ ۔ ۔ ۔ اچھا خانم۔" نیا خوش ہوتے بولی۔

"میں نے اس پہ کام کرنے کو کہہ دیا ہے۔ میرا خیال ہے چلے گا۔۔۔ تمہارے چاروں فقرے بہت چست اور خوبصورت ہیں۔۔۔ ہمارے پاس ایک بہت ہی دلکش آواز والی لڑکی ہے۔۔۔۔ میں نے کہا ہے کہ یہ چاروں فقرے اسے دے دیئے جائیں۔ تاکہ وہ ریہرسل کر لے۔

"ویسے ہم نے تھوڑی سی تبدیلی کر لی ہے۔۔۔ یعنی ہر فقرے کے ساتھ ایسی تصویر دکھائیں گے جو خود بخود فقرے کی وضاحت کرتی ہو۔۔۔" تم نے چار فقرے لکھے تھے۔

شادی بیاہ کی کوئی یادگار تقریب ہو۔۔۔۔

زندگی کا کوئی جاوداں لمحہ ہو۔۔۔۔

مسرتوں کا کوئی حیات بخش موڑ ہو۔۔۔۔

یا۔۔۔۔

دل کے اتھاہ پیار کو زبان دینا مقصود ہو۔۔۔۔

ایسے میں "شاہانہ جیولرز" کے زیورات سے بڑھ کر حسین و بے مثال تحفہ کوئی نہیں!

شادی بیاہ والے فقرے کے ساتھ ہم سہرے پہ دولہا دولہن کی تصویر دکھائیں گے۔۔۔۔

زندگی کا جاوداں لمحہ۔۔۔ بچے کی پیدائش کو کہیں گے۔۔۔۔

مسرتوں کا کوئی حیات بخش موڑ۔۔۔۔ منگنی کی تقریب دکھائیں گے۔

اور دل کے اتھاہ پیار کو۔۔۔ ایک نوجوان آدمی کی صورت میں دکھائیں گے۔۔۔ جو ایک خوبصورت لڑکی کو تحفے کے طور پر "شاہانہ جیولرز" کی ڈبیا پیش کرے گا۔

"کیوں کیسا خیال ہے؟۔۔۔"

"خانم بالکل ٹھیک ہے خانم۔۔۔" نیا اس طرح خوش ہو رہی تھی۔ جیسے زندگی کے پہلے امتحان میں اول آئی ہو۔

"نیا تمہاری ایک اور صلاحیت سامنے آئی ہے۔ جس سے مجھے بے حد خوشی محسوس ہوئی ہے۔۔۔ اب ایسا کرو۔ "بے مثال پرفیکشن گلوبل" والوں کا اشتہار بھی تم ہی بنا ڈالو۔"

"میں خانم۔۔۔ میں۔۔۔" اس مرتبہ نیا کے لہجے میں خوشی زیادہ اور حیرت کم تھی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیونکہ بیگ صاحب کے آئیڈیے مجھے پسند نہیں آئے۔ تم جوان ہو۔۔۔ دلولوں سے لدی ہوئی ہو۔۔۔ کوئی نیا خیال۔۔۔ کوئی نیا فقرہ لاؤ۔"

"ٹھیک ہے خانم۔۔۔" نیا کے دل میں واقعی جوش اٹھا۔ اور ساتھ وہ خود بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"نیا میں نے کل دوپہر کے لئے سردار صاحب کو وقت دے دیا ہے۔ کل لنچ کے لئے۔ اگر آپ کی مرضی خانم۔۔۔"

"کل دوپہر یہیں دفتر سے چلیں گے ....." نیّا اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ ابھی ہرجائی صاحب آگئے۔

"تکلیف کی معافی چاہتا ہوں"۔ وہ آتے ہی دھپ سے اُس کے سامنے کرسی پر گر پڑے۔

"خیریت ہے ہرجائی صاحب"۔ آج نیّا بہت خوش تھی اس لئے خوش دلی سے بولی۔

"سب خیریت ہے۔ آج خانم نے بلوایا تھا۔ سوچا آپ کے نیاز بھی حاصل کر لوں۔ ہرجائی صاحب شاعر تھے اور جب کسی اشتہاری فلم کے لئے کچھ شعر موزوں کرنا ہوتے تو خانم ہرجائی صاحب کے ساتھ معاہدہ کر لیتی تھی۔

"چائے منگواؤں آپ کے لئے؟" نیّا نے پوچھا۔

"نہیں چائے میں باہر بیگ صاحب کے ساتھ پی چکا ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا جاؤں گا"۔ نیّا سر جھکا کر اپنا کام کرنے لگی۔

"ہمارے جیسے سر پھرے لوگوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ہم کوئی حسین صورت کے طور پر ضرور دیکھیں ——"

"اچھا ہرجائی صاحب! آپ کی عبادت حسین صورت میں پوشیدہ ہے؟"

"خداوند کریم کی صناعی پوشیدہ ہوتی ہے حسین صورت میں!"

"خداوند کریم کی صناعی کی تو ساری دنیا ہی مظہر ہے"۔ نیّا نے کہا۔

"لیکن اچھا شعر ہمیشہ اچھی صورت دیکھ کر ہوتا ہے"۔

"اِس وقت کون سا شعر ہوا ہے؟"

"مرصع غزل کے سامنے تو کوئی شعر نہیں اترے گا۔ گھر جا کے جب یہ صورت تصور میں آئے گا، تو پھر شعر خود بخود نازل ہوتے جائیں گے"۔

"دیکھئے کوئی غلط دعویٰ نہ کر بیٹھئے گا —— جنون کا مقدر تو سُولی ہوتی ہے"۔ دونوں ہنسنے لگے۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی نیّا نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف جمالی تھا۔

"آپ نے فرمایا تھا۔ اِس ہفتے مجھے وقت دیں گی۔ میری تقدیر جاگی یا نہیں؟"

"میں نے خانم سے بات کی تھی۔ اُنہوں نے مجھے اجازت دے دی ہے"

"انہوں نے ازراہِ عنایت مجھے بھی اجازت دے دی تھی"۔

"ہفتے کا دن کیسا رہے گا ——؟" نیّا نے سامنے پڑے کیلنڈر پر سُرخ رنگ کا گول دائرہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"بسر و چشم منظور"۔ جمالی صاحب جلدی سے بولے۔

"میں آپ کو آپ کے گھر سے پک کر لوں؟"

"میں اپنے ملبوسات لے کر دفتر آجاؤں گی۔ یہیں سے بارہ بجے چلیں گے۔ مگر جانا کہاں ہوگا؟" پوچھا۔

"میں نے ایک خوبصورت جگہ ڈھونڈ لی ہے" —— جمالی نے ہنس کر کہا۔

"تو ٹھیک ہے ——"

"شکریہ، نوازش ——" نیّا نے ریسیور رکھ دیا۔

"میں اب چلتا ہوں۔ ہرجائی صاحب بھی کھڑے ہو گئے ——"

"آپ کی مرضی ہے ہرجائی صاحب!"

"یہاں سے اُٹھنے کو کس کا مگر دل چاہتا ہے۔ مگر آج کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ پھر کسی وقت تازہ غزل کے ساتھ آؤں گا"۔

"اور مجھے ہمہ تن گوش پائیں گے"۔ ہرجائی صاحب باہر نکل گئے تو نیّا نے پھر کاغذ نکال لئے۔ اُسے خیال آیا تھا کہ ابھی "بے مثال پریشر ککر" والوں کا اشتہار بنا ڈالوں —— ذہن میں فقروں کی آمد ہو رہی تھی۔ جیسے پت جھڑ میں ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے بھی سارے پتے جھڑنے لگتے ہیں، اُس نے تیزی سے کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا اور شام کو جب وہ دفتر سے اٹھ کر جانے لگی تو ایک مربوط سی عبارت کاغذ پر بنا ڈالی تھی۔

"جب کھانے کی خوشبو باورچی خانے سے باہر نکلتی ہے۔ تو گھر والا، دوڑ دوڑ کر
اندر آتا ہے ——"

ایسے لذیذ اور اشتہا انگیز کھانوں کی ضمانت ——

"بے مثال پریشر ککر ——"

بنانے والے —— بے مثال انڈسٹریز، لانڈھی کراچی"

نیا جب اس عالی شان ہوٹل میں داخل ہوئی۔ توری سیشن کی طرف سے ایک بیرا بڑی
ی سے یوں آگے بڑھا جیسے وہ نیا کا ہی انتظار کر رہا تھا —— اس نے جھک کر نیا سے
۔اور پھر ایک کاریڈور کی طرف اشارہ کیا۔ نیا اُس کی طرف چل دی۔ . . . بیرا بڑے ادب
س کے پیچھے پیچھے چلنے لگا —— ایک کمرے کے باہر بیرے نے رک کر نیا کو اندر جانے
شارہ کیا. . . . .

نیا کچھ جھجکتی ہوئی —— کچھ سوچتی ہوئی ناک (KNOCK) کر کے اندر داخل ہو گئی —— وہ
اور لڑکی تھی، اس لئے بیرے کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی۔ کہ کم عقل ہے —— یا نو وارد
—مگر اسے حیرت ضرور تھی۔ بیرا اسے ڈائننگ ہال کی بجائے بیڈ روم میں لے آیا
—اس گلی میں قطار اندر قطار یوں بیڈ روم بنے ہوئے تھے —— جیسے مقابلہ حسن میں
بھی قد و قامت کی اَن گنت حسینائیں. . . . برائے نام سا لباس پہنے کھڑی ہوں۔
ہال داخل ہو کر —— وہ ذرا سا رُک گئی —— چاروں طرف دیکھا —— سامنے صوفے پر
رصاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ان کے آگے کھانے کی گول میز لگی ہوئی تھی۔
آؤ نیا —— "سردار صاحب کھڑے ہو گئے —— "میں تمہارا ہی انتظار

کر رہا تھا۔" نیّا نے آگے جا کر آداب کیا۔ اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے بعد اس
بوجھلاہٹ سی طاری ہو گئی۔ اِس وقت کمرے میں وہ دونوں تھے ــــ اور میز پر اِن
دو آدمیوں کے لگے تھے۔ نیّا کو اختلاج سا ہونے لگا ــــ کمرہ اُسے پراسرار
دلآویز مگر بھیانک نظر آنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بات کرے ــــ خانم
تھا۔ اس کو معلوم بھی تھا کہ اِن بڑے لوگوں سے کیسے بات کرتے ہیں ــــ نیّا کو
باتیں کر لیتی تھی۔ مگر تنہائی میں اس کی زبان کو چُپ لگ جاتی تھی۔ اور خانم کو بھی آج
ضروری کام کرنا تھا ــــ ابھی ایک گھنٹہ قبل خانم اِس کے کمرے میں آئی تھی اور اس نے
جلدی نیّا کو بتایا تھا۔ "مجھے ایک ضروری کام نکل آیا ہے اس لئے میں لینچ پر نہ جا سکوں گی
میں نے فون پر سردار صاحب سے معذرت کر لی ہے ــــ تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جانا
کھانے پر انتظار کر رہے ہیں ــــ" اور جس طرح نیّا تمام دفتری اُمور بجا لاتی تھی۔ اِسی طرح
ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر یہاں آ گئی تھی۔" اور لوگ بھی آئیں گے ــــ؟" جب وہ سردار صاحب
کی مسلسل گھورتی ہوئی نظروں کی تپش سے پگھلنے لگی۔ تو اُس نے جلدی سے پوچھ ڈالا۔
"اور کون لوگ ــــ؟" سردار صاحب اپنی ننگی ننگی نظروں سے مسکراتے ہوئے بولے
"آپ کے دوست و احباب وغیرہ ــــ" نیّا نے لرزتے ہوئے کہا۔
"آج دوست و احباب کا دن نہیں ہے۔ آج میں نے محبوب ہستیوں کو بلایا تھا۔"
خوف کے مارے یہ نہ پوچھ سکی کہ آپ محبوب ہستیاں کسے کہتے ہیں اور خانم کے علاوہ
ہستیوں میں کون شامل ہے۔ شاید وہ یہ سمجھ کر آئی تھی کہ وہ خانم کی جگہ آئی ہے۔ باتیں
احتیاط سے کر رہی تھی۔ شہر میں سردار صاحب کی کیا حیثیت ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی
اِن کے خانم سے کیسے مراسم ہیں۔ اُس کا بھی اُسے اندازہ ہو چکا تھا۔ سردار صاحب کا
بھی بڑا رعب دار تھا۔ موٹی موٹی چمک دار آنکھیں ــــ جو اپنا مافی الضمیر بڑی آسانی سے ادا
دیتی تھیں ــــ سنہری سُرخ رنگت ــــ اور بڑی بڑی مونچھیں ــــ مونچھوں کے اندر جب

مسکرانے ــــ تو نیّا کو یوں محسوس ہوتا ــــ مگر مچھ نے اپنی جھلک دکھلائی ہو۔ نیّا کوئی غلط بات
کر ــــ غلط تاثر نہیں دینا چاہتی تھی۔ بہت پھونک پھونک کر گفتگو کر رہی تھی۔ اور بہت سوچ
کر اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں دو بیرے کھانے کے ٹرے اُٹھائے اندر آ گئے
اور نے بڑے قرینے سے کھانا میز پر لگا دیا۔ پانی اور کوک بھی رکھ دیا ــــ اور پھر اجازت
لے کر چلے گئے۔

"چلو بھئی شروع کرو ــــ" سردار صاحب نے توقف کے بغیر کہا۔ "تم نے اتنا انتظار کروا دیا
بڑی بھوک برداشت سے باہر ہو گئی۔" جب سردار صاحب نے لفظ بھوک کہا ــــ تو اِن
چہرے پر اتنی خوب صورت شیطینت اُبھری جسے نیّا نے اچھی طرح پڑھ لیا۔ اور پھر سردار
صاحب نے غضب یہ کیا۔ کہ خود ہی اس کی پلیٹ میں کھانا ڈالنے لگے۔
"رہنے دیجئے سردار صاحب! میں لے لوں گی۔"
"ارے آج ہمیں خدمت کا موقع دو۔ کوئی نیکی کا کام تو ہم بھی کریں۔"
نیّا کو بڑا عجیب سا لگا ــــ کھانا نکالنا عورت کا کام ہے ــــ مرد اچھا نہیں لگتا اُس نے سوچا
"چُپ چاپ کھاتی رہی ــــ اب اِس زبردستی کو وہ کیا نام دیتی ــــ کہ ہر بار جب سردار
صاحب کوئی نئی شے لیتے تو اس کی پلیٹ میں ضرور ڈالتے ــــ پلیٹ میں ڈالنے کے بعد ــــ
اُس کی آنکھوں میں ضرور دیکھتے ــــ اور کھانا نیّا کے حلق سے اُترنے کی بجائے باہر آنے لگتا۔
"کبھی کبھی ہم لوگ بھی مصنوعی باتوں اور مصنوعی لوگوں سے تھک جاتے ہیں۔ اُس وقت
ان لوگوں سے ملنے کو جی چاہتا ہے جن سے مل کر دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔" نیّا نے
جواب نہیں دیا ــــ گلاس اٹھا کر پانی پینے لگی۔
"خانم سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ اصل میں میں کہتا ہوں کہ وہ میری ضرورت
ہے ــــ کوئی کہتا ہے کہ وہ میری ماں ہے ــــ زندگی کے ہر موڑ پہ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت رہی
ہے ــــ اللہ میں ضرور کہوں گا کہ خانم کی وجہ سے ہمیشہ میرا وقت بہت اچھا گزرا ہے۔" پتہ نہیں

اُن کا یہ کہنے سے کیا مطلب تھا ـــــ؟ نیّا سمجھ نہیں پائی۔

"اِسی لئے خانم کو جب بھی میری ضرورت پڑی ہے ـــ میں ہر طرح اُس کے کام آ
دامے، درمے، سخنے، قدمے ـــــ" وہ بے تکان بول رہے تھے اور بے تحاشا کر
رہے تھے۔

"ہم ایک دوسرے کی مہربانیوں تلے دبے ہوتے ہیں . . . . تمہیں یہاں بھیج کر
ایک اور مہربانی کردی ہے ـــــ" یہ کہہ کر وہ اِس طرح ہنسے کہ نیّا کو ابکائی آگئی۔ پتہ نہیں
مہربانی سے اُن کا کیا مطلب تھا ـــــ؟ لایعنی باتوں میں کھانا ختم ہوگیا۔ نیّا کی بالکل سمجھ میں نہیں
آرہا تھا۔ کہ آج وہ یہاں کیوں بلائی گئی ہے۔ کھانے کے بعد بیرا گرین ٹی لے آیا۔ ایسے لگا
سردار صاحب کا یہاں سے اُٹھ کر جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ اُنہوں نے اپنا سگار سلگایا اور
بڑی والہانہ نظروں سے نیّا کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"اب قہوہ ہمیں تم پلاؤ گی ـــــ" انہوں نے اِس انداز سے کہا کہ نیّا کا ڈبڈبوک سا دل
ہولنے لگا ـــ اس نے اُٹھ کر پیالیوں میں قہوہ انڈیلا۔ اور ایک ننھی سی پیالی اٹھا کر سردار
کو دی ـــ نیّا نے صاف دیکھ لیا تھا کہ پیالی لیتے وقت سردار صاحب کے ہاتھ کانپ
تھے۔ اپنی جگہ بیٹھ کر نیّا نے کلائی پر لگی گھڑی دیکھی۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ پتہ نہیں
سے کب چھٹکارا حاصل ہوگا۔ اس نے دل میں سوچا ـــ پھر یکایک چائے ختم کر کے
سامنے ڈبل بیڈ پر جوتوں سمیت دراز ہوگئے۔ اور بولے۔

"معاف کرنا مجھے کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کی عادت ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو
ذرا لیٹ جاؤں ـــــ" نیّا بھی کہنا چاہتی تھی کہ سردار صاحب اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں
اُٹھ کر چلی جاؤں۔ مگر ایک انجانے خوف کے تحت وہ دل کی بات زبان پر نہ لا سکی۔ بلکہ
صاف محسوس کر لیا تھا۔ کہ سردار صاحب اپنا ایک پاؤں دوسرے پر رکھے اسے مسلسل
چلے جا رہے ہیں ـــ ان پر ایک اضطرابی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اُن کی آنکھیں

سُرخ ہوتی جاتی تھیں۔ شاید نیند کی وجہ سے، اور نیّا سوچ رہی تھی۔ وہ یہاں سے کیسے
نکل بھاگے۔ اچانک سردار صاحب نے سگار کا جلا ہوا ٹکڑا سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور بولے۔

"نیّا ہم نے تمہارے لئے زمین کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا ہے ـــــ"

"جی . . . جی . . . نیّا ہکلاتے ہوتے بولی . . . . میں سمجھی نہیں ہوں"

"کیوں نہیں سمجھی ہو ـــــ؟ کل ہی ہم نے کچھ زمینیں الاٹ کروائی ہیں ـــ اُس وقت
ہم تمہارے بارے میں سوچ رہے تھے۔ سوچا تمہارے جیسی نفیس لڑکی کے لئے، کراچی
کی خوبصورت بستی میں ایک دلکش گھر ہونا چاہیئے ـــــ" نیّا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ گھر،
گھر تو ہر عورت کی پہلی اور آخری تمنا ہے ـــ چھوٹا ہو یا بڑا ـــ اچھا ہو یا بُرا ـــ اگر آج اس
کا اپنا گھر ہوتا۔ تو وہ کیوں یوں در بدر ٹھوکریں کھاتی ـــ مگر کراچی جیسے شہر میں زمین خریدنا اور
گھر بنانا کارے دارد! شاید سردار صاحب مذاق کر رہے ہیں یا ـــ اُس کا امتحان لے رہے
ہیں۔ نیّا ذرا سا اُداس ہوگئی۔

"تم نے جواب میں کچھ نہیں کہا نیّا ـــــ"

"میں کیا کہوں سردار صاحب۔ جس بات کا مجھے یقین نہ ہو۔ اُس کے بارے میں میں کیا
کہہ سکتی ہوں ـــــ"

"کس بات کا یقین ہے۔ میرا یا میری بات کا ـــــ"

"یہی کہ مجھے گھر کے لئے بن مانگے کوئی پلاٹ مل سکتا ہے"

"اگر آزمانا چاہتی ہو۔ تو ابھی میرے ساتھ اس شہرِ نگاراں میں چلو ـــ کسی بھی زمین کے
ٹکڑے پر ہاتھ رکھ دو۔ دوسرے دن وہ تمہارا ہوگا"

"مگر کیوں ـــــ؟ کیوں سردار صاحب ـــــ!" نیّا خواہشات کے پُلِ صراط پر پہنچ گئی۔ سردار
صاحب نے ایک خوش باش قہقہہ لگا کر، نیّا کی جانب کروٹ لے لی۔

خوبصورت عورت کو اِس قسم کے سوالات نہیں پوچھنے چاہئیں ـــ صرف حکم کرنا

چاہیئے ——"

"لیکن سردار صاحب! میں تو ہرگز زمین خریدنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں!"

"مگر ہم نے تو تمہارے لئے آٹھ سو گز کا ایک ٹکڑا مخصوص کر دیا ہے!"

"آٹھ سو گز ——؟" نیا کی کمزوری اس کی آنکھوں سے حیرت بن کر جھانکنے لگی۔

"اندازاً کتنے کا ہو گا سردار صاحب؟" سردار صاحب نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستے رہے۔

"واقعی بڑی بھولی ہو —— اور تمہارے اس بھولپن پہ ہمیں پیار آ رہا ہے سچی بات تو یہ ہے کہ حسن جب تک معصوم نہ ہو۔ دل کو بھاتا نہیں —— آؤ ادھر میرے قریب آ کر بیٹھو۔" سردار صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے —— نیا سوچ کی صلیب پہ لٹک گئی —— کرسی سے اٹھ کر پلنگ پر بیٹھنے تک۔۔۔۔ ایک عالم تھا درمیان میں —— اور اسی فاصلے کے درمیان کہیں زمین کا وہ ٹکڑا تھا۔ جو نیا کی سب سے بڑی ضرورت تھا —— نیا کوشش و پنج کے سمندر میں غلطاں و پیچاں دیکھ کر۔۔۔ سردار صاحب بڑی محبت سے بولے۔

"بھئی زمین کا یہ ٹکڑا ہم تمہیں تحفتہً دینا چاہتے ہیں۔"

"یعنی مفت۔۔۔ مفت۔۔۔ مگر مفت کیوں ——؟" سردار صاحب نے زمانے بھر کا پیار اپنی نگاہوں میں سمو کر کہا ——

"جس طرح تمہارے جی میں آئے۔۔۔۔ یا۔۔۔ جب تمہارے جی میں آئے قیمت چکا دینا ——"

اچانک بالکل اچانک —— خواجہ عبدالرحیم ایک کونے سے نکل آئے اور چپ چاپ کی جانب دیکھنے لگے —— ان کی گھورتی ہوئی سورج کی مانند نگاہ کی گرمی پا کر نیا سر سے پاؤں تک لرز گئی —— نیا نے ان نگاہوں کی تپش سے بچنے کے لئے کمرے میں بکھری ہر شے میں پناہ لینا چاہی —— مگر وہ نگاہ سیدھی کلیجے میں اتر گئی —— نگاہ تھی یا دانتے

"اف خدایا —— ایک تو یہ خواجہ عبدالرحیم —— خواجہ عبدالرحیم میرے سسٹم میں سے نہیں نکلتا ——"

کیسی کیسی قدغنیں لگاتا ہے —— اور کیسے کیسے روڑے جسم اٹکاتا ہے۔ ذہن اور جسم کی جنگ نے اسے گویا شل کر دیا۔۔۔۔

زندگی کو ہر شے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خواجہ عبدالرحیم صاحب!

روٹی کی، لباس کی —— گھر کی —— محبت کی، خواہ جھوٹی ہی کیوں نہ ہو —— آسودگی ذہنی و جسمانی —— خواہ لمحے بھر کی کیوں نہ ہو!

کبھی کبھی جھوٹے سہارے لینے کو جی چاہتا ہے —— سوراخ زدہ کشتی میں دریا پار کرنے کو جی چاہتا ہے —— رہزن کو پاسبان رکھنے کی تمنا ابھرتی ہے۔ مگر خواجہ عبدالرحیم صاحب! یہ جگہ لحاظ، شرم، روایات اور نفسیاتی بندشوں کے بھاری پتھر تم نے رکھے ہیں!

نیا نے ایک دم اپنی مسکراہٹیں سمیٹ لیں۔ جس طرح چاند جیسے چہرے والی حسینہ نے اچانک نقاب ڈال لیا ہو۔

"قیمت دیئے بغیر زمین لینا اچھی بات نہیں ہے!"

"قیمت کا معاملہ تو میں نے تم پر چھوڑ دیا ہے ڈیئر۔۔۔۔ جیسے تم چاہو ——" سردار صاحب اٹھ کر آئے —— اور نیا کی کرسی کے بازو پر اس سے کندھا ملا کر بیٹھ گئے۔ نیا ایک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں خانم سے مشورہ کر کے بتاؤں گی سردار صاحب!"

"کس کس بات میں خانم سے مشورہ کرو گی؟ اور کب تک؟"

"بہرحال وہ میری سرپرست ہیں اس وقت ——"

"تم بیٹھو تو سہی اور کی سرپرستی میں چلی آؤ"

"سرپرستی ——؟" نیا نے نظر اٹھا کر سردار صاحب کی آنکھوں میں دیکھا —— "کیا سرپرستی

کا لفظ اتنے ہمہ گیر معنی رکھتا ہے؟" وہ دل میں سوچنے لگی۔

"سردار صاحب! نیا دوسری طرف سے جاکر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ دراصل زمین لینا ہی مسئلہ ہے مکان بنانا بھی ایک مرحلہ ہے اور میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ میں گھر بنا سکوں۔" شاید اسے کا یہی راستہ نظر آیا ——

"تم حکم تو کر سکتی ہو ——"

"کیسے ——؟" وہ پھر قہقہہ لگا کر ہنسے —— "اس ناچیز کو، ایک گھر بنا دوں تمہارے نام پر خوبصورت سا —— ہاں مگر تم اپنی زندگی میرے نام لگا دو —— جب تک چاہو میرے زیر سایہ رہو —— پھر چاہو تو چلی جاؤ۔"

نیا نے سردار صاحب کی طرف غور سے دیکھا —— پچاس کے قریب اُن کی عمر ہوگی اُن کے بال بچے بھی ہوں گے —— ممکن ہے۔ پوتوں۔ نواسوں والے ہوں۔ مگر زنانہ وار کا کیا عالم تھا ——؟

نیا کو معاملہ اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ مگر وہ اُس موڑ پر تھی جب سمجھ کر انجان بننے کو جی چاہتا ہے۔

سردار صاحب نے اپنا بجھا ہوا سگار اٹھا کر دوبارہ سلگایا —— اور پھر منہ سے لگایا۔ نیا صاف محسوس کر رہی تھی۔ کہ سردار صاحب کے پورے وجود پر ہلکا سا لرزہ طاری ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ برابر کانپ رہے تھے —— چہرے پر ایک خبیث سا جذبہ سجا تھا، بظاہر وہ ایک مہذب شخص بنے بیٹھے تھے۔

نیا کو یاد آیا —— بچپن میں اس نے کتنی بار بلی کو قصاب کی دکان کے پاس بیٹھے دیکھا تھا اس کی صورت اتنی مسکین ہوتی تھی اور اُس کی نگاہوں میں اتنی بے چارگی یا معصومیت ہوتی تھی۔ کہ اس پر بے اختیار پیار نما ترس آنے لگتا تھا۔ بار بار گوشت کی جانب دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی۔ کبھی آگے ہوتی —— کبھی جھجک کر پیچھے ہٹ جاتی تھی مگر جب وہ بیٹا

ہی موقع ہے۔ تو جھپٹ کر گوشت کا ٹکڑا اٹھاتی اور آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو جاتی ——

گوشت کا ٹکڑا کھا لینے کے بعد۔ پھر ویسی ہی معصوم شکل بنا کر میاؤں میاؤں شروع کر دیتی۔

ب گھبرا کر ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے بھتی ——؟" سردار صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔

"سردار صاحب ——" نیا ذرا کی ذرا رُکی۔ اور پھر بولی۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں ہے۔ میرا ایک بچہ بھی ہے ——"

"بچہ ——؟" یوں لگا جیسے سردار صاحب کو زلزلے کا جھٹکا لگا ہے۔ "بچہ —— اچھا بچہ" پھر کچھ سمجھ کر بولے —— "پھر کیا ہوا اگر بچہ ہے تو —— یہ تو اور بھی اچھی بات ہے —— اس کی بھی سرپرستی کریں گے۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہی سردار صاحب —— میرا مطلب یہ ہے —— کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ ر میری امّی اُس کی دیکھ بھال کرتی ہیں —— میں —— میں مجبوراً نوکری کرتی ہوں۔ اپنے بچے لے لئے ——" نیا کی آواز بھرا گئی۔ مگر رونا سے اچھا نہ لگا۔ سردار صاحب نے لمبا سا کش لیا خوشبودار دھواں فضا میں چھوڑا۔

"اوہ —— کیسے نازک موڑ پر عورتیں اپنی زندگی کا المیہ بیان کرنے لگتی ہیں۔" انہوں نے دل سوچا۔

"مجھے اجازت دیجئے سردار صاحب!" آنسوؤں کے درمیان نیا اتنا ہی کہہ سکی اور دوڑ کر کمرے آئی —— کوریڈور سے بھاگتی ہوئی۔ وہ ہال میں آئی۔ اور پھر سڑک پر آگئی۔ ہاتھ کے اشارے سے ایک خالی ٹیکسی روکی۔ اور گھر کی طرف چل دی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اُسے خیال آیا کہ —— پروگرام طے نہیں ہوا تھا۔ خانم نے کہا تھا۔ سردار صاحب کا ڈرائیور تمہیں گھر چھوڑ جائے گا۔"

نیا کو خوف آنے لگا —— شاید اس نے کوئی غلط حرکت کر دی تھی —— مگر وہ کیا کرتی ——؟ ر خواجہ عبدالکریم مجسم ہو کر نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا —— تو جیسے اُسے سُرخ رنگ کی جھنڈی

نظر آجاتی تھی۔

سردار صاحب نے ایسی تو کوئی بات نہیں کہی تھی۔ مگر وہ ابھی تک ڈرا ہوا تھا۔ اگلے دن اُس نے خود ہی خانم کو ساری روداد سُنا دی۔ بس اتنا اضافہ کیا — "موتی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اس لئے میں بوکھلا کر جانے کیا کہہ کر آگئی —"

"کوئی بات نہیں —" خلافِ توقع خانم نے اتنے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ کہ نیا کو یقین ہی نہیں آیا۔ "میری سردار صاحب سے کل ہی فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ تم سے خفا نہیں ہیں کہہ رہے تھے نیا ابھی بچی ہے — اس نے زمانہ نہیں دیکھا —"

"اور یہ تم اپنے بچے کا ذکر کیوں ہر جگہ لے بیٹھتی ہو؟"

"تو کیا کروں خانم —؟ میرا بچہ ہے۔ کیا اسے چھپاؤں؟"

"چھپانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اور بتانے کی بھی ضرورت نہیں جس کو جاننا ہوگا خود جان لے گا۔" نیا خاموش ہوگئی۔

"بہر حال سردار صاحب کو تمہارے ساتھ اور بھی ہمدردی ہوگئی ہے اور اُنہوں نے تم کسی زمین کی بات کی تھی —؟"

"کی تو تھی خانم —" نیا نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم زمین لینا چاہتی ہو؟"

"میں خریدنا چاہتی ہوں۔ اگر وہ مجھے الاٹمنٹ ریٹ پر دے دیں۔ تو میں اپنے بیٹے کے نام پر خرید لوں گی۔" نیا کو یقین تھا کہ اس کے پاس اتنی رقم یقیناً ہے۔ کیوں کہ موتی کے نام کی وصول ہو رہی تھی وہ سیدھی بینک میں جمع ہو رہی تھی۔ اور پھر نیا بھی اپنی تنخواہ کا زیادہ پس انداز کر دیتی تھی۔

"سردار صاحب بہت اچھے ہیں۔" خانم نے دوبارہ کہا۔ "وہ تمہارے ساتھ مہربانی چاہتے ہیں۔ بال بچوں والے ہیں۔ تمہاری مجبوری کو سمجھتے ہیں — وہ کہہ رہے تھے جو

تمہاری خوشی ہو وہ اُسی طرح کر دیں گے۔"

"سچ خانم —؟"

"ہاں —"

"مگر جب تم زمین خرید لو۔ تو خود جا کے سردار صاحب کا شکریہ ادا کر دینا۔"

"بہت اچھا خانم —!"

نیا اپنا سوٹ کیس اٹھائے تھکے ہارے بے دم قدموں سے جب اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی تو موتی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"ماما . . . ماما . . . مامی . . . "

"میرا چندا، میرا موتی ——"، نیا نے جھک کر اُسے اٹھالیا۔ اور حسب معمول اُس کا منہ چومنے لگی۔ نیا نے سوٹ کیس وہیں دروازے میں ہی رکھ دیا۔ امّی جان آئیں، اُنھوں نے نیا کو دیکھا —— تھکاوٹ کے باوجود بہت مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ اُنھوں نے راہ میں ہی سوٹ کیس اُٹھا کر کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ صبح جب اپنے چھوٹے سے سوٹ کیس کو انتہائی جدید طرز کے خوب صورت و دیدہ زیب ملبوسات ڈال کر نیا جا رہی تھی۔ تو اس وقت بھی امّی جان نے کنکھیوں سے کنکھیوں کی طرح دیکھا تھا۔ اور پوچھ بھی لیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو ——؟"

"امّی دفتر جا رہی ہوں ؟"

"اور یہ اٹیچی کیس ——؟"

"اس میں کچھ کپڑے ہیں۔ جو مجھے درزی کو دینا ہیں۔" امّی جان کا چہرہ گواہی دے رہا تھا

جھوٹ بول رہی ہے اور نیا امّی جان کو کس طرح بتاتی کہ ایک ٹاپ کلاس فیشن میگزین میں انٹرویو
ہونے کے لئے دلکش و حشر انگیز تصویروں کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔ جمالی کے ساتھ یہ طے
ہوا تھا کہ وہ اسے دفتر سے بارہ بجے، جب لنچ ٹائم ہوگا۔ لے لے گا۔

جمالی جب پروگرام پونے بارہ بجے آگیا تھا ۔ جمالی کے ساتھ اس کا وقت بہت اچھا
گزرا تھا —— وہ اتنی خوبصورت باتیں کرتا تھا کہ نیا کو نشہ آگیا۔ اس نے تصویروں کے لئے اتنی
خوبصورت جگہوں کا انتخاب کیا تھا کہ نیا کو بار بار اس کے ذوق جمال کی داد دینا پڑی تھی۔ اب نیا
بہت کر لوٹ گئی تھی۔ انگ انگ دُکھ رہا تھا —— مگر جی بہت مسرور تھا —— جمعہ کا دن اس
نے انٹرویو کیلئے رکھا تھا —— انٹرویو کیسا ؟ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جمالی اس کے بارے
میں کیا لکھے گا ——؟

گھر بلا کر تو وہ محض شکریے کے طور پر جمالی کو چائے پلانا چاہتی تھی۔

اگلے ہفتے جب نیا دفتر سے گھر آئی تو اُس کی بغل میں ایک بہت بڑا رسالہ بھی دبا ہوا
تھا۔ آج اس نے موتی کو بھی سرسری انداز سے پیار کیا۔ اور جلدی سے پلنگ پر لیٹ گئی اور
رسالہ دیکھنے لگی۔ یہ رسالہ اس نے دفتر میں بھی دیکھا تھا۔ مگر وہاں دیکھنے کا لطف نہیں آیا تھا۔
اپنی تصویریں بار بار دیکھنا چاہتی تھی اور غور سے دیکھنا چاہتی تھی —— ٹائٹل پر اس کی تصویر
تھی۔ خوبصورت تھی کہ وہ خود بھی دنگ رہ گئی۔ جسم کے سارے خطوط نمایاں تھے اور نقوش کا سارا
حسن آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ اندر ہر صفحے پر دو یا تین تصویریں تھیں۔ اور ہر تصویر کے ساتھ موٹے
موٹے حروف میں خوبصورت جملے لکھے ہوئے تھے۔

پہلے صفحے پر لکھا تھا "حُسن، جوانی، ذہانت —— تین قیامتوں کا ایک نام —— نیا!"
دوسرے صفحے پر لکھا تھا "چاند کی سنہری کرنوں کی —— البیلی شہزادی —— نیا"
تیسرے صفحے پر لکھا تھا —— سمندر کی ایک چنچل و تند موج . . . . کہ جو اپنے ساتھ دلوں
کے کنول بہا لے جاتی ہے"

چوتھے صفحے پر کچھ یوں درج تھا ــــ "اِس کو دیکھو تو اس سے ملنے کو جی چاہتا ہے ــــ ملو تو کھو جنے کو جی چاہتا ہے ــــ کھو جو تو ــــ بے اختیار پا لینے کو جی چاہتا ہے ــــ وہ کس دل میں رہے گی ؟" ہر فقرہ پڑھنے کے بعد نیا سرشار ہو جاتی ــــ پورا اظہار تصویر الفاظ میں تھا ــــ اور یہ سارے الفاظ ــــ اور خیال جمالی کے اپنے تھے نے تو اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

اور پھر جمالی کی آنکھ کے زاویے بھی اسے بہت پسند آتے تھے۔

اسے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ کہ اُس کا کون سا انداز قیامت ڈھا سکتا ہے ــــ کون لباس میں وہ کس قدر اچھی لگتی ہے ــــ نگاہوں کا کون سا زاویہ قاتل ہے ــــ اور مسکراہٹ کس حد تک گرمی ہے ؟

ساڑھی ــــ شلوار قمیص ــــ ٹراؤزرز ــــ غرارہ ــــ چست پاجامہ۔ غرض ہر لباس کی تصویریں تھیں ــــ یعنی تصویریں اِس طرح لی گئی تھیں کہ جسم کے خطوط زبان بن جاتے نیا کبھی اپنی صورت دیکھتی ــــ کبھی اپنا جسم دیکھتی ــــ کبھی اپنے ملبوسات دیکھتی۔ اسے اب یقین آیا تھا ــــ کہ واقعی وہ ایک آفاقی حسن کی مالک ہے۔ اور ایک خزینہ رکھتی ہے۔ کبھی اُس نے اِن رسالوں میں چھپنے والی حسین و جمیل عورتوں میں شامل ہونے کی تمنا کی تھی۔ آج وہ اُن سب میں آگے تھی ــــ یہ سوچ سوچ کر اس کا وجود فضاؤں میں اڑنے لگا ــــ خود پسندی اور خود نمائی کے احساس میں ڈوبی وہ تصویریں دیکھ رہی تھی۔ کہ موتی بھاگتا ہوا آیا اور رسالہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ جانے نیا کا انہماک دیکھ کر یا اسے رسالہ کی قدر و قیمت محسوس ہوئی تھی یا تصویروں کو دیکھ کر وہ بے خود ہو گیا۔

"اِدھر آؤ موتی ..... رسالہ دے دو ..... دیکھو بیٹا پھٹ نہ جائے ....."

"میں نہیں دوں گا ــــ میں نہیں دوں گا ــــ" موتی دُور جا کر اس کے صفحے پلٹنے لگا۔

"ادھر آؤ میرے بچے ــــ اِدھر آؤ ــــ" نیا نے چمکارا۔ "میں تمہیں ایک بڑی اچھی

نی ہوں ــــ" موتی قریب آ گیا ــــ نیا نے پیار سے رسالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ے بستر پر بچھا دیا ــــ کھولا ــــ اور پہلی تصویر پر انگلی رکھ کر بولی ــــ

یہ کون ہے موتی ــــ ؟"

موتی نے ایک نظر اپنی ماں کو دیکھا ــــ اور پھر تصویر کو دیکھا ــــ اور پھر ایک دم چلّا

ا ــــ

ممی .... ممی ممی یہ تو آپ ہیں"۔

اچھا چلاؤ نہیں ــــ آؤ تمہیں اور بھی تصویریں دکھاتے ہیں" نیا جیسے جیسے صفحے پلٹتی گئی موتی بار بار چلانے لگا۔

آہا۔ ماما ... ماما ... یہ بھی ماما ــــ وہ بھی ماما ..."

"تمہارے اتنی ساری ممائیں کہاں سے آئیں ؟" نیا نے نہ جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اس کا منہ چوم لیا۔

وہ ابھی تاک میں تھا ــــ جونہی نیا غافل ہوئی وہ رسالہ اٹھا کر بھاگ گیا۔ اور سیدھے اپنی نانی کے کمرے میں جا کر دم لیا۔

"اے موتی .... اے موتی ..." نیا اس کے پیچھے بھاگتی اور چلاتی رہ گئی .....

نانی .... نانی .... دیکھو ــــ" موتی نے جلدی سے رسالہ امی جان کی گود میں رکھ دیا۔ نانی نے موٹی دھاگا تپائی پر رکھ دیا اور موتی کی بات سننے لگیں۔

"اس میں ماما ہے ــــ ماما ــــ" وہ ویسے تو امی جان کو رسالے وغیرہ دیکھنے کا بالکل شوقین نہ تھا۔ مگر جب موتی نے ان کی گود میں رسالہ بچھا ہی دیا تو وہ بڑی توجہ سے دیکھنے لگیں۔ نانی کو موتی اپنی ماں کے ساتھ ملا رہا ہے ــــ جونہی موتی نے ٹائٹیل پر ہاتھ رکھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر کو دیکھنے لگیں۔ اتنے میں نیا ان کے سر پر پہنچ گئی۔ اب وہ پہنچا ہوا مہمل تھا۔ جبکہ موتی کہہ رہا تھا۔

"نانی اندر بھی دیکھو — اندر بھی ممی ہے —" امی جان مرے مرے ہاتھوں سے
اُلٹنے لگیں۔ نیّا کا خیال تھا وہ سرسری نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ مگر امی جان اپنی تمام قوتوں کو
کو کام میں لا کر بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں — تصویریں دیکھنے کے بعد انہوں نے
بند کر کے موتی کو پکڑا دیا۔ اور پلٹ کر سرہانے کھڑی نیّا کی طرف دیکھا — نیّا نے فوراً
جھکائی — وہ اپنے دفاع کے لئے تیار ہو کر آئی تھی اپنی ماں کو زمانے کے چلن
میں سمجھانے آئی تھی — ایک کی چار سنانے آئی تھی مگر . . . امی جان نے تو کچھ بھی
کہا — وہ ایک خالی خالی نگاہ جو انہوں نے نیّا کے چہرے پر ڈالی تھی — نیّا کے دل
اُتر گئی . . . وہ نگاہ اتنی خالی تو نہ تھی — اور اگر خالی تھی تو شہ رگ میں کیوں اٹک گئی —
جان آرام سے اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ جب کسی نے رسالہ نہیں چھینا تو موتی ہی رسالہ
امی جان نے بھی غالباً نیّا کی نگاہ کا مفہوم پڑھ لیا تھا۔ لیکن اب شاید اپنے جذبات پر قابو پا
تھیں — یا اپنی زبان بند رکھنا چاہتی تھیں — یا — دل اور دماغ کی اس جنگ
بچنا چاہتی تھیں۔

وہ یوں لیٹ گئیں۔ جیسے انہوں نے ویلیم کی گولی کھالی ہو۔ بڑھاپا ویسے بھی ویلیم
بیساکھیاں تھام کر آگے بڑھتا ہے۔ کراچی آنے کے بعد امی جان کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت
رہنے لگی تھی۔ نیّا نے کئی بار ڈاکٹر کو دکھایا تھا — سیڑھیاں چڑھنے، اُترنے میں انہیں
ہوتی تھی — اس لئے زیادہ اوپر ہی بیٹھی رہتیں۔ جب سر کو زیادہ چکر آنے لگتے تو سر
لیتی تھیں۔ نیّا جب ان کے لئے زیادہ تشویش کا اظہار کرتی، تو وہ کہہ دیتیں —
"بڑھاپے میں کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی ہے بیٹی۔ یہ بیماریاں اس بات کا اعلان ہیں کہ اب
. . . تیار ہو جاؤ — ناقوس بج چکا ہے . . . اب تو ذہنی طور پر کوچ کے لئے تیار
کا وقت ہے" امی جان اتنے پتے کی بات کیسے کہہ جاتی ہیں۔ نیّا کتنی بار سوچتی —
جان زیادہ وقت عبادت میں گزارنے لگی تھیں۔ پچھلی رات تہجد کے لئے بھی ضرور اٹھا کرتی تھیں

آپ رات کو تو آرام کر لیا کریں امی —" کئی دفعہ نیّا چڑ جاتی۔
مگر وہ کہتیں . . . "جب رات رات بھر نیند نہ آتے۔ تو اللہ کو یاد کرنا چاہیئے — باقی
وقت رہ گیا ہے —"
سچی بات تو یہ ہے کہ اب نیّا کو بھی امی جان کے پاس بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی
کی باہر کی دلچسپیاں زیادہ ہو گئی تھیں — دفتر کے بکھیڑے بہت تھے — آئے دن
میں پارٹیاں ہوتیں۔ جن میں اُسے بطورِ خاص مدعو کیا جاتا —
اور امی جان ایک دُنیا سے لڑ کر اس کے پاس آگئی تھیں۔ بیٹوں نے تو صاف صاف کہہ
دیا تھا کہ اگر آپ کراچی نیّا کے پاس جائیں گی تو آپ کا ہمارا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناطہ ٹوٹ جائیگا
"ہم آپ کے لئے مر گئے۔ اور آپ ہمارے لئے —؟"
بیٹوں کے لئے تو امی جان مر چکی تھیں۔
اب انھیں اپنی بیٹی کے لئے مرنا تھا۔

"خانم ـــــ بڑی مشکل ہوگئی ہے"۔ نیا نے ادا سے مسکراتے ہوئے اپنی خوب
مشکل کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں بھئی، کیا ہوا ہے ـــــ؟" خانم نے اپنے محبوب سگریٹ کا کش لے کر

"جب سے میرا انٹرویو چھپا ہے۔ لوگ بہت تنگ کرنے لگے ہیں ـــــ" نگ
نے اس طرح چبا کر کہا۔ جیسے کہ اسے "تنگ" ہونے میں بڑا مزہ آرہا ہو۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے ـــــ" خانم مسکرائی۔ "شہر میں تمہاری بہت شہرت
ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری ایجنسی کی بھی شہرت ہو رہی ہے"

"تمہیں معلوم ہے۔ مجھے بھی کئی فون آچکے ہیں ـــــ"

"اچھا ـــــ" نیا نے مصنوعی حیرت سے اپنی لمبی پلکیں جھپکائیں۔

"لوگ تمہارا اتہ پتہ پوچھتے ہیں"

"پلیز خانم، نہ بتایئے گا۔؟"

"میں جانتی ہوں ـــــ" خانم نے وضاحت کی۔ "بہت سے بڑے لوگوں کا
ہے کہ ان کی پبلسٹی فلم میں تم سے کام کرایا جائے"

"واقعی ـــــ؟"

"ہاں اور منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار ہیں"

"ہوگاڈ ـــــ" نیا نے ادا سے منہ کھولا ـــــ "ہاؤ کین اِٹ بی؟"

"اب دیکھیں نا ـــــ" مجھے بھی سارا دن فون آتے رہتے ہیں۔ کوئی آٹوگراف والی فوٹو
مانگتا ہے ـــــ کوئی ڈرائیو پر لے جانا چاہتا ہے ـــــ کوئی عشقیہ شعر سنانے بیٹھ جاتا ہے
کوئی یہاں دفتر میں آکر بُرا جہان ہو جاتا ہے"

"تمہارا کیا لیتے ہیں ـــــ اِن باتوں سے زندگی میں رنگ ہے۔ انہیں نثار ہو لینے دو"

"کام نہیں کرنے دیتے خانم"

"ہاں یاد آیا ـــــ" خانم نے کہا "سیٹھ جادو بھائی کا فون بھی بہت دفعہ آچکا ہے۔ بھئی
انہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ کیا تم نے ان کے پی آر او سے مل کر ملاقات کا وقت طے کیا ہے"

"نہیں خانم آج اس سے بات کروں گی"

"اُن کی "بلیک میجک کاسمیٹکس" فیکٹری کی مصنوعات تیار ہو کر مارکیٹ میں آگئی ہیں۔ اُن
کے لئے ایک پبلسٹی کمپین شروع کرنا ہے"

"جب آپ کہیں ہم اس پر کام کرنا شروع کر دیں گے"

"وہ ہو تم نے اُن کی مصنوعات کے لئے نام تجویز کئے تھے۔ انہیں بہت پسند آئے ہیں"

"واقعی خانم ـــــ؟" نیا خوش ہوگئی۔

"وہ کہہ رہے تھے۔ ہم خوشبوؤں کے لئے نیا کے تجویز کردہ نام ہی رکھیں گے۔ تم نے
کتنے نام لکھ کر دیئے تھے ـــــ؟"

"میں نے انہیں تین نام لکھ کر دیئے تھے"

"بلیک میجک پرفیوم ـــــ
سحر دلکش پرفیوم اور

"میں ضرور سوچوں گی خانم۔ مگر وقت لگے گا ——"

"ٹھیک ہے۔ اس دوران تم ایک بار سیٹھ صاحب سے ضرور مل لینا۔ اور ان کو تسلی بھی دے دینا کہ ہم عنقریب کمپین شروع کرنے والے ہیں۔"

"میں ضرور جاؤں گی خانم ——" نیا کھڑی ہوگئی۔ اپنے کمرے میں آتی تو وہاں بیکل صاحب اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"خوش آمدید بیکل صاحب۔" آج نیا بہت خوش تھی۔

"کتے ذُن کتے ہیں مگر تم گھاس ہی نہیں ڈالتی ہو اس لئے آج خود ہی چلا آیا ہوں۔"

"آپ جانتے ہیں۔ بے چین لوگوں کو گھاس ڈالنے سے بھی چین نہیں آتا، بلکہ اُن کے اضطراب کو بے رخی سے ہوا دینی چاہیئے۔" اس پر وہ بے تحاشا ہنسنے لگے۔

"واہ واہ ——" بیکل صاحب جھوم اٹھے۔ "کاش تم اتنی ذہین نہ ہوتیں۔ اے کاش ——! تم ہم جیسے بد دماغ یوں بندۂ بے دام نہ بنے پھرتے ہوتے ——"

"اچھا آپ بد دماغ بھی ہیں۔ آج ہی پتہ چلا ہے۔"

"ہاں ہاں —— تم نے سُنا نہیں۔ شہر میں میری بد دماغیوں کے چرچے ہیں۔ اب تمہارے سامنے بھی پگھل جاتا ہوں تو کیا ہوا —— تم نے وہ غالبؔ کا شعر سنا ہے ——

حاجت بُری بلا ہے کہ غالبؔ سا تُند خُو
منّت کشِ عدو سرِ بازار ہو گیا

"نہیں آپ نے یہ شعر کچھ حسبِ حال نہیں پڑھا۔" نیا مسکرا کر بولی۔ "ایک شعر غالبؔ کا پھر آپ کو سناتی ہوں۔

کام اُس سے آپڑا ہے کہ جس کا بیان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

"بھئی واہ —— کیا برجستہ اور خوب کہا ہے —— بڑا اعلا ذوق رکھتی ہو ——" بیکل

ہوش رُبا پرفیوم ——"

"انہیں "مسحور کُن" پسند آیا ہے۔ اس میں مشرقیت بھی ہے۔ اب پھر مرزا رواج ہو رہا ہے —— اور انہوں نے تین چیزوں کے لئے "مسحور کُن" کو ریجرڈ کیا ہے "مسحور کن پرفیوم" —— "مسحور کُن ٹالکم پاؤڈر" —— اور "مسحور کن روم فریشنر" وہ آج کل رہے تھے کہ اپنی فیکٹری کی کسی چیز کا نام میں نیا رکھ دوں گا۔" نیا ہنسنے لگی۔

"بُری طرح تمہارے عشق میں مبتلا ہو چکے ہیں سیٹھ صاحب!" خانم نے ہنس کر کہا۔ سنجیدہ ہوگئی۔

"مگر فکر کرنے کی ضرورت نہیں —— سیٹھ صاحب بے ضرر آدمی ہیں۔"

"بے ضرر آدمی سے کیا مُراد ہے ——؟" نیا پوچھ ہی نہ سکی۔

"نیا جب سے تمہارے "پریشر ککر" اور "شاہانہ جیولرز" کے اشتہار ہٹ ہوئے ہیں تم پر کچھ اور بھی بھروسہ کرنے لگی ہوں۔"

"شکریہ خانم ——"

"اب ایک اور کام بھی اپنے ذمے لے لو۔"

"آپ فرمائیں خانم ——؟"

"سیٹھ صاحب کی پبلسٹی فلم کا سارا ذمہ تم لے لو۔"

"یعنی میں ——؟"

"ہاں ہاں ——"

"مگر میں نے تو اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں ——"

"سوچنے کے لئے بہت دن ہیں۔ پورا وقت لو۔۔۔ اور کوئی انوکھا و نرالا خیال دو۔ پہلے وہ خوشبوؤں کی فلم بنوانا چاہتے ہیں اور وہ ہم سے بڑی بڑی توقعات رکھتے ہیں۔ ہے وہ ذہین اور خوبصورت عورتیں۔۔۔ انہیں کوئی اچھوتا نرالا خیال دیں گی۔"

صاحب ہمیشہ سے زیادہ داد دینے لگے . . . . اتنے میں چائے آگئی۔ نیا نے
ایک پیالی بیکل صاحب کو بنا کر دی اور دوسری اپنے ہونٹوں سے لگالی بیکل
نیا کے شوخ چہرے سے ہٹتی نہ تھی۔

"نیا آج میری بات مان جاؤ — اور میرے ڈرامے میں کام شروع کر دو۔"

"یہ ذرا مشکل ہے بیکل صاحب!"

"کیا مشکل ہے اِس میں —— ؟"

"میری مصروفیات اجازت نہیں دیتیں ——"

"تمہارے لئے ہم شوٹنگ کی تمام آسانیاں مہیا کریں گے۔"

"میرا خیال ہے۔ مجھے کبھی بھی ڈرامے میں کام نہیں کرنا چاہیئے۔"

"کیوں —— ؟ میرا تو خیال ہے اگر تم فن کی دنیا میں آجاؤ تو پیسہ اور شہرت تمہاری
کی لونڈی بن جائے ——"

"اسکرین کے فن کا جہاں عارضی جہان ہوتا ہے۔ بیکل صاحب۔"

"تم ستارہ بن کر چمکو گی۔"

"ستارہ اُبھرتا ہی ڈوبنے کے لیئے ہے ——" نیا نے فلسفہ بگھارا۔
تو زندگی میں ایک بار اُبھرنا کیا بُرا ہے —— ہمیشہ کے لئے آسمان پر چمک تو
ہے۔"

"محض آپ کا خیال ہے۔ بیکل صاحب۔ ہمارے ملک میں اسکرین کی زندگی
مختصر ہوتی ہے۔ اُدھر اُبھرے۔ اِدھر ڈوبے۔"

"مگر ٹی وی کی اسکرین کی بات ہی اور ہے —— وہاں فنکار ساری زندگی جا
سکتا ہے۔"

"میں یہ بات نہیں مانتی۔ ہمارے ہاں گروہ بندیاں ہیں۔ ذاتی رنجشیں ہیں۔ ایک

ے آگے بڑھنے کے مواقع ملتے ہیں تو دوسری طرف سے ٹانگ کھینچ لینے کی کوششیں کی
جاتی ہیں۔ اور میں اس چخ چخ میں پڑنا نہیں چاہتی۔"

"اچھا اِس بحث کو چھوڑو —— میرا کہا مان کر ایک بار —— ذرا تفننِ طبع کی خاطر ایک ڈرامے
میں ہم تو کر کے دیکھو ——"

"پھر بیگ ہنساتی ہو جاتے گی ——" نیا بولی۔

"اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔ میں نے "سپنا" میں تمہاری تصویریں دیکھی ہیں۔ ایک حسین
عورت فوٹوجینک بھی ہو یہ اتفاق کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔"

"بس رسالے تک ہی رہنے دیجئے مجھے ——"

"اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا میں بھی نہیں ہوں۔ میں نے تو تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے
نئے ڈرامے "شفق شفق دوشیزہ" میں تمہیں ہیروئن کا رول دوں گا۔"

"ایں خیال است —— و محال است —— و جنوں!"

"اچھا تم اپنی ضد پر اڑی رہو۔ میں اپنی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میں اور
تم کر ایک دن تمہیں منا لیں گے۔"

یہ ضد کی بات نہیں ہے بیکل صاحب! اصل میں مَیں ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی
ہوں جہاں —— پھر وہ ایک دم یوں خاموش ہو گئی جیسے دوراہے پر پہنچ گئی ہو۔ یہ کیسا گھرانہ
ہے جو دفتر میں نوکری کرنے کی تو اجازت دیتا تھا —— "فیشن میگزین" میں نیم عریاں تصاویر
کی بھی اجازت دیتا تھا۔ مگر . . . . مگر . . . . شاید بیکل صاحب نے اُس کے چہرے سے
کشمکش کو پڑھ لیا تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولے۔

"ہر گھرانے میں کچھ پرانے خیالات کے لوگ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری نئی نسل بڑی
باخیال ہے اور نئی نسل پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے —— تھوڑا سا وقت لگتا ہے۔ لوگوں کو
سمجھانے میں —— پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔" نیا کا بے اختیار دل چاہا۔ وہ اُن

سے پوچھے ۔۔کیا وہ اپنی بیٹی پر اتنا بھروسہ کر سکتے ہیں۔ یا اُسے ٹی وی اسٹار اسی احتیاط
سکتے ہیں۔ مگر وہ خاموش ہو گئی۔ بیگل صاحب نے جانا کہ بوجھ لگ چکی ہے اس
"میں پھر آؤنگا۔ بار بار آؤنگا جبتک کہ تم حامی نہ بھر لوگی" نیا ادا سے مسکرائی اور
شاید قیامت تک یہ ڈرامہ نہ ہو سکے" اسی لہجے میں بیگل صاحب نے بھی کہا۔
"کبھی کبھی منت سماجت کروانا ... مسلسل انکار کئے جانا ۔۔ تنگ کرنا۔ اور پھر
کروانا کتنا اچھا لگتا ہے" بیگل صاحب کے جانے کے بعد نیا نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔
اور جلدی جلدی کاغذ سمیٹنے لگی۔ آج نیا کے مسرور رہنے کی ایک اور وجہ بھی تھی ۔۔
خانم نے سردار صاحب کو قیمتاً زمین دینے پر رضامند کر لیا تھا۔ اور سردار صاحب نے
سستے داموں زمین نیا کے نام کر دی تھی۔ جب خانم نے انہیں فون پر کہا ۔۔
"سردار صاحب! نیا اور طرح کی لڑکی ہے۔ پہلے اسے مشکور کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر
رفتہ اُسے اپنے ڈھب پہ لے آئیں گے" تو سردار صاحب جھٹ مان گئے تھے۔ نیا ان باتوں
بے خبر تھی۔ خانم سے زمین کی رجسٹری کے کاغذات پا کر نیا کو یوں محسوس ہوا جیسے ہفت اقلیم کی
دولت ہاتھ آگئی ہو۔ ہواؤں میں اُڑتی گھر پہنچی ۔۔ اور بے اختیار کاغذات کھول کر امی جان کے آگے
"یہ کیا ہے ۔۔؟" حسب معمول امی جان لاعلمی کے کنوئیں سے بولیں۔
"میں نے گھر کے لئے زمین خرید لی ہے امی، موتی کے نام پہ" وہ جھوم کر بولی۔ "اب ہم
ایک گھر بنائیں گے ... اور تینوں مل کر اس میں رہیں گے۔ دیکھیں گے پھر کون ہمیں اس گھر
بے دخل کر سکتا ہے؟" امی جان نے آہستہ سے اپنا چہرہ اٹھایا۔ اور نیا کے مسرور و شادمان چہرے
نظریں گاڑ دیں۔ پوچھنا وہ یہ چاہتی تھیں کہ ابھی تمہیں کراچی آئے صرف ایک سال ہوا ہے۔
ایک سال میں تم نے زمین کیسے خرید لی ۔۔؟ اور گھر کس طرح بناؤ گی؟ ۔۔ مگر نیا کا خوشی
دمکتا ہوا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

آج خانم کے کمرے میں میٹنگ تھی۔ نیا کو معلوم تھا۔ مگر اُسے دفتر آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی
ب وہ خانم کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ نیا سلام کر کے ایک
بیٹھ گئی۔ پہلے تو اس کو جائزہ لینا تھا سب لوگوں کا ۔۔ سب چہروں کا ۔۔ شاید کوئی بات محفل میں
تھی۔ سبھی بحث میں مصروف تھے۔ حاتم صاحب پتہ نہیں کون تھے۔ مگر بڑے درد سے کہہ
تھے۔
"سبھی ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے۔ مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم ٹنوں کے حساب
شک دودھ امپورٹ کرتے ہیں اس ملک کے مویشیوں کو کیا ہوا، اس ملک کے لوگوں کو کیا ہوا؟"
"بھئی لوگ اب خشک دودھ پسند کرنے لگے ہیں، بس اتنی سی بات ہے" سجاد صاحب نے
سے کہا۔
خشک دودھ کوئی بھی پسند نہیں کرتا" حاتم صاحب بولے۔ صرف مجبوری ہے۔ یا تو وہ
سستا پڑتا ہے یا آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے اور اس کے لئے محنت بھی نہیں کرنی
بس پانی میں گھولا اور استعمال میں لے آئے۔
ایک اور فائدہ بھی ہے اس کا ۔۔۔" خانم سگریٹ کا کش لینے کے بعد بولی "پہلے ہمارے

گوالے دُودھ میں گندا پانی اور جانے کیا کیا مِلا کے لے آتے تھے۔ اب وہ ڈبے کا دودھ ہے
ہیں۔ مزے میں بھی فرق نہیں پڑتا۔ اور غذائیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس پر زور دینا چاہیے
"لیکن اس لیئے پر ہمیں سوچنا چاہیئے۔" حاتم صاحب پھر بولے۔ "ایسا کیوں ہوا کہ ڈبے کا
بچور دروازے سے ہمارے ملک میں گھس آیا۔ کم از کم دودھ اور گھی میں تو ہمیں خود کفیل ہونا
"رہنے دیں حاتم صاحب! ٹی وی پر بچوں کے دودھ کے اتنے اشتہار آتے ہیں کہ
اوقات میں سوچتی ہوں۔ ہماری ننھی نسل کیا اِن ڈبوں کے سہارے ہی پروان چڑھے گی
صاحب جو کافی دیر سے چپ بیٹھے تھے، بول اُٹھے۔

"آپ کو معلوم ہے، اب جدید مائیں بھی ڈبے کے دودھ کو ترجیح دیتی ہیں۔" خانم نے اپنا
فلسفیانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ اِن کا خیال ہے کہ ماں کا دودھ پینے سے مائیں جذباتی طور پر
بچوں سے بہت زیادہ وابستہ ہو جاتی ہیں یا بچے اتنی زیادہ وابستگی محسوس کرتے ہیں کہ ماں کے
مشاغل میں حائل ہونے لگتے ہیں۔" اِسی وقت نیاّ کو محسوس ہوا، جیسے اس کی چھاتیوں میں
ہے اور سینہ میں کوئی گرم اُبال سا آیا ہے۔ کیا یہ مامتا ہے اس نے سوچا۔ کیونکہ اس نے اپنے
دو سال موتی کو اپنا دودھ پلایا تھا۔

"اب حالات ایسے ہو گئے ہیں۔" خانم بولتی گئی "کہ عورت کو دفتر کی ذمہ داریاں بھی اٹھانی پڑ
گئی ہیں۔ یہاں بھی میاں بیوی دونوں مل کے زندگی کو ایندھن مہیا کر سکتے ہیں۔ اگر بچے کو شروع
ہی ڈبے کے دودھ پر ڈال دیا جائے تو ماں کو باہر نکلنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔"

"آسانی تو ٹیوب بے بی میں بھی بہت ہے۔" بڑی دیر سے چپ بیٹھے ہوئے بیگ صاحب
نے آہستہ سے کہا۔

اس پر سب ذرا سی دیر کے لئے چونکے۔ پھر سب نے قہقہہ لگایا۔ پوری محفل میں صرف
خواتین تھیں اور اِن میں سے بھی صرف ایک موضوع پر بول رہی تھی۔ نیاّ بالکل چپ تھی۔ جانے نیاّ کو
یہ موضوع پسند نہیں تھا، یا وہ بھی کوئی دھماکہ خیز بات کہنے کے انتظار میں تھی۔

"بھئی ہم لوگ بالکل اپنے موضوع سے بھٹک گئے ہیں۔" خانم نے سگریٹ بجھا کر کہا۔ بلکہ
ہم بھٹک رہے ہیں۔ اصل میں ہم یہاں آج ڈبے کے دُودھ کی اہمیت پر زور دینے کو اکٹھے ہوئے
تھے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ داؤد صاحب نے بچوں کے دودھ کے لئے جاپانی فرم کے ساتھ مل کر
نیا اور بہت فرانسیسی آزمایا ہے۔ اس وقت بازار میں۔ بچوں کے خشک دودھ کے بے شمار برانڈ
ہے تھے، جن میں ملکی بھی ہیں اور غیر ملکی بھی۔ اس میدان میں مقابلہ سخت ہے۔ سوچنا یہ ہے
کس طرح پبلسٹی کی جائے کہ اِن کی فیکٹری میں بنا ہوا خشک دودھ سرِ فہرست آ جائے۔"

"بس پھر تو آپ اِسی ایک پوائنٹ کو سامنے رکھیں کہ اس دَور میں جبکہ میاں بیوی دونوں کا
ملازمت گاڑی کو کھینچنا ضروری ہو گیا ہے اور اگر بچے کو ڈبے کے دودھ پر لگایا گیا تو ماں اپنے
ذہن پریشانیاں لے کر دفتر میں نہیں جاتی۔" حاتم صاحب بولے۔

"کس نام سے پبلسٹی کریں گے آپ اِس دودھ کی۔" بیگ صاحب نے براہِ راست داؤد
صاحب سے پوچھا۔

"آغوشِ ملک۔" داؤد صاحب بولے۔

"واہ بہت اچھا نام ہے۔" حاتم صاحب نے داد دی۔

"انہوں نے ایک اور جدت بھی کی ہے۔" خانم نے دخل اندازی کی۔ "ڈبے کے دودھ کے
ساتھ انہوں نے بچوں کے فیڈر اور نپل بھی بنائے ہیں اور اسی نام سے بناتے ہیں۔ یعنی "آغوش
فیڈر اور آغوش نپل۔"

"پھر تو اِن کی فیکٹری کا نام "آغوشِ مادر" ہونا چاہیئے تھا۔" بڑی دیر سے چپ بیٹھی نیاّ نے برجستہ
کہہ بھیجا۔ اس پر ایک خوش گوار سا قہقہہ نہ صرف فضا کو رنگین بنا گیا بلکہ سب کو نیاّ کی موجودگی
کا احساس بھی ہو گیا۔ بلکہ ان کو اندازہ بھی ہو گیا کہ نیاّ ایک انتہائی ذہین خاتون ہے۔ پھر سب لوگ
اپنی اپنی رائے دینے لگے کہ کس طرح پبلسٹی کی جائے۔ کس طرح کمپین شروع کی جائے۔ جب
سب لوگ اپنی اپنی رائے کا اظہار کر چکے تو نیاّ بولی۔

"پبلسٹی کے یہ زوردار اور بلند بانگ قسم کے طریقے سب مقبول ہو چکے ہیں۔ اب آپ
بالکل سادہ اور گھریلو سا طریقہ اپنائیں کیونکہ لوگ اب سادگی کو پسند کرنے لگے ہیں۔"

"مثلاً ــــ" داؤد صاحب نے براہ راست نیا کی طرف دیکھا۔ "آپ ہی بتائیے۔"

"مثلاً یہ کہ۔" نیا نے سر جھکایا اور کاغذ پر پنسل سے کچھ لکھنے لگی۔ پھر سر اٹھا کر بولی۔
"اگر اسکرین پر ایک گھریلو اور سادہ سی ماں دکھائی جائے، جو گھر کے کاموں میں بری
مگن ہے۔ اتنے میں جھولے میں پڑے ہوئے بچے کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگتی ہیں
گھڑی پر نظر ڈالتی ہے سامنے کارنس پر "آغوش ملک" کا ڈبہ دھرا ہے۔ جلدی سے اُسے ا
دودھ بناتی ہے تو "آغوش فیڈر" سامنے آجاتا ہے۔ دودھ کو "آغوش فیڈر" میں ڈال دیتی
اتنی دیر میں بچہ کچھ زیادہ ہی مچل گیا ہے۔ وہ دوڑ کر آتی ہے بچے کو جھولے میں سے اٹھا
گود میں لٹا لیتی ہے۔ اور "آغوش فیڈر" اس کے منہ کو لگا دیتی ہے۔ بچے کو سکون آجاتا ہے۔
فلیش بیک سے آواز آئے گی۔

"ماں کی آغوش میں جاتے ہی بچہ "آغوش ملک" مانگتا ہے"۔۔۔۔۔

دوسری آواز کہے گی۔

"وہ بھی "آغوش فیڈر" میں "آغوش نپل" کے ساتھ۔"

سب تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ جیسے ہر کوئی اپنی اپنی جگہ سوچ رہا
میں چپراسی چائے لے کر اندر داخل ہوا۔

"نیا تم نے بہت خوبصورت آئیڈیا دیا ہے۔ ہم اس پر مزید غور کریں گے۔ اس خو
سب کو چائے تو پلواؤ۔" خانم نے بڑی خوش دلی سے کہا، اور نیا اٹھ کر چائے بنانے

میں اس وقت سے سوچ رہی ہوں نیا کہ تمہارے ذہن میں ہمیشہ اچھوتا نرالا خیال
کیسے آجاتا ہے۔؟" خانم نے نیا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں مجھے تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ تم جتنی حسین ہو۔ اتنے ہی خوبصورت خیال
تم رکھتی ہو۔ تمہارا یہ خیال سیٹھ صاحب کو بھی بہت پسند آیا ہے۔ ہم نے سوچا ہے کہ اس پر
اب خوبصورت رنگین فلم بنائیں گے۔ مگر جانتی ہو سیٹھ صاحب کی ضد کیا ہے؟"

"کیا ہے؟" نیا نے ادا سے پلکیں اٹھائیں۔

"سیٹھ صاحب کہتے ہیں کہ وہ اپنی ساری دولت لٹا دیں گے، مگر اُن کی پبلسٹی فلم میں
نیا کام ضرور کرے گی۔"

"نہیں خانم ــــ" نیا جلدی سے بولی۔ "میں فلم میں کام نہیں کر سکوں گی۔"

"کیوں نہیں کر سکو گی تم اتنی ٹیلنٹیڈ ہو۔"

"خانم۔ بس میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ میری امی اجازت نہیں دیں گی۔"

"ان سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ایک، خود مختار عورت ہو۔ وہ پرانے زمانے
کی ہیں انہیں اس زمانے کے تقاضوں کا اندازہ نہیں ہے۔ تم جو صحیح سمجھتی ہو۔ وہی کرو۔"

"خانم یہ ایسی بات نہیں، جو اُن سے چھپائی جا سکے۔ ایک نہ ایک دن تو انہیں پتہ چل جائے گا۔" نیّا نے کہا۔

"دیکھو نیّا! کل جو کام معیوب خیال کئے جاتے تھے۔ آج ان پر فخر کیا جاتا ہے۔ تمہیں یاد ہے ابتدا میں جو کام بھی ہوا لوگوں نے اِس پر اعتراض کیا۔ اسے معیوب گردانا۔ اِس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے، مثلاً جب یہ بجلی پسماندہ ملکوں میں پہنچائی گئی تھی تو لوگوں نے اُسے آسمانی آفت سمجھ کر واویلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب ریل گاڑی پہلی بار متعارف کرائی گئی تھی تو اُسے بھی ذہنی طور پر قبول نہیں کرتے تھے۔ جب شروع شروع میں ریڈیو کا رواج ہوا تھا۔ تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب گھر گھر میں مجرا ہو گا، لیکن آج وہی ریڈیو ضروریات زندگی میں شامل ہو گیا ہے اور ریڈیو پر گانا، یا ڈراموں میں حصّہ لینا باعثِ فخر سمجھا جاتا ہے۔ دور کیوں جاؤ۔ چودہ پندرہ سال پہلے ٹی وی کو بھی اسی قسم کی تنقید کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ مگر اب اچھے گھرانوں کی لڑکیاں بھی ٹی وی پروگراموں میں حصّہ لیتی ہیں۔ اسی طرح پہلے پہل لوگ عورت کی ملازمت کے مخالف تھے۔ مگر اب بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہماری بیٹی یا بیوی فلاں فرم میں فلاں عہدے پہ کام کرتی ہے۔ یاد ہے کسی زمانے میں ایئر ہوسٹس بننا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر اب ہر نوجوان لڑکی کا خواب ہی فضاؤں میں جاگتا ہے اِسی لئے ہوا تی کمپنیوں نے بھی شکل و صورت کی پابندیاں اٹھا دی ہیں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لڑکیاں اِس طرف آسکیں۔ اب تم کس کس فیلڈ کی بات کرو گی یہ بات کہ لوگ باتیں بنائیں گے۔ رشتہ دار طعنے دیں گے۔۔۔ تو اس حقیقت کو بھی تسلیم کر ہی لو کہ لوگ صرف باتیں بنانے کے لئے ہوتے ہیں اور عزیز و اقارب طعنے دینے کے لئے۔ تمہارے دوست اور بہی خواہ ہمیشہ تمہاری شہرت سے خوش ہوں گے۔ جب کسی گھرانے کی ایک لڑکی شہرت کی تلاش میں گھر سے باہر نکل جاتی ہے تو باقی لڑکیاں اس آرزو میں تڑپنے لگتی ہیں کہ کسی بہانے وہ بھی گھر سے باہر نکل جائیں۔"

نیّا خاموش بیٹھی سُن رہی تھی۔

نیّا کے پاس واقعی دلائل نہیں تھے۔ مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کسی اشتہاری فلم میں کام کرنے کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ دوسری طرف اس کے من کے اندر ایک چور بیٹھا تھا۔ جو دھک دھک کی تال پر کہہ رہا تھا۔

اور قدم تیز تیز۔۔۔۔

اور قدم تیز تیز۔۔۔۔

منزلِ مادور نیست ——— !

ایک بار اس کا بھی اسکرین پر آنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ایک بار اپنے آپ کو مجسّم دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اپنی من موہنی صورت اپنی نظروں میں اُتارنے کی تمنّا تھی۔

"تم ایک بار کوشش تو کر کے دیکھو۔" اُسے خاموش دیکھ کر خانم نے پھر اپنے ترکش سے ایک اور تیر پھینکا۔ "سیٹھ صاحب تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ ہم پر اِن کے بہت سے احسانات ہیں۔ شاید آگے چل کر وہ تمہارے کام آسکیں۔"

"خانم میں ڈرتی ہوں۔ میں بہت بزدل ہوں۔" نیّا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہ تم بزدل ہو نہ تم ڈرتی ہو۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو اور اب تک مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرتی رہی ہو۔ بہت آگے جانے کے لئے زندگی کی فرسودہ روایات کو روندنا پڑتا ہے۔ اپنی ذرا سی خود اعتمادی کو روڈ رولر بنا کر۔"

خود نیّا کی تمنّا بہت آگے جانے کی تھی۔ بہت آگے ——— وہ جانتی تھی ستاروں سے آگے بھی جہان ہیں۔ یہ مگر کیا کرتی ——— ؟

ایسی آزمائش کی کٹھن گھڑی میں جانے کہاں سے خواجہ عبدالرّحیم نکل آتے تھے۔ آخر تم ——— اس وقت کیوں میرے سامنے آجاتے ہو۔ جب میں فیصلے کی سُولی پر اُلٹی لٹکی ہوئی ہوتی ہوں ——— بالکل اچانک ——— ۔۔۔

نیا پر گھبراہٹ کے دورے پڑ رہے تھے۔ وہ خود بھی محسوس کر رہی تھی کہ آج
ضرورت سے زیادہ نروس ہو رہی ہے۔ نہیں نہیں — نروس نہیں تھی۔ بلکہ اس کیفیت
کو تو EXCITEMENT کہتے ہیں۔

ایکسائٹمنٹ کے تو اس سے پہلے اور بھی بے شمار موڑ آئے تھے۔

جب اس نے بیوٹی پارلر جوائن کیا تھا۔ جب پہلی بار اس نے جہاز کی سیڑھی پر
رکھا تھا۔

جب پہلے پہل خانم کے دفتر آئی تھی۔ اور بھی بہت سے مواقع آئے تھے۔ مگر
وہ ایک تجربہ کار اور با اعتماد لڑکی تھی۔ پھر یہ کیسا انوکھا نرالا تجربہ تھا۔ ہر نیا کام کر کے پہلے
شاید آدمی اس طرح محسوس کرتا ہے۔ جیسے اس نے کھلے آسمانوں میں چاند گاڑی
قدم رکھا ہو۔ یہ تسخیر اور دریافت کی بات نہیں تھی۔ ایک نئے جنم کی بات تھی۔ آج وہ
سے بھی جلدی آگئی تھی۔ جی بھر کے موتی کے ساتھ کھیلی تھی۔ مگر کھیلتے کھیلتے وہ چونک
سوچنے لگتی۔ پھر اپنی گھڑی دیکھتی۔ وقت تو ہمیشہ اپنی رفتار سے گزرتا ہے۔ وہ جانتی
مگر اس کا دل چاہتا کہ کبھی کبھی وقت انسان کے اختیار میں آجایا کرے۔ ان کے بند

چلے — ان کی حاجت بن چلے۔ مگر یہ کتنی انہونی بات تھی۔ بفرضِ محال ایسا ہو بھی جاتے
وقت کتنے انسانوں کا ساتھ دے سکے گا —— ؟ بیک وقت آدھی دُنیا چاہ رہی ہوتی کہ
ت ٹھہر جائے۔ جبکہ دوسری آدھی دنیا یہ خواہش کرتی کہ وقت بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ
ر جائے — ہجر اور وصال کے درمیان وقت بہت بڑی حقیقت ہے۔

آج موتی بھی تھک کر جلدی سو گیا تھا، نیا نے اپنے کپڑوں کی الماری ٹھیک کرنا چاہی
کپڑوں کا سارا ڈھیر بازوؤں پر آرہا۔ ترتیب دینے کو تو کبھی کبھی دل چاہا کرتا ہے وہ رسالہ
لے کر لیٹ گئی۔

صفحہ صفحہ دیکھ ڈالا —— مگر ایک لفظ بھی نہیں پڑھا گیا —— ایک تصویر بھی اُبھر کر
ہوں کے آگے نہیں آئی۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی اور بے اختیار اُٹھ کر ٹی وی آن کر دیا۔
آنی ہوتے ہی دیکھا کہ ایک اشتہاری فلم چل رہی تھی گھما کر جلدی سے بند کر دیا۔ مگر پھر
نی بے وقوفی پر ہنسی آئی۔ دوبارہ ٹی وی لگا دیا۔ اور آواز اتنی آہستہ کر دی۔ جتنی وہ خود ہی
یب بیٹھ کر سُن سکتی تھی۔

ماجی صرف سات ہی بجے تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پھر سیدھی امّی جان کے کمرے
چلی گئی۔ امّی جان کی طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اس لئے وہ سرِ شام سر پہ کپڑا لپیٹے
رہی تھیں۔ آج شاید انھیں چکر زیادہ آرہے تھے۔ یہ دیکھنے کے لئے آیا وہ سو رہی ہیں۔ یا
ل رہی ہیں۔ وہ ان کے سرہانے کھڑی ہو گئی اور پھر آہستہ سے بولی۔

"امّی جان ——" امّی جان بے سُدھ پڑی تھیں۔

"امّی جان ——" دوسری آواز قدرے بُلند تھی۔ امّی جان نے چونک کر یوں اپنی لال
کھوں سے اسے گھورا جیسے انہیں اس پر فرشتۂ اجل کا گمان گزرا ہو۔ نیا گھوم کر ان
سامنے آگئی۔

کیا حال ہے آپ کا امّی جان ——؟"

"ٹھیک ہوں"۔ امی نے ذرا پرے ہٹ کر بستر پہ نیا کو جگہ دی۔

"طبیعت کچھ بہتر ہوئی ہے یا نہیں ؟"

"ابھی تک تو چکر آ رہے ہیں۔ ٹھیک ہو جاؤں گی"۔

"گولی کھائی تھی آپ نے ——؟"

"کھالی تھی ——"

"آپ کوشش کریں کہ نیند آ جائے"۔

"اس عمر میں کہیں کوشش سے نیند آتی ہے ؟"

"میں آپ کو ویلیم دے دوں ؟"

"نہیں بیٹی! ویلیم کھانے سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ ابھی مجھے اُٹھ کر نماز بھی پڑھنی ہے۔ اگر نیند کی گولی کھالوں تو نماز بھولنے لگتی ہے۔ کچھ کا کچھ پڑھ دیتی ہوں۔

"آپ اب سو ہی جائیں تو بہتر ہے —— ورنہ آپ کو آرام نہیں آئے گا"۔ یہ کہہ کر نیا کا ہو گئی اور جانے کو مڑی۔

"کیا تمہیں کسی کا انتظار ہے۔؟"

"نہیں تو ——" نیا نے اپنی بے قراری چھپاتے ہوئے کہا۔

"پھر جاؤ —— سو جاؤ —— تھکی ہوئی لگ رہی ہو"

"سو جاؤں گی امی ——" جاتے جاتے نیا نے درمیان والا دروازہ اس بے سے بند کیا۔۔۔۔ گویا غیر ارادی طور پر ایسا کر رہی ہو۔ مگر وہ ذرا سا کھلا رہ گیا۔ جسے دروا اس نے مناسب نہ جانا۔ اور آ کے ٹی وی کی آواز ذرا سی اُونچی کر دی۔ اور یوں سامنے ڈال کر بیٹھ گئی۔ جیسے وعظ سننے کا ارادہ رکھتی ہو۔ تھوڑی دیر ہتھیلی پہ ٹھوڑی رکھے بیٹھی بالآخر وہ وقت آ گیا —— وہ وقت —— جس کے انتظار میں نیا نے سانس روک رکھ انگریزی فلم کے ختم ہوتے ہی —— ایک نئی اور رنگین ایڈ چلنا شروع ہوئی۔

ایک خوش پوش اور خوش وضع مرد اپنا بریف کیس اٹھائے، تیز تیز قدموں سے دفتر کی سیڑھیاں اتر آیا اور کار میں بیٹھ گیا۔ پھر وہ کار ایک گھر کے آگے رُکی۔ وہ دوڑ کر نکلا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ بیڈ روم میں گیا۔ بیوی کو پکارا وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ بیوی کی جگہ کمرے میں ایک خوبصورت مہک پھیلی ہوئی تھی۔ جونہی اس جادوئی خوشبو نے اسے اپنے ہالے میں لے لیا۔ وہ بیوی کے لئے اور بے چین ہو گیا۔ چاروں طرف اسے دیوانہ وار ڈھونڈا —— بچوں کے کمرے میں دیکھا۔ کچن میں گیا۔ نہیں ملی تو واپس بیڈ روم آ گیا —— اُسی وقت ملحقہ غسل خانے کا دروازہ کھٹ سے کھلا اور دیدہ زیب گلابی رنگ کی نائٹی میں۔۔۔۔ ایک حور شمائل برآمد ہوئی۔ نائٹی میں سے کا انگ انگ چھلکا پڑ رہا تھا۔ گداز بازو ننگے تھے۔ قیامت خیز آنکھیں مسکرا رہی تھیں ہونٹوں بان لیوا تبسم تھا اور وہ خوشبوؤں میں بسی باہر نکل آئی۔ اس کے شوہر نے لپک کر اُسے دونوں میں بھر لیا اور پھر ایک چکر دے کر سامنے ڈبل بیڈ پہ پھینک دیا"۔

بیک گراؤنڈ سے ایک فقرا ابھرا۔

"سحور کن پرفیوم" کا جادو جو سر چڑھ کر بولتا ہے"۔

ایڈ تو کبھی کی ختم ہو چکی تھی، مگر نیا ابھی تک آنکھیں پھاڑے سکرین کو دیکھ رہی تھی۔

ہاں —— یہ خاتون جو ابھی ابھی غسل خانے سے فتنے جگاتی برآمد ہوئی تھی نیا تھی۔

جیتی جاگتی نیا۔

خوابوں کی کی۔ نیا۔!

جسے بالآخر خانم نے اس فلم میں کام کرنے پہ آمادہ کر لیا تھا اور جس کا سکرپٹ اس نے لکھوایا تھا۔ نیا نے کہا تھا۔

"خانم میں چاہتی ہوں ہم پھر اسی خاموش فلموں والے زمانے کی طرف لوٹ چلیں"۔

کیا مطلب ہے تمہارا ——؟"

"لوگ ہمیشہ ماضی کو پسند کرتے ہیں، پرانا فرنیچر — پرانے زیور — پرانا فیشن — زمانہ لوٹ لوٹ کر آتا ہے۔ آجکل ہر قسم کی اشتہاری فلمیں بن رہی ہیں۔ جن میں ملبوسات، گانا، ناچ، اچھل کود سب کچھ دکھایا جا رہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے۔ اب ہم ایک خاموش فلم بنائیں۔

"خاموش فلم کیسے بنے گی۔ اور ہم اپنا مدعا کس طرح بیان کر پائیں گے۔

"دیکھیئے — میں آپ کو خوشبوؤں کے لئے ایک آئیڈیا دیتی ہوں۔ آپ بھی یقین کریں گے ہیں ناکہ خوشبوئیں بولتی ہیں — خوشبو کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔؟"

"ہاں —؟"

"تو اسی بات کو ہم سلولائیڈ پر دکھا دیں گے۔"

"کس طرح —؟"

"اس طرح —" نیا نے پوری وضاحت کی پھر مزید کہا۔ "ہم جو خیال لوگوں کے ذہن تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ رات کے وقت تھکا ہارا شوہر جب گھر آتا ہے — اپنے بیڈ روم میں گھستے ہی اُسے اپنی بیوی کی مخصوص خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی ملتی ہے تو بیوی کے لئے اُس کی طلب بڑھ جاتی ہے — وہ مضطرانہ اُس کو ڈھونڈتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے ایک فقرہ بھی نہیں کہیں گے۔ یہ کام خوشبو دے گی۔ وہی خوشبو جس کا اشتہار بنانا مقصود ہے۔" خانم مرعوب ہو گئی تھی۔ اور فلم بنانے کی تہیہ کر لیا تھا۔ اب اس نے نیا کو قائل کرنا تھا۔ تاکہ اس خاموش فلم میں نیا اپنی جان ڈال دے کیونکہ جب تک اس میں اتنی حسین لڑکی کام نہ کرے۔ جس کا ایک ایک انگ اور ایک ایک خود بولتا ہو تو یہ فلم کیسے چلے گی۔ خانم کے دلائل کے آگے نیا کی ایک نہ چلی تھی۔ اور اب ابھی تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس حسینہ کو دیکھ رہی تھی جو لمحہ بھر کو آئی اور اس کے من میں ہلچل مچا گئی تھی۔ ایک پری پیکر — ایک اپسرا — یا ایک دشمنِ ہوش و خرد —

وہ بجلی کی مانند کوندی تھی۔ اپنا آپ دیکھ کر نیا خود دنگ بیٹھی تھی۔ محویت کے اس عالم میں اُسے پتہ ہی نہ چلا — کہ امی جان اس کے پیچھے کھڑی ہیں اور انہوں نے بھی یہ فلم دیکھ لی ہے۔ ذرا سی سر سراہٹ پر وہ اپنی محویت سے چونکی اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے ایسے لگا۔ جیسے امی جانکنی کے عالم میں ہیں۔ ان کے چہرے پر نزع کی سی کیفیت تھی۔ ابھی وہ انہیں کچھ کہہ بھی نہ پائی تھی کہ امی جان لڑکھڑا کر آگے بڑھیں اور نیا کے قدموں میں یوں ڈھیر ہو گئیں جیسی کوئی اپاہج بغیر بیساکھیوں کے چلنے کی کوشش میں پہلا قدم اٹھاتے ہی ڈھیر ہو جاتا ہے۔

امی جان کا سر نیا کے گھٹنے کو لگا تھا — سنبھلنے سے پہلے نیا نے امی جان کی چیخیں سن لی تھیں۔

امی جان رو رہی تھیں۔

امی جان بلک رہی تھیں۔

امی جان کی رُوح پرواز کر رہی تھی —

"نہیں۔!"

امی جان نے نیا کو سکرین پر اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ شک تو انہیں اُسی وقت ہو گیا تھا کہ کوئی انہونی بات ہونے والی ہے۔ جب نیا ان کے کمرے میں جا کر انہیں بار بار سونے کی تلقین کر رہی تھی۔ اس کے آتے ہی وہ بھی نماز پڑھنے کے لئے اُٹھ گئی تھیں۔ ادھ کھلے دروازے میں سے انہوں نے دیکھا تھا۔ نیا دروازہ ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی۔ وہ بھی دبے پاؤں دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں آئیں اور پیچھے کھڑی ہو گئیں — نیا دار فتگی اور محویت میں ان کا آنا محسوس ہی نہیں کر سکی تھی۔

جونہی وہ آ کر کھڑی ہوئیں ایڈیٹنگ شروع ہو گئی۔ امی جان نے زندگی بھر ذہنی دھچکے کھائے تھے۔ اس لئے ہر نئے زخم کے لئے اپنے آپ کو فوراً تیار کر لیتی تھیں۔ پر جانے کیوں — انہیں سکرین پر دیکھ کر بڑا شدید صدمہ پہنچا۔ انہیں یوں محسوس ہوا، کوئی آندھی اُٹھنے والی ہے۔ گرد باد

اور بگولوں سے لدی آندھی ـــــ جو اُن کی نیا کو اُڑا کر جانے کہاں لے جائے گی۔ نیا ایک بے بحر کی موج بن رہی ہے۔ جس کا کوئی کنارا نہیں۔ بس اِدھر سے اُدھر جانا ہی زندگی کا راگ بن جائے گا۔

"نیا۔۔۔۔ نیا۔۔۔۔" امّی جان نے اِس کے دونوں گھٹنے پکڑ لئے۔

"بیٹی تو راستہ کیوں بھول گئی ہے۔ یہ تیری منزل نہ تھی۔ میں نے تجھے منتوں مرادوں سے پایا تیرا باپ تیرے سر کا ایک بال بھی کسی کو دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا کہ چند ٹکوں کے لئے تو نے اپنے باپ کی عزت فروخت کر دی"۔ نیا کے اندر غصّے کا ابال اُٹھا۔

"اگر تو عزت و آبرو سے روٹی کما سکتی تھی۔ اگر میں نے تجھے نوکری کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ تو پھر تو نے اس سے آگے نکلنے کی کوشش کیوں کی۔؟ کیوں کی؟"

"میرے پر کاٹ دو ماں ـــــ میرے اندر ذوقِ پرواز اتنا زیادہ ہے کہ جی چاہتا ہے کسی روز خود ہی اڑ جاؤں"۔ مگر وہ پھر بھی چُپ رہی۔

"بولو نیا ـــــ مجھے اذیّتیں دے کر مارنے کے لئے ساتھ لے آئی ہو؟ میں نے کیا قصور کیا ہے۔ یہی نا کہ اس وقت تمہارا ساتھ دیا۔ جب سارے تمہارا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ مجھے معلوم ہے یہ فلم دیکھ کر تمہارے بھائیوں کا کیا حال ہو گا۔ تمہارے سارے دُکھ میرے دُکھ ہیں۔ یوں کرو۔ ایک دن اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو۔ مجھے مار دو۔ میری زندگی کی اذیّتیں ختم کر دو۔ مجھے پل پل کی یہ موت پسند نہیں ہے نیا"۔ یہ کہہ کر امّی جان نے اپنا سر نیا کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور بچّوں کی طرح رونے لگیں۔ امّی جان کا سر نیا کے گھٹنوں پر تھا۔ سر کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں کوئی کالا بال گزرے وقت کی کہانی سناتا نظر آ رہا تھا۔ امّی کے سفید بالوں میں اُن کی ساری زندگی چھپی ہوئی تھی۔ کبھی یہ سر سیاہ تھا۔ تو دل بھی جوان تھا۔ جوان دِل میں بے حد امنگیں اور حشر ساماں ولولے بھی ہوں گے۔ اس دِل نے بھی بھرپور انداز میں زندہ رہنے کی تمنا کی ہو گی۔

محمد تمنا کا عنوان خواجہ عبدالرحیم بن گیا ہو گا۔ ہاں تمنا کا عنوان اکثر غلط بن جاتا ہے ـــــ کہیں خواجہ عبدالرحیم۔ کہیں شہباز احمد خان۔

امّی نہیں جانتیں۔ بالکل نہیں جانتیں ـــــ میں تو ان کی زندگی کی محرومیوں کے بھی بدلے لے رہی ہوں۔ میری مجبور ماں اور یک دم اسے اِس سفید سر پہ پیار آ گیا۔ اِس سفید سر کا سایہ نہ ہوتا تو وہ دنیا میں کس قدر اکیلی ہوتی ـــــ کون ہوتا اِس کا یہاں ـــــ؟

"امی جان ـــــ" نیا نے اچانک امّی کو سینے سے لگا لیا۔ "اِس طرح نہ روئیں میری جان نکل جائے گی۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ آپ کو اِس قدر صدمہ پہنچے گا تو کبھی بھی ایسی حرکت نہ کرتی۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیں"۔ اِس نے امّی جان کو کندھے سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیا۔

امّی جان رو رہی تھیں۔ بے دم تھیں اور بات بھی نہ کر سکتی تھیں۔

"امّی جان اب تو جو ہونا تھا۔ ہو چکا۔ جو ہو چکا اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ امّی جان آپ اپنی حالت ٹھیک کریں۔ ورنہ میں رو رو کر پاگل ہو جاؤں گی"۔ نیا نے امّی جان کے دونوں ٹھنڈے ہاتھ پکڑ لئے۔

"ہم دونوں اس منجدھار میں تنِ تنہا ہیں نیا"۔ امّی جان نے انتہائی کمزور آواز میں کہا۔ "ہم دونوں کا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں"۔

"میں جانتی ہوں امّی"۔

"ہم دونوں کو اللہ کو ناراض نہیں کرنا چاہیئے"۔ نیا جی جان سے لرز گئی۔

"امّی جان آپ ناراض نہ ہوں۔ میرا خدا کبھی ناراض نہ ہو گا"۔ امّی چُپ ہو گئیں۔ نیا دوڑ کر پانی کا گلاس لائی۔ پھر ایک ذہنی سکون کی گولی نکال کر امّی جان کو دی۔ انہیں پانی پلایا اور ان کے پاؤں دبانے لگی۔ امّی تھوڑی دیر چُپ چاپ لیٹ کر چھت کو تکتی رہیں اور پھر نحیف آواز میں بولیں۔

"نیا تم میرے ساتھ وعدہ کرو۔ کہ اب تم کسی اشتہاری فلم میں کام نہ کرو گی۔ زندگی بھر نہ کرو گی"۔

"نہیں کروں گی"۔ نیا نے صرف انکار میں سر ہلایا۔

"کیا تم نے کوئی اور بھی معاہدہ کر رکھا ہے؟"

"نہیں ——" نیا نے پھر سر ہلایا۔

"مجھے سچ سچ بتاؤ میری بچی"

"امی جان بس ایک ڈرامے میں کام کر رہی ہوں، وہ بھی ہیکل صاحب نے اس قدر مجبور کیا تھا۔ کہ بس.... مانتے ہی بنی"

"بیٹی آج تمہیں اس طرح مجبور کرنے والے لوگ تمہارے دوست نہیں ہیں"

"میں جانتی ہوں"

"گھر سے نکل کر زندگی کے میدان میں آئی ہو۔ تو دوست دشمن کی تمیز بھی سیکھو" نیا نے نظریں جھکا لیں۔

"اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جو لوگ تمہارا چہرہ یا جسم خریدنا چاہتے ہیں۔ وہ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے" نیا کو ایک کپکپی آگئی اور بالکل اچانک اسے سرّار صاحب کے ساتھ ہوٹل میں گزارا ہوا دن بھی یاد آگیا۔

"گو میں چپ رہتی ہوں ہر وقت تمہارے ساتھ نہیں ہوتی، مگر میری آنکھیں ہر جگہ تمہیں دیکھتی ہیں" نیا نے ٹھنڈی سانس چھوڑی۔

"جہاں دلدل ہوتی ہے۔ وہاں پاؤں سنبھال کر رکھتے ہیں۔ دلدل کے اندر جانے پر کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ ہاتھ کھینچنے والا کوئی بھی نہیں ملتا۔ جب تم دل دل کے قریب جاتی ہو تو میرا دل روتا ہے" امی جان پھر آزردہ ہوئیں اور پھر رونے لگیں۔ نیا آہستہ آہستہ ان کے پاؤں دباتی رہی۔

"تم اگر یہ چاہتی ہو کہ زندگی کے باقی چند دن میں تمہارے ساتھ گزاروں، تو تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم اشتہاری فلموں میں کام نہیں کرو گی۔ کسی ڈرامے میں کام نہیں کرو گی۔ ورنہ میں.... میں اپنی چھت سے کود کر جان دے دوں گی جس میں تم نے مجھے قید کر رکھا ہے اور کبھی دن تم دفتر سے گھر آؤ گی تو تمہیں میری جگہ میری لاش ملے گی"

"نہیں امی جان ایسا نہ کہیں" نیا جلدی سے امی جان کے قدموں سے لپٹ گئی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔ آئندہ کسی ڈرامے میں کام نہ کروں گی۔ کسی اشتہاری فلم کا معاہدہ نہیں کروں گی۔ لیکن جو ہو چکا وہ واپس نہیں لے سکتی" امی جان کو جب اس کے وعدے کا اعتبار آگیا تو اپنے آنسو صاف کر کے بولیں۔

"اب اور وعدہ بھی کرو ——"

"کیا ——؟" نیا نے سر اٹھایا۔

"کوئی اچھا سا آدمی ڈھونڈ کر شادی کر لو گی" نیا گم صم ہو گئی۔

اب تم زیادہ تر مردوں کے حلقے میں رہتی ہو۔ اُن ہی میں سے کئی خواہش مند بھی ہوں گے۔ اپنی سمجھ سے کام لو۔ ایک ساتھی چن لو۔ نیک۔ وفادار۔ شریف نبھانے والا۔"

"نیک وفادار، شریف۔ نبھانے والا" نیا نے زیر لب دہرایا!

"کہاں ہو تم۔ کہ تمہیں میری آتما کھوجتی پھرتی ہے۔

میرے پر پھڑپھڑاتے ہیں۔ میری پرواز رُک رُک جاتی ہے۔

کس موڑ پر ملو گے تم مجھے ——"

کب تک میں آنکھوں پہ پٹی باندھے گول گول داتروں میں آنکھ مچولی کا کھیل

کھیلتی رہوں گی۔ آنکھ مچولی۔!

کہ جیون کا آخری اور پہلا کھیل یہی ہے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

اگلے ہفتے نیّا کے تینوں بھائیوں کے غیض و غضب میں ڈوبے ہوئے خطوط آنا شروع ہو گئے۔ تینوں بھائی جہاں جہاں تھے۔ وہیں وہیں سے انہوں نے نیّا کے نام اور امّی جان کے نام خطوط لکھے تھے۔ خطوط نہیں تھے۔ شعلے اُگلتی ہوئی دھمکیاں — اور نشتر چبھوتی ہوئی گالیاں تھیں۔ وہ سب کچھ لکھا تھا جو ایسے میں غیرت مند بھائی لکھتے ہیں اور بُرا بھلا کہنے میں اپنا ہر وہ حق استعمال کیا تھا۔ جو خون انہیں دیتا تھا۔

بڑے بھائی جان نے لکھا تھا "نیّا نے ہماری ناک کاٹ ڈالی ہے۔ کل تک جس شہر میں گردن اُونچی کر کے چلتے تھے۔ آج اس شہر کے گلی کوچوں میں نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ جگہ جگہ ہماری بہن کے اشتہار لگے ہیں"

وقاص بھائی نے لکھا تھا "نیّا نے ہماری عزّت کو دو کوڑی میں بیچ دیا ہے۔ بھرے بازار میں ہماری پگڑی اچھال دی ہے۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ کاش ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے زہر دے دیا ہوتا۔ کاش یہ پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی۔ مگر امّی جان! حیرت ہے کہ آپ کی غیرت کو کیا ہوا ہے؟"

ادیس بھائی کے خط میں غیرت ذرا زیادہ اُچھل رہی تھی "جس دن سے میں نے نیّا کو ٹرین پر دیکھا ہے میرا خون کھول رہا ہے۔ جی چاہتا ہے ایسی ننگِ خاندان لڑکی کو گولی سے اڑا دوں۔ اس کی بوٹیاں کر کے چیلوں کے آگے ڈال دوں، تاکہ آئندہ کسی بھی گستاخ لڑکی کو اپنے خاندان کی عزّت کے ساتھ اس طرح کھیلنے کا موقع نہ ملے۔ امّی جان! اپنی لاڈلی کی باگیں کھینچ لیں بے مہار ہونے سے پہلے اس کے منہ پر دو چار طمانچے ماریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم میں سے کوئی اس کے ناپاک خون سے ہاتھ رنگ کے زندگی بھر کے لئے سلاخوں کے پیچھے چلا جائے اسے دھمکی نہ سمجھا جائے آئندہ اگر میں نے نیّا کو کسی اشتہاری فلم یا فلمی پرچے میں دیکھ لیا تو بھری ہوئی بندوق لے کر ہی کراچی آؤں گا۔ اور اپنا فیصلہ بندوق کی نالی سے سناؤں گا"

تینوں خط پڑھ کر نیّا چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اسے تعجب نہیں ہوا، اور نہ ہی افسوس ہوا۔ اس کے خون میں اُبال ضرور اُٹھا۔ اس کا جی چاہا۔ وہ بغاوت کے بحرِ خارزار میں چھلانگ لگا دے — ہاتھ پاؤں مارے — اور دُور تک نکل جائے۔ دُور تک جہاں زندگی کے آخری سرے پر ساحل پر باغیوں کو آخری سہارا دیا جاتا ہے اور پھر تھوڑی دیر تک کیتلی میں رکھے ہوئے پانی کی طرح کھولتے رہنے کے بعد۔ اس نے زبان کھولی تو صرف اتنا کہا۔

شکر ہے امّی جان! میرے بھائیوں نے میری خبر تو لی۔ اس سے پہلے تو انہیں کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ کہ مجھے خط لکھ کر میرا حال دریافت کریں۔ میرے بچے کے لئے شفقتیں بھیجیں۔ کبھی اتنا ہی پوچھ لیں زندہ ہو یا مر گئی ہو۔ کون تمہارا آسرا ہے۔ کہاں سے کھاتی ہو؟ انہوں نے تو اس ڈیڑھ سال میں اپنی ماں کی بھی خبر نہیں لی۔ جو غیرت مند بھائی اپنی بیوہ ماں کو اپنے گھر کھ روٹی نہیں کھلا سکتے اور جو غیرت مند بھائی اپنی مطلقہ بہن کے سر پر چادر نہیں ڈال سکتے۔ ان کو غیرت کے ایسے قلمی مظاہرے زیب نہیں دیتے۔

باپ کے مرنے کے بعد جو اپنی اپنی ڈگر پر چل نکلے۔ وہ آج باپ کے خون کے حق دار کیسے بن گئے امّی جان نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بستر پر بیٹھی آہستہ آہستہ وہ سیب کاٹ جوس پیتی رہیں، پچھلے

ایک ہفتے سے اُن کی طبیعت خراب تھی۔ شاید اُنہوں نے بہت غم کیا تھا۔ بہت رویا بہت روئی تھیں۔ اس لئے انہیں ہائی بلڈ پریشر کا ایک اٹیک ہو چکا تھا۔ دو دن ہسپتال میں رکھ کر نیا انہیں گھر لے آئی تھی اور بڑی دلجمعی سے ان کی تیمارداری کر رہی تھی اس نے ایک ہفتے کی دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ امّی کی اچانک بیماری نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔

امّی جان کو علم تھا کہ تینوں بھائی اسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار کریں گے اب چونکہ نیا نے ان سے وعدہ کر لیا تھا کہ آئندہ وہ ایسا کام نہیں کرے گا۔ اس لئے امّی جان نے اس ضمن میں مزید کچھ کہنا ضروری خیال نہیں کیا۔ وہ نیا کا چہرہ پڑھ رہی تھیں۔ نیا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ بھائی تو نیا کو گھر سے نکال یوں بھول گئے تھے۔ جیسے کوئی دودھ میں سے مکھی نکال دے اور یہ سب عذاب امّی جان کے لئے تھے۔ حیران تھیں کہ بیٹی کا ساتھ دیں یا بیٹوں کے در پر جا پڑیں۔

ایک ہفتے کے بعد جب نیا دفتر میں آئی تو خلافِ معمول چپ چپ سی تھی۔ حالانکہ وہ اس ایک ہفتے میں Talk of the town بن چکی تھی۔ پچھلے جمعہ اس کا ڈرامہ بھی ٹیلی کاسٹ ہو چکا تھا۔ جسے لوگوں نے بے حد سراہا تھا۔ نیا کا ایک اور ٹیلنٹ سامنے آیا تھا۔ اس کا بولنے کا انداز اور فقروں کی ادائیگی اتنی خوبصورت اور بے ساختہ تھی کہ لوگوں نے اس کے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ کر لی تھیں اس کی عدم موجودگی میں مبارک باد کے کئی پیغام آئے تھے۔ لیکن جانے کیوں نیا ڈری ڈری سہمی سہمی تھی۔ اُسے یوں لگتا تھا کہ جیسے ہر موڑ پر ہر چوراہے پر اس کا کوئی بھائی پستول لئے کھڑا ہے۔ کہیں نہ کہیں سے گولی ٹھائیں کرتی ہوئی آئے گی۔ کبھی کبھی تو بیٹھی بیٹھی اچانک بجنے والی فون کی گھنٹی سے بھی ڈر جاتی تھی۔ پہلے تو وہ فون کی تیز آواز سے لرز گئی۔ پھر ریسیور اٹھا لیا۔ کتنی دیر تک وہ پہچان ہی نہ سکی کہ کون بول رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ بڑی دیر کے بعد اسے پتہ چلا یہ تو شوقی صاحب تھے۔

یوں کیا بات ہے نیا صاحبہ۔ آج آپ کی طبیعت تو ناساز نہیں۔؟"

یوں کیا بات ہے۔" نیا نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میں آپ کو فون کر رہا ہوں۔ مگر آپ دفتر میں ملتی ہی نہیں تھیں۔"

پچھلے دنوں سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔ مگر آپ دفتر میں ملتی ہی نہیں تھیں۔"

میری امّی بیمار تھیں اور میں چھٹی پر تھی۔"

اوہ جی ـــــ اب کیسی ہیں۔؟"

اب تو ٹھیک ہیں جی ـــــ"

میں نے آپ کا ڈرامہ "شفق شفق دوشیزہ" دیکھا تھا۔ نیا خاموش رہی۔

میں آپ کا ڈرامہ کس قدر پسند آیا ـــــ سمجھ نہیں آتا کہ آپ کے حُسن کی داد دوں یا ایکٹنگ کی۔

لیکن میں نے پچھلے سالوں میں ایسا چہرہ سکرین پر نہیں دیکھا۔"

یہ حوصلہ افزائی ہے آپ کی ـــــ" نیا نے آہستہ سے کہا۔

آپ وہاں دفتر میں بیٹھی بیٹھی اپنے آپ کو ضائع کر رہی ہیں۔"

جی ـــــ؟" نیا چونکی۔

آپ سے بڑی سکرین آپ کی منتظر ہے۔"

جی میں سمجھی نہیں۔"

ابھی قبل از وقت بتانا تو نہیں چاہیئے۔ مگر میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ میں نے تو اپنے دوست سے کہہ دیا ہے کہ وہ آپ پر ایک کہانی لکھے۔ ایک جاندار اور خوبصورت کہانی جو ناظرین کو تیز کر دے۔ بالکل آپ کی طرح۔"

جی ـــ جی ـــــ" نیا حیرت سے بولی۔

میں آپ کو فلم میں لانے کا سہرا میرے سر ہو گا۔ یہ کارنامہ میں سرانجام دوں گا۔ اور ہیرو دوں گا۔ انڈسٹری کو آپ جیسی تعلیم یافتہ اور باشعور ایکٹرس کی ضرورت ہے اور یہ احسانِ عظیم میں کروں گا ـــــ میں ـــــ میں اپنی زندگی کا سارا سرمایہ لگا دوں

گا۔ میں آپ کو آپ کے شایانِ شان معاوضہ دوں گا۔ میں آپ کی مرضی کی کار دوں
"میں ——" نیا نے آہستہ سے فون رکھ دیا۔

"ہر آدمی 'میں' کی گردان کر رہا ہے۔

ہر نفس انا کے پنجرے میں پھڑپھڑا رہا ہے!

ویسے بھی نیا فلموں میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ وہ جگہ ہے
کانِ نمک رفت نمک شد" ہو جاتا ہے۔ اُس کو معلوم ہو گیا تھا۔ زندگی کا کینوس بہت
ہے اور اس پر بے شمار رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔ پھر بھی جانے کیوں اس سا
کی منزل کا تعین نہیں ہو رہا تھا۔ شہرت دبے پاؤں اس کی چوکھٹ پہ چلی آئی تھی۔
—— اور دولت کا اُسے انتظار تھا۔ دولت کمانے کا ایک راستہ انڈسٹری بھی ہو
مگر وہ سوچوں کے دوراہے پر تھی۔

پچھلے مہینے خانم نے اُس کی تنخواہ بڑھا دی تھی۔ یعنی اب وہ میڈیا مینجر تھی
کے باہر اس کے نام کی تختی بھی لگ گئی تھی۔

"نیا —— میڈیا مینجر"

اور تنخواہ بھی چار ہزار روپے ماہانہ!

چار ہزار روپے ماہانہ کے علاوہ اس کمپنی میں آ کر اس نے زندگی کے اور بھی کئی
دیکھے تھے۔ اور بھی دروازے کھلے تھے۔

خانم نے ساری بات توجہ سے سنی اور پھر اد۔ سے کہہ کر ریسیور رکھنے کے بعد کافی دیر
گم صم بیٹھی رہی، جیسے کوئی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اس نے حسبِ
سگریٹ سلگا لیا اور لمبے لمبے کش لیتی رہی۔ ہر کش کے دوران وہ سوچ میں اتنی دور
اس کا چہرہ غمازی کرنے لگتا کہ اس وقت کوئی بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے جب
سگریٹ ختم ہو گیا تو خانم نے اُسے ایش ٹرے میں بجھا دیا اور خود جیسے ایک نئے عزم کے
تازہ دم ہو گئی اور سیدھی نیا کے کمرے میں آ گئی۔ نیا اُسے دیکھ کر چونکی اور پھر کھڑی ہو گئی۔
کیسی ہو نیا ڈارلنگ؟" خانم نے یوں ہنس کر کہا، جیسے نیا کے علاوہ اس کا دُنیا میں
کوئی ہو۔

"اچھی ہوں خانم"

"اسے بھی بیٹھو، کام کرتے وقت کھڑی نہ ہوا کرو۔" خانم بھی اس کے سامنے کرسی پر
بیٹھ گئی۔ اس کا اُصول تھا کہ جس ملازم کے کام سے خانم خوش ہوا کرتی تھی، ہمیشہ اس کے کمرے
میں اس کی میز کے آگے بیٹھ جایا کرتی اور تھوڑی دیر گپ شپ لگایا کرتی تھی تاکہ ملازم کو احساس
نہ ہو لیکن اس پر کس حد تک مہربان ہے۔ ویسے بھی خانم دیکھ رہی تھی کہ نیا کافی دنوں سے

بجھی بجھی سی رہنے لگی ہے۔ شہر میں اس کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے اور لوگ اس پر فدا ہوئے جا رہے تھے۔ مگر وہ ملول ہو کر بجھ سی گئی تھی۔

"نیّا تمہاری امّی کا کیا حال ہے؟" خانم نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

"اب تو اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ہیں۔"

"میں تمہیں ایک خوشخبری سناؤں نیّا؟"

نیّا نے کسی انجانے خوف سے سہم کر خانم کی آنکھوں میں دیکھا۔ تمہاری خوشخبری زندگی خزاں رسیدہ کو بہار میں بدل دے گی۔ تم نے تو پہلے ہی مجھے خوابوں کے ایک ایسے جال میں پھنسا رکھا ہے کہ میں ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اس سے آزاد نہیں ہو سکتی۔

خانم نے نیّا کے چہرے پر تجسّس اور شک کے سائے ایک ساتھ دیکھ لئے تو لطف لیتے مسکرا کر بولی۔

"تمہیں معلوم ہے، تم یورپ جا رہی ہو؟"

"میں؟" نیّا اتنی زور سے چیخی کہ میز پر پڑا ہوا شیشے کا پیپر ویٹ تک لرز گیا۔ پھر اس نے لیا اور معذرت طلب نظروں سے خانم کی طرف دیکھ کر بولی۔

"آپ نے کیا کہا تھا خانم؟"

"میں نے یہ کہا تھا کہ تم یورپ جا رہی ہو۔"

"مگر کس لئے؟"

"تفریح کے لئے۔"

"کس کے ساتھ؟"

"میرے ساتھ۔"

"مجھے کون بھیج رہا ہے؟"

"کمپنی بھیج رہی ہے۔"

"آپ کے ساتھ، مجھے؟" نیّا نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں بھئی۔"

"مگر کیوں؟"

"واہ یہ کیوں کی تکرار اچھی ہے۔ بھئی تمہارا حق بنتا ہے۔ تم اتنے عرصے سے کمپنی کے مفاد کی خاطر کام کر رہی ہو۔ ہم اپنے اچھے مددگاروں کو ہمیشہ باہر بھیجا کرتے ہیں۔ اس مرتبہ میں نے سوچا تمہیں سیر کے لئے بھیج دیا جائے۔"

"آپ بھی تو جا رہی ہیں۔"

"ہاں مجھے بھی ایک ضروری کام سے جانا ہے، اتنے دن تم وہاں کی سیر کر لینا۔"

"کب جا رہی ہیں؟"

"پرسوں۔"

"پرسوں؟" یہ دوسرا جھٹکا تھا جس نے نیّا کو ششدر کر دیا۔

"پرسوں کس طرح جا سکتی ہوں، میں تو۔۔۔؟ میری تو تیاری ہی نہیں۔"

"تم بھی ایک پرچے پر مجھے اپنے تمام کوائف لکھ کر دے دو تاکہ شام سے پہلے میں تمہارا پاسپورٹ بنوا دوں۔"

"ایک دن میں یہ سب کیسے ہوگا؟" نیّا نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ سب ایک دن میں ہی ہوگا۔ نہ صرف پاسپورٹ بنے گا۔ بلکہ تمہارا ویزا بھی لگ کر آ جائے گا۔ تم نے آخر اتنے دوست کس دن کے لئے پال رکھے ہیں۔ ایک دن تیاری کے لئے بہت ہے۔ صرف اپنے دو چار جوڑے لے لو، باقی کپڑے وہاں سے خرید لینا۔ سفر میں دیسے فالتو سامان اور ملبومات لے کر نہیں جانا چاہیئے اور خاص طور پر اگر لندن جانا ہو تو زیادہ کپڑے لے کر جانا بیکار ہے۔ دنیا بھر کے لوگ اچھی خریداری کے لئے لندن جاتے ہیں اور پھر سمر میں تو وہاں ہر چیز کی خریداری کا ہوتا ہے۔"

اتنے میں خانم کے کمرے سے فون کی گھنٹی کی آوازیں آنے لگیں اور خانم دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

نیا کا دل دھڑک رہا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ وہ پیڈ سے سلپ نکال کر اس پر اپنی تاریخ پیدائش لکھنے لگی۔ اِس تاریخ کو پیدا ہونے والی لڑکی ایک دن یورپ جاتے گی، یہ کون جانتا تھا۔ اِس کے ہاتھ برابر کانپ رہے تھے آنکھوں میں رنگا کی صورت خواب ناچ رہے تھے۔

خواب۔ جہانِ نو کے۔

ستاروں سے آگے۔

آسمانوں کے قریب۔

طلب کا کوئی کنارا نہیں۔

طلب بڑی ظالم ہے۔

بجھی بجھی نیا ایک دم جل اٹھی تھی۔ زندگی کس کے ساتھ اتنی مہربانیاں کرتی ہے۔ لوگ جلتے ہیں تو جلا کریں۔ زندگی دکھ اٹھانے کے لئے نہیں ہے۔ آج وقت مہربان ہے تو وہ اپنے ساتھ سوتیلی ماں والا سلوک کیوں روا رکھے۔

کل پتہ نہیں کیا ہو۔

ابھی تو وہ کھوجتی پھرتی تھی۔

خوابوں کی رنگ برنگی تتلیاں اِس کے آگے پیچھے ناچ رہی تھیں.... وہ انہیں پکڑنا چاہتی تھی۔ مگر وہ اِس کے ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتی تھیں۔ کبھی اس پھول پر کبھی اس پھول پر۔

کبھی اس پتے کی اوٹ، کبھی اس ڈالی سے پرے۔ وہ تو دیکھنا چاہتی تھی کہ خواب اور تتلی میں کیا فرق ہے؟

ہوائی جہاز پرواز ایک اَن دیکھے جہان کی طرف رواں تھی۔ طیارہ غالباً فضاؤں میں تھا، فضا ہوگی یا خلا، نیا نے شیشے سے باہر جھانکا بادل ہی بادل تھے جس طرح رنگ برنگے پتوں کے ڈھیر گھر کے میلے صحن میں پڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح آسمان کے نیلے کناروں پر بادلوں کے سفید ڈھیر پڑے تھے۔ جب ان پر سورج کی شعاعیں قریب سے پڑتی تھیں تو بادلوں کے وہ سفید براق ڈھیر یوں چمک اٹھتے تھے۔ جیسے ان میں چاندی کے ذرے ملے ہوں۔

تب اُسے چاند کی بڑھیا کے بال یاد آجاتے بچپن میں وہ یوں تصور کرتی تھی کہ چاند کی بڑھیا کے سر پر سفید براق بالوں کا بڑا سا گچھا ہوگا۔ اُس کی گھڑی میں دوپہر کے بارہ بجے تھے، پتہ نہیں وہ کس جہان میں تھے اور کون سے خطۂ ارض کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔

کتنی بڑی ہے تیری دُنیا خدایا! اور تُو نے اس انسان کو عقل دے کر اُسے کتنا بڑا کر دیا ہے۔ واہ۔

نیا حیرت سے کبھی جہاز کے اندر دیکھتی اور کبھی باہر۔ باہر وہ زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کیونکہ باہر دیکھنے سے اسے ہول اٹھتے تھے۔ بہت دُور نیچے دور تک وادیاں

بچوں کے کھلونوں کی مانند نظر آ رہی تھیں اور جب وہ سوچتی کہ ان وادیوں سے دُور دُور کی اُونچائیوں پر ہے تو ایک دم اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ پھر اندر دیکھنے لگتی۔ خانم بڑے مزے سے سگریٹ پیتے ہوئے ایک انگریزی ناول پڑھ رہی تھی۔ مسافر جہاز میں یوں بیٹھے تھے جیسے یہ ان کا گھر ہو۔ کچھ گھوم پھر رہے تھے، چند اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے، کوئی کافی پی رہا تھا کوئی چائے کوئی ایک دوسرے سے گپ لگا رہا تھا۔

ہاں کبھی کبھی خانم نظر اُٹھا کر دائیں طرف بیٹھے ہوئے دو خوش پوش نوجوانوں کو مزید دیکھ لیتی تھی۔ خانم جب سے جہاز میں بیٹھی تھی یہ نوجوان اُس کی نظروں کی زد میں تھے۔ یہ بات نیا نے بھی محسوس کر لی تھی اور یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ غالباً ان سے خانم کی واقفیت ضرور ہو گی خانم کی شناسائی کس سے نہیں تھی۔ کراچی ائرپورٹ سے لے کر جہاز کے اندر آنے تک کتنے لوگوں سے اس کی سلام علیکم اور ہیلو ہیلو ہوئی تھی۔ بالآخر نیا نے بھی ایک میگزین نکالا اور ورق گردانی کرنے لگی۔ یکایک پڑھتے پڑھتے اس کا دھیان بٹ گیا خانم کسی سے بڑی گرمجوشی سے باتیں کر رہی تھی۔ نیا نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان کھڑا تھا۔ غالباً وہ انہیں میں سے ایک تھا، جن پر خانم بار بار نگاہ ڈال رہی تھی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں خانم؟" اس نوجوان نے بڑی خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"میں تو ذرا یورپ جا رہی ہوں۔"

"ذرا سے" وہ ہنسا۔ "آپ کے لئے مشکل ہے کہ ذرا کی ذرا کہیں بھی چلی جائیں۔"

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں بھی یورپ جا رہا ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟"

"کام سے۔ آپ تو جانتی ہیں ہم تو ٹھیرے ملازم۔"

"ہاں بھئی۔ ایسی ملازمتیں ہر کسی کے نصیب میں ہوں۔" اتنے میں خانم کی نظر نیا پر

پڑی، جو ان دونوں کو بے وقوفوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔

"یہ نیا ہے، میری سیکریٹری۔" نیا نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ اس آدمی نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"یہ حسان صاحب ہیں۔" خانم نے نیا سے کہا۔ "کون ہیں کیا ہیں، یہ پھر بتاؤں گی۔" حسان نے پوچھا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں ذرا ٹائیلٹ کی طرف جا رہا تھا۔"

"جائیے۔ پھر ملاقات ہو گی۔"

"ضرور۔" یہ کہہ کر حسان چلا گیا۔

وہ چلا گیا تو نیا اس کی طرف مڑ کر دیکھتی اور سوچتی رہی۔ آخر اس میں کیا خاص بات تھی کہ خانم بچھی چلی جا رہی تھی۔ وہ تو ایک عام سا آدمی نظر آتا ہے۔ خانم نے نیا کی طرف دیکھا اور بولی۔

"سوزن سلائی مشین کا نام تم نے سنا ہے؟"

"ہاں ہاں۔" نیا جلدی سے بولی۔ "اس وقت ملک میں وہ سب سے بڑی کمپنی بھی تو ہے۔"

"حسان اس کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہے۔"

"اچھا۔" نیا واقعی متاثر نظر آنے لگی۔

"یہ بہت کام کے آدمی ہیں۔"

"میں جان گئی تھی۔" خانم پھر اپنا رسالہ پڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد نیا نے دیکھا حسان واپس اُدھر ہی جانب چلا آ رہا ہے۔ اس کی پہلی نگاہ نیا کی جانب اٹھی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا آیا، اور خانم کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"ارے بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو؟" خانم نے اتنی بے تکلفی سے کہا کہ اسے بیٹھتے ہی بنی۔ پھر غضب خانم نے یہ کیا کہ درمیان والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ایک طرف خانم تھی اور

دوسری طرف نیّا۔ حسّان درمیان والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" حسّان نے مسکرا کر نیّا کی آنکھوں میں دیکھا۔

"بالکل نہیں۔"

"میں ویسے اچھا ہمسفر ہوں۔ بور بالکل نہیں کرتا۔"

"ہاں اگر ہمسفر حسین ہو تو پھر کون اُسے بور کرے گا۔" خانم نے ہنس کر کہا۔ نیّا سمجھ گئی کہ یہ اشارہ اِسی کی طرف تھا۔

"تمہارے ساتھ اور کون جا رہا ہے۔" خانم نے کہا۔

"ہمارے ڈائریکٹر فنانس شہریار خان۔"

"کہاں کہاں جاؤ گے؟"

"پہلے تو لندن جائیں گے، وہاں سے جرمنی اور پھر ہالینڈ جانے کا پروگرام ہے۔"

"ہالینڈ تو اتفاق سے میں بھی جا رہی ہوں۔" خانم نے کہا۔

"اچھا۔ بڑا خوبصورت اتفاق ہے اور کہاں کہاں جائیں گی؟"

"میں تو صرف ایک ہفتے کے لئے آئی ہوں۔ دو چار دن لندن رہ لیں گے پھر ایمسٹرڈم چلے جائیں گے۔"

"لندن میں آپ کہاں قیام کریں گی خانم۔"

"میں تو ہلٹن پارک لین میں ٹھہروں۔ اور تم لوگ کہاں ٹھہرو گے؟"

"ہم لوگ ہلٹن پارک لین میں کہاں ٹھہر سکتے ہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔

"کیوں بھئی؟"

"ہمیں تو سرکار کی طرف سے اسّی ڈالر روزانہ ملتے ہیں۔ جبکہ ہلٹن پارک لین کا کرایہ روزانہ تقریباً دو سو ڈالر ہے۔"

"کسرِ نفسی سے کام مت لو۔ تم چاہو تو وہاں رہ سکتے ہو۔"

"اپنی جیب بھی تو دیکھنی پڑتی ہے۔"

"چلو چھوڑو تکلفات، تم بھی ہمارے ساتھ رہ جاؤ۔"

"نہیں خانم ہم وہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

"کیوں نہیں ٹھہر سکتے؟ ہمارے لئے وہاں دو سویٹ ریزرو ہیں، ایک ہم آپ کو دے دیں گے اور نیّا ایک ہی سویٹ میں رہ لیں گے۔ کیوں نیّا؟" خانم نے نیّا کی طرف دیکھا۔

"بالکل ٹھیک ہے خانم۔" حسّان مسکرانے لگا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ انکار نہ اقرار۔ شاید سوچ رہا تھا۔ سگریٹ پیتے ہوتے نیّا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ پہلی مرتبہ یورپ جا رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔" نیّا نے ملامت سے جواب دیا۔

"بڑی ایکسائٹمنٹ ہو گی۔"

"نہیں تو۔" نیّا ادا سے بولی۔ "ایسی کوئی خاص نہیں، مگر... بہرحال نئی جگہ دیکھنے کا شوق تو ہوتا ہے۔"

"آپ خانم کے پاس کب سے ہیں۔"

"تقریباً دو سال ہو گئے ہیں۔" اتنے میں کھانا سرو ہونے لگا۔ حسّان اٹھنے لگا تو خانم بولی۔

"نہیں ہمارے پاس بیٹھ کر کھا لو۔ اب وہاں کیا جاؤ گے۔"

اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شہریار خان نے ٹرے کھولتے ہوتے مڑ کر حسّان کی طرف دیکھا اور شاید حسّان نے اسے آنکھوں آنکھوں میں کہہ دیا تھا کہ اب میرا یہاں سے اُٹھنا مشکل ہے۔ مسکرا کر شہریار نے منہ پھیر لیا۔

"نیا تم تیار ہو؟" خانم نے نیا کو اپنے اوپر خوشبوؤں کی بارش کرتے دیکھ کر کہا۔

"ہاں خانم۔ آج کیا پروگرام ہے؟"

"تم ایسا کرو، آج حسان اور شہریار کے ساتھ چلی جاؤ۔ میرا تو لندن کا چپہ چپہ دیکھا ہوا ہے اور میرے لئے اس شہر میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ سوائے WINTER کی شاپنگ کے، جو میں آخری دن کروں گی، یہاں میرے دو چار دوست ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔ ایک تو نیچے آتے بیٹھے ہیں۔ ابھی ری سپشن سے ان کا فون آیا ہے۔ میں ان کے ساتھ جا رہی ہوں۔" نیا خاموش رہی تو خانم پھر بولی۔

حسان اور شہریار آج سارا دن گھومیں گے۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ تم ان کی کمپنی میں بور نہیں ہو گی۔"

"خانم مجھے تو شاپنگ کرنا تھی۔"

"ہاں ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ حسان تمہیں آکسفورڈ اسٹریٹ لے جائے گا۔ وہاں ہر قسم کی چیزیں مناسب داموں مل جاتی ہیں۔ میں ڈارلنگ "ہیرڈز" کے علاوہ کہیں سے شاپنگ نہیں کیا کرتی، میں ان کی پرانی کسٹمر ہوں۔ بس آخری دن وہیں جاؤں گی۔"

"دراصل خانم میں موتی کے لئے کپڑے اور کھلونے لینا چاہتی ہوں۔"

"ارے یہاں بے شمار اور مشہورِ زمانہ دکانیں ہیں۔ مثلاً "مدر کیئر" میں چلی جانا۔ ہر عمر بچوں کے گارمنٹس وہاں سے مل جائیں گے۔ تم یوں کرنا پہلے جا کر تھوڑی سی شاپنگ پھر ان لوگوں کے ساتھ سیر کا پروگرام بنانا کیونکہ یہاں پر دکانیں شام کے پانچ بجے بند شروع ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ملک کی طرح رات کے دس گیارہ بجے تک دکانیں کھلی نہیں

"اچھا خانم۔"

"تو پھر آؤ۔" خانم نے اپنی چھتری اور بڑا سا پرس اٹھا لیا اور دروازے سے باہر نکل آئی۔ ے کو تالا لگا کر حسان اور شہریار بھی باہر کوریڈور میں نکل آتے تھے اور ان کا انتظار کر رہے ے۔

"ہیلو خانم۔" حسان نے مسکرا کر خانم کا استقبال کیا۔ مگر حسان کی نظریں نیا کے چہرے چپک سی گئی تھیں۔ نیا نے اس وقت گلابی رنگ کا میچنگ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ویسی ہی پاشک لگائی تھی۔ ہونٹوں کو پیازی شیڈ دینے کے سبب وہ بالکل گلاب کا پھول سا رہی تھی اس پر غضب یہ ہوا کہ نیا نے خانم کے کہنے پر دوپٹہ اتار دیا تھا۔

یہاں دوپٹے کا جنجال پالنا کچھ آسان نہیں، دفع کرو اس کو یہاں کون کسی کو دیکھتا یا تا ہے؟ اور واقعی نیا نے محسوس کیا تھا۔ یہاں نہ کوئی کسی کو جانتا پہچانتا ہے نہ پرواکرتا ہے ہاں اگر کوئی مادر زاد ننگا بھی چل رہا ہو تو کسی کو اچنبھا نہیں ہوتا اور اگر ہمارے دیس میں بجلی کھمبے کو لال کپڑے لپیٹ دیئے جائیں تو لوگ اس کے ارد گرد اکٹھے ہونے شروع ہو جائیں گے۔

وہ چاروں کوریڈور سے ہو کر لفٹ میں آ کر کھڑے ہوتے۔ حسان کی نظریں باقاعدہ نیا پر شہر ہو رہی تھیں۔

اور نیّا کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ بڑی بے نیازی سے ریلنگ پر کہنی ٹیکے رہی۔ خانم حسّان کو مخاطب کر کے آج کے پروگرام کے بارے میں بتانے لگی۔ نیّا سوچ رہی تھی کہ واقعی خانم جادو کی پٹاری ہے۔ اس نے جہاز میں ہی حسّان کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ ہوٹل میں اس کے پاس ٹھیریں گے۔ دوسرا سویٹ جو اُس نے نیّا کے لئے بک کرایا تھا وہ اُس نے اُنہیں دے دیا تھا۔

خُدا جانے خانم نے کس مصلحت کے تحت دو سویٹ بُک کرائے تھے۔

آج اُنہیں لندن میں آتے دوسرا دن تھا اور ان دو دنوں میں بے شمار آدمی خانم سے ملنے آئے تھے ایئرپورٹ پر بھی اسے ایک صاحب لینے آئے تھے اور ہوٹل میں چھوڑ گئے تھے۔ بعد ازاں وہی صاحب رات کو پھر آئے تھے۔ اِس وقت خانم انہیں کمرے میں لے آئی تھی۔ جاتے جاتے وہ صاحب خانم کو نوٹوں کا بنڈل دے گئے تھے جسے خانم نے پرس میں ڈال لیا تھا۔ اور نیّا کو بتا بھی دیا تھا کہ یہ سیٹھ جادو بھائی کی کرم فرمائی ہے کہ اُنہوں نے یہاں ہمارے لئے ایک گاڑی اور پونڈز کا بندوبست کر رکھا ہے۔ تاکہ ہمیں یہاں تکلیف نہ ہو۔

پہلا دن ان چاروں نے اکٹھے گزارا تھا۔ "مادام تساد" کا عجائب گھر دیکھا تھا۔ بکنگھم پیلس، پکاڈلی سرکس، ٹرافلگر اسکوائر، ہائڈ پارک، اور تمام مشہور جگہوں کو دیکھ ڈالا تھا۔ دوپہر کا کھانا ایک مسلم آبادی والے ہوٹل میں کھایا تھا اور شام کو تھک تھکا کر واپس آ گئے تھے۔

نیّا جب صبح اٹھی تو نئے سرے سے فریش تھی۔ آج کا پروگرام خود خانم نے طے کر دیا تھا۔

وہ چاروں نیچے اُتر کر ریسپشن ہال میں آئے تھے تو وہاں ایک شخص پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ خانم کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"حضور کاشانی صاحب۔ آیئے آیئے۔" خانم نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور پھر سب کا تعارف بھی کرایا۔

"تم میری گاڑی لے جاؤ حسّان! میں کاشانی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اچھا پھر شام کو ملاقات ہو گی۔"

"تھینک یو خانم۔" حسّان نے کہا۔ لندن جیسے شہر میں ایک موٹر کا مل جانا، کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ مگر خانم نے تو انہیں اپنے خرچے پہ ہوٹل میں بھی ٹھہرایا تھا اور حسّان اس احسان سے شکر ریز ہو گیا تھا۔ وہ تینوں باہر نکل آئے۔

اس وقت صبح کے گیارہ بجے تھے اور ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔ لندن میں دھوپ نکلی آئی، گویا دودھ کی نہر کا نکل آنا ہے۔ لوگ اتنے مسرور ہو جاتے ہیں کہ کام چھوڑ کر گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ یہ تو نیّا نے راستے میں بھی جا بجا دیکھا تھا، یہاں وہاں مرد و زن کرسیاں ڈال کر بیٹھے ہوتے تھے بلکہ کسی خوش فکرے تو ملبوسات کی قید سے آزاد ہونے کو ترجیح دے رہے تھے۔ چند تختوں پہ بیٹھے ہوئے تھے کچھ گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ چہلیں کرتے ہوئے ٹھٹھے لگاتے ہوئے لوگ کس قدر خوش تھے اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی عورت تنہا نظر نہ آئی تھی۔ ہر خاتون خواہ بوڑھی ہو یا جوان، کسی نہ کسی مرد نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ یہاں اس دُنیا میں جہاں عورت نے اپنی برتری منوالی ہے، قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہے۔ ہر دور میں مرد کے شانہ بشانہ ہے، خود مختار ہے، آزاد ہے۔ لیکن پھر بھی وہ مرد کے سہارے کی محتاج ہے۔

سہارا نہیں بلکہ رفاقت۔ تو کیا عورت کے لئے خوبصورت ترین رفاقت . . . مرد کی ہی رفاقت ہے، اور مرد کی آخری منزل کیا عورت ہی ہے۔

اس لئے کہ یہ غلطی آدم اور حوّا سے ہو گئی تھی۔ اس کا اعتراف دُنیا کی ماں اور دُنیا کے باپ نے کر لیا تھا۔

دُنیا کے ہر آدم کو حوّا کی۔

اور دنیا کی ہر حوّا کو آدم کی ضرورت ہے۔ یہ اس کہانی کا خلاصہ ہے۔ گھومتے پھرتے ہوئے

مشہور مقامات دیکھتے ہوتے۔ سڑکوں پر کھڑے ہوتے اور بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹورز میں گھومتے ہوتے بھی نیا کا خیال بھٹک بھٹک جاتا۔ کبھی تو وہ کسی پارک میں سرسبز خطۂ زمین پر لیٹے ہوتے کسی نوجوان جوڑے کو دیکھ کر چونک جاتی کہ سنہرے عام سنہرے بالوں والی حسینہ اپنا ریشمیں سر اپنے محبوب کے چوڑے چکلے سینے پر رکھے ہنسی کی جل ترنگ بجا رہی ہوتی اور دونوں دنیا سے دور اپنی دنیا میں مگن ہوتے اور کبھی کبھی بڑے بڑے اسٹوروں میں گھومتے ہوتے کاؤنٹر پہ بیٹھی ہوتی یا کمپیوٹر پر انگلیاں چلاتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر وہ کھو سی جاتی۔ زندگی کی دوڑ میں ہر کوئی بگٹٹ بھاگا جا رہا تھا۔ ہر ایک کی کوئی نہ کوئی منزل تھی مگر اس کی کون سی منزل تھی؟

ایسے میں حسان اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے چونکا دیتا۔ نیا کو بڑا عجیب سا بھی لگتا۔ حسان خواہ مخواہ اس کا سرپرست بنا جا رہا تھا۔ سڑک پار کرنا ہوتی تو جلدی سے آگے ہو کر اس کی کمر میں بازو حمائل کر دیتا اور ایسے میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس کا خیال ہوتا کہ پورا ہجوم جو سڑک پار کر رہا ہے انہیں کو دیکھ رہا ہے۔ اگر اس نے حسان کا بازو جھٹک دیا تو وہ دونوں تماشا بن جائیں گے۔ کبھی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کوئی مخصوص چیز دکھانے لگتا، کبھی اس کی ٹھوڑی پکڑ کے اس کے چہرے کا زاویہ ٹھیک کرتا اور اس کی تصویریں اتارنے لگتا۔ نیا اسے کیا کہتی، کچھ کہہ ہی نہ سکتی تھی کیونکہ خانم نے اسے ہوٹل میں رکھ کر خرید لیا تھا تو وہ بھی خانم سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ نیا جو کچھ بھی خریدتی وہ جلدی سے بل ادا کر دیتا۔ جب وہ اپنے بچے کے لئے خریداری کر رہی تھی، تو ساری چیزیں اپنے پیسوں سے خریدنا چاہتی تھی۔ مگر اس نے بچے کے سامان کے پیسے بھی خود ادا کر دیئے نیا کو بے حد برا لگا تھا اور جب نیا نے زچ ہو کر اس کی طرف دیکھا، تو وہ ہنس کر بولا۔

"آخر آپ اتنی چیزیں کس کے بچے کے لئے خرید رہی ہیں اتنی لگن اور محبت کے ساتھ۔" اسے خانم کی بات یاد آ گئی۔ خانم نے کہا تھا کہ ہر ایک کو مت بتایا کرو کہ تمہارا ایک بچہ بھی ہے۔

"آپ بوجھیں کس کا بچہ ہو سکتا ہے؟" نیا نے بھی گول مول بات کہہ دی۔

"میرے خیال میں یا تو آپ کا کوئی چھوٹا بھائی ہو گا، یا بھانجا بھتیجا ہو گا!" نیا ہنسنے لگی۔

"میرا اپنا بچہ نہیں ہو سکتا؟"

"نہیں نہیں۔ آپ تو کسی صورت بھی ایک بچے کی ماں نہیں لگتیں۔"

"اچھا! نیا اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ "ویسے ہر عورت کسی نہ کسی بچے کی ماں ہوتی ہے! فطرتاً۔"

"بڑی غیر شاعرانہ بات کہہ رہی ہیں آپ۔" وہ بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ ماں جیسے مقدس رشتے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اصل میں مجھے عورت کا محبوبہ والا روپ ہی اچھا لگتا ہے۔"

"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" نیا نے ایک دم پوچھ ڈالا۔

حسان نے فوراً جواب دینے کی بجائے سگریٹ سلگا لیا جس سے نیا کو اندازہ ہو گیا کہ وہ شادی شدہ ہے۔

ایک کش لے کر حسان نے "جی ہاں" یوں کہا جیسے لٹھ ماری ہو۔

"پھر تو آپ کے بچے بھی ہوں گے؟" اس نے بدمزگی سے نیا کی طرف دیکھا تو نیا جھٹ اٹھی۔

"آپ کو بھی اپنے بچوں اور بیوی کے لئے خریداری کرنی چاہیئے۔ آپ کو کچھ نہیں خریدنا؟"

"خریدوں گا۔" وہ کھسیانا ہو کر بولا۔ "مگر آخری دن۔"

"میں تو اس لئے پوچھ رہی تھی کہ شاید میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔"

"آپ اس سلسلے میں میری مدد کر دیجئے۔" شہریار نے آگے ہو کر کہا۔

شہریار درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ مگر ان کے ساتھ یوں چل رہا تھا۔ جیسے کوئی سایہ ہو، ایک تو بولتا ہی کم تھا۔ دوسرے حسان اس کو مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔

"بچے آپ کیا خریدنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی مدد کروں۔"

نیا انہیں ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور میں لے گئی۔ شہریار نے اپنے بچوں کی عمریں نیا کو بتائیں اور کچھ اور اپنی بیوی کے لئے مناسب دام کے کپڑے خریدے اور نیا کا شکریہ ادا کیا۔

اتنے میں دوپہر کے دو بج گئے۔

"کھانا کھائیے گا" حسان نے نیا کے قریب آکر پوچھا۔

"شکر ہے آپ کو خیال تو آیا۔ میرا تو بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں لوگ لندن میں اتنی بھوک کیوں لگتی ہے"

"بات یہ ہے کہ آپ مسلسل پیدل چل رہی ہیں۔ اِس لئے" شہریار نے مُسکرا کر کہا۔

"ہاں ——" نیا نے ہاں کو ذرا لمبا کر دیا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک گئی ہے بلکہ نڈھال ہو گئی ہے۔ مگر تعجب ہے۔ بے شمار بنڈل اٹھائے وہ بڑے مزے سے چل رہی تھی۔ جبکہ اس کے بہت سے بنڈل حسان نے بھی اُٹھا رکھے تھے، پھر بھی اس نے کافی سامان اٹھایا ہوا تھا۔ وہاں بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور تھے اور ان میں بے شمار جدید طرز کے ملبوسات اور کوٹ وغیرہ ٹنگ رہے تھے۔ گزرتے گزرتے وہ ڈک کر ونڈو شاپنگ بھی کرنے لگتی۔ ہر چیز کو دیکھتی اور ہر چیز پر طبیعت للچاتی۔ خواہشیں زیادہ تھیں اور پیسہ کم —— وہ سوچتی یہ ملبوسات یا ضروریاتِ زندگی کی اشیاء نہیں۔ بلکہ عورتوں کی خواہشیں اور آرزوئیں لگی ہوتی ہیں۔

کیا عورت کی آرزو یہی ہے بس —— ! وہ اپنے دل سے بھی پوچھتی۔ تو دل چپ سادھ لیتا۔ اصل میں عورت ہمیشہ دو متضاد قسم کی خواہشوں کے درمیان لٹکی رہتی ہے۔

محبت۔ ! محبت مل جائے تو اسے دُنیا کے ہر عیش کی طلب ہونے لگتی ہے۔

اگر دولت اور ہر آسائش مل جائے —— تو نا آسودگی کی صلیب پر لٹک جاتی ہے

کیا سچ ہے ؟

کیا جھوٹ۔ ؟

"پھر کیا خیال ہے ؟" حسان نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا۔ "میں کچھ برگر وغیرہ لے آؤں یا ہوٹل چل کر کھانا کھالیں ؟"

"جی — ہرگز نہیں۔" نیا نے بُرا گندا منہ بنایا۔ "کل جو آپ نے مجھے "ہاٹ ڈاگ" کھلائے تھے۔ ان کے تصور سے ہی مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔ کس قدر واہیات شے تھی"

"آہستہ بولیں۔ یہ تو یہاں کے لوگوں کا من بھاتا کھاجا ہے"

"یہاں کے لوگوں کا کیا ہے۔ ان کا من بھاتا کھاجا تو سور بھی ہے" نیا نے منہ بنایا۔

"دیکھیے ان کے گھر آکے ایسی بات نہ کہیں"

"میں کوئی ڈرتی ہوں ذرا دیکھیں نا دو کانوں پہ سور کا لال لال گوشت کس طرح لٹکا ہوا ہے۔ توبہ مجھے تو دیکھ کر ہی اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔ کس قدر گندی قوم ہے یہ"

"اچھا آپ اس قوم کو بخش دیں اور اپنے اس خادم کو بتائیں کہ کیا کھانا پسند فرمائیں گی؟"

"واپس ہوٹل اگر چلے گئے تو کھانا کھا کر ضرور سستانے بھی لگیں گے۔ اس لئے بہتر ہے یہیں کسی اچھے سے ریستوران میں کھانا کھالیں"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے" شہریار نے تائید کی۔ "اگر ہوٹل چلے گئے تو سیر کا وقت نکل جائے گا"

"چلیئے یہاں قریب ایک لبنانی ہوٹل ہے۔ آج وہاں آپ کو کھانا کھلاتے ہیں"

"حسان صاحب! آپ تو اس شہر سے اچھے خاصے واقف معلوم ہوتے ہیں" نیا نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"میں تقریباً ہر سال ہی آتا ہوں"

"اچھا ——" نیا نے حیرت سے کہا۔ "اِسی لئے تو اتنی بے نیازی سے گھوم پھر رہے ہیں" نیا کو حسان پر بہت رشک آیا۔

"لبنانی ہوٹل کا کھانا اچھا ہوتا ہے"

"ہاں — ایک تو یہ مسلمانوں کا ہوٹل ہے، دوسرے کھانا بھی کچھ پاکستان جیسا ہوتا ہے" نیا کے منہ میں پانی آنے لگا۔ وہ اسی دن میں وہ پھیکے کھانے کھا کر اوب گئی تھی۔ رات دس بجے

جب وہ تھکی ہاری لفافوں سے لدی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی — تو اسے نوکر کا بھیجا ایک پیغام ملا کہ وہ آج رات اپنے دوست کاشانی کے پاس رہے گی اور ہوٹل واپس نہیں آئے گی۔ نیا بہت تھکی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے رات کا کھانا بھی باہر رکھا لیا تھا۔ اس لئے دروازہ بند کر کے نیا اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔

بستر بے حد نرم تھا۔ ننھے بچے کے رخساروں کی طرح . . . نیا برف کی طرح ٹھنڈی اُترتی گئی۔ تب اسے خیال آیا کہ یہ میٹرلیس وغیرہ کی ساری بدعتیں انہی ملکوں سے ہمارے ملک میں آئی ہیں۔ پھر اس کا دھیان خانم کی جانب چلا گیا۔

اور آج اُسے اندازہ ہو رہا تھا۔ خانم کے نزدیک دوستی کا کیا مطلب ہے؟ اندازے کتنے رنگ ہیں؟ اُس کے اندر پھر کش مکش ہونے لگی۔ اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ نیا چونک گئی۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ شکر ہے اُس نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ دروازہ کھولتے ہی ایک بدبودار بھبکا نیا کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ باہر حسان کھڑا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور وہ عجیب انداز سے مسکرا رہا تھا۔ نیا کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ حسان نے پی رکھی ہے۔ اس میں حسان کا کیا قصور تھا۔ یہاں تو لوگ پانی کی جگہ بیئر پیتے تھے۔ پہلے دن تو جب اس نے میز پر رکھے ہوئے بیئر کے بڑے بڑے جھاگ بھرے جام دیکھے تھے، تو بہت گھبرائی تھی۔ مگر اب دو چار دن میں ہی اسے عادت ہو گئی تھی۔ جتنی بار اس نے حسان کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ اتنی ہی بار اس نے بیئر پی تھی۔ اور حسان نے اب کیا پی رکھا ہے؟ اندازہ نہ ہو سکا۔ وہ ان بدبوؤں سے مانوس جو نہیں تھی۔ حسان کی چبھتی ہوئی نگاہ جادو کی طرح نیا کے کلیجے میں اُتر گئی۔

نیا جی جان سے لرز گئی۔ مگر وہ مسکرا کر بولا۔

"سنا ہے خانم آج رات باہر رہیں گی۔"

"جی ہاں —؟" نیا نے آہستہ سے کہا۔

"کیا آپ ابھی سو جائیں گی؟"

"جی ہاں —" نیا نے پھر کہا۔

"دو چار دن تو تفریح کے لئے ملے ہیں، اور وہ بھی آپ سو کر تباہ کرنا چاہتی ہیں۔"

"میں بہت زیادہ تھک گئی ہوں۔"

"تھکاوٹ اتارنے کی دوا دوں۔؟" وہ ذو معنی انداز میں مسکرایا۔

"نہیں۔ سونے سے میری تھکاوٹ خود بخود اُتر جائے گی۔" نیا نے سمجھے بغیر جلدی سے کہا۔

"تھوڑی دیر تاش کھیلتے ہیں؟"

"مجھے کھیلنا نہیں آتا — آپ شہریار صاحب کے ساتھ کھیل لیں۔"

"وہ صوفی تو جلدی سو گیا ہے۔ شاید اسے بیوی یاد آ رہی ہے۔" حسان ذرا سا لڑکھڑایا دروازہ تھام کر بولا۔

"اندر نہ بلا لیجئے گا۔"

"نہیں۔" نیا نے جلدی سے دروازہ بھیڑ دیا۔ "میں . . . سونا چاہتی ہوں۔"

"تھوڑی دیر گپ لگاتے ہیں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی . . ." وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"پلیز اب آپ جائیں۔" نیا روہانسی سی ہو گئی۔ "میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔" یہ کہتے نیا نے زبردستی دروازہ بند کرنا چاہا۔

"اوکے بے بی — شب بخیر۔" وہ بڑے بے ہودہ انداز میں ہنسا — "پھر کبھی سہی" نیا نے جلدی سے دروازہ بند کر کے بولٹ کیا۔ پھر اندر سے چابی گھما دی۔ چابی گھمانے کے بعد بھی اس نے کئی بار دروازے کو اپنی جانب کھینچ کر بھی دیکھا۔ اچھی طرح تسلی کر لینے کے بعد ہی اس نے کپڑے بدلے اور بستر کے اندر گھس گئی۔ اسی وقت سائیڈ ٹیبل پر رکھا فون بج اُٹھا۔

"الٰہی خیر۔" نیّا گھبرا گئی۔ "کہیں یہ بھی حسّان کی شرارت نہ ہو۔" ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھا
شکر ہے خدا کا دوسری طرف خانم تھی۔

"کیسی ہو نیّا۔؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"اچھی ہوں خانم۔"

"ابھی تک سوئی نہیں ہو۔" نیّا نے کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھا۔ رات کے ساڑھے
بج رہے تھے۔

"بس ابھی سونے جا رہی ہوں۔"

"اداس تو نہیں ہو۔"

"نہیں ——"

"گھبرا تو نہیں رہیں ——"

"نہیں تو ——"

"جان میں صبح دس بجے پہنچ جاؤں گی۔ کاشانی نے مجھے روک لیا ہے۔"

"مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا۔" نیّا نے کہا۔

"تم لوگ کس وقت آئے تھے کمرے میں۔؟"

"دس بجے آ گئے تھے۔"

"باقی لوگ کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہوں گے۔" نیّا نے بے زاری سے کہا۔

"تم اکیلے میں گھبرا تو نہیں رہیں۔" خانم نے پھر پوچھا۔ جانے خانم بار بار ایک ہی سوا
کیوں پوچھ رہی ہے اور دراصل وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔

"خانم اب ایک رات تو آپ کے بغیر گزارنی ہی ہے۔ سو کسی نہ کسی طرح گزار لوں

"شاباش۔! تم بہادر لڑکی ہو۔ ساتھ والے کمرے میں وہ لڑکے بھی تو ہیں؟

جی ہیں ——!"

اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ان سے کہہ دینا۔"

اب آدھی رات کو مجھے کس چیز کی ضرورت ہو گی خانم، اور اب تو وہ بھی سو گئے ہوں گے۔"

اچھا تم بھی سو جاؤ جاناں؟"

بہتر خانم۔"

شب بخیر۔"

شب بخیر ——" نیّا نے ریسیور رکھ کر کمبل منہ پر ڈال لیا۔

نیّا رات دیر تک جاگتی رہی تھی۔ توہمات کے بھوت اسے تمام رات ڈراتے رہے تھے۔ اسی
لیے صبح دیر سے اٹھی۔ تیار ہوتے ہوتے دس بج گئے۔ باہر نکلی تو حسّان اور شہریار کا کمرہ
بند تھا۔ شاید وہ لوگ نیچے ڈائننگ ہال میں چلے گئے تھے۔ نیّا پھر کمرے میں چلی آئی۔ ابھی اس
ناشتہ کرنا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ناشتہ کمرے میں منگواتے یا نیچے چلی جاتے۔
پھر نیچے چلی گئی —— ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ سارا ڈائننگ ہال خالی تھا۔
سامنے ایک کونے میں خانم اور حسّان سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ادھر مشرقی کونے میں غالباً ایک
ہی جوڑا بیٹھا تھا، اور بس نیّا تھوڑی دیر کھڑی انہیں کو دیکھتی رہی۔ جب وہ اپنی باتوں میں
رہے تو نیّا ان کے قریب چلی گئی۔ اُسے اتنے قریب دیکھ کر دونوں چونکے۔ اور پھر خانم
والی سے بولی۔

گڈ مارننگ ڈارلنگ۔ کیسی ہو۔؟"

شکریہ۔ خانم۔" نیّا زبردستی مسکراتی اور ایک خالی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

آپ کے لئے ناشتے کا آرڈر دوں؟" حسّان نے بڑے ادب سے پوچھا۔ جیسے رات
ہو۔ اس کا مخصوص دروازے میں آ کھڑا ہوا تھا۔

جی ہاں۔" نیّا نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے نیّا۔ ہم کیا پروگرام طے کر رہے تھے؟"

"جی، مجھے نہیں معلوم۔"

"آج ہم سب لوگ ایمسٹرڈم جا رہے ہیں۔"

"ہم سب کون۔؟"

"میں۔ تم، حسّان اور شہریار۔"

"اچھا ——"

"چار دن ہو گئے لندن میں ٹھہرے ہوئے۔ اب دو دن ایمسٹرڈم رہ لیں گے اور پھر واپسی میں بھی ایک دن لندن میں رُک کر پاکستان چلیں گے۔" اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ نیّا چپ چاپ کھانے لگی۔

"آپ کے لئے اور کافی بناؤں خانم۔؟" حسّان نے پوچھا۔

"ضرور بناؤ۔" خانم سگریٹ کا کش لے کر بولی۔

"وہ شہریار صاحب کہاں ہیں۔؟" یک دم نیّا نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

وہ صبح صبح اپنے ایک عزیز سے ملنے گئے ہیں۔ بس اب آنے والے ہوں گے۔" حسّان نے جواب دیا۔

"ناشتہ کر کے تم اپنا سامان پیک کر لو نیّا۔" خانم نے کافی کا گھونٹ بھر کے کہا۔ "ہمارا جہاز ایک بجے جانا ہے۔"

"ایک بجے اور اتنا کم وقت ہے۔"

"میرا خیال ہے پیکنگ تو ایک گھنٹے میں ہو سکتی ہے۔ ویسے سارا سامان لے جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ بس دو جوڑے اپنے بیگ میں رکھ لو۔ پرسوں تو پھر واپس لندن آنا ہے۔"

"بہت اچھا خانم۔" نیّا نے ناشتہ کیا۔ اور پھر معذرت کر کے اُوپر آ گئی۔ کیونکہ اس کی ساری شاپنگ بکھری ہوئی تھی۔ وہ چیزیں سمیٹنا چاہتی تھی۔ حسّان اور خانم وہیں بیٹھے کافی پیتے رہے۔ تھوڑی تھوڑی کر کے اس نے بے شمار چیزیں خرید لی تھیں، جنہیں

ب مشکل نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس نے جلدی جلدی سارا سامان پیک کر لیا اور دو جوڑے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لئے۔ ایک نائٹی اور میک اَپ کا سامان بھی۔ گیارہ بجے تک وہ بالکل تیار ہو گئی تھی۔ ایک دم خانم بوکھلائی بوکھلائی کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

"کیا تم تیار ہو۔؟"

"جی ہاں ——"

"میری طبیعت یکدم خراب ہو گئی ہے۔" یہ کہہ کر خانم غسل خانے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی۔ اور پھر بستر پہ دراز ہو گئی۔

"کیا بات ہے خانم۔؟"

"پیٹ میں گڑبڑ ہے لندن آ کے مجھے ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"ڈاکٹر کو دکھا لیں۔"

"میرے پاس دوا بھی ہے، ویسے میں نے کاشانی کو فون کر دیا ہے۔ وہ آتا ہی ہو گا مجھے اپنے ڈاکٹر کے پاس لے چلے گا۔"

نیّا سوچنے لگی۔ شاید آج کا پروگرام کینسل ہو جائے گا۔ اتنے میں حسّان بھی کمرے میں آ گیا اور بولا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔" خانم نے کراہتے ہوئے کہا۔

"پھر آج کا پروگرام کینسل کر دیتے ہیں۔" حسّان بولا۔

"نہیں حسّان! ایسا نہ کرو۔ میں نے وہاں اکورا انٹرکانٹی نینٹل" میں ریزرویشن کروائی ہوئی ہے۔ جہاز میں بھی سیٹیں بک ہیں۔ تم ایسا کرو۔ نیّا کو ساتھ لے کر چلے جاؤ۔ ابھی تک شہریار بھی نہیں آیا۔ میں بھی دو ایک گھنٹے میں سفر کے قابل ہو جاؤں گی۔ دوسری فلائٹ سے ہم دونوں آ جائیں گے۔"

"کیوں نیّا۔؟" حسّان نے نیّا کی طرف دیکھا۔ نیّا بوکھلا گئی۔

"خانم میں تو آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

"ڈونٹ بی سلی۔" خانم نے اُسے جھڑکا۔ "ضروری نہیں کہ دوسرے جہاز میں ہمیں ایک وقت چار سیٹیں مل جائیں۔ سفر میں کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اٹھو جلدی سے جاؤ۔ ورنہ جہاز کا وقت نکل جائیگا۔ رات نو بجے تک ہم ضرور آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔" نیّا بادلِ نخواستہ کھڑی ہوگئی اُس کی مہار اِس وقت خانم کے ہاتھ میں جو تھی۔

"برٹش ایئر ویز" کا طیارہ اندر سے بہت خوب صورت تھا۔ ایئر ہوسٹس بھی اپنے جاذبِ نظر یونیفارم میں زیادہ مستعد اور زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔ مگر نیّا کا ڈرپوک دل ڈرا ڈرا اور سہما سہما تھا۔ جانے کیوں اِس سفر میں وہ بہت زیادہ گھبرا رہی تھی۔ ساتھ بیٹھا ہوا حسّان اس پر پروانہ وار نثار ہو رہا تھا۔

زندگی کے خوابوں کو ایک اور پرواز ملی تھی۔ نیّا برابر اپنے دل کو سمجھاتے جا رہی تھی۔ اور وہ اس کی ہر بات سُن کر جبراً مسکرائے جا رہی تھی۔

"آپ ہالینڈ کس لئے جا رہے ہیں۔" بالآخر نیّا نے پوچھ ڈالا۔

"میں مشینوں کے نئے ماڈلز کے ڈیزائن لینے کے لئے یورپ آیا ہوں۔ اسی سلسلے میں ہالینڈ جا رہا ہوں۔"

"یہاں کتنے دن رہیں گے۔"

"تقریباً ایک ہفتہ رہوں گا۔"

"پھر کہاں جائیں گے۔؟"

"یہاں سے میں جرمنی جاؤں گا۔ اصل میں پہلے مجھے فرینکفرٹ جانا تھا۔ اور بعد میں ایمسٹرڈیم آنا تھا۔ مگر خانم کی وجہ سے پہلے مجھے ایمسٹرڈیم کا پروگرام بنانا پڑا۔" خانم کا ذکر کرتے ہی حسّان کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ جلدی سے بولا۔

"اصل میں اس وقت اچھی کمپنی مل رہی تھی تو ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے اِدھر والا کام کر لیں۔"

"دوسرا جہاز کس وقت آتا ہے۔؟"

"رات تک کئی جہاز آئیں گے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟ خانم کو سیٹیں مل جائیں گی؟" نیّا نے پوچھا۔

"خانم بڑی قیامت چیز ہے۔ وہ ہر وقت سیٹ حاصل کر سکتی ہے۔"

"رات تک وہ لوگ پہنچ جائیں گے؟" نیّا نے پھر بچوں کی طرح استفسار کیا۔

"کیوں۔؟ کیا بات ہے۔؟" حسّان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔"

"نہیں تو — کس بات کا ڈر۔؟"

"میرے ساتھ تنہا سفر جو کر رہی ہیں۔"

"جب آپ ساتھ ہیں تو تنہا کب ہوں۔" نیّا بات سے بات پیدا کر لینے کا فن جان گئی تھی اور وہ اپنی بزدلی کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔ پھر نیّا سوچنے لگی۔ خانم اِس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ پتہ نہیں اس کی طبیعت ٹھیک بھی ہوتی ہوگی یا نہیں۔؟

خانم اِس وقت ہوٹل میں لیٹی بڑے مزے سے کاشانی کے ساتھ گپ بازی کر رہی تھی۔ شہریار کو اُس نے صبح ہی موٹر دے کر بھیج دیا تھا کہ لندن کے مضافات میں اس کے جو عزیز رہتے تھے۔ وہ ان سے مل آئے — عین وقت پر خانم کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اور نہایت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت خانم نے نیّا کو حسّان کے ساتھ ایمسٹرڈیم بھیج دیا تھا۔

پلاننگ کرنے میں خانم کا کوئی ثانی تھا ہی نہیں، ایک مہینہ پہلے اسے خبر ملی تھی کہ "سوئن سلائی مشین" کی پبلک سیکٹر کمپنی کا ایڈورٹائزنگ کا بجٹ لاکھوں سے تجاوز کر گیا ہے۔ بس اِس کے بعد خانم نے اس کے اکاؤنٹ کو حاصل کرنے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دی تھیں۔ اس کمپنی کے مالک خانم کی براہ راست کسی سے دوستی نہیں تھی۔ کسی طریقے سے خانم کو یہ پتہ چلا کہ کمپنی کا مینجنگ

ڈائریکٹر حسان علی اور ڈائریکٹر فنانس شہریار مشین کے نئے ماڈلوں کا ڈیزائن لینے کے لئے یورپ جا رہے ہیں۔ وہ اپنے طور پر حسان علی کے پرائیویٹ سیکرٹری طفیل محمد اور ٹیلکس آپریٹر "TELEXOPERATER" جاوید خان سے رابطہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی اور بالا بالا ان نے حسان علی کے ٹور TOUR کی تمام تفصیلات حاصل کر لیں۔

اور انہی تاریخوں میں اپنا ٹور بھی رکھ لیا۔

نیا کو وہ ایک خاص مقصد کے تحت ساتھ لائی تھی۔ چار دن نیا کے ساتھ گھوم پھر کے حسان علی اپنا مرتبہ بھول گیا تھا۔ ویسے بھی حسان علی بڑا من موجی آدمی تھا۔ بوتل اور عورت کے بدلے اس سے کچھ بھی کروایا جا سکتا تھا۔ یورپ میں وہ شبینہ محفلوں میں دل کھول کے داد عیش دیتا تھا۔ خانم کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر موقع پر تصویریں ضرور کھینچتی تھی۔ سو ان محفلوں کی بے شمار یادگار تصویریں خانم کے کیمرے میں تھیں۔ جن میں نیا بھی تھی۔ اور جن کے بارے میں نیا بھی جانتی تھی۔ گو نیا بہت سی باتوں کو نہیں جانتی تھی۔ مگر اُسے گھبراہٹ اس بات سے ہو رہی تھی کہ حسان علی ETHICS نام کی کسی شے کو نہیں جانتا تھا۔ ایک بوتل اُس کے آگے رکھ دی جائے تو وہ ایمان کا بھی سودا کر لیتا تھا اور نیا ابھی تک دین، مذہب، ایمان اقدار، سب پہ ایقان رکھتی تھی۔ اور یہیں کہیں جہاز کے ساتھ ساتھ..... جیسے..... خواجہ عبدالرحیم بھی پرواز کر رہا تھا..... اور خواجہ عبدالرحیم کی موجودگی سے نیا کو بہت ڈر لگتا تھا۔ کاش کبھی ایسا ہوتا کہ وہ خواجہ صاحب کی نگاہوں سے بچ کر کہیں دُور نکل جاتی۔

"اکورڈ انٹرکانٹی نینٹل کے کمرہ نمبر ۲۳۴۲ میں کھڑکی کا پردہ سرکائے نیا چپ چاپ کھڑی تھی۔ پہلے تو اُسے اس بات پر حیرت ہوئی کہ اس ہوٹل کی تیئس چوبیس منزلیں تھیں۔ باہر سے ہی وہ عمارت کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ ہوٹل آسمان کی طرف منہ اٹھائے یوں کھڑا تھا جیسے اپنی بڑائی منوا رہا ہو۔

شام کے چار بجے جب ان کی ٹیکسی ہوٹل کے باہر آ کر رُکی تو ہوٹل کا پورٹر دوڑ کر آیا تھا۔ اس نے نہ صرف اُن کا سامان اٹھایا بلکہ بڑے ادب سے دروازہ بھی کھولا تھا، اُن کے لئے دو کمرے پہلے ہی ریزرو تھے۔ ری سیپشن سے کمروں کی چابی لے کر اور ہوٹل کے کاغذات میں اندراج کرا کے حسان مڑا۔ تو پورٹر نے اس کی رہنمائی کی۔ دونوں آ کر لفٹ میں کھڑے ہو گئے۔ ان کا سامان بھی ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ پورٹر نے ادب سے پوچھا۔ "سامان کس کمرے میں رکھنا ہے؟" تو حسان نے مسکرا کر کہا تھا۔ "یہیں پڑا رہنے دو" اور اُسے ٹپ دیا تو وہ سلیوٹ مار کر چلا گیا۔

نیا اور حسان دونوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ کمروں کی سج دھج دیکھ کر نیا حیران ہو گئی۔ وہی بستر بنانے کا انداز۔ تمام تر نفاستیں اور خوبصورتیاں۔ جو گیا رنگ کی چادریں

بچھی ہوئی تھیں۔ اسی رنگ کے تولیے غسل خانوں میں لٹک رہے تھے۔ کمرے میں
رنگین ٹی وی بھی تھا۔ ہر شے اتنی خوبصورت تھی اور اس قدر چمچم کر رہی تھی کہ ہاتھ لگاتے
ڈر لگتا تھا۔ نیّا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں کمرے ایک جیسے تھے۔ فرق صرف یہ
ایک میں ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا اور دوسرے میں دو پلنگ پڑے ہوتے تھے ہاں ایک الماری
بھی تھی۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ بھی تھا۔ جو اس وقت مقفل تھا۔ خانساماں
نے فیملی سوئٹ ریزرو کرائے تھے۔ بہرحال خوبصورت ماحول تھا اور پُرسکون۔ حسان
بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اور بولا۔ "آپ نے کونسا کمرہ پسند کیا ہے؟"

"میں تو اِس کمرے میں رہوں گی جس میں دو پلنگ پڑے تھے۔" نیّا نے اس طرف اشارہ
کیا۔

"ٹھیک۔"

"تو کیوں نہ درمیان والا دروازہ کھول لیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" نیّا نے کہا۔ مگر حسان نے آگے ہو کر جب دروازہ کھولنا
چاہا تو اسے محسوس ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔

"میرا خیال ہے اس کی الگ چابی ہوگی۔ نیچے سے منگوا لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"کھولنے کی کیا ضرورت ہے بھلا، کمرے تو ساتھ ساتھ ہیں ہی۔"

"اچھا اب کیا پروگرام ہے؟" حسان نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتہ نہیں خانم کب آئیں گی۔۔۔؟"

"خانم تو رات کے نو دس بجے پہنچیں گی۔" حسان بولا۔ "آپ اگر تیار ہو جائیں۔ تو
کو بازار لے چلوں۔"

"اس وقت؟"

"ہاں۔! بازار یہاں سے دُور نہیں ہے۔ بس تھوڑا سا پیدل چلنا ہوگا۔"

"مجھے خریدنا تو کچھ نہیں۔"

"ویسے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔؟"

"کوئی حرج نہیں۔"

"تو پھر تیار ہو جائیے!" نیّا نے پرس اٹھایا اور غسل خانے میں چلی گئی۔ وہ منہ دھو کر ذرا
میک اپ کرنا چاہتی تھی۔ اسے تیار ہونے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ بازار میں اُسے
لطف آیا۔ اِس بازار میں گھومتے ہوئے اسے لاہور کا انارکلی بازار بہت یاد آیا۔ اُسی
یہاں بھی بے شمار دکانیں تھیں اور پھر دکانوں کے آگے ریڑھی والوں نے، فٹ پاتھیوں
یک الگ بازار لگا رکھا تھا اور اُسی طرح پکار پکار کر سودا دیتے اور متوجہ کرتے تھے۔
یک فرق تھا یہاں کہ مرد و زن دونوں دکانداری کر رہے تھے۔ جبکہ لاہور میں صرف
ی چھابڑی لگا کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا ارادہ خریداری کا بالکل نہیں تھا۔ مگر جب وہ کہیں
ا ہو کر کوئی چیز خریدنے لگتی تو حسان آگے ہو کر وہ چیز خریدنے کی کوشش کرتا۔ بالآخر نیّا
یزیں دیکھنا بند کر دیں۔ ہوٹل لوٹنے سے پہلے انہوں نے ایک ریستوران میں بیٹھ
ائے پی۔ اور پھر چہل قدمی کرتے کرتے ہوٹل تک آ گئے۔ نیّا کو یہ دیکھ کر بہت حیرت
ہی تھی کہ یہاں بھی پاکستان کی طرح سائیکل ایک مقبول سواری تھی بلکہ سائیکل عورتوں
بہت مقبول تھی۔ خوبصورت سنہرے بالوں والی ڈچ لڑکیاں۔ بڑی شانِ بے نیازی
سائیکل گھماتی کبھی ادھر سے نکل آتیں کبھی ادھر سے۔ ہوٹل بڑے شاندار علاقے
ھا اس کے اِرد گرد اور بھی بے شمار ہوٹل تھے۔ مگر جو شان اکورا انٹر کانٹی نینٹل سے
تھی وہ کسی اور عمارت میں نہ تھی۔ ہوٹل میں آتے آتے نیّا تھک گئی تھی۔ اس لئے اندر
جاتے ہی ری سیپشن ہال کے صوفوں پر دھپ سے بیٹھ گئی۔ وہاں پہلے ہی ایک
بڑا بیٹھا ہوا تھا۔ کالی سیاہ اونچی لمبی بھیانک حبشن کے پیروں میں ایک سفید فام
ا زبان نکالے دُم ہلا رہا تھا۔ یہ تضاد نیّا کو بہت اچھا لگا۔

"آپ کو ہیرے جواہرات سے دلچسپی ہے؟" اچانک حسان نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"ایمسٹرڈم کے ڈائمنڈ بہت مشہور ہیں اور یہاں ہوٹل کی "بیس منٹ" میں ایک بہت بڑا شاپنگ سینٹر ہے۔ آپ کہیں تو آپ کو دکھالاؤں۔"؟ — ہیرے جواہرات سے مجھے دلچسپی نہیں ہوتی۔ گو نیا کے پرس میں اب اتنے پیسے نہیں تھے کہ ہیروں کا ایک ہار خرید لیتی۔ مگر شوق کے منہ پہ ہاتھ نہیں رکھا جاسکتا نا؟ وہ تھکاوٹ کے باوجود کھڑی ہو گئی۔ حسان اسے "بیس منٹ" میں لے گیا۔ واقعی بہت بڑا اسٹور تھا۔ نیا تو ایک ایک دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ خصوصاً خوبصورت گھڑیاں اور ہیرے کی دیدہ زیب انگوٹھیاں بار بار اس کی توجہ کا مرکز بن رہی تھیں۔ ایک ایک شوکیس کے آگے رک کر اس نے قیمتوں کی چٹیں پڑھی تھیں اور پھر دل ہی دل میں حساب لگاتی کہ آیا اس کے پرس میں پیسے ہوں گے کہ ایک انگوٹھی خرید سکے۔ حسان اس کے چہرے کی کشمکش کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قریب آکر بولا۔

"ایک انگوٹھی میرے لئے پسند کر دیجئے گا۔" نیا نے نظر اٹھا کر اس کی صورت کو دیکھا اور پھر اسے فوراً یاد آگیا کہ حسان کو اپنی بیوی کے لئے بھی کچھ خریدنا تھا۔

"آیئے۔ میں پسند کر دوں۔" پھر اس نے ڈبیوں میں سے نکال کر کئی انگوٹھیاں اپنی گوری گوری انگلیوں میں پہنیں۔ ہر انگوٹھی یوں اس کی خوبصورت انگلی میں سج رہی تھی کہ اسی کے لئے بنائی گئی ہو۔ بالآخر اس نے ڈائمنڈ کی ایک نازک سی انگوٹھی پسند کر کے حسان کی طرف بڑھائی اور بولی۔ "یہ بہتر ہے۔ حسان نے وہ انگوٹھی پیک کروائی اور ادا کر کے وہ سٹور سے باہر آگئے۔

"آپ کی پسند بہت اچھی ہے۔" اس نے کہا۔ ہاں نیا نے دل میں سوچا۔ دوسرے کا ہو تو چیز اچھی ہی پسند آجاتی ہے۔ لفٹ میں جب وہ دونوں اکیلے ہوئے

تو نیا نے چپکے سے انگوٹھی ڈبیہ میں سے نکالی اور تیزی سے نیا کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلی میں ڈال دی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" نیا نے بناوٹی سا احتجاج کیا۔

"پھر نہ جانے آپ سے کب ملاقات ہو۔ اس خوبصورت سفر کی یاد یہ ایک انگوٹھی رہے گی۔ میں تحفہ دے رہا ہوں۔"

"یہ بہت زیادتی ہے۔" نیا نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"اگر زیادتی ہے تو آپ معاف کر دیں۔" اتنے میں لفٹ تیسویں منزل پہ رک گئی۔ وہ دونوں باہر نکل آئے۔ کمرے کی طرف جاتے ہوئے حسان نے پھر نیا کی کمر کے گرد بازو ڈال دیا۔

"انگوٹھی میں بڑی طاقت ہے۔" نیا دل میں سوچنے لگی۔ چاہنے کے باوجود وہ حسان کا بازو نہ ہٹا سکی۔ کہیں یہ انگوٹھی زنجیر نہ بن جائے اس نے اپنے ہاتھ کی پشت پر چمکتی ہوئی بیش قیمت انگوٹھی کو دیکھا اتنی خوبصورت تھی کہ ذرا بھی اتارنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ اس کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ اتنا قیمتی تحفہ لینا اچھی بات نہیں ہے اور یہ اس سے بڑی بات ہے کہ وہ ایک اجنبی کے ساتھ چلی آئی ہے۔ کمرے نزدیک آئے تو وہ خود حسان کے بازو سے علیحدہ کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ مگر فوراً بعد ہی حسان نے دروازہ کھول کر پوچھا۔

"آپ کھانا اپنے کمرے میں کھائیں گی؟ یا نیچے ڈائننگ ہال میں چلیں گی؟" نیا جانتی تھی کہ مسز کے پیسے الگ سے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے بولی۔

"نیچے چل کر کھاؤں گی۔"

"ڈائننگ گئے ہیں۔ میں نیچے جا رہا ہوں۔ آپ بھی آجایئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے جان بوجھ کر نیا کو تنہا چھوڑ دیا۔

نیّا کے دل میں عجیب سی کش مکش ہو رہی تھی۔

بہر حال انگوٹھی خوبصورت تھی۔ اور اب اسے سمجھ آ رہی تھی کہ زیورات وہیرے واقعی عورت کی کمزوری ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی نیچے چلی گئی۔ کھانے کے وہ خاموش ہی رہی اور حسّان نے بھی زیادہ بات چیت نہیں کی۔

نو بجے وہ لوگ اوپر آ گئے تھے۔ حسّان اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں تھا اور نیّا ابھی تک کھڑکی میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ خانم کیوں نہیں آئی۔ جب سے ہوٹل کے کمرے میں آئی تھی۔ کئی بار کھڑکی کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا تھا۔ باہر کا منظر بہت دلکش تھا۔ ہوٹل سے لگی ہوئی ایک میلی کچیلی ندی بہتی تھی جو ان گھروں کے بھی گزرتی تھی۔ اس کا پانی اتنا گندہ اور گدلا تھا۔ جیسے ہمارے ہاں بارش کا پانی جمع ہو رنگت اختیار کر لیتا ہے۔ مگر وہاں کے لوگوں کے لئے یہ ندی دنیا کی حسین ترین ندی شام کو بہت سے لوگ بوٹنگ کرتے نظر آتے تھے اور اب اس وقت ایسٹر ڈوم منظر تو واقعی دیدنی تھا۔ اس کھڑکی میں کھڑے ہونے سے پورا شہر نظر آتا تھا دور بتیاں یوں ٹمٹما رہی تھیں، جیسے کہکشاں زمین پر اتر آئی ہو۔

شاید ہر شہر رات کو اسی طرح پیارا لگتا ہو، پھر اچانک اسے کراچی کا خیال آیا کے ساتھ ہی موتی یاد آ گیا۔ امّی جان یاد آ گئیں۔ پتہ نہیں وہاں دن ہو گا یا رات رہا ہو گا، یا سو گیا ہو گا۔ اُس نے ہمسایوں کو تو بڑی تاکید کر دی تھی کہ اس کی امّی کا رکھیں، کہیں امّی کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔؟

"خیر اب تو ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ واپسی میں"۔ اسے پھر خانم کا خیال آ گیا کا خیال آتے ہی اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

انجانا دیس۔۔۔۔ اور وہ تنِ تنہا ایک اجنبی کے ساتھ کیسے معلوم ہے کہ آسمان کے نیچے ہے اور کس زمین پر ہے، اسے ایک جھرجھری سی آ گئی

کمرے کے بند دروازے کو دیکھا، چابی ابھی تک اس میں لٹک رہی تھی۔ اس نے چابی نکال لے اور کپڑے بدل کے سو جاتے تو اچھا ہے۔

لیکن اس کی آنکھوں میں تو نیند کا دُور دُور بھی نشان نہیں تھا۔ وہ ابھی کھڑی اپنے سے اُلجھ رہی تھی کہ بالکل اچانک ہی کمرے کے درمیان والا دروازہ کھٹ سے اس دروازے کی طرف تو اس کا خیال ہی نہیں گیا تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ سربستہ راز کی طرح بند ہی رہے تو اچھا ہے۔ مگر اب اچانک اور بالکل اچانک جام سم والے جادو کی طرح دروازہ کھل گیا تھا اور دروازے کے ساتھ ہی اندیشے و شکوک اس کے دل میں اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ آخر اسے بتائے بغیر رے کی چابی ہی حاصل کرنا کوئی خوش نیتی کی دلیل نہ تھی۔

وہ جانتی تھی دوسرے کمرے میں حسّان ہی ہے۔ پھر بھی جانے۔۔۔۔ کیوں ہی ہو کر کھڑی رہی۔ اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا پھر دروازے کو تھوڑا سا کھول کر حسّان ڈرامائی انداز میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ آنکھیں ہوئی تھیں اور ہونٹ گیلے گیلے تھے۔ جیسے خون پی کر اٹھا ہو۔

"دروازہ کیسے کھل گیا۔؟" نیّا نے اپنا خوف دل میں دبا کر پوچھا۔

"دروازے ہمیشہ کھل جاتے ہیں"۔ حسّان بے ہودہ انداز میں ہنسا اور پھر کچھ اور

"آپ نے دروازہ کیوں کھول دیا۔؟"

"دروازے زیادہ دیر تک بند رہیں تو ماحول متعفن ہو جاتا ہے۔ دروازوں کو ایک کھلنا ہی چاہیئے"۔ اس کی نظر نیّا کے سراپے میں گھستی جا رہی تھی اور نیّا کو ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی نشتر سے اس کا گلا کاٹ رہا ہے۔ وہ بالکل نیّا کے قریب

"اتنی حسین رات ہے اور تم اداس کھڑی ہو۔"

"میں... میں خانم کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"تمہیں انتظار کرنے کی بہت عادت ہے؟ میں نے سوچا تمہیں ملاوٹ کی تکلیف کے لئے میں خود تمہارے پاس چلا آؤں۔"

"کیوں۔! کیا خانم نہیں آ رہی ہیں۔؟" نیآ نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"غالباً وہ نہیں آ رہی ہیں۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "ابھی ابھی مجھے لندن سے ایک کال موصول ہوئی ہے کہ خانم کو آج سیٹ نہیں مل سکی۔"

"سیٹ نہیں مل سکی۔؟" نیآ یوں آنکھیں نکال کر چیخی جیسے اس نے سانپ دیکھ لیا ہو۔

"کیا میں نے کوئی بہت بھیانک بات کہہ دی ہے۔" وہ نیآ کے بالکل قریب آ کر بولا۔ نیآ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غصّے اور گھبراہٹ کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ رہے تھے۔ جنہیں وہ پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"اتنا غصّہ ٹھیک نہیں ہے۔" حسّان لڑکھڑایا۔ "ذرا دماغ کو سکون دو۔ لاؤ میں ذہنی سکون کی دوا دوں۔" وہ لڑکھڑاتا ہوا آٹومیٹک منی بار کے پاس پہنچا۔ ایک بٹن دبایا تو بیئر کی بوتل باہر آ گئی۔ دوسرا بٹن دبایا تو وہسکی کی بوتل باہر آ گئی۔

"تم کیا نوش کرنا پسند کرو گی جانِ آرزو۔؟"

"آپ مہربانی کر کے اپنے کمرے میں چلے جائیں۔" نیآ قدرے درشتی سے بولی۔

"مگر یہ کمرہ بھی تو میرا ہی ہے۔"

"یہ آپ کا کمرہ نہیں ہے۔"

"مگر اس کا نمبر بھی میرے ہی کاغذوں میں درج ہے۔"

"میں ری سیپشن پہ فون کر کے آپ کی شکایت کر دوں گی۔"

"کیا شکایت کرو گی۔؟ لوگ کیا کہیں گے کہ میاں بیوی ہنی مون کے لئے

ہو گئی ہے۔"

ہاں بیوی۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔؟"

اں ہوٹل کے کاغذوں میں میں نے تمہیں مسز حسّان علی لکھا ہے۔"

یا کیوں کیا آپ نے ــــ؟" نیآ غرائی۔

یا آپ ہی آپ ہو جاتا ہے۔ کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

یا آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی بیوی نہیں ہوں۔"

یکن آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی بیوی نہیں ہوں۔"

م تمہیری کیا ہو، کیا سوچ کر میرے ساتھ آ گئی تھیں؟"

و... تو.... مجھے خانم نے کہا تھا۔"

ور تم ننھی بچی تھیں؟ کچھ نہیں جانتی تھیں، کچھ بھی نہیں۔" اس نے وہسکی کی بوتل میز پہ رکھی گلاس میں انڈیلی اور پھر بلا نوشوں کی طرح غٹ غٹ پینے لگا۔

بیوی نہیں بننا چاہتیں.... تو نہ بنو.... محبوبہ ہی بن جاؤ۔ ایک رات کے لئے۔ میں کچھ بھی بننے کو تیار نہیں ہوں۔" نیآ غصّے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

آہستہ بولو.... ورنہ لوگ تمہیں میری داشتہ سمجھ لیں گے۔"

شٹ اپ... شٹ اپ مسٹر حسّان ــــ آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں۔" حسّان زہر آیا اور نیآ کا بازو پکڑ لیا۔ نیآ نے صاف محسوس کیا کہ بازو پر اس کی گرفت بہت ہی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کا بازو کسی آہنی شکنجے میں آ گیا ہو۔

محمد زنگا فساد بالکل پسند نہیں کرتا بس محبّت کی زبان سمجھتا ہوں۔ تم اتنی حسین ہو کہ ستم توڑنے پر چاہنا مارنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ آج رات تم میرے رحم و کرم پہ ہو۔ غصّہ تھوک دو گھونٹ پی لو۔ سارا انتشار ختم ہو جائے گا چٹکی بجاتے تم نارمل ہو جاؤ گی۔

ہٹو پرے کی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ نیآ کے نزدیک کیا تو نیآ نے اپنا منہ پھیر لیا۔ نیآ کے حواس میں اندازہ ہوا کہ وہ کس مصیبت میں پھنس گئی ہے؟ بچاؤ کی کوئی صورت نہ

تھی۔ ـــــ اسے رہ رہ کر خانم پر غصہ آرہا تھا اور اپنی نادانی کو کوس رہی تھی۔ بازو سے پکڑ کر کھینچا اور اپنے ساتھ پلنگ پر بٹھا لیا۔ اس کے منہ سے بڑی واہیات بو آ رہی تھی۔ نیاّ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی سانس کی نالی میں دو دھاری تلوار ہے۔ وہ بار بار اپنی کلائی کی کھڑی دیکھ رہی تھی اور دل میں دعا کر رہی تھی کہ اے کاش کوئی رونما ہو جائے کہ خانم اچانک چلی آئے کہ خلافِ توقع حسّان نے نیاّ کا گھڑی والا ہاتھ لیا اور بولا۔

"خانم آج نہیں آئے گی ڈارلنگ . . . . مجھے تو اس گھڑی سے رقابت محسوس ہو رہی ہے۔ جس کو تم بار بار دیکھ رہی ہو"

"خانم کیوں نہیں آئے گی۔؟" نیاّ نے روہانسی آواز میں پوچھا۔

"اس لئے کہ وہ . . . دو دلوں کے بیچ کبھی نہیں آتی" حسّان اپنے ٹوٹے ہوئے لہجے کے ساتھ بولا۔ نیاّ کا دل چاہا وہ زور زور سے روئے۔ چیخے چلائے ـــ واویلا کرنا بے سود تھا۔ یہاں اُسے کون جانتا تھا اور جو لڑکی تن تنہا ایک مرد کے پر آمادہ ہو جاتے اسے کون شریف لڑکی کہہ سکتا ہے۔

"داشتہ ـــ؟"

اُف کتنا گھناؤنا لفظ تھا یہ ـــ مگر کیا وہ یہ بدنما دھبہ اپنے ماتھے پر لگانے پیدا ہوئی تھی۔ حسّان نے ابھی تک اُس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اور وہ اس کے دباؤ پلنگ پر بیٹھی تھی۔ بالکل ایسے جیسے خونخوار جنگلی بلّے نے ایک کمزور سی نازک سی چڑ رکھا ہوا اور اب کوئی دیر میں اس کو نگلنا چاہتا ہو۔ موت کو سامنے دیکھ کر ہر ایک خطا ہو جاتے ہیں ـــ لیکن نیاّ کے لئے یہ دوہری موت تھی۔ اپنی نظروں سے کہاں زندہ رہ سکتا ہے، کاش وہ اس اَدھ کھلی کھڑکی سے کُود کر جان دے دے۔ جہاں پہلے کھڑی وہ باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ مگر یہ بھی ممکن نہ تھا۔ کیونکہ اس نے پہلے ہی دیکھ لیا

ہوش میں سے کسی انسان کے جسم کا گزر جانا کچھ آسان نہیں تھا اور پھر جب کسی آدمی نے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکا ہو۔ مجسّم شیطان بن چکا ہو تو وہ انسانیت کے سننے پر راضی نہیں ہوتا۔ نیاّ خوب جانتی تھی۔ ایسے مناظر اُس نے فلموں میں بھی اور کتابوں میں بھی پڑھے تھے . . . . اور پھر بھی کانچ کی اس بے رحم دیوار سے جائے بغیر گزر جانا چاہتی تھی۔ اس لئے پینترا بدل کر بڑی نرم آواز میں بولی۔

"آپ میری کلائی چھوڑ دیں۔ ورنہ میں خانم سے آپ کی شکایت کر دوں گی" حسّان نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور اس کی کلائی چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر سامنے میز کے قریب ہو کر ایک اور گلاس بھرنے لگا۔

"خانم کے نام کی اپیل نہ کرو۔ اپنے حُسن کے نام پہ کچھ مانگو" وہ غٹ غٹ کر کے آدھا گلاس پی گیا اور پھر سامنے آ کر، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"کیا شکایت کرو گی جانِ من۔ کیا کہو گی آخر ـــ؟ میں بھی تو سنوں!" نیاّ چپ بیٹھی رہی۔ کیا وہ سوچ رہی تھی اگر یہ ذرا سا دروازہ چھوڑ کر کھڑا ہو تو وہ دوڑ کر ساتھ والے کمرے میں جائے اور اندر سے کنڈی لگا لے گی" ـــ مگر وہ عین دروازے کے درمیان کھڑا تھا۔

"خانم کو میں نے لاکھوں کا کاروبار دیا ہے ـــ اتنا کاروبار حاصل کرنے کے لئے ہی بیالیس برس کی عمر تک وہ میرے پیچھے آئی ہے۔ جانتی ہو کیوں دیا ہے خانم کو اتنا بڑا کاروبار ـــ؟" وہ خود ہی بڑبڑایا۔ "ظالم حسینہ فقط تیرے لئے ـــ تیری خاطر ـــ تیرے اِن لالہ گوں گالوں کی مے پینے کے لئے۔ کیونکہ تجھے دیکھتے ہی میں تیرے عشق میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اس سے زیادہ لمبا عشق نہیں کیا کرتا ـــ کیونکہ مصروف آدمی ہوں۔ بلکہ جلد ہی عشق کو انجام پہنچا دیتا ہوں۔ اس لئے کہ اچھا کاروباری ہوں۔ کیا یہ قیمت کم ہے جو میں نے تجھ اس رات کی اتنی بڑی قیمت ـــ کوئی ایسا عاشق تمہیں ملا ہے کبھی؟"

اور تم خانم کے دھمکا دے دے رہی ہو ـــــ خانم کیوں آئے گی ـــ؟ کیوں اس
میں بھنگ ڈالنے ـــ آج رات ہماری ہے ـــــ میری اور تمہاری ـــ اس کائنات
آج رات ہم دونوں اکیلے ہیں۔ اور آج ہی اس زمین پر اتارے گئے ہیں ـــ کسی
بارے میں مت سوچو۔ آؤ میرے بازوؤں میں آجاؤ ـــــ اوہ ـــ اتنے بل تمہارے
پر ـــــ یہ چاند سی پیشانی ـــــ یہ ستارہ سی آنکھیں ـــ اور ان پر ـــــ؟" اس نے
دونوں بازوؤں کا حلقہ بنایا اور اس میں نیاؔ کو پھنسا لیا۔ ایسا نہیں کہ نیاؔ مدافعت نہیں
سکتی تھی مگر ایک اچانک صدمے نے اُسے نڈھال کر دیا تھا کہ کیا خانم اس کے
ایسا سلوک بھی کر سکتی ہے۔؟

کیا خانم اُسے اِس طرح بھی استعمال کر سکتی ہے؟

کیا ہزاروں لاکھوں کے عوض بیچی ہوئی عزت واپس بھی آسکتی ہے۔؟

چشم زدن میں کئی پردے اس کی آنکھوں سے سرکنے لگے ـــ خانم کی تمام تر
سانپ بن کر ڈسنے لگیں ـــ وہ رنج اور غصے سے تھر تھر کانپنے لگی۔

"کیا سردی لگ رہی ہے تمہیں جانِ تمنا۔ مگر میرے ہاتھ تو بہت گرم ہیں۔" ابا جی
جاگ اٹھی۔ یہ صدمے سے نڈھال ہونے کا وقت نہیں تھا۔ سنبھلنے کا وقت تھا۔
اس کی بولی لگ چکی تھی۔

اپنے بچاؤ کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

اور سر پہ شر انگیز رات ننگی تلوار کی طرح کھڑی تھی۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝

ابا جی کی رقت آمیز آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ تو یہ ہوتا ہے رات
جس سے بار بار پناہ مانگی گئی ہے ـــــ

ایک دم ابا جی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا ـــــ

امی جی کا خیال آگیا ـــــ

پھر موتی یاد آگیا ـــــ

کانچ ٹوٹ جائے تو لوگ اُسے خاک پر پھینک دیتے ہیں ـــــ

مامتا کی آبرو لٹ جائے تو اُس کا فخر بھی جاتا رہتا ہے ـــــ

بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے ـــــ بہت کچھ گنوانا پڑتا ہے ـــ مگر یہ ـــــ

ابھی تک اندر خواجہ عبدالرحیم کیوں بول رہا ہے ـــــ؟

توڑ پھوڑ سی کیوں ہو رہی ہے ـــــ؟

آندھیاں اور جھکڑ چل رہے ہیں! اور ظلم یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی خاطر نہیں ـــ
کسی دوسرے کی خباثتِ نفس کی بھینٹ چڑھ جاتے ـــ آخر کیوں ـــــ!

نیاؔ کی پشت پر حسّان کے ہاتھوں کا دباؤ سخت ہو رہا تھا ـــ اور پھر یکایک نیاؔ کو اس
بات کا خیال آگیا جو آسمانوں پہ تھا۔ جو سب کی سنتا ہے ـــ اور جو شہ رگ کے بھی قریب ہوتا
ہے ـــ نیاؔ نے اپنی تمام تر التجا کو آہ کی صورت میں آسمان پر بھیجا ـــ آج کی رات ـــــ
میرے مالک! بس آج کی رات! مجھے بچا لے ـــ مجھے دکھا کہ تو آسمانوں پر ہے ـــــ
مظلوموں کی سنتا ہے ـــ فریادی کی فریاد کبھی رائیگاں نہیں جاتی ـــ آج مجھے بھی
پروردگار کا کرشمہ دکھا! نیاؔ ایک دم پلٹ کر مڑی ـــ اور اس کی گرفت سے نکل گئی ـــــ
سرخ لبوں کی تمازت سے حسّان کا چہرہ تپ رہا تھا ـــ مگر وہ مسکرایا اور جھوم کر بولا ـــــ
"اتنی ادائیں بھی نہ دکھاؤ کہ میرا دم نکل جائے۔" نیاؔ کو بچاؤ کے لئے صرف ایک ہی خیال
آیا ـــ ہر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ وہ اپنے چہرے پر سے تمام اندیشے
جھٹک کر مسکرائی اور خود ہی حسّان کے قریب آگئی ـــــ نہ صرف قریب آگئی بلکہ
اس کے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور بولی۔

"آپ کیوں پی لیتے ہیں کہ آپ سنبھل بھی نہیں سکتے ـــ آپ کے منہ سے تو بات بھی

نہیں نکل رہی ——"

"کون کافر کہتا ہے کہ میں مدہوش ہو چکا ہوں۔ اگر تم ساری رات یہاں بیٹھ کر سانس لیتی رہو، میں تب بھی آؤٹ ہونے والا نہیں!"

"ڈھنگ سے تو سر کار ایک بات بھی نہیں کر سکتے آپ ——"

"کتنی باتیں کرنا چاہتی ہو تم میرے ساتھ، کہو تو میں ساری رات تمہارے حسن کے قصیدے پڑھتا ہوں ——"

"مجھے خوبصورت باتیں کرنے والے مرد اچھے لگتے ہیں۔" نیا میں نجانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی تھی۔

"تو یہ ہوتی نہ بات۔" وہ لڑکھڑا کر میز کے قریب آگیا —"یہ زہر پینے دو مجھے تاکہ میں میٹھی باتیں کر سکوں۔"

"آپ آؤٹ ہو جائیں گے اور رات برباد ہو جائے گی۔"

"ارے نہیں —— میں کنواں بھی پی جاؤں تو فرق نہیں پڑے گا۔"

"اچھا آج آزما لیتے ہیں۔"

"دیکھ لینا ——"

"لائیے پھر میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے پلاؤں گی۔"

"او ستمگر —— او ستمگر ——" جھومتا ہوا حسان اس کے ساتھ والی دوسری کرسی پر گر گیا —— اور لہرا لہرا کر بے تکی آواز میں گانے لگا۔

بلایا گھر میں پلاتی پھر اپنے ہاتھ سے
کیا خوب! آپ نے ہمیں مہماں بنا کے لوٹ لیا

نیا نے بڑی ناگواری سے بوتل کا ڈھکن کھولا۔ اور پھر گلاس بھر کر اسے پیش کیا۔ زندگی میں یوں بھی کرنا پڑتا ہے ——

وہ اپنے آپ سے لڑنے لگی —— جس ماحول میں وہ آگئی تھی۔ وہاں سب کچھ جائز ہوتا ہے —— اور اپنے دفاع میں تو ہر جرم جائز ہے ——

وہ حسان کو اس مقام تک لے جانا چاہتی تھی۔ جہاں وہ ہوش و خرد کی ہر منزل سے گزر کر صرف ایک لاش رہ جاتے۔ اس دوران اسے حسان کی کچھ بے ہودگیاں اور گستاخیاں بھی برداشت کرنا پڑیں —— مگر وہ مسکرا مسکرا کر جام بھرتی رہی —— اور وہ لہک لہک کر پیتا رہا۔

پھر اچانک بولی ——

"کیا آپ کو خانم نے لندن میں ہی بتا دیا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔"

"یہ تو طے تھا —— پروگرام تو سارا وہیں لندن میں کھانے کی میز پر طے ہوا تھا۔ اور —" وہ کریہہ انداز میں ہنسا —"خانم کو اچانک بیمار بھی بننا پڑا تھا۔"

نیا کے اندر جیسے زلزلہ سا آگیا ——

مگر وہ پھر گلاس بھرنے لگی —— حسان نے اس کا گلاس والا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم بھی پیو جانِ جاناں ——"

"پیوں گی مگر ذرا ٹھہر کے ——"

"یہ ہوتی نا بات ——" حسان کے چہرے سے پورا کا پورا شیطان جھانکنے لگا تھا —— نیا نے غرا کر کہا ——

"آپ کو معلوم ہے کہ خانم کے کیمرے میں آپ کی بے شمار ایسی تصویریں ہیں جو اگر اپنے ملک میں جا کر چھپوا دی جائیں تو نہ صرف یہ کہ آپ کی نوکری جائے گی بلکہ رسوائی بھی بہت ہوگی۔"

"اچھا —— اچھا ——" بڑی مشکل سے اپنی زبان کو کھینچ کر حسان نے یہ الفاظ ادا کیے۔ "اور اتفاق سے وہ ساری فلمیں میرے قبضے میں ہیں اور کراچی کے بہت سے ایڈیٹر میرے دوست ہیں ——"

"اچھا! اب تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہو۔" وہ غرایا۔ "کتیا میں تمہارا گلا گھونٹ دونگا ——"

"نہیں میں بلیک میل ہرگز نہیں کرنا چاہتی ——" نیا اندر سے لرز گئی۔ فرض کرو حسان گلا گھونٹ کے مار بھی ڈالے تو کل لوگ اُس کی موت کو کس طرح مشتہر کریں گے ——

"میں تو چاہتی تھی آپ میرے ساتھ سمجھوتہ کر لیں ——"

"سمجھوتہ —— کیسا سمجھوتہ ——" غصّے سے بل کھا کر حسان یکدم کھڑا ہو گیا —— نیا بھی کھڑی ہو گئی —— مگر ذرا دُور ہٹ کے ——

حسان اس وقت اتنا مدہوش ہو چکا تھا کہ اپنے قدموں پر ٹھیک طور سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا —— پھر بھی اس نے بدمست آنکھوں کو زور زور سے کھول کر نیا کی طرف دیکھا جیسے اسے کھا ہی تو جائے گا —— اور اسی انداز سے وہ جھپٹ کر آگے بڑھا —— اسے دبوچ لے —— مگر عجیب بات ہوئی —— جونہی وہ تیزی سے جھپٹا —— تیورا کر گرا۔ اور اسی وقت اُسے اُبکائیاں آنے لگیں —— صورت حال کو سمجھ کر وہ اٹھا اور سیدھا غسلخانے کی طرف بھاگا۔ غلطی اُس سے یہ ہوئی کہ اپنے کمرے کے غسلخانے میں چلا گیا۔

بس یہی ایک لمحہ تھا ——

ایک ثانیہ تھا ——

ایک سیکنڈ، ایک گھڑی —— زندگی اور موت کے درمیان ایک وقفہ!

نیا جیسے پُل صراط پر آن کھڑی ہوئی ——

فیصلے کی گھڑی آ پہنچی تھی ——

اور اس نے اسے ٹلنے نہیں دیا —— دوڑ کر درمیان والا دروازہ بند کر دیا —— اپنی طرف سے مقفل کر کے چابی نکال لی —— پھر بھی کچھ باہر والے دروازے کے ساتھ کیا —— لیکن ابھی تک غیر یقینی حالت میں دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی! ایسے لگ رہا تھا آج کوئی دروازہ بند نہیں ہو گا —— اگر وہ ایک دروازہ مقفل کرے گی تو دوسرا کھل جائے گا —— اور نہیں تو ہر دیوار ڈھے جائے گی اور دروازہ بن جائے گی ——

اس کا دل چاہا کہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جائے۔ مگر باہر نکل کر کہاں جائیگی؟

ہوٹل کا سارا عملہ جاگ جائے گا ——

اور پھر وہ کہانی بن جائے گی ——

کہانی بننے سے اسے ڈر لگتا تھا ——

وہ سوچوں کی صلیب پہ لٹکی تھر تھر کانپ رہی تھی کہ حسان کے دروازہ پیٹنے کی آوازیں ——

اس کی تھاپ سے پتہ چل رہا تھا کہ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہے۔

نیا کو بری طرح گالیاں بھی دے رہا تھا —— اور نیا یوں دم سادھے کھڑی تھی۔ جیسے

پڑا بس دو چار قدم کے فاصلے پر ہو —— ابھی لپک کر آئے گا اور اسے دبوچ لیگا

کھا جائے گا —— جتنی دعائیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں۔

پھر جیسے طوفان ٹل گیا۔

بگلی بھیڑیا اپنا جوش و خروش دکھا کر ٹھنڈا ہو گیا تھا یا اس کے ہاتھ شل ہو گئے تھے۔

کے دروازے کے قریب ڈھیر ہونے کی آواز آئی تھی ——

نیا تمام رات وہیں کمرے کے فرش پر بیٹھی رہی —— جب خوفناک آوازیں آنا بند

تب اُس کے اندر سے آوازیں آنے لگی تھیں ——

ان آوازوں میں بچپن کی لوریاں بھی تھیں ——

اماجی کی قرأت کی آواز بھی تھی ——

ونی کی کلکاریاں بھی تھیں ——

اور زینہ بہ زینہ آگے بڑھتی ہوئی نیا کی خواہشوں کی جھنکار بھی تھی ——

اس بلندی پر پہنچ کر بھی وہ ابھی تک "نایاب خواجہ" تھی۔ لاہور کے ایک قدیم محلہ کی پروردہ۔

اور یہ اکورا انٹرکانٹی نینٹل" تھا۔ یورپ کے ہوٹلوں میں ایک سربلند ہوٹل!

یہاں تک آنے میں کیا کچھ پامال کرنا پڑتا ہے ——

ادراک کے سارے بند دروازے کھل گئے تھے ــــ
بہت عرصے سے نیاز روتی نہیں تھی ــــ
بہت دنوں سے مقدر کا گلہ نہیں کیا تھا ــــ
اسے آہ بھرنے کی فرصت بھی نہ تھی ــــ
مگر آج ــــ زخم کا منہ ایک نئی جگہ سے کھل گیا تھا۔ ٹانکے ہرے ہو گئے تھے۔
اس نے اللہ کی رحمت کا کرشمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا ــــ یا پھر دیارِ غیر میں
بے بسی اور کس مپرسی کا خیال آگیا تھا نیاز پھوٹ پھوٹ کر روئی ــــ
خوب روئی ــــ
جی جان سے روئی ــــ
بلک بلک کے روئی ــــ
شیطان کو دیکھ لینے کے بعد، خدا اور بھی پیارا لگتا ہے، اور قریب لگتا ہے۔
اور بھی حسین لگتا ہے۔!

زندگی

دن کی اک اک بوند گراں ہے، اک اک جرعہ شب نایاب
تام و سحر کے پیمانے میں جو کچھ ہے ڈر ڈر کے پیو!
آہستہ آہستہ برتو، ان گنتی کی سانسوں کو
دل کے ہاتھ میں شیشۂ جاں ہے قطرہ قطرہ کر کے پیو

(مصطفیٰ زیدی)

دفتر میں بیٹھی ٹائپ رائٹر پہ اپنی مخروطی انگلیاں چلا رہی تھی۔ مشین سے کھٹ کھٹ
پ... ٹپ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ بڑی مہارت سے اس کی انگلیاں ٹائپ رائٹر
چل رہی تھیں، جیسے کہ ایک مشین ہو اور وہ خود بھی بڑے مشینی انداز میں بیٹھی ہوتی تھی
ں نے اپنے اوپر سنجیدگی طاری کر لی تھی، جو ایک دفتری مشین کا خاصہ ہوتی ہے۔
فتر میں اس کا تیسرا سال جا رہا تھا۔

سرے سال اسے مشین بن جانا پڑا تھا۔ کیونکہ جب عورت پھول نہیں بن سکتی۔ چاند
سکتی۔ بارش کا پہلا قطرہ نہیں بن سکتی تو وہ مشین بن جاتی ہے۔ بچے پیدا کرنے کی،
ٹائپ کرنے کی۔

کبھی دائیں طرف میز پر پڑے ہوئے کاغذات کے پلندے کو دیکھتی اور کبھی ٹائپ
سے نکلتے ہوئے لمبے کاغذ کو کہ آیا وہ ٹھیک ٹھاک ٹائپ کر رہی ہے یا بے خیالی
زاف چھوڑتی جا رہی ہے، جیسا کہ وہ کبھی کبھی ذہنی پریشانی کے تحت کر جاتی تھی۔
رتے کرتے وہ چونک گئی۔ یہ کاغذات تو حسابوں کے وہ بل تھے جو "سوزن سلائی مشین"
بھیجنے کے لئے ٹائپ کئے جا رہے تھے۔ "سوزن" والوں کا کام ختم ہو چکا تھا۔ نیا

نے اس کمپین میں حصہ نہیں لیا تھا۔ سوزن سلائی مشین کا نام ذہن میں آتے ہی
تلخ و ترش یادیں نیا کے ذہن میں منڈلانے لگیں۔ ظاہر ہے سوزن سلائی مشین کے
حسان علی کا یا دآنا بھی لازمی امر تھا اور اس کے ساتھ لندن کا سفر، پھر ایمسٹرڈم کا ہوٹل "کا
انٹر کانٹی نینٹل" نیا بیٹھے بیٹھے لرز گئی۔ کیسی عجیب رات تھی وہ۔ یوں لگتا تھا۔ اس رات کی
کبھی نہ ہوگی اور یونہی آسمان پر چھائی رہے گی۔ سیاہی سفیدی کو راستہ نہ دے گی اور نیا
صبح کے انتظار میں دم توڑ دے گی۔ تمام رات نیا بستر پر نہیں لیٹی۔ بس کرسی پر بیٹھی رہی تھی۔
اسے یوں لگتا تھا اگر وہ بستر تک جائے گی۔ تو پھر اس سے کوئی بھول ہو جائے گی۔ پلک لگ
جائے گی اور کھٹ سے کوئی دروازہ کھل جائے گا اور راہزن نفس کا دو دھاری خنجر لیکر اس
کے خوابوں کی قبا چاک کرنے آجائے گا۔

جاگتی آنکھوں سے اس نے ساری رات کاٹی تھی۔ جانے اللہ سے کتنی دعائیں مانگ
ڈالی تھیں۔ کتنا روئی تھی، اور کتنی معافیاں مانگی تھیں اللہ سے ——— ابا جی سے ——— امی جان
سے ——— موتی سے ——— رو رو کر، بلک بلک کر، بالآخر اس نے ساری رات ختم کر دی تھی۔
کھڑکیوں کے شیشوں میں سے صبح کی نورانی ٹھنڈی روشنی نمودار ہونے لگی تھی، لیکن اسے
اس روشنی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ سوچتی تھی کہ یہ اجالا بھی حسان علی کی کوئی چال نہ ہو۔ حالانکہ اجالا
جلد بازی سے پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ بالآخر جب باہر کوریڈور میں اسے لوگوں کے چلنے پھرنے کی
آوازیں آنے لگیں، تو اسے حوصلہ ہوا۔ اس نے اپنے کمرے کا باہر والا دروازہ ڈرتے ڈرتے
کھولا، اور سر باہر نکال کر ادھر ادھر جھانکا۔ تو ایک ڈچ لڑکی جاتے جاتے رک گئی اور قریب
آکر جلدی سے بولی۔

"گڈ مارننگ"

"گڈ مارننگ" نیا نے بھی فوری جواب دیا۔

"آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔؟"

نہیں..... جی ہاں..... نیا بوکھلا گئی۔ "مجھے ابھی چائے چاہیئے"

میں ابھی پہنچا دیتی ہوں"

شکریہ" اس کے جاتے ہی نیا نے پھر دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ غسل خانے میں جا
منہ دھویا۔ بگڑی ہوئی شکل کو درست کیا اور بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ اسی وقت دستک ہونے
جان سے لرز گئی۔ اسے ہر دستک سے ڈر لگنے لگا تھا۔ یہ دستک تو اس کی روح
بھی تھی کہیں پھر حسان کو ہوش نہ آگیا ہو۔ وہ دروازے کے پاس گئی مگر دم سادھے
مسلسل دستک ہوتی رہی پھر کسی نسوانی آواز نے عاجزانہ مگر قدرے غصّے والے
کہا۔

پائے لے لیجیئے" تو نیا نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ باہر وہی ڈچ لڑکی کھڑی
تھی۔ دروازہ کھلتے ہی کھٹ کھٹ کرتی اندر آگئی۔ لڑکی دراز قد تھی۔ بال سنہرے تھے
ابھرا تھا۔ پنڈلیاں ننگی تھیں۔

آپ نے دروازہ کیوں نہیں کھولا۔؟" اس نے ایک کاروباری مسکراہٹ لبوں پر سجا
چائے پر چائے کے برتن لگانے لگی۔

رات فسٹیوا نے میں تھی۔"

اوہ ——— ! مجھے افسوس ہے" وہ بیچ بیچ شرمندہ سی ہو گئی۔ "میں نے جانا غالباً آپ
ہوں گی" نیا نے دل میں سوچا کم از کم ہم لوگ جھوٹ تو سلیقے سے بول لیتے ہیں۔
آپ اس ٹرے کس وقت کریں گی؟" اس نے خالی ٹرے بغل میں دباتے ہوئے کہا۔ نیا نے
خفیف اور بے خیالی میں کہہ دیا۔

"ان سے کہئے"

"آپ کے شوہر۔؟"

شوہر ——— " ایک برچھی سی نیا کے کلیجے میں اتر گئی یہ بات اسے رات حسان علی نے شراب

کے نشے میں بتائی تھی۔ ورنہ تو وہ پنجے جھاڑ کر لڑکی کے پیچھے پڑ جاتی۔ "کہ وہ آوارہ ہے نہیں ہے۔" لیکن پھر یہ لڑکی بھی تو پوچھ سکتی تھی کہ "اگر شوہر نہیں ہے تو کیا ہے۔ یہاں کیا معیوب ہے۔ یہاں تو لڑکیاں بوائے فرینڈز کو شوہروں پر ترجیح دیتی ہیں۔ فرینڈ کے ساتھ سفر کرنا باعثِ فخر سمجھتی ہیں۔

"کیا آپ کے شوہر بیڈ ٹی پئیں گے؟" اُس نے نیّا کو چُپ دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں۔" نیّا جیسے کھول اٹھی مگر پھر اپنے لہجے پر قابو پالیا۔ "رات اُن کی طبیعت زیادہ خراب تھی اس لئے وہ دیر سے اٹھیں گے اور جب اٹھیں گے تو روم سروس کر کے ناشتے کے لئے کہہ دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ جانے لگی پھر جاتے جاتے مڑ کر اس نے نیّا کو آنکھ ماری اور

"اسی لئے وہ الگ کمرے میں سو رہا ہے۔" نیّا کو زبردستی مسکرانا پڑا۔ وہ باہر نکل گ نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ گودن چڑھ گیا تھا۔ مگر ہوٹلوں کے اندر کا ماح شام ایک جیسا رہتا ہے نا، ابھی تک اُسے ان دبیز پردوں سے چھن چھن کر آنے وال روشنی پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ مگر وہ روشنی اور اندھیرے کا فرق صاف جان گئی تھی موت کی علامت ہے اور روشنی نوید زندگی۔ موت خواہ نفس کی ہو یا رُوح کی۔ را پھر کر روتی تھی اس لئے سر بھاری تھا اور پپوٹے دکھ رہے تھے گرم گرم چائے پ تو طبیعت کو سرور آنے لگا۔ جسم میں حرارت دوڑی تو آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے وہ اُٹھ کر بستر پر دراز ہو گئی۔ اُس کی آنکھ اس وقت کھُلی جب کوئی بری طرح دروازہ پ رہا تھا۔ نیّا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے۔ اس نے سوچا والی لڑکی ناشتہ لے کر آگئی ہے۔ اس لئے اٹھتے ہی دروازہ کھول دیا۔ وہاں خانم تھی۔ خوشبوؤں میں نہائی ہوئی ـــــ تر و تازہ ـــــ تبسّم تبسّم ـــــ آنکھوں آنکھوں کھوجتی ہوئی ـــــ اس کے پیچھے شہریار مسکین سی شکل بنائے کھڑا تھا۔

ہیں یہ لوگ ـــــ جعل ساز ـــــ چکرباز ـــــ جال بُننے والے!" حیرت اور غصّے
ے نیّا سلام کرنا بھول گئی۔
شید بھی تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی۔" خانم نے ہنس کر کہا۔
نہیں۔" نیّا نے صرف انکار میں سر ہلا دیا۔
جلدی سے شاور کے نیچے چلی جاؤ اور نہا دھو کر ہوش میں آؤ پھر اکٹھے ناشتہ کرتے
ہارے ساتھ اپنے ناشتے کا بھی آرڈر دے آئی ہوں اور ابھی وہ لڑکی لاتی ہوگی۔"
ہوئی مغلظات نے میں چلی گئی۔ نیّا کے دل میں خانم کے لئے بے حد غصّہ تھا۔ اس کا جی
چاہا۔ وہ باہر نکل کر خانم کا منہ نوچ لے۔ کیسی نائیکہ بنی دَن دَن کرتی چلی آئی ہے۔ وہ اُس
چاہی تھی۔ تیر اطلسم ٹوٹ چکا ہے تو وہ جادو گرنی ہے جو نوجوان لڑکیوں کا لہو پی کر
ے پرے کاروبار کی اساس لوگوں کی مجبوریوں پر رکھی گئی ہے۔" لیکن جب وہ نیم گرم
ے اچھی طرح نہا چکی تو۔ اس کے ہوش واقعی ٹھکانے آگئے۔ اسے محسوس ہوا
ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ ابھی وہ خانم کے رحم و کرم پر ہے۔ پردیس میں ہے
پنجرے کی مانند جو جنگل میں خونخوار چیلوں کے نرغے میں پھنس گیا ہو۔ اس لئے خانم سے
طور پر بگاڑ کرنا کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ خدا جانے بدکلامی کے بعد خانم اس سے کیا سلوک
ے کل کے حوالے کر دے ـــ؟ کہاں چھوڑ جاتے؟ کیا خبر وہ وطن کی صورت
دیکھ پائے۔ زندگی بھر دنیا سے مُنہ چھپانا پڑے۔ بس اسی طرح کے ہزار ہا وسوسے
ے لگے۔ وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو خانم اُس کے کمرے میں نہ تھی، لیکن درمیان والا
خمار حسّان کے کمرے سے اِن تینوں کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں آرہی تھیں
ہنسنے لگا رہا تھا جیسے رات کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔
گناہوں نے لوگ ہیں یہ۔" نیّا ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھ کر بال سنوارنے لگی۔ لڑکی
کی گرم گرم مہک اس کی اشتہا کو تیز کر رہی تھی۔ خانم نے اُس کے

ساتھ ہی ناشتہ کرلیا۔ نیّا کے لئے ایک اور تعجب خیز بات بھی ہوئی۔ خانم
پروگرام بنایا کہ حسّان اور شہریار یہ اس کے بعد ان کے کسی پروگرام میں بھی شرکت
رات کو خانم اور نیّا لندن آگئیں، اور وہاں سے دو دن بعد وطن کو روانہ ہوئیں۔ ا
میں نیّا زیادہ تر خاموش رہی۔ خانم بدستور چہکتی رہی۔ نیّا کا خون اندر ہی اندر کھول رہا
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ خانم سے کیا بات کرے۔ گفتگو کا کس طرح آغاز کرے
تو یوں ظاہر کررہی تھی، جیسے بالکل انجان ہے اور اُسنے کچھ بھی نہیں کیا۔ نہ ہی خو
خواہ نظر آرہی تھی۔ وطن واپس جاتے ہوتے جب نیّا اپنے جہاز میں بیٹھی اور اسے ا
گیا کہ اب اُسے کوئی اتار نہیں سکتا۔ تب اس نے سفر کے دوران خانم کو چھیڑا۔

"خانم! آخر عورت کی عزّت کو اتنا بے مول کیوں سمجھا جاتا ہے اور پھر یہ کیوں ہو
ہے۔ کہ جو عورت گھر سے باہر نکل آئی ہے وہ اپنی عزّت کا سودا بھی کرے گی"۔ خا
مڑکر حیرت سے نیّا کو دیکھا اور دوسرے لمحے سگریٹ سلگالیا۔ تھوڑی دیر تک کش
پھر بولی۔

"عزّت سے تمہاری کیا مُراد ہے؟" نیّا سوچنے لگی تو خانم خود ہی بولی۔

"تمہاری عزّت یہ ہے کہ لوگ تمہارا احترام کریں۔ تمہیں اچھا جانیں۔ زندگی پر تمہا
تسلیم کریں تمہیں قول و فعل کی آزادی دیں۔ تم سے ڈریں۔ تمہیں ایک طاقت سمجھیں
جو تم عصمت کا تصوّر لیئے پھرتی ہو۔ وہ سب فرسُودہ خیال اور نفسیاتی بندشیں
ہیں"۔

"عصمت کا تصوّر کبھی نہیں مٹ سکتا خانم"۔ نیّا جلدی سے بولی۔

"سب بکواس ہے"۔ خانم نے ترشی سے کہا۔ "لوگوں نے اپنے اوپر پردے
ہوتے ہیں۔ ماسک چڑھاتے ہوتے ہیں۔ عورت کو غلام رکھنے کے لئے مرد نے
قانون اور حد بندیاں وضع کردی تھیں۔ اِسی مرد کو دُنیا میں سب کچھ کرنے کی اجازت

پہرے بٹھاتا ہے میرے خیال میں اپنے قول و فعل میں عورت کو
آزادی ملنی چاہیئے جتنی مرد کو ہے۔ مرد کے لئے سب جائز اور عورت کے لئے
جائز"۔

"تو ایک الگ بحث ہوگئی"۔ نیّا نے کہا۔ "میں عورت یا مرد کی برتری یا کمتری کی بحث
کرنا چاہتی۔ میں تو مذہب کے حوالے سے اخلاقی قدروں کی بات کررہی ہوں۔
کا تصوّر ہر قوم میں ہے۔ ہر مذہب میں ہے۔ اگر لوگ اس فرق کو مٹادیں تو
ہر طرف وہی غاروں والے عہد کا بن جائے گا"۔

"اوّل تو یہ کہ میں مذہب پر یقین ہی نہیں رکھتی"۔ خانم نے رعونت سے کہا۔ نیّا نے
سے خانم کے چہرے کو دیکھا اور پھر بڑی جرأت سے کہہ دیا۔

"اب میری سمجھ میں آگیا کہ کیوں ایران میں اتنا بڑا خونی انقلاب آیا"۔ خانم کو یہ بات بہت
لگی مگر اس نے جیسے گھونٹ بھرلیا۔ اور بولی۔

"میں تو تقریباً تیس سال سے پاکستان میں ہوں۔ مجھے اپنے ملک کی بدلتی قدروں
کوئی تعلق نہیں"۔

"لیکن ہر انسان کا ملک، اس کا وطن اس کے اندر، ماں کی یادوں کی طرح رہتا ہے۔ کوئی
خص اپنی ماں کو نہیں بھول سکتا"۔ نیّا نے کہا۔ اس پر خانم تھوڑی دیر کے لئے خاموش
گئی۔ نیّا ڈر گئی کہ جانے اب کیا کہے گی۔ وہ سگریٹ کے دو تین گہرے کش لے کر بولی۔
"اخلاقی و مذہبی بحث میں سیاست کو لانا بے وقوفی ہے۔ ملکوں میں انقلاب کی وجوہات
صرف سیاسی نوعیت کی ہوتی ہیں"۔

"نہیں، جب اخلاقی و مذہبی قدریں اس حد تک پامال کی جائیں کہ لوگ بلبلا اٹھیں
سیاست جنم لیتی ہے۔ کسی بھی ملک کی سیاست کو صحیح طور پر چلانے کیلئے ملک کے
اخلاقی و مذہبی قدروں کا ہونا از بس لازمی ہے اور ان قدروں میں پہلی قدر

عصمت ہے۔ عصمت مردوں کی بھی ہوتی ہے اور عورتوں کی بھی۔ جب اس کا
مٹنا شروع ہوتا ہے تو معاشرے میں بے چینی، نا آسودگی اور لاقانونیت کی ایک
لینے لگتی ہے اس کے دُور رس نتائج کچھ بھی ہوں۔ مگر اسی سے دُنیا کی ہر برائی پھر
لیتی ہے۔"

"میں تمہاری ان سب جاہلانہ باتوں کو اوّل تو سمجھتی ہی نہیں اور نہ ان پر یقین کر
خانم نے ترشی سے کہا۔ "عورت کو مرد نے ہر دور اور ہر زمانے میں کھلونا سمجھا ہے۔
کو بیچا ہے۔ خریدا ہے۔ میں کہتی ہوں پھر یہی کام عورت اپنی مرضی سے کیوں نہ
کر دے۔"

"واہ واہ — اس کا مطلب ہوا کہ وہ اپنی پیشانی پہ خود ہی برائے فروخت کی
تختی لگا لے۔"

"نہیں۔" خانم زور سے بولی۔ "عورت لاتعلق انجوائے کرے۔ آزادی انجوائے کر
اپنے آپ کو بندشوں میں نہ جکڑے۔ اخلاقی ضابطے، روایتی بندھن۔ شرعی معاملات
سب ذہنی بیماریاں ہیں۔ ایک عورت جوان ہو، خوبصورت ہو، کماتی ہو اور آزاد ہو
اسے ہر قسم کی آزادی ہونی چاہیئے۔ گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے کہ وہ اپنے
کی قیمت وصول کرے۔" خانم نے لمبی تقریر جھاڑ دی۔

"ہاں۔" نیّا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اگر وہ عورت ایسا چاہتی ہو تو۔ چا
اور نہ چاہنے پر تو اس کا حق ہونا چاہیئے۔" خانم خاموش رہی تو نیّا پھر بولی۔
"اس آزاد معاشرے میں ایک آزاد عورت کو اپنے اصولوں کا احترام کرنے کی تو
ہونی چاہیئے نا —؟" نیّا دلیر ہو گئی۔

"میں دیکھوں گی نیّا۔" خانم نے زہر خند مسکراہٹ سے کہا۔ "میں دیکھوں گی۔ ہاں
اپنے اصولوں کا احترام کرتی ہو۔ یہ معاشرہ تمہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ ایک دن

نے تمہیں صحیح مشورہ دیا تھا۔ تم بھی اسی دُنیا میں ہو اور میں بھی۔" نیّا اندر سے لرز
خانم اس کو ایک چیلنج نہ سمجھ بیٹھے اور اسے کسی مصیبت میں گرفتار نہ کر دے۔
بعد خانم بولی۔

"آپ کا معاشرہ تم دیکھ کر آ رہی ہو نا؛ یہ ایک باغی معاشرہ ہے اس نے
کے فرسودہ نظام کو توڑ دیا ہے۔ عورت کی آزادی کے حق کو تسلیم کر لیا ہے،
یہاں لوگ ان قانونی، سماجی یا شرعی جکڑ بندیوں سے متنفر ہو گئے ہیں۔ شادی کے
ہیں اور شادی کے بغیر بچے پیدا کرتے ہیں۔"

اور آپ اس معاشرے کو آئیڈیل معاشرہ سمجھتی ہیں۔" نیّا کو جیسے تنقید کا موقعہ مل گیا تھا۔
کوئی معاشرہ آئیڈیل معاشرہ نہیں ہوتا۔ وقت کی تبدیلیوں کا مظہر ہوتا ہے۔"

لیکن ہر معاشرے میں اچھے بُرے لوگ ہیں۔ ان کے معاشرے میں بھی ابھی ان اقدار
بزار لوگ موجود ہیں جو عورت کی بے راہ روی کو پسند نہیں کرتے اور عورت کو گھر میں دیکھنا
ہیں۔" نیّا نے کہا۔

کتنے لوگ ہیں وہ —؟"

اچھے لوگوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے۔"

گفتگو کی خاطر بحث کئے جاؤ نیّا۔" خانم نے ذرا غصّے سے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تم
خانہ دقیانوس گھرانے سے آئی ہو اور تمہیں یہ سب کچھ سمجھانا انتہائی مشکل کام ہے۔" یہی
خانم نیّا کے منہ پر مار کر اسے خاموش کرا سکتی تھی۔ نیّا خود ہی چُپ ہو گئی مزید بحث سے
پیدا ہونے کا امکان تھا وہ ابھی تک خانم کی قید میں تھی زیادہ زبان چلانے کا انجام
ہوتا۔ تھوڑی دیر دونوں چُپ بیٹھی رہیں۔ پھر خانم اپنا لب و لہجہ بدل کر دوبارہ

جانے سے بہت پیچھے ہو نیّا۔ کبھی نہ کبھی غلط رسم و رواج کے پہرے توڑنے

پڑتے ہیں تمہیں بہت سی باتوں کا علم نہیں ہے۔ تم بیماری کو علاج کہتی ہو۔ تمہاری زندگی کی بعض نفسیاتی بندشیں توڑنے کی کوشش کی تھی آج تم جن باتوں کو سمجھتی ہو۔ کل ان کا مذاق اڑاؤ گی۔ کوئی بھی کام اُس وقت تک بُرا لگتا ہے، جب تک کہ ہم خود نہیں کر لیتے۔ جب کر لیتے ہیں تو وہ زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔ تمہیں یہ علم نہیں کہ اپنے اُوپر پابندیاں لگا کر تم اپنے آپ پر کتنا ظلم کر رہی ہو۔ ایک آدمی نے تمہیں ٹھکرایا تھا۔ تمہیں تقدیر کے دھکّے کھانے کے لئے زندگی کے بازار میں چھوڑ دیا ہے۔ تم ہاتھ پاؤں مارے۔ ایک کنارا ہاتھ آ گیا۔ فرض کرو کسی غلط سمت کو چل دیتیں۔ یا کسی اور بُرے انسان کی محتاج ہو جاتیں یا اس سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتیں۔ اب تم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی ہو تو مرد کو جانو، سمجھو، بار بار اس کے قریب جاؤ۔ اس کی دکھتی رگ ڈھونڈو۔ اس کو ٹھکرانے کا حوصلہ پیدا کرو۔ اگر تم شیشے کا مرتبان بن کر ایک جگہ بیٹھی رہو گی تو یہ بار بار تمہیں ٹھکرائے گا۔ توڑے گا۔ پھوڑے گا۔ اس لئے تم خود کیوں نہ وہ شیشہ چور چور کر دو۔ جس کے ہر وقت ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جانے کا احتمال ہو۔ دوبارہ کسی واہیات و فضول آدمی پر بھروسہ کرنے سے پہلے، بار بار مرد کے قریب جاؤ۔ اسے جانچو، پرکھو، تاکہ تم اپنے لئے کوئی مناسب آدمی تلاش کر سکو اور ٹھوکریں کھانے کے لئے تمہارے پاس کتنا وقت ہے؟ میں تمہیں تمہارے فائدے کے لئے ایسے ماحول میں لائی تھی۔ لیکن اگر تم خلوت میں لپٹی رہو گی، بظاہر ماڈرن بن کر بھی لکیر کی فقیر بنی رہو گی تو تمہارا اپنا نقصان ہو گا۔ اس لئے ٹھنڈے دل سے خود ہی سوچو۔ ان مردوں نے کبھی کسی عورت کی پاکبازی پر یقین کیا ہے؟" خانم نے ذرا سا دم لیا۔ پھر شروع ہو گئی "اور ہاں — اس دریافت کے چکر میں بعض اوقات کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ نفع اور نقصان کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں ڈال کر نتیجہ نکال لو۔ کبھی کبھی وہ کام کرنا پڑتا ہے۔ جس پر دل رضامند نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس کا نتیجہ اچھا ہو تو کیا مضائقہ ہے؟ زندگی بھر کی کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے۔ دو ایک بار کا

معنی نہیں رکھتا اور پھر ضمیر کا کیا ہے۔ نفس آمادہ ہو جائے تو اس کی آواز خاموش
جس طرح تمہارے ضمیر کی آواز خاموش ہے۔" نیّا نے دل میں کہا۔ اس کا دل
سے پوچھیے۔" کہ اُس نے بھی تو اتنے تجربے حاصل کئے ہیں ابھی تک وہ کسی
یوں نہیں پا سکی۔ مرد کے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے باوجود اپنی مرضی کا مرد
حاصل نہیں کر سکی۔ کیا مرد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے عورت
کو پامال نہیں کرتی جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کنفیوز نہیں ہوتی جاتی، کیا دُنیا میں
کیا نہیں، جس پر ایک انجانا سا، خاموش سا بھروسہ کر لیا جائے اور اس کی چھاؤں
بھر کے لئے پناہ لے لی جائے۔" اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خانم کے تجربات کی روشنی
سے کوئی سوال کرے۔ مگر وہ سوچتی رہ گئی۔ اور خانم اپنی سیٹ سے اُٹھ گئی
ٹ کی طرف جا رہی تھی۔ نیّا نے اطمینان کی سانس لی اور کرسی کی پشت سے سر
اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سفر طویل اور تکلیف دہ تھا۔ شاید جہاز
انے کے بندوبست ہو رہے تھے۔ نیّا خانم کے فلسفہ حیات پر غور کرنے لگی
ٹھیک کہا تھا۔ اگر عورت خود غرض بن کر سوچے۔ تو وہ پھر اپنی ذات کے بارے
ہے ایک لحاظ سے اس نے ٹھیک کہا تھا۔ نیّا ابھی مرد کے بارے میں کچھ نہیں
سوائے اس کے کہ باہر کی دُنیا میں اس نے ایک مختلف مرد دیکھا تھا، جس کی
طلب تھی، ہوس تھی۔ ہر آدمی کو جیسے عشق ہی عشق کرنے کی فرصت تھی اور پھر
کا ایک ہی اختتام تھا! آخر یہ مرد کیا ہے۔؟ اسے کھوجنا چاہیئے۔ مگر اپنے
کر کے نہیں۔ نیّا لرز گئی۔ اگر ایک دن آنکھیں بند کر کے وہ زہر کا پیالہ ہونٹوں
نہیں۔ اس طرح تو وہ اپنی نظروں میں آپ گر جائے گی۔ زمین پر گرے
اور ڈال پر لگے ہوئے پھول میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ
آزاد پھرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور عورت شرم و حیا کے

روائتی حصار میں خود کو دفنائے بیٹھی ہے۔

پتہ نہیں یہ ٹھیک ہے۔

پتہ نہیں وہ ٹھیک ہے۔ نیّا اپنے آپ سے اُلجھ رہی تھی۔ یہ ضمیر اور ... بھی بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جب کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو جی چاہتا ہے زہر کھا جاتے۔ نیّا کا خیال تھا وہ خانم سے صاف صاف بات کرے گی۔ اس کو دھمکی ڈراتے گی کہ اس نے نیّا کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر خانم کے لہجے میں ... بھی معذرت کا کوئی عنصر نہ تھا۔ بلکہ خانم کی کھری کھری باتوں نے اسے الجھا دیا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ خانم بڑی خطرناک عورت ہے اور وہ اس کے چنگل میں پھنس ہے۔

وہ خانم کی ملازمہ تھی۔

اس کے لئے گھر بار چھوڑ کر کراچی آگئی تھی اور کراچی میں وہ تن تنہا تھی۔ اس کا ... رشتے دار، دوست نہیں تھا۔ دوست تھے بھی تو وہ خانم کے توسط سے بنے ہو تھے۔ یہاں وہ بے یار و مددگار تھی۔ ایسے میں کیا خانم سے بگاڑ پیدا کرنا اچھا تھا۔ وہ کہیں بھی دوسری جگہ ملازمت نہ تلاش کر سکے گی۔ بالفرض محال اس نے دوسری جگہ پاؤں مارے تو کیا خانم اسے وہاں ٹکنے دے گی خانم کو ناراض کر کے دوسری جگہ ... وہ ہر جگہ اپنا رسوخ استعمال کر کے نکلوا دے گی۔ اور خانم کو خوش کرنے کا ایک ہی ... تھا جس سے وہ اب تک بچتی آرہی تھی۔

مگر کب تک۔۔؟

دریا میں رہ کر تو مگرمچھ سے بیر نہیں لیا جا سکتا تھا۔ نہ جانے ماموں ... والا معاملہ تھا۔ کراچی آنے کے بعد تو نیّا اور بھی محتاط ہو گئی تھی۔ دفتر کے بعد فوراً گھر ... لوگوں سے زیادہ گپ شپ بھی نہیں لگاتی۔ زیادہ تر اپنے کام سے مطلب رکھتی ...

... کے حواس پہ ایک خیال ننگی تلوار کی طرح لٹکا رہتا تھا کہ کہیں خانم اس کے ساتھ ... زبردستی نہ کر دے۔ کسی طرح اسے ملوث ہی نہ کر دے۔ اس کا ذہنی سکون لٹ گیا تھا۔ ... سوزن سلائی مشین" والا کنٹریکٹ خانم کو مل گیا تھا۔ مگر نیّا کو ابھی تک پتہ نہیں چلا ... حسان علی کے ساتھ خانم نے کس طرح معاملہ برابر کیا تھا۔ نیّا نے کئی بار حسان علی کو ... آتے جاتے دیکھا تھا۔ اُسے ایسا لگتا تھا جیسے خانم اور حسان علی مل کر اس کے ... کے جال بن رہے ہیں۔ جانے کب انجانے میں وہ اس کے جال میں پھنس ... پھڑپھڑاتے گی اور پھر ڈھیر ہو جاتے گی۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچتی کہ وہ کسی اور دفتر ... جائے۔ لیکن نہ جانے دوسرے دفتر میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہو۔؟ اگر دفتروں ... کا یہی عالم ہے۔ تو وہ گوشت کا لوتھڑا بنی کس کس قصاب کی دکان پر لٹکے گی۔ ... عرصے تک وہ خانم کی مرضی کے خلاف حرکتیں کر کے اس دفتر میں رہ سکے گی ... خانم کا رویّہ اس کے ساتھ بدلا بدلا سا تھا۔ زندگی جیسے پُل صراط پر آگئی تھی۔ بظاہر ... بڑی مصروف رہتی تھی لیکن اندر ہی اندر سُلگتی رہتی۔ جیسے اُس کے حُسن، اُس کی ... کے بانکپن کو کسی کی نظر بد لگ گئی ہو۔

... نیّا صبح سے بے شمار کاغذ ٹائپ کر رہی تھی۔ اب اگرچہ اس کی انگلیاں تھک ... مگر وہ اپنے ذہن کی اس یورش سے بچنے کے لئے مسلسل ٹائپ کرتی جا رہی ... کرتے کرتے اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ خوش پوش آدمی خانم کے کمرے میں ... پچھلے تین دن سے برابر اُسی وقت آرہا تھا۔ نیّا نے اس کے ساتھ بات ... خیال نہیں کیا۔ اب اُسے کاروباری دنیا کے نشیب و فراز واضح طور پر سمجھ ... تھے۔

... ہے۔؟

... ہے۔؟ اس نے خیال کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ نیّا پھر ٹائپ رائٹر کی کھٹ

کھٹ میں گم ہوگئی۔ ماتھے پر ایک لمبی شکن تھی۔ انگلیاں تیز تیز چل رہی تھیں اور نگاہیں زاویوں پر اٹک گئی تھی۔ تب وہ آدمی قریب چلا آیا اور نیا کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیا نے نظر اٹھا کر بڑے کاروباری انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو کیا ہے اور پھر دوبارہ ٹائپ کرنے لگی۔ وہ بیٹھا رہا۔ سگریٹ پیتا رہا اور نیا کی طرف دیکھتا رہا۔ نیا کو الجھن سی ہونے لگی اس نے بورڈ سے ہاتھ اٹھا لیے اور بولی۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔؟"

"میں آپ کی اجازت کے بغیر ہی خانم کے کمرے میں چلا گیا تھا۔" وہ نیا کا سوال نظر انداز کر کے بولا۔

"میں جانتی ہوں۔" نیا نے ناگوار سی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"میری خانم سے بہت پرانی دوستی ہے۔"

"پرانی دشمنی بھی ہوتی تو میں آپ کو نہ روکتی۔" وہ طنز کو نظر انداز کر کے خوبصورت سا ہنسا۔ نیا نے نظر بھر کر اُسے یوں دیکھا۔ جیسے وہ اس ہنسی سے شناسا ہو۔ یہ ہنسی اس نے خواب میں دیکھی اور سنی ہو۔ مگر نہیں۔؟ اس شخص کو تو اس نے یہاں پہلی بار دیکھا تھا۔ سر جھکا کر پھر ٹائپ کرنے لگی۔ کیونکہ بحث لاحاصل تھی۔

"خانم سے میرے اچھے مراسم ہیں۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر بار بار کی یاد دہانی سے مقصد۔؟"

"کبھی میں یہاں آپ کی جگہ بیٹھ کر کام کیا کرتا تھا۔" وہ اپنے انداز میں بولا۔ جیسے نیا کی بات سنی ہی نہیں ہو۔

"یعنی۔" نیا نے اپنا ہاتھ روک لیا اور چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ "یعنی آپ"

"ہاں۔" وہ پھر ہنسا۔ اور جیب سے اپنا کارڈ نکال کر نیا کو پیش کیا۔ سفید کارڈ پر سیاہ حرفوں میں لکھا تھا۔ "اے اے رازی"

"تو آپ ہیں رازی صاحب۔"

"جی ہاں۔"

"آپ تو لیبیا چلے گئے تھے۔"

"جانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر آ رہا ہوں۔"

"اب کہاں سے آ رہے ہیں۔؟"

"امریکہ سے۔"

"وہاں کیا کرتے ہیں۔؟"

"امپورٹ ایکسپورٹ۔"

"کس چیز کی۔؟"

"کیا پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ بتانا ضروری ہے۔؟"

"میرے خیال میں تو دوسری ملاقات بھی ضروری نہیں۔" نیا نے تلخی سے کہا اور پھر کہنے لگی چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ بڑے سکون سے بولا۔

"آپ رائٹر پر آپ کی انگلیاں اس طرح چل رہی ہیں۔ جس طرح ستار یا طنبورے پر۔" نیا نے اپنے لمبے ناخنوں والی گوری گوری مخروطی انگلیاں روک لیں اور اُس کی جانب گھورتی ہوئی درشتی سے بولی۔

"عورت کے ساتھ ساز اور آواز کا ناطہ کیوں جوڑنا چاہتے ہیں۔" وہ بوکھلا گیا۔ پھر ٹائپ رائٹر کے میز میں بجھاتے ہوئے کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"عورت خود ایک مدھر موسیقی ہے نا؟ اس لیئے۔"

"بیچاری کو ان شاعرانہ ہتھکنڈوں سے نکال کر اب کچھ کرنے دیجیئے۔ آخر ہمارے سماج کو ہمیشہ ضرورت کی ایک چیز کیوں سمجھا جاتا ہے۔ وہ غریب دفتر میں ہو، کرسی ٹیبل کا پیٹ پالنے کے لیئے بوجھ اٹھا رہی ہو، یا مزدوری کر رہی ہو۔ اپنی مجبوری

کی خاطر وہ مشین بن کر کام کرنے لگتی ہے اور آپ لوگ مشین پر بھی بُری نگاہ ڈالنے لگتے ہیں۔" جانے نیّا کے لہجے میں اتنی کڑواہٹ کہاں سے آگئی تھی لیکن اُس نے ذرا بھی بُرا نہیں مانا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا اور پھر اپنی گمبھیر خوب صورت آواز میں بولا۔

"اُس مشین کے اندر ایک دل دھڑکتا ہے اور اس کی فریاد دُور تک سُنائی دیتی ہے۔ یہ خوبصورت انگلیاں نوحہ کرتی ہیں اور ان کے بین ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ میں مل کر باہر نکلتے ہیں۔ مگر سب لوگ اُنہیں نہیں سُن سکتے۔ مگر جو سُن لیتے ہیں، وہ بے طرح مضطرب ہو جاتے ہیں۔" نیّا نے ایک دم ٹائپ رائٹر سے انگلیاں ہٹالیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اس نے غور سے رازی کے چہرے کو دیکھا تو رازی نے اپنی پُراسرار آنکھیں اس کی شکی آنکھوں میں الجھادیں۔

"یہ کون ہے ۔۔؟"

یہ کون ہے ۔۔؟ نیّا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ "کتنی عجیب بات یوں لگتا ہے۔ جیسے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" نیّا نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ نظر جھکالیں۔

"جان پہچان کا یہ بڑا بودا طریقہ ہے۔"

"لوگوں کے رویّے سے کافی شاکی معلوم ہوتی ہیں آپ ۔۔؟"

"اور آپ یہاں لوگوں کی صفائی پیش کرنے آتے ہیں؟"

"دل کا سکون ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ تلاش میں یہاں بھی چلا آیا۔"

"کیا یہاں سکون تقسیم کرنے کی سبیل لگی ہے؟"

"جو خود سکون سے عاری ہو۔ وہ کسی کو کیا سکون دے سکتا ہے؟" نیّا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

...ب جانتے ہوتے بھی آپ یہاں آکر بیٹھ گئے ہیں۔"

...ہاں۔"

...یوں ۔۔؟"

...ب دو بے چین و بے قرار لوگ آمنے سامنے بیٹھیں تو ایک تیسرا راستہ نکل

...؟"

...حترم! نیّا کی تیوری پر بل آگئے۔ "آپ اپنا راستہ ناپیئے۔"

...جاتا ہوں۔" وہ کھڑا ہوگیا۔ "لیکن پھر کبھی آؤں گا۔ آپ کے پاس، آپ کو کھوجنے ...؛ وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ کافی دیر تک اُس کی خوشبو میز کے اردگرد منڈلاتی ...کافی دیر تک نیّا سر تھامے بیٹھی رہی۔ ساکن ندی میں وہ ایک بھاری کنکر جو ...گیا تھا۔ جانے کیسی ہلچل سی ہونے لگی تھی نیّا کے دل میں۔ اس سے پہلے ...دوں مردوں سے ملی تھی مگر ایسا نہ ہوا تھا۔ گو نیّا کو اب کسی مرد کی زبان پر اعتبار نہ آتا تھا ...گئی تھی کہ یہ بھونرے ہیں۔ بہروصورت انہیں پھول کے گرد منڈلانا ہوتا ہے۔ ...گھر کے باہر ان کا رویّہ ہی جداگانہ ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی۔ آج یوں لگ رہا تھا ...بہت سی ایک جیسی شکلوں میں، ایک مختلف قسم کی شکل نظر ...ہے۔

...رات سوتے ہوتے وہ ہمیشہ سے زیادہ بے کل تھی۔ سرہانے رکھے ...چنبیلی کے پھول بھی گویا خنجر کی دھار بن کر اس کے جگر میں اترتے ...ایک سوئی ہوئی طلب جاگی۔ جیسے جادو کے گپ چپ نقارے پر ...الیلے شہزادے نے چوٹ لگائی ہو۔ اور جادو کی نگری میں قید شہزادی ...کھ کھل گئی ہو۔۔۔ لیکن آنکھ لگی ہی کب تھی۔۔۔؟ اور اگر لگتی بھی

آنکھ لگتی ہے تو دل کو یہ گماں ہوتا ہے
سر بالیں کوئی بیٹھا ہے بڑے پیار کے ساتھ
میرے الجھے ہوئے بکھرے ہوئے بالوں میں کوئی
انگلیاں پھیرتا جاتا ہے بڑے پیار کے ساتھ

آج جمعہ تھا۔ دفتر کی چھٹی تھی۔ قاعدے کے مطابق آج نیا کو گھر کے بے شمار کام
بڑے تھے موتی کو مالش کر کے نہلانا تھا کپڑے واشنگ مشین میں ڈالے ہوتے تھے۔
نہیں نکال سکھانا اور استری کرنا تھا۔ بستر کی چادریں بدلنی اور اپنا وارڈروب ٹھیک
تھا۔ جمعہ کو وہ اپنا ڈرائنگ روم اور بیڈ روم خود صاف کیا کرتی تھی اور کھانا بھی خود
پکاتی تھی پچھلی رات سر میں درد ہو رہا تھا اس لئے بالوں میں ڈھیر سارا تیل ڈال لیا تھا اور
بڑے بدلنے کو بالکل بھی جی نہ چاہ رہا تھا۔

رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔

رات بھر بے کلی رہی۔ ذہن شمع کی مانند سلگتا رہا تھا اور نیند شکی سہیلی کی طرح
روٹھی رہی تھی وہ بستر پہ کروٹیں بدلتی اور یہ شعر گنگناتی رہی۔

کروٹیں لیتے ہی لیتے رات ہوتی ہے تمام
کس طرح اے کشتگانِ خواب آجاتی ہے نیند

کئی بار بار سرہانے آکر تنگ کرتا تھا۔ اس کا بار بار جی چاہتا کہ اپنا سر دیوار سے
مار لے صبح اٹھ کر اس نے صرف ایک پیالی چائے کی پی تھی اور بستر پہ آڑی ترچھی

لیتی تھی۔ پتہ نہیں کسلمندی تھی، محرومی تھی، علالت تھی یا بیزاری۔ کچھ بھی کام کرنے کو
نہیں چاہ رہا تھا بس یونہی لیٹی اپنے خیالوں سے اُلجھ رہی تھی کہ کال بیل بجی۔ اس گھر
ملاقاتی زیادہ نہیں آتے تھے۔ وزیٹرز کے لئے یہ گھر مناسب نہیں تھا۔ چھوا چھوت
اور فلیٹ ہونے کے باعث سب کی نظر میں تھا۔ نیاّ اپنے ملنے والوں کو دفتر میں ہی
لیتی تھی۔ زیادہ تر فون پر ہی گپ شپ لگا لیتی تھی۔ گھر پر اکثر بل دینے والے آتے
دودھ کا، اخبار کا، بجلی کا، پانی کا یا کوئی اور بل۔

نیاّ نے وقت دیکھا صبح کے دس بجے تھے۔ اس وقت کون مردُود آگیا؟ پھر اُس نے
اپنی گھڑی پر دوبارہ تاریخ دیکھی۔ کسی کا بل واجب الادا نہیں تھا۔ شاید کوئی ہمسایہ ہو
یا کوئی ضرورت مند ہو؟ اٹھ کر دیکھنے کا سوچ رہی تھی کہ موتی دوڑتا ہوا آیا اور آکر اس کی
ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"ممی.... ممی.... وہ آئے ہیں وہ"

"کون آیا ہے موتی" نیاّ کھڑی ہوگئی۔

"وہ — وہ — مجھے کیا پتہ وہ آپ کو بلا رہے ہیں" نیاّ نے سلیپر پہنے اور پاؤں گھسیٹتی ہم
پلکی۔ موتی کو کسی کی پہچان تو ہے نہیں۔ بہتر ہے وہ خود ہی دیکھ لے۔ دروازہ کھول کر باہر
جھانکا تو زمین نے پاؤں پکڑ لئے۔

وہی تھا — بالکل وہی — کتنے شاندار انداز میں کھڑا مُسکرا رہا تھا "ہاں تم نے مجھے رات
بھر سونے نہیں دیا اور اب میرے گھر تک چلے آئے۔ چلے آئے میرے پیچھے پیچھے کھوجتے
ہوئے۔ ڈھونڈتے ہوئے۔ نقارے پر چوٹ مارتے ہوئے۔ کون ہو کھوجی تم — ہیکا
تم وہی ہو — جو مجھے رداجوں کے بھیانک دیو کے چنگل سے چھڑانے آئے ہو — آؤ شہزادی
آؤ — میری سیج تلک آؤ — میری سُلگتی کلیوں کو اپنے ہونٹوں سے چھُو لو۔ میری جوانی کے زمان
کسی خبیث جادوگر کے طلسم سے پتھر بنے پڑے ہیں۔ ان پر اپنی محبت کا آبِ حیات چھڑک

تی زندگی دو۔ انہیں جگاؤ۔ میرے شبستان کے آگے زہریلے کانٹے اُگے ہیں۔ تقدیر
یار شہنشاہ کی ایک قہر زدہ کنیز ہوں میں۔ اپنے ہی تن کی چار دیواری میں زندہ درگور
ں۔ مجھے اس زنداں سے زندہ نکال کر لے جانے کے لئے آئے ہو۔۔۔ تو۔۔۔
۔۔۔ میری تھکن کو محسوس کرو۔ میری صورت سے نہیں۔ میرے دل پہ ہاتھ رکھ کے"
سالہ غرور فخر، جوانی، حُسن اور حاضر جوابی جیسے سبھی ایک ساتھ جواب دے گئے۔ وہ
لی در شیشہ بنی دروازے کے پٹ کھولے کھڑی رہ گئی۔ پاگلوں کی طرح ایک ٹک دیکھے
۔ سگریٹ کا آخری کش لے کر جلا ہوا ٹکڑا دور کونے میں پھینک کر وہ بولا۔

"دل میں جگہ دیں نہ دیں — گھر میں تو بلا لیں۔ مہمان سمجھ کر نہیں تو سائل سمجھ کر ہی سہی —
یوں کے در سے خالی ہاتھ چلے جانا بھی سائل کی نامرادیوں کی معراج ہے" نیاّ نے اپنے
ے قابو دل پر قابو پا کر کہا۔

"آیئے اندر تشریف لے آیئے" وہ چلا آیا پیچھے پیچھے۔ مگر اُسے میرے گھر کا راستہ
ے معلوم ہوا۔ کیا تیرے گھر کا راستہ کہکشاں سے ہو کر آتا ہے۔ دفتر سے لے لیا ہوگا —
کا دوست ہے۔ اس کے لئے کیا مشکل ہے۔ آج ڈرائنگ روم بے حد گندہ ہو رہا تھا
رات موتی قینچی سے پرانے رسالوں میں سے تصویریں کاٹتا رہا تھا۔ چھٹی کی رات موتی
رنم کی گندگی پھیلانے کی اس نے اجازت دی ہوتی تھی۔ کٹے ہوئے کاغذوں کے
ے قالین پر پھیلے ہوتے تھے۔ رسالے ادھر ادھر بکھرے تھے۔ گدیاں فرش پر پڑی
ے گلدان اوندھے تھے۔ صوفے کے کور پائیدان کے پاس ڈھیر تھے اور موتی کے
لے کپڑے صوفے پر بھی بکھرے ہوتے تھے۔ وہ صوفے پر سے اطمینان سے بنیان
ر بیٹھ گیا۔ نیاّ بہت شرمندہ تھی — وہ بھی شرمندہ سی بیٹھ گئی۔ خود اس کا حُلیہ کس قدر
ہو رہا تھا۔ بالوں میں بے انتہا تیل۔ میلے سلوٹ زدہ کپڑے۔ سُتا ہوا چہرہ۔ اداس
آنکھیں، دفتر میں تو وہ شعلۂ جوالہ بن کر جاتی تھی۔

"دراصل میری طبیعت ٹھیک نہ تھی۔" نیّا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر معذرت والے انداز میں کہنا شروع کیا۔ "آج سارا گھر گندہ ہو رہا ہے۔ میں بھی۔ موتی بھی۔ کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔"

"معذرت مجھے کرنا چاہیئے کہ میں بغیر اطلاع کے آگیا کہ آتے بنا چین نہیں آرہا تھا۔" نیّا کا دل دھڑک کر حلق تک آگیا۔ "رہی گھر کی بات۔ تو زندہ لوگوں کے گھر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے اکثر بنجے سجائے گھر دیکھے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے یہاں کوئی بھی نہیں رہتا۔ کسی شے کو چھوا تک نہیں گیا۔ کسی شے پر زندگی کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ ذرا سی بے ترتیبی ذرا سا انتشار گھروں میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتا ہے۔ ذرا سی گندگی بے ترتیبی زندگی کا احساس دلاتی ہے۔ مجھے تو ایسے گھروں میں ہر جگہ ایک دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔" اس کی اتنی لمبی تمہید نے نیّا کی شرمندگی کو تو نہیں مٹایا۔ البتہ وہ بات کرنے کے قابل ضرور ہو گئی۔ اُٹھ کر اندر گئی اور امّی جان سے چائے کے لئے کہہ کر آگئی۔

واپس آئی تو وہ ادھ ننگے موتی کو ٹانگوں میں پھنسائے اس سے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ اور موتی کہہ رہا تھا۔ "میرے ڈیڈی بہت دُور گئے ہیں۔ بہت بڑا جہاز لینے لئے۔" غالباً اس نے موتی سے اس کے ڈیڈی کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔

"اچھا ہے۔" نیّا نے دل میں سوچا۔ "اُسے میرے اور بچے کے بارے میں پتہ چلا تو خود ہی دفعان ہو جائے گا۔" مگر جب نیّا نے یہ سوچا تو اُس کے دل میں کہیں گہرا درد بھی ہی اٹھا جو کسی شے کے چھن جانے کا قلق ہی ہو سکتا تھا۔

کاش چاند داغدار نہ ہوتا۔

کاش گرہن نہ لگتا۔ کاش چاند کسی کے آنگن میں اُترتا۔ تھوڑی ہی دیر میں موتی رازی سے مانوس ہو گیا اور اپنے کھلونے اُٹھا اُٹھا کر اُسے دکھانے لگا۔ نیّا خوف زدہ تھی کہ کہیں الٹا سیدھا سوال موتی کر سکتا تھا۔ کوئی بھی ہمدردانہ برچھی رازی کلیجے میں اُتار سکتا ہے۔

نیّا کسی سے بات کرتے ہوئے گھبرا رہی تھی اور چاہ رہی تھی کہ رازی جلد
رازی یوں پُرسکون بیٹھا چائے پی رہا تھا جیسے یہ اس کا اپنا ہی گھ
یہاں رہ رہا ہو۔
آپ کی امی جان کا کیا حال ہے؟" اس نے اتنی لگاوٹ سے پوچھا کہ نیّا چونک گئی۔

آپ تو بالکل ٹھیک ہیں۔" پھر دوبارہ بولی۔ "یہ ساری معلومات آپ نے خانم سے حاصل

طلب سچی ہو تو آدمی کیا نہیں معلوم کر لیتا؟"
نے سب معلوم کر لیا۔ نیّا خاموش ہو گئی۔ تو وہ خوش دلی سے بولا۔
بڑا پیارا بچہ ہے اور مجھے بڑا پسند آیا ہے۔" نیّا طنزاً مسکرائی۔
بڑا سیدھا نفسیاتی سا چٹکلہ ہے۔"
مطلب؟"
کے سامنے بچے کی تعریف کریں تو خود بخود شناسائی کی راہ پیدا ہو جاتی ہے۔"
یک پر زور قہقہہ لگایا۔
کر گئیں نہ مجھ پر۔ ویسے اتنا زہر آپ کے اندر کس نے بھرا ہے؟"
نے کبھی شہد کی مکھی سے پوچھا ہے کہ اُس کے اندر اتنا زہر کہاں سے آتا
شہد بناتی ہے۔"
بصورت جواب ہے۔ لیکن شہد حاصل کرنے کے لئے مکھی کا ڈنک تو کھانا
ہے نا۔؟"
ہو کر شہد ملے گا۔"
یہ کا خیال ہے کہ شہد کے لئے میں موتی کو وسیلہ بنا رہا ہوں۔"

"...نے تو یونہی نفسیات کی بات کہی تھی۔" نیّا نے ہنس کر بات ٹالنے کی کوشش
والے انداز میں کہ خبر ہے پیارا بچہ، مگر میں اسے وسیلہ بنائے بغیر بھی آپ سے شناسائی
بھی کرنے کو جی۔ بچھ میں شہد کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت ہے۔" نیّا کا دل خوشی سے
دھڑکنے لگا۔ بہت خطرناک، بہت خطرناک آدمی لگ رہا تھا۔ نہیں خود نیّا بزدل ہے
اس چڑیا کی مانند جو کھلے آسمان میں پرواز کرتی کرتی تھک گئی ہو۔ اور اب کسی شکاری کو
دیکھ کر چپ چاپ عمداً اس کے پاس آ بیٹھی ہو۔ کبھی کبھی۔ قوتِ پرواز کو مفلوج کرنے
لئے اسیر ہونے کو دل چاہتا ہے۔ اسیری ہی مسائل کا آخری حل نظر آتی ہے۔

یہ آدمی۔

معطّر سا۔ خوشگوار سا۔ روشن۔ روشن۔ مشامِ جاں میں دھیرے دھیرے
کی طرح اُترتا چلا جا رہا تھا۔

خوبصورت ہے۔ خوبصورت باتیں کرتا ہے۔ نیّا نے اُسے غور سے دیکھا۔ گ
گندمی رنگ۔ گھنے بال۔ درمیانہ قد۔ نفیس سا سوٹ زیبِ تن کئے ہوئے تھا۔ کوٹ
جیب میں قمیص کے رنگ کا رومال۔ صاف ستھرے ہاتھ۔ چمکدار ناخن۔ نیّا کو بعض
والے مرد بڑے بُرے لگتے تھے۔ رازی سے ہلکی ہلکی خوشبو نکل کر آ رہی تھی۔ جو مکمل مرد
خوشبو تھی۔

"آپ نے میرا جائزہ لے لیا؟" اچانک وہ بولا۔ تو نیّا نے لرز کر نظریں جھکا لیں۔

"یقین کریں میں شریف آدمی ہوں۔"

"شریف ہیں تو بار بار یقین دہانی کی ضرورت کیوں محسوس کر رہے ہیں؟"

"اُس طرف سے پذیرائی جو نہیں ہو رہی ہے۔"

"ایک ہی تو ملاقات ہوئی ہے آپ سے۔ میں کیا جانوں آپ کے بارے میں؟"

"بعض اوقات ایک ہی ملاقات پوری عمر کا حاصل ہوتی ہے۔ یہ کوئی دُنیوی کا

سودا کیا جائے۔

ع فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا

نیّا نے گھبرا کر آنکھ اٹھائی اور وہ نیّا کی نگاہ میں اُتر گیا۔

"میں اب جاؤں؟" وہ کھڑا ہو گیا۔ دل میں گھر کرنے کے انداز خوب جانتا ہے، نیّا سوگواری
رہی مگر منہ سے کچھ نہیں کہا اور خود بھی کھڑی ہو گئی۔

"میں نہ جاؤں؟" وہ پھر بولا۔

"میں نے کب یہ کہا۔"

"آپ نے تو وہ بھی نہیں کہا۔ یہ بھی نہیں کہا۔ کیا سب کچھ مجھی کو کہنا پڑے گا؟"

نیّا۔" نیّا کے منہ سے نکل گیا۔ "یہ کیا کہہ دیا میں نے۔" اس نے فوری دل میں سوچا۔
میں کل آؤں گا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"کیوں۔ کیوں۔" اس کا دل بے چین ہونے لگا تو وہ فرش کی جانب دیکھنے لگی۔
"اب آپ آنکھ اٹھا کر بات کریں گی تو آپ کو جواب مل جائیگا۔" وہ تھوڑی دیر کھڑا رہا۔
رہا۔ لیکن نیّا سے نظر نہیں اٹھائی گئی دونوں کے صرف دل دھڑکتے رہے۔
"اللہ حافظ۔" اس نے آہستہ سے کہا اور موتی کو چوم کر چلا گیا۔ نیّا نے اس کے جانے
دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ ہل رہا تھا۔ نظر کیوں نہ اٹھاتی تو نے پگلی۔ کیا
دیکھ چور تھا۔

"آجاؤ — یہاں — میری سیٹ پر —" رازی نے نگاہوں میں جسم کی ساری گرمی سمو

"نہیں —" نیّا کسمسائی۔

"اب اتنا بڑا چیلنج دے کر نظریں نہ چراؤ۔"

"میں تو مذاق کر رہی تھی۔"

"میں تو ہرگز مذاق نہیں کر رہا۔" نیّا کے منہ سے ہنسی کا فوّارہ چھوٹ پڑا۔

"اس طرح ہنسو گی تو میں اور گدگدی کروں گا۔"

"پلیز نہیں۔" نیّا سمٹتی سمٹاتی اس کی سیٹ پر آگئی اور وہ دوسری طرف سے نکل کر

سیٹ پر آگیا۔

"تو ہو جائے اُستادی شاگردی کا پہلا درس۔"

"دیکھو رازی! میں اچھی شاگرد نہیں ہوں۔"

"میں بہت اچھا اُستاد ہوں۔" وہ چہرہ قریب کر کے بولا۔

"یہ میں جان گئی ہوں۔" نیّا نے ذو معنی لہجے میں کہا۔ اس پر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے

تو بسم اللہ کر کے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھو۔ اور اپنے نازک پاؤں جن سے اب تک دل

یہاں کلچ پر رکھو۔ اور دوسرا ایکسی لیٹر پر۔ ہاں اس طرح۔" رازی نیّا کو موٹر چلانے کا

نے لگا۔ لیکن نیّا ابھی تک سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے الجھن سی ہو رہی تھی اور دل

ا تھا۔ دو ہی ردیں سے شعلے نکل رہے تھے۔ رازی اس قدر قریب جو بیٹھا تھا۔ اور پھر

ے بازو سے اس کے گرد گھیرا ڈال کر اس نے اسٹیئرنگ بھی پکڑا ہوا تھا۔ تاکہ اُسے بیٹھنے

ی طرح سے سمجھا سکے۔ نیّا کا دھیان نہ اسٹیئرنگ کی طرف تھا۔ نہ سڑک کی جانب۔

ٹیونگ کر رہی تھی۔ جو رازی کی سانسوں سے نکل رہی تھی۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ اچھی

ہاں اُس نے اپنے آپ کو پھنسا لیا۔

مذاق تو نہیں تھا اس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو پھنسایا تھا۔ رازی آیا تو اس

ا کا پنجرہ کھول دیا۔ رازی ہر شام اس کے گھر آنے لگا تھا۔ چور بن کر نہیں۔ دلیر

نگا نہیں چھیننا جانتا تھا۔ رازی التجا نہیں کرتا۔ حکم دیتا تھا۔ رازی گڑگڑاتا نہیں بلکہ

اس میں بہت سی ایسی صفات تھیں۔ جنہیں نیّا تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ دلیر،

اک، گستاخ۔ بے جھجک۔ نیّا کو بزدل مردوں سے نفرت تھی۔ چھین کر لے

ے اچھے لگتے تھے۔ اور اب رازی نیّا سے نیّا کو ہی چھینے لئے جا رہا تھا۔ اور

ہ رہی تھی۔ شام کو کسی مرد کے ساتھ گھومنا، فلم دیکھنا، ریستورانوں میں بیٹھنا۔

ا میں نہ تھا۔ مگر اب رازی کے ساتھ وہ سب کچھ کرتی۔ اور تو اور موتی کو بھی

چھٹی کا دن تقریباً تینوں گھر سے باہر گزارتے۔ کبھی ساحلِ سمندر کی طرف نکل جاتے

ہاں۔ انکار و اقرار کے سارے دروازے خود رازی نے توڑ دیئے تھے

ں کے سامنے پگھل جاتی جس طرح آگ کے سامنے موم! اس کا اکثر دل چاہتا

دور۔ کسی جگہ رازی کا ہاتھ تھامے چلتی رہے۔ قدم کبھی نہ رکیں۔ باتیں کبھی

بولنی رواں رہے۔ نیّا پر محبت کا نشہ نیا نیا چھایا تھا۔ اس لئے لڑکھڑائے

کسی بات سے انکار نہ کر سکتی۔ کسی پروگرام کو رد نہ کر سکتی۔

آج بھی ان کا لمبی ڈرائیو پر جانے کا پروگرام تھا۔ رازی جب اسے لینے کے
وہ ہلکی کاسنی ساڑی پہنے، جوڑے میں سدا سہاگن کے کاسنی پھول سجائے اس کی منتظر تھی
موٹر کا ہارن سُن کر نیّا نے اپنے اوپر "جولائے" کا اسپرے چھڑکا اور باہر نکل آئی جانے کیوں
کی آنکھیں اُس کا آئینہ بن گئی تھیں۔ اپنا سراپا ان میں نظر آنے لگا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی کیوں
پھیل جاتیں اور کبھی سکڑ جاتیں۔ ان آنکھوں کے زاویے نیّا کو بیشمار نت نئی تصویریں دکھاتے
وہ ظالم آنکھیں۔ بیٹھے بیٹھے اُس کے ہونٹ چھو لیتیں۔ کبھی باتیں کرتیں۔ اور کبھی
کبھی سارے وجود کو شعلوں میں لپیٹ دیتیں۔ یہ کیسا جادو گر تھا۔ جس نے اس کے
پر نرالا منتر پھونک دیا تھا۔ جسم تمام شب سلگتا رہتا۔ مگر دل پھول کی طرح کھلا رہتا۔ پھول
اور آگ کا میل اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ رازی اُسے لے کر آج ملیر کینٹ کے سنا
راستوں کی طرف نکل آیا تھا۔ عشق کے زمانے میں آوارگی مزہ دیتی ہے۔ جب محبوب
ہو اور سڑکیں وسیع ہوں تو آدمی کیا کرے؟ لایعنی سی باتوں میں بھی ایک انوکھی لذت
ملتی ہے۔ یونہی ادھر اُدھر گاڑی دوڑا رہے تھے کہ نیّا نے کہا۔

"ذرا ٹھیک سے گاڑی چلاؤ رازی۔ تم مسلسل میری طرف دیکھ رہے ہو۔ کسی کو شہ
نہ کر دینا۔"

"میں بہت اچھا ڈرائیور ہوں محترمہ! سڑک کی طرف دیکھے بغیر بھی عمدگی سے گاڑی چلا
سکتا ہوں۔ ویسے کوئی بیچارا، آپ کا رُخِ روشن دیکھ کر شہادت کا رتبہ پانا چاہے تو میں روکوں
گا نہیں۔"

"جی نہیں۔ ہر صورت میں الزام تمہاری ڈرائیونگ پر ہی آئے گا۔"

"جناب مجھ جیسا ڈرائیور اس پورے شہر میں نہیں۔ مجھے ڈرائیونگ کی سب سے
اعلیٰ ٹیکنیک آتی ہے اور کسی بھی اناڑی کو صرف چار گھنٹے میں موٹر چلانا سکھا سکتا ہوں۔"

"کہیں امریکہ میں تم نے ڈرائیونگ اسکول تو نہیں کھول رکھا ہے؟" رازی قہقہہ لگ

نا۔
تم جیسے حسین سیکھنے آئیں۔ تو میں یہاں کراچی میں یہ کام شروع کر دوں۔"
تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ میں پہلی شاگرد موجود ہوں۔ سکھانا شروع کرو۔"
سچ۔"
ہاں ہاں۔ میری تو زندگی کی سب سے بڑی تمنّا ہی یہی ہے۔" حقیقت میں نیّا جب
پر خواتین کو موٹریں چلاتے ہوئے دیکھتی تھی۔ تو اُسے ان پر بہت رشک آتا تھا۔
پہلے کیوں نہ بتایا؟" رازی نے پوچھا۔
کیا کیا بتاتی؟"
تم نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں بتایا۔" اس نے گردن گھما کر نیّا کی آنکھوں میں دیکھا۔
اور تم پھر بھی سب جان گئے ہو۔" دونوں ہنس دیئے۔
میں کاریگر آدمی ہوں۔ تم جانتی ہو۔"
ہاں جانتی ہوں۔"
پھر تمہیں کار چلانا بھی سکھا دوں۔"
یہ فائدہ ہوگا؟ میری کوئی موٹر ہے؟"
ضرور موٹر والے آپ کے خادم ہیں چاہیں رکھا رکھائے کے لئے کاغذ لکھوالیں۔ موٹر تو
گیئر ہے۔" نیّا ہنسنے لگی۔ اظہارِ محبت کا یہ انداز اسے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ گو انہوں
نے کر محبت کے موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ مگر گفتگو میں اشارے کنائے کے خوبصورت
نے انہیں ایک دوسرے کے جذبات سے آگاہ کر دیا تھا۔ جونہی نیّا نے اسٹیئرنگ
رازی نے گاڑی میں لگا ہوا کیسٹ آن کر دیا۔ ایک نغمہ دھیمے سُروں میں بجنے لگا۔

دو دن کی تو پہچان ہے یہ دلبر، ہمدم سے
لگتا ہے کہ ہم جانتے ہیں

بڑا موزوں گیت تھا۔ نیا کو سُرور آنے لگا۔ سچ مچ۔ ابھی تھوڑے دن ہی تو ہوئے تھے اس کی اور رازی کی جان پہچان کو۔ مگر یوں جان پڑتا تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ یہ کیسے بندھن ہوتے ہیں اور کیسے جذبے ہوتے ہیں جاگ جائیں تو اپنے ساتھ سارے زمانے کو جگا دیتے ہیں۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ یہ بندھن ہوتے ہیں کہ جب آ کر دلِ دل پر دستک دیتے ہیں تو دل کے دروازے آپ ہی کھل جاتے ہیں۔ یہی زندگی کے دھاروں کا رخ موڑ دیتے ہیں! دو گھنٹے تک مسلسل وہ ڈرائیونگ سکھاتا رہا۔

"بس اب تھک گئی ہوں۔" نیا نے کہا۔

"ارے ابھی سے۔ مجھے تو ایسے لگ رہا ہے جیسے خواب میں ہوں۔" رازی کی معنی خیز نظروں نے اُس کے چہرے کو چھو لیا۔

"ابھی ایک گھنٹہ اور چلاؤ۔"

"پلیز رازی، اب نہیں۔ باقی کل۔"

"میں نے تو چیلنج کیا ہے کہ چار گھنٹے میں تمہیں سکھا دونگا۔"

"میں جانتی ہوں۔ تم سکھا سکتے ہو۔ مگر اب نہیں۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔"

"دیکھو نیا سیکھنے کا یہی ہوں محترمہ بعد میں تم پچھتاؤ گی۔"

"بعد میں کب؟"

"شادی کے بعد۔"

"کس کی شادی؟" نیا نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر کہا۔

شادی تو خیر ہم دونوں کی ہو گی ہی۔ اور انشاء اللہ جلدی ہو گی۔ مگر ایک بات پیشگی بتا دوں۔ شوہر کبھی اپنی بی کو ڈرائیونگ نہیں سکھا سکتا خواہ کتنا اچھا ڈرائیور کیوں ۔۔۔؟" نے ڈرائیونگ

بتانے کی بات ہے۔ شادی کے بعد تو ذرا سی غلطی پر جھڑک دیتا ہے! اور جلد ہی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ شوہر عاشقی کے زمانے میں، موٹر تو کیا ہوائی جہاز اڑانا بھی سکھا سکتا ہے۔"

"تو تم مجھے خوف زدہ کر رہے ہو۔"

"نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اس زمانے کی خوبصورت یادوں کی طرح یہ بھی پلے باندھ لو۔ اور پھر جب کبھی تم میرے ساتھ تلخی سے سختی سے پیش آؤ۔ تو میں تمہیں یاد دلاؤں میں تمہارا اُستاد بھی رہ چکا ہوں۔"

"تو اس قسم کے ارادے ہیں تمہارے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ مجھے اُستاد مان لو۔"

"تو گی مان کر؟"

"ہو جائے گا۔"

"بڑا غرق ہی نہ ہو جائے۔"

"ہو چکا ہے۔" اس پر دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے۔

"اچھا۔۔۔ اب ذرا دھیان سے اسٹیرنگ گھماؤ۔ میں نے اسٹیرنگ چھوڑ دیا ہے۔ کے نہ چلاؤ۔ ارے تم نے تو اتنا زور لگا رکھا ہے اسٹیرنگ پر جیسے موٹر نہیں ہاتھی کا بچہ چلا رہی ہو۔"

"اب ایسے ریمارک دو گے تو نہیں چلاؤں گی۔"

"نہیں میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ قسم خدا کی موٹر چلاتی ہوئی آفت لگتی ہو۔ اگر ذرا کمزور اعصاب کا آدمی سامنے ہو تو موٹر ٹکرا دے۔"

"تم کمزور اعصاب کے ہو۔؟"

"ہو گیا ہوں۔"

"اگر زیادہ کمزوری غالب آئے تو مجھے بتا دینا۔"

"بتا رہا ہوں۔"

"کیا؟"

"چلو چل کر کسی ریستوران میں بیٹھتے ہیں۔"

"ابھی تو صرف تین گھنٹے ہوئے ہیں۔ سارا جوش ختم ہو گیا؟"

"نہیں ظالم تیرے بدن کی آنچ اب زیادہ آنے لگی ہے۔ ذرا ریستوراں میں بیٹھ کر کی آگ بجھاتے ہیں۔ پھر باقی ایک گھنٹے کا کام رہ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

جب وہ دونوں ریستوراں میں داخل ہونے لگے تو نیّا ایک آدمی سے ٹکرا گئی جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس آدمی نے بھی مڑ کر دوبارہ نیّا کو غور سے دیکھا۔ پھر نیّا تذبذب میں پڑ گئی۔ ایک میز کے گرد بیٹھتے ہی رازی نے پوچھا۔

"کون تھے یہ حضرت؟ گھائل معلوم ہوتے ہیں۔"

"پتہ نہیں۔ میں نہیں جانتی۔ مگر مجھے یہ آدمی لاہور کا معلوم ہوتا ہے۔"

"لاہور کا ہے تو کیا ہے؟"

"غالباً میرے بھائی کا دوست ہے۔ میں نے بچپن میں اُسے دیکھا تھا۔"

"ارے اب وہ تمہیں کہاں پہچان سکتا ہے۔ وہ کبھی تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ بچپن معصوم کلی، اب زمانے کے لئے قیامتِ صغریٰ بن چکی ہے۔ زیادہ سے زیادہ سوچتا معشوق اچھا ہے۔"

"تم تو ایسے باتیں کر رہے ہو۔ جیسے تم نے میرا بچپن دیکھا ہے۔"

"شاید دیکھا ہی ہو۔ کیونکہ بچپن تو میرا بھی لاہور میں ہی گزرا ہے۔"

"اچھا؟" نیّا نے حیرت اور خوشی سے پوچھا۔ واقعی اُس نے تو کبھی رازی سے

کچھ بھی نہ پوچھا تھا۔ بس اس کی شخصیت کے نشے میں سرشار ہو گئی تھی۔ نیّا نے اپنا ہیں پیچھے رکھا اور صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔ اتنے میں بیرا آ گیا۔ رازی نے آرڈر بیرا چلا گیا۔

"تم لاہور میں کس جگہ رہتے تھے؟"

"ہاں تو شروع ہو گئی نا وہ عورتوں والی کھود کرید۔"

"اگر تجسس کا جذبہ تو مردوں میں بھی ہوتا ہے۔ عورت کو اس طرح بدنام کیوں کرتے ہو تم۔"

"چڑ گئیں۔ میں بھی تمہیں چڑا ہی رہا تھا۔" نیّا چپ رہی۔

"اچھا تم بتاؤ۔ تم کہاں رہتی تھیں؟" نیّا نے بتایا کہ وہ چوک رنگ محل کے پاس "محلہ رنگ پورہ" میں رہتی تھی اور پھر اپنے آباجی اور اپنے بھائیوں کے بارے میں بتایا۔ اُسکول اور گلیوں کے بارے میں بتایا۔ اور یہ بتاتے بتاتے وہ بچپن کی خوابناک یادوں میں کھو گئی۔ اس کی ساری باتیں سُنکر رازی چونک اٹھا اور پھر اطمینان سے بولا۔

"کس زمانے کی بات کر رہی ہو۔ سن اور اتا پتا بتاؤ؟" اور نیّا نے بتا دیا۔ تو حیرت سے رازی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اسے کوئی بے حد پرانی اور بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔

"کیوں کیا ہوا۔؟" نیّا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تو تم.... اوہ.... میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔" اس نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر نیّا کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا پھر دیر تک دیکھتا رہا۔ "تو تم وہ نیّا ہو" اور پھر سر پکڑ لیا۔

"اوہ کس قدر خوشگوار حادثہ ہے۔"

"کیسا حادثہ؟ بھئی کچھ بتاؤ بھی۔" نیّا نے اصرار کیا۔

"لیکن کمال ہے۔ میں نے تمہیں پہلے کیوں نہ پہچانا۔؟"

"کچھ بتاؤ گے بھی یا میں اُٹھ کر چلی جاؤں۔" نیّا کی الجھن بڑھنے لگی تھی۔ کیونکہ اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کے چلے آنے کے بعد محلے میں اس کے بارے میں کیسی باتیں مشہور ہوتیں؟

"تم جہاں رہتی تھیں۔ تو تمہارے محلے میں، تمہارے گھر کے سامنے۔ کبھی کوئی کرایہ دار آئے تھے۔؟"

"ہاں کئی آتے رہتے تھے۔" نیّا نے لاپروائی سے کہا۔

"کبھی ایسے کرایہ دار آئے تھے جن کے بیٹے کا نام ارسلان تھا؟"

"ہاں۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔" نیّا نے کچھ اُبھرے کچھ ڈوبے انداز میں جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے۔

"تمہیں یاد ہے۔"

"یاد ہے۔" خوف کے مارے نیّا کا دل دھڑک اٹھا۔ اور ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس نے بے یقینی کے انداز میں رازی کی طرف دیکھا۔ رازی بھی اسے عجیب انداز میں دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے نقوش میں جانے کیا ڈھونڈ رہے تھے۔ ماضی۔ حال سے ملتا۔ نیّا جان کنی کی حالت میں لٹکی تھی۔ تبھی رازی نے آہستہ سے کہا۔

"میں وہی ارسلان ہوں۔"

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟" نیّا جیسے کسی گہرے کنویں سے بولی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔؟"

"تم رازی کیسے بن گئے؟" جواباً رازی نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ اس پر لکھا تھا۔ "اے۔ اے رازی" یعنی ارسلان احمد رازی۔

"تم نے کبھی اے۔ اے کا مطلب ہی نہیں پوچھا تو میں کیا بتاتا؟"

"واقعی!" نیّا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے تو رازی کو یوں بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیا تھا جیسے وہ آسمانی مخلوق ہو۔ "میں نے سمجھا تمہارا اصلی نام رازی ہے۔"

"رازی تو میرا راز کا نام ہے۔"

"اس کا کیا مراد ہے؟" نیّا نے چونک کر پوچھا تو رازی کھسیانا ہو گیا۔

"یہ بھی جوانی میں ایک زمانہ آتا ہے۔ جب ہر لڑکا یا لڑکی کچھ کر گزرنے کی منزل میں ہوتے ہیں۔ اپنے آپ سے بھی عشق ہوتا ہے۔ اور دُنیا کو بھی چونکانا چاہتے ہیں۔ اس طرح کوئی مصور جانا ہے۔ کوئی ادیب۔ کوئی مصور۔ کوئی فوٹو گرافر۔ کوئی بت تراش۔ تو جناب نے میں نے بھی شاعری شروع کر دی تھی۔"

اُس زمانے میں جب مجھے خطوں کی گولیاں بنا کر پھینکا کرتے تھے۔"

جانتی ہو اس وقت میری عمر صرف بیس سال تھی۔"

اور میں صرف اٹھارہ برس کی تھی۔"

تم اب بھی اٹھارہ برس کی ہو۔ اور میں تمہیں کھوجتا کھوجتا بوڑھا ہو گیا ہوں۔" رازی نے اسی انداز سے کہا۔ کہ نیّا کے دل میں آگ بھڑک اُٹھی۔

تم سے بچھڑنے کے بعد میں نے تمہیں بہت تلاش کیا تھا نیّا۔" رازی کی آواز خود بخود نرم اور پُراثر ہو گئی تھی۔ تم جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ میں نے تم سے پہلی ملاقات میں کہا تھا نا لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ اور تم نے میری اس بات کا مذاق اڑایا نے ایک دوسرے کو قریب سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تم دُور دُور سے مجھ پر بجلی گرایا ہیں۔ اور میں بُری طرح تمہارے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اور جان بوجھ کر تمہارے سامنے آتا تھا۔ تم نے ایک بار صرف میری ایک سرسری سی جھلک دیکھی تھی۔ اس لئے تم مجھے نہیں۔ اب جبکہ میں اتنا بدل گیا ہوں۔ وہ لاابالی سا لڑکا نہیں بلکہ ایک بھاری بھرکم کتنے سالوں کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔ غالباً نو یا دس سال کے میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے مذہبی اور پردہ دار گھرانے کی لڑکی یہاں اونچی سوسائٹی میں۔ بخدا۔ میں تمہارا یہاں کس طرح تصوّر کر سکتا تھا۔"

"رازی!" نیا جو سوچوں کے دوراہے پر گم صم بیٹھی تھی۔ ایک گہری سانس لیتی ہوئی بولی۔
"میری شادی ہو گئی تھی۔"

"ہاں مجھے خانم نے تمہارے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ مجھے تمہارے ا
کوئی دلچسپی نہیں۔ کتنی خوشی کی بات ہے۔ زندگی کے ایک موڑ پر تم دوبارہ مل گئے ہو۔ ق
تم مجھے کھوجتی پھر رہی تھیں۔ اور میں تمہیں۔"

"زندگی میں۔ میں نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں رازی۔" نیا کی آنکھوں میں
آ گئے۔ "یہاں تک آنا میرے جیسی لڑکی کے لئے اتنا آسان نہیں تھا۔" رازی نے
سے اپنا مضبوط ہاتھ نیا کے ٹھنڈے برف جیسے لرزتے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ا
کے ہاتھ کے دباؤ سے نیا کے جیسے مردہ تن میں جان پڑ گئی تھی۔

"میں نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں نیا۔ آؤ اب ماضی کی صعوبتوں کو بھول جا
شاید قدرت کو ہمارا اس طرح ملاپ منظور تھا۔ ہم اس کائنات میں ایک دوسرے
لئے سرگرداں تھے۔ ہم یقیناً ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے تھے۔ پڑاؤ منزل
ہوتی۔ پڑاؤ کا غم کیوں کریں۔ تم میرے ماضی کو نہ کریدو۔ میں تمہارے ماضی کی
نہیں کرتا۔ اب دیر نہ کرو۔ آؤ۔ ہم ایک ہو جائیں۔ قبل اس کے کہ زمانہ ہمارے
درمیان آ کھڑا ہو۔" نیا سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔" نیا نے اپنا دوسرا لرزتا ہوا ہاتھ بھی رازی کے ہاتھ پر
دیا۔ نیا کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دونوں ہاتھ ٹھنڈے تھے اور ان دو
لرزتے ٹھنڈے ہاتھوں میں رازی کا گرم ہاتھ آہستہ آہستہ حرارت بخش کر زندگی کی
دے رہا تھا۔ نیا جو اپنی زبان سے کہہ سکی تھی وہ ہاتھوں نے کہہ دیا۔ رازی کا ہاتھ
ایسی مشعل کی طرح لگ رہا تھا۔ جو زندگی کی نوید دیتی ہے۔ زندگی کے راستے دکھاتی
اس مشعل کو وہ کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے رازی کے ہا

اسی وقت آنسو کے دو گرم قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر میز پر گر گئے۔
"میں تمہارے آنسو کے ہر قطرے پر اپنے ہونٹ رکھ دوں گا۔ مگر بخدا اس
بار میں تمہارے آنسو نہ بہاؤ۔ اور جو یہ خوشی کے بھی ہیں۔ تو ان کو روک لو۔ اپنی آنکھوں
کو اپنے سامنے آنسو نہ بہانے سے روکو۔ ورنہ ضبط دونوں طرف سے ٹوٹ جائے گا۔"

آج نیّا بے حد مسرور اور حد درجہ سرشار تھی۔ زمین پر تو قدم ہی نہ پڑتے تھے۔ بعض خوشیاں جاگتی ہیں۔ تو زندگی کا سارا فلسفہ ہی بدل جاتا ہے۔ وہ کب جانتی تھی کہ ایسا ہوگا۔ اب تو ایسا لگ رہا تھا۔ کہ وہ روز ازل سے رازی کو چاہتی آئی ہے۔ رازی اس کی رگ رگ میں اترا ہوا ہے اور اس کی سانسوں میں لہرا رہا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن سے اسی کی آواز آرہی ہے۔ اب اُسے قدرت کی مصلحتوں پر ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔ کہ یہ جو شہباز سے طلاق ہوئی تو یہ محض اس لئے کہ قدرت کو دو محبت کرنے والوں کو ملانا مقصود تھا۔ واہ کیا خوبصورت انجام اس مبہم کہانی کا! کہ جو شروع بھی نہ ہوئی تھی۔

پرس جھلاتی ہوئی۔ پھولوں اور کلیوں میں تیرتی ہوئی، وہ گھر کے اندر داخل ہوئی، لپک کر موتی کو اُٹھا کر بے اختیار چوم لیا۔ موتی حیران تھا کہ آج ماں کو اس قدر والہانہ پیار کیوں آرہا ہے؟ اور یہ اجنبی کون ہے۔ جس کی سنگت میں ماں گلاب کی طرح کھلی رہتی ہے۔ ڈانٹ نہ جھڑک۔ نیّا نے موتی کو چھوڑا۔ تو پیچھے آتے ہوئے رازی نے اس کی تقلید میں اُسے اُٹھا کر چوم لیا۔ موتی اس دوہری مہربانی سے بوکھلا اٹھا تھا۔ مگر رازی کے ہاتھ میں تو اس کے لئے آئس کریم کا ایک پیکٹ بھی تھا۔

واہ۔ انکل رازی زندہ باد۔" موتی نے آئس کریم لے کر نعرہ لگایا۔

مجھے انکل نہ کہا کرو۔" رازی نے موتی کو پکڑ کر اپنی ٹانگوں میں پھنساتے ہوئے کہا۔

کیا کہوں؟" موتی جلدی سے آئس کریم کا پیکٹ کھول کر کھانا چاہتا تھا۔

مجھے پاپا کہا کرو بیٹا۔"

پاپا۔؟" موتی نے اپنی حیران اور خوبصورت آنکھیں کھول کر پہلے رازی اور پھر نیّا کو دیکھا

ہاں ہاں۔ پاپا۔" رازی نے اُسے پیار سے جھنجوڑا۔

پاپا کیا ہوتا ہے ممی؟" موتی نے پریشان ہو کر ماں سے پوچھا۔

ہوتا ہے۔" رازی نے مصنوعی غصّے سے دانت پیسے اور پھر زیر لب کہا۔ "ماں

نیّا

انسان ہو رازی۔" نیّا نے بھی مصنوعی جھلاہٹ سے رازی کو ڈانٹا۔

پاپا۔ پاپا۔ ابو ہوتا ہے۔ ڈیڈی ہوتا ہے۔" رازی نے پیار سے سمجھایا۔

میرے ڈیڈی تو۔"

نہیں۔" رازی نے اُسے روک دیا۔" میں ہوں آپ کا ڈیڈی۔ کھلونے لینے گیا تھا۔

لایا ہوں۔"

کہاں ہیں کھلونے۔؟" موتی نے بھی ترکی بہ ترکی پوچھا۔

نیچے گاڑی میں پڑے ہیں۔"

نہیں نہ جا کر۔"

نہیں۔ پہلے میرا بیٹا مجھے پاپا کہے گا۔"

پاپا۔ پاپا۔" موتی نے ہنس کر کہا۔ اس کی آئس کریم پگھلتی جا رہی تھی۔ اور نجات کا واحد راستہ اعتراف کر لے۔ اس لئے جھٹ اعتراف کر لیا۔ رازی نے اسے چھوڑ دیا اور کمرے میں بھاگ گیا۔

"لو بھئی نیا مبارک ہو۔ تمہارے بیٹے نے مجھے قبول کر لیا ہے۔" نیا دیر سے مسکرائی۔ رازی کا یہ جارحانہ انداز۔ یہ زبردستی اپنے آپ کو منوانے کی ادا نیا کو بہت پسند آئی۔

"اب تمہاری کیا رائے ہے؟"

"کس معاملے میں؟"

"واہ۔" رازی نے آنکھ بند کر لی۔ "معاملہ چٹ پٹ ہو جانا چاہیئے۔ اب یقین دہانی نہیں۔ تاب انتظار نہیں۔ پہلے ہی ایک دوسرے کو کھوجنے میں کتنا وقت ضائع کر چکے ہیں۔"

"واقعی۔۔۔؟" نیا دل ہی دل میں اپنی عمر کا حساب لگانے لگی۔

"واہ راستے میں تو۔۔۔ تم میرا ہاتھ ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ رو رو کر میرا گریبان بھگو رہی تھا۔ اور اب بے نیاز بنی کھڑی ہو۔"

"چپ رہو خدا کے لئے رازی۔" نیا تھرا گئی۔ "امی ساتھ والے کمرے میں ہیں۔"

"اور امی نادان نہیں ہیں۔ جو یہ نہ جان سکیں کہ آج کل بنو جو ہواؤں میں اڑ رہی ہے کلی کی طرح کھل رہی ہے تو بات کیا ہے؟"

"رازی کبھی تو انسانیت کے جامے میں رہو۔" وہ قریب آ گیا۔ "بہت زیادہ۔" جلدی سے بولو۔ میں نے موتی سے اگلوا لیا ہے نا؟ تو تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"ذرا ہٹ کر بات کرو۔ امی جان نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گی؟"

"یہی کہیں گی کہ بچی بالغ ہو گئی ہے۔"

"نادانیاں کرنے والی عمر نہیں ہے یہ سمجھے۔"

"عشق کے لئے تو یہی عمر جائز ہے۔ نادانیوں کی عمر تو گزر گئی۔ اچھا پھر میں جا کر امی جان سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔"

"دیر دو رازی، اتنی جلدی کیوں ہے؟"

"بھئی میرے کام کا ہرج ہو رہا ہے مجھے واپس جانا ہے۔ ورنہ میں تمہیں اٹھا کر ہیلی کاپٹر میں لے جاؤں گا۔"

"اس طرح پہلے ایک بار غائب ہو گئے تھے۔ بن بتائے۔ آخر کہاں چلے گئے تھے کیا بیٹھے بٹھائے۔ کیا ہوا تھا۔ اگر تم اس طرح مجھے مصیبت میں پھنسا کر نہ جاتے۔ تو کبھی میں میرے ابا جی میری شادی نہ کرتے۔"

"اس۔" رازی کھسیانا سا ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ "تھی ایسی ہی کوئی مجبوری نیا۔ جسے میں بتا سکتا۔ کچھ میرے ابا جی کی مجبوریاں تھیں۔ پھر میں وطن سے باہر چلا گیا تھا۔ اچھا یہ بتانے کو ایک عمر پڑی ہے۔ تم بتاؤ میں امی جان سے بات کروں یا تم کرو گی؟"

"پہلے میں بات کر لوں۔ تم بعد میں کرنا۔ مجھے پتہ ہے ان سے کس انداز میں بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پھر چلتا ہوں۔ کل آؤں گا۔"

"ظاہر ہے۔" نیا نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں آنے سے کون روک سکتا ہے۔" جب وہ باہر نکلا تو موتی دوڑتا ہوا آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"ارے موتی۔"

"خیر پاپا۔ میں تمہیں ڈیڈی کی تصویر دکھاؤں۔" موتی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فریم شدہ تصویر رازی کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ نیا اپنی جگہ سن ہو گئی۔ رازی نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر ناگواری سے دیکھی پھر نیا کی طرف دیکھا۔ جس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ ہاتھ موتی مچل رہا تھا۔ تو نیا نے شہباز کی پرانی تصویر اس کی الماری میں رکھ دی تھی۔ یہ تمہارے ڈیڈی ہیں۔"

"ڈیڈی تو ایسے ہوتے ہیں۔ ڈیڈی تو ایسے ہوتے ہیں۔" وہ رازی کی پینٹ

پکڑے چلا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹیا۔" رازی نے آہستہ سے وہ تصویر میز پر اوندھی رکھ دی۔ "اب پاپا کو خدا حافظ کہو۔ کل پھر ملیں گے۔" اس نے جھک کر موتی کو پیار کیا۔ اور باہر نکل گیا۔

نیا نے آگے بڑھ کر شہباز کی تصویر اٹھالی۔ مگر پلٹ کر دیکھنے کا اسے حوصلہ نہیں ہوا۔ شہباز کے ذکر پر اسے ہمیشہ غصہ آیا کرتا تھا۔ آج تو ایک نفرت کا جذبہ ابل پڑا۔ یہ کمبخت تصویر کیوں نکل آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ موتی کے ذہن پر ہنوز اس کے نقوش ہیں۔ ہیں یہ نقوش گہرے نہیں ہونے دوں گی! اس نے ایک فیصلہ کن انداز میں سوچا۔ اور پھر وہ فریم بغیر دیکھے ہی۔ کھڑکی سے نیچے سڑک پر پھینک دیا۔ اگر کسی کو لگ جاتا تو۔ اس کا دل دھڑک اٹھا ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے نیچے دیکھا۔ جانے وہ ننھا سا فریم کہاں گرا ہوگا کس کس کے قدموں تلے آچکا تھا۔

اتنے میں موتی دوڑتا ہوا آیا۔ "ممی ڈیڈی کہاں ہیں؟ کہاں ہیں میرے پیلے ڈیڈی؟"

"پگلا۔" نیا نے اس کو چوم لیا۔ "ڈیڈی کل آئیں گے میرے بیٹے کو اچھے اچھے کھلونے لاکر دیں گے۔ ہم آئس کریم کھانے جائیں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔" نیا نے موتی کو گود میں اٹھا نہلایا دھلایا۔ کپڑے بدلے۔ اتنا پیار کیا۔ جس کا وہ تصور نہ کر سکتا تھا۔ وہ موتی کے ذہن میں بنی ہوئی ہر شبیہہ کھرچ دینا چاہتی تھی۔ پریوں کی کہانی سنا کر جب اس نے موتی کو سلا دیا پھر امی جان کے کمرے میں آگئی۔

"کیا حال ہے۔ امی جان؟"

"ٹھیک ہوں بیٹی۔"

"کھانا کھالیا آپ نے؟"

"نہیں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ موتی کو تو میں نے کھلا دیا تھا۔ آؤ تم بھی کھالو۔"

"امی جان۔" نیا جلدی سے شروع ہوگئی۔ مبادا شرم جھجک میں بات نہ رہ جائے۔ "آپ نے کہا تھا نا کہ میں کوئی اچھا سا آدمی ڈھونڈ کر شادی کر لوں۔ اور میں نے آپ سے بھی کر لیا تھا۔"

"ہاں۔" امی جان ٹھنڈے برف لہجے میں بولیں۔ "میں نے کہا تھا۔ نیک، دفادار، شریف نے والا آدمی۔ ڈھونڈ کر شادی کر لینا۔"

"ایسا آدمی میں نے ڈھونڈ لیا ہے امی۔" امی خاموش رہیں۔

آپ سے اجازت لینے آئی ہوں۔"

تم رازی سے شادی کرنا چاہتی ہو؟" امی نے یوں آرام سے کہا جیسے روزمرہ کی کوئی کر رہی ہوں۔

جی امی۔" نیا نے امی کا لہجہ محسوس کئے بغیر مسرور ہو کر کہا۔ امی تھوڑی دیر خاموش اور پھر بولیں۔

شادی پر آمادہ ہو جانا تو بہت اچھی بات ہے۔ مگر شادی کے فیصلے عجلت میں نہیں جاتیں۔ رازی سے تو تمہاری صرف ایک مہینے کی پہچان ہے۔" نیا کا دل چاہا وہ سے امی کے منہ پر ہاتھ رکھ دے اور کہے۔

آپ ایک مہینے کی پہچان کہتی ہیں۔ رازی تو میری جوانی کا پہلا سپنا ہے۔ میرے پہلا پھول ہے۔ اس نے ہی تو کنکر مار کے مجھے بچپن کی نیند سے جگایا تھا۔ اس دلایا اور میرے دل کو چھیڑا تھا۔ مجھے محبت کا پہلا گیت سنایا تھا۔ یہ تو کے کم ہے۔ اور آپ کہہ رہی ہیں۔" مگر وہ خاموش رہی۔ بھلا امی جان کو یہ کہانی کس سنائی جا سکتی تھی؟

دل کی کہانیاں ہیں۔

کے دل والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔

"امّی جان میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے؟" بالآخر نیّا نے ایک فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اور موتی کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟"

"موتی ۔" نیّا ہنسنے لگی۔ "موتی تو میری جان ہے۔ وہ بھلا مجھ سے کس طرح جدا ہو سکتا ہے۔ آپ اور موتی ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔"

"پھر بھی بہتر ہے ہر معاملے میں تم رازی سے کھل کر بات کر لو۔ کچھ اُس کا پتہ معلوم کرے کہ کون ہے۔ کس خاندان سے ہے۔ کیا کرتا ہے۔ بسا اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے نتائج کا باعث بن جاتی ہیں۔" نیّا کھڑی ہو گئی۔ پھر مسکراتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کا اتا پتہ یہی ہے کہ میرے دل میں رہتا ہے۔ اُس کا کام یہ ہے کہ مجھے جنم کرتا رہے۔ اس کا خاندان میرے جسم سے جنم لے گا۔"

اور وہ کون ہے؟

وہ کون ہے؟

جو مجھ میں سمایا اور مجھ پر چھایا رہتا ہے۔؟

کراچی کے بین الاقوامی ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے نیّا کو اختلاج ہونے لگا۔ پہلے پندرہ منٹ تو اُس نے اِرد گرد کا جائزہ لینے میں لگا دیئے، بے شمار لوگ تھے۔ اتنی زیادہ تعداد میں لوگ ملک سے باہر جاتے ہیں اور ہر روز جاتے ہیں، نیّا حیران ہو رہی تھی۔ ان میں کچھ غیر ملکی بھی تھے۔ مگر زیادہ تر ملکی تھے۔ سامنے ٹی وی پر فلائٹس کے اوقات اور نمبر لکھے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے مختلف فلائٹس ملک سے باہر جا رہی تھیں اور برابر اعلان ہو رہا تھا۔

نیّا اس سے پیشتر بھی خانم کے ساتھ ملک سے باہر گئی تھی۔ پہلی مرتبہ اس لاؤنج میں آ کر بیٹھی تھی جیسے کوئی انتہائی تجربے کار خاتون ہو اور جائزہ بھی بھرپور انداز میں لے رہی تھی۔ ماحول کا سارا ابھرا ہوا تھا اور اندر کافی شور تھا۔ بہت سے بچے مچل مچل کر رو رہے تھے۔ بچوں اور مرادوں کو دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا کہ ہمارے ملک کے کم پڑھے یا ناخواندہ لوگ بھی لاؤنج میں بیٹھے تھے اور ان کے بیوی بچے بھی ساتھ تھے انہیں بھی ٹھیک طرح سے بیٹھنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ بچے اس طرح چیختے پھر رہے تھے جیسے گاؤں کی گلیوں میں پھر رہے ہوں۔ زیادہ تر بچوں نے لمبے لمبے کرتے پہن رکھے

تھے اور ان کے پاؤں ننگے تھے۔ بے ڈھنگے کپڑوں اور بے ڈول جسموں والی ما
بھی ان کے پیچھے چلاتی پھر رہی تھیں۔ بعض لوگوں کے کپڑے انتہائی میلے تھے، بعض
میں گٹھڑیاں اور طوطے کے پنجرے پکڑے ہوئے تھے۔

یا اللہ یہ لوگ اپنے ملک سے باہر جا رہے ہیں؟

مگر کہاں جا رہے ہیں؟

جہاں جائیں گے ملک کو بدنام کریں گے۔

پہلے ہی جانے والے وطنِ عزیز کو کافی بدنام کر چکے ہیں۔ یہ لوگ جنہیں مالٹا یا کیا
چھلکے کوڑے کے ڈرم میں پھینکنے کا سلیقہ نہیں۔ سگریٹ بجھائے بغیر فرش پر پھینک
اور دلایتی غسل خانے کو استعمال کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔

یہ وہاں جا کر کیا کریں گے؟

مزدوری ہی۔ ٹھیک ہے، مگر کیا اچھا ہو جو حکومت ان جانے والوں کے لئے
ایک حد مقرر کر دے اور ایک ٹریننگ سنٹر کھول دے جس میں کم از کم تین مہینے کا کور
جس میں غیر ممالک میں رہنے کے آداب سکھائے جائیں۔ مگر حکومت بے چاری بھی کیا

ہاں۔ نیا دل میں سوچنے لگی۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو میں واپس آ کر ایسا سنٹر کھولوں گی
میں ناخواندہ لوگوں کو بطورِ خاص باہر جانے کی تربیت دی جائیگی۔

مگر یہ لوگ جا کہاں رہے ہیں؟ یقیناً دبئی، ابوظہبی، قطر، کویت، بحرین کی طرف
ہوں گے اور اسی وقت ابوظہبی جانے والی ایک فلائٹ کا اعلان ہوا تو سارے کے
لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نیا کا اندازہ صحیح نکلا تھا۔ یہ محنت مزدوری کرنے جا رہے ہیں
زیادہ پیسہ کمانے جا رہے ہیں۔ وہاں جا کے محنت بھی دگنی کریں گے۔ کاش اتنی محنت
اپنے ملک میں کرتے اور پھر پیسہ جمع کرنے کی خاطر وہاں بہت گھٹیا طریقے پر رہتے ہیں
وہاں ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتے گا۔ افسوس یہ نہیں جانتے مگر یہ خوش ہیں

ے نام خیالات ختم ہو چکے تھے۔ وہ اپنے وطن کے لئے کافی سوچ چکی تھی۔ دو
پی تھیں۔ مگر رازی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب وہ اپنا سامان
والے لاؤنج میں آ رہے تھے تو ایک دم رازی کو ایک آدمی ہال کے باہر نظر آیا
نے نیا سے کہا۔

... چلی جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔ ہماری فلائٹ جانے میں ابھی ایک گھنٹہ ہے۔" تو
تھی اور اب تقریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ مگر رازی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ نیا کو اختلاج
بلکہ عجیب و غریب وہم ستانے لگے۔ فرض کرو رازی نہ آئے۔ مگر کیوں نہ آئے؟
ے اڑنے کا اعلان ہونے لگے تو وہ کیا کرے گی؟ چلی جائے یا اُس کا انتظار کرتی رہے
وقت چلا کہاں گیا۔ کیا وہ نیا کے ساتھ دھوکا کر سکتا ہے۔ مگر کیوں؟ آج صبح ہی
ی ہوئی تھی۔ شادی بھی بڑے سادہ طریقے پر ہوٹل میں ہوتی تھی۔ نیا باقاعدہ
ہی تھی۔ یہ اس نے رازی سے بھی کہہ دیا تھا کہ شادی بڑی سادگی سے ہوگی۔ چند
مہمانے شامل ہوئے تھے۔ ہاں خانم بھی آئی تھی اور نیا کے لئے تحفے میں ایک
لائی تھی۔ گو خانم اس شادی سے خوش نہیں تھی بلکہ اس نے نیا کو سمجھانے کی
ش کی تھی۔ جس دن نیا نے رازی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا، اُسی دن
کر خانم کے پاس لے گئی۔

ہے نیا؟" خانم نے استعفیٰ پڑھ کر کہا۔

ذکری چھوڑنا چاہتی ہوں۔"

کوئی ذاتی نہ ہو تو بتاؤ۔"

... میں ... دراصل شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

خانم نے ٹھنڈی سانس لے کر اچھا کو ذرا لمبا ہی کر دیا۔"

جلدی تم نے کیسے فیصلہ کر لیا؟"

"بعض فیصلے آپ ہی آپ ہو جاتے ہیں خانم۔"

"کس کے ساتھ شادی کر رہی ہو؟"

"نیّا نے بے یقینی سے خانم کی طرف دیکھا۔ کیا خانم اتنی ہی انجان ہے۔ پھر کہا، بولی۔

"رازی کے ساتھ۔"

"اوہ . . . ." خانم چُپ کر گئی، تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی۔

"مبارک ہو رازی اچھا لڑکا ہے۔ مگر نیّا . . . تمہیں شادی کا فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے تھا۔"

"میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

"میرے خیال میں تو شہر میں کچھ اور لوگ بھی تھے، جو رازی سے ہر لحاظ سے بہتر۔ اور تمہارے طلب گار بھی۔"

"مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی خانم۔"

"شادی میں دلچسپی کے علاوہ بھی بہت کچھ دیکھا جاتا ہے۔"

"میرے خیال میں تو محبت کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھا جاتا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہیں رازی سے محبت ہو گئی ہے۔"

"اسے بھی مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔"

"پھر تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے اپنے اردگرد کے لوگوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔"

"جب خود تجربے اُٹھانے کو میدان وسیع ہو تو پھر دوسروں کی بنائی ہوئی راہوں پر ہمیں کیا ملے گا خانم؟"

"ٹھیک ہے۔" خانم بولی۔ "مگر تمہیں نوکری چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی، چھ ماہ کی

ں۔"

خانم، میں شادی کے بعد سروس نہیں کروں گی۔"

ی کا فیصلہ ہے۔"

ں، یہ میرا فیصلہ ہے۔" خانم زیرِ لب مسکرائی، پتہ نہیں اس میں طنز زیادہ تھا یا مزاح۔

شادی کے بعد گھر بیٹھو گی؟"

ے پیدا کرو گی؟"

چھی بات ہے۔ تمہاری تنخواہوں کا حساب کر دیا جائے گا۔ ویسے نیّا! تم نے ہماری خدمت کی ہے، ہم تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اور جب کبھی تم پلٹ کر آنا چاہو ں آمدید کہیں گے۔ یکایک نیّا کے سر سے لے کر پاؤں تک آگ لگ گئی۔ خانم اُسے بجائے بددُعا دے رہی تھی۔ شاید خانم کو حسد محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اتنا اچھا آدمی اور پھر رازی خانم کا بھی تو دوست رہ چکا ہے، یقیناً جل گئی ہو گی۔

ے اُمید ہے کہ میں پلٹ کر نہ آؤں گی۔"

پنے آپ پر بھروسہ ہے یا رازی پر؟"

ر پر بھروسہ ہے۔"

ی بات ہے۔ ویسے رازی کو میں ایک عرصے سے جانتی ہوں، اس وہ اوصاف ں کو خوش رکھ سکے۔"

یقین ہے کہ میرے اندر وہ اوصاف ہیں اور میں اپنے شوہر کو خوش رکھ

نے خوش دلی سے کہا۔ "گڈ لک۔ جاؤ عیش کرو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ

ہیں۔ ویسے تمہاری ایک پرانی دوست ہونے کے ناطے مَیں اتنی نصیحت ضرور کروں گی کہ
بھی آدمی پر بھروسہ کرنے سے پہلے اپنے پاؤں اچھّی طرح مضبوط کر لینے چاہئیں۔" نیّا کو
یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ وضاحت طلب کرے، پھر یہ سوچ کر خاموش
ہو گئی کہ بات بڑھ جائے گی۔ خانم کا مقصد صرف نیّا کو بد دل کرنا ہے اور کچھ بھی نہیں اور
کے چنگل سے آزاد ہونے کے لئے ہی تو اس نے رازی کا سہارا لیا تھا۔ اس وقت
ایک مضبوط مرد کی ضرورت تھی۔ شوہر کے ہوتے ہوئے کوئی اور پاسبان نہیں بن سکتا
اور خانم تو خواہ مخواہ اُس کی سرپرست بنی ہوئی تھی۔

رازی نے نیّا سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ہم شادی کے بعد امریکہ چلے جائیں گے اور
اپنا ہنی مون نیویارک میں منائیں گے۔

آج صبح گیارہ بجے اُن کا نکاح ہوا تھا اور آج ہی رات گیارہ بجے والے جہاز سے
نیویارک جا رہے تھے۔

نیّا کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ اُس نے میک اَپ تو دلہنوں والا کر رکھا تھا
کپڑے بہت سادہ پہنے ہوئے تھے۔ دراصل اسے اشتہار بن کر سفر کرنا پسند نہیں تھا
طرح شادی کا فیصلہ آناً فاناً ہو گیا تھا، اسی طرح باہر جانے کا پروگرام بھی یکلخت بن گیا تھا
رازی کی بس یہی ضد تھی کہ ہم ہنی مون نیویارک چل کر منائیں گے۔ بلکہ اس نے کہا تھا کہ کچھ ماہ وہاں
رہیں گے اور پورے نارتھ امریکہ کی سیر کریں گے۔ یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔

خوب صورت خواب تھے۔ دلکش تمنّائیں تھیں۔ تبھی تو نیّا کسی بات سے انکار نہ کر سکی
عجلت میں نوکری چھوڑی اور موتی کو امّی کے پاس چھوڑا۔ موتی کے لئے بھی رازی نے مشورہ
دیا تھا کہ اُسے کسی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا جائے، مگر نیّا نہیں مانی
ابھی چھ سال کا تھا، بورڈنگ میں بھیجنے کے لئے بہت معصوم تھا، نیّا کا دل نہیں مانا
اسے اندازہ تھا کہ موتی کو بورڈنگ میں بھجوانا ہی پڑے گا۔

پاتی تھی کہ امریکہ سے واپس آ کر موتی کو مری بھیج دے۔ صرف وہی اسکول نیّا کو
ی الحال تو اس نے امّی اور موتی کو ڈھیر ساری تسلیاں اور آسائشیں دے کر پیچھے
ر خود زندگی کے ساتھ آگے چل پڑی تھی۔

ا۔

ازی کو کیا سوجھی؟ کھڑے کھڑے غائب ہو گیا۔ صبح سے اب تک انہوں نے تسلّی
بات بھی نہ کی تھی۔ بس بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ بھاگتے دوڑتے ہی رازی
تھا۔

اپنا وہی جوڑا ضرور ساتھ رکھ لینا۔"

وہ جانتی تھی۔ کیوں۔ سب تیاریوں کے ساتھ وہ اُس کے ساتھ چل کھڑی ہوئی۔
ابھی پاؤں کی زنجیر نہیں بنا۔ کبھی کبھی تو ساری زنجیریں توڑ دینے کو دل چاہتا ہے
اب وہ ایک معزز عورت تھی۔ کسی کی بیوی تھی اور اسی شان کے ساتھ اپنے شوہر کے
ڈالنے والی تھی۔ مگر بیٹھے بیٹھے جی کے اندر کیسی بے قراری اُبھری تھی۔ بہت سے
ے، اندیشے کیسے قطار اندر قطار چلے آتے تھے۔ اسی وقت مائیکروفون پر
جہاز کی پرواز کی اطلاع گونجنے لگی۔ قیامت کا وہ لمحہ آ پہنچا تھا۔ نیّا گھبرا کر کھڑی ہو
ادھر اُدھر سے دوڑ کر گیٹ کی جانب جانے لگے۔ جانے والوں کی لائن لمبی
اس نے ہال میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔

رنگ زرد ہو گیا۔

لمحہ کا لمحہ تھا۔

پہنچا نہیں تھا۔ آیا اُس کو مسافروں کی لائن میں کھڑے ہو جانا چاہیئے یا....

اس کا انتظار کرتی رہے۔

اُس کا قیمتی سامان جہاز کے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ سب کچھ کھو جائے گا۔

لیکن وہ اپنے سامان سے زیادہ قیمتی ہے اُسے نہیں کھونا چاہیئے۔ دُنیا بڑی ظ
اور نیّا جیسی تنہا لڑکی کو نگل جاتے گی۔ زمین نیّا کے پاؤں تلے سے خود بخود کھسکتی جا رہی
پتھر بنی کھڑی تھی اور لائن کے مسافر آہستہ آہستہ کم ہو رہے تھے کہ اچانک بالکل
بائیں دروازے سے ہنستا ہوا رازی داخل ہوا۔ اس کے بازو پر ایک کالا کوٹ پڑا
اور وہ یوں مسکراتا آ رہا تھا جیسے بازی جیت کر آ رہا ہو۔

"ہائے رازی" نیّا ایک دم چیخ اٹھی "میری تو جان ہی نکل گئی تھی"

"نکالیں گے تمہاری جان، مگر ذرا دم لے کے" رازی نے ایک آنکھ میچ کر کہا
رکھنا اب میرے سوا تمہاری جان کوئی نہیں نکال سکتا" اس نے آگے بڑھ کر نیّا
اُٹھا لیا۔

"آخر کہاں غائب ہو گئے تھے، ایک گھنٹے بعد آ رہے ہو" نیّا غصّے سے

"ایک دم بیویوں والا رویہ اختیار نہ کرو، ابھی نکاح کو چند ہی گھنٹے ہوئے ہیں"
نے ہنس کر کہا۔ اب جلدی سے میرے پیچھے چلی آؤ، لڑائی جھگڑا جہاز میں بیٹھ کر
فلائٹ کا یہ آخری اعلان تھا" وہ دونوں آگے پیچھے گیٹ کی طرف بڑھے۔ گیٹ
نکل کر وہ بس میں بیٹھے اور پھر جہاز میں سوار ہو گئے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر نیّا کی جا
آئی۔ رازی ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔

"آخر تم چلے کہاں گئے تھے؟" نیّا نے پھر کہا۔

"محترمہ آپ کو معلوم نہیں آج کل نیویارک میں کتنی سخت سردی پڑ رہی ہے
سے تمہارے کوٹ کے لئے کہہ رہا تھا۔ ابھی وہ کوٹ لے کر آیا تھا اور میں اس
لینے گیا تھا"

"یہ میرا کوٹ ہے؟" نیّا نے اس کے بازو پر پڑے ہوئے کوٹ کی طر
کر کے پوچھا۔

یہ آپ کا کوٹ ہے۔ یقین نہ آئے تو دیکھ لو۔ میں نے سوچا ایسا نہ ہو جونہی ہم
ہم چھینک چھینک کر پاگل ہو جاؤ اور ہوٹل میں پہنچنے تک فلو میں مبتلا ہو جاؤ۔
دن کا ایک عرصے سے تصوّر کئے ہوئے ہوں، تباہ ہو جائے" اس پر نیّا کا چہرہ
نخ ہو گیا۔ اُسے رازی کی یہ بات ہر بات سے زیادہ اچھی لگی۔ وہ شرما سی گئی
ہ کہہ سکی۔

بیٹھ جاؤ نا" اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

یہ کوٹ وارڈ روب میں خود ہی لٹکا آؤں، پھر بیٹھ جاتا ہوں" تھوڑی دیر بعد رازی
آیا اور پھر دونوں کو خبر نہ ہوئی کہ اتنی لمبی فلائیٹ میں وقت اتنی جلدی کیسے گزرا
جھٹکے آنے لگے تو رازی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

سرے کو چھیڑتے ہوئے۔

کو جگاتے ہوئے۔

آنکھوں میں جانے کتنی ہی ان کہی کہانیاں کہتے ہوئے بالآخر ان کا سفر تمام ہوا۔

نیویارک پہنچ کر جہاز سے اُترتے ہی رازی نے سیاہ کارڈ والا کوٹ نیّا کے کندھوں پر ڈ

"باہر بہت سردی ہے۔ تم کوٹ پہن کر یہاں سے اُترو گی۔"

"مگر ابھی سے کیوں؟ ائرپورٹ سے باہر نکل کر پہنوں گی۔"

"نہیں ابھی سے پہن کے نکلو۔ اس طرح تم نظر لگنے سے بچ جاؤ گی۔" نیّا مسکرا دی نے بازو پھیلا کر کوٹ پہن لیا اور ردچار قدم چل کر رُک گئی۔

"رازی یہ کوٹ تو بہت وزنی ہے۔"

"حضور آپ کے کندھے بہت نازک ہیں۔"

"نہیں رازی، عام طور پر کوٹ اتنے بھاری تو نہیں ہوتے۔"

"اس کپڑے کو ملاحظہ کیا ہے آپ نے؟"

"ہاں۔"

"اسے قراقلی کہتے ہیں۔ اور قراقلی کا کوٹ بھاری ہوتا ہے۔"

"اُف میرے تو کندھے دُکھنے لگے۔ اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لوں؟"

"نہیں تم اُسے پہنے رہو اور اس لائن میں لگ جاؤ۔ یہاں پاسپورٹ وغیرہ کی نا ہو گی

خاموش رہو۔" کسٹم سے بھی وہ دونوں خیر و عافیت سے نکل آتے تھے۔ جونہی ے باہر نکلے، یخ بستہ ہوا کے تھپیڑوں نے نیّا کے گل گوں چہرے کو چھوا تو نیا ڈول ے یہاں بہت سردی تھی۔ غالباً رازی کا ایک دوست کار لے کر آیا ہوا تھا۔ اس لئے ی کار میں بیٹھ گئے اور ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ موٹر میں بیٹھتے ہی رازی نے کہا اب تم کوٹ اتار سکتی ہو۔"

ب تو ہوٹل میں ہی جا کر اُتاروں گی۔" "ہالی ڈے ان" میں ان کی رہائش کا بندوبست تھا ں پہنچ کر نیّا نے اطمینان کی سانس لی اور بے اختیار کوٹ اُتار دیا۔

رازی تم ذرا اس کو اُٹھا کر دیکھو واقعی یہ کوٹ بہت بھاری ہے۔"

بھی یہ تم سے تو بھاری نہیں ہے نا؟" رازی ہنس کر بولا۔ "اگر میں نے تمہارا بوجھ اٹھا لیا ہے ٹ کا بھی اٹھا لوں گا۔" قریب آ کر اُس نے نیّا کے ہاتھ سے کوٹ لیا اور پھر ہینگر میں لٹکا ں ہینگ دیا۔ نیّا نے ایک لمبی انگڑائی لی اور دھم سے بستر پہ گر گئی۔

تھک گئی ہو؟"

ں۔ سفر نے نہیں، بلکہ اس کوٹ نے مجھے تھکا دیا ہے۔" رازی زور سے ہنسا۔

اچھا تم نہا دھو کر تیار ہو جاؤ، بازار سے تمہیں ایک ہلکا پھلکا کوٹ لئے دیتے ہیں۔ ہے۔"

ٹھیک ہے۔" نیّا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

پہلے گرم چائے پلواؤ رازی، جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے۔"

رازی پلیٹ کر بولا۔ "جوڑ جوڑ تو نہیں دُکھنا چاہیئے آج۔" اس پہ دونوں ہنسنے لگے۔ فون اُٹھا کر روم سروس کا نمبر ملایا اور چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس وقت نیویارک میں پہنچے کے بعد رازی نے نیّا سے کہا۔

"اب نہا کے ٹب میں جا کر بیٹھ جاؤ، اپنی تھکاوٹ دور کرو اور پھر آرام کرو بلکہ سو جاؤ۔"

"اور تم کیا کرو گے؟"

"میں تمہاری خدمت کروں گا۔" اس نے لفظِ خدمت اس طرح ادا کیا کہ نیّا کو ہنسی گئی اور ساتھ ہی سُرور بھی آ گیا۔

"مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

"کہاں؟" نیّا بولی۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا؟ یہاں میرا دفتر ہے۔ مشتاق جو ہمیں ائرپورٹ پر لینے آیا تھا پارٹنر ہے۔ اس کے ساتھ جاؤں گا اور پھر شام کو چھ بجے لوٹ آؤں گا۔"

"چھ بجے؟" نیّا بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور چھ بجے تک میں یہاں تنہا رہوں گی۔"

"میں تو تمہیں آرام کرنے کا وقت دے رہا ہوں۔ بارہ بجے سے لے کر چھ بجے تک جی بھر کر سو لو۔ اس کے بعد میں سونے نہیں دوں گا۔"

"اور رازی۔" نیّا جلدی سے بولی۔ "پہلے کی طرح اگر تم غائب ہو گئے تو؟"

"اچھا۔ یہ اعتماد ہے تمہیں مجھ پر۔ بے وقوف کوئی اپنی بیوی کو بھی چھوڑ کر جاتا ہے؟" ایک دم احساس ہوا کہ وہ تو رازی کی بیوی ہے اور اس احساس نے اسے سرشار کر دیا۔

"ایک بات اور کہہ دوں۔ صحیح ٹائم بتا کر جا رہا ہوں، جونہی کمرے میں آؤں تم دلہن یہاں بستر پر بیٹھی رہو گی۔"

"دُلہن بن کر رازی۔"

"تو اور کیا دولہا بننا چاہتی ہو؟"

"اُف کتنا مضحکہ خیز لگے گا۔"

"کیوں بھئی۔ کیا میں اتنا ہی بھونڈا آدمی ہوں؟"

"نہیں رازی۔" نیّا نے اُٹھ کر اس کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ "دلہن بننا کیا ضروری

ت ضروری۔ میں تو آج رات اپنی بیوی کو دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔

نے کہا تھا، تم دلہن نہیں بنو گی تو میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔ تمہاری نہ سہی یہ میری خواہش

ہے۔ آخر میں نے کیا جرم کیا ہے کہ تم مجھے اس نظارے سے محروم رکھو۔ زندگی میں

شادی کی جاتی ہے۔" اس جملے پر نیّا چونک اٹھی۔ رازی کی تو یہ پہلی شادی تھی اور وہ

ن کے روپ میں دیکھنے میں حق بجانب تھا۔ نیّا خاموش ہو گئی۔

پھر کیا ارادے ہیں؟" رازی نے پوچھا۔

س طرح تم کہو گے۔"

ثابش۔" رازی مسکرایا۔

یرا کارڈ رکھ لو۔ اس پر میرے دفتر کا فون نمبر بھی درج ہے۔ گھبرانا مت، کسی شے

ت ہو ری سپشن پر فون کر دینا اور دوپہر کا لنچ کمرے ہی میں منگوا لینا۔"

آداب زیادہ انسٹرکشن نہ دو۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں پہلے بھی ان ہوٹلوں میں رہ چکی ہوں۔"

ہو بیگم صاحبہ میں تو یہ بھول ہی گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے رازی شرارت سے قریب آیا

غسل خانے میں گھس کر اندر سے کنڈی لگا لی۔

ٹھیک پانچ بجے کمرے میں لگے فون کی گھنٹی بڑی کرخت آواز میں ٹرن... ٹرن... بج اٹھی۔

نیّا گہری نیند سو رہی تھی۔ گرم گرم شاور کے چھینٹوں تلے بیٹھی رہی تو ساری تکان دور ہوگئی۔ نیم گرم پانی سے بھرے ہوئے جھاگ جھاگ ٹب نے اُس کے اعصاب کو راحت و سکون سے آشنا کیا۔ پانی میں بیٹھے بیٹھے ہی اس کی خوب صورت پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔ تب اُسے احساس ہوا کہ ان جفاکش ملکوں کے لوگ غسل خانوں میں ٹب کیوں لگاتے ہیں۔ جان توڑ محنت کے بعد کچھ دیر ٹب میں بیٹھنے سے کتنا سُرور آتا ہے اور ہاں تو غسل خانوں کے ٹب محض "سٹیٹس سمبل" کے طور پر لگواتے جاتے ہیں۔ اُس نے اکثر لوگ تو اُس کا استعمال بھی نہیں جانتے۔ نیّا نے وہاں بیٹھے بیٹھے سوچا کہ وہ پیارا سا آئیڈیل گھر بنوائے گی۔ جس کے غسل خانے بالکل ایسے ہی ہوں گے۔ زمین تو کے پاس تھی ہی۔ جس کا ذکر اس نے رازی سے کر دیا تھا اور اب وطن واپس جا پھر سوچتے سوچتے اُس کو اُونگھ آتی تھی۔ ٹب سے باہر نکل کر اس نے اپنی باتھ اور باہر نکل آئی۔ پھر جو بستر پر لیٹی تو اسے سدھ بدھ ہی نہ رہی۔

مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی کی دلخراش آواز نے جیسے اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دیا۔ جونہی زور لگا لگا کر کھولیں، گھنٹی بند ہوگئی۔

"دلیل۔" اس نے زیرِ لب یونہی گالی دی۔ "جانے کسے" اور پھر کروٹ لے کر سونے کی کوشش کی۔ اسی وقت دوبارہ گھنٹی بج اٹھی۔ وہ بھنّا کر اُٹھی، کمبل جھلاہٹ سے پرے پھینکا اور ریسیور اُٹھاتے ہی اُسے یاد آیا کہ وہ تو دوسرے ملک میں ہے باوجود ضبط کے اس کی جھنجلاہٹ لہجے سے واضح ہو ہی گئی۔

"ہیلو..." دوسری طرف رازی تھا۔

"غصّے میں معلوم ہوتی ہو۔"

"اور کیا گہری نیند سے جگا دیا۔" وہ بڑبڑائی۔

"شکر کرو ٹیلی فون کے ذریعے جگا رہا ہوں، اگر وہاں آکر جگاتا تو..." نیّا نے گھڑی دیکھی۔ "تم نے تو چھ بجے آنے کو کہا تھا اور ابھی پانچ بجے ہیں۔"

"احتیاطاً جگایا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم سو رہی ہوگی۔"

"تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"بول تو اپنے منہ سے رہا ہوں، مگر اس وقت میں دفتر میں ہوں۔ دفتر سے ہوٹل تک کا ایک گھنٹے کا ہے، سوچا چلنے سے پہلے تمہیں خبردار کر دوں تاکہ میرے آنے سے پہلے تم گھنٹے سے لیس ہو جاؤ۔"

"اگر نہ بھی ہوئی تو کیا؟"

"نہیں پتہ ہے نا یہ ہماری شادی کی پہلی رات ہے اور بہت سی گرہیں پہلی رات دلوں کی کھلتی ہیں اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ یہ میری خواہش ہے تم دُلہن بن کر بیٹھو۔" نیّا تھوڑی دیر چپ رہی پھر جھجکتی سی لے کر بولی۔

"یاد دہانی کے لئے شکریہ۔ واقعی میں تو بے سُدھ سو رہی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" نیّا نے ریسیور رکھ دیا۔ کھڑی ہوئی تو پھر جمائیاں آنے لگیں۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ رازی نے فون کر دیا۔ ورنہ وہ پڑی سوتی رہتی اور پہلی ہی رات کتنی بدمزگی ہو جاتی۔ اُسے رازی کی خواہش کا احترام کرنا چاہیئے۔ اُسے رازی پر بے طرح پیار آنے لگا۔ پہلے وہ غسل خانے گئی، منہ ہاتھ دھویا۔ پھر باہر نکل آئی۔ اب اُس کی نیند غائب ہو چکی تھی۔

اس کا عروسی جوڑا اور زیورات سوٹ کیس میں بند تھے اور سوٹ کیس کی چابی اس نے کوٹ کی جیب میں ڈال دی تھی۔ وارڈ روب کھولی تاکہ چابی نکالے، مگر وہ پٹ تھامے چپ سے کھڑی رہی۔ وہاں کوٹ نہیں تھا، رازی نے اس کے سامنے کوٹ یہاں لٹکایا تھا۔ جگر سارے ہینگر خالی تھے کوٹ کسی پر نہ تھا۔ جانے کوٹ کہاں چلا گیا؟

اُس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا، حتیٰ کہ غسل خانے میں بھی دیکھا۔ تعجب نہ کوئی آیا نہ گیا۔ ان ہوٹلوں کے کمروں میں بغیر اجازت کوئی اندر نہیں آتا اور سونے سے پہلے اس نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا تھا۔ خدا جانے رازی ہی کہیں کوٹ رکھ کے بھلا گیا۔ اب کوٹ کے ساتھ دوسری پریشانی چابیوں کی تھی۔ چابیاں نہ ملیں تو وہ کپڑے نہ بدلے گا۔ کپڑے نہ بدلے تو رازی بُرا مانے گا اور پہلی رات ہی بدمزگی ہو جائے گی۔ بار بار کرے گا۔ چیزیں اُٹھا اُٹھا کر تلاش کرتی پھر رہی تھی کہ اچانک اُس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی۔

وہاں اُس کے سوٹ کیس کی چابیاں پڑی تھیں۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" اُس نے جلدی سے چابیاں اٹھالیں۔ اُسے رازی کی یہ دن دار حرکت بہت اچھی لگی۔ غالباً وہی کہیں کوٹ رکھ گیا تھا اور احتیاطاً چابیاں میز پر رکھ گیا۔ غالباً اسی خاطر اس نے فون بھی کیا ہوگا کہ کہیں میں پریشان تو نہیں۔

رازی کتنا شاندار آدمی ہے۔ نیّا نے اُسے اپنے دل کے بیحد قریب محسوس کیا۔

رازی جب کمرے میں داخل ہوا اور نیّا نے گھوم کر اُسے دیکھا تو بس وہیں کھڑا کا کھڑا اور پھر آنکھیں جھپک جھپک کر بولا۔

اپنے قتل کا سامان تو میں نے خود کیا۔ خود تم سے کہا خنجر بدست آدم۔"

یکایک نیّا کو احساس ہوا کہ وہ دلہن بن کر کھڑی ہے اور دلہنوں والی شرم و حیا اُس بغاوت پھر سے پر چھا گئی۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

واقعی اُسے شرم آ گئی۔

اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ رازی نے ہاتھ میں پھولوں کا ایک خوبصورت گلدستہ پکڑا ہوا تھا۔ اُسے بستر پر پھینک دیا اور لپک کر قریب آیا۔

رنگ کے خوب صورت ترین لمحوں نے قریب آ کر دستک دی تو دونوں کے ہوش

بہت دیر بعد جب ہوش کا لمحہ آیا تو نیّا کو بولنے کی ہمت ہوئی۔

رازی میرا وہ سیاہ کوٹ کہاں ہے؟" رازی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ایک سایہ سا چہرے پر لہرایا تھا جسے نیّا نے صاف پڑھ لیا۔ مگر اس نے اپنا لائٹر نکالا اور سگریٹ

سُلگانے میں مصروف ہوگیا۔ پھر ایک کش لینے کے بعد ساری مستی آنکھوں میں سمو کر نیّا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"محبت کے لمحوں میں اُس منحوس کوٹ کا ذکر کیوں لے بیٹھی ہو۔"

"کوٹ منحوس کیسے ہوگیا رازی؟"

"اچھا اس وقت عجیب و غریب سوال کر کے میرا موڈ مکدّر کرنے کی کوشش نہ کرو، پلیز۔ اس وقت یوں لگ رہا ہے۔ جیسے میں فضاؤں میں اُڑ رہا ہوں۔"

"میرے خیال میں یہ لمبی فلائیٹ کا اثر ہوگا۔ رازی آنکھیں بند کئے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ دھواں چھوڑتا رہا۔ نیّا تھوڑی دیر اس کو دیکھتی رہی، پھر بولی۔

"رازی! تمہیں معلوم ہے بھوک کے مارے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

رازی نے جلدی سے اپنی گھڑی دیکھی اور پھر بولا۔

"ڈنر کا وقت ہو چکا ہے۔ ذرا روم سروس کو فون کر کے کھانا اوپر بھیج دیں۔"

"تم کیوں نہیں کرتے فون؟"

"میں اس وقت کچھ نہیں کروں گا۔ بتا دیا ہے۔ میں اپنی اس کیفیت سے باہر نہیں آنا چاہتا۔"

نیّا نے کھانے کے لئے فون کر دیا۔ دونوں کافی دیر چُپ چاپ لیٹے رہے۔

نیّا کا دھیان پھر کوٹ کی جانب چلا گیا۔ سوچتے سوچتے بولی۔

"آخر تم وہ کوٹ وہاں سے اُٹھا کر کیوں لے گئے، جب اُسے میرے لئے ہی لائے

"تم ہی نے تو کہا تھا کہ بہت بھاری ہے۔"

"لیکن وہ مجھے پسند آیا تھا، قراقلی کا کوٹ مجھے بے حد پسند ہے۔"

"اور لا دوں گا۔"

"اگر اور ہی لانا تھا تو وہی رہنے دیتے۔ آخر وہ تم کہاں لے گئے اور کس وقت

اس میں میری چابیاں تھیں۔"

چابیاں نکال کر میں نے میز پر رکھ دی تھیں۔"

ں نے دیکھ لی تھیں۔ اگر بروقت نہ دیکھ لیتی تو بھلا تمہارے آنے سے پہلے تیار ہو سکتی

پنا ہوا تیار ہو گئیں ورنہ۔۔۔۔"

ہ کیا؟ ابھی ایک رات بھی نہیں گزری اور تم شوہر بن کر مجھے ڈرانے لگے ہو۔"

ہوں گا تو میں تمہارا عاشق ہی، مگر ڈراتا دھمکاتا بھی رہوں گا۔"

ادی نکاح کے صرف دو بول مرد کا پول کھول دیتے ہیں۔"

نکاح کی مدتوں تم کرتی رہی تھیں۔ میں نے تو کہا تھا کہ معاملہ یونہی ٹھیک رہے گا۔"

رازی۔" نیّا نے تکیہ اٹھا کر رازی کے منہ پر دے مارا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی

ویٹر آیا تھا۔ نیّا اپنے لباس کو سمیٹتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ رازی کھڑا ہوا

نے دروازہ کھولا، میز پر کھانا لگوایا اور دروازہ بند کر دیا۔

کھانا دیکھ کر یاد آیا کہ مجھے بھی بھوک لگی ہے۔" نیّا اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی

اس نہیں دیکھ کر ضرور ڈر گئی تھی۔" رازی نے وارڈ روب کھول کر اس میں اپنا کوٹ لٹکایا تو

پنے کوٹ کا خیال آ گیا۔ کھڑی ہو کر بولی۔

آخر تم وہ کوٹ کہاں چھوڑ آتے ہو؟ کس کو دے آتے ہو؟"

تم آج رات اس واہیات کوٹ کے ذکر میں ہی برباد کرنا چاہتی ہو۔" رازی نے اتنی

سے کہا کہ نیّا لرز گئی۔ رازی کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ آئندہ نیّا کے منہ سے کوٹ

نہیں سننا چاہتا۔

ن اپنا سلیپنگ گاؤن اٹھا کر غسل خانے میں چلا گیا۔

ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی تھی، اُس کی نظر سامنے شیشے پر گئی۔ اُس نے اپنے سر پہ

ہوا گل ایک مُرجھا ہوا پھول لگ رہی تھی۔ مگر پھر بھی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ تر و تازہ پھول

کی پتیاں بکھیر دی جائیں تو وہ بھی اچھی لگنے لگتی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس نے اپنے کمرے کو کتنی پریت سے بنایا سنوارا تھا۔ مگر اب اِک اِک شے بکھر گئی تھی۔ حتیٰ کہ آنکھوں کا کاجل بھی پھیل گیا تھا۔ اُس نے غور سے آنکھیں کھول کر اپنا پھیلا ہوا کاجل دیکھنا چاہا تو جیسے آئینے کے اندر روزن کھلتے چلے گئے۔ دُور بہت دُور اس کی نظریں ماضی کے لپٹے ہوئے شبستانوں میں جھانکنے لگیں۔ جانے کیسے۔ جانے کس طرح لاشعور کا بند روزن کھلا اور شہباز دولہا کے رُوپ میں اس کے سامنے آگیا۔

وہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ، جو آفت تھی، قیامت تھی، بلا تھی۔ اُس کے گھونگھٹ کے پٹ آکے کھڑی ہوگئی۔

کیا زندگی یادوں کے طلسم سے کبھی آزاد نہ ہوگی؟ یادیں سود در سود بڑھتی رہیں گی۔ بعض باتوں کو، بعض وارداتوں کو مکمل طور سے بھلا دینے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔ انسان چاہتا ہے ان کے نشانات بھی کھُرچ دیئے جائیں مگر جس طرح چیچک کے پھوڑے کے نشانات کبھی نہیں جاتے، اسی طرح اوائل عمر کی یادیں عمر بھر لاشعور میں پڑی رہتی ہیں۔

غسل خانے کا دروازہ کھلا اور زاری اپنا سلیپنگ گاؤن پہنے باہر نکل آیا۔ اُس کو دیکھ کر نیّا نے اپنا غرارہ سمیٹا اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی جھروکے میں جا کھڑی ہوئی۔ شیشے کے پار دھند تھی اور اندر سفید پردہ بھیگا ہوا تھا۔ پھر بھی جیسے وہ باہر کی جانب دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ آج اندر نہیں باہر دیکھنا چاہتی تھی۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ زندگی میں دوسری بار دلہن بنے گی۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو کسی نے یہ دُعا نہ دی ہوگی کہ "اللہ تجھے دو مرتبہ دُلہن بنائے"۔

"آخر یہ اتنی بڑی گالی کیوں ہے"؟

جبکہ عین شرع کے مطابق ہے۔

مغربی ممالک کی خواتین بھی تو ہر سال شوہر صرف اس لئے بدل لیتی ہیں کہ ہنگامہ خیزی اور

جذبے سے ہمیشہ جوان رہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ بار بار دلہن بننے سے عورت جوان رہتی ہے۔

نیّا کو ایسے محسوس ہوا کہ آج کی رات ایک ننھی سی کانچ اس کے پہلو میں چُبھ گئی ہے۔

نیّا کو اسے موتی کا خیال آگیا۔ پتہ نہیں موتی کا مستقبل کیا ہوگا؟

بہرحال اسے تو موتی کا خیال رکھنا ہی ہوگا۔ موتی کے ساتھ ہی اور بھی بہت سی باتیں یاد آنے

ماضی دل نشین نہ ہو تو اس کے پٹ موند دیئے جاتے ہیں۔ پر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب زندگی میں تیز و تند ہوا کے جھونکے چلنے لگتے ہیں پٹ آپ ہی آپ کھُل جاتے ہیں۔

آج کی رات صرف محبتوں کے لئے تھی۔ محبتوں کی رات میں بھی کبھی کلیوں اور پھُولوں کے

کو سوچنے کا موقع ملا ہے شاید یہ اس شعور کی وجہ سے ہے جو اس نے زندگی سے حاصل

نیّا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

کیا وہ کچھ سال پہلے والی، لاابالی، ہلکی پھلکی، خوب صورت سی لڑکی نہیں بن سکتی؟ کتنی

نیّا نے زندگی کے چہرے پر۔۔۔ مڑ مڑ کے دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا رازی چپکے سے قریب

اس کی کمر میں بازو ڈال دیا۔

"کیا بات ہے جان، روٹھ گئی ہو؟" نیّا نے تو روٹھنے والی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ مگر

نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو چھُپانے کے لئے اپنی پلکیں جلدی جلدی جھپکیں۔

"چُپ کیوں کھڑی ہو؟"

"کیا کروں"؟ وہ آہستہ سے بولی۔ "ڈھول نقارے تو نہیں بجا سکتی نا"

"ڈھول نقاروں سے خود تمہیں نفرت تھی، ورنہ میں تو وہاں بھی بجوانے کو تیار تھا" نیّا نے

طرف پھیر کر اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"ڈھول نقارے تو میرا ماضی ہیں، میری دوشیزگی ہیں۔ میرا گذرا ہوا وقت ہیں۔ میں کیسے ان

کر سکتی تھی۔ اتنی دُور سے دوڑتی ہوئی آرہی ہوں، مڑ کر نہیں دیکھا۔ مبادا پتھر بن

جاؤں گی۔ آج ایک دم پتھر بننے کو کیوں جی چاہ رہا ہے؟"

"تمہیں تو بہت سخت بھوک لگی تھی"۔ رازی نے پوچھ ڈالا۔ "ہاں تم نے تو اجنبی نمک کو بھی نہیں کھایا۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتا ہوں"۔ نیّا نے گھبرا کر رازی کی طرف دیکھا کہ ہوا کے اندر جھکڑ چل رہے ہیں۔ یہ جو دُور کی آوازیں قریب سے آ رہی تھیں اور یہ جو ماضی کے بھوت اسے ڈرا رہے تھے کہیں رازی نے ان کی آواز تو نہیں سُن لی؟ مگر نہیں رازی چپ چاپ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے منہ سے ہرگز یہ فقرے نہ نکلے تھے۔ یہ فقرے جانے اتنی مسافت طے کر کے یہاں کیسے چلے آئے تھے۔ ایک دم بے بس ہو کر نیّا نے رازی کے کندھے پر سر رکھ دیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

"رازی مجھے اس عذاب سے بچا لو۔ اس مصیبت سے چھڑا لو"۔ رازی نے اُسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا اور بچوں کی طرح پچکارنے لگا۔

"اداس ہو گئی ہو؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ نیّا صرف روتی رہی۔ کوئی جواب نہیں!

"میں تم سے اتنی محبت کروں گا نیّا کہ تم ہر پچھلا غم بھول جاؤ گی"۔ نیّا نے گھبرا کر سر اٹھایا اور بے یقینی سے رازی کی آنکھوں میں دیکھا۔ کتنی دیر تک اُس کی آنسو بھری شکی آنکھیں رازی کی آنکھوں سے الجھی رہیں۔ رازی کی آنکھوں میں بڑا والہانہ پن تھا۔ محبت تھی، مستی تھی، ہونے کا مکمل وعدہ تھا۔ نیّا کے دل کو تسلّی ہو گئی۔ اُس نے دوبارہ اپنا سر رازی کے کاندھے پر رکھ دیا۔ رازی اس کے خوبصورت معطّر بالوں سے کھیلنے لگا۔

"تم نے مجھ پر اعتماد کیا ہے نیّا۔ میں تمہارے اعتماد کو ہرگز ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا"۔ کا دل چاہا کہ وہ بے اختیار کہہ دے۔

"اپنا دل چیر کے مجھے اس میں چھپا لو کہ میں تھک چکی ہوں اور مجھے باقی رکھنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے"۔

"تم نے کہا تھا نا کہ کوٹ بہت بھاری ہے پہنتے ہوئے تکلیف ہوئی اور میں نے

دیا"۔

یں دیا"۔ نیّا نے چونک کر اُس کے کاندھے سے سر اٹھا لیا۔ "کہاں پھینک دیا"؟

ر ندی پہ"۔

یہاں بھی اس طرح چیزیں پھینک دی جاتی ہیں؟"

پھینکنے والی چیزیں ہر زمین پہ پھینکی جا سکتی ہیں"۔

تمہیں اتنا غصّہ کیوں آیا"؟

نہیں جانتیں میں تم سے کس حد تک عشق کرتا ہوں۔ جس دن تم کہو گی، تم مجھے ستا رہے آپ کو بھی کہیں پھینک آؤں گا۔ خود اپنے ساتھ بھی یہی سلوک کروں گا"۔

زی"۔ نیّا کانپ اٹھی۔

ں بہت جذباتی آدمی ہوں"۔

رازی تم ہمیشہ میرے ساتھ رہنا۔ تمہارے بغیر تو میں زندہ رہنے کا تصوّر بھی نہیں

ی

ابھی نہیں سوچ سکتا۔ لیکن تم نے ابھی دیکھا نہیں کہ مرد عشق کی انتہا میں کہاں تک

ہے"۔

یا عشق کی کوئی اور انتہا بھی ہے؟" نیّا نے پوچھا

گی، تم نے تو ابھی عشق کی انتہا دیکھی ہی نہیں"۔

شادی کے بعد عشق ختم نہیں ہو جاتا؟"

ہو جاتا ہو گا کم ظرفوں کا، مگر ہم یہ سمجھیں ہی کیوں کہ ہم شادی شدہ ہیں"۔

یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟"

ہو سکتا ہے۔ ہے ایک طریقہ میں تمہیں بتاؤں گا"۔

تم مجھے کیا کیا بتاؤ گے رازی؟"

"تم سمجھتی ہو تم نے دُنیا دیکھ لی ہے، ایک زمانے سے لڑلیا ہے اب بہتر عورت ہو جبکہ تم نے تو زمانے کو ابھی جانا ہی نہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔"

"رازی!" نیّا نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دوسرے کیلئے جیتیں۔ ایک دوسرے سے ہی سروکار رکھیں، ہمیں دُنیا کو جان کر کیا لینا ہے اگر ہم ایک دوسرے کو جان گئے ہیں تو۔"

"یہ بھی ٹھیک۔" رازی ہنس پڑا۔ پھر اُسے اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر پلنگ تک لایا

"عشق کے دربار میں حاضری دینے کو ساری رات پڑی ہے۔ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔" پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اُس نے رومال اُٹھا کر اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کیا۔

"کچھ پیو گی؟" یہ کہہ کر رازی نے کمرے کی منی بار کا دروازہ کھولا۔

نیّا کانپ گئی۔ اس لئے نہیں کہ اندر سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا تھا۔ منی بار کے دروازے نے اس کے اندر پھر پٹ سے ایک دروازہ کھول دیا تھا۔ مگر اس بار وہ دل مضبوط کر کے بیٹھی رہی۔ اندر پیپسی کولا، سیون اَپ، جنجر ایل، کلب سوڈا جیسی بوتلیں بھی تھیں۔

"کیا لو گی؟" رازی نے پوچھا۔

"سیون اپ دے دو۔"

"وہاں بھی سیون اَپ۔ یہاں بھی سیون اَپ۔" رازی نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تو نیّا ہنس پڑی اور اُٹھ کر غسل خانے چلی گئی۔ جب واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ رازی نے سیون اپ کھول کر گلاس میں ڈال دی ہے اور اس میں ایک برف کا ٹکڑا بھی تیر رہا ہے۔ خود اپنے لئے وہسکی کی بوتل گلاس میں انڈیل رہا ہے۔

"یہ کیا کر رہے ہو رازی؟" وہ تیزی سے قریب آ کر بولی۔

"نشے کو دو آتشہ کرنا چاہتا ہوں۔" نیّا نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"...نے تو کہا تھا، تم نہیں پیتے۔"

"...وہاں کہا تھا جہاں پینا جرم ہے۔"

"...ہر جگہ زبان تو ایک سی ہوتی ہے۔"

"...ہاں میں، میں بہت تھک گیا ہوں۔"

"...دنیا میں تھکاوٹ دُور کرنے کا اور کوئی نسخہ نہیں؟"

"...اچھی خاصی محبوبہ سے ایک دم بیوی بننے کی کوشش کر رہی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ...ہی تھیں۔ آخر عورت بیوی بن کر تنگ دل کیوں ہو جاتی ہے؟"

"...بھی تو شوہر بن کے تنگ دل ہو جاتے ہیں۔"

"...نہیں ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ کراچی میں تمہارے بہت سے عاشق ہیں۔"

"...لئے تمہیں معلوم ہے کہ میں شریف عورت ہوں اور صرف تم ہی سے محبت کرتی ہوں۔"

...مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"...ایک بار پھر کہنا۔ کیا کہا تم نے؟"

"...ن کتنا خود پسند ہوتا ہے مرد۔ عورت کے منہ سے بار بار اظہار محبت چاہتا ہے۔"

"...ر عورت زندگی بھر کیا کرتی ہے۔ وہ بھی تو یہی چاہتی ہے کہ مرد ہر روز یہ کہے کہ تم کل ...سے بھی اچھی لگ رہی ہو۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے عورت کی عمر دن بدن ڈھلتی ہے۔ جوان نہیں

...آپ لوگوں کا کہنے سے کیا جاتا ہے؟"

"...خود پسند عورت ہے یا مرد؟"

"...رہے۔ کیونکہ جب ایک آدمی عورت سے سب کہہ دیتا ہے تو اسے قرار آ جاتا ہے۔ ...کے بعد تو اس کی خود پسندی ماما میں ڈھل جاتی ہے۔ مگر مرد کی خود پسندی کا پیمانہ کبھی ...شادی، بچے، کیریئر، کوئی شے اس کو قرار نہیں بخشتی یہ ہر دن اور ہر رات نئی عورت

سے مل کر اُس کے منہ سے ایک ہی بات سننا چاہتا ہے۔"

"کافی سیانی ہو تم۔" رازی ہنس کر بولا۔ "اس لئے مجھے اُمید ہے کہ تم مجھے ہر طرح خوش کی کوشش کرو گی۔"

"اچھا ایک گلاس پینے دو تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ خوب صورت باتیں کر کے تمہیں میں اُتار سکوں۔" نیّا کے دل میں جیسے سوئی سی چبھی، مگر اُس نے چہرے پر مسکراہٹ ہوتے کہا۔ "تم ویسے بھی بہت خوبصورت باتیں کرتے ہو رازی اور تمہاری باتوں نے مجھے اسیر کر دیا تھا۔"

"وہ تو تمہاری صورت کا اثر تھا۔ تمہیں دیکھتے ہی میری زبان سے پھول جھڑنے لگے اپنی بات کی نفی کر رہے ہو! میں سامنے ہی ہوں اور تمام تر تمہارے اختیار میں پھر بھی جھوٹی چیزوں کا سہارا لے رہے ہو۔"

"اس بات سے مار کھا گیا ہوں۔" نیّا نے جلدی سے اٹھ کر ساری بوتلیں دوبا میں رکھ دیں اور جو وہسکی اُس نے گلاس میں انڈیلی تھی اسے واش بیسن میں بہا کر بولی

"میرے ہوتے ہوئے تم شراب نہیں پی سکتے۔"

"بجو حکمِ حاکم۔" رازی انگڑائی لے کر کھڑا ہو گیا۔

"یار مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آئی۔" رازی بولا۔ "یہ عورتیں پڑھ لکھ کے اتنی ما بھی شراب کی مخالفت کیوں کرتی ہیں۔ بالکل نیم خواندہ لڑکیوں کی طرح جنہوں نے بچپ دیسی فلمیں دیکھی ہوتی ہیں اور اس میں ولین کو دیکھ کر شراب سے متنفر ہو جاتی ہیں کیوں ہوتا ہے؟"

"پتہ نہیں رازی؟ مگر میرا خیال ہے اس کی کوئی مذہبی وجہ ہو گی۔ کیونکہ میں مذ سے تعلق رکھتی ہوں، اس لئے ہمارے گھر میں شراب، سگریٹ کو بہت بُرا

"حالانکہ مہذب دنیا میں ان چیزوں کو آداب میں شامل کیا جاتا ہے۔"

دنیا ہی سے تو کینسر جیسی بیماریاں بھی آتی ہیں۔"

رات کو مزید بھیانک نہ بناؤ اس کے تذکرے سے۔" نیّا اس کے قریب آ دونوں کھانا کھانے لگے۔ نیّا کو پھر مدتوں پہلے کی رات یاد آنے لگی تو اس نے اپنا نے کے لئے رازی سے مسلسل باتیں کرنی شروع کر دیں۔

جانتے ہو رازی عورت شراب کو اپنی سوت کی طرح سمجھتی ہے۔"

آخر؟" رازی بولا۔

چیز سے اتنی نفرت نہیں کرتی، جتنی شراب سے کرتی ہے۔"

تو میں کہتا ہوں کہ اس پر بچپن کی دیکھی ہوئی فلموں کا اثر ہوتا ہے۔"

کا اثر کہہ لو یا گھروں میں سُنی ہوئی سینہ بہ سینہ داستانوں کا اثر سمجھ لو۔ عورت سمجھتی کی جڑ شراب ہے۔ پہلے پہل مرد تھکاوٹ کا عذر کر کے شراب پیتا ہے۔ پھر شراب وہ تفریح کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ شراب کے نشے میں وہ سوچنے سمجھنے عاری ہو جاتا ہے اس لئے اُس کے قدم غلط سمت اُٹھنے لگتے ہیں۔ وہیں سے گانے اور نائٹ کلبوں کی لت پڑ جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے بیوی بچوں متنفر ہو جاتا ہے۔"

سمجھتی ہو؟"

دوسری عورتوں سے الگ تو نہیں ہوں۔ میں سمجھتی ہوں، شراب کی لت مرد کو ایک بے حسی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ پہلے اُس کا ضمیر مرتا ہے، پھر دل مرتا ہے اور ہے اور جس مرد کے پاس یہ تینوں چیزیں نہ ہوں، وہ کسی شریف عورت کا ملتا۔ پھر وہ زندگی بھر کھلاڑی عورتوں کے ہاتھ میں گیند بنا اُچھلتا رہتا ہے۔"

زور سے ہنسا۔ "تالی نہیں بجا سکتا کیونکہ کھانا کھا رہا ہوں۔ ویسے ایک برے پلّے کچھ نہیں پڑا۔"

"نہ پڑے۔ مگر میں تمہیں کبھی پینے نہ دوں گی۔"

"اگر میں اس بات کا وعدہ کروں کہ تمہارے پاس بیٹھ کر پیوں گا اور جتنی تم کہو گی اتنی ہی؟
اور کھلاڑی عورتوں کے ہاتھوں گیند بننے کی بجائے تمہارے ہاتھ کا بلا بننا پسند کروں گا تو؟"
نیا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تو بھی نہیں۔ تو بھی نہیں حضور۔"

"وعدہ کرو۔" اس نے رازی کا ہاتھ تھام لیا۔ "کبھی نہیں پیو گے۔ کبھی نہیں۔"

"بھئی سالن والے ہاتھ سے کیسے وعدہ کر سکتا ہوں۔ ہاتھ تو چھوڑو۔"

"تو تمہارے من میں چور ہے۔"

"اے جی۔ میرے تو تن میں بھی چور ہے۔"

"جاؤ! میں نہیں بولتی۔"

"کروں گا وعدہ کروں گا۔" وہ ہاتھ چھڑاتے ہوتے بولا۔ "کھانا تو کھانے دو۔ ابھی
کئی وعدے کرنے ہیں، وعدے لینے ہیں۔ کیا سب کچھ آج رات ہی ہو گا؟"

"لیکن ایک بات یاد رکھنا، میں تمہیں شراب پینے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی
"اپنی آنکھوں سے بھی نہیں پینے دو گی۔" نیا چپ رہی۔

جو اہلِ دل ہیں بڑھاتی ہے آبرو اُن کی
جو بے شعور ہیں ان کو خراب کرتی ہے

لہک لہک رازی نے اسے شعر سنایا مگر نیا چپ بیٹھی رہی۔

"شعر کی داد تو دے ظالم۔" رازی نے اسے پاؤں سے چھو کر کہا۔

"مجھے ایسے شعر پسند ہی نہیں۔"

"اچھا اب یہ برتن ہٹاؤ۔۔۔۔ اور۔۔۔۔" نیا نے اس کی جانب دیکھا۔ اس
میں شرارت بھری تھی۔

مجھے ہٹانے ہیں؟"

لے؟"

ن محبت کروں گا اور کچھ نہیں کروں گا۔" نیا کھڑی ہو گئی۔ اسے ایک دم یاد آیا،
تی نویلی دلہن نہیں ہے۔ ایک بازی ہار چکی ہے اور اب اس حقیقت کو تسلیم

موسم میں رم جھم کی خوشبو تھی اور آسمان سے زمین پر رنگ اُتر رہا تھا۔ نیّا نے دوبارہ آنکھوں سے لگالی اور قدرت کی صنّاعی کو دوبارہ دیکھنے لگی۔ قدرت کی صنّاعی اور انسان کاری گری۔

"یہ کیا بات ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے حسین موسم بھی ان لوگوں کو دیئے۔

"خوب صورت جنّت نگاہ نظارے بھی انہیں انہی کو دیئے۔ اور پھر عقل..... کیا ساری انہیں کو دے دی؟"

"ساری باتیں روٹی کی ہیں بیگم۔ جب پیٹ بھر کر کھانا مل رہا ہو تو پھر ذہن جنّت اور کے سوا کیا کر سکتا ہے۔" نیّا نے روئے زمین پر اس سے حسین منظر نہیں دیکھا تھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے وہ نیاگرا میں تھے۔ جس ہوٹل میں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے کی بالکنیاں نیاگرا آبشار کی جانب کھلتی تھیں۔ دوربین نہ بھی لگائیں تو آبشار کا منظر بالکنی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ نیّا دن میں کئی بار اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس بالکنی میں آکھڑی ہوتی تو آبشار کا منظر دودھیا رنگ کا ہو جاتا۔ صبح کے اجالوں میں آبشار کے اونچائی سے گرنے

کی جھپاہٹ جیسی نغمگی معلوم ہوتی۔ سارا پانی، ساری دھاریں، ساری لہریں دودھ کی معلوم ہیں زرد کے رنگ کے پتھروں پر کسی نے دودھ انڈیل دیا ہو۔

پھر جب سورج طلوع ہونے لگتا تو دھاروں کے رنگ بدل جاتے۔ آبشار پر یوں نکھار آتے جیسے نوخیز کلی جوانی کی طرف بڑھ رہی ہو۔ گلابی سُرخ، نارنجی، بنفشی، کاسنی، کیسے کیسے آبشار بدلتا رہتا ہے۔ جو کھڑا تو اپنی جگہ پر تھا مگر شعاعوں کے ساتھ سفر کرتا محسوس ہوتا ہاں پر اُودے، نیلے بادل چھا جاتے تو پھر نیاگرا فال کا منظر دیدنی ہوتا۔ دونوں کناروں پر اتنی قوس قزح بن جاتی جیسے کسی حسین گوری نے دھنک رنگ ہالا پہن لیا ہو اور پورے آبشار ہالے بن جاتے۔ بڑا ڈالگس، چھوٹی قوس،

ہے ہمارا خالق۔ اسی لئے تو اُس نے اتنی حسین چیزیں بنا ڈالی ہیں۔ ن اتنی حسین ہے تو آسمان کتنا خوبصورت ہوگا۔ نور ہی نور ہوگا وہاں۔ رنگ ہی رنگ ہوگا وہاں۔ ھدا کی یہ بارات یہاں انسان نے خود زمین پر اتاری تھی۔ جب رات آتی تو نیاگرا کے نغمہ ریز ر ہر لمحہ بدل جاتا۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی اس پر نئے نئے رنگوں کی بارش ہوتی اسے زیادہ خوب صورت بناتے کے لئے ایک مناسب فاصلے سے مختلف رنگوں کی روشنیاں جلائی جاتیں۔ کبھی آبشار نیلم پری تھا تو ابھی گلابی ہو گیا۔ پانی گلابی۔ چھینٹے گلابی۔ لہریں۔ پھر ہو گیا۔ منہ اسرا سارا ماحول۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے آبشار دوبارہ سبز ہو گیا۔ پھر ایک دم ہو گیا۔ لوگ والہانہ طور پر آبشار کے اردگرد کھڑے رہتے۔ دوربینیں۔ کیمرے فلیش

اس سرزمین پر کیا کچھ نہ تھا اور اسی سرزمین پر آ کے نیّا کو جنّت کا مطلب سمجھ میں آیا تھا وہ ہنی مون پر ماہ سے سفر پر تھے۔ امریکہ۔ پیرس، سوئٹزرلینڈ، سویڈن، جرمنی گھوم کر کنیڈا آ ئے تھے۔ ساری حسین دُنیائیں دیکھی تھیں۔ نیّا نے، مگر نیاگرا فال کو دیکھ کر دم بخود ہی ہو گئی تھی ہ قدرت، گاؤں کی البیلی کی طرح سیدھی سادی اور سچی کھری نظر آ رہی تھی۔ اوّل تو وہ لوگ ہو جاتے اور ہنی مون کپل کو دیکھا کرتے۔ مگر جب نیّا اپنے کمرے میں آجاتی تب

بھی زیادہ وقت بالکنی میں بیٹھ کر گزارتی۔ اسے دور بیٹھ کر تنہا تنہا نظارہ کرنے میں بہت مزا آتا۔ وہ ان لوگوں کو بھی دلچسپی سے دیکھا کرتی جو اپنے اپنے محبوب کی کمر میں بازو ڈالے اس بھرے مجمع میں تنہا ہو جاتے۔

دُنیا کتنی حسین ہے۔ وہ سوچا کرتی۔ اور پھر جب اپنی دُنیا حسین ہو جائے تو ہر طرف ہی حُسن بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ رازی نے اس کے ساتھ جی جان سے محبت کی تھی۔ ساتھ رہنے لئے پھرتا تھا۔ خوب صورت دنیا دکھا رہا تھا۔ ڈھیروں پیسے خرچ کر رہا تھا۔ بے شمار شاپنگ کرواتا۔ وہ اس آزاد دنیا کی خوب صورت سرزمین پر یوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے گھوما کرتے جیسے کہ انہیں صرف عشق کرنے کے لئے زمین پر بھیجا گیا ہو۔ نیا آرزو کرتی اور رازی پوری کی طرح ہر چیز مہیا کر دیتا۔ لالچی عورتوں کی طرح ہر ہر شے پر نیا کی محبت کی مہر لگ جاتی اسٹور میں گھس جاتی تو پھر بھول جاتی کہ اس کی اوقات کیا ہے۔ مگر رازی ماتھے پر بل ڈالے بغیر اس کے بل ادا کرتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ دھڑکتے دل کے ساتھ رک جاتی اور مڑ کر رازی کا چہرہ دیکھتی۔ کیا یہ چہرہ سدا ایسا ہی رہے گا۔

"کیا بات ہے؟" رازی پوچھتا۔

"رازی تم ہمیشہ میرے ساتھ اسی طرح محبت کرتے رہو گے؟"

"پاگل، محبت کے انداز بدلتے رہیں تبھی محبت میں دلکشی رہتی ہے۔ ایک ہی انداز سے محبت کرتے رہو تو اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے، محبت تو ختم نہ ہو جائے گی۔"

"اگر یہ دنیا ختم ہو گئی تو میری محبت ختم ہو جائے گی۔ مگر میری ایک بات یاد رکھو محبت کے تقاضے پورے ہوتے رہیں تو میاں بیوی کے درمیان ہمیشہ محبت والا رشتہ رہتا ہے۔"

"محبت کے تقاضے کیا ہوتے ہیں رازی؟"

"تمہیں رفتہ رفتہ سمجھاؤں گا۔ محبت کا امتحان کڑا امتحان ہوتا ہے اور عام طور

پر اس میدان میں بودی ثابت ہوتی ہیں۔"

"میں۔" نیا نے حیرت سے کہا۔ "شاید تم غلط کہہ گئے ذرا مجھے اشارہ تو کرو میں اپنی جان پیش کر دوں۔"

"بھلا کوئی اشارے سے بھی جان قربان کرتا ہے۔"

"کہہ کے تو دیکھو۔"

"پگلی جان کی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی۔ ویسے عورت میں اپنے آپ کو قربان کرنے کا جذبہ ہونا چاہیئے۔"

"اپنا آپ جان سے الگ ہوتا ہے کیا؟"

"ہاں۔"

"کبھی کبھی تم بڑی الجھی ہوئی باتیں کرتے ہو؟"

"میں نے بہت زمانہ دیکھا ہے نا۔"

"اور میں تمہارے ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہتی ہوں۔" نیا دوڑ کر اس کے قریب آجاتی اور پھر وہ تیز تیز قدموں سے رواں ہو جاتے۔

اس تیزی میں لذت بھی تھی۔ دوڑ رہے تھے، ہانپ رہے تھے۔ مگر اب نیا کو یوں احساس ہونے لگا تھا۔ جیسے وہ تھک گئی ہے۔ تفریح سے بھی آدمی تھک جاتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے مسلسل محبت سے ہی تھک جاتا ہے۔ کئی سالوں سے نیا کی زندگی ایک ہی نہج پر گزر رہی تھی اس لئے اسے کام کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ مگر یہاں آرام بھی تھا اور باقی بچی زندگی جانے کب وطن جانا ہوگا۔ ورنہ وہ تو اسی دنیا میں کہیں کھو جاتے گی۔ رازی نے ایک بار پوچھا تھا۔

"نیا کیا تم امریکہ میں رہنا چاہتی ہو؟"

نیا نے اس کے ہر بار جواب دیا۔ "مجھے یہاں رہنا پسند نہیں۔ سیر و تفریح کے لئے یہ

ملک ٹھیک ہے، مگر رہنے کے لئے اپنا ملک اچھا ہے۔"

"اچھا تو تمہیں میرو تقریب کے لئے ہر سال لایا کروں گا۔"

"ہائے اس سے اچھی کیا بات ہوگی۔"

"مگر میری ایک شرط ہے۔"

"کیا؟"

"پھر بتاؤں گا۔"

"یہ ہر بات تم پھر پہ کیوں ٹال جاتے ہو۔ مجھے تمہاری یہ بات اچھی نہیں لگتی۔"

"اصل میں میں قبل از وقت کوئی بات کہنے کا قائل نہیں ہوں۔ جس وقت جس بات کا موقع ہو کہتا ہوں۔"

"چاہے سننے والا جان سے جائے۔"

"حوصلہ ہے تو انتظار بھی کرے گا۔"

"انتظار تو زندگی بھر بھی کیا جا سکتا ہے رازی، مگر ہمارے پاس وقت کتنا ہے۔"

"بہت وقت گنوا دیا ہو تو نفرتیں زندگی سے نکال کر صرف محبتوں کی بات کرنی چاہئے۔"

"اچھا فلسفہ ہے اگر اس پر عمل کیا جائے۔"

"میں تو وہی بات کہتی ہوں جس پر عمل کر سکتی ہوں۔"

"اسی لئے میں تمہیں پسند کرتا ہوں، تم بہادر عورت ہو۔" نیا نے دوربین اپنی آنکھوں سے ہٹا لی۔ آسمان سے آبشار پر رنگ اتر رہے تھے اور نیچے نظارہ زیادہ دلکش ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ رازی کافی دیر بیٹھا پی رہا تھا۔

یہ بھی عجیب بات ہوتی۔ پورے سفر میں رازی پینے کی ضد کرتا رہا اور وہ انکار کرتی رہی۔ تابہ کے ایک کمزور لمحے میں اس نے اپنی بات آخر منوالی۔

ہاں عورت مجبور ہو جاتی ہے۔ نیا نے دل میں سوچا۔ اگر آج میں اسے اجازت نہیں
ی تو کل چوری چوری پیئے گا۔ کسی اور کے پاس جا کے پیئے گا، اب تو وعدہ کر رہا ہے
ے ہاتھ سے پیئے گا، میرے قریب بیٹھ کر پیئے گا۔

تم جانتی ہو۔ وہاں اپنے ملک میں تو اجازت ہی نہیں۔ پھر یہاں میرا سفر کیوں برباد کرتی
ی جوانی کے صدقے میں اپنے ہاتھ سے پلاؤ۔" نیا کچھ دیر گم سم بیٹھی رہی۔ زندگی میں وہ
چھ نہیں ہوتا جو ہم سوچتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ سفر کے پہلے مرحلے میں ہی زندگی میں دراڑیں
ں۔

اجازت دینے کے باوجود میں اسے پسند نہ کر سکوں گی رازی۔"

مجھے تو پسند کرتی رہو گی نا؟"

ہاں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اسی لئے وہ اسے شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھ
ی۔ اُسے شراب کی بُو زہر لگتی تھی۔ جب بھی رازی پینا شروع کر دیتا وہ اِدھر اُدھر ہو
ب بھی کافی دیر سے وہ بالکنی میں بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی۔

بھی باتیں اپنی مرضی کے مطابق تھوڑی ہوتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں لچک رکھنی پڑتی
بیٹھے بیٹھے کتنی گھڑیاں بیت گئیں۔ وقت دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔
یا!" رازی نے اپنی بوجھل آواز میں اسے پکارا۔ "نیا!" مگر وہ یوں آنکھیں موندے بیٹھی
ے کچھ سنا ہی نہیں اور پھر لڑکھڑاتا ہوا رازی خود باہر نکل آیا۔

لیا ہے تم سو گئی ہو کیا؟" نیا پھر بھی نہیں بولی۔

اگر بالکنی سے نیچے پھینک دوں گا۔" اس پر نیا کھلکھلا کر ہنس دی۔

کب سے بلا رہا ہوں کیا ہوا ہے؟"

یہاں بیٹھ کر ذرا نظارا کرو۔ دیکھو رات کتنی خوب صورت ہوتی جا رہی ہے۔" نیا
ہری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"اندر رات زیادہ خوب صورت ہے۔ اندر چلو۔"

"آؤ بیٹھو تو سہی۔" اس نے رازی کا ہاتھ پکڑ کے زبردستی اسے بٹھا لیا تو رازی اپنی مدہوش آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"تمہارے سوا اس رات میں مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔" نیّا ہنسنے لگی۔ یہی ایک ادا رازی کی پسند آئی تھی کہ پینے کے بعد بڑے واشگاف الفاظ میں اظہارِ محبت کرنے لگتا تھا۔ نیّا کو ساتویں آسمان پہ پہنچا دیتا۔

"رازی! ہم گھر کب چلیں گے؟" نیّا نے اچانک پوچھ لیا۔

"کیا تم اداس ہو گئی ہو؟"

"ان ہوٹلوں کے ماحول سے اُکتا گئی ہوں۔"

"حالانکہ اکثر عورتیں ہوٹلوں کا ماحول پسند کرتی ہیں۔"

"تم اکثر عورتوں کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟"

"بس بن گئیں نا تم بیوی۔ میں کہتا ہوں محبوبہ رہا کرو۔ محبوبہ، ظالم کی بچی۔ بیوی بن کر بدصورت لگنے لگتی ہو۔" نیّا ہنسنے لگی۔

"اچھا تو کب چل رہے ہو رازی؟ پہلے تو آوارہ پنچھی تھے۔ جس ڈال پہ بیٹھ گئے اسی پہ بسیرا کر لیتے، جہاں سے دانہ دنکا ملتا چُگ لیتے۔ مگر اب تو آشیانہ بنانا پڑے گا۔ ہے نا؟" نیّا نے رازی کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"تو اس کی تدبیر بھی کرنی ہو گی۔"

"ضرور کرنی ہو گی۔"

"تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے۔ تمہیں اس سے کیا؟"

"تو میں کیا کروں رازی! میں کچھ کر سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ دُنیا میں جتنے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے۔"

"تو تم کرو۔" نیّا نے والہانہ پن سے کہا۔ "جو کہو گے کروں گی۔"

"اپنی بات یاد رکھنا۔"

"لکھ کے دے سکتی ہوں۔ ویسے تم واپس جا کے کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"یہی سوچ رہا ہوں۔ ایک دم سے کئی کاموں میں ہاتھ ڈال رکھا ہے۔ وہاں میں ایک فنانس کنسول کر آ رہا ہوں۔ پہلے ایک ٹریول ایجنسی تھی۔ یہاں کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر ہم قالینوں اور ہینڈی کرافٹس کے ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں گا؟"

"ایک ہی کام کرو اور دلجمعی سے کرو۔"

"ہر کام کے لئے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے نیّا اور تم جانتی ہو پیسہ اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔"

"اماں بھی یہی کہتی تھی۔" نیّا نے پھر آہستہ سے کہا۔ "ہاں"۔ اور تھوڑی دیر بعد بولی۔

"رازی پیسہ تو کمایا جاتا ہے۔ پیسے کے لئے محنت کی جاتی ہے۔ پیسہ چرایا نہیں جا سکتا۔ چرایا ہوا پیسہ آدمی کے نصیب نہیں چرا سکتا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔۔ مگر بہت عرصہ درکار ہے۔ ان باتوں کے لئے اور اب میں تھک رہا ہوں۔"

"ابھی سے؟"

"ہاں۔ اگر مجھے کچھ روپیہ مل جائے تو میں وطن واپس جا کر ایک بہت بڑا ہوٹل بنا لوں۔"

"ہوٹل؟"

"ہاں۔ آج کل ہوٹلوں سے بہت آمدنی ہوتی ہے۔ تم نے تو دنیا کے بڑے بڑے ہوٹل دیکھے ہیں۔ ایسا ہی اسٹینڈرڈ کا ہوٹل وہاں بنا لوں تو میری نسلیں بھی بیٹھ کر کھا دیں گی۔"

"تو بنا لو۔"

"واہ۔ کتنی آسانی سے کہہ دیا، بنا لو۔"

"کبھی سوچا ہے تم نے اس قسم کے ہوٹل کو بنانے کے لئے کتنے کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں۔"

"بینک سے قرض لے لو۔"

"اس قدر قرض کس برتے پہ لے لوں۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

ایک چھوٹی سی اسکیم ہے میرے پاس۔"

"کیا؟"

"اگر تم میرا ساتھ دو تو۔"

"دوں گی۔"

"سوچ لو، عورت کی بات میں وزن نہیں ہوتا۔"

"میں مختلف قسم کی عورت ہوں۔" رازی نے آنکھیں اچھی طرح کھول کر نیا کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

"چلو اندر چل کر باقی باتیں کرتے ہیں۔"

رازی جب کمرے میں داخل ہوا تو نیا نے جلدی سے پوچھا۔

"تمہاری میٹنگ کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی تھی؟"

رازی نے کوٹ اتار کر ہینگر پر لٹکایا۔ "یہ کاروبار ہیں جانِ من۔"

"واپسی کی سیٹ کا کیا بنا؟"

"جائے گی۔"

"کب جا رہے ہیں؟"

"کل ہیں کو۔"

"تو ایک مہینہ پڑا ہے۔" نیا نے منہ بنا کر کہا۔

"میں اپنے کام ادھورے چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا۔" نیا نے بدمزگی سے کروٹ لے کر دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ اس سفر سے تھک گئی تھی اور موتی کے لئے اداس تھی۔ امی کے لئے فکرمند تھی۔ مگر کھل کھلا رازی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ ایک اور بات بھی تھی۔ امی کا کلمنڈر رہتا تھا۔ یہ خوب صورت کالی اسے دنیا سے بے زار کئے دے رہی تھی کہ بھید کھلنے سے پہلے واپس چلی جاتے۔

"میرا خیال ہے تمہیں آرام و چین راس نہیں آتا۔" پتہ نہیں رازی نے کس انداز سے کہا نیا سمجھ نہ سکی۔ بس مڑ کر اس کو دیکھنے لگی۔

"نوکری کی عادت پڑ گئی ہے نا؟" رازی آ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"تم بھی کوئی نوکری کر لو۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں، بیوی جو ہوتی ہے نا وہ بے چاری روٹی کپڑے کے عوض زندگی بھر کی غلام بن جاتی ہے۔"

"اچھا! میرا خیال اس کے برعکس ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"روٹی کپڑے کے لئے وہ ایک مرد کو ہمیشہ کے لئے ملازم رکھ لیتی ہے۔"

"صرف روٹی کپڑے کے لئے؟" نیا نے ذو معنی الفاظ میں کہا۔ اس پر دونوں بے تحاشہ ہنسنے لگے۔ مگر نیا نے محسوس کیا کہ ہنسنے کے باوجود رازی کے چہرے پر تردد اور الجھن کے کچھ سائے ہیں، وہ کچھ کہنا چاہتا ہے اس لئے اُس نے اُسے کہنے پر اکسانے کا ارادہ کر لیا۔

"ہاں تو کون سی نوکری دے رہے ہو مجھے؟"

"ہوں۔" وہ ایک دم چونکا۔ "واقعی تم کام کرو گی؟"

"ضرور کروں گی۔" تھوڑی دیر رازی خاموش رہا پھر جیسے سوچ سمجھ کر بہت احتیاط سے

"دنیا میں ایک ہی حقیقت ہے اور وہ ہے روٹی۔" اس نے سگریٹ سلگا کر پھر نیا کی طرف دیکھا۔ "پیٹ بھر کر روٹی مل رہی ہو تو ساری دنیا حسین نظر آتی ہے۔ کھانے کی میز بھری ہو تو اصول، مقاصد، نصب العین واضح صورت میں نظر آتے ہیں اور ان کے بارے میں اونچی اونچی باتیں کرنے میں مزا آتا ہے۔ لیکن جب گھر میں مفلسی ہو اور پیٹ میں ایک دانہ بھی نہ ہو تو دنیا کی صورت ہی بدل جاتی ہے۔

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔" نیا نے ہنس کر کہا۔ "میں نے مفلسی کے دن بھی دیکھے ہیں۔"

"تب تو تمہیں پیسے کی قدر و قیمت کا بھی علم ہو گا۔"

"ہے۔" نیا بولی۔

"انسان کی زندگی صرف پیسہ ہے۔ ہر فرد دنیا میں اس پیسے کی دوڑ میں شامل ہے، جو غریب ہے امیر ہونا چاہتے ہیں اور جو امیر ہیں وہ مزید امیر ہونا چاہتے ہیں۔

"دولت ہے۔"

"پیسے کی طلب کرنا یا اس کے پیچھے دوڑنا عیب تو نہیں؟"

"بالکل نہیں۔"

"پیسہ جس طرح بھی کمایا جائے اس میں محنت اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ضرور ہوتی ہے۔" نیا بولی۔

"اور بات ہے کہ ہر فرد اپنے مزاج کے مطابق پیسہ کمانے کے راستوں کا انتخاب کرتا ہے۔" یہ بات نیا کی سمجھ میں نہیں آئی اس لیے اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رازی بھی سگریٹ کے دو تین کش لگا کر دھواں فضا میں چھوڑتا رہا، پھر کافی دیر بعد بولا۔

"میں جو کام کرتا ہوں اس میں مجھے ایک پڑھی لکھی، ذہین اور وسیع القلب شریک زندگی کی ضرورت تھی۔ زندگی کا کاروبار ہو یا دوسرا، ذہین عورت آدمی کا آدھا بوجھ اٹھا لیتی ہے اور بعض اوقات پورا بوجھ بھی اُسے اٹھانا پڑتا ہے۔" وہ رک گیا۔ "مجھے کھود کرید کرنے والی عورتیں پسند نہیں۔ میں تمہیں اچھی زندگی دینا چاہتا ہوں۔ دوسرے معنوں میں موتیوں اور ہیروں میں رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتماد کرو اور اندھا دھند میرے ساتھ چلو۔" نیا کا دل دھڑکنے لگا، اس کے اندر گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر مدھم سی آواز میں کہا۔

"میں تم پر اعتماد کرتی ہوں رازی! اندھا اعتماد۔" رازی پر کوئی ردِ عمل نہیں ہوا۔ وہ خاموش رہا پھر بولا۔

"عورت کی ذرا سی بے وقوفی، جہالت یا بحث و تکرار مرد کو بڑی سے بڑی مصیبت میں گرفتار کر سکتے ہیں ہے نا؟"

"ہاں۔" نیّا نے صرف سر ہلا دیا۔ ابھی وہ کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ اس واسطے خاموش رہی۔

"میرے ساتھ رہنے کا ایک الگ انداز ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ پلٹ کر مجھ سے سوال کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں جب میں کہوں چلو، تو چل پڑو، میں کہوں رُک جاؤ تو کھڑی ہو جاؤ۔" نیّا خاموش رہی۔

"دنیا میں کیا اچھا ہے کیا بُرا ہے، یہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ ایک عورت کو دنیا میں کیا چاہیئے۔" تھوڑی دیر بعد بولا۔ "عزّت و آبرو کی زندگی اور زندگی کی ہر آسائش۔ اس کو ہمیشہ خوش رہنا چاہیئے۔ یہ آسائش اُسے کیسے اور کہاں سے حاصل ہوتی ہے، نہیں پوچھنا چاہیئے کیونکہ کچھ کام صرف مرد کے ہوتے ہیں۔"

"مگر مجھے کرنا کیا ہوگا رازی؟" نیّا نے آہستہ سے یوں کہا جیسے کوئی اور نہ سُن لے۔

"تم کبھی کبھی میرے ساتھ سفر کرو گی اسی طرح جس طرح میں کہوں گا۔ کبھی میری بیوی بن کر کبھی ایک ہی جہاز میں بالکل اجنبی بن کر۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکے گا رازی؟" نیّا ایک دم سے بولی۔

"یہ سوچنا میرا کام ہے۔" وہ بیگانگی سے بولا۔ "میں نے تمہارا ایک امریکن پاسپورٹ بنوایا ہے۔ جس پر تمہارا آدھا نام درج ہے۔ یعنی "نیا خواجہ"۔ اور دوسرا "ناپاب رازی" کے نام سے ہے۔"

"مگر اس سے تمہارا مقصد کیا ہے رازی؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے کہا تھا کہ مجھے ایسی بیوی پسند نہیں جو خواہ مخواہ محبت کرے۔ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ چلو تاکہ مجھے اندازا ہو جائے کہ تم واقعی مجھ سے پیار کرتی ہو۔" نیّا نے جیسے اپنی سانس روک لی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھ کر رازی بولا۔

"تم نے اس روز کہا تھا تم میرے ایک اشارے پر جان قربان کر سکتی ہو۔"

"ہاں مگر جب پتہ ہو کہ تم صحیح اشارہ کر رہے ہو۔"

"نہیں۔" رازی نے کرختگی سے اُسے ٹوکا۔ "عشق کی انتہا وہ نہیں یہ ہے اور یہی میں چاہتا ہوں۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر میرے پیچھے چلی آ رہی ہو تو میں سمجھوں گا کہ تم صحیح معنوں میں مجھ سے عشق کرتی ہو۔ مشکلات میں میرے ساتھ قدم ملا کر چل سکتی ہو پھر میں زندگی بھر تم پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ یہی میاں بیوی کے درمیان ہمیشہ برقرار رہنے والی محبت کے وہ اصول ہیں جن کا میں نے ایک دن حوالہ دیا تھا۔ تمہیں میرے نظریات سمجھ میں آ جائیں تو میں زندگی بھر تمہارا ہوں گا۔"

"رازی۔" بہت دیر کے بعد ڈوبتے اُبھرتے لہجے میں نیّا نے کہا۔ "یہ تو سودے بازی ہوئی محبت کون کہتا ہے۔"

"محبت کا دوسرا نام ہی سودے بازی ہے اور شادی محبت کا پہلا سودا ہے۔" اس پر خاموشی ہو گئی۔ اس کے ذہن میں کچھ اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ مگر انہیں صبر سے دبا گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس مرحلے پر وسوسے سر اٹھائیں۔ زندگی کا کتنا خوب صورت جہاں اس نے دیکھا تھا۔ اس لئے وہ ایک پل میں اس خواب کو توڑ پھینکنا نہیں چاہتی تھی۔

"رازی۔۔۔" وہ پھر اپنے شک میں ڈوبے لہجے میں بولی۔

"مجھے سفر کس سلسلے میں کرنا ہوگا؟"

"پہلا مرحلہ اعتماد کا ہے۔ اندھا اعتماد۔ اگر اس میں پوری اتر و گی تو پھر اگلا مرحلہ آئے گا۔"

ایسا ہو گیا تو رازی اٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا اور درمیان میں ایک گھُپ اندھیرا کمرہ آ ہی جائے گا۔ مگر نیّا نہیں چاہتی تھی کہ ایسا ہو۔ میاں بیوی کے درمیان ایسا اندھیرا مرحلہ نہیں آنا چاہیئے۔ ورنہ دو کناروں پر وہ ہمیشہ ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کے مختلف راستوں میں اندھیرے غار ضرور آتے ہیں۔ مگر ایسے میں افہام و تفہیم کی ایک مشعل

ضرور بچا کر محفوظ رکھنی چاہیئے کہ جونہی اندھیرا بڑھے، دونوں میں سے ایک بڑھ کر مشعل اٹھا لے، نہ صرف اس لئے کہ راستہ نظر آتے، بلکہ ایک دوسرے کی صورت بھی پہچان لیں۔

رازی غسل خانے سے باہر نکلا تو بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر نیّا کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔

"تمہیں یاد ہے آج ہمیں کیبرے دیکھنے جانا ہے اور میں نے کل ہی ٹکٹ خرید لئے تھے۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

پھر بھی تم تیار نہیں ہوئیں۔ اُٹھو کوئی شوخ چٹکتی سی ساڑھی پہن کر شعلہ جوالا بن جاؤ۔ تاکہ لوگ کیبرے کو بھول کر تمہیں دیکھنے لگیں۔" ہر روز جب رازی ایسے ریمارکس دیتا تھا، نیّا کو بہت مزا آتا تھا۔ مگر آج اُسے ذرا بھی لُطف نہیں آیا۔ وہ پلنگ پر پڑی رہی اور بولی۔

"رازی! تمہیں اچھا لگتا ہے کیا جب لوگ تمہاری بیوی کو پُرشوق نظروں سے دیکھیں۔"

"ہاں۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔ "میرا دل چاہتا ہے جب تم میرے ساتھ چل رہی ہو تو سب لوگ تمہیں رشک سے اور مجھے حسد سے دیکھیں۔" مگر نیّا کا دل چاہ رہا تھا۔ رازی اس وقت یہ کہے۔

"جو بھی تمہاری طرف نظر بھر کر دیکھتا ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے بیچ میں گولی اتار دوں۔"

"خوبصورت بیوی کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سب سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔

"اور دوسرا فائدہ کیا ہوتا ہے؟"

"اور بھی بہت فائدے ہیں۔"

"اور وہی فائدے اُٹھانے کے لئے تم نے مجھ سے شادی کی تھی۔" نیّا نے اعتراض

چاند ماری کی۔

وہ خود پسندی کے نشے میں جلدی سے بولا۔ "تم دیکھتی جاؤ تمہارے حُسن شعلہ میں کیا کیا فائدے اٹھاتا ہوں۔ میری نگاہ نے تمہیں پہلے دن ہی تاڑ لیا تھا، تم ذہانت ہو اور عقل میں معصومیت کا مکمل ترین مرقع ہو۔" پھر جلدی سے مڑ کر اس کا چہرہ دیکھا کیونکہ اس کے منہ سے ضرورت سے زیادہ باتیں نکل گئی تھیں۔ پھر اپنی بات کے لئے ہنس کے اُس کے قریب آ کر چہرے پہ جھک کر بولا۔

تم میرے اندر ایک مرد کی رقیبانہ فطرت جگانا چاہتی ہو۔ مگر میں تنگ دل نہیں بہت فراخ دل آدمی ہوں۔ ہاں اگر تم نے میرے علاوہ کسی اور کو دلچسپی سے دیکھا تو اڑا دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے مصنوعی انداز میں اپنے ہاتھ نیّا کی گردن پہ رکھے۔ نیّا اُس سے مس نہ ہوتی، اُسے پہلا فقرہ ہی ڈس چکا تھا اور اس فقرے کا زہر اندر چڑھ رہا تھا۔

بہت دُور امّی جان کی آوازیں آنے لگیں۔ "اچھی طرح اس کا اتا پتہ کر لو۔ کس خاندان کی ہے، کیا کرتا ہے؟ اسی وقت اُسے اپنی کوکھ سے ایک ٹیس سی محسوس ہوئی، وہ ٹیس شاید یہ ٹیس وہی آخری مشعل بن جائے۔ اندھیرے میں راہ دکھانے والی۔

کیا بات ہے؟" رازی نے اس کے زرد چہرے پر نگاہیں جما کر پوچھا۔

رازی . . ." نیّا یکایک چُپ ہو گئی۔

ہاں۔ کہو۔"

طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

باہر نہیں جائیں گے کمرے میں ہی رہتے ہیں، ٹھیک ہے۔"

اچھا نہیں رازی۔" وہ کسلمندی سے بولی۔

کے ڈاکٹر کو بلاؤں؟" وہ تردّد سے بولا۔

"نہیں۔" وہ سوگواری سے ہنسی۔ "ڈاکٹر والی طبیعت خراب نہیں دیسے ہی۔"

"اچھا میں ابھی تمہیں ایک گولی دیتا ہوں تم آرام سے سو جاؤ گی۔" وہ اُٹھ کر اپنا بریف کیس کھولنے لگا تو نیّا نے چھت پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"رازی! گھر کب چلو گے؟"

"کیا تم جلدی جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"امی اور موتی یاد آ رہے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔"

"اور کیا۔ کوئی اور بھی ہے یاد آنے کو؟" رازی پانی کا گلاس اور گولی لے آیا۔

"نہیں۔" نیّا نے گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "اگلے مہینے شاید میں سفر کے قابل نہ رہوں۔"

"ہیں۔" ایک دم رازی چونکا اور پھر ناگواری سے بولا۔ "وہ بے ہودہ بات مجھے نہ

"کون سی؟" نیّا نے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"وہی۔ میں نے تمہیں بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ابھی مجھے بچے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن کبھی کبھی ضرورت کے بغیر بھی بچہ ہو جاتا ہے۔"

"اوہ نہیں۔ نیّا تم اتنی ماڈرن بن کر، سب کچھ جان کر بالکل جاہل عورتوں والی بات کر رہی ہو۔ ابھی مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ابھی تو تمہیں زندگی کے نشیب و فراز بتانے ہیں۔ ابھی۔۔۔ ابھی تو تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ کیا بکواس ہے بھئی!"

"یہ بچہ ہمارے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتا۔ میں بچہ ہو جانے کے باوجود تمہارے اشاروں پر چلوں گی۔"

"بھئی میں اب تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ دراصل بچہ میرے منصوبوں میں شامل نہیں

نے تو میرا ہر منصوبہ خاک میں ملا دیا۔"

"میں نے؟" نیّا نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا اب اس کا کچھ کرو۔"

"کیا کروں؟"

"بھئی چھٹکارا حاصل کرو اس مصیبت سے۔"

"نہیں رازی۔" نیّا دوبارہ لیٹ گئی۔ "میں اُسے مصیبت نہیں اللہ کی نعمت کہتی ہوں۔ اس واسطے اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کروں گی۔" نیّا کا لہجہ اس قدر فیصلہ کن تھا کہ رازی نے بھی محسوس کر لیا۔ نیّا کو بہت پہلے کا زمانہ آپ ہی آپ یاد آنے لگا۔ یہ زندگی کے کیسے موڑ ہیں مالک! ایک زمانہ تھا۔ جب اپنی کوکھ کے اُجڑ جانے کے دُکھ نے اُس کی زندگی ویران کر رکھی تھی، آج اُس کا بار آور ہونا خطرے کی علامت بن رہا ہے۔

مالک! ایک ہی اسٹیج پر دو ڈرامے!

کیوں آخر کیوں؟ نیّا رونے لگی مگر اس نے اپنے آنسو رازی سے چھپانے کی کوشش کی۔ رازی اس وقت تو چُپ ہو گیا مگر اس کے بعد پہلے پیار سے اور پھر ڈرا دھمکا کر نیّا کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ نیّا نے صاف کہہ دیا کہ یہ گناہ کرنے کی اس میں جرأت نہیں وہ پہلے ہی بہت سزا بھگت چکی ہے اب اور نہیں بھگتے گی۔

نتیجتاً جب نیّا اپنے وطن واپس آئی تو اُس کی کوکھ میں تین ماہ کے پھول کی مہک تھی۔ اس نے رازی کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر آتے وقت صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

"رازی! میں دنیا کی دوڑ میں ایک تھکی ہوئی عورت ہوں۔ مجھے صرف گھر اور بچوں کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی لئے میں نے تم سے جلد شادی کر لی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اسی لئے تمہارا ہر جائز کام بھی کر سکتی ہوں۔"

"جائز کام کیا ہوتا ہے؟" رازی نے غرا کر پوچھا۔

"وہ کام جس کی ضمیر اجازت دیتا ہو۔"

"ضمیر! کیا بکواس ہے، چند دن تمہیں روٹی نہ ملے تو ضمیر کی آواز آپ ہی آپ دب جائے گی۔"

"مجھے کھلونا بن کر دکان پر سجنے والی عورتیں پسند ہوتیں تو میں خانم کے ساتھ ضرور سمجھوتہ کر لیتی۔ یہ ضرور ہے کہ دُنیا کی آسائشیں ہر عورت کو لُبھاتی ہیں۔ مگر میں تم سے زیادہ مطالبہ نہیں کروں گی۔ ایسا نہ ہو کہ یہ دولت ہمارے درمیان حائل ہو جائے۔"

"لیکن کچھ دن پہلے تو تم کہہ رہی تھیں کہ تم میری خاطر جان تک قربان کر سکتی ہو۔"

"ہاں اگر تمہیں اُس سے کوئی فائدہ پہنچے تو۔"

"اور میری خاطر تم ایک معمولی سا بچہ۔۔۔۔"

"نہیں رازی نہیں۔ بچہ معمولی نہیں ہوتا۔ بچہ ہی تو اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہے۔"

"مگر تمہارا تو ایک بچہ ہے۔"

ماں کو ہمیشہ دو چار بچوں کی ضرورت ہوتی ہے۔" تھوڑی دیر بعد نیا نے رُک رُک کر کہا۔ "کیا موتی تمہارا بچہ نہیں۔ تم تو کہتے تھے میں اُسے ہمیشہ اپنا بچہ سمجھوں گا۔"

"میں نے کب کہا کہ میں اسے اپنا بچہ نہیں سمجھوں گا۔ بال کی کھال نکالتی ہو۔" رازی نے بگڑ کر کہا۔

رازی نے نیا کو کوئی بات واشگاف الفاظ میں نہیں کہی تھی۔ مگر نیا جو کچھ کہہ رہی تھی رازی کو وہ اسی طرح سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جس طرح نیا بن کہے اس کی کوئی بات سمجھ گئی تھی۔

جب وہ دونوں وطن واپس آتے تو ذہن اور دل میں کئی دراڑیں پڑ چکی تھیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ محتاط ہو گئے تھے۔

نیا نے اپنی موٹر پورچ میں کھڑی کی اور نوکر کو آواز دے کر بلایا۔ خانساماں دوڑا آیا ڈگی کھول کر اس میں سے سودا سلف نکالنے لگا۔ نیا نے وہیں خانساماں کو کھانے کے دوچار ہدایات دیں اور دوڑ کر گھر کے اندر چلی گئی۔

"امّی جان! آپ نے سیپ کو دودھ دے دیا تھا؟" اُس نے کلائی پر بندھی گولڈن کو دیکھ کر امّی سے پوچھا۔

"ہاں۔" امّی نے آہستہ سے کہا۔ "گیارہ بجے بہت طوفان اٹھا رہی تھی۔ میں نے نہلایا دیا اور دودھ پلا کر سلا دیا۔"

"یہ تو بہت اچھا کیا آپ نے۔" نیا نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر سیپ کے کمرے کا، کاٹ سے گلابی رنگ دار جھالر اٹھا کر دیکھا۔ چھ ماہ کی نرم و گلابی سیپ دونوں کی مٹھیاں رخساروں پر رکھے اطمینان سے سو رہی تھی۔

نیا اپنے بیڈ روم میں آ گئی پرس گھما کر پلنگ پر پھینک دیا اور اپنے بال کھولنے لگی کے سامنے کھڑی تھی اس لئے ساتھ ساتھ اپنا جائزہ بھی لینے لگی۔ بچی کی پیدائش کے ہو گئی تھی۔ اردو شاعری والے معشوق کی طرح پتلی کمر کافی پھیل چکی تھی، پیٹ

نکل آیا تھا اور کولہے بھی پھیل گئے تھے۔ چہرے پر بڑا بن آگیا تھا۔ لیکن اُس کی خوبصورتی بچوں کی تو بر قرار تھی۔ حسین عورت زندگی کے ہر اسٹیج پر حسین لگتی ہے۔ البتہ رازی اس کے موٹاپے سے سخت بے زار نظر آرہا تھا۔

مگر نیا کیا کرتی؟ یہ سب آسودگی کی نشانیاں ہیں۔ اب اس کا اپنا ایک خوب صورت گھر تھا۔

نیا نے رازی کو اپنی زمین کے بارے میں بتایا۔ امریکہ سے واپس آتے ہی رازی نے اس کی زمین بکوادی تھی اور اُس میں اور پیسے ملا کر نیا کو یہ بنا بنایا گھر خرید دیا تھا۔ اس میں چار بیڈ روم تھے۔ ایک نیا اور رازی کا، ایک امی جان اور سیپ کا، ایک موتی کا اور چوتھا گیسٹ روم تھا جو چھت کے اوپر تھا۔ گو موتی مری کے ہاسٹل میں چلا گیا تھا مگر چھٹیوں میں اگر آتا تو اسی کمرے میں رہتا تھا۔ ہر کمرے میں ائر کنڈیشنر لگا ہوا تھا۔ فرش پر دیدہ زیب ایرانی اور پاکستانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر مہنگی مہنگی پینٹنگز آویزاں تھیں، مغربی طرز کے آرام دہ صوفے رکھے ہوئے تھے اور ہر کمرے میں بیش قیمت ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔

گھر میں دو تین نوکر تھے۔ ایک خانساماں، ایک بیرا اور ایک آیا جو صبح سات بجے آتی اور شام چار بجے چلی جاتی تھی۔ اتوار کو اس لئے چھٹی کرتی کہ عیسائی تھی۔ امی جان نے کئی بار کہا بھی کہ بچی کو تو سارا وقت میں ہی دیکھتی ہوں پھر یہ دکھاوے کی آیا کیوں رکھ چھوڑی ہے۔ جبکہ رات کو بھی بچی میرے پاس سوتی ہے۔ مگر نیا جانتی تھی کہ اس کالونی میں رہنے کے لئے "اسٹیٹس سمبل" کے طور پر آیا تو رکھنی پڑے گی۔ ورنہ لوگ کہیں گے یہ کیسے امیر آدمی ہیں کہ اپنے بچے خود پالتے ہیں۔

یوں سیپ کو امی جان کے کمرے میں سلانا بھی ایک مجبوری تھی کیونکہ رازی کو نوزائیدہ بچوں کی چوں چوں اچھی نہیں لگتی تھی۔ اُس نے صاف کہہ دیا تھا کہ رات کو تھکا ہارا آؤں تو آرام سے سونا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے کمرے میں بچی کی توتلیں اور نیپکن وغیرہ بکھرے نظر

نیا کی ضد کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ نیا آخر وقت تک اپنے مؤقف پر اڑی رہی اسے لاشعوری طور پر ایک خوف بھی تھا۔ جانے رازی اُسے کس مقصد کے لئے کرنا چاہتا ہے۔ گویا اس نے بچی کی آڑ لے لی تھی۔ خیال تھا اس طرح اس کے جم جائیں گے اور رازی بھی اس پر کھل جائے گا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ کے شوہر کے ساتھ زندگی بسر کرنا کس قدر کٹھن ہے۔ جب گھر میں دولت کی ریل زیادہ لیعہ آمدنی کا پتہ نہ ہو۔ جب گھر سے شوہر یہ کہہ کر جائے کہ دفتر جا رہا ہوں اور اس فتر نہ ہو۔ جب کوئی پوچھے کہ تمہارا شوہر کیا کرتا ہے؟ تو وہ ایسے سوالوں کا کیا جواب رازی کے بقول اس نے بہت سے کاموں میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ اُسے کیا معلوم ی کا اصل بزنس کیا ہے، اس لئے وہ آہستہ سے کہہ دیتی۔

یرے شوہر بزنس کرتے ہیں۔"

کیسا بزنس؟"

جانے "امپورٹ ایکسپورٹ" کہتے وقت اس کی زبان دانتوں تلے کیوں آجاتی تھی۔ لے میں ان کا اتنا بڑا اسٹیٹس تھا کہ آس پاس کی عورتیں اکثر یہ سوال پوچھتی تھیں۔

گھر میں دو موٹریں بھی تھیں۔ ایک ٹیوٹا کرولا جس پر رازی دفتر چلا جاتا تھا اور دوسری ہلکے کی مزدا جو اس نے نیا کو لے کر دی تھی۔ اپنی ذاتی موٹر چلانا نیا کی ایک پرانی تمنا تھی۔ ان نے رازی سے امریکہ میں کہی تھی اور وہیں اس نے نیا کے لئے ایک علیحدہ موٹر سے دیا تھا۔ رازی نے اُسے خوش کرنے کے لئے شروع شروع میں اپنا ہر وعدہ نیا کو ایک دم سے ساری دُنیا کی آسائشیں مہیا کر دی تھیں، زمین سے اٹھا کر آسمان اکثر وہ چاہتا تھا کہ نیا کو اتنا اُونچا لے جائے کہ نیا پستیوں کی طرف دیکھتے ہوئے خوف ہے۔ پھر وہ ہر دم آگے دیکھے گی۔ پیچھے نہیں۔ اُسے آسودگی اور آسائش میں اس طرح رہے گا کہ اُس کے نفس پر پرتی چڑھ جائے گی۔ بصارت کی پہلی تہہ پر سونا اور موتی

بچھا دے گا۔ پھر اس تہہ کے آگے اُسے کچھ بھی نظر نہیں آتے گا۔ تب وہ نیا کو اپنی مٹھی میں دبا کر اپنے اشاروں پر چلائے گا مگر نیا کی بدنصیبی یہ تھی کہ خواجہ عبدالرحیم کا خون لالی بن کر اُس کے اندر جیسے ایک لال جھنڈی والا بابا بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ لاٹھی چارج کرتا نیا اسے رسان سے کہتی۔

صبر کر دبا صبر۔ دُنیا اتنی بُری نہیں ہے۔ دیکھنا تو سہی میں ان سنگلاخ چٹانوں میں اپنے لئے کیسے راستے تلاش کرتی ہوں۔"

"یہ تلاش مستقل جاری رہے گی کیا؟"

"ساری زندگی ہی ایک تلاش ہے۔"

جس کا آخری چراغ قبر میں جا کر بجھتا ہے۔ ویسے تو نیا ایک بڑے آدمی کی بیگم بن کر رہتی تھی اور بیگمات کی طرح وہ علی الصبح کار لے کر جاتی اور سودا سلف لے آتی۔ بازار میں کھڑی ہو کر خوب بھاؤ تاؤ کرتی۔ اُس کا باتیں کرنے کا انداز بھی ماڈرن بیگمات جیسا ہو گیا تھا۔ اُس کے گھر میں اکثر دعوتیں اور چھوٹی موٹی پارٹیاں ہوتیں۔ رازی کے بیشمار ملنے والے تھے جانے والے تھے اور ان میں اکثر نیا کے مداح تھے۔

جانے نیا کے اندر زندگی کی تگ و دو ختم ہو گئی تھی یا اس نے اپنے طرف سے زیادہ پا لیا تھا، وہ رفتہ رفتہ تن آسان ہو گئی۔ اُس کا کچھ بھی کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنا آپ ٹھیک کرنے کی بھی تمنا نہیں رہی تھی۔ کسی زمانے میں اُس کا جسم قیامت تھا مگر اب وہ جسم ڈھیلا ہو گیا تھا، اُسے نہ ایکسرسائز سے رغبت تھی اور نہ ہی فیشل مساج سے۔

نہ خیال، نہ وہ خیال آرائیاں۔ آخر ایک عورت کی زندگی کی معراج کیا ہے؟

یہی سب کچھ جو اس نے پا لیا تھا! ایک سجا سجایا گھر، نوکر چاکر، موٹر کاریں، اچھا کھانا اچھا پینا۔ یہ گھر نیا کا اپنا تھا، نیا کے نام پر تھا۔ سب کچھ تھا مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ نیا نے آگے نہ سوچا۔ آج رات اُسے رازی کے ساتھ ایک ڈنر پر جانا تھا اور وہ ابھی ابھی ہیئر ڈریسر سے

کا وقت لے کر آئی تھی۔ لنچ کے بعد سے بال سیٹ کروانے جانا تھا۔ ساڑھی کو استری کرنے کے لئے دینی تھی۔ رازی نے کہا تھا کہ وہ پانچ بجے آجائے گا اور پانچ بجے وہ گھر سے نکل جائیں گے۔ رازی آج کل دیسے بھی چڑچڑا ہو رہا تھا اگر نیا تیار ہونے میں منٹ بھی تاخیر کرتی تو وہ چلانے لگتا۔ نیا جانتی تھی کہ یہ چڑچڑاپن اس میں سیپ کی طرح کے بعد ہی آیا ہے۔ پھر بھی وہ سوچتی جب سیپ بڑی ہو جائے گی، پاؤں پاؤں کے قریب آئے گی تو وہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ کون سا باپ ہے جو بیٹی پر جھک نہ جائے۔ ویسے نیا ہر دم یہی کوشش کرتی تھی کہ رازی کا ہر ممکن خیال رکھے جھگڑنے کا موقع نہ دے لیکن پھر بھی آئے دن گھر میں چخ چخ ہو جاتی تو نیا اُسے زندگی کا معمول سمجھ کر پی جاتی۔

جلدی جلدی نہا کر باہر نکلی، آیا کو ساڑھی پریس کرنے کو دی۔ بے بی کے بارے میں ہدایات اور پھر تیزی سے کار لے کر باہر نکل گئی۔ شام کو جب رازی آیا تو نیا بالکل تیار اس پر بھی وہ کوئی خاص خوش نہیں ہوا۔ نیا کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہ کوئی حقیر سی بالکونی میں اپنا ڈائمنڈ کا ہار چھپنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ڈنر سوٹ پہن کر اپنے اوپر خوشبوئیں چھڑک کر وہ بالکل تیار ہو گیا۔ رازی کو اپنی ظاہری وجاہت پر بڑا مان تھا۔ پہننے کا سلیقہ بھی خوب جانتا تھا اور اُس کی ظاہری پہچان پر ہی تو وہ مرمٹی تھی اور اب دیکھ کر قرار تھی کہ خوش لباس و خوشبودار مرد کے اندر دل کیسا ہوتا ہے۔

رات کو دعوت رازی کے ایک عزیز دوست کے گھر تھی۔ وہ ایکسائز ڈپارٹمنٹ کے افسر تھے۔ گو عمر کافی ہو چکی تھی مگر رنگین مزاج تھے۔ گھر میں آنا جانا بھی تھا اور نیا سے واقف تھے۔ مگر یہ بات اسے رازی نے ہی بتائی تھی، تب سے نیا کو چنگیزی صاحب سے کراہت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ جانے رازی کو اس بات پر اعتراض کیوں نہیں ہوتا تھا۔ نیا حیران بھی ہوتی۔

نیّا جس محفل میں بھی جاتی، شور مچ جاتا۔ کراچی میں تو ویسے آدمی اپنے اسٹیٹس کو پہچانا جاتا ہے مگر نیّا تو ایک اشتہاری فلم میں کام بھی کر چکی تھی اور وہ اشتہاری فلم ا کسی نہ کسی سینما ہال میں چلتی نظر آجاتی تھی۔ جونہی نیّا محفل میں داخل ہوئی، ہر طرف مچ گیا۔

ہیلو نیّا! ہیلو رازی! زیادہ تر لوگ نیّا کی جانب متوجہ ہوئے دو تین بیگمات ا بغل گیر بھی ہوئیں۔ قدرے بے ڈول ہو جانے کے باوجود نیّا آج بھی بلا کی حسین خ میک اپ میں تو اُسے کمال حاصل تھا۔ مسز حنیف نے اُس کی کمر میں بازو ڈالا اور ا

"کم بخت! ذرا اپنے آپ کو پتلا کر لے تو قیامت لگے گی قیامت۔"

"کس لئے قیامت بنوں اب؟" نیّا نے ہنس کر کہا۔ "بہت قیامتیں ڈھا چکی ہ اب تو سیدھی سادی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔" یہ بات اس نے بطور خاص رازی کو کے لئے کہی تھی، لیکن رازی کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں گھسیٹتا ہوا اسے چنگیزی صاحب کے پاس لے گیا۔ چنگیزی صاحب بڑھ کر نیّا سے یوں ملے اسی کے انتظار میں ہوں۔ ہاتھ بھی ملایا، حال بھی پوچھا۔ بعد میں رازی نے نیّا کو اشارہ کر چنگیزی صاحب کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ جائے۔ نیّا نہ چاہتے ہوئے بھی ان پاس بیٹھ گئی اور مسکرا مسکرا ان سے یوں باتیں کرنے لگی، جیسے پانی کے ساتھ کوئین کی نگل رہی ہو۔ وہ بھی نیّا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں باتیں کر رہے تھے جیسے کسی کی بیوی نہ ہو بلکہ بازار میں پڑا ہوا لکاؤ مال ہو۔

نیّا کو ایسے مردوں سے گھن آنے لگی تھی مگر ایسے ہی بے شمار مرد رازی کے دو تھے، لیکن ایک بات نیّا نے بُری طرح محسوس کی تھی کہ رازی سرکاری افسران سے دبتا تھا، ان کے سامنے یوں بن جاتا جیسے بلّی کے سامنے چوہا، جھک جھک کر ملتا، کہتے زبان نہ تھکتی اور چاہتا تھا کہ نیّا بھی ان کے آگے بچھ بچھ جاتے، لیکن گھر

والوں والے انداز اختیار کرنا کس قدر مشکل ہے۔ نیّا پر ایسا وقت آیا تو اُسے چران بھی ہوتی کہ جب رازی کسی کا ماتحت نہیں، قرض دار نہیں، اپنے گھر میں سب کچھ دے رکھا ہے تو وہ ایسا کیوں کرتا ہے اور پھر نیّا سے بھی ایسی توقع ہے جہاں تک نیّا کر سکتی تھی کرتی تھی۔ اپنے گھر میں بڑی شاندار پارٹیاں دیتی، دعوت کرتی، عزّت و احترام سے ملتی، خوب صورت گفتگو کرتی مگر اس سے دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی، لیکن یہی دیوار میاں بیوی کے درمیان حائل ہونے لگی۔ دعوت سے واپسی پر نیّا نے حسب عادت موٹر میں ہی گفتگو کا آغاز

ی! مجھے یہ تمہارے چنگیزی صاحب بالکل اچھے نہیں لگتے۔" رازی کچھ سیکنڈ رہا، پھر بڑے سرد لہجے میں بولا۔

ب فہرست بنا دو کہ کون سے لوگ تمہیں بُرے لگتے ہیں اور کون کون پسند ہیں فہرست کے مطابق صرف تمہارے پسندیدہ لوگوں سے ہی رابطہ رکھوں گا۔"

اس نے اس طرح چبا کر کہا کہ نیّا کو طیش آگیا۔

طلب ہے تمہارا میرے پسندیدہ لوگوں سے؟"

ب سمجھتی ہو۔"

ا کیا چاہتے ہو؟"

جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔" نیّا چُپ ہو گئی۔ چند منٹ تک غصّے میں کھولتی رہی، پھر بولی

لے گی تو پتہ چلے تمہاری اس بے زاری کی وجہ کیا ہے؟"

سے پوچھ رہی ہو؟"

وہ بھی تیزی سے بولی۔ "مجھے اپنا کوئی قصور بھی تو نظر آئے۔"

انی تمہارا سب سے بڑا جرم ہے۔" اُس نے پھنکارتی آواز میں کہا۔

"مگر شادی سے پہلے تو تم نے کہا تھا کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں؛

"شادی سے پہلے ہر آدمی احمق ہوتا ہے اور بے وقوفانہ دعوے کرتا ہے۔ شادی سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ تم میرے ڈھب کی عورت ہو۔"

"تمہیں کیسی عورت پسند ہے، بتا دو؟"

"میں تمہیں ہزار بار بتا چکا ہوں جو عورت شوہر کے اشاروں پر آنکھیں بند کر کے نہ چل سکتی۔ میں اُسے اچھی بیوی نہیں مان سکتا۔"

"شوہر کا اشارا بھی تو سمجھ میں آئے۔"

"مجھے ایسی کُند ذہن بیوی نہیں چاہیئے۔" نیّا اس کے اشارے خوب سمجھتی تھی۔ انجان بنی رہتی تھی۔

"شریف بیوی، بچے، گھر کا آرام، اعتماد۔ یہی تو ایک آدمی کو درکار ہوتا ہے۔ کیا تم خوشی نہیں ہوتی کہ جب تم گھر آتے ہو تو میں تمہاری منتظر ہوتی ہوں۔"

"مجھے اس قسم کی بجھی ہوئی عورت پسند نہیں، میں نے سمجھا تھا تم باہر کی دُنیا میرے ساتھ قدم ملا کر چلو گی۔"

"باہر کی دُنیا عورت کے لئے سازگار نہیں اس لئے میں نے گھر کے اندر آنا پسند

"تو پھر کسی اور شریف آدمی کا انتخاب کرتیں۔"

"میں تو تمہیں بھی شریف آدمی سمجھتی ہوں۔" نیّا نے بڑی خوبصورتی سے طنز کیا۔ راز دیر خاموش رہا۔

"تم کو تو شاید طلاق لینے کی عادت ہے، ایک سے نباہ نہ ہوا تو دوسرا سہی۔ آخر تمہیں سمجھوتہ کرنے کی عادت نہیں ہے۔" اِس پر نیّا کا دل چاہا کہ رازی کا منہ نوچ لے۔ کا گولہ حلق میں نگل کر بولی۔

"طلاق لے کر دوسری شادی کرنا معیوب نہیں، عین شرع کے مطابق ہے اور

ں نے تمہارے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر رکھا، تم جتنی سرد مہری سے پیش آتے ہو، ی بے عزتی کر دیتے ہو۔ راتوں کو دیر سے آتے ہو، مجھے کہیں ساتھ نہیں یری عمر اور میری ذہانت کی کوئی عورت یہ زیادتیاں کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

اپنی کج بختی کی وجہ سے پار ہی ہو۔"

کوئی کج بختی نہیں کی۔ میں نے تم سے صرف یہ کہا تھا کہ تھوڑی اور حلال یت ہے۔ زیادہ پیسوں کے لئے میں کوئی اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہ نہیں کرنے دوں گی۔"

دفتروں میں کرتی پھرتی تھیں کیا وہ بھی عین شرع کے مطابق تھا؟"

نے کیا کیا ہے دفتروں میں رازی؛ سارا دفتر جانتا ہے کہ میں انتہائی شریف

شریف لڑکی تھیں تم، اسی لئے تو خانم کے ساتھ یورپ میں آوارگی کرتی۔

خانم نے بتایا ہے؟" نیّا نے پینترا بدل کر پوچھا۔

ساری دُنیا جانتی ہے۔"

انم کی ذلیل حرکت ہے تو وہ یہ ضرور جانتی ہو گی میں کتنے مضبوط کریکٹر کی

لئے جب تم کسی محفل میں جاتی ہو تو سارا زمانہ تمہارا آشنا ہوتا ہے۔ کوئی ہیں کرتا کہ اُس کی بیوی کو اُس سے زیادہ لوگ جانتے ہوں۔"

شروع میں کہا کرتے تھے، تمہارا دل چاہتا ہے کہ جب میں تمہارے ساتھ مجھے رشک اور تمہیں حسد سے دیکھیں۔"

ارا تھا جب میں نے یہ کہا تھا۔ شوہر شوہر ہی ہوتا ہے۔"

"ہاں وہ تو مجھے اب پتہ چل ہی گیا، لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے اگر لوگ مجھے جا
ہیں۔"

"اپنی مرضی سے تو تم سب کچھ کرتی رہیں۔ مگر میری مرضی سے تم میرے دوستوں
نہیں مل سکتیں۔"

"رازی تم اتنے دقیانوسی کیوں ہو؟ ایک طرف تمہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ
لوگ میرے مداح کیوں ہیں اور دوسری طرف کہتے ہو کہ میں تمہارے آوارہ دوستوں
ملوں، ٹھٹھے لگاؤں، ان کے دل گرماؤں۔ خدارا اس تضاد کا مطلب تو سمجھا دو۔"

"یہ میری کاروباری ضرورت ہے اور میں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ تم اس
میری معاونت کرو۔"

"خدا کے لئے مجھے اپنے کاروبار کی نوعیت بھی سمجھا دو کہ یہ کس قسم کا کاروبار ہے
بیوی کو دوسرے مردوں کے آگے گڑگڑانے پر مجبور کرتا ہے؟"

"بکواس بند کرو۔" رازی نے غصّے سے کہا۔ "اور میرے سامنے فضول الفاظ
نہ کرو۔ تمہاری جیسی عورتیں جو ذرا سا پڑھ لکھ لیتی اور چار دن نوکری کر لیتی ہیں تو اپنے آ
زمانے بھر کی انٹلکچوئل سمجھ لیتی ہیں، تم میں اتنی عقل نہیں کہ زمانے کی رفتار سمجھ سکو۔" یاقو
دیر کھولتی رہی پھر بولی۔

"اب ان چنگیزی صاحب کو ہی دیکھو، بہانے سے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر ہاتھ کی
دیکھنے لگے۔ کافی دیر تک خواہ مخواہ میرا ہاتھ ٹٹولتے رہے، جی چاہ رہا تھا کہ اپنے ہاتھ
ایک تھپڑ رسید کر دوں، آخر انہیں میرا ہاتھ پکڑنے کا حق کس نے دیا ہے؟ اور تم مز
مسکرا کر انہیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے تمہاری بیوی کو نہیں بلکہ کسی بھیڑ
پکڑ رکھا ہے۔"

چنگیزی صاحب سے میرے کاروباری مفادات وابستہ ہیں اور مجھے ہ

ضرورت ہے۔"

تھی تو نہیں ہو اس دنیا میں کاروبار کرنے والے اور بھی بہت لوگ ہیں جن کے
ایک دوسرے سے وابستہ ہیں مگر وہ دوسروں کے ہاتھ اپنی بیوی کے گریبان تک
نے دیتے۔"

ٹ اپ۔ الو کی پٹھی۔" رازی گرجا۔

جب تمہیں جواب نہیں سوجھتا تو تم اس طرح مجھے چپ کرانے کی کوشش کرتے
ہو تم مجھے صدیق صاحب کے پاس بینک چھوڑ آئے تھے اور تمہارے آنے کے
ے فحش مذاق کرنے لگے۔"

یں معلوم ہے مجھے صدیق صاحب نے کتنے لاکھ کا قرضہ دیا ہے؟"

یا اس قرض کی ادائیگی بیوی کے ذریعے کرنا چاہتے ہو؟"

مہذب دنیا کے آداب و تقاضے نہیں جانتیں۔ امریکہ میں اچھی عورتیں اپنے شوہروں
کو اسی طرح بڑھاوا دیتی ہیں۔"

ریکہ کی بات پاکستان میں کرتے ہو، یہاں عورت کا ایک الگ مقام ہے۔"

مالے جیسی دقیانوسی گھرانوں کی کم ظرف اور کم عقل عورت کا مفروضہ ہے۔"

حال تمہارے کاروبار کی توسیع کے لئے میں تمہارے اوباش دوستوں کی تسکین
میں بن سکتی۔"

تمہیں اتنے اچھے گھر میں ایسی آسودہ زندگی گزارنے کا حق بھی نہیں پہنچتا۔" یاقوت
ریا کاری تھا۔ مگر اس میں ساری آسائشیں اور سہولتیں رازی کی دی ہوئی تھیں۔ یاقوت
سائشوں کے خواب دیکھے تھے۔ انہی آسودگیوں کے پیچھے وہ عرصے سے بھاگ
اب سب کچھ میسّر تھا۔ مگر روح میں یہ کیسے کانٹے چبھے جا رہے تھے۔

شوہر کا فرض ہے کہ بیوی کو اچھی زندگی دے۔ اگر کوئی آدمی ضرورت سے زیادہ

کما لیتا ہے تو وہ اپنی بیوی پر احسان کیوں جتاتا ہے! اس کی قیمت اپنی بیوی کو گھر سے نکال کر کیوں وصول کرتا ہے؟" نیّا نے اپنی آنکھوں کے آنسو، آنکھوں میں پلٹتے اور آہستہ سے کہا۔ "تم اپنی سہولتیں واپس لے لو، میں کٹیا میں رہ لوں گی۔"

"تم جیسی عورت کے لئے کٹیا میں رہنا بہت مشکل ہے نیّا! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔"

"میں سب کچھ کر سکتی ہوں، دوبارا نوکری کر سکتی ہوں، میں زندگی کا بوجھ اٹھانا جانتی ہوں۔"

"ہاں۔ کتنے سوکمار رہی تھیں تم۔ تم تو اپنی تنخواہ میں اپنی موٹر کے پٹرول کا خرچ بھی نہیں اٹھا سکتیں۔"

"آخر تم مجھے اس طرح اذیت کیوں دے رہے ہو؟"

"تم میرے دوستوں کے معاملات میں دخل اندازی بند کر دو۔"

"تم مان لو کہ میں ایک شریف عورت ہوں۔"

"تم ایک نیچ اور کمینی عورت ہو۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو رازی۔ میں موٹر سے نیچے کود جاؤں گی۔"

"کود جاؤ — مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ کوئی اور تمہارا عاشق تمہیں اٹھا لے جائے گا۔"

"شٹ اَپ رازی —؟"

"زبان سنبھال اُلّو کی پٹھی۔" نیّا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"ذلیل عورت تو اس قابل نہیں ہے کہ میں تجھے اپنے ساتھ لے جایا کروں۔ جب کبھی ہم گھر سے اکٹھے نکلتے ہیں۔ واپسی پر لڑائی ضرور ہوتی ہے، تو ناشکری عورت ہے۔ اب میں تجھے اپنے ساتھ نہیں رکھوں گا۔ گھر میں پڑی سسکتی رہے گی اور میں تیری خبر نہیں لوں گا۔" رازی نے ایک جھٹکے سے کار تیز کر دی۔ گھر آگیا تھا۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے

موٹر گھر کے اندر داخل کی۔ نیّا نے بھی غصّے سے دروازہ کھولا اور روتی ہوئی اتر
نیّا کے اُترتے ہی رازی نے ایک جھٹکے سے گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈال کر گیٹ سے
نکال لے گیا۔ نیّا اندر جاتے جاتے رک گئی۔ اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت رات
کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ یہ کون سا وقت ہے باہر جانے کا؟ وہ جانتی تھی
کہ رازی اُسے اذیّت دینے کے لئے وہ گھر سے باہر نکل گیا ہے۔ کلب چلا جائے گا
شراب بھر آوارگی کرے گا اور وہ رات بھر سلگتی رہے گی۔ گیلی لکڑیوں کی طرح دھواں دھواں
ہوتی رہے گی۔ جب مرد اپنی بیوی کو دُنیا کی سب سے بڑی اذیّت دینا چاہتا ہے تو وہ
بات کو دیر سے آتا ہے۔ کم ظرف مرد کا یہی زود اثر ہتھیار ہوتا ہے۔ وہ سزا کے طور
پر بیوی کو رات کی سنسان سولی پر لٹکا کر خود اندھیرے راستوں میں گم ہو جاتا ہے۔

"کبھی کسی نے رات کے سرد اور بیدرد لمحوں میں سنسان سڑکوں پر آکا دکا رینگتی کاروں کی آواز سنی ہے۔ کیا کبھی کسی نے محسوس کیا ہے کہ یہ جو لڑکھڑاتی رینگتی موٹریں کی سیاہ چادر سے نکل کر سڑک کا سینہ چیرتی ہیں تو کتنی مظلوم عورتوں کی سیج پر کانٹے بچھاتی ہیں۔ کتنی سہاگنوں کی مانگ اجاڑتی ہے۔

کیا کوئی جانتا ہے کہ سوئی سڑکوں کو جھنجوڑ کر جگانے کا فعل کس قدر اذیت ناک ہے۔ وہ آواز کسی نے سنی ہے جو شب کے پچھلے پہر موٹر کے پہیوں سے رگڑ کھا سڑک کی کوکھ سے نکلتی ہے۔ اس آواز میں گھر کی چوکھٹ پر سسکتی ہوئی سہاگن کے شامل ہوتے ہیں۔ تب ہر وہ موٹر جو اُسے مایوس کر کے آگے نکل جاتی ہے اس کے پر سے گزر کے جاتی ہے۔ بدنصیب سہاگن رات کا پیراہن پہن کر ساری شب جینے کا کھیل کھیلتی ہے۔ شب کی سنسان کوٹھری ہو اور انتظار کی سولی ہو تو زندہ قید لگتی ہے۔"

نیاّ نے کاغذ پر یہ چند جملے لکھے اور پھر پرزے پرزے کر کے اِدھر اُدھر بکھیر دیئے دیر سے اس کا یہی شغل تھا۔ وہ کسی سے اپنے دل کا درد کہنا چاہتی تھی اور جب

بیتی تو اسے کاغذ پر لکھ کر پرزوں میں بدل دیتی۔ خود ترسی کی یہ بھی ایک کیفیت تھی
دنوں سے اس پر طاری تھی۔ ہاں مگر دور جب سڑک سے آتی ہوئی کسی موٹر کی آواز آتی
اپنی بالکنی میں کھڑی ہو جاتی اس کے بیڈ روم کے آگے ایک بالکنی بنی ہوئی تھی جس
ج مین روڈ کی طرف تھا۔ کبھی کبھی وہ یہاں کھڑی ہو کر سڑک کا نظارا کیا کرتی تھی۔ وہ یہیں
ڑی ہو کر رازی کو خدا حافظ کہہ دیتی تھی اور کبھی جب وہ آتا تو یہیں سے جھانک کر اس کو
لیتی تھی۔ جانے کیوں دن کے وقت تو اس نے کبھی اس سڑک کی پروا نہیں کی تھی
رات کو یہی سڑک اس کی سوتن بن جاتی۔

سوتن کس طرح بھئی۔ ! وہ اپنے دل سے کئی بار پوچھ چکی تھی۔ سڑک سے جلاپا کیسا۔!
اس موٹر کے ساتھ ہونا چاہیئے جو رازی کو لے کر نکل جاتی تھی۔ مگر اس میں موٹر کا بھی
قصور۔ ؟

پھر۔ پھر قصور کس کا ہے ؟ مقدّر کا ہو سکتا ہے۔ ! دُور سے ایک موٹر کی بتیاں نظر
آئیں۔ جیسے ریل گاڑی اندھا دھند چلی آتی ہے۔ ایسی آواز آ رہی تھی جیسے پانی پر چل رہی
ہو جیسے کوئی مشاق بنواز کو را اٹھا پھاڑتا ہے۔ دن کے وقت اس سڑک کے حلیے میں بھی
ہوتا ہے اور آواز میں بھی البتہ رات میں یہ سڑک بالکل بدل جاتی ہے۔ اس غریب
گل کی مانند جو کام سے واپس آتے ہی اپنا اکلوتا فراک اتار کے رکھ دیتی ہے۔ اور
پرزوں میں گھر کے کام کرنے لگتی ہے۔ یا پھر اس سہاگن کی مانند جیسے پیا نہ چاہے
کاجل اور بستر اس سڑک کی مانند سنسان اور ویران ہو جاتا ہے۔ ویران سڑکیں ہوں یا
بستر دونوں سے بین کی آواز آتی ہے۔ نیاّ کئی بار جھروکے سے دیکھ چکی تھی۔ کئی
گزر چکی تھیں۔ کئی آوازیں اُبھر کر ڈوب چکی تھیں۔ ہر بار دُور سے آتی ہوئی روشنیوں
کو کر وہ سوچتی، شاید یہی موٹر ہو۔ شاید اس میں رازی ہو۔ گھر آ رہا ہو۔ مگر وہ موٹر بیدردی
نظریں چرائے آگے نکل جاتی۔ کیوں انتظار رہتا ہے عورت کو اس بے درد مرد کا،

جو اس کا دل قدموں تلے پامال کر کے چلا جاتا ہے اور جو اُس کی وفا پر تھوک کر چلا جاتا ہے بیوی کو شمع کی صورت میں سُلگنے کے لئے چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور بیوی کو دیکھو جیسے وہ اپنے انتظار میں جلی جا رہی ہے آخر — کیوں ؟ - نیّا اپنے آپ کو جیسے گردن پکڑ کر جھنجھوڑ تو بھی وہی مار کھا رہی ہے۔ تو بھی عام عورت کی طرح اپنا حق نہیں مانگ سکتی۔ جاگ جاگ کر اپنی عمر جلا رہی ہے۔ کیا اس کا سواگت کرنے کا ارادہ ہے یا اس کا گریبان پکڑنے کا۔

نیّا پھڑپھڑا رہی تھی۔ مگر اُڑ نہیں سکتی تھی۔ اپنے پر اس نے خود کاٹ دیئے تھے۔

یہ تو رازی کا روز کا معمول ٹھیرا۔ روز شام کو گھر سے نکل جاتا اور پھر رات گئے واپس آتا۔ کالی سیاہ رات کو ننگی تلوار کی طرح اس کے سر پر تان کر وہ نکل جاتا تھا۔ کہاں۔ کہاں ؟

رکس کے پاس —

ایک اور ہی جہان میں — نیّا نے زندگی کے سرد و گرم دیکھے تھے۔ جانتی تھی کہ باہر کیا ہوتا ہے۔ ؟ اسی واسطے پھندے میں لٹکی رہتی تھی۔

بتا تجھے کیا ملا۔ مرد کو جان کے۔ اس کی اصلیت پہچان کے۔ رکس نے کہا تھا۔ کھوجنے کو نکلنے کے لئے۔ یوں انجانے میں زندگی گزر جاتی تو بہت اچھا تھا مگر۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکنا — مجبوریوں کی انتہا ہے۔ اس رات بھی جب رازی کی لڑائی ہوئی تھی تو رازی اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور پھر رات کے ایک بجے آیا۔

"کہاں سے آ رہے ہو اس وقت۔ ؟" نیّا نے اس کے آتے ہی غصے سے

"اپنا لہجہ درست کرو۔ میں ایسا استادانہ رویہ پسند نہیں کرتا۔"

"تو تم پسند کیا کرتے ہو۔ ؟"

"بیوی ہو تو بیوی بن کر رہو۔"

"بیویوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔"

"سب کتابی باتیں ہیں۔"

"اور وہ کون ہیں جو راتوں کو تم لوگوں کا دل گرماتی ہیں۔ ؟"

چٹاخ — رازی کا ہاتھ اٹھ گیا۔ "حرام زادی۔ تو باہر کی عورتوں کے بارے میں کیسے ہے۔ آوارہ۔ کمینی۔" نیّا چیخنا چاہتی تھی، رونا چاہتی تھی اور رازی کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی۔ اُف بھی نہیں کی۔ رخسار پہ ہاتھ رکھا اور وہیں بیٹھ گئی۔ ساتھ والے کمرے میں امّی جان سو رہی تھی۔ گو ائر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ مگر امّی جان کا کیا ہے۔ وہ تو ساری رات کی طرح منڈلایا کرتی تھیں۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے خواہ مخواہ اُس کے کمرے میں جھانکتے ہیں۔

"کیا ہوا ہے ؟"

"کیوں ہوا ہے۔ ؟" کبھی کبھی آنکھ کے آنسو دل کے اندر بہانے پڑتے ہیں۔ تب روح کا رنگ لال ہوتا ہے یہ اتنی بہادر عورت! جو ایک زمانے میں ساری دُنیا کو کندھوں پر اٹھا سکتی تھی۔ وہ ایک دم ایک مرد کی مٹھی میں آ کے مکھی کیوں بن جاتی ہے۔ انگیز اور کراہیت آمیز! جب بھی ہاتھ اُٹھے اُسے ہٹانے کو ہی اُٹھے اور ابھی تو دن بھی نہیں گزرے تھے۔

اس صبح نیّا جب اٹھی تو اس کے گل رنگ رخساروں پہ رات کے ستم کے نشان تھے سب سے اپنا منہ چھپائے پھرتی رہی۔ دوسری رات رازی جلد ہی گھر آ گیا۔ خود ہی بستر پر آ کر سر سار ہو کے معافی مانگ لی۔ وہ ہاتھ جو اٹھا تھا۔ اسی ہاتھ کو پھیلا کے اُسے سوچتی رہی۔ یہ میاں بیوی کا رشتہ کیسا ظالم رشتہ ہے۔ پل میں دشمن، گھڑی میں دوست دو فرقوں کی اتنی اونچی دیوار کہ پاٹنا مشکل اور کہاں چند معمولی لفظوں کے سہارے صلح بھی کچھ عجیب طلسماتی سا تعلق ہے۔ عجیب سا رشتہ ہے۔

کچھ راتیں اس طرح گزر گئیں جو شدید لڑائی کے بعد صلح میں گزرتی ہیں۔ معطر کیف رنگ آمیز نشے میں ڈوبی ڈوبی پھر خود ہی کہتی۔ بڑا ذلیل ہے یہ رشتہ — مانسون

کی برسات اس سے اچھی ہے کہ بادل گھر کے آئیں، کچھ پتہ تو چلتا ہے۔ مگر یہاں کچھ پتہ نہیں۔ ابھی ہنس رہے ہیں۔ ابھی رو رہے ہیں۔ کبھی نہ بولنے کی قسم کھا رکھی۔ لیکن پچھلے پہر ٹوٹ کر پیار آرہا ہے۔ کتنی ہی لڑائیاں ہو چکی تھیں اور کتنی ہی دھنک رنگ راتیں بیت چکی تھیں۔ اس بے یقینی کی کیفیت سے نیا تھک چکی تھی۔۔۔ اس نے رازی کی پسند میں ڈھل جانا چاہا تھا۔ مگر رازی کی ایک پسند ہو تب نا!

آج جو اچھا ہے کل وہ بُرا ہے۔

شادی سے پہلے کہتا تھا۔ مجھے گھریلو عورتیں پسند ہیں جو گھر کی چار دیواری میں رہیں۔

نیا نے جھٹ استعفیٰ دے دیا اور اب کہتا تھا گھریلو عورت راکھ ہوتی ہے مجھے تو شعلہ صفت بیوی درکار ہے اور تو اور بچوں سے بھی نفرت کرتا تھا۔ کبھی جو اپنی چاند ایسی گول مٹول مکھن مکھن بیٹی کو پیار سے چمکارا ہو۔ جب بھی اُسے اپنے بستر پر دیکھتا جھٹ کہہ دیتا۔

"اس مصیبت کو اٹھا لو یہاں سے۔" افوہ۔ سمجھوتہ کرتے کرتے نیا تھک گئی تھی۔ مگر سمجھوتے کی وہ راہ اُسے پسند نہیں تھی۔ جو رازی دِکھا رہا تھا۔ عورت تھی۔ عورت بن کر رہنا چاہتی تھی۔ اسی لئے تو اُسے اپنے حُسن سے بھی گھن آنے لگی تھی دن بدن حد درجہ بے پرواہ اور بے ڈھب ہوتی جا رہی تھی راتوں کو جاگ جاگ کر آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ جانتی تھی رازی اُسے اپنے آگے جھکانے کے لئے راتوں کو تڑپتا چھوڑ جاتا ہے۔ اس سے دُور دُور رہتا ہے۔ جانے تپسیا کے کون سے جنگل میں تھی وہ کہ بھری جوانی میں بن باس کاٹ رہی تھی پہلے اُس نے اپنے ادپر شرع اور شرافت کے پہرے بٹھا رکھے تھے اور اب جب وہ سہاگن تھی۔ سانسوں میں خوشبو اور دل میں ارمان تھے۔ رازی اُس سے دُور دُور رہتا تھا۔ کیا عورت کی پیاس کبھی نہیں بجھتی؟ مگر پگلی تو سہی تیرا من پیاسا ہے یا تن پیاسا ہے، تیری روح پیاسی ہے یا ذہن پیاسا ہے؟

نہیں آتا تھا کہ کون سی پیاس شدید ہے۔ مگر اندر کی آوازیں بند ہو جاتیں تو باہر آوازیں نہیں آتیں۔ "نہیں"۔ کوئی گرج کر کہتا۔ جب تک آدم کی اولاد گندم اور انگور دست نگر ہے، جسم کی پیاس ہر پیاس پر حاوی رہے گی۔ راتوں کو وہ بیراگن بنی پنے آپ سے الجھا کرتی تھی۔ بھلا فلاسفی بن جانے سے بھی کہیں رازِ دروں کی یاں سلجھ سکتی ہیں۔

آج اس نے رازی سے ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ موٹروں کی دہی تھی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی موٹر سڑک پہ گھسٹتی یوں نکل جاتی جیسے جاں بلب ہسپتال میں دم توڑ رہا ہو۔ اسے راتوں کو یوں سڑکوں پر دم توڑنے والی موٹروں سے آنے لگا تھا۔ ممکن ہے کوئی ان میں مسافر ہو، مجبور ہو، بیمار ہو، مگر وہ انہیں صرف ن بُرے آدمیوں کی موٹریں سمجھ رہی تھی۔ جو ہرجائی ہوتے ہیں اور ہر پیالے سے پیاس بجھانا چاہتے ہیں۔

تین بجے تک نیا، پرزے بکھر بکھر کر، کھول کھول کر اور رو رو کر تھک چکی تھی، بس مزہ ہی باقی رہ گیا تھا۔ اُس کی پھوڑے کی طرح دُکھنے والی زخم زخم آنکھوں میں کے لال ڈورے بھی لہرانے لگے تھے۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ بالکنی سے باہر جھانکا پھر ی سے کر اندر آگئی۔ ملگجی روشنی میں آئینہ دیکھا۔ کیا اُس کے چمن کے تمام گل بوٹے ک نذر ہو چکے ہیں۔ ! کیا جھونرا اڑ چکا۔ ! وہ مرے مرے قدموں سے امّی جان کے ش میں چلی گئی۔ کبھی کبھی وہ راتوں کو اُٹھ کر اسی طرح دبے پاؤں امّی جان کے کمرے سیپ کو دیکھنے چلی جایا کرتی تھی۔ "سیپ" کے لئے دل میں ہمیشہ درد اٹھتا تھا جیسے کی خاطر اپنے سے دُور رکھتی تھی۔ وہ بنا چاپ کے اندر گئی تھی۔ مگر پھر بھی امّی ر اٹھا کر دیکھا۔

"تم ابھی سوئی نہیں نیا؟"

"افوہ" نیا جھنجلا گئی۔ امی تو ہمیشہ کی طرح اب بھی بیدار تھیں۔ پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"سیپ کو دیکھنے آئی تھی" وہ واپس جانے کے لئے مڑی تو امی جان نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیا رازی آگیا ہے۔ ابھی تک اس کی گاڑی کی آواز نہیں آئی؟"

"جی ہاں۔ آگیا ہے" الجھے ہوئے انداز میں جواب دے کر نیا رُک گئی اور بولی۔

"آپ سو جائیں امی، کیوں جاگ رہی ہیں"؟

"میں تو اب تہجد کے لئے اُٹھنے لگی ہوں" امی اُٹھ کر بستر میں بیٹھ گئیں اور نیا اپنے کمرے میں آگئی۔ پتہ نہیں امی کسی وقت سوتی بھی ہیں یا نہیں۔ یہ امی جان کا بھوت بھی عجیب طرح سر پر سوار تھا۔ مگر نیا امی جان کو رازی کی اصلیت بتانے پر ہرگز تیار نہ تھی شاید امی جان اُٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی تھیں۔ کیونکہ ان کے وضو کرنے کی آواز آرہی تھی۔ اسی وقت پورچ میں رازی کی موٹر آکر رُکی۔ نیا کا دل دھڑک کر حلق تک آگیا۔ یہ کیسا جذبہ ہے خدایا۔؟ ابھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ رازی کا منہ نوچ لے، کپڑے تار تار کر دے اور اب اس کے آنے پر یوں لگ رہا ہے۔ جیسے تڑپتا دل تسلی پا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اُسے معاف کر دے گی اور نہ اس پر یہ ظاہر کرے گی کہ وہ کتنی دیر سے اس کے انتظار میں جاگ رہی ہے پھر سوچنے لگی بات کس طرح شروع کرنی چاہیئے۔ راتوں کو دیر سے آنے والے شوہر عورت کی آہ وزاری کو فقط بکواس کہتے ہیں۔ آج تک کسی شوہر کو بیوی کی دھمکیاں باہر جانے سے نہیں روک سکیں۔ آج تک کسی شوہر نے بیوی کی فریاد سنی ہے۔؟ باہر رہنے والے شوہر بیوی کو محض ایک عضوِ معطل سمجھ لیتے ہیں۔

باہر کی ہوا مسموم ہے۔

راتوں کو باہر بلائیں اُترتی ہیں اور موتیا کی کلیاں بن کر مردوں کے گلے میں لٹک جاتی

ہے مردوں کو بیوی کا حسن صورت، حسن سیرت اور حسن سلیقہ، کچھ بھی نظر

باہر کی دُنیا سے بچ کر میں اندر آگئی۔ پھر بھی باہر کی دنیا میری دشمن بنی ہوئی ہے۔ مجھے اس دنیا سے بچالو۔ نیا جھٹ اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گئی، گویا رازی کو بتانا چاہتی کہ اُسے تو کبھی بھی اُس کا انتظار نہیں تھا اور نہ پرواہ تھی، مگر بات دراصل یہ تھی کہ اُس وقت وہ رازی کے ساتھ الجھ پڑتی تو امی جان ساتھ والے کمرے میں سب کچھ سن لیتیں اور انہیں پتہ چل جاتا کہ ان کی لاڈلی بیٹی کی خوب صورت سیج تلے کانٹے بچھے ہیں۔ اسی وقت جانے کیسے امی جان کے کہے ہوئے فقرے دور دراز کی مسافت طے کر کے اس کے دل میں ٹن ٹن بجنے لگے۔

آوارہ اور شرابی شوہروں کے دیئے ہوئے زخم کتنے گہرے ہوتے ہیں، بے موت مرتے ہیں۔ تم نے شاید ان عورتوں کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جن کے پاس بیشمار دولت ہے مگر ان کے شوہر رات رات بھر گھر سے باہر رہتے ہیں" ماں تیری بات میں صداقت تھی، مگر مجھے یہ تو بتا، "یہ جاہل اور خاموش مائیں اتنی جلدی اتنے بڑے نتائج تک پہنچ جاتی ہیں"۔ رازی کمرے میں آگیا۔ نیا دم سادھے پڑی رہی۔ اس نے بتی جلائی، کپڑے بدلے اور غسل خانے چلا گیا۔ واپس آکر اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا، جیسے ایسا کیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نیا کی طرف پیٹھ موڑ کے کروٹ بدل لی اور خراٹے لینے لگا۔ نیا اس قدر تھک کر آیا تھا کہ ایک لفظ بھی کہنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

نیا نے اپنی آہ اپنے سینے میں دبالی اور دھیرے سے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔

پروفیسر بیدی جن کے ساتھ رومان کا ہر خوب صورت تصور وابستہ ہے، کبھی کبھی میلوں کی مسافت پر پھیل جاتے ہیں اور دو انسان ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی ذہنی اور جسمانی طور پر کوسوں دُور چلے جاتے ہیں۔

"کیا بات ہے موتی! تم سارا دن اندر کیوں بیٹھے رہتے ہو چندا؟" نیتا نے موتی کے کمرے میں آکر پردے ہٹاتے اور بڑے دُلار سے پوچھا۔ موتی ان دنوں چھٹیوں کی وجہ سے گھر آیا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں ممّی، بس اندر کھیلتا رہتا ہوں۔"

"مگر بیٹا اس بار چھٹیوں میں جب سے تم آئے ہو، چپ چاپ سے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں ممّی!"

"نہیں میرے بچے اگر تمہیں گھر میں کوئی تکلیف ہے تو اپنی ممّی کو بتاؤ؟"

"کچھ بھی نہیں ممّی۔" یہ کہہ کر موتی نے سر جھکا لیا اور دوبارا اپنے لیگو سیٹ سے کھیلنے لگا جو نیتا اس کے لئے امریکہ سے لائی تھی۔

اس بار موتی تین ماہ کی چھٹیوں میں اپنے گھر آیا تو بڑا سہما سہما تھا۔ حالانکہ اسے نیا کمرہ دیا گیا تھا۔ نئی چیزیں ملی تھیں، گھر میں ساری آسائشیں تھیں۔ نئی کالونی میں نئے دوست تھے سب کچھ تھا۔ مگر وہ سارا دن اپنے کمرے میں ہی گھسا اپنے کھلونوں سے کھیلتا

پیدائش سے ہی بڑا سوشل بچہ تھا، اندر گھسے رہنا اس کو اچھا نہیں لگتا تھا بلکہ خواہ مخواہ
پوٹے سے دوستی گانٹھ لیتا تھا۔

الجھنوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ ایک تو ان کے گھر میں آنے جانے والوں کا تانتا
اس پر رازی بھی خوش ہو کر موتی سے بات نہیں کرتا تھا۔ جب بھی بات کرتا تو ایسا
کاٹ کھائے گا۔ نیتا اس کے رویے پر حیران ہوتی۔ یہ وہی رازی تھا جو اس سے
زمانے میں موتی کو چھوتے نہیں تھکتا تھا اور بار بار مجبور کرتا تھا کہ وہ اسے پاپا کہے
نیتا کھانے کی میز پر بیٹھے چپ چاپ سہمے ہوئے موتی کو دیکھتی تو ٹھنڈی سانس
ہی دبا لیتی۔

مجھے اپنی ماں کے ناکردہ گناہوں کی سزا مل رہی ہے میرے بچے۔"

نے اُس کے لئے ایک ننھی سی جنت تعمیر کر دی تھی۔ گھر کے اندر ہر نعمت موجود تھی
کو پوری آزادی دے رکھی تھی، پھر بھی موتی کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا، جیسے وہ
ری پرندہ ہے۔

چندا! تم باہر نکل کر کھیلا کرو، اس کالونی میں تمہاری عمر کے اور بھی بہت سے بچے

ں ممّی۔ میں ان بچوں کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ موتی نے منہ بسور کر کہا۔

ں نہیں کھیلو گے، کیا وہ تمہیں مارتے ہیں؟"

مجھے کون مار سکتا ہے؟" وہ منہ پھلا کر بولا۔ "میں کمزور تھوڑے ہی ہوں۔"

تو میں ابھی کٹو اور بلو کو بلاتی ہوں اور پوچھتی ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں
ں طرح پومی اور منٹو رہتے ہیں۔ پومی بہت اچھی بچی ہے۔ تم ان کو اپنے گھر بلایا
خود کھلونے ہیں تمہارے پاس۔ بچے تو کھلونوں کے لالچ میں ہی آجاتے ہیں۔"

میں ان کو نہیں بلاؤں گا اور نہ ان کے ساتھ کھیلوں گا۔"

"کیوں بیٹے؟" نیّا نے تردّد سے پوچھا اور وہیں قالین پر بیٹھ گئی۔ پھر جھک کر موتی کا چہرہ ہوا منہ چوما اور اسے سینے سے لگا لیا۔ "کیوں خفا ہو گیا ہے میرا بیٹا سب سے؟"

"ممّی یہ سب گندے بچّے ہیں، میں ان کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔"

"اچھا تم خود بتاؤ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟ ورنہ میں انہیں بلا کر پوچھ لوں۔"

"بس ایسے ہی ممی۔" موتی جھنجلا کر بولا۔ "میں ان سب کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اچھی باتیں نہیں کرتے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں؟" نیّا نے موتی کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ گود میں بیٹھتے ہی موتی پانی کے بلبلے کی طرح پھوٹ پڑا۔ اس کی آنکھوں میں بڑے آنسو تیرنے لگے۔

"ایک دن کٹّو مجھ سے پوچھنے لگا، موتی کیا یہ تمہارے اصلی ڈیڈی ہیں؟ میں نے ہاں تو وہ بولا، پھر یہ تمہیں پیار کیوں نہیں کرتے، صبح اسکول چھوڑنے کیوں نہیں جاتے اور ہر کو آئس کریم کھلانے کیوں نہیں لے جاتے؟ پومی یہ سُن کر کہنے لگی نہیں نہیں۔ یہ تو مو کے نقلی ڈیڈی ہیں کیوں کہ ایک دن میری ممّی میری آنٹی سے کہہ رہی تھیں اس عورت نے بدلنے کی عادت ہے، یہ اس کا دوسرا شوہر ہے۔ ممّی خصم کیا ہوتا ہے؟ یہ کہہ کر موتی چھم رونے لگا۔ نیّا کے دِل میں برچھی سی اتر گئی۔

"یہ سب تم سے پومی نے کہا تھا؟"

"ہاں۔"

"پومی اتنی چھوٹی بچّی ہے یہ سب کیسے کہہ سکتی ہے؟"

"تو پھر مجھے یہ سب کیسے پتہ چل گیا؟" موتی نے بحث شروع کر دی۔

"بیٹا بچّوں کی باتوں کا بُرا نہیں مانتے، بچّے بے وقوف ہوتے ہیں، انہیں بڑوں باتوں کی سمجھ تو آتی نہیں بس یونہی اِدھر اُدھر کی ہانکتے ہیں۔"

"مگر یہ بچّے روز ہی مجھ سے ایسی باتیں کیوں کہتے ہیں۔ ایک دن پومی کہہ رہی تھی

مجھے موتی کی ممّی سے ڈر لگتا ہے وہ دوسروں کے خصم چھین لیتی ہے۔" نیّا کو یوں اس پر چھت آن گری ہو۔ پومی کی امّی آسیہ نہ صرف اس کی ہمسائی تھی بلکہ سہیلی بھی بن گئی تھی اس کا شوہر بینک میں ملازم تھا۔ اکثر شام کو وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اس پوری محلّے میں ابھی تک نیّا نے آسیہ کے ساتھ ہی رسم و راہ بڑھائی تھی۔ لوگ اندر سے کتنے گھناؤنے ہوتے ہیں۔ وہ سوچنے لگی، اس نے تو کبھی آسیہ کے شوہر کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور اس کے بغیران کے گھر جاتی ہی نہ تھی مگر اُجلے دامن پر بہتان کے دھبّے لگانا شاید اس دنیا کی ریت ہے۔ نیّا نے اپنے آنسو اپنے حلق میں ہی گرا لئے اور موتی کو زور سے بھینچ لیا۔

"ان کردان چاروں کو، یہ واقعی گندے بچّے ہیں۔ ہماری پچھلی لائن میں دو بڑے پیارے رہتے ہیں۔ کاشف اور واصف، ان کی ممّی جرمن اور باپ پاکستانی ہے۔ میں ان سے تمہارا تعارف کرا دوں گی، یقیناً وہ ایسی گندی باتیں نہیں کریں گے۔ لیکن تم اپنے گھر میں اپنے کمرے سے باہر نکل کر کھیلا کرو۔"

"کس کے ساتھ کھیلا کروں ممّی؟"

"ارے تمہاری ممّی سی بہن ہے سیپ، اُس کے ساتھ کھیلا کرو۔" موتی چپ ہو گیا تو پھر کہنے لگی۔ "کیا تمہیں سیپ اچھی نہیں لگتی؟"

"اچھی لگتی ہے۔" موتی نے آہستہ سے کہا۔

"ہے نا پیاری پیاری گڑیا؟"

"ہاں۔" موتی زیرِ لب ہنسا۔

"تو اُس کے ساتھ کھیلا کرو۔"

"وہ تو اتنی چھوٹی سی ہے ممّی کہ چل بھی نہیں سکتی۔"

"ارے تم ہی تو اُسے چلنا پھرنا سکھاؤ گے۔ اس کے پاس چلے جایا کرو تمہیں دیکھ کر تالیاں بجاتی ہے، کہتی ہے آہا آہا میرا بھیّا آ گیا ہے۔" موتی ہنس پڑا۔ "اور بیٹا اپنے پاپا

کے ساتھ گپ لگایا کرو، ان کے ساتھ بھی کھیلا کرو۔"

"نہیں ممّی۔" موتی نیّا کی گود سے نکل کر قالین پر بیٹھ گیا۔

"کیوں بیٹا، پاپا سے کٹی ہے؟" نیّا اس کے قریب چلی گئی۔ "پاپا آپ کو اچھے نہیں لگتے کیا؟"

"ممّی جب آپ پاس نہیں ہوتیں تو پاپا مجھے گندی گالیاں دیتے ہیں۔"

"کیسی گالیاں؟"

"ہر وقت کہتے ہیں، سؤر کی اولاد، حرام کی اولاد۔ ممّی! یہ حرام کی اولاد کیا ہوتی ہے؟"

نیّا کا بے اختیار جی چاہا کہ کہیں سے وہ رازی کو اسی وقت پکڑ کر لائے اور اُس کا سر زمین پر مگر وہ گم صُم سی بیٹھی رہی۔ اُس نے موتی کی بات کا جواب نہیں دیا۔ موتی نے ماں کو چُپ دیکھا تو بولا۔

"ممّی! ایک دن جب آپ غسل خانے میں تھیں تو نانی اماں کو بھی گالیاں دے رہے تھے۔"

"اچھا۔" نیّا ڈر گئی۔ "کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہہ رہے تھے مکّار بڑھیا یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتی یا اس کتیا کو چھ

وہ سیپ کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہے تھے۔ میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے

میری بیٹی کو اس حرامی کے پاس مت لٹایا کرو، اس کی نحوست کا سایا اس پر بھی پڑ جائے

نیّا کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ رازی ایسی گھٹیا باتیں بھی کر سکتا ہے۔ مہذب، مہذب

نکھرے، اُجلے اُجلے روپ والے لوگ اندر سے کس قدر مکروہ ہوتے ہیں۔ لیکن

ہر بار دھوکہ کیوں کھا جاتی ہیں۔

"اچھا بیٹا تم مجھے اپنے اسکول کی باتیں بتاؤ؟" نیّا نے موتی کا دھیان ہٹانے

باتوں کا رخ پھیر دیا۔ اُس کو اچھی طرح بہلا پھسلا کر جب وہ اُٹھی تو جلتے تیل کی طرح

بول رہی تھی۔

رات کو رازی آیا تو بہت اچھے موڈ میں تھا۔ مگر نیّا کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ بات

کا بہانہ ہی تلاش کر رہی تھی کہ کچھ ملنے والے آ گئے۔ پھر کچھ اور لوگ آ گئے۔ یہ سلسلہ رات

دیر تک جاری رہا۔ نیّا اور رازی یوں ہنس ہنس کر مہمانوں کی پذیرائی اور تواضع کرتے رہے

جیسے ان سے زیادہ محبت کرنے والا جوڑا روئے زمین پر نہیں ہے۔ بات بات پر رازی

ہنسا رہا تھا اور ہر ہر فقرے پر نیّا اس کو داد دے رہی تھی۔ اس وقت نیّا سوچ رہی تھی کہ

شیکسپیئر نے اس دنیا کو اسٹیج کہا تو کچھ غلط نہیں کہا۔ مگر اس اسٹیج پر سب سے بڑے اداکار

تو مرد ہیں ہی ہوتے ہیں۔ قادرِ مطلق یوں زندگی کے ساتھ اچھا ڈرامہ کھیلنے پر انہیں بچّوں

کی صورت میں ایوارڈ دیتا ہے۔ کاش یہ ایوارڈ زندگی کے لئے نئے راستے کھول سکتے۔!

جب رازی دفتر جانے لگا۔ تو کہنے لگا۔

"تم بھی تیّار ہو کے میرے ساتھ چلو، ایک دوست سے ملنے جانا ہے۔" بچوں کو

لے بغیر نیّا جلدی سے تیّار ہو گئی کیونکہ تیّاری میں دیر لگانے کو رازی بالکل پسند نہیں کرتا

اور نیّا کو غیر ضروری ناز نخروں کا طعنہ کئی بار دے چکا تھا۔ تیّار ہو کر نیّا نے لباس پر

پرفیوم چھڑکا اور جلدی سے آ کر اس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ گئی۔ رازی نے موٹر اسٹارٹ

کر کے سگریٹ سُلگایا تو امپورٹڈ تمباکو کی خوشبو موٹر میں پھیل گئی۔ نیّا کو یہ خوشبو بہت پسند

تھی۔

"شاید تمہیں علم ہو نیّا۔" رازی نے ونڈ اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے کہنا شروع کیا

"حکومت نے ساری فنانس کمپنیاں بند کر دی ہیں۔"

"ہاں میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔" نیّا نے آہستہ سے کہا۔

"اس سلسلے میں مجھ پر ایک کیس چل رہا ہے۔"

"لیکن تمہاری کمپنی تو فراڈ کمپنی نہیں تھی۔" نیّا جلدی سے بول اٹھی۔

"میں نے تم سے ہمدردی کی بھیک تو نہیں مانگی۔" رازی سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں اکیلا ہی تو اس کی زد میں آنے والا نہیں۔ کاروبار میں تو ایسا ہوتا رہتا ہے۔ نشیب فراز آتے رہتے ہیں۔ مگر میں کافی دنوں سے پریشان ہوں اور اب اسی ضمن میں اشرف صاحب کے ہاں جا رہا ہوں۔ وہ اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کر سکتے ہیں۔"

"کیا ان کے گھر جا رہے ہو۔؟"

"نہیں اس وقت وہ دفتر میں ہوں گے۔" نیا خاموش ہو گئی۔

"اگر میں کہوں کہ میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ تو تم میرے لئے کیا کرو گی؟"

"جو تم کہو گے۔ ظاہر ہے شوہر کی پریشانی بیوی کا چین بھی لے اڑتی ہے۔"

"میں تمہیں تھوڑی دیر کے لئے اشرف صاحب کے ہاں چھوڑ جاؤں گا۔ مجھے اپنے وکیل سے ملنا ہے۔"

"اور میں یہاں کیا کروں گی؟" نیا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تم ان کے پاس بیٹھو۔۔۔۔ ان سے مقدمے کے بارے میں بات کرو۔"

"یہاں دفتر میں اور لوگ بھی ہوں گے۔"

"نہیں کوئی نہیں ہو گا۔ میں نے انہیں فون پر بتا دیا تھا کہ میں اور نیا آئیں گے۔"

"مگر تم بھی ساتھ رک جاؤ نا؟ میں کیا بات کروں گی۔"

"اب جاہل عورتوں والی باتیں نہ کرو۔"

"کام کی نوعیت کو تو تم ہی سمجھا سکتے ہو۔"

"ہاں مگر تم ان کا دل خوش کرو گی اس طرح کہ وہ میرا کام بلا چوں و چرا کر دیں۔"

ایک شعلہ سا نیا کے پاؤں سے اٹھا اور سر کی جانب چلا گیا۔ اس نے غصے اور بے یقینی سے رازی کی جانب دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا مگر جبر کر لیا۔ مبادا اس نے غلط سمجھ لیا ہو اور بات منہ سے نکل جائے۔ ورنہ کوئی شوہر اتنا بے غیرت کس طرح ہو سکتا ہے۔

...صاحب کیسے آدمی ہیں ان کے بارے میں افواہیں اکثر پھیلتی رہتی تھیں۔ ان کے ...صحیح وسالم واپس آجانا بالکل اسی طرح تھا جیسے کوئی پانی میں اتر جائے مگر ...نکل آئے۔ پھر بھی اس نے اپنے سوال کو کچھ اس طرح ترتیب دیا۔

"...وش کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔"

"...م اتنی معصوم نہیں ہو کہ اس کی بھی وضاحت کرنی پڑے گی۔"

"...ن کر دو نہیں جانتی پھر۔"

"...ر اندر جا کر سب کچھ سمجھ جاؤ گی۔" رازی نے گاڑی دفتر کے باہر روک لی۔ "ٹھیک ...ت نیا کو ایسا لگا جیسے گاڑی کے شیشے سے امی جان کی دو اداس آنکھیں جھانک ...ی ہوں۔ "اچھی طرح اتا پتہ کر لو۔۔۔۔ کون ہے۔۔۔۔ کیا کرتا ہے۔۔۔۔"

...رازی! نیا نے آہستہ سے کہا۔

"...اگر تم مجھ سے کہو کہ اسی وقت سامنے سڑک پر جا کر لیٹ جاؤ اور میں تمہارے اوپر ...گزار کر لے جاؤں گا۔ تو میں فوری تمہارا حکم بجا لاؤں گی، مگر اشرف صاحب کو ...برے بس کی بات نہیں ہے۔" رازی ایک دم سلگ اٹھا، مگر غصہ دبا کر بولا۔

"...یری بقا کا سوال ہے۔"

"...ری بھی ایک بقا ہے رازی۔"

"...رت کی بقا مرد سے الگ نہیں ہوتی۔"

"...یری انا کا سوال ہے۔"

"...شوہر کے کیریئر سے قیمتی نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں کیریئر کے آگے ہر شے ہیچ

...کیریئر اپنے زور بازو اور اپنی قابلیت سے بناتے ہیں۔ عورتوں کو سیڑھی

"ذلیل عورت تم کو بحث کرنے کی بڑی عادت ہے۔ ذرا سا لکھ پڑھ لیا تو جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگیں۔ کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو۔؟"

"کیا میں بات بھی نہ کروں رازی۔؟"

"بات میں وزن بھی تو ہو۔"

"تم جانتے ہو اشرف صاحب کیسے آدمی ہیں۔ اگر میں ان کے کمرے میں بیٹھ کر واپس آئی تو لوگ کیا کہیں گے۔؟"

"یہ میرے سوچنے کی بات ہے۔"

"رازی تم کیسے شوہر ہو۔؟" نیا نے آہستہ سے مگر نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"بکواس بند کرو۔" رازی غصّے سے بلبلا اٹھا۔ "تم نے ہنی مون کے زمانے میں میرے سر کی قسمیں کھائی تھیں کہ تم میرے اشاروں پر چلو گی۔"

"رازی! میں آج بھی ان وعدوں پر قائم ہوں۔ تم میری جان لے لو مگر مجھے...."

"مجھے تمہاری فضول سی جان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مشکل میں ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تم میری مدد کرو۔"

"میں ایک شریف عورت ہوں۔" نیا نے حد درجہ نرمی سے کہا۔ "بیوی بن کر رہنا چاہتی ہوں اور تم نے مجھے عزّت کی زندگی دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"اور کیا میں نے تمہیں عزّت کی زندگی نہیں دی۔؟ خوبصورت گھر، آسائشیں، شہر میں کتنی عورتیں تمہاری طرح رہتی ہیں؟"

"اور میں اس کے لئے تمہاری مشکور رہتی ہوں۔"

"تمہارا صرف مشکور رہنا میرے کام نہیں آسکتا۔"

"رازی میں وہ کام نہیں کروں گی۔ جس کی اجازت میرا ضمیر نہیں دیتا۔"

"اور خانم کے لئے تم سب کچھ کرنے کو تیار تھیں۔" نیا کے ذہن میں ایک دھماکا سا

"میں نے خانم کے لئے کوئی اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں کی تھی۔ تنخواہ لیتی تھی اور عزّت و آبرو سے کام کرتی تھی۔"

"اسی لئے وہ بزنس کے حصول کے لئے تمہیں یورپ لے گئی تھی۔"

"اور تمہارا خیال ہے میں نے اس کی بات مان لی تھی۔؟"

"اب تم عورتوں کی طرح قسمیں کھانے لگ جاؤ گی تو میں کون سا یقین کر لوں گا۔"

"کیا تم نے میرے ساتھ شادی اسی لئے کی تھی۔" ایک دم پلٹ کر نیا نے پوچھ ڈالا۔

"شاید یہ وجہ بھی شامل ہو.... مجھے کاروبار میں ایک ایسی ہی عورت کی ضرورت تھی۔"

"اوہ.... رازی۔ میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کوئی آدمی اس حد تک گھٹیا ہو سکتا ہے۔ میں نے تو سنا تھا کہ لوگ جب طوائفوں سے شادیاں کر لیتے ہیں تو انہیں بھی پردہ نشین بیویوں کی طرح احترام سے رکھتے ہیں اور تم ایک شریف عورت سے غلط کام لینا چاہتے ہو۔؟"

"الو کی پٹھی۔ میں جانتا ہوں۔ کتنی بڑی شریف زادی ہے تو۔ تیری شرافت کے روپیہ تو نہیں دے سکتی مجھے زندہ رہنے کے لئے اور ٹھاٹ باٹ کے لئے روپے کی ضرورت ہے۔ اگر میرا کام نہیں کر سکتی تو اپنے میکے سے روپیہ لا دے میرے لئے۔"

میکہ۔ کتنا درد تھا اس چھوٹے سے لفظ میں۔

میکہ عورت کے دل میں ناسور کیوں بن جاتا ہے۔ میکے کا طعنہ قبر میں بھی ساتھ جاتا ہے۔

میکہ کیا ہے میرے مولا۔؟ ایک مجبور و بیکس ماں جو خود دو روٹیوں کی محتاج ہے۔ نیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاید اس لفظ میں آنسو گیس چھپی ہوئی تھی۔ سارا منہ آنسوؤں سے بھر گیا۔

"منحوس عورت! جب سے میرے گھر آئی ہے۔ رو رہی ہے۔ میرا سب کچھ تیری

دست لے گئی ہے۔ کم بخت نہ دفعان ہوتی ہے نہ مرتی ہے۔" اس کو روتا دیکھ کر وہاں
مع اکٹھا ہونے لگا تھا۔ اس لئے رازی نے موٹر گھر کی طرف موڑ لی۔

"الو کی پٹھی، حرام زادی۔ چار دن کھانے کو نہ ملے تو نام نہاد شرافت کا بھرم کھل
جاتے گا۔" پھر جتنی گالیاں اُسے یاد تھیں اُس نے ایک سانس میں نیا کو دے ڈالیں۔
بس روتی رہی۔ سڑک پر چلتے ہوتے لوگ انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ رازی
ل موٹر چلا رہا تھا جیسے لوہے کا آدمی ہو۔ آنسوؤں کے آبشار بہہ جائیں مگر وہ ٹس سے
س نہیں ہوگا۔ بالآخر موٹر گھر کے باہر ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ نیا اُتر کر اندر چلی گئی اور
ازی واپس چلا گیا وہ سیدھی اپنے بیڈ روم میں گھس گئی اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔
وب صورت لال پیلے پھولوں والی ساڑی آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی اور دل لہولہو ہو
رہا تھا۔ کپڑے بدل کر پلنگ پر گر گئی۔ جب جی بھر کر رو لیا تو اٹھ کر آئینہ دیکھا۔ آنکھیں سوج
گئی تھیں اور ناک لال ہو رہی تھی۔ تیزی سے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر منہ صاف
کرنے لگی کیوں کہ سیپ کے رونے کی آواز آ رہی تھی اور امی جان کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ
آ گئی ہے۔ . . پھر ے کو ٹھیک کر کے کاجل لگایا اور بچوں کے کمرے میں چلی گئی۔ روتی
ہوئی بیٹی کو اٹھا کر کلیجے سے لگایا تو محسوس ہوا جیسے امی جان اُسے ایک ٹک دیکھے
جا رہی ہیں۔ اس نے امی جان کی آزردہ آنکھوں سے اپنی آنکھیں نہیں ملائیں، نظر چرا کر
بچوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔ کھیلتی جاتی اور سوچتی بھی جاتی کہ اب اتنی بڑی بغاوت کے
بعد رازی اُس سے کیا سلوک کرے گا۔ آج تو تمام سوال و جواب کھل کر سامنے آ گئے تھے۔

امی جان اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے اس پر پہنا ترس کر رہی ہوں۔
مگر ان کی نگاہ کیسی تھی۔ ! نیا تھرا گئی۔ اس کا دل چاہا کہہ دے۔ "ماں مجھے اس طرح
نہ دیکھ۔ نہ دیکھ اس طرح !" بہت دیر بعد امی جان جیسے کنوئیں کے اندر سے بولیں۔
"نیا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹی۔" نیا لرز گئی۔ امی جان کا لہجہ رو رہا تھا اور

الفاظ کراہ رہے تھے۔ امی جان کی آنکھیں گلہ کر رہی تھیں اور امی جان کا ایک ایک رواں احتجاج
کر رہا تھا۔ نیا کا دل چاہا کہ امی جان کے گلے لگ کے خوب خوب روئے۔ ہمدردی کے
بول تلوار سے بھی زیادہ کاری ہوتے ہیں۔ حوصلوں کے پہاڑ چیر دیتے ہیں اور آنسوؤں
کے جگر میں گھس جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ محبت کی صدا پہچان کر کٹورا سی آنکھیں
چھلک اٹھتی ہیں۔ نیا نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو آنکھوں کے کٹوروں میں سنبھالے اور
اپنی آواز پر قابو پا کر بولی۔

"امی جان میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تو مجھے کئی دنوں سے سست سی لگ رہی ہے۔" نیا سوگواری سے مسکرائی۔ "تو
نے مجھے جنم دیا ہے نا ماں۔ اس لئے تو پوچھنے کے کئی طریقے جانتی ہے۔"

"بس امی رات کو دیر تک مہمان آتے رہتے ہیں اور جاگ جاگ کر میرے سر میں درد
رہنے لگا ہے۔"

"جا تیل کی شیشی اٹھا لا۔ میں تیرے سر میں تیل ڈال دوں۔ کیسا جھاڑ سا بن رہا ہے۔
بال ہی بدرنگ ہو گئے ہیں۔" نیا ساکت بیٹھی رہی اور سیپ سے کھیلتی رہی تو امی خود
ہی اٹھ کر چلی گئیں اور تیل کی شیشی اٹھا لائیں۔ نیا نے بال کھول کر یوں سر آگے کر دیا۔ جیسے
مزاحمت کی ہمت نہ ہو۔ امی جان نے ہتھیلی بھر کے ٹھنڈا ٹھنڈا تیل نیا کی مانگ میں الٹ
دیا تو اسے گدگدی بھی ہوئی اور جھرجھری بھی آ گئی۔ یہ ٹھنڈا ٹھنڈا تیل مانگ کے راستے
بیکاریوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھر گیا۔ جس پر امی جان اپنی ضعیف انگلیاں چلانے لگیں۔

ان انگلیوں میں کیا تھا۔ ؟ نیا کے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ ان انگلیوں کا لمس
تو دنیا میں کہیں نہیں ملتا۔ ! ماں کو تو نے کیوں پیدا کیا خدایا !

اپنی انگلیوں کی پوروں سے ۔ بیٹی کے دل کا درد بانٹ لینا چاہتی ہے۔

"بیٹی اپنا دھیان رکھا کرو۔" دھیرے دھیرے امی جان نے لب کھولے ایک

ہی [illegible] بچی کی پیدائش کے بعد تم نے اپنا آپ چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ چہرے پر وہ چاندنی نہیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ جسم بے ڈول ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے کی طرح اپنے آپ کو ٹھیک ٹھاک رکھو۔ امی جان تھوڑی دیر یہ رہیں پھر لولیں۔" رُوپ کی کلیاں مرجھا جائیں تو مرد بھونرے کی طرح اُڑ جاتا ہے۔ تمہارا شوہر اور طرح کا ہے اُسے خوش رکھا کرو۔"

"خوش رکھوں ماں؟" نیا نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے کہ کہیں امی جان ان کی نمی محسوس نہ کر لیں اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

کہاں گیا وہ رُوپ کا خزانہ۔؟ اُس نے آئینے کے آگے کھڑی ہو کر سوچا۔ کون لے گیا پھول اور پنکھڑیاں۔ خوشبو میں۔ نکہتیں۔ جوانی ایک بڑی حقیقت ہے یا۔ سچی خوشی جوانی کا راز ہے!

جونی بتی کا اشارہ دیکھ کر نیا چونکا ہے پر رُکی۔ وہ چونک سی گئی۔ ہاں وہ رازی [illegible] کی کار تھی۔ مگر اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر ایک اور عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک دھار دار خنجر نیا کے کلیجے میں اتر گیا۔ جس کی چبھن اس نے ہونٹوں میں دبا لی۔ لب سڑک تڑپنا [illegible] کچھ ٹھیک نہیں لگا۔

موٹر دوسری طرف زن سے نکل گئی تھی اور اس کے آگے وہ دیکھ نہ سکی تھی۔ مگر [illegible] نے موٹر کا نمبر بطورِ خاص پڑھ لیا تھا۔

لڑائی، جھگڑا، بے عزتی، مار کٹائی تو عورت ہنس کر برداشت کر لیتی ہے، مگر [illegible] ری عورت۔!

دوسری عورت کا کرب اعتماد کے آسمان میں چھید کر دیتا ہے۔

نیا کو یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف سے بھڑکتے شعلوں نے اُسے اپنی لپیٹ [illegible] لے لیا ہے۔ جا تو رہی تھی کسی اور جگہ مگر سگنل کا اشارہ کھلتے ہی اس طرف مڑ گئی، [illegible] رازی کی موٹر گئی تھی۔ آج وہ رازی کا پیچھا کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پیچھا کرنے کو تو کئی [illegible] بھی دل چاہا تھا۔ کئی ماہ سے وہ اس سے دُور دُور رہنے لگا تھا۔ اُس سے ہر قسم

کا تعلق توڑ لیا تھا۔ وہ اُس کی منکوحہ تھی۔ اس کے شب و روز کا حساب رکھنا چاہتی تھی۔ نیّا کو اس بات کا حق حاصل تھا۔ مگر ابھی تک وہ اس کے شب و روز سے بے خبر تھی۔ دن کا ایک حصّہ کام کر کے شوہر عموماً گھر آجاتے ہیں اور پھر جہاں جہاں جاتے ہیں، بیوی ساتھ ہوتی ہیں یا بیویوں کو اپنے ٹھکانے بتا کے جاتے ہیں، مگر رازی۔ گم صُم ہو کے ایک راز بن گیا تھا۔ اپنی ذات کا ایک سرا بھی نیّا کے ہاتھ میں پکڑانے کو تیار نہیں تھا۔ نیّا خالصتاً گھریلو عورت نہیں تھی۔ باہر کی آدھی دنیا دیکھ چکی تھی اور باقی اُس کے زرخیز ذہن نے اُسے بتا دی تھی۔ کُڑھتی رہتی۔ اُلجھتی رہتی۔ لڑتی تو بدمزگی ہو جاتی۔ جو کئی کئی دن چلتی تھی جب تک باہر کے سراب مرد کو نہ لبھائیں۔ وہ بیوی سے منہ نہیں موڑتا۔ اسی لئے وہ اس کا پیچھا کر کے یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ کہاں جاتا۔ کیا کرتا ہے۔ اس کے کون سے اڈے ہیں، مگر ڈرتی تھی۔ رازی اور طرح کا آدمی تھا۔ اگر اُس کو پتہ چل جاتا کہ وہ اُس کا پیچھا کرتی ہے۔ تو جانے کیا غضب ڈھا دیتا۔

مرد کی ازلی فطرت کی طرح اگر اور ضد میں آگیا تو کیا ہوگا۔؟

بے حیا، بدلحاظ ہو گیا تو کیا ہوگا۔؟

جھٹکے سے سب تعلق توڑ لئے تو کیا ہوگا۔؟

بس انہی توہمات میں گھری کُڑھتی رہتی۔ آج جب اپنے وسوسوں کو مجسم دیکھ لیا تو بے اختیار اسی راستے کی طرف مڑ گئی۔ جدھر رازی کی موٹر گئی تھی۔ تھوڑی دُور جا کر اُسے رازی کی موٹر صاف نظر آنے لگی، گو درمیان میں دو تین موٹریں تھیں۔ مگر وہ ایک زاویے سے اُسے بڑی اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ اس کی کوشش بھی یہی تھی کہ رازی کی موٹر کو اپنی نظروں میں رکھے، مگر خود نمایاں نہ ہو۔ اسی لئے جب فاصلہ کم رہ جاتا تو وہ کسی موٹر بس یا ٹرک کی آڑ میں ہو جاتی۔ رازی کے ساتھ اگلی سیٹ پر ایک جوان لڑکی بیٹھی ہوتی تھی۔ وہ اس کی شکل تو نہ دیکھ سکی تھی۔ مگر باتیں کرنے کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے

ہیں۔ اس لڑکی کے بال کٹے ہوئے تھے اور رنگ گندمی تھا۔ نیّا نے صرف اتنا دیکھا لیوں میں اس پر وہ وہ قیامتیں گزر گئی تھیں کہ اسٹیئرنگ اُس کے ہاتھ سے نکل نکل کبھی تو آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو پیتی اور کبھی اپنا غصّہ اور رنج دبا کر دل کو تسلّی دیتی۔

نادان سنبھل۔ ہوش کر، ابھی نہ جانے اور کیا دیکھنا ہے۔؟

حوصلہ کر، دیکھ۔ اور سمجھ! کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھنا۔

کیسی عجیب ہوتی ہے مرد کی فطرت بھی۔

پھر دوسری طرح سوچتی کہ جب شادی نہیں ہوتی تھی تو رازی اُسے موٹر میں بٹھا کر داران سڑکوں پہ گھوما کرتا تھا۔ اُس کے چہرے سے نگاہ نہیں ہٹاتا تھا۔ کیا کیا کرتا تھا۔

اب وہ ہرجائی کسی اور سے کہتا ہوگا
تو میری جان ہے میں تجھ کو بھلا سکتا نہیں

واقعی۔ مرد کی فطرت تو موسم بدلنے سے پہلے ہی بدل جاتی ہے۔ مگر اسی مرد کے عورت تن من کی بازی لگا دیتی ہے۔

اچانک رازی کی موٹر کھڑی ہو گئی۔ ایک طرف رُک کر اُنہوں نے ٹھنڈا کرش پیا۔ نیّا نے اپنی گاڑی ایک گلی میں پارک کر لی۔ وہ دونوں کولڈ ڈرنک پیتے رہے اور ان کے گھونٹ پیتی رہی۔ وہ لوگ پھر مسکراتے ہنستے ایک خاص سمت مڑ گئے۔ نیّا نے ان کے پیچھے موٹر لگا دی۔ نیّا تو کیا کرنے جا رہی ہے؟ اور کیا کرنا چاہتی ہے؟ وہ اپنے آپ سے پوچھتی رہی۔ آخر کہاں تک ان کا پیچھا کرے گی؟

جہنم تک کروں گی۔ اور دیکھوں گی یہ کیا کرتے ہیں؟ کیا تو نہیں جانتی کہ ایک شادی شدہ ایک جوان لڑکی کو اپنی موٹر میں کیوں بٹھا کر لے جاتا ہے؟ محبتوں کی منزلیں تو اس

پر سے گزر چکی ہوتی ہیں وہ تو صرف لمحوں کا شکاری ہوتا ہے اور لمحوں کے شکاری پر کمند کہاں ڈال سکے گی۔؟

نہیں۔ میں ان کو پکڑوں گی اور رنگے ہاتھوں پکڑوں گی۔ روز مجھے طعنے دیتا ہے کہ میں بُری عورت ہوں۔ میں اسے بتا دوں گی کہ وہ بُرا ہے یا میں۔ مگر کہاں پکڑ سکے گی ان کو پگلی۔ کہاں تک ان کے پیچھے جائے گی۔ پتہ نہیں یہ دونوں کہاں جا رہے ہیں۔

"میں بھی وہیں جاؤں گی لیکن اگر لینے کے دینے۔"

"اور جو لینے کے دینے پڑ گئے تو؟"

ہاں — وہ دل تھام کر سوچنے لگتی۔ رازی بڑا چالباز آدمی تھا۔ پینترا بدلتے اس کو دیر نہیں لگتی تھی اور اپنی ہر کمزوری کا رخ ایک دم اپنے کاروبار کی جانب موڑ دیتا۔ دنیا میں وہ جو کچھ کرتا تھا۔ اس کی اس کے کاروبار کو ضرورت تھی اور نیا سے جو بھی غلطی ہو جاتی وہ بُری طرح اس کے کاروبار پر اثر انداز ہوتی تھی۔ ہر تیسرے فقرے کے بعد کہتا۔

"پیٹ کا دھندا سب سے بڑا دھندا ہے۔"

"اگر تمہیں یہ روٹی نہ ملے تو تمہاری ساری مستی نکل جائے۔"

"پیٹ بھر کر کھانا مل رہا ہے نا اس لئے اکڑتی ہو۔"

"پیٹ بھر کر تو وہ تب بھی کھاتی تھی، جب خود کماتی تھی۔ یہ مرد زندگی میں روٹی کے کس قدر طعنے دیتا ہے، اور جو عام آدمی سے ذرا زیادہ کما لیتا ہے، اس کے مزاج کے بارے میں تو پوچھو ہی نہیں۔ بیوی کے دونوں جہاں خرید لیتا ہے۔ کیا غریب مرد نہیں ہوتا۔؟ دھک۔ ایک چیز دل کے اندر ٹوٹی۔

"کم بخت یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔؟ ایک روز تو نے غریب مرد کو ٹھکرایا تھا وہ گھر کے اندر رکھتا تھا۔ روٹی کپڑے کی تنگی دیتا تھا مگر تن پہ بے وفائی کے انگارے برساتا تھا۔ تجھے اونچے محل۔ شاندار آدمی۔ آگے پیچھے موٹریں پسند تھیں نا؟ یہ

آدمی۔ اپنی بیوی کو ڈیکوریشن پیس بنا کے رکھتے ہیں اور دل کی محفل کہیں اور

ہیں۔

ہی خوبصورت پھول کیوں نہ ہوں گلدان میں پڑے پڑے ایک دن مرجھا

چاہے تازہ پانی ڈالو۔ تازہ ہوا بخشو۔ دھوپ دو۔ چاندنی دو۔ ڈال کے

ہی اور ہے۔ گلدان میں سجنا تو نے خود پسند کیا تھا۔

کی موٹر ایک گھر کے آگے رُک گئی۔ اس نے دو چار ہار دن دیئے! ایک وابہیات سی

باہر نکل آیا۔ اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ موٹر پھر چل پڑی۔

تو اُن کے سر پہ پہنچ جائے گی۔ تو کیا کرے گی۔؟ وہ جھٹ کہہ دے گا۔

کاروباری ضرورت ہے۔" ایک تو اسے رازی کے کاروبار کی سمجھ نہیں آتی

سے وہ ملنے کو منع کرتی وہ آدمی اس کی کاروباری مجبوری بن جاتا۔ جس جگہ

کی کاروباری ضرورت ہوتی وہ تو بے چارا کھاتا پیتا بھی کاروباری ضرورت

پھر بھی نیا کو اس کا کاروبار سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

رک کر انہوں نے کھانے پینے کی بیشمار چیزیں خریدیں اور پھر ان کی موٹر

بے" کی جانب ہو گیا۔ تب نیا کو سمجھ آئی کہ باقاعدہ پکنک منانے کا پروگرام

ہے۔ وہاں انہوں نے ایک ہٹ بھی لے رکھی ہو۔ اور۔ جونہی نسبتاً

اور ویران سی سڑک آئی۔ نیا چونک گئی۔ اب پکڑے جانے کا ڈر تھا کیونکہ راستے

آمد و رفت نہیں تھی۔ اس نے اپنی رفتار آہستہ کر لی۔ ممکن ہے رازی کی نظر اس پہ

اور سڑک پر ہی اس پہ آگ برسانے لگے اور اس ذلیل عورت کے سامنے گالیاں

اس کا دل چاہا تھا کہ گاڑی رکوا کر اس کمینی فاحشہ عورت کے بال نوچ لے اور

سے لال کر دے۔ مگر اس میں اس عورت کا کیا قصور تھا۔؟ لٹکاؤ مال تو کوئی

ہے۔ یہ سوچتے سوچتے نیا ایک موٹر پر رُک گئی۔ رازی کی موٹر جیسے سڑک پہ

تیرتی آگے بھاگی جا رہی تھی۔ رازی آگے دیکھنے کا عادی تھا پیچھے نہیں۔ نیا اس
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے بہتوں کے نشان دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل تنور کی طر
رہا تھا۔ اور ایسے لگ رہا تھا جیسے اعصاب کو کسی نے کلف لگا دیا ہے۔ تن
اکڑ گئے تھے۔

یہ کیسے جذبے ہیں خدایا۔ ؟ جب شوہر سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ جب
کی کجی روی دل کا خون کر دیتی ہے، تو پھر اس کو دوسری عورت کے ساتھ دیکھ کر
محسوس ہوتا ہے۔

وہ جذبات کے پُل صراط پر کھڑی تھی۔ ایک بال برابر لکیر تھی۔ جہنم اور جنت
گرے گی وہ۔ ؟

"کیا میں عورت نہیں ہوں۔ ؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ میرے
نہیں ہیں۔ ؟ مجھے زندگی کی رموز کا پتہ نہیں ہے ؟ یا مجھے جسمانی رفاقت کی ضرو
ہے۔ ؟ میں بیاہتا ہوں۔ مگر تنہائی کے لق و دق صحرا میں کھڑی ہوں۔ کس جرم کی
میں مجھے بے حسی کی چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ ؟ اس کے اندر ایک ابال اٹھا
خبیث مرد کو مزا چکھا سکتی ہوں۔ میں بھی بوائے فرینڈ رکھ سکتی ہوں میرے بھی
ہیں اس شہر میں۔ ایک دن ذرا کسی اور کی موٹر میں بیٹھ کے دیکھوں گی صاحب زاد
محسوس کرتے ہیں، اتنا وسیع القلب بنتا ہے یہ مرد۔ کیا اپنی بیوی کو کسی اور کے
دیکھ سکتا ہے۔ ہاں اس کے لئے سب جائز۔ کیونکہ یہ سماج اسی کا بنایا ہوا
مگر عورت کیوں اپنے اوپر پہرے بٹھائے۔ ؟

تم کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو نیا۔ ؟ اپنا غصہ تھوک دو۔ تم صرف جل کڑھ سکتی
کیونکہ تمہارے اندر ابھی تک خواجہ عبدالرحیم بیٹھا ہوا ہے۔ اس لئے تم لیکچر
بچتی چلی آ رہی ہو۔ اور زور و شور سے بہتے دریا سے خشک نکل آئی ہو۔

ہی میں کیا کرتی ہوں۔ یہ بد دیانت، دھوکے باز رات کو گھر آئے، اچھی
ں گی۔ اب تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور مجھے اپنا حق چھیننا
بزدل نہیں کہ راستہ بدل کے نکل جاؤں۔ مگر نیا نے محسوس کیا کہ وہ رو رہی ہے
ہے۔ ؟ اسے اپنے رونے پر بھی غصہ آیا۔ اپنے آنسو صاف کئے اور ایک
موٹر اسٹارٹ کر کے موڑ لی۔ اب رازی کی گاڑی کہیں نظر نہ آ رہی تھی۔ دُور پرے
ں نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ آگے جاتی تو انہیں ڈھونڈ سکتی تھی مگر اس کے اعصاب
رہے تھے، اس نے واپس چلے جانا ہی مناسب جانا۔ جونہی رفتار کی سوئی
گھڑی پر بھی آپ ہی آپ نظر پڑ گئی۔ اس وقت شام کے چار بج رہے تھے
بجے گھر سے نکلی تھی اور چار گھنٹوں سے ان سڑکوں پر پھر رہی تھی۔ کیا پایا اس
ا کے۔ آج اگر اپنی ذاتی موٹر میں یوں گھومنے کی عادت نہ ہوتی تو وہ
بیٹھی ہوتی اور اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلتا کہ باہر اس کا شوہر کیا کرتا پھر رہا ہے
ناع ہو گیا تھا۔ اصل میں وہ اپنی ایک ڈاکٹر دوست کے ہاں جا رہی تھی۔ اس
کے معائنہ کے لئے وقت لینا تھا۔ رات بھر امی جان کراہتی رہی تھیں ایک
تھیں۔ صبح اٹھیں تو بہت سست لگ رہی تھیں۔ نیا نے بار بار پوچھا بھی
لگائیں۔ بولیں۔ "فکر نہ کرو میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔" اس نے امی جان
ہرے زرد چہرے کی طرف دیکھا تو وہ اسے کچھ ضرورت سے زیادہ زرد
رائی اور سناٹا تھا اس چہرے پر۔ جھریاں تہہ در تہہ جیسے ایک دردناک کہانی کا
تھیں۔ ایک دم نیا کو امی جان پر ٹوٹ کر پیار آنے لگا۔ اپنے ردِ عمل پر شرم
زندگی میں قدم رکھنے کے بعد وہ امی جان سے بالکل بے پرواہ ہو گئی
باقاعدگی سے ڈاکٹر کو دکھاتی، نہ علاج معالجے پر زور دیتی۔ بس کھڑے کھڑے

ان کا حال پوچھتی اور دوا لا دیتی۔ نئی زندگی کی الجھنوں نے اسے امی جان سے ذہنی طور پر دور کر دیا تھا۔ آج غور کیا تو امی جان ہمیشہ سے زیادہ کمزور اور خستہ حال نظر آئیں۔ اسے دل ہی دل میں شرم آئی تو بولی۔

"امی جان چلئے میں آپ کو ڈاکٹر حسینہ کے پاس لے چلوں۔ وہ میری دوست ہے اور حال ہی میں امریکہ سے آئی ہے۔ بہت بڑی فزیشن ہے رات کو اپنے کلینک میں ہوتی ہے۔ مگر اس وقت اسپتال میں مل جائے گی۔"

"نہیں بیٹی۔ مجھے چکر آ رہے ہیں۔ دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی میری فکر مت کرو۔"

"اچھا۔" نیا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں خود ہی اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔ اگر وہ اسپتال میں مل گئی تو وہاں سے اسے گھر لے آؤں گی۔ ورنہ رات کو آپ کو میرے ساتھ جانا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" امی جان آہستہ سے کہہ کر بستر پر دراز ہو گئیں۔

"میں جاؤں امی آپ ٹھیک ہیں۔؟"

امی جان نے نگاہ اٹھا کر نیا کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ "پاگل ہو تم۔" کمرہ خالی، ڈراؤنی اور کتنی عجیب تھی وہ نگاہ۔ نیا کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ کہے۔ امی ایک بار پھر میری طرف دیکھیئے۔" مگر اسے کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ کیا وہ اس نگاہ کو دوبارہ دیکھ سکے گی؟ ڈرتے کانپتے دل کو تسلیاں دیتی وہ باہر نکل آئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آج امی جان کے سینے سے لگ جائے ان سے لپٹ جائے اور کہے۔ "ماں میں نے تیرا حوصلہ دیکھ لیا، ساٹھ سال سے تو نے اپنے سینے پر یہ کی سل رکھی ہوئی ہے۔ مگر میں تھک گئی ہوں۔ ٹوٹ گئی ہوں۔ تھوڑا سا صبر مجھے دے دے۔"

اس نے موٹر میں بیٹھتے وقت یہ تہیہ کیا تھا کہ آج کے بعد وہ امی جان کا بہت خیال رکھے گی۔ اپنی سب مصیبتیں اور محرومیاں بھول جائے گی۔ یہ دنیا تو یونہی چلتی رہے گی۔ لوگ یونہی ملتے رہیں گے۔ زندگی تو یہی سلوک کرتی رہے گی۔ مگر وہ درخت جو مرجھا رہا ہے، ہوا کے ایک جھونکے کا منتظر ہوتا ہے۔ سوکھا ہوا پتہ شاخ پر کتنی دیر رہ سکتا ہے۔؟

"نہیں۔" اس نے اپنے واہموں کو جھٹک دیا اور تیزی سے موٹر ڈاکٹر حسینہ کے گھر کے راستے پر ڈال دی۔ وہ کافی دیر سے گھر سے نکلی ہوئی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ موتی ہوسٹل جا چکا تھا۔ آتے ہوئے اس نے آیا کو تاکید کر دی تھی کہ کہیں گھر نہ جائے۔ امی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے سیپ کا رکھے شاید آیا ابھی گھر پر ہی ہو اور اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اب اسے سیدھے جانا ہے۔ امی جان کو لے کر چھ بجے سیدھی ڈاکٹر حسینہ کے ہاں چلی جائے گی۔ جانے بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ گھر کا خیال آتے ہی اسے احساس ہوا جیسے اسے بھوک لگ رہی ہے۔ جانے جی کو کیا ہو رہا تھا۔ بھوک سے کلیجہ کٹ رہا تھا یا رازی کی دیدہ دلیری سے ہونٹ کس اٹھ رہی تھی۔ کچھ تو ہو رہا تھا جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ایک چوراہے پر ٹریفک بھی رک گئی۔ اس وقت اسے ٹریفک سگنل کی لال پیلی سبز روشنیاں بھی بری لگ رہی تھیں۔ بھیانک دیو کی آنکھیں لگ رہی تھیں۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی اس کی عجیب موٹروں کی قطار میں آکر رکی۔ تو ہر مرد نے جو اس کے آگے پیچھے اس کی موٹر چلا رہا تھا اس کو غور سے دیکھا، بار بار دیکھا وہ عورتیں جو موٹروں میں بیٹھی تھیں انہوں نے اسے بڑے رشک سے دیکھا ایسے دیکھا جیسے اس کے سر پر سینگ نکلے ہوں۔ کبھی وہ بھی ان موٹر چلانے والی عورتوں کو دیکھ کر رشک سے مر مر جایا کرتی تھی۔ آج یوں لگتا تھا زمین پر انہوں نے اپنا حق تسلیم کروا لیا ہے۔ خوبصورت ملبوسات

میک اَپ زدہ چہرے۔ سنولائے ہوئے بال۔

عورت موٹر چلاتی ہوئی خوب صورت لگتی ہے۔

سڑک پر جاتی ہوئی خوب صورت لگتی ہے۔

دفتر میں بیٹھی ہوئی خوب صورت لگتی ہے۔

اس خود مختاری کی قیمت کیا ہے۔؟

ٹریفک پھر چالو ہوگیا۔ موٹریں رینگ رینگ کر اِدھر اُدھر بکھرنے لگیں۔ نیّا نے دیکھا سڑک پر اور عورتیں بھی موٹریں چلا رہی تھیں اسی اعتماد اور تفاخر سے جس طرح کہ نیّا چلا رہی تھی۔

کیا یہ سب عورتیں اپنی زندگی کا بھرم اٹھائے ہوتے ہیں۔؟

ان کے بھی دل خالی ہیں۔ مگر ہاتھ میں موٹر کی چابیاں ہیں۔؟

کیا انہوں نے بھی موٹروں کے پس پردہ سمجھوتے کر رکھے ہیں۔؟

کیا ان کے شوہروں نے انہیں موٹروں کے عوض خرید رکھا ہے۔؟

یا موٹریں دے کر اوٹ میں کر دیا ہے۔ کچھ تو ہے۔ کہ مرد الگ ہو کر مطمئن ہے

اے عورت! کیا تو خوش ہے۔؟ موٹریں چلا کر۔ جہاز اڑا کر۔ دفتر میں بیٹھ کر۔؟

اے عورت! کیا تو نے اپنا گھر، رسوئی، آرام دہ بستر، محبت اور مامتا رہن رکھ دی ہے۔ ان دنیوی آسائشوں کے عوض؟ زمانے نے بہت کچھ دیا ہے تجھے۔ شعور، علم ادراک اور خود مختاری۔ مگر یہ چین سے آواز کہاں سے آتی ہے۔

"تو کہاں رواں ہے۔؟"

کھوکھلی چیزوں کے عوض تو نے وزنی سکّے کھو دیئے ہیں۔ اپنے اوپر غلاف چڑھا لئے ہیں تو نے۔ پی ایچ ڈی نے نگل لیا ہے تجھے۔ نیّا چپکے چپکے رونے لگی۔ سمجھ نہ آئی آپ ہی آپ رونا کیوں آرہا تھا۔؟ آج اسے موٹر چلاتی ہوئی ہر عورت دکھی لگ رہی تھی۔

اپنے اوپر ماسک چڑھا کر بیٹھی ہے۔ صدیوں پہلے کی جاہل عورت آج اسے اچھی لگنے لگی۔ جو لاعلم تھی۔ لاپروا تھی۔ پھر اسی وقت اسے امّی جان کا خیال آگیا۔ وہ عورت بھی کتنی مظلوم ہی تھی۔ ہم کم از کم اپنے حق کے لئے آواز تو اٹھا سکتے ہیں۔ مگر اس بیچاری کی تو زبان داغ دی جاتی تھی۔ اللہ جی! عورت کو کس مٹی سے گوندھا ہے تو نے، ایک بار یہ پتہ چل جائے۔ تو اس مٹی کی ایک ایک چٹکی ضرور ان مردوں کو کھلا دوں۔!

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی موٹر کی رفتار بھی تیز کر دی۔ دل کٹا جا رہا تھا۔ خیال آیا کہیں موٹر جائے پی جاتے، مگر چلتی گاڑی میں اتنی روانی تھی کہ اسے روکنا اسے اچھا نہیں لگا۔ گھر موٹر گیراج میں کھڑا کیا اور چابیاں پکڑ کر باہر نکل آئی۔ کبھی کبھی گھر ایک سوالیہ نشان کی طرح نظر آتا ہے؟ اس نے نظر اٹھا کر اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ اسی گھر کی اس نے تمنا کی تھی اور بڑے ارمانوں سے اسے سجایا تھا۔ دل خالی ہو تو گھر بھی خالی لگتا ہے۔ گھر ایک جسم کی مانند ہے۔ گھر کے لوگ اس جسم کے اعضاء ہیں۔ عورت اس گھر کی آنکھ ہے تو مرد دماغ ہے۔ بال بچے، دل، جگر، ہاتھ پاؤں۔ اور عزیز و اقارب۔ ریڑھ کی ہڈی کے مہرے۔ ان سب سے مل کر کنبہ اور پھر خاندان بنتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ سب جسم کی روح بن جاتے ہیں۔ جسم میں روح ہو تو وہ خوبصورت ہے۔ خوش فریب ہے۔ نظر نواز ہے۔ اگر جسم میں روح نہ ہو۔ تو وہ کیا ہے؟ مُردہ! اور مردوں سے سبھوں کو ڈر آتا ہے۔ کبھی کوئی مردے کے ساتھ لیٹا ہے۔ خواہ اس کا محبوب ہی کیوں نہ ہو! خوشی گھر کی خوشبو ہوتی ہے۔ جس گھر میں خوشی نہ ہو اس گھر سے اٹھ آنے لگتا ہے۔ بھیانک لگتا ہے۔ کھنڈر لگتا ہے۔ مردہ لگتا ہے۔ آج اسے اپنا گھر روح کے بغیر جسم لگ رہا تھا۔ ڈر لگ رہا تھا اندر قدم رکھتے ہوئے۔ اپنے قدموں کے علاوہ کوئی چاپ نہیں آرہی تھی اور اپنی چاپ ہی اس کے رونگٹے کھڑے کیئے دے رہی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر پرس جھلاتی ہوئی، اپنے چہرے پر مصنوعی بشاشت پیدا کرتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

آیا کمرے کی دہلیز پر گم صم بیٹھی تھی۔ وہ سیدھی امی جان کے کمرے میں چلی گئی۔ امی کا چت لیٹی تھیں اور ان کے اوپر سفید چادر پڑی تھی۔

"آیا۔" نیا چیخی۔ اور پھر ڈگمگاتی ڈولتی فرش پر گر گئی۔

سناٹا اونچی اونچی آواز میں قہقہے لگانے لگا۔ سناٹا چلانے لگا۔ بین کرنے لگا۔!

"ماں! کوئی اس طرح بھی جاتا ہے۔ ماں کوئی یوں بھی پردہ کرتا ہے۔ کہ ہم تیرا اپاہج تو سانس کی جھانجنیں خاموش ہوں۔ ماں اپنی ذات سے اتنا بڑا انتقام نہیں لیتے۔ تیرے تو بیٹے بھی تھے۔ بیٹی بھی تھی اور پھر بھی تو یوں منہ موڑ کر چل دی، جیسے کسی کو جانتی نہیں۔ اتنی تکلیف تو دی ہوتی، جتنی کانٹا چبھنے کی ہوتی ہے۔ اتنا ہی پکار لیتی، جتنا نومولود دنیا میں آ ہی ماں کو پکار لیتا ہے۔ اتنا تو سن لیتی۔ جتنا سننے کا حوصلہ ساتھ لے گئی ہے۔ ناہنجا پیٹ جائیوں کے انتظار میں ایک آنکھ ذرا سی کھلی رکھتی۔ چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکا ہے۔ وہ آخری لپک بھی نہ دکھائی تو نے۔ یوں پپوٹے بوجھل کر لئے کہ زندگی بھر زور لگا کر اٹھ نہ سکیں، کھل نہ سکیں۔ کوئی روزن کھلا نہیں چھوڑا۔ کس طرف سے آواز دوں۔ کہاں سے پکاروں۔ کس کھڑکی سے جھانکوں۔ مکان خالی ہے۔ چھتیں زمیں بوس اور در و دیوار ریزہ ریزہ۔ اتنی جلدی سانسوں کا میخانہ لٹ جاتا ہے۔ اتنی جلدی دوسرا پڑاؤ مل جاتا ہے وہ کون سی سواری ہے ماں۔ جو اتنی تیز رفتار ہے کہ میں اسٹیشن پہ کھڑی ہاتھ بھی ہلا نہیں سکی اور تو اپنی منزل پہ جا پہنچی۔

"ماں — ماں — ماں —" سارا گھر اس کا ہم آواز بن کے چلانے لگا۔ صحراؤں کی گونج کی طرح۔ سارے کمرے ماں — ماں کی آواز سے گونج اٹھے۔ پٹ روتے۔ دیواریں لرز گئیں۔ چھتوں نے سر جھکائے۔ گھر میں پڑی ہوئی آسائش کی ہر شے پانی پانی ہو گئی

وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے۔ نیا کو اپنے اردگرد کوئی نظر نہ آیا۔ بہرتی سرکتی آیا اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔ نیا نے خالی خالی نظروں سے اس سجے سجائے

گھر کو دیکھا۔ اسی گھر سے اس کی ماں اٹھ کر چلی گئی تو کتنا بے معنی لگ رہا تھا یہ گھر۔ ماں جس ماں نے نوکرانی سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اس کے خوابوں کی نذر ہو گئی اور جسے اس کی رضی کے خلاف اس نے ایک بے حس داماد کی چوکھٹ پر دم توڑنے پہ مجبور کر دیا اور پھر ں زندگی کے اندوہناک موڑ پر۔ کرچی کرچی ہونے سے پہلے وہ لپک کر آیا کے گلے سے لگ ی چلا چلا کر روتی۔ یہ بھری دنیا ہے مالک! مگر گلے لگا کے رونے کو کوئی نہیں ملتا۔؟ موت کی خبر تو دروزوں میں سے باہر نکل جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سوسائٹی کی ورتیں سنجیدہ شکلیں بناتے آنے لگیں۔ نیا کو بار بار غش آ رہے تھے اور وہ اسے بار بار وش میں لا رہی تھیں اور بار بار پوچھ رہی تھیں "اس کا شوہر کہاں ہے؟" اس بات پر نوکر رنگے بن جاتے اور نیا اور زور سے رونے لگتی۔ کیا کہتی کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔؟ جب ندگی موت سے بغلگیر ہو کر زار زار روتے چلی جا رہی تھی۔ وہ کسی نازنین کے زانو پہ سر رکھے لمحے لمحے کا رس پی رہا ہے۔

"اے کچھ تجہیز و تکفین کا بندوبست کرنا ہے یا صرف رونے پر ہی زور رہے گا۔" ایک ڑی بی نے کہا تو جیسے نیا کو ہوش آ گیا۔ "آخری منزل پہ تجھے کڑا انتظار نہیں کراؤں گی ماں۔ رے بہت احسانات ہیں مجھ پر، بہت دن تجھے ستایا اور روکا۔ اب جلدی بھیج دوں گی ں۔ جلدی! اپنے گناہوں کا بوجھ تجھ پر نہیں ڈالوں گی۔"

لوگوں کی مدد سے اس نے سارا بندوبست کیا اور اپنے بھائیوں کو تار دلوائے۔ بھولوں آ گئے۔ خوشبوئیں آ گئیں، سفید نیا لباس آ گیا۔ قرآن خوانی کی آوازیں بلند ہونے لگیں پھولوں اور کلیوں سے لدی ماں کو سفید بادلوں جیسا لباس پہنا کر جب صحن میں رکھا گیا، تو یا نے دیکھا کہ وہ کسی اور جہان کی مخلوق لگ رہی تھی۔ جھریوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا فال خالی چہرہ اس وقت بھرا بھرا اور خوبصورت لگ رہا تھا، امی گھڑی بھر میں سالوں پیچھے چل گئی تھیں۔ جب اُسے امی جان کے الفاظ یاد آنے لگے۔ نیک اور متقی عورتوں پر مرنے

کے بعد بھی روپ آتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کے ٹھنڈے قدموں پر سر رکھ کر آخری بوسہ دیا اور کالونی کے لوگ رات کے دس بجے جنازہ اٹھا کر لے گئے۔

آہستہ آہستہ محلے کی عورتیں بھی ہمدردی کے دو بول کہہ کر چلی گئیں۔ تب وہ سفید چاندنی بچھے فرش پر سلگتی ہوئی اگربتی کے پاس بیٹھی رہ گئی۔ اگربتی سلگ رہی تھی اور دھواں اوپر جا رہا تھا۔ بس اتنی سی ہے انسانی زندگی کی کہانی۔ ذہن خالی تھا۔ دل خالی تھا۔ گھر خالی تھا۔ اس اتنے بڑے شہر میں کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس کے کاندھے پر وہ اپنا دکھتا ہوا سر رکھ دیتی اور باقی ماندہ آنسو بھی بہا دیتی۔ آنسوؤں کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بڑی زرخیز فصل ہوتی ہے آنسوؤں کی۔ جتنے بہاؤ اتنے ہی اور تیار! رازی ابھی تک نہیں آیا تھا اور رازی کے لئے اس نے خود ہی جنازہ نہیں روکا تھا۔ خدا جانے وہ کب آتا۔؟ اور کس عالم میں آتا۔ ہوش میں ہوتا یا بے ہوشی میں۔ وہ تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ رات اس کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑے گی۔ وہ کرے گی جو کبھی نہ کیا ہو۔ مگر اب جنگ کیا لڑتی۔؟ گھر آئی تو حوصلے کی ساری کشتیاں جل چکی تھیں۔ لوگوں کے بار بار استفسار پر اس نے کہہ دیا تھا۔ رازی ایک ضروری کام سے پنڈی گیا ہے۔ اس کا انتظار نہ کیا جائے۔ کئی دنوں سے وہ رات کے دو تین بجے آ رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ ایک آوارہ منش، اوباش فطرت انسان کے لئے اس کی متقی اور پرہیزگار ماں کا جنازہ نہیں روکا جا سکتا۔ نیا کتنی دیر گم صم خاموش بیٹھی رہی۔ آج آیا ہمدردی کے مارے گھر نہیں گئی تھی۔ سارے تنخواہ دار ملازم منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ در و دیوار اُسے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور کچھ بھی نہیں تھا اس پاس۔ بخون کے رشتے کہاں ہیں؟ محبت کے رشتے کیا ہوتے ہیں؟ رو رو کر نیا کی آنکھیں پھوڑا بن چکی تھیں۔ رات کے گیارہ بجے اس نے سب نوکروں کو آرام کرنے کے لئے کہہ دیا۔ آیا کو سیپ کے کمرے میں سلا دیا اور خود قرآن پاک لے کر امی جان کے کمرے میں بیٹھ گئی۔ کلام پاک کھولا تو رنگین صفحوں سے ایک اداس خوشبو

اس کی ناک سے ٹکرائی۔ اس نے جھک کر ایک ایک ورق کو چوم لیا۔ سطر سطر گلہ کر اس کی بے حسی اور بیگانگی کا۔ اچانک۔ بالکل اچانک اسے محلے کی مائی جی یاد آ جو اسے کلام پاک پڑھانے آیا کرتی تھیں اور بتاتی تھیں کہ قرآن پاک کا ایک حرف پڑھنے دس نیکیوں کا ثواب ہوتا ہے۔ کلام پاک کے صفحوں کی اداس اداس، بھیگی بھیگی خوشبو ان کی خوشبو میں بدل گئی۔ پہلا صفحہ پڑھتے ہی آنسوؤں کی ایک تیز رفتار بوچھاڑ آئی۔ سے الفاظ بھیگ گئے۔ سارا صفحہ تر ہو گیا۔ ساری خوشبو گیلی ہو گئی۔ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا میں گولیاں پھنس رہی تھیں۔ آنسو رکتے نہ تھے۔ چیخیں گلے میں پھنس رہی تھیں۔ نیم وا ہوں ابو ابو تھیں۔

حسب معمول رات ڈھائی بجے کے قریب رازی کی موٹر کی آواز آئی۔ بوجھل قدم باہر کی باتوں کی کہانی سنا رہے تھے۔ جانے کیوں نئے سرے سے نیا کا دل بھر آیا۔ یہی ایک وہ اس دنیا میں اس کا اپنا تھا۔ ایسے موقعوں پر محبوب چہروں کو دیکھ کر خواہ مخواہ رونا آتا ہے اور ایسے موقعوں پر تو سنگدل سے سنگدل آدمی کا بھی دل پسیج جاتا ہے۔ رازی کے اندر داخل ہوا تو ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ گھر میں لوبان اور عود کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کمروں میں سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ اس کی مدہوشی آپ ہی آپ دور ہو گئی۔ باہر جاگتے ہوئے چوکیدار سے اس نے پوچھ لیا تھا۔ اس نے سارے واقعات سنا دیئے تھے۔ تب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا نیا کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ بڑی مشکل سے نیا نے اپنا بھاری سر اور زخمی آنکھیں اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر اس کے کندھے پر سر رکھ کر بلک اٹھی۔ وہ اُسے سینے سے لگا کر انگاروں کی طرح جلتے سارے آنسو بہانے دیتا تو وہ جنم جنم کے گلے بھول جاتی۔ اتنا ہی کہہ دیتا "نیا میں جانتا ہوں اب تمہارا کوئی نہیں رہا۔ آج کے بعد میں تمہیں ماں کا پیار اور باپ کی شفقت بھی دوں گا۔ تمہارا نگہبان بن کر تم پر چھا جاؤں گا۔ تمہیں بکھرنے نہ دوں گا۔ ٹوٹنے نہ دوں گا۔ میں لوٹ آیا

ہوں نیّا، میں لوٹ آیا ہوں۔ میرا کنواں تو گھر میں ہے، میں کہاں پیاس بجھاتا پھرتا ہوں۔
اب ایسا نہیں ہوگا۔" مگر وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر گم صم بیٹھنے کے بعد
وہ آہستہ سے بولا۔

"مجھے بہت افسوس ہے نیّا۔ صبر کرو۔ آخر انہیں ایک دن مرنا تھا۔ تم رو رو کر اپنے
آپ کو تباہ نہ کرو۔ اٹھو۔ ولیئم کی ایک گولی کھا کر سو جاؤ۔"

"ولیئم کی گولی غم کا مداوا ہوتی ہے لوگو؟" نیّا اور بلک پڑی۔ "ولیئم کی گولی ماں کا غم بھلا
دیتی ہے چارہ گرو؟" نیّا نے اپنا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ رازی اٹھ کر چلا گیا۔ نیّا کا خیال
تھا۔ ابھی وہ پانی کا گلاس اور گولی لے کر آتے گا۔ اسی وقت نیّا کو یاد آیا کہ اس نے صبح سے
کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ آج کل ڈائٹنگ کر رہی تھی۔ اس لئے صبح صرف ایک پیالی چائے
کی پی کر نکل گئی تھی۔ ارد گرد کتنے گھر آباد تھے۔ کتنی ماڈرن تھی یہ سوسائٹی۔ یہاں سب پڑھے
لکھے، شاد آباد، کھاتے پیتے لوگ رہتے تھے۔ اس وقت سب اپنی اپنی بتیاں بجھا کر آرام
کی نیند سو رہے تھے۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ جس گھر میں موت ہو جاتی ہے۔ وہاں چولہا نہیں
جلتا۔ یہ حق ہمسایوں کا ہوتا ہے کہ انہیں کھانا ہی کھلا دیں۔ نیّا انتظار میں بیٹھی رہی۔ جب
پچھلے پہر کی آہٹیں بھی سو گئیں اور صبح کاذب کی نوخیز اور الھڑ ہوا نے فضا کو گدگدانا شروع
کیا تو نیّا کو چاروں طرف سے ایک سوگوار سی صبح کی خوشبو آنے لگی، وہ اٹھ کر اپنے کمرے
میں آ گئی۔ رازی اپنے بستر پر اوندھا پڑا سو رہا تھا وہ شاید اس قدر تھک کر آیا تھا کہ زیادہ دیر
اس کے پاس بیٹھ بھی نہیں سکا تھا۔ نیّا کمرے کے وسط میں، سن سی کھڑی رہ گئی۔ نہ جانے
آج رشتوں ناطوں کے اس لق و دق صحرا میں — اس کو دُور کی آوازیں صاف کیوں سنائی
دے رہی تھیں۔ ذرا سی بات پہ وہ رد نے بیٹھ جاتی تھی تو شہباز ساری رات بیٹھا اس کے
آنسو پونچھا کرتا۔

ادھر — آنسو پونچھنے کے سوا اسے آتا ہی کیا ہے۔ ؟ وہ جھنجلا کر اس کا ہاتھ جھٹک

ا آنسو تو بچہ بھی پونچھ سکتا ہے مگر اب وہ کھڑی سوچ رہی تھی کہ کبھی کبھی آنسو پونچھنا بھی اس
ح کا سب سے عظیم فعل بن جاتا ہے۔ ابراہیم ادھمؒ نے فرشتے سے کہا تھا۔" میں اللہ
بندوں سے پیار کرتا ہوں"۔ تب ان کا نام سنہری کتاب میں سب سے اوپر لکھا گیا تھا۔
ں کے امتحان میں اس نے یہ کہانی پڑھی تھی۔ اور آج پتہ چلا اس کا مطلب کیا ہے؟
ں آدمی اچھا ہوتا ہے یا بُزدل! انگلی ہونٹوں پر رکھے وہ سوچ رہی تھی۔

دوسرے دن غیاث بھائی اور وقاص بھائی بمعہ اپنے بیوی بچوں کے آگئے تھے ادیس بھائی نوکری چھوڑ کر اپنی فیملی کو لیکر قطر جا بسے تھے اس لئے انکو اطلاع نہیں بھجوائی جا سکی تھی پہلے تو نیا ان سب کو حیران ہو کر دیکھتی رہی۔ کتنی مدتیں بیت گئی تھیں ان سب کو دیکھے ہوئے آج اتنے دن بعد دیکھا تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔؟ مگر جب غیاث بھائی نے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا تو اس کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے چیخ چیخ کر، سر پیٹ پیٹ کر رو دی، عرصہ دراز بعد بڑے بھائی نے سر پہ ہاتھ رکھا تو ابا جی کا لرزتا ہوا شفیق ہاتھ یاد آگیا بھابیاں بھی کچھ زیادہ ہی ہمدرد نظر آرہی تھیں۔ سبھوں نے اسے بے حد پیار کیا بے حد تسلیاں دیں۔ خصوصاً شیریں بھابی تو اس کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ غیاث بھائی کی اولاد میں چھ بیٹیاں ہو گئی تھیں اور وہ وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے تھے۔ آدھے بال سفید ہو گئے تھے۔ ان میں پہلا جیسا اکڑاؤ نہیں رہا تھا شاید لڑکیاں آتے ہی کمر جھکا دیتی ہیں۔ ان کے ابا کی کمر جھکانے کے لئے ہی تو امی جان نے نیا کی آرزو کی تھی۔ غیاث بھائی کو دیکھ کر نیا کو بہت رونا آیا۔ یہ ہے وہ گھبرو نوجوان جو گلے میں مفلر باندھ کے بن ٹھن کے ہیرو بن کے گھر سے نکلا کرتا تھا تو محلے کی لڑکیوں کے دل ڈانواں ڈول ہونے لگتے تھے اور ان دن

یوں میں ہی ادھیڑ عمر کا افسردہ آدمی لگ رہا تھا۔ شیریں بھابی بھی بہت موٹی ہو گئی تھی۔ ہد نہیں رہی تھی ان میں پہلے تو بات بات میں کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ غیاث بھائی کو لیتے تو بالکل ابا جی کی طرح نظر آتے۔ وقاص بھائی اور ان کی بیوی بھی بہت محبت ن آرہے تھے ان کے ساتھ مل کر رہنے کا نیا کو کم اتفاق ہوا تھا۔ آج اپنے خون کے ے ملی تو دل کو بہت ٹھنڈک پہنچی، عجیب سا سکون ملا۔ رونے میں بھی مزا آیا اور ے سوچا دنیا میں اپنے عزیزوں کا ہونا بھی کس قدر ضروری ہے۔

یسرے دن امی جان کا سوئم تھا۔ امی جان کی ساری آخری رسومات نیا بڑی شان و ن سے منانا چاہتی تھی۔ نیا ان کے لئے برابر قرآن خوانی کروا رہی تھی۔ غربا میں کھانا تقسیم ی تھی۔ ڈھیروں کپڑے غربا میں بانٹ رہی تھی۔ سوئم کے روز رازی بھی سر پہ رومال گھر بیٹھا لوگوں سے تعزیت وصول کرتا رہا۔ اونچی آواز میں نہیں بولا۔ کوئی نشتر کوئی ہیں پھینکی! بلکہ اگلے دو روز بھی وہ گھر پہ ہی رہا، مگر تیسرے روز صبح ہی صبح تیار ہو جوتوں میں نہا کر گھر سے باہر جانے لگا تو نیا نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

ہاں جا رہے ہو رازی۔؟"

کیا یہ بتا کر جانا ضروری ہے؟" اس نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

م جانتے ہو گھر میں مہمان آتے ہوتے ہیں۔"

ون سے مہمان۔؟"

نیا نے حیران اور دکھی سی نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑی آہستگی سے کہا۔

جائی اور وقاص بھائی؟"

"تو یہ مہمان ہیں۔" رازی کا انداز طنزیہ تھا۔ "میں سمجھتا تھا تمہارے بھائی ہیں، اچھی طرح مان نوازی کرو۔ امیر بہن کے گھر آتے ہیں۔ دیکھو مدارات میں کمی نہ کرنا۔ کیا ہوا جو یہاں ٹھہر آتے ہیں۔ بہن کے مہمان تو پہلی دفعہ بنے ہیں۔"

"یہ طعنہ دینے کا وقت نہیں ہے رازی۔" نیّا نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا
"کہ وہ امّی جان کی وفات کی وجہ سے آتے ہیں۔ ایسے میں کوئی دشمن بھی آجائے تو یہ

"ہاں۔ ہاں۔ میں سب جانتا ہوں۔ تمہارے بھائی بڑے غیرت مند ہیں۔ اسی لئے تو کبھی پہلے ماں اور بہن کی خبر نہیں لی تھی۔"

"مجھے ان کے رویّے سے کیا رازی۔" نیّا نے بات کو دبانے کے لئے آواز بھی آہستہ کر لی۔ مبادا باہر بھائی یا بھابی میں سے کوئی سُن لے کہ اندر کیا تکرار جاری ہے۔

"گھر میں آنے والوں کی عزت کرتے ہیں۔ دو چار دن بعد چلے جائیں گے۔ تم بے فکر دفتر جاؤ، مگر ذرا جلدی آجانا۔"

"کیوں۔؟" وہ غرّا کر بولا۔ "یہ بے غیرت تو روٹیاں توڑنے کے لئے آئے ہیں۔ میں کوئی مفت خور انہیں ہوں۔ مجھے تو پیٹ کی خاطر کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے گھر پر بیٹھا رہوں، نہ جاؤں، دوڑ دوڑ کر گھر آؤں تو تمہیں عیش و نشاط کی زندگی کہاں سے دوں۔"

نیّا کو دل ہی دل میں ہنسی آئی اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتا اسے صاف کہہ دیتی کہ وہ جانتی ہے کہ وہ دفتر میں کیا کرتا ہے محنت کرنے کے لئے پر جاتا ہے اور تھکن اتارنے کے لئے امانت میں خیانت کرتا ہے۔ مگر اس وقت بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ پتہ نہیں کیا عذر بنا کر رازی اس کے بھائیوں کو بے عزت کر گھر سے نکال دے۔ بھائی تو آخر بھائی ہوتے ہیں۔ بے حس ہوں یا بے غیرت! اور کوئی ان کو اپنے گھر سے بے عزت کر کے نہیں نکلوانا چاہتی۔ ویسے بھی نیّا دیکھ رہی تھی کہ رازی کا ردّیہ ان کے ساتھ ہتک آمیز تھا وہ نہ ان کو سلام کرتا، نہ ان کے ساتھ بیٹھتا، نہ ان کے ساتھ کھانا کھاتا، بس ہر وقت اپنے کمرے میں گھسا رہتا۔ نیّا دل ہی دل میں کڑھتی رہتی اس کو معلوم تھا کہ رازی کے آگے اس کی ایک بھی نہیں چلے گی۔ اس لئے کچھ بھی کہہ سکتی تھی۔ مگر اب ڈرتے ڈرتے بولی۔

...دلوں کی بات ہے یہ لوگ چلے جائیں گے، میری خاطر ذرا ان سے اچھی طرح مل

...نہیں ہوں۔" رازی زور سے بولا۔ "میں تمہارے رشتہ داروں کو بالکل ...کرتا اور نہ یہ ذلیل لوگ میری ذمّے داری ہیں۔"

...کر رہ گئی۔ کچھ اور کہتی تو وہ باہر نکل کر سب کی بے عزتی کر دیتا۔

...تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ نیّا اپنی جگہ پر یوں کھڑی رہ گئی جیسے ...اس کے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اس کے بھائیوں ...نے آخری الفاظ سن نہ لئے ہوں۔ کیونکہ رازی نے جان بوجھ کر وہ الفاظ بلند ...لئے تھے۔ وہ تھوڑی دیر "صمّ" "بکمٌ" بنی کھڑی رہی، پھر اپنے کمرے میں جا کر پلنگ ...زار و قطار رونے لگی۔ مصیبت کی گھڑی میں پچھلی باتوں کی بازگشت ضرور سنائی ..."یہ کس قسم کا شوہر ہے۔؟" اتنا بد دماغ اور مغرور۔ پتہ نہیں کس بات کا ...اسے۔ میں اس کے ہر پُتے لفنگے دوست کا احترام کرتی ہوں، مدارات ...اور یہ میری خاطر میرے سگے بھائیوں کے سلام کا جواب بھی نہیں دے ...اپنی بیوی کا دل رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے۔ تب اسے اچانک — ...۔ جرنیل آپا کا خیال آگیا۔ بڑی جلّاد عورت تھی۔ ٹھیک ہے حسد کے ...کرتی تھی۔ لیکن یہ رازی، یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے۔؟ ساتھ ہی شہباز ...میں گھوم گئی۔ وہ قطرتاً دبّو قسم کا مرد تھا۔ اسی لئے ماں سے بھی دب گیا ...کے بھائیوں کی کس قدر عزت کرتا تھا۔ امّی جان کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ...رات یہ بھائی اس کے گھر آتے تو بچھ بچھ جاتا۔ عزت و تکریم سے بلاتا، بازار ...چیزیں خرید کر لاتا، ان کی تواضع کرتا اور کوشش کرتا کہ گھر میں ہونے والی بدمزگیوں ...کے کانوں میں نہ پڑے۔ اور بعد میں نیّا کا مشکور بھی نظر آتا کہ وہ اس کی

غربت اور اس کی ماں کے مظالم کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اس وقت وہ اس سے مختلف نظر آتی تھی۔ کہیں... کہیں.... یہ زندگی ہی تو جرنیل آپا نہیں ہے۔ کہیں کہیں میں۔ کہیں کس روپ میں۔ اُس جرنیل آپا سے تو وہ دامن چھڑا کر بھاگ آئی تھی مگر اس جرنیل آپا سے بچ کر کہاں جائے گی۔

وہ اپنے پلنگ پر پڑی آنسوؤں کے جال بنتی رہی۔ نجانے کب شیریں بھابی سے کمرے میں آکر اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور آہستہ سے نیّا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ نیّا نے اپنی آنسو بھری آنکھیں کھول کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے گھپ اندھیرے میں دیکھ رہی ہو اور پھر سسک پڑی۔

"صبر کرو نیّا۔" شیریں بھابی نے اپنے لہجے میں مامتا سمو کر کہا۔ "تم جانتی ہو۔ اس رونے سے مرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ تم اتنے دنوں سے مسلسل رو رہی ہو۔ امّی جان کو کیوں اتنی تکلیف پہنچا رہی ہو۔ انہوں نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا۔ تم رو رو کر ان کی روح کو اذیت نہ پہنچاؤ۔" یہ بات نیّا کو پھر چھا گئی۔ آہ۔ میری امّی جان کے بیٹوں اور اُن کی بیویوں نے زندگی میں کی قدر جانی، نہ ان کا احترام کیا۔ کاش یہ زندگی میں یوں عزت سے ان کا نام لیتے جاتے سے وہ یوں دل کا بوجھ دل ہی میں نہ لے جاتیں۔ شیریں بھابی کی بسیار کوشش بعد نیّا آنسو پونچھ کر اٹھ بیٹھی۔ آج بھابی کو نیّا پر کچھ زیادہ ہی پیار آرہا تھا۔ اپنے سے اس کا آنسوؤں بھرا چہرہ اور ناک صاف کرتے جا رہی تھی۔ نیّا کو ان کے ہاتھوں کی گرمی محسوس ہو رہی تھی اور وہ دل میں سوچ رہی تھی۔ رشتہ۔ رشتہ ہی ہوتا ہے بہن بھائیوں سے بڑھ کر بھی دنیا میں کوئی ہوتا ہے۔ وہ ناحق ذرا سی رنجش پر سے دور ہو گئی تھی۔ آج بھری دنیا میں ان لوگوں کے بغیر اس کا کون ہے

"نیّا! تم نے تو بس بالکل ہی ملنا چھوڑ دیا تھا۔" شیریں بھابی نے ہولے ہولے

اپنی عزیزوں کو چھوڑتا ہے۔ پتہ نہیں تمہارا دل ایک دم پتھر کیوں ہو گیا تھا۔"

بھابی۔" نیّا نے اپنی بوجھل آواز میں کہا۔" بھائی لوگوں نے ایسے خط لکھے تھے۔"

جانے دو۔ غصّے میں آدمی کیا نہیں کہہ دیتا۔ وہ وقتی لمحہ ہوتا ہے۔ مگر اس طرح رشتے تو نہیں ٹوٹ جاتے۔ یہی بھائی ہیں۔ جو ہر دم تمہارا نام لیتے ہیں اور تمہیں یاد کیے جیتے ہیں۔"

نیّا نے اپنی سوجی ہوئی آنکھیں کھول کر بے یقینی اور حیرت سے شیریں بھابی کے چہرے اور شیریں بھابی نے اس کی زخمی نظر کی تاب نہ لا کر نظریں جھکا لیں اور دھیرے سے بولی "میں کیا بتاؤں۔ کچھ ایسی پریشانیوں میں الجھے رہے کہ تمہاری خبر ہی نہ لے سکے۔ ورنہ خون سے گوشت جدا ہوتا ہے۔" پھر شیریں بھابی نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ ڈبڈبائی نمناک خلاؤں میں دیکھا۔ اور پھر شروع ہو گئیں۔"

"کل میں نیّا تم ہمارے حالات نہیں جانتیں اور اب تم سے چھپانا بھی کیا۔ غیاث نے اپنے کی ساری جائداد بیچ کر ایک فلم کمپنی کھول لی تھی۔ دو فلمیں بنائیں۔ دونوں فلاپ ہو گئے، کمپنی بک گئی، دوکان بک گئی، ایک وقت ایسا آیا تھا۔" بھابی کی آواز بھرا گئی۔ "بس کیا بتاؤں۔ اگر اس وقت میرے والدین مدد نہ کرتے تو ہم روٹی کو بھی ترس جاتے۔"

نیّا نے درد میں ڈوب کر کہا۔

"ہر خوشی میٹھا نظر آتا ہے جسے کاٹ کر نہ چکھا ہو۔" نیّا کو امّی یاد آگئیں۔ ایسے موقعوں پر کہتی تھیں۔

"آپ تو کچھ بھی پتہ نہیں بھابی۔" نیّا نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"ایک مرتبہ خیال آیا کہ تمہیں لکھوں۔ تمہیں بتاؤں۔ مگر غیاث منع کر دیتے تھے۔ کہتے تھے بے آرام سے ہے۔ اس بے چاری کو کیوں دکھ پہنچاتی ہو؟"

"ہائے بھابی۔ آپ نے مجھے خط لکھ دیا ہوتا۔"

"اب بھی مجھے بات کرنے سے منع کر رہے تھے۔ مگر میں نے کہا۔ نیا غیر تھوڑی اپنا خون ہے۔ اپنی بچی ہے۔ میں تو ضرور بات کروں گی۔"

"آپنے اچھا کیا بھابی۔ کہ مجھے بتا دیا!"

چھ بچیاں ہیں۔ اسکول جاتی ہیں۔ اچھا کھانے کو مانگتی ہیں۔ اچھا پہننے کی عادت ہے۔ شروع میں باپ نے خوب لاڈ اٹھائے تھے۔ اسکول کے اخراجات تو رہے ایک مجھے تو ان کے مستقبل کی فکر ہے۔ ککڑی کی بیل کی طرح بڑھ رہی ہیں اور اتنی ہی تیزی مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ کل کو ان کی ڈولیاں کس طرح اٹھیں گی۔ مجھے تو ان کی فکر نے ہائی پریشر کی مریض بنا دیا ہے۔ میرے مرنے پے نہ جانا۔ بعض اوقات آدمی غموں سے پھولنے لگتا ہے۔"

نیا ان کے حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ بھابی کی موٹی موٹی گوشت میں لا بانہوں میں ابھی سونے کی چوبیس چوبیس چوڑیاں تھیں۔ کپڑے بھی اچھے پہنے ہوئے تھے بیچاری نے اپنا بھرم بنایا ہوا تھا۔

"غیاث کہہ رہے تھے۔" بھابی پھر آہستہ آہستہ شروع ہوئیں۔ "کہیں سے اگر لاکھ مل جائیں تو دوبارہ منڈی میں اپنی دوکان کھول لیں گے۔ وہی باپ دادا کا کام شروع دیں گے۔" نیا نے سر جھکا لیا۔

"غیروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں نے کہا تھا۔ نیا اپنا ہے۔ ماں جاتی ہے۔ اس سے قرض لے لو۔ بعد میں چکا دینا۔"

نیا کے اندر کوئی شے ٹن ٹن کر کے بجنے لگی۔ بھابی کا لاڈ پیار اور اپنائیت نیا کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

"تمہیں اللہ نے بہت کچھ دیا ہے نیا۔ ہم تمہاری زندگی سے بہت خوش ہیں

زیادہ دے۔ موتیوں میں جھولو، سونے میں تلو۔ اگر آج اپنے بھائی کی مدد کرو گی۔ تو دعا لو گی۔ بہنیں ہی بھائیوں کے لئے قربانیاں دیتی ہیں۔"

نے جھکا ہوا سر نہیں اٹھایا۔ وہ اس وقت رقیق القلب ہو رہی تھی۔ اسے غیاث س پر بڑا ترس آیا تھا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ نوٹوں سے جھولی بھر کے اپنے اوپر نثار کر دے۔ ان کے لئے کچھ کرے۔ مگر پھر۔ اسے رازی سے بھیک مانگنا اور رازی پہلے ہی انہیں کون سا اچھا سمجھتا ہے۔ صاف کہہ دے گا۔ دامن چلے آتے بہنوئی سے مانگتے ہوئے شرم بھی نہ آئی۔ اسی کشمکش میں مبتلا دیکھ بھابی اپنے شہد جیسے لہجے میں بولی۔

"تم کچھ دنوں کے لئے لاہور ہمارے ساتھ چلو۔ میں تمہیں یہاں تنہا نہ رہنے دوں گی نے اپنی صحت برباد کر لی ہے۔ یہاں رہو گی۔ تو امی جان اور بھی یاد آئیں گی۔ بچے الگ پریشان ہو رہے ہیں۔ اس غم میں تمہیں گھرداری کا ہوش کہاں ہے۔" برا گھر ہے بھابی، میں نہ دیکھوں گی تو کون دیکھے گا۔ گھر سے نکل جاؤں تو سب ہو جائے۔" کچھ دیر سوچ کر نیا نے کہا۔

گھر بھی بس جاتے ہیں۔ بچے بھی پل جاتے ہیں۔ اپنی صحت و جوانی تباہ ہو جائے ل واپس نہیں ملتی کیسی چاندنی جیسی تمہاری رنگت تھی اور اب دیکھو کیسا گہن زدہ ا ہے۔" نیا سوگواری سے ہنسی۔

حسن اور جوانی سدا رہے ہیں بھابی۔"

"... خیر..." وہ بولی۔ "اس وقت تمہارے لئے تبدیلیٔ آب و ہوا کی بہت ہے۔" اتنے میں سیپ کے رونے کی آواز آئی۔ تو شیریں بھابی یہ کہہ کر باہر کو ئے میں صدقے سیپ رو رہی ہے۔" اس انقلاب پر نیا ششدر سی رہ گئی۔ بالی ہے۔ جو ذرا سی بات پر موتی کو دھنک کر رکھ دیتی تھی۔ مگر یہ تب کی بات تھی

جب موتی اور نیا اس پر بوجھ بنے ہوتے تھے۔ نیا بھی منہ دھو کر باہر نکل آئی۔ سب بچے آکر مل جل کر کھیل رہے تھے اور شیریں بھابی سیپ کو گود میں اٹھائے، اس کا منہ صاف کر رہی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد غیاث بھائی اور شیریں بھابی اور ان کے بچے اپنے کسی عزیز کو ملنے چلے گئے۔ اس وقت صرف وقاص بھائی اور ان کے بیوی بچے گھر میں تھے۔ نیا ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی وہ بڑی محبت سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ نیا کو تعجب ہو رہا تھا کہ دونوں بھائیوں نے اس سے زمانے بھر کی باتیں کی تھیں۔ مگر یہ نہیں پوچھا کہ امی جان کو کیا ہوا تھا۔؟ اُن کی آخری خواہش کیا تھی۔؟ انہوں نے کس طرح زندگی گزاری اور ان کی تجہیز و تکفین کس نے کی؟ یہ وہ بیٹے ہیں جن کی پیدائش پہ مائیں گھر میں گھی کے چراغ جلاتی ہیں۔ کیا موتی بھی اسے ایسا ہی سکھ دے گا۔؟ نیا موتی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسی وقت وقاص بھائی بولے۔

"تم لاہور کب آ رہی ہو نیا؟ کچھ دن ہمارے پاس آکر رہو۔"

نیا کا دل لرز گیا۔ لاہور۔ لاہور سے تو وہ یوں نکل آئی تھی۔ جیسے بن باس کا نکلی ہو۔ امید کی کوئی کھڑاؤں بھی اس کے پاؤں میں نہیں تھی کہ وہ انہیں اپنی بیٹھک تخت پر رکھ کر آجاتی۔ اور لوٹ کر جانے کی امید رہتی۔ پھر بھی اداس آواز میں بولی۔

"جب بچوں کی چھٹیاں ہوں گی تو آؤں گی وقاص بھائی۔"

"بہن! ہم تو غریب آدمی ہیں۔" وقاص بھائی عامیانہ انداز میں بولے۔ "میں تو معمولا ملازم ہوں۔ تنخواہ کم ہے۔ بچے زیادہ ہیں کسی نہ کسی طرح گاڑی تو چل رہی ہے۔ اگر بھائی کے گھر آنا پسند کرو تو۔"

"ایسا نہیں کہو بھائی۔" نیا کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ "بہن بھائیوں میں غر کیسی۔؟ اور امارت کیسی۔؟ دنیا میں سب سے طاقتور چیز خون کے رشتے ہیں۔

بھائیوں کو ایک دوسرے میں سے ماں باپ کی خوشبو آتی رہے دولت، روپیہ، مرتبہ ان کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی۔" پتہ نہیں نیا نے کس جذبے سے یہ فقرے ادا کیے۔ پتہ نہیں وقاص بھائی کی سمجھ میں بھی آئے یا نہیں۔ مگر انہوں نے ایک منٹ بھی نہیں کیا فوری بولے۔

"لاہور میں، میں نے ایک کمرشل پلاٹ خریدا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس پہ ایک شاپنگ اور دکانیں کرائے پہ چڑھا دوں۔ اس طرح کچھ حالات بدل جائیں گے۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔" نیا بولی۔ "کچھ نہ کچھ تو کرتے رہنا چاہیئے۔"

"ہاں نیا۔" وہ بولے۔ "تعمیرات کے لئے سرمائے کی ضرورت ہے۔ اتنا سرمایہ کہاں سے لائے گا۔"

نیا بالکل چپ ہو گئی۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہی بولے۔

"بینک سے قرض لوں تو سود در سود بڑھتا رہے گا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ مجھے دس بارہ لاکھ سے مل جاتا۔"

نیا زیر لب مسکرائی۔ "دس بارہ لاکھ ان کے نزدیک کتنی معمولی رقم ہے۔"

"تمہارے سسر صاحب کا ماشاء اللہ بہت بڑا کاروبار ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ اس شہر کے سب بڑے لوگوں سے اس کے کاروباری CONTACTS بھی ہیں۔ اگر تم اس سے میری سفارش کرو تو مجھے بلا سود قرضہ مل جائے۔ پھر میں دو دکانوں کا ایڈوانس لے کر فوراً لوٹا دوں گا۔"

نیا کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ رات سونے سے پہلے نیا نے اپنے آپ کو جھنجوڑا۔ کل تیرے خون کے پیاسے تھے۔ کیونکہ خاردار جنگل میں تو نے زندگی کا راستہ تلاش کرنا چاہا اور آج تیرا محل سا گھر دیکھ کر تیرے رشتے دار بن بیٹھے ہیں۔ کیا ماں سے بڑھ کر بھی کوئی رشتہ ہے دنیا میں۔؟ جو بیٹے ماں کو کفن نہیں ڈال سکتے۔ ان کو بہن کے سہاگ کی فکر

کہاں ہوسکتی ہے۔ اوّل تو اس کے پاس اتنا پیسہ ہی نہیں تھا۔ اور بالفرض وہ رازی سے اپنی بے عزتی کروا کے اپنی عزتِ نفس رہن رکھ کے، اس سے کچھ پیسہ مانگ بھی لے۔ تو کون سے بھائی کو دے۔ کس خوش کرے۔ کسے ناراض کرے۔ ان کے مطالبات تو آسمان سے نیچے نہیں اتر رہے تھے۔ گویا پیسے اس گھر میں اُگتے ہیں۔ رازی کے سامنے اس کے میکے کا رہا سہا بھرم بھی ٹوٹ جائے گا۔ صاف کہے گا "اسی لئے آتے تھے کمینے!" اور پھر آپا جی کی کہا دیتیں بھی بُری طرح یاد آرہی تھیں۔ "لالچی آدمی کی تو قبر کا بھی منہ کھلا رہتا ہے۔"

نیّا پچھلے کئی دنوں سے ایک نئے کرب سے گزر رہی تھی۔ ان عزیزوں سے نہیں ملی تھی۔ تو دکھ کی نوعیت دوسری تھی۔ اب ملی تو دکھ نے بھی صورت بدل لی۔ اور جب دن کی جان لیوا خاموشی کے بعد دونوں بھائیوں نے واپس جانے کا پروگرام بنایا تو نیّا نے اوپری دل سے کہا۔

"بھائی ابھی کچھ دن اور رہ لیں؟ میرا خیال تھا کہ آپ لوگ چہلم کر کے جائیں گے۔"

بھائی نے اپنے کپڑے سمیٹتے ہوئے نہایت سرد لہجے میں جواب دیا۔

میکے والوں کا لڑکی کے ہاں زیادہ دن رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ بہت رہ لئے اب چلتے ہیں گے۔ ہم تو رسم کے اِس موقع پہ تمہاری ڈھارس بندھانے آتے تھے۔ تمہاری تنہائی کو دور کرنے آتے تھے مگر رازی تو سیدھے منہ ہم سے بات تک نہیں کرتا اور ... ہاں ... جیسی تیسی روٹی ہر کوئی اپنے گھر میں کھا رہا ہے۔ اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں بدھمی کا نوالہ بن کے بیٹھے رہیں گے۔" ٹھنڈی سانس لے کر بھائی پھر بولی۔

"دیکھ لئے ہیں۔ بہن بھائیوں کے رشتے۔ سب بناوٹی باتیں ہیں۔ اب کہاں رشتوں کی بات!" نیّا نے چپ کا حصار کھینچا اور بوجھل آنکھوں سے انہیں دیکھتی اپنے کمرے میں آئی۔ اسے یہ احساس ہوا جیسے امّی جان اس کے جسم میں حلول کر گئی ہیں۔ ایسے موقعوں پر امّی بھی غلاف میں لپٹا تکیہ بن جایا کرتی تھیں۔

کافی دیر تک ٹیلی فون کا ریسیور پکڑے رازی میٹھے میٹھے لہجے میں باتیں کرتا رہا۔ اس کا "ہیلو پلیز" سے شروع ہوتا اور "تھینک یو" پر ختم ہوتا۔ ایسے لگتا ہے جیسے فون میں ہی گھس جانا چاہتا ہو۔ نیّا اس کے شہد ایسے لب و لہجے کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ عرصے سے ان کے درمیان صرف وَن وے ٹریفک چل رہا تھا۔ مگر جس آدمی کے ساتھ رات دن رہتی ہے۔ اس کی ادا اور کج ادائی دونوں کو پہچاننے لگتی ہے۔

وہ واپس آکر بیٹھا، تو نیّا نے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ لڑکی کون ہے، جس کے ساتھ تم اتنے مشکورانہ انداز میں باتیں کرتے ہو؟"

رازی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ چائے دانی اپنی طرف کھسکا کر پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا۔

"میں نے دفتر میں ملازم رکھی ہے۔"

"اچھا۔ اب تم دفتر میں لڑکیاں بھی رکھنے لگے ہو؟"

"اب سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"کیونکہ ایک روز میں نے تم سے کہا تھا۔ مجھے اپنے دفتر میں بٹھاؤ۔ تو تم نے فوراً کہا

تھا۔ میرے دفتر میں بھلا لڑکی کا کیا کام۔؟"

"آجکل تو تقریباً ہر دفتر میں لڑکیاں کام کرتی ہیں۔" رازی نے بات ٹالنے کی کوشش

"کام تو کرتی ہوں گی۔ مگر یوں پانچ پانچ منٹ کے بعد باس کو فون نہ کرتی ہوں

"میں جب گھر پہ ہوتا ہوں" تو مجھے دفتر کی اطلاعات کی ضرورت ہوتی ہے ا
میری ہدایت ہے کہ وہ مجھے بار بار فون کر کے بتایا کرے۔"

"مگر وہ تو صبح ہوتے ہی فون کرتی ہے اور رات گئے تک کرتی رہتی ہے۔
پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔

"تم کیا جانو دفتری معاملات۔"

"کیا تمہارے دفتر کے معاملات اتنے سنگین ہوتے ہیں کہ تمہیں ایک ایک م
کی اطلاع کی ضرورت ہوتی ہے۔" نیتا نے بظاہر سادگی سے پوچھا۔

"بکواس مت کرو۔ تم کوڑھ مغز ہو۔"

"دفتر میں تو میں نے بھی کام کیا ہے۔ اتنی کوڑھ مغز نہیں کہ ان معاملات کو نہ
سکوں۔"

"الو کی پٹھی اب تم مجھ پہ الزام بھی لگانے لگی ہو۔؟"

"الزام۔؟" نیتا سوگواری سے ہنسی۔ "میں نے تو صرف پوچھا ہے کہ محترم ہر
کے بعد فون کیوں کرتی ہیں اور تم شکریے کے پھول برساتے ہوئے کیا راز و نیاز کرتے
ہو۔ اب چور کی داڑھی میں تنکا نکلے۔ تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"تم بدنصیب عورت ہو۔ تمہیں بکواس کرنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اور اپنی زبان
کی سزا پا رہی ہو۔"

"میں نے کون سی زبان درازی کی ہے۔ اپنے شوہر سے کھل کر بات کرنا زبان د
نہیں ہوتی۔"

ں کسی نے تمیز نہیں سکھائی۔"

میرے شوہر ہو۔ کوئی اوتار نہیں ہو۔ میری ہی طرح کے انسان ہو۔ میں بات
ے پہلے تمہارے پاؤں کیوں چھوؤں۔؟"

ے ختم کر کے رازی نے پیالی پرے سرکا دی۔

نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔"

محاورہ تو ہر شوہر استعمال کرتا ہے۔" نیتا نے آہستہ سے کہا۔ "کوئی نہیں جانتا کہ
بھی زندگی ہوتی ہے۔"

تمہیں زندگی کا زیادہ تجربہ ہوگا۔ کیونکہ شوہر بدلنا تمہاری عادت ہو ہے۔"

نے جیسے زہر کا گھونٹ پیا۔ یہ طعنہ وہ اسے کئی بار دے چکا تھا۔

گی کو جہنم بنانے کا سہرا دونوں کے سر ہونا چاہیئے۔"

رے کاروباری معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہ کرو اور عورت بن کے
ی کرخت لہجے میں بولا۔

تم میرے گھر کے معمولات میں دخل دو گے تو میں تمہارے دفتری معمولات میں
روں گی۔"

تو ہوتا بھی نہیں مارتا تمہارے گھر پہ۔"

ں حرافہ سے کہہ دو کہ بار بار میرے گھر پہ فون نہ کیا کرے اس سے میرا ذہن
ہوتا ہے۔"

آزادی کیا تو یہ گھر میکے سے لائی تھی۔ کھڑے کھڑے تمہیں یہاں سے نکال
رازی دھاڑا۔ یہ طعنہ بھی نیتا نے کئی بار سنا تھا۔ اس لئے اسے بھی کڑوا گھونٹ
آنکھوں میں آنے والا کڑوا پانی بھی روکا۔ اور بولی

نے بھی دفتر میں کام کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑے دفتر میں کیا ہے۔

میں کاروباری اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھتی ہوں اور ہر عورت سے زیادہ اچھا کام کر سکتی ہوں۔"

"یہ تمہارا خیالِ خام ہے۔ کم از کم میرے دفتر میں تم کام نہیں کر سکتیں۔"

"اس لئے کہ اب میں تمہاری منکوحہ ہوں۔ بیوی ہوں۔ تمہارے ساتھ دغا بازی نہیں کر سکتی۔"

رازی منہ پھلاتے سگریٹ پیتا رہا۔ تو نیتا پھر بولی۔

"حالانکہ شادی سے پہلے تم ہمیشہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ مل کر کام کریں گے تم دفتر میں بیٹھنا۔ کاروبار سنبھالنا۔ اور میں باہر کا کام کیا کروں گا۔"

"اس وقت میں تمہیں اور طرح کی لڑکی سمجھتا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم ایک خاص مقصد کے لئے لڑکیاں رکھتے ہو۔ آخر میں بھی تو سنوں وہ کون سا کام ہے۔ جو میں نہیں کر سکتی۔"

"چار دن ایک دفتر میں کام کر لیا۔ تو لگیں اپنے آپ پر اترانے۔ تمہارے اندر ما دقیانوسی ماسول کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تم آج کے زمانے کا، ایک قدم بھی ساتھ نہیں دے سکتیں۔"

"ہاں تم تو بہت زیادہ ایڈوانس ہو نا؟ تمہاری پیدائش امریکہ میں ہوئی، تو بیت الخلا میں ہوئی۔ اس لئے تم زیادہ روشن خیال ہو۔ تم ہی مجھے سکھا دو سب کچھ۔" نیتا نے نظر انداز میں برچھی پھینکی۔

"بک بک نہ کرو تو کی بچی، چٹیا پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔ گھر آتا ہوں، تو بلا کی طرح مجھے چمٹ جاتی ہو۔ میرا تو گھر آنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"وہ جو برائے نام پچھلی رات آتے ہو۔ وہ آنا بھی بند کر دو۔"

"ایسا کرنا پڑے گا۔" رازی نے غصّے سے کہا۔

دونوں تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گئے۔ نیتا اندر ہی اندر کھولتی رہی۔ یہ

یہ بساط ہمیشہ پلٹ کیوں جاتی ہے؟ حالانکہ وہ ہمیشہ نیک نیتی کے ساتھ
ع کرتی ہے۔ جھگڑا ہرگز نہیں کرنا چاہتی۔ مگر شاید نفرتوں کی دیوار اتنی اونچی
ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھ سکتے۔ رازی کو وہ چاہے بوجھی
ات ہمیشہ نیا کو کھانی پڑتی تھی اور سزا بھی اسی کو ملتی تھی۔ پھر اس ساری بک بک
ں کا کیا فائدہ تھا۔؟ نیا کو معلوم تھا کہ اس نے دفتر میں ایک لڑکی رکھی ہے! اسی
کھومتا پھرتا ہے۔ وہی ہمہ وقت اسے فون کرتی رہتی ہے اور فون پر بھی کچھ اشارے
تے ہیں۔ مگر وہ کہاں سے پکڑے۔؟ رازی تو ہر بات کا سراجلے کاروبار
یا تھا۔ کاش وہ جان سکتی کہ رازی کا کاروبار کیا ہے۔؟ اسی لئے تو وہ اس
یں بیٹھنا چاہتی تھی۔ مگر پتہ نہیں اس کا وار ہمیشہ اوچھا کیوں پڑتا تھا اور بات
ے بھٹک کر گالی گلوچ کے دائروں میں الجھ جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کھول کھول
نے اپنا غصہ ٹھنڈا کیا، اور پھر بڑی بے حیائی، مگر ملائمت سے بولی۔

ی ضروری تو نہیں کہ تم میری نیت پر ہمیشہ شک کرو۔ بتاؤ اس وقت میں نے کون
بری بات کہہ دی ہے۔ یہی تو پوچھا ہے نا کہ وہ لڑکی کون ہے۔ جو ہر وقت
ا کرتی رہتی ہے۔"

چھنے کا بھی ایک انداز ہوتا ہے نیا۔ تم میری ہر بات پر شک کرتی ہو؟"

کس بات پر میں نے شک کیا ہے۔؟"

کہ ــــ"

نا ــــ"

لت سے ہو وہ انداز میں پوچھتی رہتی ہو۔ تم کیا کرتے ہو۔؟ کیوں کرتے ہو۔؟؟
ہتے ہو۔؟؟؟ وغیرہ وغیرہ۔ باہر کی دنیا ایک الگ دنیا ہے۔ ہر مرد باہر کی دنیا
ہے۔ اب وہ اپنی بیوی کو کیا بتائے۔ تم نے ابھی تک اپنے شوہر پر اعتبار ہی

نہیں کیا۔"

"اچھا رازی۔ اگر تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ میں تم پر یا تمہارے پیشے پر شک کرتی ہوں
آئندہ تم سے ایسا کوئی سوال نہیں پوچھوں گی، مجھے یقین ہے کہ تم ایک عزت دار آدمی ہو
باعزت طریقے پر روٹی کما رہے ہو۔" یہ کہہ کر نیا نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھ
اس کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے تھوڑی دیر رُک گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ سگریٹ کا دھ
چھوڑتے ہوئے رازی کے چہرے کا رنگ تھوڑا سا بدلا تھا۔ مگر وہ خاموش رہا۔

"جو عورت اپنے شوہر میں دلچسپی لیتی ہو، وہ اس کی ہر بات میں دلچسپی لینا چاہ
ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں۔ تمہارے ساتھ قدم ملا
چلوں۔"

"اور یہی تمہاری بھول ہے۔ بھلا عورت مرد کے ساتھ قدم ملا کے چل سکتی
رازی۔ رازی پلیز۔ اب میں کچھ کہوں گی تو تم پھر بگڑ جاؤ گے۔ یہ اصول مرد
نے صرف گھر کی عورت کے لئے وضع کئے ہیں۔ باہر کی عورت کو وہ اپنے ساتھ
ملا کے چلنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ مگر گھر کی عورت کو چار دیواری میں بند کر دیتے
"نیا۔ تم ان عورتوں میں سے نہیں ہو۔" رازی نے دوٹوک کہا۔ "تم باہر نکل
ہر بات کو ترازو میں تولنے لگتی ہو جبکہ دوسری عورتیں ہمارے اشارے کو حکم
خوشی خوشی مان لیتی ہیں۔"

"رازی۔" نیا نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ "میں اتنی آگے آ چکی ہوں
اب پیچھے نہیں جا سکتی۔ مجھے درمیان میں معلق نہ کرو۔ میں کوشش کروں گی کہ اپنے
کو بدل دوں۔ تمہاری خاطر مجھے سب منظور ہے۔ تمہارے ساتھ تمہارے راستے
پر چلنا چاہتی ہوں، جرح نہیں کروں گی۔ سوال نہیں کروں گی، خدا کی قسم۔ اپنے
سے اٹھنے والی ایک آواز بھی نہیں سنوں گی۔ لیکن مجھے اس طرح پیچھے چھوڑ کر

اگر تم نے زندگی کے سفر کی ابتدا خوشی خوشی کی ہے تو خوشی خوشی انتہا تک بھی پہنچاؤ۔"
رازی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے سگریٹ پھونکتا رہا۔
تم تو کہتے تھے۔ کہ تم مجھ سے عشق کرتے ہو۔ اور عشق کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔۔
نے ایک روز کہا تھا کہ اگر تم کہو گی میں تمہیں تنگ کر رہا ہوں تو میں۔۔۔۔"
اب ان فضول باتوں کو مت دہراؤ۔" رازی جلدی سے بولا۔ عشق کے زمانے
ہر آدمی اس قسم کی لایعنی باتیں کرتا ہے۔ اور تم نے اتنی بار ان باتوں کو دہرایا ہے
ب انہیں سن کر ہی مجھے ابکائی آنے لگی ہے۔ ضروری نہیں زندگی میں آدمی جو کچھ
رے اس پر ہو بہو عمل بھی کرے۔ اس دنیا میں عشق کرنے کے علاوہ بھی اور کام

اسی لئے تم لڑکیوں کو لے کر ساحل پر جاتے ہو۔ ا۔ر۔۔۔" نہ چاہتے ہوئے
یا کے منہ سے یہ فقرہ نکل گیا۔ اور یہ سنتے ہی رازی آگ بگولا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔
خبیث عورت تیرے اندر سے خباثت نہیں جا سکتی۔ تو نے اب ایک نیا الزام
ہے میرے اوپر۔ تیری سزا یہی ہے کہ تو گھر میں بیٹھی اپنے نصیبوں کو رویا کر۔"
کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ایک دن پہلے بھی باتوں باتوں میں تکرار ہوئی تھی۔ اور نیا نے ساحلِ سمندر والی
کا ذکر کر دیا تھا۔ اس روز بھی رازی صاف مکر گیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی "سیپ" کی قسم
بھی کر اس کے ساتھ کوئی لڑکی نہ تھی۔ وہ کسی لڑکی کو لے کر ساحلِ سمندر پر نہیں گیا
تب نیا اندر سے لرز گئی تھی۔ اس نے مرد کا ایسا گھناؤنا روپ نہیں دیکھا تھا کہ
فضول باتوں کے لئے مرد اپنی بیٹی کی جھوٹی قسم کھا لیتے ہیں۔ اسے رازی کی ساری
ہی جھوٹ نظر آنے لگی تھی۔ باپ کے لئے بیٹی سے بڑھ کر پیارا اور مقدس رشتہ
ہیں ہوتا، مگر آوارہ عورتوں کی خاطر ایسے مرد بیٹی کے سر پر بھی ہاتھ رکھ کر قسم کھا

لیتے ہیں۔ رازی اپنے کمرے میں جاکر تیار ہونے لگا۔ آج عرصۂ دراز کے بعد وہ شام کو گھر آگیا تھا اور نیا خوش تھی کہ آج کی شام اس کے ساتھ گزارے گی، مگر اس نے اپنی شام خود ہی برباد کرلی تھی اور وہ اپنے اوپر خوشبوئیں چھڑک کر باہر جانے کی تیاری کررہا تھا۔ نیا کا دل کٹ کٹ کر لہولہو ہونے لگا۔ امّی جان کے بعد وہ اتنی ہراساں تھی کہ ہر قیمت پر رازی سے سمجھوتا کرنا چاہتی تھی۔ اب واقعی اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر رازی کے اشاروں پر چلنا چاہتی تھی مگر اب رازی اس کے ہاتھ میں اپنی باگیں نہیں پکڑاتا تھا وہ بدک گیا تھا۔

نیا وہیں بیٹھی رہ گئی۔ زندگی کی ڈور پھر سے الجھ گئی تھی اور کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ بھی بغاوت کردے۔ اس گھر سے نکل کر اپنا علیحدہ جہاں بسا لے۔ کبھی سوچتی خانم کے پاس چلی جاتے۔ خانم نے کہہ دیا تھا کہ اس کے دروازے نیا کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ مگر دوبارہ اس دنیا میں جانے سے نیا کہانی نہ بن جائے گی؟ بلکہ اسکینڈل بن جائے گی اور یہ بھی نہیں معلوم کہ خانم اس کے ساتھ کیا سلوک کرے؟ ہارے ہوئے جواری کو ہمیشہ من مانی شرائط پر دوبارہ شامل کیا جاتا ہے۔ گرے ہوئے گھوڑے پر کون پیسہ لگاتا ہے۔ خانم نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ پہلے عورت کو اپنے پاؤں مضبوط کرلینے چاہئیں۔ وہ عورت جو گھر کو ٹھکرا کر زمانے سے لڑنے کے لئے باہر نکل جاتی ہے۔ اس کی ساری زندگی غالباً سودے بازی سے ہی گزرتی ہے۔؟ اسے بھی سودے بازی کے بغیر شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ خانم نے کہا تھا کہ اپنے قدم پہلے مضبوط کرلو، مگر اس نے تو رازی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر "آمنا و صدقنا" کہہ دیا تھا کیا وہ خانم کی بات پر کان دھرلیتی۔ ایک گھر اور حقِ مہر کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اور گھر بھی اس کے نام پر اس لئے لیا گیا تھا کہ زمین اس کے نام پر تھی۔ ورنہ وہ تو عشق میں اتنی اندھی ہوچکی تھی کہ رازی کی ہر ادا پر ایمان لے آتی تھی۔ پہلے اس دلدل سے نکل آتی تھی۔ تو امّی جان ہمراہ تھیں۔ ان کا کمزور سہارا کتنا قوی تھا۔ سارے زمانے سے اے

تھا، کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھاتا تھا۔ اپنی مرضی سے زندگی بسر کرتی تھی۔ اور اب — وہ بچوں کا ساتھ تھا۔ اور دوسری طرف زمانہ منہ کھولے کھڑا تھا۔ پھر اس رازی کا پتہ نہیں تھا۔ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔؟ اس کے ساتھ لڑ لڑ کے وہ ذہنی طور پر کمزور ہوگئی تھی۔ اب آگے جانے کی اس میں ہمت کہاں رہی تھی۔ اسے ہر حال میں رازی کو منانا پڑے گا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ باہر کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے کہ وہ شوہر کی ٹھوکریں کھائے۔ رازی کے دیئے ہوئے دکھ اٹھالے۔ کبھی تو زندگی کا بیڑا پار ہوجائے گا۔ وہ اٹھ کر رازی کے کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت وہ بالکل تیار ہوچکا تھا۔ اس نے اپنا سیاہ سوٹ پہن لیا تھا۔ اس کے ساتھ سرخ چیک والی ٹائی تھی۔ اپنے اوپر بے شمار خوشبوئیں چھڑک لی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کمرہ مجلہ عروسی ہے اور یہ تو اس کی پرانی عادت تھی کہ باہر نکلنے سے پہلے بیشتر خوشبوؤں کا چھڑکاؤ کرجاتا تھا۔ کبھی نیا کو اس کی یہ عادت بہت اچھی لگتی تھی۔ مگر اب اس عادت سے جل اٹھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ خوشبوؤں میں بس کر وہ کہاں جاتا ہے۔؟ اندر جاکر وہ اس کے قریب کھڑی ہوگئی۔ مگر رازی نے پروا بھی نہیں کی۔ اسٹول پر بیٹھ کر سیاہ جرابیں پہننے لگا۔ نیا اس کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔ اور اس کے ہاتھ سے جرابیں پکڑتے ہوئے بولی۔

"لاؤ میں پہنا دوں۔"

رازی نے جرابوں پر گرفت مضبوط کرلی اور اتنی زور سے لات ماری کہ نیا دور جا گری۔

"مجھے یہ دیسی فلموں والی باتیں مرعوب نہیں کرسکتیں — میں اپنے کام خود کرسکتا ہوں۔"

نیا حیرت سے بس اس کے چہرے کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ یہ آدمی کس قدر مغرور

ہے۔ آخر اس کا بھی تو کوئی علاج ہوگا دنیا میں!

"تم جہاں جانا چاہو۔ چلی جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بہت کچھ دے چکا ہوں۔ اگر کم ہو تو اور لے لو۔"

نیّا وہیں فرش پر بیٹھی رہی۔ یہ کون سی نئی بات تھی۔ ایسے فقرے اسے روز ہی سننے پڑتے تھے۔ وہ اب جاتی بھی کہاں، آگے تو گھپ اندھیرا تھا۔ رازی تیزی سے باہر نکل گیا اور نیّا کو ایسے لگا جیسے ٹھنڈی زمین نے اسے نگل لیا۔ شاید وہ دیر تک اسی طرح گم صم بیٹھی رہتی۔ باہر کسی کے کار کے ہارن کی آواز آئی، تو وہ چونک گئی۔ اٹھ کر دیکھا تو واقعی دوسری کار تھی۔ اور اس میں سے مہتاب علاؤالدین اتر رہی تھی۔ ساتھ اس کا شوہر بھی تھا۔ نیّا کو یقین تھا کہ رازی اب ضرور رک جائے گا، اور ایسا ہی ہوا۔ رازی ان کو لے کر اندر آ رہا تھا۔ نیّا نے جلدی جلدی آئینے کے آگے کھڑے ہو کر اپنے بکھرے بال سمیٹے۔ اور ستے ہوئے چہرے پر خوشبودار کریم لگائی۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر رازی نے نیّا کو یوں آواز دی۔ جیسے دونوں میں کبھی جھگڑا ہوا ہی نہیں تھا اور نیّا بھی اپنے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹیں سجا کر ادھر لپکی۔ اب وہ مسکراہٹوں کی سوداگری سے بڑی اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔ جس قسم کی مسکراہٹ کی ضرورت ہوتی اسے اپنے نہاں خانے سے اٹھا کر اپنے ہونٹوں پر سجا لیتی۔

مہتاب علاؤالدین حسب معمول بہت بنی ٹھنی ہوئی تھی اور بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ پالتو کتے کی طرح اس کا شوہر بیٹھا ہوا تھا۔ نیّا سلام کر کے بیٹھ گئی اور خوب گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ مہتاب علاؤالدین ان کے حلقے کی زبردست عورت تھی۔ اسے مردوں کو دیوانہ بنانے کا فن آتا تھا۔ اس کے قریب جانے والا ہر آدمی اس کا اسیر ہو جاتا تھا۔ وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی، جتنی طرحدار تھی۔ بنانے

کے اوپر عضب کا میک اپ کر لیتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو اوپر نیچے سے طرح سیاہ کر لیتی تھی۔ جس سے وہ زیادہ بڑی نظر آنے لگتی تھیں، خوبصورت لباس تھی۔ مگر کوشش یہ کرتی تھی کہ جو بھی لباس پہنے اس میں سے جسم کی خوبصورتیاں جھلکتی رہیں۔ اس وقت بھی اس نے برائے نام چولی کے ساتھ سیاہ پرنٹیڈ ساڑی ہوئی تھی۔ بال چھوٹی بچیوں کی طرح مختصر کاٹے ہوئے تھے۔ گلابی لپ اسٹک زدہ اور کجلا بھری آنکھیں ہلا ہلا کر وہ اپنی شخصیت کا جادو جگا رہی تھی۔ نیّا کو معلوم تھا کہ اسے بہت پسند کرتا ہے۔ رازی کئی بار اس بات کا اعتراف بھی کر چکا تھا۔ خود مہتاب علاؤالدین کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ پتہ نہیں علاؤالدین کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ کہ رات وہ یہ نظارے دیکھتا پھر بھی مسکراتا رہتا۔ نیّا کو مہتاب علاؤالدین ہمیشہ بری تھی۔ مگر آج کا آنا اسے بہت اچھا لگا۔ کم از کم اس کے آتے ہی رازی تو واپس آیا تھا۔ اس کے چہرے سے وہ کرختگی اور رعونت دور ہو چکی تھی، یوں ہنس ہنس کر کر رہا تھا۔ جیسے اس نے لڑنا سیکھا ہی نہ ہو۔ نیّا کے ساتھ اس کا لب و لہجہ بھی گیا تھا۔ ہنس کر بولا۔

"جان، کوئی چائے وائے پلواؤ نا!"

"ابھی لاتی۔" نیّا جھپٹ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ جب چائے لے کر واپس ڈرائنگ روم میں قہقہے پھوٹ رہے تھے۔ نیّا نے چائے بنا کر سب کو پیش کی۔

"نیّا تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔" مہتاب نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے پیالی لے لی۔

"چائے پی کر ہی تو میں اس کا غلام ہو گیا تھا۔" رازی نے جھوم کر کہا اور نیّا ہنس پڑی اور پھر زندگی بھر تم نے مجھے چائے بنانے پر لگا دیا۔" نیّا نے کہا۔

اس پر سب لوگ ہنسنے لگے۔

"کیوں نا؟" رازی نے ہنس کر کہا۔ "ہم تو حسینوں کی خدمت کو ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

"سب حسینوں کی اس طرح خدمت نہ کرنا جیسی میری کر رہے ہو۔" نیا نے برجستہ کہا اور سب لوگ سمجھے بغیر ہنسنے لگے۔

"مہتاب تم کچھ کھاتی کیوں نہیں ہو۔"؟ نیا محبت سے بولی۔

"بس میں آج کل۔"

"تمہیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، تم تو سدا بہار حسن لاتی ہو۔" نیا نے کہا۔ اس پر مہتاب نے بہت اِتراکر رازی کی طرف دیکھا۔ رازی کی آنکھیں والہانہ اس پر نثار ہو رہی تھیں اور وہ بھی برابر رازی کو نخرے دکھا رہی تھی۔ نیا ہنس ہنس کر سب سہہ رہی تھی۔

"میں تو اپنی بیوی کی اجازت کے بغیر نظر بھی اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔" رازی نے کسی بات پر ہنس کر کہا تو نیا صرف مسکرا دی۔ یہ ایک بہت بڑا جھوٹ تھا مگر بعض اوقات ایسے جھوٹ حوصلوں کو تقویت دیتے ہیں۔ کسی دوسری عورت کو مسخر کرنے کے لئے مرد رازی نے یہ جھوٹ تو بولا۔

"نیا اس بے چارے کو تھوڑی سی چھٹی دے دیا کرو۔" مہتاب نے ہنس کر کہا۔

"کہاں چھٹی مل سکتی ہے۔ جب مقابل تم جیسا قاتل ہو۔" نیا نے بھی چوٹ کی۔ مگر وہ عورت سمجھ نہیں سکی۔ بلکہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

"جان! ان کو وہ ٹیپ تو سنواؤ جو میں کل لایا تھا۔" رازی نے اتنے پیار سے کہا کہ نیا بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

ٹیپ لگاتے وقت نیا سوچنے لگی کہ یہ کتنی بڑی اذیت ہے کہ تمہارے سامنے تمہارا شوہر کسی دوسری عورت پر نثار ہو رہا ہو۔ مگر کبھی کبھی اس اذیت میں بھی کتنا مزا آتا ہے جیسے نشتر چبھونے سے درد میں کمی آجاتی ہے اور اس گھر کا جمود کبھی کبھی ایسی ہی اذیت باتوں سے ٹوٹتا تھا۔

سب لوگ گیت سن کر جھومنے لگے تھے گیت عشقیہ تھا اور غالباً رازی مہتاب

چاہتا تھا۔ اس میں محبوب کے سانولے سلونے چہرے کی تعریف کی گئی تھی۔ مہتاب بھی دزدیدہ نظروں سے رازی کو دیکھ لیتی۔ نیا سوچ رہی تھی۔ وہ ایسی کیوں نہیں بن پاتی جیسی مہتاب علاؤالدین ہے۔ اس نے اپنے حلقۂ احباب میں یہی کچھ دیکھا ہے۔ سب مردوں میں چور ہوتا ہے۔ اے مردوں پر نہیں، بلکہ عورتوں پر تعجب ہوتا کہ وہ کس طرح برداشت کر لیتی ہیں، جبکہ اس نے اس جدید سوسائٹی میں ایسی عورتیں بھی دیکھی تھیں جو جانتی تھیں کہ شوہر کے علاوہ آس پاس کے حلقے میں ان کے دو چار عاشق بھی ہوں۔ وہ بددیانتی نہیں سمجھتی تھیں۔ نیا یوں تو بہت ماڈرن بنتی تھی مگر اندر کی گرہ نہیں کھلی تھی، یہ گرہ عبدالرحیم کے ہاتھوں بندھی تھی۔ کیسے کھل جاتی۔

مہتاب اور اس کا شوہر رات گئے تک بیٹھے رہے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ گرم کباب بنا کر لاتی رہی۔ رازی کا موڈ ہمیشہ سے زیادہ خوشگوار تھا۔ نیا بھی شام والی بھول گئی تھی۔ وہ لوگ رات کے بارہ بجے گئے۔ تو نیا کپڑے بدل کر خوش خوش بیڈروم گئی۔ یہ سوچ کر کہ رازی سے دوبارہ بات کرنے کا موقع ملے گا اور وہ کسی طرح اپنی بات منوا لے گی۔ رازی ایک رسالہ پڑھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر کرخت سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"رازی۔"؟ وہ قریب آکے بڑے پیار سے بولی۔

منہ سے کچھ کہے بغیر رازی نے صرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں اتنی سختی تھی کہ نیا لرز گئی۔ پھر اپنے آپ سے بولی۔

"عورتیں بے غیرت ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر قسم کی بے عزتی کو پی جاتی ہیں۔ تو بھی پی جا۔"

"اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ جیسے میں تمہاری کچھ بھی نہیں لگتی۔"

"اچھا۔" رازی طنز سے بولا۔ "مہمانوں کی وجہ سے میں ذرا لحاظ کر گیا تو تم نے میرے بارے غلط اندازا لگا لیا۔"

"نہیں رازی۔" نیا اس کے قریب بیٹھ گئی۔ "میں تمہارے بارے میں کبھی غلط اندازہ نہیں

لگاتی۔ میں تمہارے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"کام۔۔؟" رازی طنزیہ ہنسا۔ "پہلے اپنی صورت دیکھو۔۔۔۔ اپنا حلیہ دیکھو۔۔ مہتاب کو دیکھا تھا تم نے۔ کتنی شاندار عورت ہے؟ اس کے بھی دو بچے ہیں۔"

نیاّ کا دل چاہا وہ کہہ دے کہ مہتاب نے تو شوہر کو پالتو جانور بنا رکھا ہے۔ بہواس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ کبھی وہ اس اندرونی آگ میں جلی ہو تو اس کے چہرے پر خراشیں نظر آتیں۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ایسی بات کہہ دینے سے ساری رات غارت ہو جائے گی اور اب اسے رازی سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسی لئے وہ کوئی تلخ بات بھی نہ کہتی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی، تو رازی بولا۔

"میرے ساتھ کام کرنے کے لئے عورت کا اسمارٹ ہونا ضروری ہے۔ ذہنی طور پر چاق و چوبند۔"

وہ پھر کتاب پڑھنے لگا۔ نیاّ دور بیٹھ کر دور کی باتیں سوچنے لگی۔

رے دن صبح نیاّ نے موٹر نکالی اور ایک بیوٹی کلینک کے باہر جا کر دم لیا۔ رات نے تہیہ کر لیا تھا۔ کہ اب وہ اپنے آپ کو ٹھیک کر لے گی۔

ر بند کر کے چابی گھماتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ تو کمرہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہی ، خشک پھروں والی۔ بجھی بجھی عورتیں۔ انہوں نے مڑ کر نیاّ کو دیکھا۔ مگر کسی نے ۔ شاید اب اس کا سراپا ہی بدل چکا تھا۔ نیاّ کو دیکھ کر ایک خاتون پیشوائی کو بڑھی رانہ انداز میں بولی۔

سر ماتیے۔"

پہلے ان سب سے فارغ ہو لیں۔" نیاّ نے کہا۔ "میں پھر بات کروں گی۔"

آپ تشریف رکھیں۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

بچھ گئی اور غور سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ خاتون اپنی جگہ پر چلی گئی تھی اس کے رکیاں کھڑی تھیں۔ ایک بہت ہی دبلی پتلی تھی اور دوسری بہت ہی موٹی۔ وہ سے مخاطب ہوئی۔

ماں کمزوری میں مبتلا ہونا اچھی بات نہیں۔ آپ ہلکی ایکسرسائز کیا کریں اور اچھی غذا

کھایا کریں۔ دودھ کے ساتھ بالائی اور کریم کا استعمال رکھیں۔ پھلوں میں کیلا اور آم زیادہ کھایا کریں۔ جلدی ہی آپ کا وزن بڑھ جائے گا۔ ویسے آپ اتنی بُری نہیں لگتیں۔ جتنا آپ کو کامپلیکس ہے۔ آپ کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ آپ اپنے جسم کی مناسبت سے موزوں کپڑے پہنا کریں۔ اب یہی دیکھیئے۔ آپ نے کھڑی لائنوں والی قمیض پہن رکھی ہے۔ اس میں آپ اور زیادہ دبلی اور لمبی دکھائی دے رہی ہیں۔ عام طور پر آپ بڑے بڑے پھول والے پرنٹ اور شوخ رنگوں کے کپڑے پہنا کریں۔ کالے رنگ کے کپڑے نہ پہنا کریں۔ کالے کپڑوں میں بھی انسان دبلا پتلا نظر آتا ہے۔

پھر وہ موٹی لڑکی کی طرف مڑی اور بولی۔

"یہ آپ کی سہیلی ہیں۔؟"

"نہیں یہ میری کزن ہے۔"

"آپ کے برعکس یہ بہت موٹی ہیں اور انہوں نے بڑے بڑے پھولوں والا گرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا ہے۔ بی بی پہلے تو آپ اپنا وزن کم کریں۔ یہ میں آپ کو خوراک کا ایک چارٹ دے رہی ہوں۔ اس کے مطابق کھانا کھائیں۔ ہر روز یہاں آکر ایک گھنٹہ ورزش کیا کریں اور یہ بڑے بڑے پھولوں والے کپڑے پہننا چھوڑ دیں۔ آپ زیادہ تر لانگ سوٹ گہرے رنگوں والے کپڑے پہنا کریں۔ یا پھر چھوٹا پرنٹ ہو۔ میرا خیال ہے کہ ایک مہینے میں آپ کا وزن کم ہو جائے گا۔ ہاں آپ میٹھا بالکل نہ کھائیں۔"

"مگر اس کو تو آئس کریم بہت پسند ہے۔" دبلی لڑکی نے لقمہ دیا۔

"نہیں۔ آئس کریم اور چاول تو بالکل بند کر دیں۔ پھلوں میں بھی صرف سنگترہ اور کھائیں۔ آپ کو معلوم ہے سنگترے کے چھلکے میں کیا تاثیر ہے؟" وہ خاتون لیکچر دینے اور نیا کو بیٹھے بیٹھے اختلاج ہونے لگا۔ اسے اپنا زمانہ یاد آگیا۔ اسی طرح وہ بھی بیا انداز میں بے تکان بولا کرتی تھی۔ مظلوم عورتوں کو ہدایات دیا کرتی تھی۔ ہمیشہ خوب صو

ے مشورے دیتی تھی۔ مردوں کا مقابلہ کرنے پر اُکسایا کرتی تھی اور سمجھتی تھی کہ وہ تسخیر کی ڈگر پر کھڑی ہے۔ مگر۔ مگر وہ تو ابھی تک وہی عورت تھی اور کتنے تعجب کی بات ہے یہاں بھی مجبور عورتوں کے کٹہرے میں کھڑی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ساری پیشہ ورانہ مجبوریاں ہیں۔ گاہکوں کو پھنسانے کے لئے۔ نہ کوئی کسی کو حسن دے سکتا ہے نہ جوانی۔ مگر اسی وقت کلینک والی خاتون اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"اب آپ فرمائیں۔" نیا نے دیکھا وہ بہت معمولی شکل و صورت کی عورت تھی۔ اس سے کوئی ایسی بات نہ تھی کہ جو اس سے مشورہ لیا جاتا۔ مگر اب آپھنسی تھی تو بولنا پڑا۔

"میں اپنا وزن کم کرنا چاہتی ہوں۔"

خاتون نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور بولی۔

"آپ کو بیٹ اندر کرنے والی ایکسرسائز کی ضرورت ہے۔"

نیا ہنس پڑی تو وہ بولی۔

"ویسے آپ کو فیشل کی بھی ضرورت ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ آنکھوں کے باہر لائنیں بھی پڑ گئی ہیں۔ ٹھوڑی کے نیچے بھی ماس ڈھیلا ہو گیا ہے۔ آپ کو ہر مہینے ایک مساج دوں گی۔" وہ اپنا لیکچر شروع کرنے والی تھی کہ نیا ایک دم بول اٹھی۔

"مجھے صرف اپنا وزن کم کرنا ہے۔ کیونکہ میرے پاس ایکسرسائیکل نہیں ہے۔ باقی سب میں جانتی ہوں۔ میں نے بیوٹی ٹریٹ منٹ میں ڈپلوما لیا ہوا ہے۔"

"اچھا۔" وہ عورت ایک دم خاموش ہو گئی۔ کچھ اور ضروری باتیں کر کے نیا باہر نکل آزاد دنیا کی ہر بات ہی اُسے کھوکھلی لگ رہی تھی۔ اصل چیز تو دل کی خوشی ہے۔ خوشی نہ ہو۔ تو چہرے پر روشنی نہیں ہو سکتی۔ سچی خوشی ایکسرسائز اور ٹریٹ منٹ میں

نہیں ہے۔ اپنے گھر میں ہے۔ داغ داغ چہرہ اور زخمی زخمی دل لئے جانے زیبا لڑکیوں میں کیا ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ مرد کے لئے حسین عورت وہ ہے۔ جو اپنے اختیار میں نہ ہو۔ پرائی ہو۔ دُور ہو۔ نئی ہو۔ زلفیں، گیسو، آنکھیں، ہونٹ سب کتابی باتیں ہیں۔ نیّا کا دل جلنے لگا۔ وہ یونہی موٹر میں آ بیٹھی۔ اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتی رہی۔ پھرتے پھراتے اس کی نظر سامنے ایک بورڈ پر پڑی۔ پہلے تو وہ اس کے قریب سے گزر گئی پھر دوبارہ مڑ کر آئی اور غور سے بورڈ پڑھا۔ لکھا تھا۔

"پروفیسر غلام ربّانی ماہر نفسیات۔ ہر قسم کے مشوروں کے لئے تشریف لائیے۔"

نیّا نے اپنی موٹر روک لی۔ کئی دن سے وہ سوچ رہی تھی کہ اپنا معاملہ کسی ماہر نفسیات کے سپرد کر دے۔ ماں سر پہ نہیں رہی تھی کوئی سہیلی بھی نہ تھی۔ جس سے وہ مشورہ کرتی، کوئی دردِ دل سننے والا نہیں تھا۔ دل چاہتا تھا کہ کسی ایسے ہی آدمی سے ملے خصوصاً جب وہ رسالوں میں دیکھتی کہ لوگ لکھ لکھ کر اپنے مسئلوں کا حل پوچھتے ہیں تو وہ کیوں نہ پیسے دے کے چارہ گر پیدا کرے۔ شاید یہ دانشور اسے زندگی کا نیا راستہ بتا سکے۔ اب جو سامنے بورڈ نظر آیا تو فوراً دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ان پروفیسر صاحب سے ابھی ملے گی۔ اگر کل پہ بات رکھ لیتی تو جانے کل اس کا موڈ کیسا ہوتا۔؟ وہ ملاقات کے کمرے میں بیٹھ گئی۔ ایک سوکھا سا ملازم جھانک کر اندر چلا گیا۔ چونکہ اس وقت کوئی اور ضرورت مند نہیں آیا تھا۔ اس لئے پروفیسر صاحب نے اسے فوراً اندر بلا لیا۔ پروفیسر صاحب پچاس کے لگ بھگ ہوں گے پکے ہوئے رخسار تھے۔ آنکھیں بجھی بجھی سی۔ شکل سے ذرا بھی ماہر نفسیات نہیں لگ رہے تھے۔ بلکہ ہونق لگ رہے تھے۔ نیّا ڈرتی جھجکتی ان کی میز کے سامنے بیٹھ گئی۔

"پروفیسر صاحب! میں آپ سے مشورہ لینے آئی ہوں۔" وہ گلا صاف کر کے بولی۔

پروفیسر صاحب نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ "اور کس لئے آئی ہو تمہیں یہاں" مگر بڑے میکانکی انداز میں بولے۔

"بیان کریں بی بی۔"

"جی... جی..." نیّا پھر رک گئی۔ اسے اب اپنا مسئلہ بہت حقیر سا نظر آنے لگا۔ وہ ...ب ہو گئی تھی۔

"شاید آپ میری کچھ مدد کر سکیں۔ آج کل میں ذہنی طور پر بہت پریشان رہتی ہوں۔"

پروفیسر صاحب نے صرف سر ہلایا۔ تب نیّا کو احساس ہوا کہ وہ انتہائی احمق لگ رہی ...اب ہمت کر کے اسے سب کچھ کہہ دینا چاہیئے۔

"جو بات تو وہی پرانی ہے۔ یعنی میرے شوہر سے میرے کچھ نظریاتی اختلافات ہو گئے ہیں ...ے ہماری ازدواجی زندگی مجروح ہو رہی ہے۔

پروفیسر صاحب چپ رہے۔ شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ نیّا کی جھجک دور ہو جائے ...ہی سب کچھ کہتی چلی جائے اور ہوا بھی یہی۔ نیّا نے نظریں جھکا کر سب کچھ کہہ دیا — ...ں سے لے کر آخری پھانس تک۔ یہاں ایک جگہ رک گئی، کیونکہ اب پہلی شادی کا حوالہ ...یر ہو گیا تھا۔ پروفیسر صاحب بڑی مشّاقی سے بولے۔

"ڈاکٹر سے اپنی بیماری چھپائی جائے تو وہ صحیح طور پہ علاج نہیں کر سکتا۔ اگر آپ علاج ...نے آئی تو پھر کوئی بات اپنے دل میں نہ رہنے دیں۔

نیّا نے مختصراً اپنی پہلی زندگی کی کہانی بھی سنا دی۔ سب کچھ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ ...ا ایسے لگا جیسے پروفیسر صاحب سنتے سنتے مراقبے میں چلے گئے ہیں۔ کیونکہ کافی ...وہ نظریں جھکائے بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔ جب نیّا کو بے چینی ہونے لگی ...ں نے سر اٹھایا اور بولے۔

"آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ نے مجھے کوئی نئی کہانی نہیں سنائی۔ یہاں سینکڑوں عورتیں ...ں اور کم و بیش ایسی ہی کہانیاں سنا کر چلی جاتی ہیں۔" وہ کچھ دیر رُکے اور نیّا کے ...کے تاثرات پڑھنے لگے۔ "ہمارے ملک میں نوے فیصد عورتیں اپنے شوہروں

کی بے حسی کا گلہ کرتی ہیں۔ ہمارے پیشے کا جہاں یہ تقاضا ہے کہ ان کے حالات اپنے تک محدود رکھیں۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے حالات کا اچھی طرح جائزہ لے کر کوئی راستہ نکالیں۔"

"جی۔" نیّا نے آہستہ سے کہا۔

"آپ جانتی ہیں تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی۔ ممکن ہے۔ دوسری پارٹی کو بھی آپ سے کچھ شکایتیں ہوں۔ ان شکایات پہ کان دھرنا بھی ضروری ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ میرے شوہر سے ملیں گے"؟ نیّا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"اگر ضرورت پڑی تو ملنا پڑے گا۔"

"پروفیسر صاحب! آپ کو معلوم ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی باتوں کی اجازت نہیں دی جاتی۔"

"کیسی باتوں کی بی بی؟" پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

"یہی کہ شوہر کی شکایت کسی غیر مرد سے کی جائے۔ حالانکہ یہ شکایت نہیں ہے یہ قدم تو گھر کے سکون کو بحال رکھنے کے لئے اٹھایا گیا ہے۔ آخر آدمی پریشان ہو تو کیا کرے؟ مصیبت میں تو دیوار سے بھی مشورہ لے لیتے ہیں۔ میرے سر پہ چونکہ کوئی نہیں ہے۔ اس لئے میں آپ کے پاس چلی آئی ہوں۔ مگر میرے شوہر میرے اس فعل کو انتہائی قبیح کہیں گے۔"

"آپ تو ناحق گھبرا گئیں۔" پروفیسر صاحب گویا ہوئے۔ "میں نے کہا تھا میں آپ کا اچھی طرح جائزہ لوں گا اور بعض باتوں میں مصالحت کے لئے ان کو بلا کر سمجھا بجھا دیا

"نہیں پروفیسر صاحب۔" نیّا جلدی سے بولی۔ "اگر آپ کے پاس کوئی ایک طرفہ حل ہے تو مجھے بتا دیں اگر آپ ان سے ملے تو پھر طلاق یقینی ہو جائے گی۔"

"بی بی آپ طلاق سے کیوں ڈرتی ہیں۔؟"

نیّا حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی تو وہ پھر بولے۔

"جبکہ آپ ایک مرتبہ طلاق لے چکی ہیں۔"

"کیا پروفیسر صاحب" طلاق میرا مقدر بن جانا چاہیئے؟"

"فرض کریں کہ اگر یہ آپ کا مقدر ہو۔ تو آپ اسے کیسے بدل سکتی ہیں؟"

نیّا پوری جان سے لرز گئی۔ پروفیسر صاحب صریحاً بدشگونی کی باتیں کر رہے تھے۔

"گویا آپ میرے ذہن میں یہ بات ڈال رہے ہیں۔" نیّا نے جز بز ہو کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ بہت بہادر عورت ہیں۔"

"ہاں پروفیسر صاحب یہ فقرہ بہت بڑا ٹانک ہے۔ مگر اسی فقرے سے عورت کو گھن آنے لگتی ہے کیونکہ عورت صرف عورت بن کر رہنا چاہتی ہے۔"

"ہوں..." پروفیسر صاحب تھوڑی دیر خاموش بیٹھے ایک کاغذ پہ لائنیں بناتے رہے۔ پھر بولے۔ "آپ کچھ اپنی نجی زندگی کے بارے میں بھی بتائیں۔؟"

نیّا نے نظریں اٹھا کر استفہامیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ کیونکہ وہ تو تقریباً سبھی کچھ بتا چکی تھی۔

"اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں۔ میرا مطلب ہے۔ میاں بیوی کی پرائیویٹ، ذاتی زندگی کے بارے میں۔"

نیّا نے گھور کر پروفیسر صاحب کو دیکھا۔ جو کچھ نیّا بتا چکی تھی وہ ایک ذہین انسان کے لئے کافی تھا۔ اسے گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر پروفیسر صاحب بولے۔

"کیا وہ اس معاملے میں آپ پر تشدد کرتے ہیں... بے حسی اختیار کرتے ہیں.... یا ... ان کے مطالبات کیا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔" اور "وغیرہ وغیرہ" انہوں نے بہت لمبک کر کہا۔

"اوہو!" نیّا ایک دم چونک اٹھی۔ اب پروفیسر صاحب کو ڈی چھیڑ پڑی اور مزید اُنہیں کی داستان سننا چاہتے ہیں۔ اپنے بجھتے دل اور سوتے ہوئے ولولوں کو جگانے کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ شاید اب ان کی زندگی میں یہی کچھ رہ گیا تھا کہ ایسی کہانیوں سے دل بہلایا کریں۔ نیّا کو اپنا کھوکھلا پن خود بُرا لگنے لگا اور وہ یہاں سے اٹھنے کا بہانہ تلاش کرنے لگی۔ گھڑی دیکھ کر بولی۔

"معاف کیجئے گا۔ پروفیسر صاحب! مجھے اب گھر جانا ہوگا۔ میری بچی کے دودھ کا وقت ہو گیا ہے۔ دراصل میں گھر سے آپ سے ملنے کے ارادے سے نہیں نکلی تھی۔ آپ کا بورڈ دیکھ کر ادھر آ گئی اور باتوں میں بچی کو بھول گئی تھی۔ اب اجازت دیجئے۔ میں کل پھر آؤں گی اور باقی باتیں بتاؤں گی، آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گی۔" نیّا کھڑی ہو گئی۔

"بہت بہتر بی بی۔" پروفیسر صاحب بھی کھڑے ہو گئے۔ جیسے آپ کی خوشی۔ جیسے بھی چاہیں آپ خوشی سے تشریف لائیں۔"

نیّا نے پرس کھولا۔ فیس ادا کرنے کے لئے۔ آخر اس نے ان کا ایک گھنٹہ لیا تھا مگر ایک گھنٹے میں اسے حاصل کچھ نہیں ہوا تھا۔ پوچھنے سے پہلے اس کی نظر میز پر رکھے ایک بورڈ کی طرف اٹھ گئی۔ جس پر ان کی فیس درج تھی۔ نیّا نے سرخ نوٹ ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے یوں دبوچا جیسے بلی چوہے کو دبوچتی ہے۔ نیّا نے غور کیا، پروفیسر صاحب کا چہرہ اس طرح تھا جیسے لکڑی کا تختہ، نہ جذبات، نہ احساسات، نہ ہمدردی کی کوئی کرن۔ نیّا خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔ اسے احساسِ زیاں ہونے لگا کہ آج تک اس نے دل کی بات کسی سے نہ کہی تھی۔ روح پر منوں بوجھ لئے پھرتی تھی۔ یہی بوجھ اس کا سرمایہ تھا۔ آج اس بوجھ کو ذرا سا کھسکانے کی کوشش کی تو اپنا تن من خالی نظر آنے لگا۔ بعض اوقات دل کے دکھ کسی سے کہہ کر تن من ہلکا پھلکا نظر آنے لگتا ہے۔ روح پر چھائے غموں کے بادل بھک سے اڑ جاتے ہیں مگر پروفیسر صاحب سے مل کر دل اور بھی بوجھل ہو گیا تھا

ہم لوگ علم کا خزانہ سمجھتے ہیں وہی لوگ اندر سے خالی ٹن ٹن بجنے لگیں۔ تو کس قدر قلق

؟

کیا دنیا میں کوئی روشنی نہیں دکھا سکتا۔ ؟

ہر کوئی اپنی مسند پہ شعبدہ باز بن کر بیٹھا ہے ؟

نیّا کا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ گھر جانے کا تو اس نے بہانہ بنایا تھا۔ اداس اور ویران گھر اسے کیا کرنا تھا۔ ؟ راستے میں رازی کے ایک پرانے دوست یامین کا گھر پڑتا تھا۔ بیوی بہت ہی ہمدرد اور ایک سلجھی ہوئی خاتون تھی۔ گو گاؤں کی تھی مگر اچھی سمجھ بوجھ کی۔ یامین صاحب بھی بہت اچھے آدمی تھے۔ گو وہ رازی کے پرانے دوست تھے پھر بھی نیّا کی طرفداری کرتے تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں یہی ایک جوڑا تھا جسے رازی کی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا علم تھا۔ بلکہ بعض اوقات یہ دونوں ان کی صلح بھی کرا دیتے یامین صاحب عمر میں رازی سے بہت بڑے تھے۔ اس لئے رازی ان کا احترام کرتا نیّا بھی انہیں بالکل اپنے بزرگوں کی طرح سمجھتی تھی۔ اس لئے جب بھی گھر کے حالات میں پریشانی ہوتی تو ان کے گھر کا رخ کرتی۔ کبھی یہ لوگ رات گئے تک اس کے پاس بیٹھے جب کبھی رازی نیّا کے ساتھ تلخ کلامی کرتا، یامین صاحب اسے ڈانٹ دیتے اور سمجھایا کرتے۔

رازی! تم یہ مت سمجھنا کہ نیّا کا اس دُنیا میں کوئی نہیں۔ میں بازپُرس کرنے کے لئے موجود رہوں گا۔ جب کبھی اس کو ستاؤ گے میں تمہارا گریبان پکڑ لوں گا۔" اور نیّا سے بھی یہی کہتے تھے۔ "نیّا جذباتی پن سے ہوتے ہوئے آپ خود کو اکیلا نہ سمجھیں اور ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا کریں۔ جمیلہ بھابی ہمیشہ آپ کے طرفدار رہیں گے۔" اسی شہ پہ بدترین لمحوں میں نیّا یامین صاحب کے گھر چلی جاتی تھی اور آج بھی دل پہ گھٹائیں سی چھائی ہوئی تھیں۔ اس لئے سوچا کہ جمیلہ بھابی کے پاس جا کر دل کو ہلکا کرتی جائے۔ نیّا نے موٹر ان کے گھر کی طرف موڑ لی۔ اندر گئی تو یہ دیکھ

کو اسے تعجب ہوا کہ یامین صاحب اس وقت گھر پر ہی تھے۔ جبکہ اس وقت انہیں دفتر میں ہونا چاہیئے تھا۔

نیّا انہیں دیکھ کر بوکھلا گئی پھر سنبھل کر بولی۔

"آج آپ دفتر نہیں گئے۔؟"

"نہیں بھابی۔" وہ بولے۔ "آج جمیلہ کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اور میں آج چھٹی پر ہوں۔"

"جمیلہ بھابی کہاں ہیں؟" نیّا آگے بڑھ آئی۔

"اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اسپتال گئی ہے اور میں بچوں کے پاس بیٹھا ہوں۔"

"کب تک آئیں گی۔؟"

"بس آنے والی ہوں گی کچھ ٹیسٹ کرنے تھے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔"

"نیّا بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس طرح واپس جانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس لئے بیٹھتے ہی بولی۔

"میں تو یونہی اِدھر سے گزر رہی تھی۔ سوچا جمیلہ بھابی سے ملتی جاؤں مجھے کیا معلوم کہ وہ بیمار ہیں۔ اب تو انہیں دیکھ کر ہی جاؤں گی۔" نیّا ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ یامین صاحب ملازم سے چائے کا کہنے چلے گئے۔

یامین صاحب کے مشفقانہ برتاؤ کی وجہ سے نیّا انہیں بڑے بھائی یا باپ کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ اسی لئے گھریلو باتوں میں بے تکلف مشورے بھی مانگ لیتی تھی۔ آج چونکہ اس کا جی ہمیشہ سے زیادہ بوجھل تھا اور رازی کی بڑھتی ہوئی بے حسی نے اسے ہراساں کر رکھا تھا۔ اس لئے سوچا کہ یامین صاحب سے بھی مشورہ کرلے۔ تھوڑی دیر میں یامین صاحب کمرے میں آ گئے۔ لائٹر سے سگریٹ سلگایا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ

رسنا میں بھابی، کیا حال چال ہیں اس خبیث کے۔؟" بس ان کا یہ کہنا تھا کہ نیّا جو سے آنسو سنبھالے پھر رہی تھی۔ رو پڑی۔ رونے سے کچھ جی بھی ہلکا ہوا۔ اتنے پائے رکھ گیا۔ نیّا نے آنسو پونچھ کر اپنے لئے بھی چائے بنائی اور یامین صاحب بھی۔

لگریٹ۔" یامین صاحب نے اٹھ کر پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ دوسرے ہاتھ سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور بولے۔

ب بات میں آپ کو بتا دوں کہ رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ ذرا سے کام لیں۔"

یسے سختی کروں یامین صاحب؟ وہ تو پہلے ہی بدک رہا ہے۔ زیادہ لڑائی جھگڑا کروں لڑ کر بھاگ جائے گا۔"

ں کے بھاگ جانے سے آپ کب تک ڈرتی رہیں گی۔؟

ہا کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی۔ جس سے مزید بدمزگی پیدا ہو۔"

ائے کے دو ایک گھونٹ پی کر یامین صاحب بولے۔

رازی کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ دراصل وہ ایسی ہی زندگی گزارنے کا ہے۔ شادی اس کے لئے کوئی زنجیر نہیں ہے۔ آپ ناحق اپنے آپ کو ضائع کر

یں کیا کروں۔؟" نیّا کو اندر سے بہت تکلیف ہوئی۔ کوئی آدمی رازی کے بارے رائے نہیں رکھتا تھا۔ سب ہی نہ جانے اشارے کنائے میں اس سے کیا ہتے تھے۔ جسے وہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ کاش اتنا اہم فیصلہ کرنے لے وہ کسی کی بات پر کان دھر لیتی۔

"آپ میں سچ سننے کا حوصلہ ہے ؟" یامین صاحب نے کہا۔

"جی ہاں - آپ جو کہنا چاہتے ہیں - کہیں - میں اب پتھر ہو چکی ہوں - کانچ کی عورت نہیں کہ بکھر جاؤں گی۔"

"رازی کے سدھرنے کے امکانات بالکل کم ہیں - اس کے ساتھ آپ کو اسی طرح گزارا کرنا پڑے گا - وہ اپنی مرضی کا آدمی ہے۔"

"لیکن اس طرح تو میں مر جاؤں گی، یا مجھے کوئی روگ لگ جائے گا۔" نیا نے تقریباً رو کر کہا۔ "یہ بھی کوئی زندگی ہے۔"

"اس طرح جینے کو کون کافر کہہ رہا ہے - ؟"

"اور کس طرح جیئوں - ؟"

"آپ خوش خوش رہا کریں۔"

"کیسے خوش رہوں یامین صاحب - آپ بالکل بچوں والی باتیں کر رہے ہیں - دل میں آگ لگی ہو اور میں خوش رہوں - مصنوعی مسکراہٹ کا ماسک چڑھا کر میں نے دیکھ لیا ہے - دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"مصنوعی طور پر خوش رہنا تو کوئی بات نہ ہوئی - خوش رہنا سیکھیئے۔"

"کس طرح ۔"

"جس طرح رازی خوش رہتا ہے۔"

"رازی کس طرح خوش رہتا ہے - ؟"

"اس نے زندگی کی رنگینیوں سے منہ نہیں موڑا - وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا جس میں اسے خوشی محسوس ہوتی ہے - وہی کرتا ہے - اسی ماحول میں رہتا ہے، جو اس کا دل خوش ہوتا ہے - انہی لوگوں سے ملتا ہے، جو اسے اچھے لگتے ہیں۔"

"وہ مرد ہے۔" نیا نے کہا - معاشرہ اس کو یہ سارے حق دیتا ہے۔"

ے جاتے دیں اب معاشرے کی بحث - آج کے دور میں مرد عورت سب

ب - آپ اپنے آپ کو آمادہ تو کریں۔"

یعنی - ؟" نیا نے ہونقوں کی طرح منہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا - وہ ہنسنے لگے۔

ہائی آپ بہت معصوم ہیں - تعجب ہوتا ہے - اتنی زندگی آپ نے کیسے گزاری؟"

نیا خاموشی سے چائے پینے لگی۔

دمی جس ماحول میں ہو - اسے اپنے آپ کو اسی ماحول کے مطابق ڈھال لینا چاہیئے۔"

یں عورت ہوں یامین صاحب !"

ابھی چھوڑیئے ۔ اگر لٹ گیا اک نشیمن تو کیا غم۔" یامین صاحب نے اپنی آواز ذرا

ا لی۔ "ایسے مردوں کو مزا چکھانا چاہیئے - اگر عورت شریف بنی رہے تو یہ اور بھی

تے ہیں۔"

نیا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا - بس وہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔

یر کیا پوچھتی ہیں آپ۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ "میں تو شروع

ے آپ کا مداح ہوں - جب سے آپ کو ٹی وی پر دیکھا تھا - آپ کو تو شاید علم بھی نہ

رازی سے تو میری معمولی سی صاحب سلامت تھی - بھلا میں اس قسم کے آدمی سے

ڑ کے اپنے آپ کو خطرے میں کیسے ڈال سکتا ہوں وہ تو میں نے آپ کی خاطر ہی

ور قریب آنے کا خطرہ مول لیا۔

کر وہ خجالت سے ہنسنے لگے - نیا چپ بیٹھی تھی مگر دل میں سوچ رہی تھی۔ "یہ

وقع تھا ایسی بات کہنے کا۔" ابھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ یامین صاحب

آنسو بہانے اور رونے سے عورتوں کے مسائل حل نہیں ہوتے - اس طرح

ن اور صحت تباہ ہو جائے گی - اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کریں۔"

"مگر کس طرح ۔ ؟" وہ جز بز ہو کر بولی۔

"بھئی اگر آپ صاف صاف سننا چاہتی ہیں۔ تو سنیئے۔ رازی کی دلچسپیاں باہر ہیں اس کو ہمیشہ شراب و کباب، راگ رنگ اور عورت سے دلچسپی ہے۔ آپ اپنی زندگی برباد کر بھی اس کی یہ لت چھڑا تو نہیں سکتیں۔ اس لئے جلنا کڑھنا چھوڑ کر اپنے دل کے بہلانے کا سامان ڈھونڈ لیں۔"

"یعنی.... یعنی.... نیا کو کھلا گئی۔

"ہاں زندگی تو خوشی سے ہے۔ خوشی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ خوشی ہر قیمت پر خرید لینی چاہیئے اور اس کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی علم نہ ہوگا شہر میں ہم جیسے مدّاح بھی ہیں جو عرصہ دراز سے آپ سے باقاعدہ عشق کر رہے ہیں۔ گولی ماریں رازی کو۔ وہ اوروں کو لئے پھرتا ہے۔ آپ بھی اپنا وقت اپنے مداحوں کے ساتھ گزاریں اور یہ کوئی گناہ بھی نہ ہوگا۔ جیسے کو تیسا آپ نے یہ مثل تو سنی ہوگی۔ آپ جوان ہیں، خوب صورت ہیں۔ اپنے آپ کو سزا کیوں دے رہی ہیں ۔ ؟"

غصّے سے نیا کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر یامین صاحب نے اسے حیا پر محمول کیا بولتے چلے گئے۔

"میں تو خدا کی قسم آپ کی وجہ سے اُسے مسلسل برداشت کر رہا ہوں۔ دو دفعہ کبھی جی چاہتا ہے خنجر اس کے سینے میں اتار دوں۔ بڑا ہی کمینہ آدمی ہے۔"

"نیا ابھی کچھ کہنے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کر رہی تھی کہ ایک دم باہر موٹر ہارن کی آواز آئی... موٹر کی آواز سنتے ہی یامین صاحب باہر لپکے۔ غالباً ان کی بیوی تھی۔ نیا نے بمشکل اپنا موڈ سنبھال کیا وہ یامین کی بیوی کے سامنے اپنے احساسات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یامین صاحب جمیلہ کو بازوؤں کا سہارا دے کر یوں لا رہے

سے بڑا زن مرید اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اسے لاکر انہوں نے صوفے پر لٹا دیا
ے والہانہ انداز میں ان کی طبیعت پوچھی جیسے اس کی فکر میں مرے جا رہے تھے
ونے پر لٹا کر وہ اتنی فرمانبرداری سے سر جھکا کر بیٹھے تھے۔ گویا کسی عظیم استاد کے
ں بیٹھے ہوں۔ نیا کی طرف تو انہوں نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ باتیں کرتے کرتے
ی کے پاؤں دبانے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر نیا کو جیسے قے آنے لگی وہ تھوڑی دیر
بی کے پاس بیٹھی رہی۔ یونہی لایعنی سے سوال کرتی رہی۔ ان کو صحت کے بارے
ہدایات دیتی رہی۔ بالآخر وہ سلیقے سے اجازت لے کر کھڑی ہو گئی۔ یامین صاحب،
ائے فرمانبردار بنے، اپنی بیوی سے اجازت لے کر اُسے باہر تک چھوڑنے آئے
ان سے کوئی بات نہیں کی۔ ان کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ جاتے
انہوں نے نیا پر ایک حسرت آمیز انتہائی غلیظ اور ننگی نگاہ ڈالی۔ نیا کے سر سے لیکر
اں آگ لگ گئی۔ وہ اس نگاہ کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

اس میں قصور کس کا ہے نیا بیگم ۔ ؟" راستے بھر وہ سوچتی رہی۔ جب عورت ڈگمگ
ہے تو راہبر بھی راہزن بن جاتے ہیں۔ یہ ہیں آج کل کے دوست۔ تو بھی ہر ایک
ا اعتبار کر لیتی ہے۔ چلی تھی ایک مسئلہ حل کرانے، ابھی کئی مسئلے اور کھڑے ہو جاتے ؟
ہر بازار ننگے سر نکل آتے تو چاہنے والوں کی کمی نہیں رہتی۔ کیونکہ مرد نے عورت
نا اپنی عیّاشی کی شے سمجھا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ تو اپنے شوہر کے اشاروں

اب کیا کرنا چاہتی ہے ۔ ؟ تو جس راستے پر جاتی ہے۔ وہیں سانپ پھن اٹھا کے
ے ہو جاتے ہیں اور اگر اب تو رازی سے یہ بات کہہ بھی دے تو وہ جھٹ کہہ
گا کہ سارا قصور تمہارا ہے۔ تمہیں ہی لوگوں کو اپنے عشق میں مبتلا کرنے میں مزا آتا ہے
لے گھر کیوں گئی تھی ؟ اور رازی یامین صاحب پر بھروسہ کتنا کرتا ہے۔ ایمان جیسا

بھروسہ! اور یہ کم بخت اندر سے کتنا کالا نکلا۔

نیّا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور رگیں درد سے پھٹی جا رہی ہیں اور اگر اس نے ذرا سا اور ذہن پر زور دیا تو سر پھٹ جائے گا۔ جن دنوں وہ پریشان ہوتی تھی اسے رات کو نیند بھی نہیں آتی تھی۔ صبح کو سارا چڑچڑا پن تو کردوں پر نکالتی اور پھر کئی بار اسی عالم میں رازی سے بھی ناشتے کے وقت جھڑپ ہو جاتی تھی۔ سامنے ہی ڈاکٹر کا بورڈ دیکھ کر اسے یاد آگیا کہ آج نیند کی اور سر درد کی کوئی دوا لکھوا کے لیتی جائے۔ سارا دن یو پے در پے واقعات ہوتے ہیں۔ وہ اسے آج پھر سونے نہیں دیں گے۔ وہ کلینک میں جا کر بیٹھ گئی اور اپنی باری آنے پر اندر گئی اور بولی۔

"ڈاکٹر صاحب میرے سر میں اکثر درد رہتا ہے۔"

"کیا آپ نے اپنی نظر ٹیسٹ کرائی ہے۔؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا مگر نظر ٹیسٹ کرائی تو بالکل ٹھیک تھی۔"

"پھر کیا وجہ ہے درد کی۔؟"

"یہی تو میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں۔"

"عام طور پر کب درد ہوتا ہے۔؟"

"جی زیادہ تر رات کو ہوتا ہے اور وہ بھی پچھلی رات۔ اب تو یہ عالم ہے کہ ذرا سا دماغ پر زور دوں اور سوچنا شروع کردوں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

"اچھا تو آپ سوچتی بھی ہیں۔" ڈاکٹر کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"جی ہاں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ہر انسان سوچتا ہے۔"

"نہیں آپ نے غلط کہا۔ ہر انسان نہیں سوچتا۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں۔ جنہیں سوچنے کی فرصت نہیں ہے۔"

"خوش قسمت لوگ ہوں گے وہ۔" نیّا بولی۔

"...بھی ان لوگوں میں شامل ہو سکتی ہیں۔"

"...اپنے اختیار میں ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"...را خیال ہے کہ آدمی چاہے تو اس کی ہر عادت اس کی قوتِ ارادی کے تابع ہو

"...خیال ہے یہ ملکہ صرف ڈاکٹروں کو حاصل ہوگا کہ وہ اپنی ہر عادت کو کنٹرول کر سکیں۔"

...صاحب مسکرائے۔

"...اچھی عادت ہے۔ مگر یہی عادت جب شدت پکڑ جاتے تو نقصان دیتی ہے ...ی میں کوئی بھی بات معمول سے زیادہ ہو جاتے۔ یا اس میں توازن نہ رہے۔ تو ...بن جاتی ہے۔"

"...صاحب آپ اس بحث میں نہ پڑیں۔ بہت سی باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ...ناس آدمی یوں بھی ہمیشہ تکلیف میں مبتلا رہتا ہے۔ آپ بس مجھے کوئی ایسی دوا ...جس سے میری ذہنی کوفت دور ہو جایا کرے اور میں سکون سے سو جاؤں۔"

...صاحب ہنسنے لگے۔

"...کی تو بہت سی دوائیاں ہیں۔ مگر ذہنی پریشانی انسان کی اپنی کوشش سے ہی دور ...ہے۔ یوں میں آپ کو دو چار دوائیں لکھ کر دے سکتا ہوں۔ مگر چند دن بعد آپ ...ئی۔"

"...میں کیا کروں ڈاکٹر صاحب۔ میں تو سوچ سوچ کر شل ہو چکی ہوں۔"

"...آپ اتنا کیوں سوچتی ہیں؟ کیا پریشانی ہے آپ کو۔؟"

"...ڈاکٹر صاحب۔۔۔" نیّا جھجک گئی۔ "ہوتی ہیں گھر میں پریشانیاں۔" پھر ...بات بدل کر بولی۔

"...مجھے نیند کی کوئی ہلکی سی دوا دے دیں۔"

"آپ کو معلوم ہے نیند کی گولیوں کی عادت اچھی نہیں ہوتی۔ بڑھتے بڑھتے یہ عادت خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔"

"جی ہاں میں جانتی ہوں۔ اسی لئے تو بازار سے کوئی پیٹنٹ دوا خرید کر خود کو تباہ نہیں کرنا چاہتی۔ کوئی ایسی دوا دیں، جب ذہن گرفت میں نہ آ رہا ہو اور نیند کا کوسوں پتہ نہ ہو تب میں وہ دوا کھا لیا کروں۔ اسے عادت نہ بناؤں۔"

"کیا اکثر آپ کو نیند نہیں آتی۔؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جی۔"

"اس وقت مطالعہ کیا کریں۔"

"مطالعے میں جی نہیں لگتا۔"

"گھر کا کام کر کے اپنے آپ کو تھکایا کریں۔"

"گھر میں نوکر چاکر ہیں۔ مجھے جسمانی کام زیادہ نہیں کرنا پڑتا۔"

"بچوں کے ساتھ کھیل کر تھکا کریں۔"

"میرا بڑا بیٹا ہوسٹل میں رہتا ہے اور بچی ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

"آپ کے شوہر کہاں رہتے ہیں۔؟" اچانک ڈاکٹر صاحب نے پوچھ لیا تو نیا بوکھلا گئی۔

"جی وہ ..... یہیں ..... یہیں کراچی میں ....."

"کیا وہ رات کو جلدی آجاتے ہیں۔"

"جی، نہیں ....." نیا نے آہستہ سے جواب دیا۔ ڈاکٹر اب اصل وجہ تک پہنچ گیا تھا۔

"دیر سے کیوں آتے ہیں۔؟"

"پتہ نہیں جی۔" گو نیا کو ڈاکٹر کا اس طرح ذاتی سوال پوچھنا برا لگ رہا تھا۔ مگر وہ جواب

بھیجا ہو گئی تھی۔ مسئلہ بھی تو اسی کا تھا۔

سے کیا کہتے ہیں۔؟"

تے ہیں باہر رہنے کی کاروباری وجوہ ہیں۔"

لی۔" ڈاکٹر صاحب بہت ہمدردی سے بولے۔ "رات گئے تک باہر رہنے کی

روباری وجوہ نہیں ہوتیں اور نہ رات گئے باہر کوئی کاروباری لین دین ہوتا ہے۔

یں ایسا نہیں ہے۔؟"

جانتی ہوں۔" نیا آہستہ سے بولی۔

آپ ان کو سمجھائیں۔"

کوئی بیوی اپنے شوہر کو سمجھا سکتی ہے۔؟"

کا کوئی بزرگ ہے۔"

نہیں۔" نیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے سر جھکا لیا۔ اگر کوئی بزرگ ہوتا

ا کہاں کسی کی سننے والا تھا۔!

وہ کلب جاتے ہیں۔؟"

ر جانے۔!"

یلاں کے ساتھ جایا کریں۔"

شش کر چکی ہوں نہیں مانتے۔"

کہتے ہیں۔؟"

نے جواب دینے کی بجائے اپنی حیران آنکھیں اٹھا کر ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔

اکٹر کو کیا ضرورت ہے۔ اتنے زیادہ سوالات پوچھنے کی، یا ذاتیات میں الجھنے کی،

پہلی بار احساس ہوا کہ ڈاکٹر خاصا جوان تھا، صحت مند تھا۔ اس کی آنکھوں میں

رہی تھی۔ وہ اسے دبیز شیشوں کے کیبن میں بیٹھا ہوا کچھ اور نظر آ رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے شاید نیا کے چہرے پر ناگواری کے کچھ اثرات دیکھ لیے تھے۔ وہ فوراً بولا۔

"آپ حیران ہوں گی یہ سن کر کہ میرے پاس اکثر بڑے بڑے آدمیوں کی بیویاں آتی ہیں۔ سب آپ کی طرح ذہنی مریض بن چکی ہیں۔ ان کو بھی اپنے شوہروں کی بے حسی کا گلا ہے۔ گھر میں بے حساب دولت ہے، کھانے پینے کو ہے۔ عیش و آرام ہے مگر ان کا دل خوش نہیں۔ جل جل اور کڑھ کڑھ کر وہ بیمار ہو گئی ہیں۔ کسی کو "ہارٹ برننگ" ہوتی ہے کسی کو اعصابی تشنج کی تکلیف ہے۔ کوئی ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا۔ کسی کو ذیابیطس کا عارضہ لگ چکا ہے۔ اب وہ اپنی امنگوں کے ساتھ اپنی صحت اور جوانی بھی تباہ کر چکی ہیں۔ انسان بیمار پڑ جائے۔ تو دنیا اس کے لئے بیکار ہو جاتی ہے۔ ایک بے حس انسان کے لئے آپ اپنی زندگی کیوں تباہ کر رہی ہیں؟"

"کیوں۔۔۔؟"

نیا پھر سولی پر اٹک گئی۔

ہر شخص اس سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ کیا وہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عینک لگا کے نسخہ لکھ کر نیا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"ویسے میں نے ذہنی سکون کی دوائیں لکھ دی ہیں۔ ان میں ایک گولی نیند کی ہے صرف اس وقت استعمال کریں۔ جب بالکل نیند نہ آ رہی ہو۔ ویسے کوشش کریں کہ آپ کو قدرتی طریقے سے نیند آ جائے اور اگلے ہفتے آ کر مجھے اپنی کیفیت بتائیں۔" نیا کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب بھی کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بڑے غور سے دیکھا اور بولے۔

"بظاہر تو آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔۔۔۔ یعنی۔۔۔ عام عورت سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ گفتگو کرنے کا سلیقہ بھی جانتی ہیں، پھر آپ کے شوہر آپ کی پروا کیوں نہیں کرتے۔۔۔؟"

نیا بے بسی سے مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو۔ "یہ تو مقدر کی بات ہے۔"

"بعض اوقات دل کا درد بیان کر دینے سے دکھ کم ہو جاتا ہے۔ آپ بلا تکلف میرے پاس تشریف لائیں۔ جب دل گھبرائے آ جایا کریں۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کریں۔ بعض اوقات دوا وہ کام نہیں کرتی جو ایک دوستانہ مشورہ کر دیتا ہے۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔" نیا نے انکساری سے کہا۔ "میں تو ایک نکمی عورت ہوں میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ مگر آپ کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ میں چاہتی کہ میری وجہ سے مریض انتظار کی تکلیف برداشت کریں۔"

"دوسرے مریضوں کا کیا ہے وہ اپنے مطلب کی خاطر انتظار کریں گے۔ میرا وقت بالکل نہیں ہو گا۔ آپ دوبارہ ضرور تشریف لائیں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ آپ کا انتظار کروں گا۔" ڈاکٹر کی نگاہوں میں شوق اتر آیا تھا۔ نیا کو ایسے محسوس ہوا یہ آخری جملے زائد تھے۔ ڈاکٹر کا مرتبہ اور پیشہ ایسے جملوں کی اجازت نہ دیتا تھا۔ فیس ادا کی اور گھبرا کر باہر نکل آئی۔ اپنے گھر پہنچ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اب تو کسی سے ہمدردی کے دو بول سننے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔

نیا پھر زندگی کے ساتھ چل پڑی تھی۔ پہلے سے زیادہ سرگرم، اور تیز تر، اس کو یہ تو معلوم تھا کہ زندگی کی دوڑ میں بھاگتے بھاگتے کچھ ایسے موڑ آتے ہیں۔ جب آدمی گر جاتا ہے۔ لیکن گر جانا تھکاوٹ یا شکست کی علامت نہیں۔ کبھی منزل پر جلدی پہنچنے کی لگن میں آدمی ٹھوکر کھا کر گر جاتا ہے اس لئے گرتے ہی فوراً کھڑے ہو جانا چاہیئے اور کپڑوں پر لگی شکست کی گرد کو جھاڑے بغیر زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ دوسرے تیسرے نمبر پر سہی آدمی منزلِ مقصود پر ضرور پہنچ جاتا ہے۔ نیا نے پہلے اپنے آپ کو سنوارنا شروع کیا اور پھر اپنے گھر کو۔ باقاعدہ ایکسرسائز کرنے اور فیشل ٹریٹ منٹ سے اس نے اپنی سندرتا کو بلا لی۔ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی۔ رازی کی ہنس ہنس کر آؤ بھگت کرنے لگی۔ غیر ضروری سوال تو کجا، اس نے تو انتہائی ضروری سوال بھی کرنے چھوڑ دیئے۔ کہاں جا رہے ہو۔ ؟ کب آؤ گے۔ ؟ وہاں کیوں جاتے ہو۔ ؟ وہ کون ہے۔ ؟ اس قسم کے سوالوں سے رازی کو الرجی ہونے لگتی تھی۔ وہ کٹکھنے کتے کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ نیا نے ایک منافقانہ قسم کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا لی اور ڈھٹائی کا لبادہ اپنے جسم پر تان لیا۔ اب جو کچھ رازی کہتا وہ ہنس کر سن لیتی۔ جو کچھ کرتا رہتا اسے قبول کرتی رہتی

بھی لے جاتا بغیر عذر کئے چل دیتی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ زندگی اور آنسوؤں کا
ن کا ساتھ ہے۔ مگر رونے کا انداز تو بدلا جا سکتا ہے۔ یوں ایک ایک انسان
اس جا کر ہمدردی کی بھیک مانگنے سے بہتر ہے کہ اپنے ہی ضمیر کی آہ و بکا سن
بھی اسے پھٹکار دے اور کبھی اسے دلاسہ دے۔ یہ بھی جینے کی ایک ادا ہے
گی کو زہر سمجھ کر گھونٹ گھونٹ پیا جاتے۔ مگر ہونٹوں پر امرت جیسی مٹھاس سجائی
نے کہ دُنیا ناکام اور شکست خوردہ عورت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے! ازدواجی
ں ہاری ہوئی عورت' اس مردار کی مانند ہے۔ جس کے اردگرد بے شمار گدھ اس
ت کے منتظر ہوتے ہیں کہ کب یہ ڈور ٹوٹے اور وہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ اپنے اپنے
ے کا گوشت نوچیں اور چل دیں۔

نہیں۔ نیا نے سوچا ایک ہی خونخوار درندہ میری شہ رگ پہ منہ رکھ کے میرا خون
ں لے۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔ مگر پھر اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جب اس نے اپنی گردن
خونخوار درندے کے آگے بڑھائی تو وہ خون چوسنے کی بجائے مسکرانے لگا۔ پتہ
یہ تبدیلی کس وجہ سے آئی۔ مگر نیا نے محسوس کیا کہ اب رازی رات کو جلدی گھر
نے لگا تھا۔ رات کا کھانا گھر پہ کھانے لگا تھا۔ دوست احباب کی محفلیں گھر میں جمنے
تھیں۔ نیا کو بھی اپنے ساتھ لے جانے لگا تھا۔ ایک بار پھر گھر، گھر نظر آنے لگا تھا۔
ی کبھی اپنے آپ کو دیکھتی، وہ بھی پہلے کی طرح چست و توانا۔ خوب صورت اور
زہ نظر آنے لگی تھی۔ وہی پتلی کمر، وہی چہرے پہ شادابی "کیا واقعی حسن مرد کی بہت
ضروری ہے" اس نے دل میں سوچا۔ ایک دن رازی گھر جلدی لوٹ آیا۔ . . . پہلے
ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ پھر سیپ کو گود میں لے کر خوب پیار کیا۔ اب سیپ
آواز میں باتیں کرنے لگی تھی۔ وہ سارا دن گھر میں گھوم گھوم کر ہر ایک کو ستایا کرتی تھی۔ ان
سب کو آج بھی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ رازی خلافِ معمول موتی سے بھی گپ لگاتا رہا۔

تھوڑی دیر باہر لان میں جا کر اس کے ساتھ کرکٹ بھی کھیلتا رہا پھر تھک ہار کر جب اندر آیا تو نیا سے بولا۔

"میں نہانے جا رہا ہوں۔ تم بھی ذرا تیار ہو جاؤ۔ آج باہر جا کر کھانا کھائیں گے۔"

"لیکن میں نے تو آج رات کے کھانے میں ساری تمہاری پسندیدہ چیزیں تیار کی ہیں۔" نیا بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ وہ سب چیزیں ڈیپ فریز میں رکھ دو۔ کل کام آ جائیں گی۔" نیا کو رازی کی اس بات سے بہت تعجب ہوا۔ پہلے اگر نیا کبھی کہہ دیتی تھی کہ چلو ہوٹل میں کھانا کھا لیں تو رازی سو سو صلواتیں سناتا تھا۔ "تمہاری جیسی ماڈرن عورتوں کو ہوٹلوں کے کھانے بہت لبھاتے ہیں۔ . . . دفتروں میں کام کرنے والی عورتوں کو گھرداری سے دلچسپی نہیں ہوتی اور پھر تمہیں تو ویسے بھی باہر کے کھانوں کی عادت پڑ گئی ہو گی۔" نیا جل کر چپ ہو جاتی تھی۔ مگر اب نیا سرتاپا بدل گئی تھی۔ اس نے نوکر کو آواز دے کر کہا کہ بچوں کو کھانا کھلا کر باقی فریزر میں رکھ دے تو غسل خانے جاتے ہوئے رازی نے مڑ کر کہا۔

"بچوں کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے۔ ان کو گھر کیوں چھوڑے جا رہی ہو۔"

یہ ایسی خوشی تھی جس پر نیا کا دل چاہا وہ رقص کرنے لگے۔ پہلے اگر نیا کبھی کبھار کہتی کہ آج بچوں کو باہر لے چلیں تو وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتا تھا۔ "کیا تم نے مجھے اپنا زر خرید غلام سمجھ رکھا ہے کہ تھکا ہارا گھر آیا ہوں اور اب آپ کے بچوں کو گھمانے لے جاؤں۔" مگر اب واقعات نے کروٹ بدل لی تھی یا نیا کے ستارے ایک بار پھر چمک اٹھے تھے۔

ہوٹل میں انہوں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ بچے خوب خوش ہوتے۔ سیپ لوڈ فنگر ہال میں تتلی کی طرح ادھر ادھر اڑتی پھر رہی تھی۔ موتی کچھ سنجیدہ سا ہو گیا تھا، مگر آج اس کے چہرے پر بھی ایک روشنی سی بکھری ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار نیا کو محسوس ہوا۔ جیسے

رازی ہے۔ اس کا بھی ایک خاندان ہے۔ کھانا کھانے کے دوران نیا یوں محسوس کر رہی تھی۔ جیسے وہ تالاب کے کنارے پر تیرنے والے کنول کا پھول ہے۔

رازی باتوں کے دوران بولا۔

"نیا میرا خیال ہے مجھے یورپ جانا پڑے گا۔"

نیا کا نوالے والا ہاتھ پلیٹ میں ہی رہ گیا مگر اب اسے بات پوچھنے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ سنگی سے بولی۔

"کیا کاروباری سلسلے میں جانا ہے۔؟"

"ہاں۔" وہ جلدی سے بولا۔ وہ کاروبار کے معاملے میں کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر چپ رہی . . . کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل گئی تو پانسہ ہی پلٹ جائے گا۔ بڑے ناز سے اس نے اتنا پوچھا۔

"کب تک جاؤ گے۔؟"

"بہت جلد۔" عجلت میں جواب دے کر رازی نے پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔ "لگتا ہے۔ اسی ہفتے میں۔" وہ گلاس رکھ کر بولا۔

نیا کا دل دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ ہزار اندیشے، وسوسے سر ابھارنے لگی۔ پھر بیوی کا تجسس بیدار ہونے لگا۔ مگر اس نے اپنے اندر کی آوازوں کا جلدی سے گلا گھونٹ دیا اور سکون سے کھانا کھاتی رہی۔ جیسے اس خبر سے اس پر بم نہیں گرا۔ اسے رازی نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ تم بھی میرے ساتھ سفر کرو گی۔ کبھی ہمسفر بن کر، کبھی اجنبی بن کر۔ تب اس کو اس خیال سے ہی جھرجھری آ گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے جھوٹ تو زندگی کا ایندھن ہوتے ہیں مگر بڑا جھوٹ پٹرول کی مانند ہوتا ہے۔ کبھی کوئی سچائی کی آنچ اس کے قریب آ جائے تو ساری زندگی بھک سے اڑ جاتی ہے۔ لیکن اب وہ اسی صورت رازی کے ساتھ سفر کرنا چاہتی تھی، جس صورت میں اس نے کہا تھا۔ خطروں سے کھیلنا

چاہتی تھی۔ ہتھیلی پر جان لے کر پھرنا چاہتی تھی کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا
آہستہ آہستہ وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی بولی۔

"تو پھر میں تیاری کر لوں۔؟"

رازی تھوڑی دیر چپ بیٹھا رہا پھر بولا۔

"اس بار نہیں۔ تمہیں اگلی بار ساتھ لے جاؤں گا۔"

"مگر تم نے تو وعدہ کیا تھا رازی۔" نیا نے کمزور بچے کی مانند زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر لا کر کہا۔ "کہ ہر سفر میں مجھے ساتھ رکھو گے۔"

"اس بار اتنے پیسے نہیں ہیں۔" رازی نے معذرت کے انداز میں بڑی انکساری سے کہا۔ "میں واپس آتے ہوتے وہاں سے تم سب کے ٹکٹ لے آؤں گا اور اگلی بار ہم سب بال بچے اکٹھے چلیں گے۔"

"سچ۔؟" نیا نے حد درجے بے اعتباری سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں نیا!۔ میں تم سے اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ خیال تھا وہاں سے واپس آکر سب کچھ تمہیں بتا دوں گا۔ لیکن خیر۔ اب تم نے خود ہی یہ موضوع چھیڑ دیا ہے۔ تو تمہیں بتا دوں کہ یہاں رہ کر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اسی میں ناکامی ہوتی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اب ہم سب جا کر امریکہ میں رہیں گے۔"

"واقعی۔؟" نیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"ہاں۔ میں کچھ دن یورپ رہ کر امریکہ چلا جاؤں گا۔ وہاں گھر کا بندوبست کروں گا۔ کاروبار کے لئے دفتر تلاش کروں گا۔ اتنی دیر میں تم گھر کی ساری چیزیں بیچ کر سرمایہ بنک میں جمع کرا دینا۔ بچوں کے سرٹیفکیٹ لے لینا۔ موتی اور سیپ کو امریکہ کے کسی اچھے سکول میں داخل کرا دیں گے۔ میں اور تم۔ مل جل کر کام کریں گے۔ ٹھیک ہے نا؟" اس نے اپنے پہلے جیسے انداز میں نیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھا۔

ٹھیک ہے۔" نیا بوجھل آواز میں یوں بولی۔ جیسے خواب میں بول رہی ہو۔ کیا اس تدبیروں بھی بدل سکتی ہے۔ ہاں یہی ایک آخری راہ تھی ان دونوں کے خوش رہنے ہوگی یہ راہ بھی رازی نے ہی ڈھونڈی۔

"لیکن رازی گھر کا کیا کریں گے۔؟"

"گھر کے لئے اخبار میں اشتہار دے دینا۔ گھر بیچنا ٹھیک نہیں۔ اسے کرائے پر دے دیں گے اور جس کسی کو بھی گھر دوان سے ایک سال کا ایڈوانس لے لینا۔"

نیا کے اندر باجے سے بجنے لگے اس کا دل چاہا کہ اگلے پل وہ جہاز میں سوار ہو جائے۔ ساری تلخیاں۔ ساری رنجشیں بھول کر، پھر نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کرے۔

پھر رازی اسے گھر اور بچوں کے متعلق اور بہت سی باتیں سمجھاتا رہا، اس طرح باتیں کرتا رہا جیسے محبت کرنے والے شوہر باہر جانے سے پہلے کرتے ہیں۔ اور نیا کو محسوس ہوا، جیسے رازی اس کی زندگی کا آخری نشان ہے۔

یہی اس کا آسرا ہے۔ یہی سہارا ہے۔

یہی اس کا سنجات دہندہ ہے۔

نیاّ جب رازی کو جہاز پہ سوار کرا کے گھر آئی تو جیسے ٹوٹ ٹوٹ کر اداسیاں اس کے دامن میں آگریں... سناٹوں نے اس کا استقبال کیا اور بے کلی اس کا سایا بن گئی۔ بچّوں کو اپنے کمرے میں بٹھا کر وہ اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ شادی کے بعد رازی پہلی مرتبہ اس سے جُدا ہوا تھا۔ مگر ظالم جدا بھی کیسے ہوا تھا۔ اگر وہ ظلم کرنے کے انداز جانتا تھا تو محبّت کی ادائیں بھی اس پہ ختم تھیں۔ یوں تو وہ پچھلے ایک ہفتے سے ان کے ساتھ یوں گھوم پھر رہا تھا۔ جیسے دنیا میں اس کے لئے دلچسپی کا کوئی اور سامان نہ رہا ہو۔ تحفے، کپڑے، پیسے ہر شے اس کے قدموں تلے بچھا دی تھی۔ جگہ جگہ لئے گھومتا پھرتا تھا۔ بچّوں کو لپٹا لپٹا کر پیار کر رہا تھا۔ مگر کل رات تو اس نے انتہا کر دی تھی۔ محبّت کی دنیا میں جگمگاتے دالے سارے چاند ستارے توڑ کر زمین پہ لے آیا تھا۔ عرصۂ دراز کے بعد اس نے پھر نیاّ کو شبِ عروسی جیسی ایک رات بخش دی تھی۔ وہی ادائیں تھیں، وہی غمزے، وہی عشق کی سرمستیاں تھیں اور وہی پیار کی لن ترانیاں۔ تھوڑی دیر بعد نیاّ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچتی کہ کبھی کوئی تلخی ان کی زندگی میں ہوئی تھی؟ رازی تو اتنا اچھا انسان مبیٹھا۔ اتنا خوشبو دار تھا کہ جیسے کبھی اس نے زہر نہ اگلا ہو۔ نگاہوں میں وہی والہانہ پن تھا

کچ ادائی نہ کی ہو۔ کیا ایسا شوہر بھی ہرجائی ہو سکتا ہے؟ تھوڑی دیر کے لئے اس سوچ میں پڑ گئی تھی کہ کہیں اس کی نظر کا زاویہ تو نہیں بدل گیا تھا۔ یقین محبت دیتا ہے۔ اور بے یقینی اس میں اضافہ کرتی ہے۔ نیاّ یقین اور بے یقینی کی کے درمیان بھٹک رہی تھی۔ پھر وعدے وعید ہوتے۔ قسمیں اور رسمیں دہرائی پرانی داستانوں کو چھیڑا گیا۔ نیاّ نے اس کے پرانے جور و ستم یاد کر کے آنسو بھی بہائے اس کے آنسو پونچھ کر اسے طعنے بھی دیتا رہا کہ عورت بودی ہوتی ہے۔ کمزور ہوتی ین نہیں رکھتی اور خود کو بے سکون کر لیتی ہے۔ بھلا میں بدل سکتا ہوں۔ میں نے ہیں نہیں بدل سکتا۔ میری محبت کے انداز ضرور بدلتے رہیں گے۔

رازی کہیں امریکہ لے جا کر مجھے خراب نہ کرنا۔"

عشق میں خراب ہونا ہی کامیابی کی انتہا ہے۔"

اچھا اب مجھے ان فلسفوں میں نہ الجھاؤ۔ میں تمہیں سمجھ گئی ہوں۔"

پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔"

اور اب میں وہی کروں گی جو تم کہو گے۔"

یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔"

مگر مجھے اپنے سے دُور نہ رکھنا۔"

تمہیں قریب رکھنے کے لئے ہی تو جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ہم دونوں یہاں نہیں رہ سکتے۔"

تمہیں پتہ ہے کیا وقت ہوا ہے۔؟" نیاّ نے پوچھا۔

وصل کے لمحوں میں وقت نہیں پوچھا کرتے۔" رازی نے ہنس کر کہا۔

کیا تمہیں آج پھر عشق و عاشقی کا دورہ پڑا ہے؟" نیاّ نے پوچھا۔

اچھا اب زیادہ کرکرا نہ کرو۔" رازی نے سگریٹ سُلگا لیا۔

"یہ سگریٹ پی کر میں سو جاؤں گا۔ صبح شور مچا کے مجھے جگانا نہیں۔ میں دیر تک سوؤں گا۔ کیونکہ کل رات مجھے لمبا سفر کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" نیّا نے کہا تھا اور اب رات کے ساڑھے گیارہ بجے نیّا اسے سوار کرا کے آئی تھی۔ اس کا جہاز جا چکا تھا۔ ائرپورٹ پر بہت رش تھا۔ مگر رازی آخری وقت تک نیّا اور بچوں کے پاس کھڑا رہا۔ ادھر ادھر بھی نہیں دیکھا۔ جاتے وقت دونوں بچوں کو پیار کیا اور نیّا کو اپنے ساتھ لپٹا کر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہہ کر اندر چلا گیا۔ اگر اپنی اسی رعونت اور تُند خوئی کی برچھی مار کر جاتا تو نیّا کو بھی دُکھ نہ ہوتا۔ فرقتوں میں جدائی سکون کا باعث ہوتی ہے۔ اور وہ جو دن رات دل جلاتے ہیں۔ دور ہو جائیں تو ذرا سکھ کی سانس آتی ہے۔ مگر محبت کے رموز بنا کے آدمی دُور ہو جاتے۔ تو خلش کئی دن تک تڑپاتی ہے۔ اسی گھر میں نیّا نے بڑی کرب انگیز تنہا راتیں بسر کی تھیں۔ مگر آج کی رات، بڑی اداس، بڑی خالی خالی لگ رہی تھی۔ جیسے کوئی جام پی کے اوندھا دے۔ پتہ نہیں اب آگے کیا ہو گا۔ ؟ نیّا سوچوں کے لق و دق صحرا میں کھڑی کوئی سمت ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کے آسمان پر امید کا کوئی تارا تاک رہی تھی۔

تنہائی کے دیو سے لڑتے ہوتے ابھی صرف دو دن ہی گزرے تھے۔ آج کی رات نیّا نے ٹھنڈے بستر پہ بیٹھ کر نیّا نے اپنی تمام ترجیحوں کی لسٹ بنائی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو مصروف کرنے کے لئے کام شروع کرنا چاہا۔ رازی کہہ گیا تھا کہ وہ تقریباً ایک مہینے بعد آ جائے گا۔ اس ایک مہینے میں اسے گھر کا سارا سامان فروخت کرنا تھا، مکان کرائے پر دے دینا تھا۔ بینکوں کے چکر لگانے تھے اور بھی کئی کام تھے۔

تیسری صبح۔ جب چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائے وہ کرسی پر بیٹھی گرم گرم گھونٹ بھر رہی تھی اور صبح کا تازہ اخبار دیکھ رہی تھی کہ ایک خبر پڑھتے ہوتے اس کی پیالی چھلک گئی اور گرم گرم چائے اس کے زانو پر گر گئی۔ آج کے اخبار میں ایک بڑی عجیب و غریب

پہلے تو اسے یقین نہیں آیا۔ خبر پڑھی۔ دوبارہ پڑھی۔ سہ بارہ پڑھی۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پہ کپکی طاری ہوئی جیسے ہاتھ پر چھالا پڑ گیا ہو۔۔۔ اِدھر اُدھر پاگلوں کی طرح چکر کاٹنے لگی۔ کوئی فون نمبر یاد تھا۔ اور نہ کوئی تشنا سا چہرہ ایسا دکھائی دیتا تھا۔ جسے بلا کر اس خبر کی تصدیق کبھی جی چاہتا کہ اخبار کے دفتر فون کر دے مگر نہیں۔ اس طرح تو اخبار والے اس کی ہائیں گے۔ اِدھر اُدھر گھوم کر آتی اور دوبارہ آ کر خبر پڑھنے بیٹھ جاتی دل کو کسی صورت قرار فا۔

اُسے یقین نہیں آتا تھا مگر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ وہ وسوسے جنہیں خوں کی لوریاں دے دے کر اس نے سُلا دیا تھا۔ مجسم ہو کر سامنے آ گئے تھے کیا کرے؟ ہائے۔ ؟؟ پوری دنیا میں کوئی اور نظر نہیں آتا تھا۔

سارا دن بھی اسی بے چینی، کرب اور اضطراب میں گزر گیا۔ کسی نے فون نہیں کیا۔ کوئی پتہ نہیں آیا۔ سارے دوست احباب جیسے شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس کے معصوم ان بات سے بے خبر کہ آج گھر میں کھانا نہیں پکا، بسکٹ اور سلائس کھاتے ادھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔

"زمانہ نگاہیں بدل چکا۔" نیّا نے ذرا دل کو سنبھال کر سوچا۔ تو قیامت کی وہ گھڑی آن پہنچی اندازہ گناہوں کی سزا سے ملنے والی ہے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر۔۔۔ نیّا نے رازی کی الماری کھول دی۔ یہ اس کے بیڈ روم کی ایک الماری تھی۔ جسے رازی ہمیشہ مقفل کبھی وہ استفسار کرتی تو کہہ دیتا کہ اس میں اس کے ضروری کاغذات اور کیمرے وغیرہ ہیں اس لئے رکھتا ہوں بچے اس تک نہ پہنچ جائیں۔ نیّا نے بڑی جد و جہد کے بعد وہ کھول لی تھی۔ اندر بے شمار خالی اور بھری ہوئی تولیں تھیں، تمباکو کے ڈبے تھے، کاغذات کی گڈیاں تھیں۔ پرانی فلمیں۔ اور بھی بہت سا الم غلم پڑا تھا۔ نیّا نے سب چیزیں اُلٹ پلٹ کر دیکھیں۔ کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ کچھ پلّے نہیں پڑا۔

یونہی اضطراری کیفیت میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہی تھی کہ سائڈ ٹیبل کی دراز کھل گئی۔ اس میں سے رازی کی خوشبو نکلی۔ چونک کر دیکھا تو وہاں رازی کے سگریٹ اور ماچسیں پڑی تھیں۔ نیّا نے ماچس کی ڈبیا اٹھالی۔۔۔ اور بے اختیار تیلیاں جلانا شروع کر دیں۔ ایک کے بعد دوسری۔ وہ اتنی دیر تک تیلی کو جلنے دیتی جب تک اس کی انگلی کی پوریں نہ جلنے لگتیں۔ کبھی کبھی تن من جلا کر کتنا مزا آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ انسان بیٹھے بیٹھے اپنے آپ کو پھونک دے۔ ڈبیا کھول کر اس نے ساری سگریٹیں توڑ دیں اور ان کو مسلنے لگی۔ کڑوے تمباکو کی خوشبو سارے بستر پر پھیل گئی۔ ذرا سا تمباکو اٹھا کر اس نے زبان پر رکھ لیا۔ بدمزا تھا۔ کڑوا تھا۔ مگر مردوں کو ایسی سب چیزیں لبھاتی ہیں۔ خود فراموشی کی منزل پر پہنچنے کے لئے اس کڑواہٹ اور بدمزگی کو جھیلنا ضروری تھا۔ اسے بھی آج خود فراموشی کی ضرورت تھی۔ اس نے سگریٹ مسلنے کا کام بند کر دیا۔ بچے ہوئے سگریٹوں میں سے ایک سگریٹ آرام سے اٹھا کر ہونٹوں میں داب لیا اور پھر اسے دیا سلائی دکھا دی۔ پہلا کش لیا۔۔۔ تو کڑوا دھواں حلق کے راستے نتھنوں میں گھس گیا۔ کان بند ہوتے محسوس ہوئے۔ آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اچھو ہو گیا۔ سانس دھائی دینے لگی دو تین بار کش لینے کا عمل دہرایا تو دھوئیں کو خود بخود صحیح راہ مل گئی۔ دھواں صحیح طور پر نکالنے کے تجربے میں پورا ایک سگریٹ ختم ہو گیا۔ اس نے دوسرا سلگا لیا۔ پھر تیسرا۔ دھوئیں کی راہیں ہموار ہوتیں۔ تو ذہن خود بخود آسودہ ہونے لگا۔ سوچوں کے بادل چھٹے تو وہ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گئی۔ وہ کش پہ کش لگاتی رہی اور چھت پر ٹکٹکی جمائے سوچتی چلی گئی۔ پچھلی زندگی کی ساری فلم دھوئیں کے مرغولوں کے ساتھ نظر آنے لگی تھی۔ بہت سے چہرے دیکھے تھے اس زندگی میں۔ لاتعداد شکلیں اسے یاد تھیں۔ ان گنت انسان اس کے ارد گرد رہے تھے مگر اس اندھیارے میں آج کوئی چہرہ نہیں پہچانا جاتا تھا اور تب بالکل اچانک ان چہروں کے ہجوم میں ایک جگنو چمکا۔ یہ جگنو فاروق تھا جو سب سے الگ اور سب سے جدا پہچانا جا رہا تھا۔ فاروق رازی کا

ایک رشتہ دار بھی تھا اور دوست بھی تھا۔ امریکہ سے نیّا اور رازی سیدھے راولپنڈی تھے ایئرپورٹ پر انہیں فاروق لینے کے لئے آیا تھا وہ لوگ جب کسٹم کے بکھیڑوں سے باہر نکلے تھے، تو باہر فاروق ان کا منتظر تھا۔ وہ دوڑ کر آیا۔ رازی سے بغلگیر ہوا اور پھر کمر میں ٹھوکا مار کے پوچھا۔

"یہ کون ہے یار۔۔۔؟"

"بھئی تمہاری بھابی ہے۔"

"سچ مچ۔۔۔؟"

"ہاں ہاں۔۔۔!"

"تم مسلمان ہو گئے۔۔۔؟"

"اس خاتون کو دیکھ کر کون کافر اس پر ایمان نہیں لائے گا۔"

نیّا مسکرا کر اپنا سامان سنبھالنے لگی تھی۔ تو ذرا ان سے دُور ہو گئی۔ مگر اس کے کان ان کی گفتگو کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔ نیّا نے سُنا فاروق کہہ رہا تھا۔

"ویسے کسی اچھے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ چھچل فریب نہ کرنا۔"

"ارے میرے مجنوں۔" رازی ہنسا۔

"ذرا دیکھو یار اب تو ڈٹ کے کوئی اچھا سا کام شروع کر دے۔ اس آنکھ مچولی سے کب تک تو انسان نہیں بنے گا۔ میں تجھ سے نہیں ملوں گا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تو مجھے نہیں مل سکتا۔ تیری نوکری کی مجبوریاں ہیں۔"

"چلا میرے ساتھ وعدہ کر اس عورت کو ٹھیک ٹھاک رکھے گا۔"

"تو ہمیشہ ناصح رہے گا یا کبھی دوست بھی بنے گا۔"

"تیری دوستی تیرے کسی کام کی نہیں۔ اس لئے مجھے ناصح ہی رہنے دے۔"

"اچھا۔ پھر تو مجنوں کی کس منزل پر ہے۔۔۔؟"

"یار میری منزلوں کو تو یہاں سمجھ سکے گا۔ تو ہر پڑاؤ پر ایک نیا ساتھی بدل لیتا ہے۔"

"رازی زور سے ہنسا۔ "دیکھ یار میری پوزیشن خراب نہ کر۔" شام کی فلائٹ سے وہ لوگ کراچی آ رہے تھے اس لئے شام تک فاروق کے فلیٹ میں رہے تھے۔ فاروق نے انہیں ایک ہوٹل میں کھانا کھلایا تھا۔ بہت اچھی اچھی باتیں کی تھیں۔ نیا اپنی زندگی میں بے شمار آدمیوں سے مل چکی تھی۔ مگر فاروق کو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ شریف النفس انسان کیسے ہوتے ہیں۔ یہ پہلا آدمی تھا۔ جس نے نیا کو صرف اس نظر سے دیکھا جس میں ماں اور بہن کا احترام ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے فاروق ایک خوبصورت خیال کی طرح اس کے ذہن میں رہ گیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ رخصت کے وقت فاروق نے اپنا فون نمبر نیا کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا تھا۔ "بھابی مجھے صرف اس وقت فون کریں۔ جب اس خبیث سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچے۔"

اس ایک فقرے نے جیسے فاروق کا سارا کردار کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ دل میں ڈھیروں احترام لئے نیا اس سے رخصت ہو گئی تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ قدم قدم پر اسے رازی کی طرف سے تکلیفیں پہنچی تھیں۔ مگر اسے کبھی فاروق کا خیال نہیں آیا تھا مگر آج حالات کے گھپ اندھیارے میں اچانک اسے فاروق کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اپنی پرانی ڈائری ڈھونڈی اور اس میں سے فاروق کا نمبر تلاش کیا۔ ڈائل گھمایا۔ خدا کی قدرت فاروق گھر پر ہی مل گیا۔ نیا نے اپنی ریزہ ریزہ آواز میں صرف اتنا کہا۔

"فاروق بھائی مجھے اس وقت آپ کی اشد ضرورت ہے۔ کیا آپ کسی طرح کل کی پی فلائٹ سے آ سکتے ہیں۔؟"

"اگر یہ آپ کا حکم ہے تو ضرور آ سکتا ہوں۔"

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

ارسلان احمد، شیخ سلطان احمد کا اکلوتا بیٹا تھا۔ امیر باپ نے زندگی کی ہر آسائش مہیا کی تھی۔ مگر رزقِ حلال کمانے کا کوئی طریقہ نہیں سکھایا تھا۔ ارسلان احمد نے ناز و نعم کے پالنے میں آنکھ کھولی اور سونے کے چمچے میں پہلا گھونٹ پیا مگر اس پالنے سے لے کر دولت کے حصول کا طریقہ کار کیا تھا۔ اس گھر کی ماں بھی یہ نہیں جانتی تھی۔ دراصل ارسلان کی پرورش اور پرورش میں ایک پیسہ بھی حلال کا نہیں لگا تھا۔ یوں دنیوی لحاظ سے اس کے باپ نے اسے یونیورسٹی تک اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور دنیا کے نشیب و فراز کے بارے میں ہر بات سمجھائی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا دین و ایمان صرف پیسہ تھا۔ پیسے کے پیچھے سے اُدھر کرنا اس کے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور یہی کھیل وہ ارسلان کو سکھاتا رہا تھا۔ سرکاری ملازم رہا، رشوت کی دیوی، لکشمی بن کر اس کے گھر میں چھم چھم کرتی پھرتی تھی۔ اس نے آسائش خانہ بنا رکھا تھا۔ ملنے جلنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ذہین تھا مگر اپنی ذہانت وہ منفی کاموں میں صرف کرتا تھا۔ رشوت لینے کے سینکڑوں گر وضع کئے تھے۔ دو بار سرکاری ملازمت سے نکالا گیا پھر اس نے پرائیویٹ فرموں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ وہاں گھپلوں کا جلدی پتہ لگ جاتا ہے۔ اس لئے سلطان احمد نے

اپنے عہدے دار دوستوں کی وساطت سے دواؤں کا لائسنس حاصل کیا اور ایک کمپنی
مگر یہاں قسمت نے یاوری نہ کی وہ جلدی ہی جعلی دوائیں فروخت کرنے کے الزام میں گرفتار ہ
کہتے ہیں۔ سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا! متقی لوگ اسی ایک دن سے ڈرتے ہیں۔ ر
سلطان احمد کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ روزِ حساب وہی ہے۔ جب تمہا
جیب میں روپوں کی جھنکار نہ ہو۔ قیامت کے لمحات وہ ہیں۔ جب تمہارے پاس آسو
نہ ہوں اور منکر نکیر خود اپنا پیٹ ہے۔ توبہ کو وہ منافقت کہتا تھا۔ اس لئے خدا نے ا
توبہ کی مہلت بھی نہیں دی۔ وہیں جیل کی کوٹھڑی میں ہارٹ اٹیک ہوا اور فرش کے برابر
پوٹ ہو کر سلاخوں کے پیچھے ہی پیچھے وہ اپنا حساب بے باق کرنے خالقِ حقیقی کے
جا پہنچا۔ ! جہاں اس نے وراثت میں بہت کچھ چھوڑا تھا۔ وہاں دولت کمانے کے کالے
گُر اور پیسے کی ہوس بھی ارسلان احمد کو دے گیا۔ بیٹے نے باپ سے اگر کچھ سیکھا تھا تو وہ
یہی روپے سے آنکھ مچولی کھیلنے کا کاروبار تھا۔ باپ کی وفات کے بعد کچھ عرصے کے
ارسلان احمد درویش ہو گیا تھا، لیکن محنت کے بنا روپیہ کمانے کا جو گُر اُس نے اپنے باپ
سے سیکھا تھا۔ اس سے آگے نہیں جا سکا۔ اس نے اپنے باپ کی زندگی سے درسِ عبر
نہیں سیکھا تھا۔ بلکہ وہ خود کو دنیا کے سامنے اپنے باپ سے زیادہ ہوشیار اور عیار ثابت
کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ باپ کے مقابلے میں زیادہ خوبرو، جوان اور تعلیم یافتہ تھا۔ نئے تجربے
کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔ اس کے آگے دُنیا وسیع میدان کی طرح پھیلی ہوئی تھی وہ ا
سیاہ راہوں پر اتنی دُور تک چلا گیا۔ کہ اپنا آپ بھول گیا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح
کاروبار کرنے لگا۔ ہر کاروبار کے ساتھ وہ اپنا نام بھی بدل لیتا تھا۔

پہلے ارسلان احمد شیخ تھا۔

پھر اے۔ اے شیرازی ہوا۔ اس کے ایک پاسپورٹ پر اے احمد فراری لکھا ہوا
تھا۔ اس بار جب وہ امریکہ سے واپس آیا تھا تو اس کی جیب میں اے۔ اے رازی کا پاسپ

کے علاوہ بھی اس کے پاس مختلف ناموں کے پاسپورٹ تھے۔ قدرت نے
ہت اور ذہانت بڑی فیاضی سے دی تھی۔ اور دونوں کا وہ غلط استعمال کر رہا تھا
وں کے طبقے میں وہ بہت زیادہ ہر دلعزیز تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسے ہر
وں کو شیشے میں اتارنے کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ اڑتی چڑیا کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر
طلب براری کے بعد انہیں رہا کر دیتا تھا۔ زیادہ تر وہ ان عورتوں کو قریب آنے
دیتا تھا۔ جو اس کے کام آسکتی ہوں۔ حصولِ زر کا ذریعہ عموماً عورت ہی کو بناتا تھا اور
انہی عورتوں پر لٹا دیتا تھا۔ ایک بار ارسلان احمد پر بہت مشکل وقت آن پڑا تھا۔
اس نے خانم کے ہاں ملازمت کر لی تھی۔ خانم نے اسے سہارا دیا تھا۔ گو وہ خانم
ڈھلتی عمر کی عورت تھی۔ مگر خانم محبت اور کاروبار میں فرق خوب جانتی تھی۔ جب ارسلان احمد
ں کے لئے خطرہ بننے لگا تو اس نے اسے بڑی خوبصورتی سے الگ کر دیا۔ وہ ملک
ہر رہا اور وہاں بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ بہت دنوں بعد ایک دن وہ خانم
ں آنکلا تو وہاں اسے نیا نظر آگئی۔ زندگی کی تمام تر ٹھوکروں کے باوجود نیا کے
ہرا ایسا نور تھا۔ جو معصومیت اور طہارت کا مظہر ہوتا ہے۔ اُسے نیا ان تمام لڑکیوں
ادہ حسین لگی جو اب تک اس کی زندگی میں آئی تھیں۔ اُسے دیکھ کر اس کا عشق باز
اٹھا اور پھر ایسی حسین لڑکی سے بہت سے مفاد حاصل کرنے کی امید بھی تھی۔ اس
نیا کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ گو خانم نے اسے بتا
ا جیسی لڑکیاں زمانے کو چیلنج کر کے گھروں سے باہر نکل آتی ہیں اور بظاہر
ان دکھائی دیتی ہیں۔ مگر ان کا فرسودہ ماحول اور دیرینہ روایات ان کے اندر
نہیں نکلتیں۔ لیکن رازی عورت کی معصومیت کو جُل دینا خوب جانتا تھا۔ اسے
ہوٹل کی ضرورت تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا۔ کہ زندگی کے آسمان سے جو شریف لڑکیاں
ں کی طرح ٹوٹ کر خاک پر گر جاتی ہیں۔ انہیں ہمیشہ سہاروں کی تلاش رہتی ہے اور

آخری سمجھوتہ وہ شادی کے نام پر کرتی ہیں۔ اس لئے ارسلان احمد رازی نے ایک عاشق صادق کا روپ دھارا۔ اپنی وجاہت کو وسیلہ بنایا اور زبان و صورت کی تمام تر خوبیوں لے کر نیا کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ نیا نے بہت آدمی دیکھے تھے وہ اس وقت کٹی ہوئی پتنگ تھی اور کٹی ہوتی پتنگ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اتنی زیادہ منتظر نگاہوں اور پھیلے ہوئے ہاتھوں میں سے کس کی ہتھیلیوں پر گرنا ہے۔ وہ ڈولتے ڈولتے تھک گئی تھی ڈر رہی تھی۔ کہیں چوراہے کے گندے نالے میں نہ گر جائے۔ اس لئے ارسلان کے پھیلے ہوئے معطر معطر مضبوط ہاتھوں میں آ گری۔ شادی کے لئے آمادہ کر لینا تو ارسلان احمد رازی کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مگر نیا تو جیسے اس پیش کش کی منتظر ہی تھی۔ جتنی جلدی ارسلان احمد رازی لڑکی کو اپنے جال میں پھنسا لیتا تھا۔ اتنی ہی جلدی آزاد بھی کر دیتا تھا۔ زیادہ دن تک وہ کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ مطلب نکالا۔ اور چھٹی دے دیتا۔ نیا سے پہلے وہ اسی طرح چار لڑکیوں سے شادیاں کر کے انہیں چھوڑ چکا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ لڑکی اس کے ڈھب کی نہ ہوتی۔ تو وہ اسے جلد آزاد کر دیتا تھا۔ نیا بھی انہی لڑکیوں میں سے تھی۔ گو معصوم تھی۔ فریب کو نہیں پہچانتی تھی۔ مگر اپنے عقائد میں لوہا تھی۔ اور اخلاقیات میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ ارسلان احمد رازی نے ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ لی۔ وہ اس کے ٹائپ کی نہ بن سکی۔ تو اس نے اسے اذیتیں دینی شروع کر دیں تاکہ وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ مگر نیا کہاں جاتی۔ تب رازی کو اپنے کاروبار کے لئے نگینہ کا بندوبست کرنا پڑا۔ نگینہ کراچی کی بہت مشہور و معروف سوسائٹی گرل تھی۔ دیکھنے میں اتنی حسین نہیں تھی۔ مگر بہت طرار تھی۔ وہ رازی کے اشارے کنایے خوب سمجھتی تھی۔ پچھلے چھ سے وہ ارسلان احمد رازی کے دفتر میں اس کی سیکرٹری بنی بیٹھی تھی۔ جس بات کا نیا کو علم نہیں تھا۔ وہ کل کے اخبار نے بتائی تھی۔

کل کا اخبار اس کے آگے کھلا پڑا تھا۔ اور جلی حروف میں ایک خبر اس کا منہ چڑا

رازی نام کے ایک آدمی اور اس کی بیوی نگینہ رازی کو چرس اسمگل کرنے کے جرم
ت میں لے لیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ارسلان احمد رازی یا اے اے رازی ایک
رم تھا اور زیادہ تر اپنے بیوی کے سیاہ کوٹ کے ذریعے اسمگلنگ کرتا تھا۔ کسی
ی نشاندہی پر کوٹ ادھیڑ کر دیکھا گیا تو اس میں چرس برآمد ہوئی۔ دونوں میاں بیوی کے
ضبط کر لئے گئے ہیں اور مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔"

نیا کے آنسو تھمتے نہ تھے۔

رونے کا وقت نہیں ہے بھائی۔ فاروق نے بڑی شائستگی سے کہا۔ "اب
جلدی سے فیصلہ کرنا ہو گا۔ آپ جانتی ہیں کہ پوچھ گچھ والی پارٹی یہاں بھی آتے گی
برے سوا کوئی نہیں جانتا کہ آپ ان معاملوں سے بالکل لاتعلق اور لاعلم ہیں۔ اور
نام اخبارات وغیرہ کی زینت نہیں بننا چاہیئے۔ ان لوگوں کے آنے سے پہلے
پ اپنا دامن بچا لیں۔ میں آپ کی ہر قسم کی امداد کروں گا۔"

نیا تو سدا بھنور میں رہی —

نیا تو سدا ہچکولے کھاتی رہی —

نیا تو ڈوب کیوں نہیں جاتی —

نیا نے ہچکیاں لیتے لیتے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سچائی

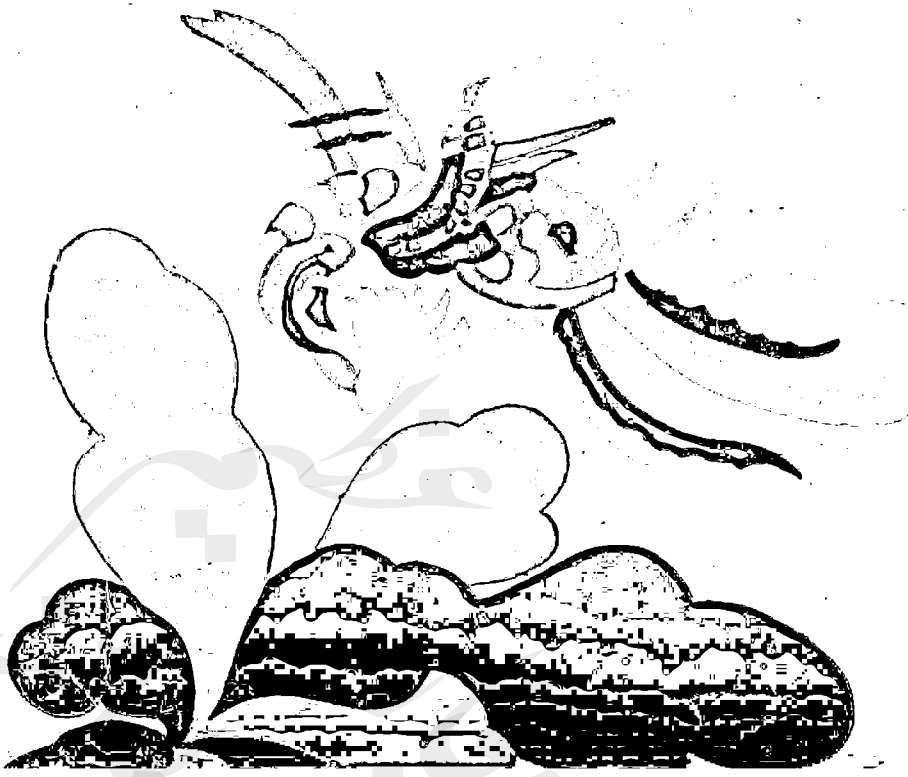

موئے سفید آئے ہیں بعد از شباب دیکھو
دیتی ہے زندگانی منہ پر جواب دیکھو

نیا نے جھک کر آئینہ دیکھا تو بے اختیار اسے ایک پرانا شعر یاد آگیا۔ اس نے
اں میں ہاتھی دانت کے دستے والا سفید کنگھا تھام رکھا تھا اور آئینے کے آگے
ی ہو کر اپنے بال سنوار رہی تھی۔ نہیں۔ بال سنوار نہیں رہی تھی بلکہ اپنے بالوں
ازہ لے رہی تھی۔ اس عمر میں سنوار تا کم اور چھپانا زیادہ ہوتا ہے۔ کنگھے کے دندانوں
بالوں کو جو الٹا پلٹا تو اندر چھپے ہوئے سفید بال مسکرانے لگے، کچھ ادھر کچھ ادھر
ان کی کوئی قطار ایسی نہ تھی جس میں سے کسی سفید بال نے سر نہ اٹھایا ہو۔

"اُوہ! قدرت کا یہ ظلم"

نیا نے ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ جب پہلے پہل اس نے اچانک اپنے سر میں
سفید بال دیکھا تھا تو اسے جھرجھری آگئی تھی۔ عورت کا فلسفہ بھی عجیب ہے
مرد کے ساتھ تعلق باندھ لیتی ہے، جاہل ساس کے ظلم برداشت کر لیتی ہے،
پتی کی بے جا سختیاں سہہ لیتی ہے مگر سر میں سفید بال دیکھ کر ڈر جاتی ہے۔
کے لئے موت سے بڑا خوف ڈھلتی عمر کا خوف ہے۔ کیونکہ عورت کے پاس صرف
ایک چالو سکہ ہوتی ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ یہ سکہ دھندلا ہو کر کھوٹا نظر آئے

سفید بال بڑھاپے کا پہلا سگنل ہیں، تب وہ خوف زدہ ہو جاتی ہے کہ اردگرد کی ساری روشنیاں بجھ جائیں گی اور یہ مرد جو فطرتاً تلوّن آشنا ہے۔ پھر سے اڑ جائے گا۔

یہ اس سے بھی عجیب بات ہے کہ عورت کو جوانی اور خوبصورتی کا احساس بھی مرد ہی دلاتے ہیں اور جب سڑک پر جاتی ہوئی کسی عورت کو مرد مڑ مڑ کر نہیں دیکھتے تو اسے خود بخود احساس ہو جاتا ہے کہ وہ بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو چکی ہے اور یہی مرحلہ عورت کی زندگی کا کٹھن ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ جسے قبول کرنا اور بھی مشکل ہوتا ہے سب سے پہلے چہرہ ہی دغا دیتا ہے اور اس کا سب سے زیادہ نقصان حسین عورت کو ہوتا ہے۔ ہر کس و ناکس کی نگاہیں اور زبان اس بات کا سرِ عام اعلان کرتے ہیں۔

"ہائے تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو تو اتنی خوب صورت تھی!"

حقیقت میں ملنے جلنے والے بھی اپنے جنم جنم کے بدلے لے لیتے ہیں کہ کبھی حسین تھیں تو کیا، اب تو ڈھل رہی ہو۔

ہاں بیاہتا عورت۔ گھر بار اور بچوں والی۔ جوں جوں جھریوں کے جزیرے میں داخل ہوتی ہے، بھاری بھرکم ہوتی جاتی ہے۔ اولاد اور شوہر پر اس کا حق زیادہ ہوتا جاتا ہے مگر نیّا کے پاس ایسا کوئی آسرا نہیں تھا۔ وہ کل بھی تنہا عورت تھی اور آج بھی تنہا ہے۔

تنہا عورت کا شریکِ سفر اس کی جوانی اور اس کا حسن ہوتا ہے گو اس کے حسن اور جوانی کو ہر کوئی للچائی نظر یا مشکوک نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مگر وہ ہر دم نظروں کے ہالے میں رہتی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے یہ احساس بہت ہے مگر تنہائی کا بڑھاپا قبر سے بھی زیادہ بھیانک لگتا ہے۔

نیّا اس موڑ پر پہنچ کر رنجیدہ ضرور ہوئی تھی مگر بوکھلائی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا اور ضرور آئے گا۔ وہ اس دن کے لئے ذہنی طور تیار تھی۔ اس لئے جونہی سفید بادل ان کالی گھٹاؤں میں نمودار ہوئے۔ اس نے انہیں چھپانے کی تدبیر کر لی۔ وہ زندگی کے اور بہت سے رازوں کی طرح اپنے سفید بال بھی کسی کو نہ دکھانا چاہتی تھی۔

اب تک وہ اپنے بال رنگوا رہی تھی، اپنے آپ کو ٹھیک ٹھاک رکھے ہوتے عمر میں بھی ایسی دکھائی دیتی کہ سڑک پر جاتے ہوتے آدمی کے قدم رک جاتے تھے۔ جب آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بالوں کا اچھی طرح جائزہ لے چکی تو سوس ہوا کہ ہر بار جب وہ بال رنگوانے جاتی ہے تو بال پہلے سے کچھ زیادہ سفید ہیں۔

نیّا نے کنگھا ہاتھ سے رکھ دیا۔ سر پہ اسکارف باندھا اور کار کی چابیاں پکڑ کر نیچے اتر سیدھی "ٹاپ ہیئر فیشن" پر جا کر رکی۔ جب سے وہ راولپنڈی آ گئی تھی، یہیں سے وہ چہرہ درست کروایا کرتی تھی۔ جونہی وہ دکان میں داخل ہوئی، کام کرنے والی لڑکیاں یں۔ سب ہی کھڑی ہو گئیں اور پیشوائی کو بڑھیں۔ نیّا نے مسکرا کر ان کے سلام کا یا پھر بڑے شاندار انداز میں وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور سگریٹ سلگا کر اپنے ں دبا لیا۔

ایک لڑکی دوڑ کر آئی۔ اس نے نیّا کے سر پہ بندھا اسکارف کھول دیا۔ اس کے ں کنگھا کرنے لگی اور پھر دوسری لڑکی سیاہ لوشن ایک پیالی میں گھول کر لے آئی ب جیسا ایک بڑا ایپرن پہنا دیا اور برش سے اس کے بال رنگنے لگی۔

الوں کو اچھی طرح رنگ کے ان کی پگڑی بنا کے سر پہ ہی لپیٹ دیا اور پھر دوڑ کر ناخن کا سامان اٹھا لائی اور نیّا کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ناخن سنوارنے کے بعد اس نے نیّا کے کی ساج کی اور ہاتھوں پر ایک خوشبودار لوشن لگا دیا۔ اس کے بعد اس نے نیّا کے ٹا کر ایک تپائی پر رکھ دیئے اور بڑی مہارت سے پاؤں کے ناخن سنوارنے لگی۔

آئینے کے سامنے بیٹھی اپنا حلیہ دیکھ رہی تھی اور سگریٹ کے کش پہ کش لگا رہی موں اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اور پھر دھوئیں کے بیچوں بیچ اسے ایک ندلیاں طور پر نظر آنے لگی۔

قائم! نیّا زیرِ لب مسکرائی۔ اس وقت وہ بالکل خانم کی طرح لگ رہی تھی یا اس کی طرح

ہوگئی تھی مگر وہ اب بھی خانم سے زیادہ حسین تھی۔ پتہ نہیں خانم کہاں ہوگی کس حال میں ہوگی؟ یوں لگتا ہے کہ ایسی عورتوں کو بڑھتی عمر کبھی شکست نہیں دے سکتی مگر بالآخر قدرت انہیں بھی نکیل ڈال ہی دیتا ہے اس نے کبھی خانم کو اپنا آئیڈیل تو نہیں بنایا تھا مگر پتہ نہیں کس طرح وہ رفتہ رفتہ اسی لائن پر چل پڑی تھی۔

نہیں وہ خانم ہرگز نہیں ہے۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ البتہ اس کا حلیہ ضرور خانم جیسا بن گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے گیسو جو بکھر کر دلوں کو ڈس لیتے تھے اب بالکل ہاتھ بھر کے رہ گئے تھے جنہیں وہ رنگوا کر اسٹائل سے کٹوا دیتی تھی۔ مسلسل اکھاڑنے سے بھوؤں کے نیچے ماس سخت ہوگیا تھا۔ پپوٹوں پر ابھار آگیا تھا۔ چہرہ اگرچہ ٹھیک تھا مگر اس پر کرختگی کی ایک لہر سی تھی۔ آنکھیں جاگتی تھیں مگر فانوس نہ تھیں کہ جس طرح فانوس سارے کمرے کو روشن کر دیتا ہے اسی طرح حسین آنکھیں سارے چہرے پر اجالا بکھیر دیتی ہیں۔ اور پھر اس کے ہاتھ میں سگریٹ بھی تھا۔ وہ بار بار کش لگاتی اور خانم کی مانند راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ دیتی۔ یوں تو خانم بھی بے تحاشا سگریٹ پیا کرتی تھی۔ مگر یہ لت اسے خانم سے نہ لگی تھی، حالات کا تحفہ تھی۔ ایک بار منہ کو لگائی تو چھٹ نہ سکی۔ کبھی کبھی اپنے آپ سے انتقام لینے کو، اپنا جی جلانے کو دل چاہتا ہے۔ دکان کی ساری لڑکیاں اس کا اسی طرح احترام کرتی تھیں جس طرح کبھی وہ خانم کا کیا کرتی تھی۔ دکان میں بیٹھی ہر عورت اس کی شخصیت سے متاثر ہو جاتی۔ لڑکیوں کی نگاہوں میں ذوق شوق دیکھ کر وہ ہنسا کرتی۔

"نادانو! تمہیں کیا معلوم کہ خود مختاری کے اس اسٹیج پر پہنچنے کے لئے عورت کو کیا کچھ گنوانا پڑتا ہے۔ اپنے عورت پن سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ پوری ایک زندگی کا سفر کانٹوں پر طے ہوتا ہے۔ نیا دکان میں بیٹھ کر بہت دلچسپ گفتگو کیا کرتی تھی اور سب لوگ پاگلوں کی طرح اسے تکا کرتے۔ دو گھنٹے وہاں بیٹھ کر وہ نوٹ گل افشانی گفتار کے پھول کھلاتی رہی جب بال سوکھ گئے تو دوسری لڑکی نے اسے "سنک" سے آگے

کے بال دھو دیئے۔

گھنٹے کے بعد جب نیا کلینک سے نکلی تو وہ تازہ دم اور خوب صورت لگ رہی تھی بال بالکل نئے انداز سے سیٹ کروا لیے تھے۔ چہرے پر خوب صورت میک اپ آنکھوں میں کاجل کی دو دھاری تلوار تھی لمبے ناخنوں پر نیل پالش لگی ہوئی تھی موٹر میں بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ کر کے سڑک پر لائی تو اسے یاد آیا کہ آج سوموار ہے گھر کے لئے ہفتے بھر کا سودا لینا ہے۔ اسی لئے وہ مارکیٹ روانہ ہوگئی۔

مارکیٹ پہنچ کر اس نے عام بیگمات کی طرح گوشت، قیمہ، مرغیاں، پھل وغیرہ خریدے پھر سبزی والے کی دکان پر کھڑی ہوگئی۔ ابھی وہ مختلف قسم کی سبزیوں کے بھاؤ پوچھ رہی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ دکان پر یا اس کے اردگرد کھڑا ہوا ہر شخص اسی کو دیکھ رہا ہے۔ وہاں کچھ بیگمات بھی کھڑی تھیں۔ مرد بھی سودا لے رہے تھے۔ مگر نیا کے آنے سے ان کا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ سلیقے سے میک اپ کرنے کے بعد نیا اپنی عمر سے بہت چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔

"دس کلو پیاز تو دو بھائی۔" نیا نے دکان دار سے کہا۔ "اور پچھلی دفعہ جو تم نے لہسن دیا تھا اندر سے سوکھا نکلا تھا۔ اب چن کر دینا۔"

"نہیں بی بی جی!" دوکاندار بولا۔ "آپ سے کبھی گھپلا نہیں ہو سکتا، غلطی سے چلا گیا تو واپس لے آئیں جی۔"

"اچھا دس روپے کے لہسن کے لئے میں پچاس روپے کا پٹرول پھونکتی۔"

"ٹھیک ہے۔" دوکان دار ہنسنے لگا اور پیاز چن چن کر ترازو میں ڈالنے لگا۔

"اچھا اب پیاز دھیان سے تولو۔" نیا نے کہا۔ "اور پیاز اتنے مہنگے کیوں ہیں اس بار؟"

"مہنگے تو نہیں ہیں بیگم صاحبہ۔" وہ پیاز ٹوکری میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "اگر بار تو پیاز ہم نے باہر بھیجے ہی نہیں ہیں۔ پچھلے سال باہر بھجوانے شروع کر دیئے

تھے تو پیاز آٹھ روپے کلو تک فروخت ہوئے تھے۔ اب تو جی صرف تین روپے کلو بک رہے ہیں۔ آپ ہی اندازہ کرلیں جی۔"

"پچھلے مہینے تو تم نے ڈھائی روپے کلو دیئے تھے۔ اب کیا ہوا ہے؟" نیا نے پوچھا۔

"دام چڑھ گئے ہیں جی۔ آپ یہ ریٹ لسٹ چیک کرلیں۔" اس نے سامنے لگے ہوئے ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا جس پر انتہائی بدخطی سے سبزیوں کے ریٹ لکھے ہوئے تھے۔

"یہ اس مہینے کی لسٹ ہے جی۔ آپ ہمارا ہر سودا اس لسٹ سے ملا لیا کریں۔ اب تو جی لسٹ کے بغیر ہم ایک تنکا بھی نہیں بیچتے۔"

"ہاں۔ یہی تم لوگوں کا علاج ہے۔ ڈنڈے لگتے رہیں تو تم ٹھیک رہتے ہو۔"

"اجی ہم تو تابعدار ہیں جی۔" سبزی والا تراز و پکڑ کر بولا۔ "آپ کو منڈیوں کے بھاؤ کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہے بیگم صاحبہ! وہاں سے مال مہنگا آتا ہے۔ ہم تو جی چھوٹے دکاندار ہیں، پرچون فروش ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ اُدھر سے مال مہنگا ملتا ہے، ادھر گاہک ناراض ہو جاتا ہے۔"

"اچھا۔" نیا زچ ہو کر بولی۔ "لہسن تولا ہے یا نہیں تم نے۔ کہیں باتوں میں پھر سوکھا تڑا لہسن نہ تول دینا۔"

"نہیں جی آپ خود چن لیں۔" وہ جلدی جلدی موٹا موٹا لہسن چننے لگا۔ "اب یہی دیکھیں جی پچھلے سال سارا مالٹا باہر بھجوا دیا گیا تھا تو اپنے ملک میں مالٹا اور کینو مہنگا ہو گیا تھا۔ بیگم صاحب جی یہ غریب ملک ہے۔ یہاں مالٹا اور کیلا ہی ایک پھل ہے جسے ہر امیر غریب کھا سکتا ہے پچھلے سال تو غریب لوگ کیلے کو بھی ترس گئے تھے۔ اسی طرح پیاز ہے۔ غریب آدمی پیاز کے ساتھ روٹی کھاتا ہے اور جی ہماری تو کوئی ہانڈی پیاز اور لہسن کے بغیر نہیں بن سکتی ایسی چیزوں سے زرِ مبادلہ کمانے کا کیا فائدہ، جس پر ہمارے ملک کے غریب لوگوں کی زندگی کا انحصار ہے جی۔"

نیا سبزی فروش کی یہ بات سُن کر چونک گئی۔ کتنی گہری بات کہہ دی تھی اس ناخواندہ آدمی نے۔ واقعی اب لوگوں میں کافی شعور پیدا ہو گیا ہے۔ نیا ابھی سوچ رہی تھی کہ پہلو سے اسے عورتوں کی آواز آئی۔ اس نے نظر اٹھائے بغیر کان ادھر لگا دیئے۔ شاید دو خواتین نیا کے بارے میں تبادلہ خیالات کر رہی تھیں۔

"نیا ہے۔" ایک نے کہا۔ "وہی۔" پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

"کم بخت پر ہر نئے دن نیا جوبن ہوتا ہے۔"

"کیوں نہ ہو۔ اپنے آپ کو جوان رکھنے کے طریقے جو آتے ہیں اُسے۔"

"ایسی عورتیں کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں۔"

"بوڑھے ہونے کے لئے ہم جو ہیں۔"

"اں۔" پہلی والی ہاں کو ذرا لمبا کر کے بولی۔

"شریف عورت پر بڑھاپا بھی جلدی آجاتا ہے۔" پھر وہی خاتون انتہائی دردناک انداز میں اندرونی بیماریوں کے بارے میں سیر حاصل تبصرہ کرنے لگی۔ ان کا موضوع بدلتا دیکھ کر نیا نے آہستہ آہستہ ان کی طرف رُخ کیا اور نظر اٹھا کے ان کی طرف دیکھا وہ ان دونوں سے واقف تھی۔ اس کی شاپ پر یہ دونوں آیا کرتی تھیں۔ انہوں نے بھی نیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ خندہ پیشانی سے مسکرائیں۔ ایک بڑے جوش و خروش سے بولی۔

"ہیلو نیا! کیا حال ہے؟"

"اچھی ہوں۔" نیا نے مسکرا کر کہا۔

"ہائے آج تو آپ بے حد اسمارٹ لگ رہی ہیں۔ ابھی ہم آپ ہی کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں کہ دن بدن آپ حسین ہوتی جا رہی ہیں۔"

"سادہ گفتگو میں نے سن لی تھی۔" نیا نے دل میں کہا۔

"آپ تو سراپا بہار ہیں خدا کی قسم۔" دوسری بولی۔

مگر اُنہوں نے بے دلی سے جواب دیا اور ان کی منافقت کے بارے میں سوچنے

لگی۔ اتنے میں دوسری طرف سے ایک آدمی نے ہیلو کہا تو نیا اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ادہ، یزدانی صاحب! آج آپ ٹوکری اٹھائے چلے آ رہے ہیں؟"

"بس کیا کریں۔ نوکری جو ہوئی۔"

"بیگم یزدانی کہاں ہیں؟"

"آج ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور گھر میں کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ میں نے سوچا سودا سلف لا دوں۔ آپ سنائیں کیسی ہیں۔ کسی روز آئیں گے۔ آپ کی طرف۔"

"ضرور تشریف لائیں۔"

"آپ کو بہت دنوں بعد دیکھا ہے۔ آج کیسے نکل آئیں؟"

"کبھی کبھار جب فرصت مل جاتے تو سودا لینے آ جاتی ہوں۔"

"ہاں۔" وہ ہنس کر بولے۔ "اب خواتین کے کام بڑھ گئے ہیں۔"

"ایک زمانہ تھا۔" نیا بولی۔ "جب خواتین مزے سے گھر بیٹھا کرتی تھیں۔ سارا سودا سلف مرد لا کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ بچوں کے بھی پسند کروانے کے لئے گھروں میں بھیج دیئے جاتے تھے۔ اور کپڑوں کے تھان بھی، لیکن اب دنیا بھر کے کام عورتیں کرتی ہیں۔ بچوں کو اسکول چھوڑنے جاتی ہیں۔ سودا سلف لاتی ہیں۔ گھر کا کھانا پکاتی ہیں، مہمانوں کی تواضع کرتی ہیں، بجلی اور پانی کے بل بینکوں میں جمع کرواتی ہیں، ٹی۔ وی کے لائسنس بنواتی ہیں، جائداد کا حساب کتاب رکھتی ہیں۔ حتیٰ کہ کاروبار بھی کرتی ہیں۔"

"ہاں جی۔ ایسا تو ہے۔" یزدانی صاحب نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

"لیکن مرد اب بھی ان سے خوش نہیں ہیں۔"

"اصل میں۔" یزدانی صاحب نے سگریٹ سلگایا اور ایک لمحے کے لئے رک کر کہنے لگے۔ "یہ سارے بوجھ عورت نے خوشی خوشی خود اٹھائے ہیں۔ وہ چاہتی تھی اس پر اعتماد کیا جائے، سو مردوں نے بہت سی ذمے داریاں اس پر لاد دیں۔ آپ جانتی ہیں اپنا بوجھ ہلکا ہوتا نظر آئے تو مرد یا عورت دونوں ہی خود غرض بن جاتے ہیں۔ اور پھر پڑھی لکھی بیوی کا اور کیا معنی

ہے؟"

"تو آپ سب نے۔" نیا نے وہاں کھڑی ہوئی عورتوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "یہ ہوتا ہے پڑھی لکھی بیوی کا مصرف کہ بازار سے گوشت ترکاری لایا کرے۔" اس پر سب ہنسنے لگے۔

"ان ذمے داریوں کی آڑ لے کر یورپ میں عورت اتنی آگے نکل آئی ہے کہ اب سب کا دھیان دھکیلنے کی فکر میں ہیں۔" نیا نے کہا۔

"کیا سیج؟" ایک عورت بولی۔

"ہاں۔ اب وہاں مباحثے اور مناظرے ہو رہے ہیں کہ اس عورت کو کس طرح گھر کے اندر بھیجا جائے کیونکہ اس کے باہر آ جانے سے گھر کا توازن جو بگڑ گیا ہے۔ وہاں دانشمند سر جوڑ کر یہ مسئلہ حل کر رہے ہیں۔ اصل میں وہاں کے دانشمند پہلے ایک مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں، پھر ساری زندگی اسے حل کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔" کسی نے کہا اس پر سب ہنسنے لگے۔

اتنے میں کچھ اور خواتین و حضرات بھی سودا لینے چلے آئے تھے، سبزی کی دکان پر آزادی نسواں کے بارے میں اچھا خاصا مذاکرہ ہونے لگا۔ اور پھر بات عورت سے شروع ہو کر مہنگائی پر آ گئی۔ تب ایک خاتون نے کہا۔

"کیا کریں جی! نوکر سودے میں سے پیسے بچا لیتے ہیں۔ اب اتنی مہنگائی میں ہم سے بچت نہیں ہوتا اور پھر پیسے رکھنے کے علاوہ سودا بھی ناقص لے جاتے ہیں۔ اسی لئے اب ہمیں اپنا آرام تج کر یہاں آنا پڑتا ہے۔ ورنہ ان گندی مارکیٹوں میں کب ہم خوشی سے آتے ہیں۔"

ایک اور خاتون بولی۔

"لوگ روتے ہیں کہ گوشت مہنگا ہو گیا ہے۔ کیوں نہ ہو گوشت مہنگا! اب تو ہر گھر میں گوشت پکتا ہے۔ پہلے لوگ دالیں اور سبزیاں زیادہ کھایا کرتے تھے۔ مگر اب آپ دیکھئے کہ دالیں اور سبزیاں کتنی مہنگی ہو گئی ہیں۔ ۱۰ دس روپے کی سبزی پکانی ہے تو بیس روپے کا گوشت کیوں نہ پکائیں۔"

ایک بوڑھی خاتون نے گفتگو میں حصّہ لیا۔

"پہلے جس گھر میں پاؤ گوشت جاتا تھا اب وہاں دو کلو گوشت جاتا ہے۔"

"بی بی جی!" سبزی والے نے دخل در معقولات کر کے ان کو یاد دلایا کہ وہ سبزی خریدنے آتے ہیں اور یہ گاہکی کا وقت ہے۔ کچھ عورتوں نے وقفے کو غنیمت جانا اور آگے بڑھ کر اپنا اپنا سودا بتایا۔ سبزی والے کے ہاتھ تیزی سے شلجم، ٹماٹر، گوبھی اور مٹر پر چلنے لگے۔

"ہاں بھئی یہ پٹرول کہاں جا کر بھرے گا۔" ایک صاحب نے نیّا کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھ کر اپنے ساتھی سے سوال کیا۔

"کچھ پتہ نہیں صاحب!" اس آدمی نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کنکھیوں سے نیّا کی جانب دیکھا۔ "ویسے ہمارے جیسے غریب ملک کے لئے اتنا مہنگا پٹرول خریدنا بہت مشکل ہو جائے گا۔"

"غضب خدا کا۔" ایک معمّر سی خاتون بولی۔ "آپ نے کبھی اس بات پر بھی توجہ دی ہے کہ ملک میں موٹریں کتنی آگئی ہیں۔ ہر ماڈل اور ہر ملک کی موٹر یہاں نظر آتی ہے۔ جس کو دیکھو موٹر لئے پھرتا ہے۔ اب تو موٹر کے بغیر کوئی جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایک غریب ملک میں موٹروں کی اتنی درآمد۔"

"موٹر تو دراصل ضروریات زندگی میں شامل ہو گئی ہے۔" وہی آدمی بولا۔ "ذرا دیکھیں تو شہر کتنے وسیع ہو گئے ہیں۔"

تھوڑے فاصلے کے لئے لوگ سائیکل بھی تو استعمال کر سکتے ہیں۔ تاکہ ملکی صنعت کو بھی فروغ ملے۔ ہالینڈ جیسے ملک میں لوگوں کی دل پسند اور سستی سواری ابھی تک سائیکل ہی ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں سائیکل پر سفر کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔" نیّا نے کہا۔

ایک طرحدار بیگم ابھی ابھی آ کر محفل میں شامل ہوئی۔ ساری بات سُن کر بولی۔

"اصل میں ہم لوگوں کو پیدل چلنے کی عادت بالکل نہیں رہی۔ میں حال ہی میں امریکہ

یورپ کا چکر لگا کر آئی ہوں، وہاں زیادہ تر لوگ پیدل چلتے ہیں۔ جب سے پٹرول کا ہوا ہے۔ اشد ضرورت کے تحت ہی اپنی موٹریں استعمال کرتے ہیں۔ خواتین دو چار میل پیدل چل لینے میں کوئی بری بات نہیں سمجھتیں اور یہاں تو لوگ ہمسائے کے گھر بھی موٹر ہی میں جاتے ہیں۔"

نیّا نے مسکرا کر اس خاتون کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی امریکہ اور یورپ سے ہو کر آئی تھی اور شائستگی سے بولی۔

"پیدل چلنا واقعی بہت اچھی عادت ہے۔ پیدل چلنے سے صحت بھی اچھی رہتی ہے اور جسم بھی خوب صورت ہو جاتا ہے۔ وہاں کی عورتیں بیشک پیدل چلتی ہیں۔ مگر ہمارے پیدل چلنے میں دو قباحتیں ہیں۔"

سب نے نیّا کا چہرہ استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

"ایک تو یہ کہ ہمارے یہاں گرمیوں کا موسم طویل ہوتا ہے اور یہ موسم پیدل چلنے کی اجازت نہیں دیتا جبکہ امریکہ اور یورپ میں اتنی گرمی نہیں ہوتی۔ دوسرے ان کی سڑکیں پیدل چلنے کے لئے بہت موزوں ہیں۔ صاف ستھری ہیں اور کشادہ بھی۔ ہر شہری ٹریفک کے اصولوں کی پابندی اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بلکہ پیدل چلنے والوں کے حقوق مقدم جانتے ہوئے گردانے جاتے ہیں۔ سڑک پر پیدل چلنے والے کو پہلا حق ملتا ہے۔ جبکہ یہاں صرف یہ کہ زیادہ تر سڑکیں ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں بلکہ ہر سوار من موجی بن کر نکلتا ہے، موٹر والے تو یوں ہی بدنام ہیں۔ سڑکوں پر زیادہ تر ایکسیڈنٹ سائیکلوں، رکشوں اور ٹانگوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ہر سواری والا آگے نکلنا چاہتا ہے اس جلد بازی میں خواہ وہ اگلے جہاں پہنچ جائیں۔ ہاں ایک تیسری وجہ بھی ہے۔" نیّا نے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "عورتوں کو سڑکوں پر تحفظ حاصل نہیں۔"

"تحفظ؟" سب لوگوں نے جواب طلب نظروں سے نیّا کی جانب دیکھا تو وہ اپنی بات کی وضاحت کے لئے بولی۔

"وہاں، دوسرے ملکوں میں دن رات مرد، عورتیں سڑکوں پر ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ کسی کو احساس نہیں ہوتا کہ دائیں جانب جوان لڑکی جا رہی ہے یا لڑکا مگر یہاں تو چپ خود ہی سوچیے کہ سڑک پر کوئی عورت جا رہی ہو تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے؟ یوں لگتا ہے جیسے سارا زمانہ اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ فحش مذاق، بے ہودہ آوازے، بے معنی اشارے کیا کچھ نہیں ہوتا۔ اس بیچاری کا سیروں خون خشک ہو جاتا ہے یہ سوچتے سوچتے کہ آیا وہ بحفاظت گھر پہنچ سکے گی یا نہیں۔ اتنا ہی دیکھیے کہ کوئی حسین عورت کسی دکان پر کھڑی ہو جائے تو لوگ یوں اکٹھے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جیسے میلہ لگا ہو۔"

گو نیاّ نے روانی میں ایک عام سا مشاہدہ بیان کیا تھا مگر جیسے وہاں کھڑا ہوا ہر شخص چونک سا گیا۔ مردوں کو اپنا اپنا سودا یاد آنے لگا۔ نیاّ نے بھی اپنی سبزیاں تلوائیں، بل بنوایا، پیسے ادا کئے اور اپنی موٹر کی طرف بڑھی۔ سبزی والے نے سبزی کی ٹوکری پیچھے اس کی ڈگی میں رکھ دی۔ نیاّ نے چابی گھما کے کار کا دروازہ کھولا تو اسے آواز آئی۔ ایک عورت دوسری سے کہہ رہی تھی۔

"بڑی حرافہ ہے یہ نیاّ۔ دیکھا کس طرح ان مردوں کے منہ پر جوتا مار کے چلی گئی ہے حالانکہ پہلے خود ہی مسکرا مسکرا کر انہیں یہاں کھڑے ہونے کی ترغیب دی تھی۔"

نیاّ زیر لب مسکرا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ آج بہت دیر ہو گئی تھی یونہی باتوں باتوں میں حالانکہ آج اسے جلدی گھر پہنچنا تھا۔

اس نے اپنی موٹر اسٹارٹ کی اور اس کو یوں مین روڈ پر ڈالا جیسے تالاب کی سطح پر تیرتی ہوئی بطخوں میں ایک اور بطخ جا کر مل گئی ہو۔ نیاّ نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا پھر کار لائٹر نکال کر سگریٹ سلگایا اور لمبا کش لے کر منہ سے دھواں چھوڑا۔ جگر خراش آہ کی طرح سارا دھواں کار میں پھیل گیا۔

اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے مگر ایک ہاتھ کی دو انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا اور اس کے دھواں یوں نکل رہا تھا۔ جیسے انگلیوں کے درمیان اگربتی جل رہی ہو۔ کبھی

وہ ہاتھ اٹھا کر وہ سگریٹ کا کش لگا لیتی اور پھر منہ سے دھوئیں کے مرغولے نکالتی سبک سے موٹر چلانے لگی۔ جس طرح وہ مردانہ وار موٹر چلا رہی تھی اسی طرح مردانہ وار سگریٹ پی رہی تھی۔ ادھر ادھر آتی جاتی کاروں میں بیٹھے لوگ اسے گھور رہے تھے ابھی تک اس ملک میں عورت کا سگریٹ پینا ایک عجوبہ سمجھا جاتا ہے۔ جانے کیوں سگریٹ پیتے عورت کو دیکھ کر لوگ خود بخود اس کے بارے میں رائے قائم کر لیتے ہیں۔ شاید اس سگریٹ نما کو شراب سب کو ہضم کے لوازمات تھے اور لوگوں کا خیال ہے کہ اب وہ سے اتر کر کوٹھیوں میں آ گئے ہیں۔ نیاّ کو بہت مزا آ رہا تھا جب لوگ چونک چونک دیکھ رہے تھے۔

"دیکھتے تو ہیں نا" اس نے ہنس کر سوچا۔ دکھانے کے لئے تو لوگ اپنا گھر بھی جلا لیتے وہ تو صرف اپنا کلیجہ پھونک رہی تھی۔

مردوں کی نگاہوں میں دلچسپی تھی اور عورتوں کی نگاہوں میں بے زاری۔ یہاں نیاّ پھر عورت کے فلسفے پر سوچنے لگی۔ مرد ہر اس عورت کے قریب جانا چاہتا ہے جس کے میں بدنامیوں کے انگارے ہوں۔ پتہ نہیں یہ دریافت کا چکر ہے یا یافت کا۔ مرد ہے۔ زبان سے جس کو برا کہتا ہے اسی عورت کی جانب وہ دوڑتا ہے۔ بس کسی عورت کا لگ جائے کسی بدنامی کا وہی عورت مردوں کے لئے دلکشی کا مرقع بن جاتی ہے اس عورت سے ایک بے نام سی نفرت اور ایک بے نام سا حسد کرتی ہیں شاید اس وہ عورت ان کے سر پر ایک خطرہ یا چیلنج بن کے منڈلاتی رہتی ہے۔ نیاّ کو اپنا وہ زمانہ جب اسے ماڈلنگ کا شوق چرایا تھا۔ اوہ! وہ بھی شوق کی کیسی کیسی وادیاں پار کر کے یہاں گئی تھی۔ اب بھی مرد نیاّ کو پرشوق نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس سے گپ لگانا خوش سمجھتے تھے۔ تب نیاّ کو خانم کی باتیں یاد آتی تھیں اس نے ٹھیک کہا تھا کہ چالیس سال عورت اپنی عقل کے سہارے زندگی لوٹ سکتی ہے۔ ابھی تک نیاّ ایک خطرہ بن کر سب کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ مقدر کے آسمان پر پیچ کھا کر وہ ایک کٹی پتنگ بن چکی

تھی جو خلا کی وادیوں سے دھیرے دھیرے پستی کی طرف آ رہی تھی اور لوٹنے والے بے حد
حساب تھے۔ جب بیس تیس پیسے کی پتنگ کٹ جاتی ہے تو سب منہ اٹھا کے آسمان کی
جانب دیکھنے لگتے ہیں کہ کس کی گود میں گرے گی یا کون سا ہاتھ اسے بڑھ کر اچک لے گا
پتنگ خواہ کتنی معمولی کیوں نہ ہو، لوٹ لینے کا الگ مزا ہے اور اس مزے سے کوئی مرد
بھی محروم نہیں رہنا چاہتا۔

نیا کو معلوم ہو چکا تھا کہ مرد کی فطرت کیا ہے۔

اپنی بیوی کے سوا ہر عورت اسے ایک انجانا جزیرہ نظر آتی ہے جسے دریافت
کرنے پر وہ آمادہ ہو جاتا ہے۔ نیا زیر لب مسکراتی۔ بہت سے مرد اس سے واقف
سر بازار شناسائی کا اظہار کرتے تھے۔ ہیلو کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ گپ لگاتے
تھے۔ وہ جانتی تھی ان میں سے کئی ایسے ہیں کہ اگر نیا ذرا سا اشارہ کر دے تو بال بچے اور
اپنی بیویاں چھوڑ کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو جائیں گے۔

نیا نے سگریٹ ختم کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور جھک کر موٹر کے آئینے میں
اپنا چہرہ دیکھا۔ بیالیس سالہ چہرہ خوب بنا ٹھنا ہوا تھا۔ کمان کی طرح ترشی ہوئی بھنویں اور
ان پر پنسل کی ہلکی لکیر۔ رخساروں پر گل رنگ غازہ۔ ابھرے ہوئے ہونٹوں کو ہلکا براؤن رنگ
دے کر گہرے براؤن رنگ کی لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ رنگے ہوئے بالوں پر کریم رنگ
کا چیک اسکارف لپٹا ہوا تھا۔ سارے چہرے پر ایک مناسب نکھار سا تھا۔

مغرب کا فلسفہ یہ ہے کہ عورت جوں جوں بوڑھی ہوتی جاتے، شوخ رنگ کے
کپڑے پہنے اور گہرا گہرا میک اپ کرے تاکہ دور سے جوان نظر آتے سو نیا بھی دور سے
جوان نظر آ رہی تھی۔

نیا نے جب اپنے گھر کے آگے موٹر کھڑی کی تو دور سے دیکھ لیا کہ اس کی دکان کھلی
تی اور اس میں گاہک بھی نظر آ رہے تھے۔ بجولی نے حسب معمول دکان کھول لی تھی۔ دل ہی
نیا نے بجولی کی فرض شناسی کو سراہا۔ اس نے دکان کی ساری ذمے داریاں آتے ہی سنبھال
بہت ہی دیانتدار اور محنتی لڑکی تھی۔

نیا پچھلی سیڑھیوں سے فلیٹ میں داخل ہوئی، نوکر کو آواز دے کر بلایا۔ وہ سارا سودا سلف
پر چلا گیا۔ نیا نے آج کے کھانے کے بارے میں اسے سمجھا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ گوشت
کی تھیلیاں بنا کے ڈیپ فریزر میں رکھ دے اور خود اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ جس طرح
وہ چھوڑ کر گئی تھی اسی طرح ہر شے بکھری ہوئی تھی۔ اپنا کمرہ ٹھیک کرنے سے پہلے
م میں چلی گئی۔ موتی کا کمرہ بالکل صاف پڑا تھا۔ بستر پر بیڈ کور پڑا ہوا تھا البتہ موتی کمرے میں
ملازم کو بلا کر پوچھا تو وہ بولا۔

"چھوٹے صاحب ناشتہ کر کے اپنے دوستوں کے ساتھ چلے گئے ہیں۔"

نیا سیپ کے کمرے میں چلی آئی۔ سیپ ابھی تک تکیوں میں منہ دئے اوندھی لیٹی تھی گویا
سو رہی تھی۔

"اُف کس قدر سست ہے یہ لڑکی۔" نیّا نے دل میں سوچا۔ اس نے رضائی کھینچ کر سیپ کا منہ کھول دیا اور بولی۔

"اٹھو بیٹیا! دیکھو تو کتنا دن چڑھ آیا ہے۔"

"اوہ ممّی!" سیپ نے مچل کر پھر رضائی میں گھسنا چاہا۔ "سونے بھی تو دیں۔"

"بہت سولیں سیپی! اب اٹھو۔ ناشتہ وقت پہ کیا کرو۔ اس طرح بار بار گھر کے ہر فرد کے لئے ناشتہ بنانا پڑے تو نوکر بے زار ہو جاتے ہیں۔"

"ممّی چھٹیاں ہیں۔" بند آنکھوں میں سیپ کسمسائی۔

"ہاں مگر ضروری نہیں کہ ساری چھٹیاں صرف سو کر ہی برباد کر دی جائیں۔ جلدی اٹھو پھر میں نے دکان میں بھی جانا ہے۔" اس مرتبہ نیّا کے لہجے میں دھمکی کا عنصر تھا۔ اس لئے سیپ بے زار ہو کر اٹھ گئی اور پیر پٹختی ہوئی غسل خانے میں چلی گئی۔ نیّا نے آگے بڑھ کر سیپ کا بستر ٹھیک کیا۔ رضائی تہہ کر کے ایک طرف رکھی اور پھر اپنے کمرے میں آ کر اپنا بستر ٹھیک کرنے لگی۔

چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی۔ اس نے خانساماں کو آواز دے کر چائے بنانے کا حکم دیا۔ اپنا کمرہ ٹھیک کر کے وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ اور سگریٹ سلگا کے دھیرے دھیرے کش لینے لگی۔ اس انداز میں آنکھیں بند کر کے جب وہ دھواں چھوڑا کرتی تو ہمیشہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے لگتی تھی۔ ذہنی طور پر اس کا ماضی اس سے کبھی الگ نہ ہوا تھا مگر اس وقت وہ تمام تر سنجیدگی سے سیپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ سیپ بڑی لاپروا اور غیر ذمے دار لڑکی تھی۔ یوں تو اس کی عمر ابھی پندرہ برس تھی۔ مگر پندرہ سال بھی جانچنے کے لئے کوئی خاص چھوٹی عمر نہیں ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نیّا نے اسے کم سنی میں ہی ہوسٹل میں داخل کرا دیا تھا۔ لیکن مومی کو تو اس سے بھی چھوٹی عمر میں اس نے ہوسٹل بھیجا تھا۔ مومی اور طرح کا بچہ تھا بچپن میں جتنا شریر اور ضدی تھا، بڑا ہو کر اتنا ہی سنجیدہ اور شرمیلا ہو گیا تھا حالانکہ اس نے کبھی مومی پر جائز سختی بھی نہیں کی تھی۔ کبھی پھول کی چھڑی سے نہ چھوا تھا۔ اونچی آواز میں پکارا بھی نہیں تھا۔ وہ چاہتا

بڑا ہی جیالا، بہادر اور مرد دھاڑ سے بھرپور مرد نکلے مگر موتی اس طرح جوان ہوا جیسے بچپن ہی کھو گیا ہو، گم صم ہو گیا ہو۔ پچھلے سال موتی نے بی کام کر لیا تھا اور اب نیّا نے اسے لئے لاہور بھیج دیا تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے بچے اپنے سے دُور رکھے۔ وہ نہیں کہ اس کی یا حالات کی کوئی پرچھائیں بچّوں پر پڑے۔ بہت عرصے تک حالات غیر یقینی نے۔ بہت عرصے تک نیّا حالات سے لڑتی رہی تھی وہ تین چار سال کا عرصہ جو اس کے ساتھ گزارا تھا، اس کی ساری زندگی پر محیط ہو گیا تھا۔ اسی منحوس عرصے کو اپنی سے نکالتے نکالتے یہ دن آ گیا تھا۔ یوں رازی سے اس کا چھٹکارا تو بہت جلدی ہو گیا وہ کی وجہ سے۔ فاروق نے بڑے سلیقے سے اسے بہت سی بدمزگیوں، بدنامیوں ہو دگیوں سے بچا لیا تھا۔ اس نے طلاق لینے کا مشورہ دیا تھا اور رازی کو بھلا طلاق ں کیا عذر ہو سکتا تھا جبکہ وہ جیل میں تھا۔ فاروق خود لندن گیا اور طلاق کے کاغذات ظ کرا لایا تھا پھر اس نے نیّا اور بچّوں کو اسلام آباد لا کر اپنے فلیٹ میں پناہ دی تھی، نیا سے چھپا کر رکھا تھا تاکہ لوگوں کی اٹھتی ہوئی انگلیاں زہریلے تیروں کا کام نہ کریں۔ فتہ رفتہ اس نے کراچی میں نیّا کا گھر اور گھر کی ہر چیز فروخت کر دی تھی اور نیّا سے پوچھا تھا ب کہاں سکونت اختیار کرنا چاہتی ہے۔ لاہور اس کی جنم بھومی تھی۔ اس کے خوابوں ڑوہ تو وہاں سے بن باس کاٹنے نکل آئی تھی۔ جب کراچی نے بھی سہارا نہ دیا تو انسانوں ریٹ کے اس جنگل سے بھی اس نے منہ پھیر لیا۔ کچھ دنوں اسلام آباد رہی تو یہ اجنبی اجنبی فضا اور ہمدردیوں سے لدے گونگے پہاڑ بہت اچھے لگنے لگے تھے مگر اسلام آباد ہ تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا چنانچہ بہت دنوں کی دوڑ دھوپ کے نے راولپنڈی کی ایک بڑی شاہراہ پر ایک کمرشل پلاٹ خرید لیا تھا جس کے نچلے ا اس نے بڑے بڑے شوروم بنا دیئے تھے اور اوپر ایک چار منزلہ عمارت کھڑی گی۔ درمیان والے تین فلیٹ اس نے کرائے پہ دے دیئے تھے اور سب سے

اوپر والے فلیٹ میں خود رہتی تھی۔ اب زندگی گزارنے کا چلن ہی اور تھا۔ وہ لڑکو
نہیں چاہتی تھی حالانکہ اسلام آباد میں ملازمت کے چانسز بے شمار تھے مگر اپنے ٹو
ہوتے ذہن کو مجتمع کر کے اس نے ایک بڑی سی "بوتیک شاپ" کھولنے کا فیصلہ کر لیا
کا زیادہ تر پیسہ اس بڑی عمارت پر لگ گیا تھا۔ دکان کے لئے اس نے اپنے قیمتی زیور
بیچ ڈالے، کچھ قرض بینک سے لے لیا کیونکہ وہ جو کام بھی کرنا چاہتی تھی، بڑے
پیمانے پر کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں "نایاب بوتیک" کے نام سے
میں ایک بہت بڑا سٹور کھل گیا جس میں لٹکتے ہوئے دیدہ زیب، خوش رنگ و جدید
ملکی و غیر ملکی اسٹائل کے ملبوسات پنڈی و اسلام آباد کی تمام تر میگمات کی توجہ کا مرکز
گئے۔

اس نے ایک اشتہاری کمپنی میں کام کیا تھا اس لئے اسے اندازہ تھا کہ پبلسٹی کی کا
میں کیا اہمیت ہے اس نے ٹی وی پر اور اخباروں میں اپنے اسٹور کے بڑے بڑ
اشتہار چھپوا دیئے تھے۔ وہ ٹھیکے پر کام نہیں کرواتی تھی بلکہ درزی ملازم رکھے تھے
نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی خواتین بھی اس کی دکان سے خریداری کرنا باعث فخر سمجھتی تھیں
شوروم کے ایک کونے میں ایک "اسنیک بار" بھی کھول لیا تھا تاکہ خریداروں کو مشروبا
اور چائے وغیرہ کی سہولت رہے اور دوسرے کمرے میں رسالوں اور کتابوں کا ایک
اسٹال بنوا لیا تھا تاکہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا رخ دکان کی جانب رہے۔ ہر حصے
تنخواہ دار ملازم رکھے تھے۔ وہ اچھی تنخواہ دیتی تھی تاکہ کام خوش اسلوبی سے انجام پاتا

کچھ ہی عرصے میں یہ اسٹور اور شوروم خاص و عام کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ شوروم
سارا کام نیا اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ شروع شروع میں تو کوئی سیلز گرل رکھنے کی توفیق
ہی نہ تھی پھر رفتہ رفتہ وہ عادی ہو گئی تھی۔ ایک دن وہ دوکان پر کپڑوں کا حساب کتاب
جوڑ رہی تھی کہ ایک دبلی پتلی سانولی سی ڈری سہمی لڑکی اندر آ گئی تھی۔

فرمایئے؟" نیا نے کاروباری انداز میں کہا۔

میڈم میں۔۔۔" وہ لڑکی تھر تھر کانپنے لگی۔

ہاں ہاں۔" نیا نے نرمی سے پوچھا۔ "کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟" نیا کو فوراً پتہ چل گیا کہ یہ لڑکی
ی کے لئے نہیں آئی بلکہ کچھ مانگنے آئی ہے۔ آج کل نوجوان لڑکیاں اپنی نوجوانی کا کاسہ
ے ہوئے گھڑت قصے سنا کر سینکڑوں روپے ہتھیا لے جاتی ہیں مگر نیا کو خواہ مخواہ اس زردسی
رس آنے لگا اور وہ اس کی بات سننے پر مجبور ہو گئی۔

وہ لڑکی خوف زدہ تھی اور ہونٹوں پر زبان بھی پھیرتی جاتی تھی۔

ادھر آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ اور اطمینان سے سب کچھ کہو۔" نیا نے کہا تو وہ ڈری سہمی
ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔

تمہارا نام کیا ہے؟" نیا نے اس کی جھجک توڑنے کے لئے پوچھا۔

جی بولیا۔" وہ جلدی سے بولی۔

بولیا! کیا تم پڑھتی ہو؟"

جی کبھی پڑھتی تھی۔"

اب کیا کرتی ہو؟"

جی در در کے دھکے کھاتی ہوں۔"

کیوں؟"

جواب دینے کی بجائے بولیا رونے لگی مگر روتے روتے اسے خود ہی خیال آ گیا کہ وہاں
رونے نہیں آئی اور کسی کا وقت ضائع کرنا بھی نامناسب بات ہے۔ آج کل
نقلی آنسوؤں کا رواج پڑ گیا ہے کہ لوگ اصلی آنسوؤں کی شناخت نہیں کر سکتے۔
اس نے آستین سے اپنا چہرہ صاف کر کے بولی۔

میں صرف میٹرک تک پڑھی ہوئی ہوں۔ میں نے کالج میں داخلہ لیا تھا مگر تعلیم جاری نہ

رکھ سکی۔ نرسنگ اسکول میں داخلہ لیا تو دو مہینے بعد چھوڑ دینا پڑا۔"

"کیوں؟"

"بس جی کچھ گھریلو حالات ہی ایسے ہیں۔"

"تمہاری ممی ہیں؟"

"جی!"

"اور ڈیڈی؟"

اس پر وہ دوبارہ رونے لگی۔ نیا نے اسے ایک پیالی چائے پلائی اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے کہنے لگی۔

"آؤ میرے ساتھ کام بھی کرتی جاؤ اور مجھے اپنے متعلق بتاتی جاؤ۔ اس طرح وقت ضائع نہیں ہوگا۔"

بولی فوراً کھڑی ہوگئی جیسے اشارے کی منتظر ہو پھر نیا نے اس کی مدد سے تمام تر کپڑے جو درزیوں کے ہاں سے سل کر آتے تھے، ہینگروں میں لٹکا کر شوکیسوں میں سجا دیئے۔ ان پر قیمتوں کے ٹیگ لگاتے جس جس طرح وہ بولی کو سمجھاتی رہی، بولی دوڑ دوڑ کر اسی طرح کام کرتی رہی حتیٰ کہ بولی نے خود ہی شوکیسوں کے اندرونی شیشے بھی صاف کر دیئے۔ کام کرتے وقت اس معصوم لڑکی کے چہرے پر ایسی روشنی عود کر آتی کہ نیا خواہ مخواہ اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوگئی اور جب وہ کام ختم کر کے نیا کے نزدیک آئی تو اس کے چہرے پر وہی ویرانی اور وسوسے تھے۔ وہ یوں مایوسانہ انداز میں اس کے قریب آ بیٹھی جیسے زندگی کی ہر آس ٹوٹ گئی ہو۔

"کیا خیال ہے بولی!" نیا نے اچانک پوچھا "کیسا ہے یہ شوروم؟"

"بہت اچھا ہے۔" وہ بولی۔

"میرے ساتھ کام کرو گی؟"

جی میڈم!" بولی نے آنکھیں پھاڑ کر بے یقینی سے نیا کی طرف دیکھا۔

"بیرک بک پڑھا ہے نا تم نے، بل وغیرہ تو بنا لو گی نا؟"

بولی ابھی تک حیرت و مسرت کے ملے جلے تاثرات سے آنکھیں پھاڑے نیا کو دیکھ

"میں حساب کتاب لکھنا ہوگا۔ میرا خیال ہے تم یہ کام بخوبی سرانجام دے لو گی۔ میں پانچسو روپے ماہوار دوں گی۔"

"پانچ سو روپے ماہوار؟" بولی جھر جھر رونے لگی۔ نیا جانتی تھی کہ ایسے موڑ پر یونہی رونے آتا ہے۔ جب وہ اچھی طرح رو چکی تو اپنا گلا صاف کر کے بولی۔

"میڈم! آپ کو کس طرح پتہ چلا کہ میں نوکری مانگنے آئی تھی؟"

نیا نے سلگتا ہوا سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا لیا اور دھوئیں کا مرغولہ چھوڑ کر بولی۔

"بولی! یاد رکھو چہرے بولتے ہیں، اچھے اور نیک چہرے۔ شاید میں نے دنیا میں کوئی کام نہیں کیا مگر ایک ضرورت مند لڑکی کو خالی ہاتھ بھیجنے کا گناہ بھی نہیں کر سکتی۔"

"واہ یسوع مسیح!" بولی نے دل ہی دل میں آنکھیں بند کر کے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور سوچنے لگی۔ یہ کتنی عظیم عورت ہے۔ کتنی بلند! سگریٹ منہ میں دباتے پورا نہیں پھنسے، پھنسے کپڑوں والی یہ طرحدار عورت اس وقت بولی کو دنیا کی عظیم ترین عورت نظر آئی۔

بولی نے اسی وقت شوروم کا باقی کام کرنا شروع کر دیا۔ نیا اطمینان سے دور جا کر بیٹھ گئی۔ گاہکوں کے ساتھ بھی بولی نہایت نرم لہجے میں باتیں کرنے لگی مگر تھوڑی دیر بعد وہ آ کر نیا سے ہدایات لیتی جاتی تھی۔ بولی نے اتنی سخت سردی میں صرف ایک سوئٹر پہنا ہوا تھا اور پھرے سے یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ سردی سے بیمار ہی ہے۔

نیا کو بیٹھے بیٹھے ایک دم کوئی ضروری کام یاد آگیا۔ وہ کھڑی ہو کر بولی۔

"جولی! میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ ابھی آجاؤں گی۔"

جولی ایک دم گھبرا گئی بلکہ پیلی پڑ گئی۔

"کیوں کیا ہوا؟" نیا بولی۔

"میڈم! کیا میں شوروم میں اکیلی رہوں گی؟"

"یہاں ڈرنے کی ضرورت نہیں جولی! ارد گرد میرے ملازم ہی کام کر رہے ہیں۔"

"نہیں یہ بات نہیں میڈم۔۔۔" جولی رکتے رکتے کچھ کہنے والی تھی۔

"یہ کمرشل ایریا ہے جولی! یہاں ہمہ وقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ خوب گہما گہمی رہتی ہے، تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔"

"یہ بات بھی نہیں میڈم!"

"پھر کیا بات ہے؟"

"یہ ساری دکان یوں کھلی ہے۔ یہ سب۔۔۔ یہ کیش۔ آپ سب کچھ کھلا چھوڑے جا رہی ہیں۔"

جولی کے سامنے آج ساری دوپہر کافی فروخت ہوتی تھی اور سارا کیش دراز والی سیف میں پڑا تھا۔

"ارے تم جو ہو دکان میں اور پھر میں ابھی تو آجاؤں گی۔"

"میڈم! آپ مجھ پر اعتبار کریں گی؟"

"ہاں ہاں۔" نیا نے کہا مسلمان کو مسلمان پر اعتبار کرنا چاہیئے۔"

"مگر میں تو۔۔۔"

"کیا میں تو؟"

"میں تو کرسچین ہوں۔"

"پگلی!" نیا نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور ہنس کر بولی۔

ے چہرے پر مریم کا سا تقدس ہے جولی! اور تم کیا جانو ہم اپنے لوگوں سے
ا اعتبار کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے کسی سے پوچھ گچھ کئے بغیر
ن میں رکھ لیا ہے۔"

ب ایک گھنٹے بعد واپس آئی تو جولی خاصا رو چکی تھی۔ آج جانے کیوں
، جولی کو رونا آ رہا تھا۔ آج کا دن بھی عجیب تھا۔ وہ گھر سے روکر نکلی تھی اور
ے کہہ آئی تھی کہ آج میرے نصیب کا دروازہ کھول دو ورنہ میں خودکشی کر
پھر یہ کیسے عجیب و غریب واقعات پیش آ رہے تھے۔

ے دکان میں گاہک بھی بہت آتے تھے اور اس نے سارے نوٹ اپنے
ے سیف میں رکھے تھے۔ شام کو دکان بند کرتے سے پہلے اس نے
ب نیا کے آگے رکھ دیا اور بولی۔

ی ماں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ دوسری شادی بھی ایک مجبوری ہی
ب جوان عورت کو ہمیشہ سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ میرے پاپا اسکوٹر
نے میں فوت ہو گئے تھے ان کا نام تھا جوزف جمیل۔ پھر میری ممی نے اسپتال
کر لی وہاں میری ممی کی ملاقات غلام ربانی سے ہوئی۔ اس وقت تو انہوں
کیا تھا کہ وہ مجھے بیٹی بنا کر رکھیں گے اور میرے سب اخراجات برداشت
یں مگر اب انہوں نے میری ممی کی نوکری چھڑوا کر اپنے گھر بٹھا لیا اور میری کفالت
کار کر دیا ہے۔ بلکہ ممی پر زور ڈال رہے ہیں کہ مجھے مزید پڑھانے کی بجائے
ا اپنے ایک آوارہ بھانجے سے کر دیں۔ میری ممی یہ بات نہیں مانتیں۔
ر آئے دن ہمارے گھر میں اس بات پر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ گالی
تا ہے۔ بعد میں ممی بھی اپنا غصہ مجھ پر نکالتی ہیں۔ میری ممی کی تین اور
پاپا کو تو وہ چھوڑ نہیں سکتیں اور۔۔۔ اور میں کہاں جاؤں؟"

"دیکھو جولی!" نیّا نے اسے درمیان میں ٹوکا۔

"اب تم میرے پاس آگئی ہو نا! کچھ دن اس اسٹور میں رہ کر دیکھو پھر اپنی م
میرے پاس لانا اگر گھر کے حالات زیادہ خراب ہو گئے تو میرے پاس آجانا۔ پ
پاس تمہارے لئے جگہ ہے۔ الگ رہنا، تنخواہ لینا اور اپنی تعلیم بھی مکمل کر لینا
لے کر یہاں شوروم میں بیٹھ جایا کرو، جب کوئی گاہک نہیں ہو اس وقت پڑھ
یہاں کھڑے کھڑے وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اس شام جولی جب گھر جانے لگی تو اس کے چہرے پر ایسا اجالا تھا جیسے
نے اس کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھ دیا ہو۔ دنوں میں بات نہیں گئی۔ دو
ہی دن جولی کی ماں اس کے ساتھ آگئی اور جولی کا ہاتھ نیّا کے ہاتھ میں دے کر
کہا۔

"میڈم! میں ماں ہو کر جولی کو جو کچھ نہیں دے سکی وہ آپ نے دے دیا۔ ا
اپنے پاس رکھیں، آج سے جولی خود مختار ہے اس کی تنخواہ میں سے ایک
بھی میرے لئے حرام ہے۔" پھر وہ جولی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"جولی! محسن کا درجہ ماں سے زیادہ ہوتا ہے۔ بس اس بات کو یاد رکھنا ج
زندگی میں اندھیرے چھا جائیں تو میڈم سے روشنی مانگنا اور ہاں! جب تمہارا
شادی کر لینا۔ مجھے یقین ہے کہ میڈم کی چھاؤں میں رہ کر تم کبھی کوئی غلط قدم نہیں

جولی کی ماں کی یہ بات سن کر بنی سنوری نیّا کی پلکوں کے سائبان ٹوٹ گئے
آنکھیں چھپانے کے لئے وہ اچانک اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔

خود اُجالوں کو جو ترستے ہیں
روشنی کے نقیب ہوتے ہیں۔

اس دن کے بعد سے جولی نیّا کے پاس آگئی تھی۔ نیّا سب سے ا

ٹ میں رہتی تھی۔ سکون اور خاموشی کے لئے اس نے اپنے لئے وہی فلیٹ
اس کی سیڑھیوں کے نیچے نیّا نے اپنا ایک کمرہ مہمان خانے کے طور پر بنوا لیا تھا
ایک غسل خانہ اور ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بھی تھا۔ یہ کمرہ اس نے جولی کو دے دیا
لی کو ہر قسم کی آزادی تھی۔ وہ اپنے گھر کی طرح آزادانہ رہتی، خود پکاتی اور خود کھاتی تھی
ب بات تھی۔ جولی صرف اتوار اور جمعے کے روز باہر جاتی تھی۔ اتوار کو چرچ جایا کرتی
نیّا نے اس سے کہا تھا کہ وہ خود مختار ہے، آزاد ہے، جہاں جی چاہے
ی ہے۔ مگر گزشتہ چھ سالوں سے جولی نے اپنا طریق کار نہیں بدلا تھا۔
یوں جولی کے آجانے سے نیّا کو بڑا سہارا مل گیا تھا۔ تہوار کے دنوں میں جب شوروم
وں کے انبار لگ جاتے اور لوگوں کا رش ہوتا تو دونوں رات گئے تک بیٹھی حساب
جوڑا کرتیں۔ نیّا نت نئے ملبوسات ڈیزائن کرتی اور اس کام میں جولی اس کی مدد
تی۔

عید کا سارا دن جولی نیّا کے مہمانوں کی تواضع کیا کرتی اور کرسمس کے تہوار پر نیّا خاص
جولی کو تحفہ دیا کرتی۔

شوروم کی شہرت اور کارکردگی میں جولی کا بھی اتنا ہی ہاتھ تھا جتنا نیّا کا۔ اسی لئے تو نیّا
روم پنڈی اور اسلام آباد میں "اسٹیٹس سمبل" بن چکا تھا۔ لوگ بڑی بڑی محفلوں میں نیّا کے
ن کئے ہوئے ملبوسات پہن کر جاتے اور بڑے فخر سے بتاتے کہ وہ "نایاب بوتیک"
خریداری کرتے ہیں۔ سفیروں کی بیگمات جب چھٹیوں میں اپنے اپنے وطن جایا
یادہ آرڈر دے کر نیّا سے پاکستانی ملبوسات سلوایا کرتیں جو وہ بطور تحفہ اپنے دیس میں
رجاتی تھیں۔ یوں "نایاب بوتیک" کا ہر جا چرچا ہوا اور نیّا کی زندگی ایک جگہ پر ٹھہر گئی۔
ی کا دیا بھی بن گیا اور اسے زندگی گزارنے کا چلن بھی آگیا۔

نیّا آنکھیں بند کئے بیٹھی سوچ رہی تھی کہ سیپ بال جھٹکتی، شرٹ شرپ کرتی عشنا نے

سے آئی تھی اور ساتھ ہی چھل چھل کرتا پانی جسے اس نے غسلخانے میں بے تکا بہایا تھا، باہر نکل آیا۔ گو سیپ کے پاؤں میں سلیپر تھے مگر سلیپر بھی پانی سے تر تھے۔ کمرے فرش اور قالین پر اپنے پاؤں کے گیلے نشان بناتی وہ بے نیازی سے گزر گئی تھی تب نیاز نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

پتہ نہیں، سیپ حد درجہ لاپرواہ کیوں تھی۔ شاید اس لئے کہ نیاز نے اسے کبھی نہیں ٹوکا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو ڈانٹتی پھٹکارتی نہیں تھی۔ ایک تو دونوں بچے ہوسٹلوں میں رہتے تھے اور صرف چھٹیوں میں گھر آتے تھے۔ دوسرے بچپن کی پھٹکار کے نشانات ابھی تک اس کے اپنے ذہن پر تھے۔ اس نے سیپ سے کبھی یہ نہ کہا تھا کہ "دنیا بہت بری ہے"۔ اس ایک فقرے نے اسے عرش سے اٹھا کر فرش پر دے مارا تھا۔ اسی فقرے نے اسے سانپ بن کر ڈس لیا تھا۔ یہی فقرہ اس کی نس نس میں ڈوب رہا تھا۔ اسی لئے وہ دلوں کی لاٹھی تھام کر پا پیادہ دنیا کو کھوجنے نکل آئی تھی۔ نکلی تو خوشی کی تلاش میں تھی مگر ابھی تک واپس نہ جا سکی تھی۔ دنیا تو ہر دور میں ایک جیسی ہوتی ہے۔ کسی کے لئے اچھی کسی کے لئے بری۔ کچھ کچھ اچھی کچھ کچھ بری۔ ہر کوئی اپنے تجربے کے مطابق دنیا کی حقیقت کو پا لیتا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ موتی اور سیپ کی زندگی میں بحیثیت ناصح داخل ہو اس لاٹھی بردار چوکیدار کی طرح جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر "خبردار۔ خبردار" کی آوازیں لگاتا ہے اور چین سے سونے والوں کو بتاتا ہے کہ اس پار خطرہ ہی خطرہ ہے۔ شب بھر سکون سے نیند نہیں لینے دیتا۔

وہ کسی بھی خطرے کا احساس دلائے بغیر اپنے بچوں کو پروان چڑھانا چاہتی تھی۔ اسی لئے اس نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی گرد بھی اپنے بچوں پر نہیں پڑنے دی تھی۔ موتی کو تو علم تھا مگر سیپ بالکل نہیں جانتی تھی کہ اس کا اور موتی کا باپ علیحدہ ہے۔ نیاز نے جب سیپ کو اسکول میں داخل کرایا تھا تو یہ مشکل پیش آئی تھی۔ موتی کو تو اس نے رازی کے زمانے میں ہی اپنے اصلی باپ کے نام سے اسکول میں داخل کرایا تھا۔ اس

اسکول میں اس کا نام فضیل شہباز خاں لکھوا دیا تھا۔ اسی نام کے فرق نے موتی کو رفتہ رفتہ سے دور کر دیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ سمٹتا گیا۔ حتیٰ کہ نیا بھی اس لئے ایک نکتہ رہ گئی۔

سیپ کو اسکول میں داخل کراتے وقت وہ پھر کڑی سوچوں کے حلقے میں تھی۔ جانے کیوں زندگی کے ان بھیانک سالوں کو جو اس نے رازی کے ساتھ بسر کئے تھے۔ نکال پھینکنا تھی۔ وہ کسی کو نہیں بتانا چاہتی تھی کہ سیپ رازی کی بیٹی ہے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ہو کہ رازی کی سیاہ کاریاں سیپ کی معصوم سچائیوں کو چاٹ جائیں۔ وہ ماں تھی اور اولاد کے لئے دور کی سوچ رہی تھی۔ اس لئے اس نے سیپ کی ولدیت کے خانے میں شہباز احمد خاں کا نام لکھوا دیا تھا۔ مگر سیپ کے نام کے ساتھ اس کا نام نہیں لگایا اس وہ کئی بار سوچتی تھی کل کلاں کو سیپ کی شادی کے وقت اگر شہباز مکر گیا کہ وہ کا باپ نہیں ہے تو کیا ہوگا؟ اسے اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیئے۔ مگر پھر بھی شہباز بچوں کے نام کے ساتھ لگا کر اسے ایک گونہ طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ جانے اسے رازی کی طبعی شرافت سے اتنی امیدیں کیوں ہو گئی تھیں۔

کبھی کبھی وہ سیپ کو دیکھتی تو اسے نایاب یاد آ جاتی جو ماں نے منتوں اور مرادوں سے مانگی تھی جس کے بیاہ کا ماں کو بڑا ارمان تھا جو صاف ستھری، معصوم کومل تھی جو ریشمی گلابی گلابی سرسر کے جھونکے کی مانند تھی۔ جس کی آنکھوں میں انجانے پن کے گلابی ڈورے تھے اور ہونٹوں پر تازہ پھولوں جیسی شادابی تھی۔ وہ شاید اسی نایاب کو مجسم دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنی جوانی کو بھلا کون آواز نہیں دینا چاہتا۔ غالباً نیا بھی سیپ کی صورت میں اپنی جوانی کو دوبارہ دیکھنا چاہتی تھی مگر پرورش کے بالکل مختلف انداز کے ساتھ۔ اس لئے اس نے اسکول میں اس کا نام "نایاب سیپ" لکھوا دیا تھا وہ ایک نئے تجربے کے ساتھ سیپ کی پرورش کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اٹھتے بیٹھتے ہوتے ٹوکتی نہیں تھی۔ گلی میں کھڑا

ہونے سے منع نہیں کرتی تھی۔ دوپٹہ اوڑھنے پر اصرار نہیں کرتی تھی بچپن میں جب وہ موتی کے ساتھ گتھم گتھا ہو جاتی تو اسے احساس نہیں دلاتی تھی کہ وہ لڑکی ہے اور اسے لڑکوں کے ساتھ دھینگا مشتی نہیں کرنی چاہیئے۔ ایک غلط وقت پر دنیا کو جاننے کا تجسس وہ سیپ کے اندر نہیں جگانا چاہتی تھی۔ اپنی بار بار سرزنش سے بہت سی باتیں قبل از وقت نہیں کہنا چاہتی تھی۔ غالباً اسی لئے سیپ حد درجہ لاپروا ہو گئی تھی۔ کبھی ڈھنگ اور سلیقے سے کپڑے پہن کر باہر نہیں نکلتی تھی۔ دوپٹے کو تو خیر وہ عذاب سمجھتی تھی۔ شروع ہی سے وہ مری کے ہوسٹل میں رہی تھی۔ انگریزی سکول میں پڑھتی تھی اس لئے اس کا تمام تر لب و لہجہ انگریزی ہو گیا تھا۔ اس کا میل جول بھی بڑے گھرانوں کی لڑکیوں کے ساتھ تھا۔ انہیں کے اطوار اس نے سیکھ لئے تھے۔ اسی طرح رہنا چاہتی تھی۔ فیشن ایبل گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح اس نے بھی اس عمر میں ہی موٹر چلانا سیکھ لیا تھا۔

کبھی کبھی وہ اپنے جسم کے نوخیز غنچوں سے بے پرواہ بھاگتی آتی اور چابیاں میز پر پھینک کر دھپ سے پلنگ پر چت لیٹ جاتی اور آنکھیں بند کر کے لمبی سی سانس چھوڑتے ہوئے کہتی۔

"تھینک گاڈ! گھر پہنچ گئی ہوں"

"مما" پھر وہ سر اٹھا کر نیا کی طرف دیکھتی۔ "آج پھر مصیبت میں پھنسنے لگی تھی"

"نیا آہستہ سے نظریں اٹھا کر دیکھتی تو وہ مزے لے لے کر سنانے لگتی۔

"کچھ لڑکے میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ اوّ کے پٹھے!"

نیا یوں ان سنی کر دیتی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"کم بختوں کو مزا چکھا کے آئی ہوں"

"پتہ ہے" وہ پھر اٹھ کر بیٹھ جاتی اور نیا کی طرف منہ کر کے کہتی۔ "پتہ ہے ممی میں نے کیا کیا؟ ان کم بختوں کو غلط راستے سے کراسنگ کرنے پر آمادہ کر کے سنتری کے حوالے

آئی ہوں" پھر وہ قہقہہ لگاتی۔

"واہ، کتنا مزا آیا۔ کیسی بے بسی سے مجھے دیکھ رہے تھے" وہ ہنستی جاتی ہنستی جاتی اور چپ ہو جاتی جیسے اس کے لئے یہ اتنی اہم خبر نہ ہو۔ اگر وہ اس سے کہتی کہ یہ بری بات ہے، باہر مت نکلا کرو تو وہ ضرور پوچھتی کیوں ممی؟ اور پھر روز باہر نکلا کرتی۔ روز نئی شرارتیں کرتی۔ اب تو وہ باہر کی ہر بات بڑے مزے سے آ کر ماں کو بتا دیا کرتی تھی۔ نیا جب کبھی غور سے سیپ کی طرف دیکھتی تو اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ کلی چٹک رہی ہے۔ وہ دل میں سوچتی۔

"پندرہ سال کی عمر بھی کیا عجیب عمر ہوتی ہے۔ بادِ بہاری کا پہلا جھونکا۔ نیم وا گلاب کس قدر حسین لگتا ہے، بے اختیار توڑ کر بالوں میں سجا لینے کو جی چاہتا ہے۔

نیا کا دل چاہتا کہ ایک دم مڑ کر دوڑنا شروع کر دے اور وہیں سے اپنی عمر کا سرا ایک بار پھر پکڑ لے، ایک بار پھر اپنے آپ کو پندرہ سال کی عمر میں دیکھ لے۔

مگر سیپ کی صورت میں تو وہی تو ہے۔

"ہاں" وہ سوچتی مگر اس میں ایک اور خون مل گیا ہے اور دیکھیے اس خون کے اثرات کیا ہوں؟ سیپ کی تمام تر صورت نیا کی طرح تھی۔ مگر اس کی چال رازی کی طرح اور اسی چال سے نیا کو ڈر لگتا تھا۔ جبکہ موتی تمام تر شہباز پر تھا۔ ایک دم سے لمبا ہو گیا تھا۔ وہی چھریرا بدن۔ بال بھی ویسے ہی خوب صورت، آنکھوں میں وہی معصومیت۔ ابھی دبلا بہت تھا۔ اس واسطے کندھے جھکا کر چلتا تھا۔ اس کے چہرے پر بہت زیادہ متانت تھی جو عام طور پر اس عمر کے لڑکوں کے چہروں پر نہیں ہوتی۔ غالباً شہباز بھی اس عمر میں ایسا ہی لگتا ہو گا۔ کبھی نیا سوچتی۔

نوکر چائے بنا کر سامنے تپائی پر رکھ گیا تھا۔

"سیپی!" نیا نے آواز دی۔ "تم نے ناشتہ کر لیا ڈارلنگ!"

"جی ممتا" اس نے لمبی سی انگڑائی لے کر وہیں سے جواب دیا۔

"اب کیا کرو گی؟"

"کیا کروں ممی!" وہ شکستی شکستی ماں کے پاس آگئی۔

"بیٹی! ذرا یہ کمرے ہی صاف کرا دو۔"

"صاف تو ہیں ممی۔" وہ بے زاری سے بولی۔ "مجھے آج ہیئر ڈریسر کے پاس بھی جانا ہے۔"

"یہ اپنی ٹراؤزر کے بٹن بند کرو۔" نیا نے آہستہ سے کہا۔

"اوہ ممی!" وہ جلدی جلدی بٹن بند کرنے لگی۔ "تیار تو ہو رہی ہوں۔"

وہ اپنے کمرے میں گئی اور پھر ہاتھ میں کنگھا لئے واپس آگئی۔ اپنے لمبے لمبے بالوں کو سلجھاتے ہوئے بولی۔

"ممی! میں ذرا گاڑی لے جاؤں؟ بس ہیئر ڈریسر کے ہاں جانا ہے۔"

نیا نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کے اس کی طرف دیکھا۔ دیر سے اٹھنے کی وجہ سے اس کے چہرے پہ ایک سوز تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی صورت کا سورج اس وقت نصف النہار پہ تھا مگر سیپ ان سب تبدیلیوں سے بے نیاز تھی۔ ماں کو یوں اپنی طرف تکتے پا کر بولی۔

"کیا ہوا ممی! میرے چہرے کو کیا ہوا ہے؟ کیوں اس طرح دیکھ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں؟ نیا نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دی۔

"اسی وقت سیپ جھک کر اس کے گلے لگ گئی اور اپنا رخسار نیا کے رخسار سے مس کرتے ہوئے بولی۔

"ممی! پتہ نہیں کبھی کبھی تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ بس پاگلوں کی طرح دیکھتی رہتی ہو اور منہ سے کچھ بھی نہیں کہتی ہو؟"

نیا نے اس کی پیشانی چوم لی۔

میری ماں کو بھی کبھی کبھی کچھ ہو جاتا تھا۔ تب وہ خلاف میں لپٹا تکیہ بن جاتی تھیں۔ مگر میں سے واشگاف الفاظ میں احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔ بلکہ خاموش انتقام لینے کا سوچتی تھی ہی دل میں سوچتی رہی۔

ممتا! گاڑی لے جاؤں؟" سیپ نے اس کی گود سے نکل کر چابیاں میز سے اٹھائیں۔

"لے جاؤ بیٹی مگر جب تم اکیلی گاڑی میں نکلتی ہو تو مجھے طرح طرح کے وہم ستاتے ہیں لئے میری یہ حالت ہو جاتی ہے۔"

"اوہ ممتا! آپ اتنی دقیانوسی ہیں۔ مجھ سے بھی چھوٹی لڑکیاں گاڑیاں دوڑاتی پھرتی ہیں۔ آپ مجھے اتنا چھوٹا کیوں سمجھتی ہیں؟ چار مہینے بعد میں پورے سولہ سال کی ہو جاؤں

نیا نے مسکرا کر دوسری پیالی بنائی اور ہاتھ میں پکڑ لی۔

اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے کا شوق ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے پل میں گزر جائیں۔ پھر ایک ایسی عمر آجاتی ہے جب دل چاہتا ہے کہ ماہ و سال کی رفتار جائے۔ دن ساکت ہو جائیں، عمر ہماری مرضی سے گزرے۔

"تمہارے پاس لائسنس نہیں ہے نا اس لئے مجھے ڈر لگتا ہے۔" نیا بولی۔

"ممتا! بھلا مجھے کون پکڑ سکتا ہے۔ سنتری جی کو چکمہ دے کر ہر بار نکل جاتی ہوں۔" یہ وقت سیپ نے ایک آنکھ بند کر لی۔

"اچھا تم! بائے۔" وہ چابیاں انگلی میں گھماتی ہوئی مڑی۔

"سیپی! جلدی آجانا بیٹا۔" نیا نے ذرا بلند آواز میں کہا۔

"تم روز ہی یہ فقرہ کہتی ہو ممی! حالانکہ میں اپنی مرضی سے آتی ہوں۔" پھر خود اونچی آواز بڑبڑانے لگی۔ "یہ ساری مائیں پاگل ہوتی ہیں ایک ہی فقرہ بار بار کہتی رہتی ہیں۔ شاید ان کا حافظہ ہوتا ہے۔ یا بھلکڑ ہوتی ہیں۔ توبہ ہے! اور وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے زور سے بولی۔

"آجاؤں گی ممی! آجاؤں گی فکر نہ کرنا" اور کود کود کر سیڑھیاں اترنے لگی۔

نیا نے مڑ کر سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔ وہ نیچے اتر چکی تھی۔ وہ سوچنے لگی: "پتہ نہیں... پتہ نہیں کون ہوگا جو تیرے سوچوں کے دفینے اور خیالوں کا خزانہ لوٹ کر لے جائیگا۔ تجھے کیا پتہ اس عمر میں آفتیں اردگرد منڈلایا کرتی ہیں۔ صورتیں دھوکا دے جاتی ہیں اور محبت بلا بن کر جھپٹ جاتی ہے۔" ابھی بیٹھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ اسے محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے بولی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"میڈم!"

"کیا بات ہے بولی؟"

"میڈم نیچے ایک آدمی آیا ہے۔"

"کون ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟"

"یہ تو اس نے نہیں بتایا۔"

"کتنی دیر ہوئی ہے اسے آتے ہوئے؟"

"جب سے آپ گھر سے گئی ہیں۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ میڈم ایک ضروری کام سے گئی ہیں۔ مگر اس نے کہا میں انتظار کرلوں گا۔ اب اس نے بے بی کو گاڑی میں جاتے دیکھا ہے تو مجھے اوپر پتہ کرنے بھیجا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چلو اور اس سے کہو میں آرہی ہوں۔" نیا نے جلدی جلدی چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنی لپ اسٹک گہری کرنے لگی۔

نیا نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بھرپور انداز میں اپنا جائزہ لیا۔ سر پہ بندھا ہوا ب اسکارف کھول دیا جسے موٹر چلاتے سے پہلے اس نے اس لئے باندھ لیا بال اڑ کر منہ پہ نہ آجائیں جو بڑی محنت اور خطیر رقم خرچ کر کے سیٹ کروائے تھے اور چاہتی تھی کہ دس بارہ دن نکل جائیں۔ اسکارف کھول کر بیٹھے ہوئے بالوں کو برش سے رگرا کر دیا، اپنے لباس کا جائزہ لیا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے ایک تو بیرونی سیڑھیاں بنوائی تھیں جو فلیٹ والوں کے مشترکہ استعمال میں تھیں اور دوسری سیڑھیاں اندر کی طرف بنوائی تھیں جو اس کی لابی سے ہو کر نیچے م کی لابی میں نکلتی تھیں۔

وہ اپنی انہی پرائیویٹ سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔ زینہ زینہ نیچے آتی ہوئی ر ہی تھی کون آیا ہوگا؟ یوں تو وہ ایک کاروباری عورت تھی اور دن میں سینکڑوں اس کی دکان پہ آیا کرتے تھے۔ کئی شوہر صاحبان شوقیہ ہی اپنی بیویوں کے گلے کا ہار دکان میں آتے تھے۔ ریڈی میڈ ملبوسات کو کم دیکھتے تھے سجی سجائی بیگمات کو زیادہ تھے۔ بعض اوقات تنہا مرد بھی خریداری کے لئے آتے تھے۔ نیا نے مردوں

کے آنے کا کبھی بُرا نہیں مانا تھا۔ دل میں سوچتی اور پھر ہنستی تھی کہ بازار میں دکان لگائے بیٹھی ہوں۔ گاہک کو روک نہیں سکتی، گاہک تو گاہک ہی ہوتا ہے۔ جس کی جیب میں پیسے ہوں اور جو ضرورت مند ہو وہ گاہک ہوتا ہے۔ ضرورت اور قوتِ خرید دونوں انسان کو گاہک بنا دیتی ہیں۔ ہاں اگر دکان کسی مشہور یا بدنام عورت نے کھولی ہو تو مارے تجسس کے مرد چلے آتے ہیں اور شوقِ دیدار میں جیب خالی کر جاتے ہیں۔ نیا کی اچھی خاصی شہرت پنڈی میں بھی ہو چلی تھی۔ جاتے ہوا چغل خور ہے یا فضا میں چھید ہیں کوئی بات رہتی نہیں خلا کے آنچل میں، دنیا والوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ جب نیا کی کہانی ذرا دھندلا گئی اور اس کا ذہن جینے کے قابل ہونے لگا تو وہ مستقل طور پر پنڈی میں مقیم ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے بارے میں کہانیاں بھی مشہور ہونے لگیں، جن میں جھوٹ زیادہ اور سچ کم تھا جو نے بھی سنا اس میں مزید مسالہ اور نمک مرچ لگا کے آگے پہنچا دیا۔ اصل حقیقت کا کسی کو علم نہ تھا۔ جس کا بھی دل چاہتا نیا کے ساتھ ایک کہانی جوڑ دیتا مگر نیا تائید، تردید یا احتجاج کچھ بھی تو نہیں کرتی تھی بس ضبط کا گھونٹ بھر کر رہ جاتی۔

جب جھوٹ اتنا زیادہ ہو تو مٹھار نے والا پاگل قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ تندہی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ ہاں اس کی پراسرار شخصیت سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ لوگ اس کے قریب آنے کے لئے بے قرار رہتے، اس سے دوستی رکھنا چاہتے، اپنے گھر بلاتے اور اس سے شناسائی رکھنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ اس لئے دیکھتے ہی دیکھتے نیا پنڈی اور اسلام آباد کے تمام اونچے اور معروف گھرانوں میں نظر آنے لگی۔ الٹرا ماڈرن اور فیشن ایبل طبقے میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ سرکاری اور نجی تقریبات کے کارڈ اس کے پاس آنے لگے اور نیا کے کاروبار کے لئے یہ پذیرائی مفید ثابت ہوئی۔ خاص خاص تقریبات میں وہ انتہائی نفیس اور اسٹائلش کپڑے پہن کر جاتی جس سے اس کی خوب پبلسٹی ہوتی۔ بہت سی بیگمات سے اس کے بڑے اچھے مراسم

تقریبات میں ان کے ہاں بھی جا چکی تھی۔ نیا اب پنڈی، اسلام آباد کی ایک جانی پہچانی شخصیت مانی جاتی تھی مگر ایسی پر سنیلیٹی جو ابھی تک راز میں تھی۔ دراصل کے سر پر اس کا تاج نہ ہو اس کے حصے میں بدنامیوں، رسوائیوں اور نت نئی ماتا ہوتا ہے مگر اب تو نیا ان باتوں کی عادی ہو چکی تھی اور بڑی ہمت البر کر رہی تھی۔

بار کے سلسلے میں مرد بھی اس سے ملنے آتے تھے۔ کئی ادارے اپنی خاص نوعات اس کے شو روم میں رکھنے کو بھیجتے تھے۔ کئی ادارے اس سے آرڈر تے تھے اور اس کو آرڈر دینے آتے تھے۔ پچھلے دو سالوں سے تو وہ فلم کمپنیوں کے لئے ملبوسات بھی تیار کر رہی تھی۔ اس لئے کسی مرد کا اس سے ملنے آنا یرت انگیز بھی نہیں تھا۔ مگر نہ جانے کیوں، جب بجو لی نے اس سے آ کر کہا ایک شخص ملنے آیا ہے اور مُصر ہے کہ مل کر ہی جائے گا تو نیا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا طرح جب کوئی نو وارد دوکان میں آتا تھا تو اس کا وسوسوں بھرا دل دھڑک اٹھتا ے کی گھنٹیاں بج اٹھتی تھیں۔ شہباز سے بچھڑے ہوتے کئی سال بیت گئے ن گزرے سالوں میں اس نے نیا سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ نیا کوئی کو ہاسٹل میں داخل کرایا تھا تو سرپرست کے خانے میں شہباز کا نام لکھوا سنا تھا شہباز دو چار بار ہی کبھی اس سے ملنے آیا تھا۔ البتہ پیسے برابر بھجوا دیا کرتا ے موتی کو لاہور بھجوا دیا تھا اور بطورِ خاص باپ سے ملنے کی تاکید بھی کر دی تھی اور یوں موتی اتنی گرمجوشی سے اپنے باپ سے نہ مل سکا دونوں کے درمیان ایک سا فاصلہ برقرار تھا گو وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے وہ جانتی تھی کے محبت کرنے کا انداز کیسا ہے؟ لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ جوان بچے پر کا ہاتھ یا باپ کا سایہ ضرور ہونا چاہیئے۔ اس لئے بار بار اسے وہ شہباز کے

گھر بھیج دیتی تھی اور نوازی، گو اس سے جدا ہوئے بھی اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا، نے کبھی پلٹ کر خبر بھی نہیں لی تھی۔ سنا تھا کہ وہ پاکستان کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں ایک خطرہ ننگی تلوار کی طرح ہمیشہ اس کے سر پر لٹکتا رہتا تھا۔ باپ ہو کے ناطے سیپ پر اب بھی اس کا حق تھا اور وہ جانتی تھی کہ کم ظرف مرد جب کسی کے منہ پر انتقام کا طمانچہ مارنا چاہتا ہے تو اس سے اس کی پلی پلائی اولاد چھین کر جاتا ہے۔ سیپ کی تو اس نے پرورش ہی اور طرح کی تھی اور اسے بتایا تک نہیں کا اصل باپ رازی ہے۔ کبھی کبھی وہ لرز اٹھتی اگر کبھی رازی یا اس کا کوئی کارندہ وارد ہو تو؟ دولت رازی کی کمزوری ہے اور یہ سن کر کہ نیا اب پھر خوشحال ہو گئی ہے اور میل کرنا چاہے تو؟ بچی کو اٹھا لے جانا چاہے تو کیا ہو گا؟

شہر میں اس کی بدنامیاں بڑھیں گی۔

گڑے مردے اکھاڑے جائیں گے۔

اخبار والوں کو کالم مل جائیں گے۔

اور جانے کیا کیا ہو گا؟ یہ سب سوچتے سوچتے نیا نیچے اتر کر شوروم میں سامنے ہی کرسی پر ایک گورا چٹا، صاف ستھرا مگر چھوٹی آنکھوں اور سنہر والا ایک آدمی بیٹھا تھا جو نیا کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا، مسکرایا اور پھر سر کو ذرا سی جنبش جیسے کورنش بجا لایا ہو۔ نیا نے بھی سر کو جنبش دینے پر ہی اکتفا کیا اور چلتی ہوئی سامنے کاؤنٹر پر پہنچ گئی۔ اب وہ نیا کے سامنے کھڑا یوں مسکرا رہا تھا جیسے کوئی اس سمیت اس کا اسٹیچو بنا رہا ہو۔

نیا غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی آدمی غیر ملکی لگتا تھا۔ یہ غیر ملکی گورے سے ایک جیسے لگتے ہیں۔ پہلی نظر میں پتہ نہیں لگتا کہ کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں تعجب کی بات نہیں تھی کہ ایک غیر ملکی اس کی دکان میں آیا تھا، اکثر غیر ملکی یہاں

نیا نے اپنے شوروم میں پاکستان کے چاروں صوبوں کی دست کاری اور مصنوعات تھیں جنہیں غیر ملکی بہت شوق سے خریدا کرتے تھے بلکہ اس کی دکان "ٹورسٹ" نام سے بھی مشہور تھی۔ اس نے سوچا یہ بھی خریداری کے لئے آیا ہو گا۔ پاکستانی اپنے دیس لے جانا چاہتا ہو گا یا کسی نئے لباس کا آرڈر دینے آیا ہو گا۔

"آیئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" نیا نے بڑی شستہ انگریزی

دکان گورے لوگوں کو دیکھ کر جو زبان اندر سے پھوٹتی ہے وہ انگریزی ہی دیکھ کر اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس نے بڑی شائستہ اردو میں

کی خوش اخلاقی کا بڑا شہرہ تھا۔ واقعی جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔"

پ....؟" نیا مارے حیرت کے ششدر رہ گئی۔

ا" وہ بڑے سکون سے بولا۔ "میں اردو بول سکتا ہوں اور تھوڑی بہت پنجابی

اردو تو کئی غیر ملکی سیکھ لیتے ہیں مگر پنجابی لب و لہجہ ایک غیر ملکی کے لئے واقعی کمال ہے۔"

بات مشکل نہیں ہے اگر آدمی سیکھنے کا تہیہ کر لے۔"

یہ تو آپ نے سچ کہا۔" پھر وہ بڑے ادب سے بولا۔

میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟"

ضرور!" نیا کو وہ آدمی دلچسپ بھی لگا اور کام کا بھی اس لئے کاؤنٹر سے

اس طرف تشریف لے آئیں اور اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں۔"

روم کے ایک کونے میں وہ ایک کیبن کو بطور ڈریسنگ روم استعمال کرتی تھی جس

میں ڈرائنگ روم کے لوازمات موجود تھے۔ جب نیّا کو کسی سے ذاتی گفتگو کرنی ہوتی وہ پردہ آگے کھینچ دیا کرتی تھی۔ آج اس نے پردہ نہیں کھینچا مگر اجنبی کو یہاں لا بٹھایا پھر جولی کو آواز دے کر بولی۔

"جولی! پلیز ذرا اندر چائے بھجوا دینا۔"

اس اجنبی نے بیٹھتے ہی ولایتی سگریٹوں کی ڈبیا اور ایک گولڈن لائٹر نکالا۔ ایک سگریٹ کا سرا ڈبیا سے باہر نکال کے اس نے نیّا کو آفر کیا۔ نیّا نے شکریہ کہہ کر وہ سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا اور سوچنے لگی کہ اس کو کس نے بتایا ہے کہ میں سگریٹ پیتی ہوں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اجنبی نے آگے بڑھ کر لائٹر جلا کر اس کے سگریٹ کو دکھایا پھر اپنا سگریٹ سلگانے لگا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ یہ شخص خود ہی گفتگو کا آغاز کرے۔ نیّا کاروباری عورت تھی۔ کاروباری معاملوں میں نہ تو پہل کرتی اور نہ جلد بازی کرتی۔ اتنے میں چائے بنا کر لے آئی اور انہیں ایک ایک پیالی دے کر واپس چلی گئی۔ چائے کی ایک چسکی لے کر اجنبی بولا۔

"پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام کوزک ہے۔ میں ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتا ہوں۔" کوزک! نیّا نے اس نام کو کئی بار ذہن میں دہرایا اور اندازا کرنے لگی کہ یہ کس ملک کے باشندے کا نام ہو سکتا ہے۔ مگر وہ کوئی اندازا نہ لگا سکی عجیب سا نام تھا۔ خیر اس نام سے کیا غرض! اسے تو کام سے مطلب ہے۔

"میں نے سمجھا تھا آپ کا تعلق کسی سفارت خانے سے ہے۔" نیّا نے کہا۔

"نہیں۔" وہ انکسار سے بولا۔ "اصل میں میرا کوئی خاص کام نہیں ہے۔ مگر بہت ایسے کام ہوتے ہیں جو میرے جیسے انسان سرانجام دیتے ہیں۔" نیّا کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا بس اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"کچھ کام سرکاری سطح پر کئے جاتے ہیں۔" وہ دوبارہ گویا ہوا۔ "کچھ کام ہیں نوع انسان

کے ناطے کئے جاتے ہیں اور کچھ کام اقتصادی اور معاشی رابطوں کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ترقی پسند دنیا میں رابطے بہت کام آتے ہیں۔"

"جی ہاں۔" نیّا نے بڑی سنجیدگی سے کچھ سمجھے بغیر کہا۔

"میں انہی رابطوں کی بات آپ سے کرنے آیا ہوں۔"

"یقین کیجئے۔" نیّا نے برجستہ کہا۔ "ابھی تک آپ کی کوئی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اصل میں اتنی ذہین نہیں کہ عنوان سے مضمون بھانپ لوں۔"

"اوہ۔" وہ بھی ہنسا۔ "آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہی ہیں۔ جبکہ اس شہر میں آپ کی کامیابی کے ڈنکے بج رہے ہیں۔"

"جھوٹ ہے۔ آپ مصلحتاً ایسا کہہ رہے ہیں۔" اس پر وہ مسکرا کر بولا۔

"آپ واقعی بہادر عورت ہیں۔ آپ دوٹوک بات کر لیتی ہیں۔ کسی عورت میں اس خوبی کا ہونا بڑی بات ہے۔" اس وقت نیّا کو اپنی تعریف اچھی نہیں لگی۔ اس لئے وہ چپ رہی۔ نیّا کو چپ دیکھ کر وہ بولا۔

"آپ کو معلوم ہے اس علاقے میں آپ کی دوکان سب سے زیادہ مشہور ہے؟"

"اچھا۔" نیّا نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"آپ نے جب بھی کسی حلقے میں جا کر خرید و فروخت کی بات کی انہوں نے نایاب چیز ہی حوالہ دیا۔ آج سوسائٹی کی ہر عورت آپ کی دوکان سے خریدے ہوئے کپڑے پہننا فخر سمجھتی ہے۔"

"سب اللہ کی مہربانی ہے۔" نیّا نے عادتاً کہا۔

"سب آپ کی ذہانت ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو نیّا ایک دم چونک اٹھی۔ اسے یاد آیا کہ یہ لوگ اپنے معاملات میں اللہ کو نہیں لایا کرتے۔ صاف بار

"ہمارے اپنے معاملے ہیں خدا کو کیوں درمیان میں لائیں۔" خدا کو اپنے معاملات میں لانے کی رسم ایشیائی ملکوں خصوصاً پاکستان میں سب سے زیادہ ہے۔ پھر کیا کریں؟ آخر اپنی کوتاہیوں کا ذمے دار کسی کو تو ٹھہرانا پڑتا ہی ہے اگر ہر گڑبڑ اور کوتاہی کا ذمے دار خدا ٹھیرانے کا رواج نہ ہوتا تو پھر ہر شخص اپنے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا ہوتا۔ نیا کو الجھن سی رہی تھی۔ اجنبی کھل کر بات جو نہیں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر خود ہی بولا۔

"میں سرکاری طور پر متعین نہیں کیا گیا ہوں مگر میں اپنے ملک کے کمرشل انٹرسٹ کے لئے ملک ملک پھرتا ہوں یا یوں کہہ لیجئے کہ اپنے ملک کے اقتصادی و تجارتی معاملات پر میری کڑی نظر ہوتی ہے۔ اس کے لئے مجھے جہاں رہ کر جو بھی کرنا پڑے میں کرتا ہوں ویسے اب تک تو زیادہ تر ایشیائی ملکوں میں ہی رہا ہوں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے اردو بڑی اچھی طرح جان گیا ہوں، بول اور پڑھ لیتا ہوں۔ بلکہ دو چار جملے لکھ بھی لیتا ہوں"

"سچ کہیئے بس یہی ایک فائدہ ہوا ہے؟" نیا نے ذو معنی انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر پڑا اور بولا۔

سفر میں فائدے اور نقصانات تو ہوتے ہی ہیں۔ میں نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ اللہ کے فضل سے ہمیشہ اور ہر جگہ کامیاب رہا ہوں۔"

"مگر یہ بیچ میں آپ نے اللہ کا نام کیوں لیا؟" نیا نے اسے ایک دم ٹوکا تو وہ

"یہ تو آپ کے ملک کا محاورہ ہے اور میں بامحاورہ گفتگو کرتا ہوں۔"

"میرے پاس آپ کس غرض سے تشریف لاتے ہیں؟" بالآخر نیا نے پوچھ ہی

"وہی کاروبار۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لال بھبوکا چہرے پر ایک شوخ چمک اور شرارت بھری مسکراہٹ ابھری۔ "میں تو کاروباری آدمی ہوں۔ نفع اور نقصان کرتا ہوں۔ نفع زیادہ اور نقصان کم میرا مسلک ہے۔ آپ ایک کاروباری خاتون ہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مفاد کا باعث بن جائیں۔"

دیکھئے مسٹر۔۔۔" نیا رک گئی۔

ٹرک! میرے دوست مذاق میں مجھے کوک کہتے ہیں۔"

ں تو مسٹر کوک! میں ایک کاروباری عورت ضرور ہوں مگر ان معنوں میں نہیں جن میں رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے مرد کا کاروباری فلسفہ عورت سے کچھ مختلف ہو۔ اسی طرح ہر کاروباری نقطۂ نظر مختلف ہوتا ہے۔ آپ کے ہاں کاروبار کی ایک دوڑ لگی ہوتی ہے ل ڈالر، پونڈ، فرانک اور مارک کے پیچھے پاگلوں کی طرح بھاگ رہے ہیں۔ مگر ڈالر میری نہیں ہے نہ ہی مجھے پیسے کی ہوس ہے میں کاروبار اس لئے کرتی ہوں کہ اس کے کوئی چارہ نہیں۔ میرے دو بچے ہیں اور میں ہی ان کی کفیل ہوں۔ میں اپنے بچوں کی نہیں باپ بھی ہوں، میں نے زندگی سے بھیک مانگنا نہیں سیکھا۔ محنت کرنا اور سکون سے سونا سیکھا ہے۔ میں صرف اتنا ہی کمانا چاہتی ہوں جس سے میری اور بچوں کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور اتنا ہی کمانے کی مجھ میں ہمت بھی ہے۔ راتوں رات رکس ملین ڈالر وومن نہیں بننا چاہتی۔ بس عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنا چاہتی میرا خیال ہے آدمی کو اتنا ہی کمانا چاہیئے جتنا اس کے دست و بازو اجازت دیتے بشرطیکہ وہ صحت و سلامتی سے کما سکے۔" اجنبی اس کی باتوں سے بہت متاثر نظر آ تھوڑی دیر بیٹھا سوچتا رہا پھر رک رک کر بولا۔

آپ مشرقی لوگوں میں اتنا ٹھیراؤ کیسے آجاتا ہے؟ اور آپ کے اندر اتنا اطمینان ہے؟ آپ اتنے سکون سے باتیں کر رہی ہیں۔ جیسے آپ کے آگے دنیا کی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ سب کیسے ہو جاتا ہے؟ کیا اس لئے کہ آپ ایک خدا رکھتے ہیں اور آپ کا یقین مستحکم اور غیر متزلزل ہوتا ہے۔" نیا مسکرائی۔

ہی درست ہے۔ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی بتائی ہوئی اور بہت سی باتوں راہ بنا لیتے ہیں، انہی میں سے ایک قناعت بھی ہے۔ آپ جانتے ہیں قناعت

کیا ہوتی ہے ؟"

"کچھ کچھ" وہ کھسیانا ہو کر بولا۔

"میں آپ کو سمجھاؤں گی کبھی"

"اتنا بھی نہ سمجھایئے گا کہ میں مسلمان ہو جاؤں" یہ سُن کر نیّا نے ایک عجیب انداز سے اس کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا خیال بُرا نہیں ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنے آپ پر بھروسہ نہیں اور اپنے مذہب پر یقین کامل نہیں"

"اجی ہمارے ہاں مذہب کو کون پوچھتا ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہر انسان اپنا خدا آپ ہے"

"پھر کیوں خدشہ ہے آپ کے دل میں؟"

"آپ کے لب ولہجہ میں اتنا اعتماد اور اتنی CONVICTION ہے کہ میں کانپ گیا ہوں۔ یہ سب کہاں سے سیکھا آپ نے؟"

"میری عمر میں یہ سب کچھ آپ ہی آ جاتا ہے" نیّا نے کہا۔

"عمر تو میری بھی چالیس سال ہے" وہ بولا "مگر میں زندگی کے بارے میں اس طرح بات نہیں کر سکتا"

نیّا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ ہرگز چالیس سال کا نہیں لگ رہا تھا۔ پہلی نظر میں نیّا نے اسے پینتیس برس کا جوان سمجھا تھا ایک تو حد سے زیادہ گورے اور حد سے زیادہ کالے لوگوں کے چہروں سے ان کی عمروں کا پتہ نہیں چلتا اور پھر یہ غیر ملکی لوگ زیادہ چاق وچوبند اور مستعد ہوتے ہیں کہ اپنی جوانی کو طول دے لیتے ہیں، خوب محنت کرتے ہیں شاید اسی لئے ان کے اعضا ڈھیلے نہیں پڑتے اور نہ ادھر ادھر سے گوشت ڈھلکتا ہے۔

"میں آپ کے پاس آ کر بیٹھا کروں گا تاکہ آپ مجھے زندگی کے اسرار و رموز بتایا

کریں" وہ انکسار سے بولا۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں کاروباری عورت ہوں، میرے پاس اتنی فرصت نہیں ہوتی"

"کبھی کبھی" وہ بولا "آپ کی اجازت سے، آپ کا کیا جائیگا اگر کسی بھٹکے ہوئے کو راستے پر لگا دیں گی"

"ٹھیک ہے" اس وقت نیّا نے مصلحتاً ہامی بھر لی۔

"مگر آپ نے اپنی بات تو ابھی تک مکمل نہیں کی۔ ہم لوگوں کی طرح آپ بھی اپنے موضوع سے بھٹک جاتے ہیں"

"واقعی" وہ ہنسا "اصل میں آپ اتنی دلچسپ گفتگو کرتی ہیں کہ میں صرف کاروباری گفتگو کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف سمجھتا ہوں"

"نوازش ہے آپ کی" نیّا نے آہستہ سے کہا۔

"بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک عظیم الشان عالمی نمائش لگنے والی ہے اس کے لئے میں مختلف ملکوں کی مصنوعات اکٹھی کر رہا ہوں اور اسی سلسلے میں آپ کے پاس بھی آیا ہوں۔ پاکستانی مصنوعات اور دست کاری کے نادر نمونے اکٹھے کرنے کا قرعہ میرے نام نکلا ہے۔" پھر وہ جلدی سے بولا "دراصل تقریباً چھ سالوں سے میں پاکستان آ جا رہا ہوں اور اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہوں اس لئے بھی مجھے یہاں بھیجا گیا ہے"

"ٹھیک ہے" نیّا بولی۔ "آپ مجھے ایک لسٹ بنا دیجئے کہ آپ کو کون کون سی اشیاء کتنی تعداد میں اور کتنے عرصے میں درکار ہیں۔ اگر ہمیں مناسب وقت مل گیا تو ضرور آپ کی مدد کریں گے"

"حقیقت میں یہ نمائش اگلے سال جنوری میں منعقد ہوگی مگر ہم لوگ ایک سال پیشتر

سے تیاری کر رہے ہیں اور ہم آپ کو مناسب وقت دیں گے۔"

"ہم انشاءاللہ آپ کا کام کریں گے۔"

"شکریہ!" وہ کھڑا ہو گیا۔ ساتھ ہی نیا بھی کھڑی ہو گئی۔

"اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے رُک کر بولا۔ "اگر آپ اپنی مصنوعات کے بدلے وہاں کی مصنوعات منگوانا چاہیں تو یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے اور اگر ان مصنوعات کے ساتھ آپ ہمارے ملک میں خود جانا چاہیں تو آپ کو آنے جانے کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ بھی مل سکتا ہے بلکہ ہمارا ادارہ آپ کو دنیا کی سیر بھی کراتے گا۔"

"مہربانی آپ کی۔" نیا جلدی سے بولی۔ "میں نے امریکہ اور یورپ کے کئی ممالک دیکھ رکھے ہیں، پچھلے سال میں جرمنی گئی تھی۔"

"اچھا اچھا۔"

"یہی ایکسپورٹ کے سلسلے میں میری ایک سہیلی نے وہاں اسٹور کھولا ہے اور میں اسے پاکستانی ملبوسات اور پاکستانی قالین بھیجا کرتی ہوں۔ اس نے ٹکٹ بھیج کر بلوایا تھا ویسے میرے لئے غیر ممالک میں کوئی دلکشی نہیں۔ اپنے ملک کی تجارت و مصنوعات کو فروغ دینا ہو تو اور بات ہے۔ یوں منہ اٹھا کر چل دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بہرحال۔" نیا نے سوچا کہ اس نے کچھ بے رخی سے ذرا سخت بات کہہ دی ہے اس لئے فوراً بات بدل کر بولی۔ "اگر آپ کے کاروبار کی نوعیت ایسی ہوئی کہ جانا ضروری ہو گیا تو ٹھیک ورنہ ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے کام بھی آسکتے ہیں یا نہیں؟"

اسی لمحے میں خواتین کا ایک غول دکان کے اندر داخل ہوا جسے نیا اور کوزک نے شیشے کے باہر ہی دیکھ لیا تھا۔ کوزک نے نیا سے جانے کی اجازت مانگی۔

"میں پھر حاضر ہوں گا۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"یو آر ویلکم سر!" نیا نے بھی شائستگی سے کہا۔ جونہی کوزک دکان پر سرسری نظر

ڈال کر باہر نکلا۔ جانے کیوں نیا کو ماؤزے تنگ کے آخری دنوں میں کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے۔

"چیزیں وہ نہیں جو دیکھنے میں نظر آتی ہیں، بظاہر جو کچھ دیکھنے میں نظر آتا ہے حقیقت میں وہ نہیں ہوتا۔"

رات کو نیا بیٹھی کوثر کے ساتھ اس عجیب و غریب ملاقات کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ موتی اس کے کمرے میں آگیا۔ آج کل موتی اور سیپ سردیوں کی چھٹیوں میں گھر آئے ہوتے تھے صبح ناشتہ کر کے موتی اپنے دوستوں کے ساتھ باہر نکل جاتا اور شام کو واپس آتا۔ نیا یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی کہ وہ کہاں اور کیوں جاتا ہے؟ جوان بچوں کی جبلتوں کو وہ تسلیم کرتی تھی اور روک ٹوک کرنے والی ماں نہیں بننا چاہتی تھی مگر اسے موتی کے چہرے پہ کبھی روحانی خوشی کی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔

"کیا بات ہے موتی؟" نیا ذرا ٹھیک ہو کر بیٹھ گئی۔ لمبا سا موتی جھومتا جھامتا بل کھاتا آ کے نیا کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گیا۔ موتی بہت زیادہ مطالبات نہیں کرتا تھا۔ اس لئے نیا سے کبھی کبھار ہی تفصیلی بات ہوتی تھی۔

"ہاں تو کیسے مزاج ہیں ہمارے ہیرو بیٹے کے؟" نیا نے موتی کی جھکی ہوئی کمر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ "بل گیا فلموں میں کوئی چانس؟"

موتی نے شرما کے نظریں جھکا لیں اور ناگواری سے سر ہلایا

"ارے ہمارا اتنا خوبرو بیٹا سڑکوں پہ گھومتا ہے اور ابھی تک کسی کی نظر میں ہی نہیں
ا، کیا ہو گیا ہے لوگوں کے ذوقِ انتخاب کو؟" موتی نے ماں کے اس مذاق کو پسند
کیا اس لئے جھلاتے ہوتے لہجے میں بولا۔

"ممی! آپ نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"بیٹا ابھی تم اپنی تعلیم مکمل کر لو، پہلے تمہارا ایم کام کرنا بہت ضروری ہے اس کے
سوچیں گے۔"

"نہیں ممی!" وہ منہ پھلاتے ہوتے بولا۔ "میں یہاں نہیں پڑھ سکتا۔"

"یہاں سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"ممی میں پاکستان میں نہیں رہنا چاہتا۔"

"کیوں بیٹا؟"

"بس ممی۔"

"بس ممی تو کوئی جواب نہ ہوا۔"

"کوئی ٹھوس وجہ تو بیان کرو، آخر تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟"

"ممی میں یہاں نہیں پڑھ سکتا۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"ہزاروں لاکھوں لڑکے یہاں پڑھتے ہیں اور یہیں پہ کچھ بن جاتے ہیں، ہے نا؟"

"ہاں مگر میں یہاں رہ کر کچھ بھی نہیں بن سکتا۔"

"کیا یہاں تم پہ ناجائز پابندیاں ہیں؟ تمہارے مطالبات نہیں مانے جاتے تم سے
بحث نہیں کی جاتی آخر کچھ تو بتاؤ موتی؟"

"ممی!" موتی کو غصہ آگیا وہ رک رک کر بولا۔ "ممی! آپ ہر بات کی وجہ نہ پوچھا کریں، بس
مجھے یہاں کا ماحول یہاں کے لوگ پسند نہیں ہیں۔"

"کیا برائی ہے یہاں کے ماحول میں؟ اور کیا دکھ دیا ہے تمہیں یہاں کے لوگوں نے؟

یہ تمہارا اپنا ملک ہے۔ یہاں تم پیدا ہوتے ہو اور آخر کار تمہیں یہیں رہنا ہے۔"

"پیدا ہونا تو ایک اتفاقیہ امر ہے ممی! کوئی کسی بھی سرزمین پر پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر رہنے کی چوائس اپنی ہونی چاہیئے۔ کوئی جنت میں رہے یا جہنم میں آپ کو اس سے کیا۔؟"

"کیا کہہ رہے ہو موتی؟ مجھے اس سے کیا۔؟ سوچو تم مجھ سے یہ کہہ رہے ہو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارے ساتھ میری زندگی کی ہر سانس وابستہ ہے۔ میں تمہارے لئے جیتی ہوں۔ تمہارے لئے مرتی ہوں۔ تم دونوں کے سوا میرا اور کون ہے۔؟"

"اوہ نہ۔" موتی نے غصے میں کندھے اچکائے۔ "آپ کو اپنی دلچسپیوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔"

"موتی۔" نیا جیسے چونک پڑی۔ "بیٹا کیا ہیں میری دلچسپیاں۔؟"

"بس ممی۔ آپ کا کاروبار ہے۔ دوست احباب ہیں۔ دعوتیں، پارٹیاں ہیں۔ آپ اپنی زندگی میں مگن ہیں۔ آپ ہمیں اپنی زندگی شروع کرنے دیں۔" تھوڑی دیر کے لئے نیا سن ہو گئی۔ اسے ایسے لگا جیسے اس کے دل میں کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔ گم صم بیٹھی اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے کھیلتی رہی پھر سر اٹھا کر آنسوؤں بھری گیلی گیلی آواز میں بولی۔

"بیٹا یہ میں کاروبار کس لئے کرتی ہوں۔ تمہی لوگوں کو اچھی زندگی اور اچھی تعلیم دینے کے لئے۔"

"ممی۔ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ اچھی زندگی اور اچھی تعلیم خود حاصل کروں۔"

نیا سوگواری سے ہنس پڑی۔

"ابھی تم اس قابل نہیں ہوئے موتی۔ جب اس قابل ہو جاؤ گے میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں گی۔"

ممی۔ مائیں تو ہمیشہ بچوں کو چھوٹا ہی سمجھتی ہیں اور یہ ان کی خود غرضی ہوتی ہے۔"

خود غرضی۔" نیا کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہو۔ لیکن پھر بھی ہمت کر کے بولی۔

"کیسے تمہیں دور کرنے کا حوصلہ کروں۔؟ دو ہی تو میرے بچے ہیں اور انہی کی خاطر میں جی رہی ہوں۔"

"ممی اب بھی میں کونسا آپ کے پاس رہتا ہوں۔ ہمیشہ سے تو مجھے ہوسٹلوں میں رکھا ہوا ہے آپ نے۔؟ پھر آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"سچ ہے۔" نیا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور موتی کا روٹھا روٹھا چہرہ دیکھا۔ ماں آنکھیں بچے کے چہرے میں سب کچھ دیکھ لیتی ہیں مگر افسوس کہ بچہ اس بصارت سے محروم ہوتا ہے۔ جس میں اسے ماں کی اصلیت نظر آتے۔ یہ بھی ایک ظالم قانونِ قدرت ہے۔ شاید اس لئے کہ دنیا کے پہلے باپ اور پہلی ماں کے اپنے والدین نہ تھے۔ آدم و حوا کو بھلا معلوم کہ والدین کیا ہوتے ہیں۔ کسی بھی اولاد کو پتہ نہیں چل سکتا کہ والدین کیا ہوتے ہیں جب تک جیتے ہیں بے مصرف اور فضول لگتے ہیں۔ مر جاتے ہیں تو اتنا بڑا سا خلا چھوڑ جاتے ہیں۔

نیا کو یکایک امی جان اور ابا جی یاد آ گئے۔ وہ بھی اسی طرح امی جان سے الجھ پڑا تھا۔ امی جان کو بھی یونہی دکھ ہوا کرتا ہو گا۔ کتنے مزے سے آج موتی تعلق کے ہر رشتے کا مذاق اڑا رہا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو کیسے بتا سکے گی کہ اس نے ان کے لئے کیا کیا اور بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہر والدین نے یہ رسم موت پر چھوڑی ہے تو وہ اپنا لب کھولے۔

اس نے نظر اٹھا کر اپنی آنسو بھری آنکھیں موتی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ موتی کا چہرہ اس وقت اسے ہمیشہ دکھ ہوتا تھا۔ موتی کا چہرہ ایسے نہیں تھا جیسے اس عمر میں نوجوان

لڑکوں کا ہوتا ہے۔ ہمیشہ اس کے چہرے پر ایسا تاثر ہوتا جیسے روٹھ چکا ہے۔

مگر کس سے۔ نیا کو آج تک سمجھ نہیں آتی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نیا سے کبھی نہیں روٹھا تھا۔ نہ ضد کی تھی۔ نہ مار کھائی تھی۔ نہ کسی بات کا برا مان کر اظہار ہی کیا تھا۔ نہ کبھی نیا کے رہن سہن پہ احتجاج کیا تھا۔ نیا چاہتی تھی کبھی کبھی وہ ضد کر کے روٹھ جاتے اور نیا ہاتھ جوڑ کر اسے مناتی پھرے مگر اس نے مچلنا اور روٹھنا تب ہی چھوڑ دیا تھا جب نیا نے رازی کے ساتھ بیاہ کیا تھا۔ اس کے گم صم ہوتے ہی نیا نے دنیا بھر کی چیزیں اور آسائشیں اس کے لئے جمع کرنی شروع کر دی تھیں۔ بن مانگے ہر شے مہیا کرتی۔ کپڑے بنوا کے دیتی۔ ضرورت سے زائد پیسے بھجوا دیتی۔ اس نے کہا مجھے اسکوٹر چاہیئے تو جھٹ اپنی ہر ضرورت روک کر اسکوٹر لے دیا۔ نیا نے اسے بہت دفعہ تاکید کی تھی کہ وہ لاہور میں اپنے باپ سے ملا کرے۔ مگر وہ کہتا تھا مجھے بھکاری بننا پسند نہیں۔ پتہ نہیں وہ ایسا کیوں کہتا تھا۔ ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اپنے قول و فعل میں بالکل آزاد تھا۔ کوئی پوچھ گچھ نہیں تھی مگر پھر بھی جانے کیوں کرب کی ایک موہوم سی لکیر اس کے چہرے پر آ کر ٹھیر گئی تھی۔

"میرے بچے۔" نیا نے کلیجے پہ ہاتھ رکھ کے سوچا۔ "میں نے تمہارے ساتھ نہ کوئی ظلم کیا اور نہ ناانصافی پھر بھی تقدیر نے جو کچھ میرے ساتھ کیا اس کی ہلکی سی پرچھائیں تیرے چہرے پر کیوں رہے۔؟ کتنا تکلیف دہ ہے یہ احساس کہ آپ کا بچہ آپ سے نفرت کرتا ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو۔ یہ موتی کا صرف لاابالی پن ہو۔ پچھلے ایک سال سے موتی تقاضا کر رہا تھا کہ اسے امریکہ بھیج دیا جائے۔ کچھ تو اس لئے بھی کہ اس کے کئی دوست امریکہ چلے گئے تھے۔ مگر نیا چاہتی تھی وہ ایم کام کرے پھر اے سی ایس کا کورس پاس کرنے کے لئے چند سالوں کے لئے بھیج دے گی پھر ابھی اس کے حالات بھیجنے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔ کچی عمر میں وہ اسے بھیجنا نہیں چاہتی تھی سوچتی

بچہ وہیں کا ہو کر رہ جائے۔ اس عمر میں فضولیات انسان کو زیادہ لبھا لیتی ہیں
یت دیکھتی رہی اور وہ سر جھکاتے غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بالآخر بولا۔
آپ نے اجازت نہ دی تو میں خود ہی چلا جاؤں گا۔"
بھاگ کر جانا بہت آسان ہے نا؟" نیا نے ہنس کر پوچھا۔ "اچھا یہ تو بتاتے
بھاگ کر جانا چاہتے ہو یا ملک سے۔؟"
بھی دوں تو آپ کو اس کا کیا فائدہ ہوگا۔؟"
یہ ہوگا کہ میں اپنے سینے پہ پتھر رکھ لوں گی۔"
نی یہ سب محاورے ہیں۔ پتہ نہیں مائیں اتنی بزدل کیوں ہوتی ہیں؟"
سب قصور مامتا کا ہے اگر عورت میں مامتا نہ ہوتی تو دنیا میں عورت کمزور

تو پڑھی لکھی اتنی ماڈرن خاتون ہیں۔ آپ تو ایسی دقیانوسی باتیں نہ کریں۔" نیا
بیٹا ماں کسی بھی دور کی ہو۔ ماں ہمیشہ دقیانوس ہی ہوتی ہے۔"
یہاں دل نہیں لگتا اور یہ ماحول مجھے پسند نہیں۔" موتی نے زچ ہو کر کہا۔
نہیں یقین ہے کہ وہاں تمہارا دل لگ جائے گا۔ وہ ماحول تمہیں پسند آجائیگا۔"
وہاں۔۔۔۔ وہاں انسان ماں باپ کے حوالے سے نہیں پہچانا
خود اپنی شناخت ہے ممی۔ نیا کے دل میں دھکا سا لگا۔ موتی کو اپنی ماں
سے جانے جانا پسند نہیں تھا۔ موتی اپنی ماں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ پھر
ئے ہوئے دل کو جوڑ کر بولی۔
یقین ہے تمہارا دل وہاں بھی نہیں لگے گا۔ وہاں اجنبیوں کی کوئی شناخت
اور شناخت کے بغیر انسان سمندر میں قطرے کے برابر ہے۔ ہماری نوجوان
ملک میں رہنا چاہیئے۔"

"یہاں کیا ہے ممی۔ ؟" موتی نے چڑ کر کہا۔

"یہاں کیا نہیں ہے بیٹا۔ ؟ جو لوگ اپنے ملک میں نام نہیں پیدا کر سکتے
دوسرے ملک میں بھی کوئی باعزت مقام حاصل نہیں کر سکتے یہاں بھی محنت
کا صلہ ملتا ہے۔ یہاں بھی مواقع ملتے ہیں۔ اس ملک کو بھی ہونہار جوانوں کی ضرورت
جو اپنے ملک میں کھوٹا سکہ ہو۔ وہ باہر بھی کھوٹا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اتنے لوگ
گئے ہیں کیا کر رہے ہیں۔ سوائے اس کے کہ ڈالر سمیٹ رہے ہیں۔"

"بس بس۔ آپ رہنے دیں ممی مجھے معلوم ہے آپ مجھے نہیں جانے
اسی طرح عذر کر کے بیٹھی رہیں گی۔ میں نے اپنا پاسپورٹ بنوالیا ہے۔ ویزا
گا۔ وہاں سے میرا ایک دوست مجھے اسپانسر کر رہا ہے۔ کسی دن بغیر بتائے
دوں گا۔ پھر نہ رونا۔"

"نہیں۔" نیتا گھبرا کر بولی۔

"یوں نہ جانا میری جان! تمہاری ماں مر جائے گی۔" اس بات پر موتی استہزائیہ
ہنسا مگر نیتا نے اس کی ہنسی کی پروا کئے بغیر کہا۔

"میں خود تمہارا بندوبست کر دوں گی۔ وہ ملک جتنے خوبصورت نظر آتے
ہی سفاک بھی ہیں۔ وہاں ڈالر کی حکمرانی ہے۔ دوستیاں اور رشتے داریاں
ہو جاتی ہیں۔ کسی پر بھروسہ کر کے ذلیل و خوار نہ ہونا۔ وہاں تو مطلب کے بغیر
ایک دن کا کھانا بھی نہیں کھلا سکتے۔ سگے والدین کو اٹھا کر گلی میں کھڑا کر دیتے
اگر تم جانے پر بضد ہو تو عزت و آبرو سے جانا۔ جب تک تمہیں کوئی جاب
پاس گھر کے کرائے اور کھانے کے لئے کچھ پیسے ہونے چاہئیں۔ کسی یونیورسٹ
لینا ہو تو یہیں سے کاغذات بھجوا کے داخلے کا بندوبست کر کے جاؤ۔ وہاں
ہوتے پھٹکنے اور جاب ڈھونڈنے میں اپنی صحت تباہ کر لو گے تو تعلیم کیا

تمام باتوں کے باوجود ہر وقت واپسی کا ٹکٹ تمہاری جیب میں ہونا چاہیئے
لئے فارن ایکس چینج کا بندوبست کر دوں گی تاکہ تمہارے نام پر وہاں کچھ رقم
میں نے وہاں لوگوں کو در بدر کی خاک چھانتے دیکھا ہے اس لئے آنکھیں
نہیں بھیج سکتی۔ سن لیا تم نے موتی۔ ؟"

۔" موتی نے آہستہ سے کہا۔

ہی چاہتے ہو تو تمہاری یہ خواہش میں ضرور پوری کروں گی۔ تمہاری ہر تمنا پوری
ہے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ میری ماں میں کتنا حوصلہ ہے۔ میں تمہیں اسی شان
ں شان سے تمہیں پالا پوسا ہے۔ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے موتی۔" نیتا کی
ئی کہ "تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے دور بھیج سکوں، میں وعدہ کرتی ہوں،
ے پر تمہیں اعتبار ہے۔"

۔" موتی نے پہلے سے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

طمینان ہو گیا بیٹے۔ ؟"

" اس نے اسی انداز میں کہا۔

انتظار کرو گے۔"

ں گا ممی۔"

نہ رہا کرو۔۔۔۔" موتی ہنس پڑا اور شرمندہ سا اٹھ کر جانے لگا تو نیتا نے
کے اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی۔

ے پاس بیٹھ جاؤ۔" موتی بیٹھ گیا تو بولی۔

اتے جاؤ اپنی ماں سے دور کیوں بھاگ جانا چاہتے ہو؟" اس پر حیران ہو
سوم اپنی ماں کا چہرہ دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

یسا۔ ؟" کیا میں اتنی بری لگتی ہوں تمہیں۔ ؟"

"نہیں ممی۔" وہ جھکی جھکی نظروں سے بولا۔ "میں آپ سے نہیں بھاگ رہا۔"

"تو اور کس سے بھاگ رہے ہو بیٹا۔ میں اتنی نادان بھی نہیں ہوں۔ ایک ما
متنفر ہو اور سزا دوہری ماں کو دے رہے ہو۔ ؟"

"دوسری ماں۔ ؟" موتی نے حد درجہ حیران ہو کر اپنی ماں کی آنکھوں میں جھا

"ہاں۔ ہاں۔" نیا مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمہیں جنم دیا ہے۔ اس لئے تمہاری ماں ہوں اور دوسری ماں اپنی ر
ہوتی ہے۔ جس کے سینے پر لوٹ پوٹ کر انسان جوان ہوتا ہے۔ جس کی فضاؤں
سے نمو حاصل کرتا ہے۔ جس کے کھیتوں اور کھلیانوں سے اس کے رگ و ریشے بنے
اور جس کو اپنے بیٹوں کی چھایا ہر دم درکار ہوتی ہے۔"

"واہ ممی۔" موتی خجالت سے ہنسا۔ "آپ کا فلسفہ بھی عجیب ہے۔ اپنے فلا
دوسری ماں بھی بنا ڈالی۔"

"یہ حقیقت ہے موتی۔ ہر فرد پر پہلا حق اپنی ماں کا ہوتا ہے اور دوسرا اپ
کا۔ بعض اوقات۔ بعض اوقات کیا۔ تاریخ اسلام ان واقعات کی شاہد ہے
نے اپنے منتوں اور مرادوں سے مانگے ہوئے بیٹے۔ اپنے وطن کی مٹ
ماں سے اس کا بچہ کون مانگ سکتا ہے۔ کون چھین سکتا ہے۔ ذرا سوچو مگر
کی زمین پر آنچ آنے لگتی ہے تو سب سے پہلے اپنے بچے پیش کر دیتی ہے
اس سے بڑی کوئی اور سچائی ہے۔ تم ہم دونوں سے بھاگ کر کہاں جا رہے ہو۔"

"ممی میں تو پڑھنے جا رہا ہوں، کچھ بننے جا رہا ہوں۔" موتی جلدی سے بولا
کر پھر یہیں آ جاؤں گا۔ آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ اور زندگی بھر یہیں رہوں گا۔
کرتا ہوں ممی مگر پلیز مجھے کچھ بننے دیجئے۔"

"بیٹا جنہیں کچھ بننا ہوتا ہے۔ وہ گمنام مدرسوں میں پڑھ کر بھی نام پیدا کر لیتے

ے اندر کچھ کرنے کا جذبہ نہ ہو وہ امریکہ میں پیدا ہو کر بھی گمنام ہی رہتے ہیں۔ بہرحال
ے کچھ اور نہیں کہنا چاہتی صرف یہی کہوں گی کہ جو عزت و وقار اپنے ملک میں
ا اور کہیں نہیں۔ وہاں تم ایک درجہ دوم کے شہری ہو گے۔ زیادہ سے زیادہ
زدور، یعنی ایندھن مگر یہاں تم درجہ اول کے شہری ہو تمہاری اور تمہارے باپ
انت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن ملکوں میں سہولتیں بہت ہیں مگر یہ کام تو تمہارا
ی طرح کے دوسرے نوجوانوں کا ہے کہ اپنے دست و بازو سے اپنے
تقدیر بدل دیں۔ یہاں اتنی محنت کریں کہ ہر جا خوشحالی نظر آتے۔ مجھے تو دکھ
ہے یہ دیکھ کر کہ نوجوان نسل دوسرے ملکوں میں جا کر اپنا لہو اور اپنی توانائی ضائع
ہے جبکہ اس توانائی کی یہاں اشد ضرورت ہے۔" موتی چپ ہو گیا۔ ماں کے
کے آگے اس کے دلائل ختم ہو گئے تھے اور اسے ڈر ہی تھا کہ اگر زیادہ
ے گا تو کہیں ماں کی باتوں میں آ کر اپنا ارادہ نہ بدل دے۔ آہستہ سے

ں آپ مجھے ایک بار بھیج دیں پھر میں ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق کروں گا۔"
اری سے مسکرائی۔
ے جیسے میں تو تمہارے انتظار میں بیٹھی رہوں گی۔"
ا ممی یہ کیا بات ہوئی۔ ؟" موتی کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کی ماں جوان
الثبوت تھی۔ چاق و چوبند تھی پھر ایسی باتیں کیوں کر رہی تھی۔ دراصل ماؤں کو عادت
ہے محاورے بول کر اولاد کو ڈرانے کی۔ اتنے میں سیپ کہیں سے دوڑتی ہوئی
اپنی ماں کے گلے میں جھول گئی۔
وہ بہت مزے کا ڈراما تھا۔ بھیا تم نے مس کیا۔" موتی چپ رہا تو بولی۔ "ممی بھیا
بھر مکھن لگا رہا ہے۔"

"میں امریکہ جا رہا ہوں سیپی۔" موتی نے اسے چڑانے کے انداز میں کہا۔ "اور مجھے جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ ممی نے وعدہ کر لیا ہے۔" یہ تینوں فقرے موتی نے ایک سانس میں کہہ دیئے۔ تاکہ نیا کو بات کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

"سچ۔؟" سیپ نے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں پوری طرح کھول کر پوچھا۔ نیا چپ رہی تو وہ موتی کے پیچھے پڑ گئی۔

"اچھے بھیا! تم وہاں جا کر ایک سال بعد مجھے بھی بلوا لینا۔"

"تم کیا کرو گی وہاں آ کر۔؟" موتی نے پوچھا۔

"اگلے سال میں میٹرک کر لوں گی نا؟ تو وہاں آ جاؤں گی۔"

"پتہ ہے۔؟" موتی دانا بن کر بولا۔ "وہاں میٹرک پاس کو کوئی نہیں پوچھتا۔"

"تو کیا ہے؟ میں کوئی جاب کر لوں گی۔"

"کونسا جاب کرو گی تم میٹرک پاس کر کے؟ اسکولوں کے لڑکے لڑکیاں تو وہاں چھٹیوں میں برتن دھوتے ہیں۔ غسلخانے صاف کرتے ہیں یا سوداسلف کی دکانوں میں کام کرتے ہیں۔ تفریحی مقامات پر ٹکٹ بیچتے ہیں۔"

"میں یہ سب کر لوں گی۔ وہاں کچھ معیوب نہیں سمجھا جاتا۔" سیپ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"گھر میں تمہیں کبھی کوئی کام کرتے دیکھا تو نہیں۔" موتی نے کہا۔ "پانی پینا ہو تو نوکر کو آواز دیتی ہو۔"

"گھر کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔" سیپ نے اٹھلا کر کہا تو خیالوں میں گھری گھری نیا چونکی۔

"یہی تو میں بھی کہنا چاہتی ہوں کہ گھر کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔؟"

"ہیلو۔ مسٹر کوزک!" نیا نے اسے دیکھتے ہی گرمجوشی سے کہا تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے بولا۔

"السلام علیکم۔" اس پر نیا نے کھسیا کر جلدی سے وعلیکم السلام کہہ دیا۔

آج کوزک شوروم کے بند ہونے سے تھوڑی دیر پہلے آ گیا تھا۔ اس لئے نیا فارغ تھی۔ باقی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر رہی تھی۔ وہ آ کر نیا کی اجازت سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"بہت دنوں بعد آئے آپ۔؟" نیا نے اخلاق سے پوچھا۔

"بس اپنے ادارے سے آرڈر منگوانے میں دیر ہو گئی۔ خیال تھا مکمل آرڈر آ جائیں تو خدمت میں حاضر ہوں گا۔"

"لیکن اگر آپ آرڈر لائے بغیر خدمت میں حاضر ہوتے تو کیا ہوتا۔؟"

"مجھے اس ملک میں تو سب ہو جاتا ہے۔"

"مثلاً۔؟"

"مثلاً یہ کہ اگر کوئی آدمی کسی خوبصورت عورت سے ملنے یونہی چلا آئے تو لوگ دونوں کو

ایک خوبصورت بدنامی میں ملوث کر دیتے ہیں۔" اس بات پر نیا بے تحاشا ہنسنے لگی۔

"اس کا مطلب ہے آپ ہمارے ملک کے دو رخی خارجہ طور طریقوں کو سمجھ گئے ہیں"

"اے جی میں آپ کے ملک کو "بہت اچھی" طرح سمجھتا ہوں۔" یہ فقرہ کوزک نے ذرا چبا کر کہا۔

"اچھا تو آپ ڈر کے مارے نہیں آتے۔"

"اپنی وجہ سے نہیں آپ کی وجہ سے — ورنہ۔"

"ورنہ کیا — ؟"

"ورنہ اتنی خوب صورت عورت کے ساتھ بدنام ہونا تو ہمارے ملک میں اعزاز سمجھا جاتا ہے۔" نیا ہنسنے لگی۔

"اب آپ کے ملک کی کیا تعریف کروں۔ وہاں تو چودہ سالہ کنواری کے بچے کو بھی باعزت سے اپنا لیا جاتا ہے۔" یہ کہتے ہی نیا کو احساس ہوا کہ اس نے بڑی سخت بات کہہ دی ہے اس لئے جلدی سے بات بدل کر بولی۔

"آپ اس قدر خوبصورت اردو بولتے ہیں کہ اگر کوٹ نہ بولیں تو کوئی شبہ نہیں کر سکتا کہ آپ غیر ملکی ہیں۔"

"اردو زبان خوبصورت ہے اور مجھے پسند ہے۔" کوزک بولا۔

"ویسے آپ کو اور کتنی زبانیں آتی ہیں۔ ؟"

"مجھے سات زبانیں آتی ہیں۔ بنگالی بھی آتی ہے۔"

"زبانیں سیکھنا آپ کا شوق ہے۔ یا کاروباری مجبوری۔ ؟" نیا نے ذو معنی انداز میں پوچھا۔

"دونوں سمجھ لیجئے۔" وہ بھی ذو معنی انداز میں بولا۔ "مجبوری کو جب تک مشغلہ نہ بنایا جائے اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور پھر اب تو مجھے واقعی زبانیں سیکھنے کا چسکا پڑ گیا ہے۔"

"اچھا۔" نیا نے کہا اور پھر جولی کو چائے لانے کا اشارا کر دیا۔ جولی پچھلے دروازے

گئی۔ کوزک نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے کچھ لمبے لمبے کاغذات نکال کر آگے رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ ہمارے ادارے کی طرف سے آرڈر ہیں۔" نیا ایک کاغذ اٹھا کر دیکھنے لگی تو اس نے پلندہ سا بنا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور بولا۔ "یہ سب کاغذات دیکھنے کے لئے وقت ہے۔ آپ یہ رکھ لیں۔ اطمینان سے بیٹھ کر بعد میں دیکھیں، میں کل دوبارہ آؤں گا پھر کر کے مجھے بتا دیں کہ ان پر لاگت کتنی آئے گی۔ یہ سامان کتنے عرصے میں بن جائے گا دائس میں آپ کو کتنی رقم درکار ہوگی۔ ؟" نیا کاغذ سمیٹنے لگی۔ اتنے میں جولی چائے کی ٹرے اندر آئی۔ اس نے ٹرے تپائی پر رکھ کر چائے بنائی اور دونوں کو ایک ایک پیالی تھما کر کی طرف چلی گئی۔ جس وقت وہ دونوں چائے پی رہے تھے اور ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے تھے ے کی انگوٹھیاں پہنے ہوئے ایک بیگم دکان میں داخل ہوئی اور جولی کے پاس آ ی۔

"میری میکسی تیار ہو کے آ گئی ہے ؟ آج کا وعدہ تھا۔"

"میں ابھی میڈم سے پوچھ کے آپ کو بتاتی ہوں۔" جولی نے جھٹ اس کے ہاتھ سے نیا کی طرف بڑھی تو جولی کے تعاقب میں اس خاتون نے بھی نیا کی جانب دیکھا اور نیا وقت ایک غیر ملکی کے ساتھ چائے پیتے دیکھ کر ایک مضحکہ خیز تاثر اس کے چہرے ہوا۔ جولی جھٹ لے کر نیا کے پاس آئی تو نیا نے اسے بتایا کہ میکسی آ گئی ہے۔ اور ازمیں پڑی ہے نکال کر دے دو۔ جولی کے میکسی پیک کرنے تک وہ عورت ٹکٹکی ے نیا اور کوزک کی حرکات و سکنات دیکھتی رہی اور باہر نکلتے ہی اس نے اپنی کار کا کھول کر اپنے ساتھ بیٹھی خواتین سے کہا۔

"ایک گرما گرم خبر سنو۔"

"کیا۔ ؟" سب بیک آواز بولیں۔

"میڈم نے ایک تازہ دم مرغا پھانس لیا ہے اور بغل میں لئے بیٹھی ہے۔"

"اچھا۔" گنگا جمنی قہقہوں سے کار گونج اٹھی۔

"ہاں تو تمہیں کیسے پتہ چلا۔؟" مختلف قسم کے سوال وجواب کے ساتھ۔ ہ
خواتین چلتی کار میں سے مڑمڑ کے نیا کی دکان کی جانب دیکھتی جا رہی تھیں۔

کوٹرک ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"میں کل آؤں گا۔" پھر رک گیا۔ "باقی داوے۔ میرے پاس ایک اور آفر بھی

"وہ کیا ہے۔؟" نیا نے پوچھا۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کافی عرصہ میں کپڑوں کی ایکسپورٹ کا کام کرتا رہا
یہاں ہم نے ایک ادارہ کھولا تھا اور اس کے لئے سوئنگ ——— مشینیں
منگائی تھیں لیکن بدقسمتی سے وہ ادارہ تو بند ہو گیا اور مشینیں بیکار ہو گئیں۔ ان میں
دو مشینیں ابھی تک ہمارے پاس پڑی ہیں اگر آپ اپنی دکان کے لئے خریدنا چاہیں
آپ کو رعائتی قیمتوں پر مل جائیں گی۔"

"بیٹھئے۔" نیا نے اسے دوبارہ بٹھا لیا اور مشینوں کی ساخت اور ماڈل
بارے میں گفتگو کرنے لگی۔ بجلی سے چلنے والی یہ سلائی کی مشینیں وہی تھیں جن کو
کو اشد ضرورت تھی مگر ایکس چینج نہ ہونے کی وجہ سے منگوا نہ سکتی تھی جبکہ یہ
کا کام منٹوں میں کرتی تھیں۔ نیا انہیں خرید نے پر رضامند ہو گئی۔

"آپ ان کی قیمت بتائیں۔؟"

"ایک مشین ہم نے بارہ ہزار روپے میں خریدی تھی۔ گویا دو مشینیں چوبیس
کی ہوئیں۔ مگر چونکہ یہ مشینیں استعمال ہو چکی ہیں۔ اس لئے آپ کو آدھی قیمت پر
دیں گے۔" یعنی بارہ ہزار کی دو مشینیں۔ نیا نے دل میں سوچا سودا گھاٹے کا نہیں۔
ابھی وہ ذہن میں حساب جوڑ ہی رہی تھی کہ کوٹرک بولا۔

ضروری نہیں آپ ان کی قیمت فوری ادا کر دیں۔ قسطوں میں بھی ادا کر سکتی ہیں۔ یا
آپ ہمارے لئے بنائیں گی۔ اس میں سے منہا کر سکتی ہیں۔" نیا کو آج تک
خوشی ملی تھی اس لئے وہ دنگ رہ گئی مگر چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا بلکہ
سنبھل کر کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" کوٹرک جلدی سے بولا۔

"کل صبح نو بجے میرا آدمی دونوں مشینیں یہاں چھوڑ جائے گا اور میں کل کی بجائے
آؤں گا۔"

"سوموار گیارہ بجے دوپہر۔"

"ٹھیک ہے۔" نیا نے کہا۔

"اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" نیا نے بھی برجستہ کہا۔

بچوں کو کھانے سے فارغ ہو کر اور بچوں سے تھوڑی سی گپ شپ لگا کے نیا
کمرے میں آ گئی۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے وہ فائل نکالی جو کوٹرک اسے دے گیا تھا۔
چھوٹا سا جیبی کیلکولیٹر نکال کر سامنے رکھ لیا اور اس کے آرڈر کا حساب جوڑنے
لگ گئی۔ گھنٹے کے بعد ہی اس نے فائل ہاتھ سے رکھ دی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں
سکتی تھی کہ کوٹرک اس کو اتنا بڑا آرڈر دے جائیگا۔ یہ آرڈر تو لاکھوں سے بھی اوپر جا
رہا تھا۔ آرڈر کے لئے اگر وہ دکان کا سارا کام بند بھی کر دیتی تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا بلکہ
تھوڑا سا فرق نہ پڑتا۔ اس کے علاوہ انہوں نے آدھی رقم پیشگی دینے کی بھی پیشکش
کی تھی۔ نیا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اتنی خطیر رقم کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی
کہ ایک سال کی مدت میں یہ آرڈر پایۂ تکمیل کو پہنچتا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا
کہ ایک مخصوص حصہ فارن ایکس چینج میں بھی مل جائے گا۔

"فارن ایکس چینج جس کی اسے اشد ضرورت تھی۔ اپنے بیٹے کے لئے، اگر سال بھر کا خرچ موتی کی خاطر امریکہ کے کسی بینک میں رکھوا دے تو پھر بے فکر ہو کر نوتی کو امریکہ بھیج سکتی تھی۔ اس کا بیٹا آرام سے تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ وہ ہر سال اپنے بیٹے سے مل سکتی تھی اور بیٹی کی شادی کسی اچھی جگہ کر سکتی تھی، یوں تو اس کے سارے دلدر دور ہو جاتے۔ واقعی اللہ جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی آرڈر آتے تھے مگر اس آرڈر کو دیکھ کر تو نیا کی نیند اڑ گئی تھی۔ سگریٹ سلگا کے اس نے ہونٹوں میں دبا لیا تھا اور آنکھیں پھاڑے چھت کی جانب دیکھے جا رہی تھی

دوسری صبح ٹھیک نو بجے ایک آدمی کوڑک کے کارڈ کے ساتھ دو مشینیں لے کر دکان میں داخل ہوا نیا نے مشینیں لے کر اُسے رسید دے دی تھی۔ جب اُس نے مشینیں کھول کر دیکھیں تو حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ بالکل نئی لگ رہی تھیں۔ پرانی یا استعمال شدہ ہرگز نہ لگ رہی تھیں ایسا لگتا تھا انہیں کسی نے چھوا تک نہیں اور اگر انہیں استعمال کیا ہے تو انتہائی احتیاط سے استعمال کیا ہے۔

یہ وہی مشینیں تھیں جو نیا کی ہر قسم کی ضرورت پوری کرتی تھیں۔ جانے اس کے سارے کام جلدی جلدی کیونکر پورے ہونے لگے تھے۔ اس نے مشینیں ایک طرف رکھوا دیں اور دوسرا سگریٹ سلگا کر سوچنے لگی۔

نیا اور کوڑک جب ریسٹوران میں داخل ہوئے تو اندر بیٹھے ہوئے بہت سے نے ان کی طرف دیکھا۔

نیا آج آتشی گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور سیاہ رنگ کی سنہرے والی شال کندھوں پر ڈال لی تھی۔ خوب صورت میک اَپ میں آج وہ واقعی ب ڈھا رہی تھی اور ہمیشہ سے جوان نظر آ رہی تھی۔ کوڑک سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے دونوں بہت ہی خوبصورت نظر آ رہے نیا اور کوڑک جب کونے میں پڑی ہوئی ایک میز کی طرف بڑھے تو ہال میں سرگوشیاں ا اٹھیں۔

"کون ہے۔؟"

"کس کے ساتھ آئی ہے۔؟"

نیا نے حسبِ عادت اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی سرگوشیوں کی طرف کان لگا دیئے۔

"حرامزادی، دن بہ دن جوبن نکال رہی ہے۔"

"اور یہ ساتھ کون ہے۔؟"

"ہوگا کوئی اس کا نیا عاشق!"

"قہقہے۔" دوسری میز سے کچھ اس قسم کی آوازیں آئیں۔

"اے بی ہم تم تو صرف امپورٹیڈ کپڑوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ مگر اسے دیکھو۔ کیسی بہادر عورت ہے کہ امپورٹیڈ عاشق لئے پھرتی ہے — پھر قہقہے۔

"بھئی نصیب کی بات ہے۔"

"ہاں نصیب کی بات تو ہے۔" پھر ایک میز سے کچھ ایسی آوازیں آئیں۔

"یار اس کا بٹیا کتنا بڑا ہوگا۔"

"جوان ہے بالکل۔ اس کے یار سے کچھ ہی چھوٹا ہوگا۔"

"بڑے دھڑلے کی عورت ہے یار۔"

"ہاں یہ سدا بہار عورت ہے۔"

"اس نے کبھی بوڑھی نہیں ہونا۔"

"جانتی ہو کیوں۔؟"

"کیوں۔؟"

"جو عورتیں جوان عاشقوں کے ساتھ گھومتی ہیں وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں۔"

"بھئی واہ۔"

"پیری شباب ہے جو تمنا جواں ہے۔"

"ہاں اصل چیز زندگی کی امنگ ہے۔ شوق جوان ہو تو دل بھی جوان رہتا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کئی نوجوان مردہ دل ہوتے ہیں۔"

"جوانی کا تعلق دل سے ہے یا عمر سے۔" پھر بحث کا رُخ دوسری طرف مڑ گیا

نیا نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور ارد گرد بیٹھے ہوئے مہذب لوگوں کی طرف دیکھا سب ہی خوش لباس، خوش گفتار تھے اور سبھی کنکھیوں سے کھانا کھانے کے دوران باتوں

یں نیا کی جانب دیکھ رہے تھے۔ مردوں کی نظر میں شوق تھا۔ تجسس تھا۔ دعوت جبکہ عورتوں کی نظروں میں نفرت اور حسد تھا۔ سب ہی عورتیں نیا کو حقارت سے ہی تھیں۔ حقارت کے پس پردہ ایک خوف بھی تھا۔ جیسے نیا کوئی پچھل پیری ہے چپکے چور دروازے سے آکر گھر کا سکون لوٹنے والی ڈائن۔

مگر نیا ان سب کی نظروں کے زاویے محسوس کر کے مسکرا رہی تھی۔ طنز کے ہلکے سینے پر سہہ رہی تھی۔

وزک نے میز پر پڑا ہوا منقش مینو اٹھا کر نیا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ نیا نے جلدی ساری فہرست دیکھ ڈالی اور پھر اپنے لئے سوپ اور کھانے کا آرڈر دیا۔ ر اپنا پرس اپنی گود سے اٹھا کر میز پر رکھا اور سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر سگریٹ سلگا ں لینے کے بعد وہ پھر سوچوں میں کھو گئی۔ جانے وہ کوزک کے ساتھ یہاں ئی۔

ح صبح گیارہ بجے کوزک اس کی دکان میں آیا تھا۔ نیا نے اس کے آرڈر کا ح جائزہ لے لیا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ آرڈر کی تمام اشیا کے لئے ایک سال رکار ہے۔ مگر نیا کوشش کر کے یہ سب چیزیں نو دس ماہ میں تیار کرا ں۔ کوزک راضی ہو گیا۔ نیا نے مشینوں کا سودا نقد رقم دے کر کر لیا تھا۔ وہ چاہتی زل کا حساب علیحدہ اور صاف رہے۔ پھر کوزک نے کہا کہ اب ہم کاروباری ت سے طے کر لیں۔

ی تفصیلات۔؟" نیا نے پوچھا۔

ں کتنا ایڈوانس پیش کروں۔ فارن ایکس چینج میں کتنا لینا پسند کریں گی؟ وغیرہ را۔"

ا جلدی کیا ہے۔؟" نیا نے کہا۔

"میں کاروبار میں تاخیر نہیں کیا کرتا۔ مجھے اس ملک میں کام ختم کر کے کہیں اور بھی جانا ہے۔ کیا خبر ادارے والے مجھے جلد بلا لیں اور میری جگہ کوئی اور آدمی بھیج دیں بہتر ہے اپنے معاملات میں خود ہی طے کر لوں۔"

"ٹھیک ہے دو چار دن میں ہم طے کر لیں گے۔" نیا نے جواب دیا۔ "میں ذرا سوچ لوں۔"

"کیا میں ایک درخواست کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔" کوزک نے انکسار سے کہا

"فرمایئے۔"

"کیا آپ آج میرے ساتھ ڈنر کھانا پسند کریں گی؟"

"کہاں۔؟"

"کسی ریستوران میں۔؟"

"کس سلسلے میں۔؟"

"ویسے ہی دوستی اور بھائی چارے کی خاطر۔" نیا مسکرا دی۔

"کاروبار میں دوستی کیسی۔؟"

"بھئی آپ سے دوستی بھی رکھنی ہی پڑے گی۔ یہ اور بات ہے کہ خوش قسمتی سے ہمیں کاروبار بھی مل گیا ہے۔" نیا سر جھکا کر سوچنے لگی۔

"آپ اتنی ایڈوانس اور وسیع النظر خاتون ہیں۔ آپ کیوں اتنا سوچتی ہیں اور اتنے سوال پوچھتی ہیں۔" نیا کی پیشانی پر سوچ کی ایک نئی اور بالکل انوکھی لکیر ابھری پھر جلد اس نے فیصلہ کر لیا۔

"ہاں میں آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گی مگر ایک شرط پر۔"

"وہ شرط کیا ہے۔؟"

"وہ شرط یہ ہے کہ کھانے کابل میں ادا کروں گی۔"

"عجیب شرط ہے۔" کوزک نے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ "واقعی عجیب۔ کیا میں وجہ پوچھ سکتا ہوں۔؟"

"میں نے یہ عرض کیا تھا کہ آپ کو یہ شرط منظور ہے یا نہیں۔؟" نیا کا لہجہ اتنا فیصلہ کن تھا کوزک حیرت زدہ رہ گیا اور جلدی سے بولا۔

"مجھے منظور ہے۔ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے مجھے ہر شرط منظور ہے۔"

"اور کچھ۔؟"

"بس اتنا ہی کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں آپ کو کس وقت لینے آؤں؟"

"میں شام سات بجے شو روم بند کرتی ہوں۔"

"میں ساڑھے سات بجے آؤں گا۔"

"میں اپنی کار پر جاؤں گی۔"

"کیا یہ دوسری شرط ہے۔؟"

"نہیں۔ واپسی پر آپ کو تکلیف ہو گی مجھے چھوڑنے آنا پڑے گا۔"

"ویسے میں آپ کو چھوڑتے میں بھی اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

"آپ نے مجھے پکڑا ہی کب ہے جو چھوڑ دیں گے۔"

"اوہ۔ یہاں پر میں زبان کی مار کھا گیا ہوں۔" نیا ہنسنے لگی۔

اور اس وقت نیا اس کے ساتھ ریستوران میں بیٹھی تھی۔ دونوں آگے پیچھے اپنی کار میں آئے تھے۔ مگر اندر ایک ساتھ داخل ہوئے تھے۔ آج پھر نیا نے بڑی محنت سے میک اپ کیا تھا اور بڑے سلیقے سے تیار ہوئی تھی۔ جیسے کسی پر بجلی گرانے جا رہی ہو۔ کوزک بڑا بے باک آدمی تھا اور بڑی ڈھٹائی سے نیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہا تھا۔ کھانا شروع ہو گیا تو بولا۔

میرے دل میں بڑی کھد بد ہو رہی ہے۔ پلیز میرا تجسس ختم کر دیں۔ مجھ سے تو کھانا بھی صحیح طریقے سے نہیں کھایا جا رہا ہے۔"

"کیا تکلیف ہے آپ کو۔۔؟" نیا نے پوچھا۔

"یہ جو آپ نے شرط رکھی تھی بل ادا کرنے والی۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔؟ میں نے اب تک سینکڑوں عورتوں کے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ تقریباً ہر ملک کی عورت کے ساتھ کھانا کھانے کا چانس ملا ہے۔ مگر کبھی کسی عورت نے ایسی شرط نہیں رکھی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پاکستانی عورتیں دوسری عورتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔" نیا نے مسکرا کر کہا۔

"یقین کیجئے۔ میں نے آپ ہی کے ملک کی بے شمار خواتین کے ساتھ بھی کھانا کھایا ہے۔ بڑے گھرانے کی مہذب بیگمات کے ساتھ کھایا ہے مگر انہوں نے ایسی کوئی شرط کبھی نہیں رکھی۔ بلکہ وہ تو میرے ساتھ کھانا کھانا ایک اعزاز سمجھتی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ دوہری پرسنیلٹی رکھتے ہیں۔"

"کیا مطلب۔۔؟" کوزک گھبرا گیا۔

"یعنی آپ کوئی ایسی ہستی ہیں۔ جس کے ساتھ کھانا کھانا واقعی قابلِ عزت ہے مگر اپنے آپ کو چھپائے کیوں رکھتے ہیں۔۔؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" کوزک کھسیانا ہو گیا۔

"ویسے ہی۔" وہ رک کر بولا آپ برا نہ مانیں۔ آپ کے ملک میں ابھی تک غیر ملکیوں کو معتبر جانا جاتا ہے اور ان کے ساتھ گھومنا ایک اعزاز سمجھا جاتا ہے۔"

"میرے خیال میں آزادی کے بعد سے ایسا نہیں ہے۔" نیا نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

"پتہ نہیں۔ ویسے میں جس عورت کو دعوت دیتا ہوں وہ انکار نہیں کرتی۔"

"انکار تو میں نے بھی نہیں کیا۔ ہے نا؟" پھر طنزیہ انداز میں بولی۔ "دراصل آپ کی شخصیت میں اتنا سحر ہے کہ کوئی عورت انکار نہیں کر سکتی۔" کوزک نے اس کے لہجے کا طنز کو پا لیا تھا۔ اس لئے بڑے سکون سے بولا۔

"مگر آپ میں اور دوسری عورتوں میں جو فرق ہے وہ آپ نے خود ظاہر کر دیا۔ ہم اس بات کو خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں کہ کوئی مرد کھانے کی دعوت دے اور بل عورت دے۔"

"تو آپ یوں سمجھیئے نا کہ یہ دعوت میں نے آپ کے اعزاز میں دی ہے۔ کمائی کے معاملے میں عورت اور مرد برابر ہوتے ہیں۔ میں ایک کماؤ عورت ہوں۔ اپنا بوجھ خود اٹھاتی ہوں۔ میں نے ایک اصول بنا رکھا ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ کاروبار کرتی ہوں ان سے دوستی نہیں رکھتی۔ دوستی ہو جائے تو کاروبار پر اثر پڑتا ہے۔ جہاں کاروباری معاملات ہوں ان سے میں دعوتیں پارٹیاں بھی قبول نہیں کرتی۔ آپ نے اتنے خلوص سے دعوت دی کہ میں انکار نہ کر سکی۔ ویسے بھی جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھاتی ہوں تو بل ہمیشہ میں ہی ادا کرتی ہوں۔ اس کا کوئی برا بھی نہیں مانتا۔"

"کیا کاروباری وجہ کے علاوہ اس کی کوئی مذہبی وجہ بھی ہے۔۔؟"

"مذہبی تو نہیں کہہ سکتے ہاں روحانی وجہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔"

"روحانی وجہ کیا ہوتی ہے؟"

"مجھے اس سے روحانی سرور حاصل ہوتا ہے۔"

"یہ سوچ کر کہ آپ اپنی جیب سے مردوں کو کھانا کھلا سکتی ہیں۔" اس پر نیا بے اختیار ہنس پڑی۔

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ خیر چھوڑیئے اس بحث کو۔ اس کی گہرائی میں نہ ہی جائیں۔"

تو اچھا ہے۔ ویسے بھی پھر آپ حلال و حرام کی بحث میں پڑ جائیں گے۔ آپ کھرے آدمی ہیں۔ میں نے آپ سے صاف صاف کہہ دیا ہے۔ اگر میرے ساتھ کھانا کھانا پسند ہو گا تو بل ہمیشہ میں ادا کیا کروں گی۔"

"مجھے بسر و چشم منظور ہے۔" کوژک نے سر جھکا کر کہا۔ "اتنی حسین عورت کی چشم عنایت اور بخل پرس کے۔" اس نے نیا کے چھوٹے سے ایوننگ بیگ کی طرف اشارا کیا۔ نیا بڑے خوب صورت انداز میں مسکرانے لگی اور ساتھ ہی ساتھ سوچنے لگی کہ اگر اس نے یہ پوچھ لیا کہ اس کے ساتھ کھانا کھانا کیوں ضروری ہے تو۔؟

"اس کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔؟"

"ہو سکتا ہے۔؟" نیا نے کہا۔

"مگر۔۔۔"

"مگر۔۔۔" نیا پھر گم صم ہو گئی۔

"تو اتنی خوبصورت زندگی آپ تنہا رہ کر کیوں ضائع کر رہی ہیں؟" وہ نیا کو گم صم دیکھ کر بولا۔

"ضائع کب کر رہی ہوں۔ میں تو اپنی زندگی کے ایک ایک پل سے فائدہ اٹھا رہی ہوں۔ کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہوں۔"

"میں ان معنوں میں نہیں کہہ رہا۔"

"اور زندگی کا کیا مقصد ہوتا ہے۔ شادی کی تھی بچے بھی ہیں۔ اب کام کرتی ہوں۔"

"آپ لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ شادی کو بڑی سنجیدگی سے لیتے ہیں۔"

"تو کیا شادی کو مذاق سمجھنا چاہیئے۔"

"ہاں۔ شادی نہ تو سنجیدہ مسئلہ ہے اور نہ مذاق ہے۔ شادی تو صرف ایک [illegible] ہے جس طرح سردیوں میں گرم پانی سے نہاتے ہیں اور گرمیوں میں ٹھنڈے پانی۔

[illegible] کافی اچھی لگتی ہے۔ کبھی کوکا کولا۔"

"تو مسٹر کوژک! آپ کا خیال ہے کہ موسموں کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ ساتھی [illegible] بدل لینے چاہئیں۔" کوژک زور سے ہنس پڑا۔

"خیال یہ بھی برا نہیں مگر موسم ذرا جلدی جلدی بدل جاتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی ساتھی بدلنا [illegible] تو اس کی کڑواہٹ ساری زندگی نہیں رہنی چاہیئے۔"

"ضروری نہیں ہر آدمی ایک سا ہو۔؟"

"آپ شادی شدہ ہیں مسٹر کوژک۔؟" نیا نے اچانک سوال کر ڈالا تو کوژک سنجیدہ [illegible] پھر نیپکن سے منہ صاف کر کے بولا۔

"میرے جیسے سیلانی آدمی کے ساتھ کون شادی کر سکتا ہے۔؟ آج یہاں۔ [illegible] ہاں۔ خطروں سے کھیلنا میری زندگی ہے اور کوئی لڑکی میرے گلے کا ہار بننا [illegible] نہیں کرے گی۔" پھر ایک دم اسے خیال آ گیا کہ اس نے شاید کوئی غیر ضروری بات [illegible] دی ہے۔ بولا۔

"ہمارے ہاں عورت بڑی ممنون ہے۔ ہم اسے طویل عرصے کے لئے گھر [illegible] کر نہیں جا سکتے۔ وہ اپنی تنہائیوں کا کوئی ساتھی ڈھونڈ لیتی ہے پھر ہم ملازم ہو [illegible] ہے۔ ہر جگہ ساتھ بھی نہیں رکھ سکتے۔" نیا خاموش رہی۔ اس بارے میں وہ کچھ [illegible] نا نہ چاہتی تھی۔

"مجھے عام طور پر مشرقی لڑکیاں پسند آتی ہیں۔ مشرقی عورتیں، خصوصاً آپ کے [illegible] عورتیں۔"

"ہمارے ملک کی عورتوں میں کیا خاص بات ہوتی ہے۔ مسٹر کوژک! ذرا سی [illegible] لطف اور بہت ہی جذباتی ہوتی ہیں۔" کوژک ہنسنے لگا۔

"نہیں۔ ان میں نسوانیت بہت زیادہ ہوتی ہے کچھ بھی کریں۔ کسی دفتر میں [illegible]

کسی مشین پر یا جہاز میں۔ وہ علی الاعلان کہتی ہیں۔ میں عورت ہوں اور یہی عورت کا حسن ہے کہ وہ ہمیشہ عورت نظر آتی ہو۔ ہم لوگ اب چلتے پھرتے گوشت کے لوتھڑوں سے تھک گئے ہیں۔" نیا کو کوزک کی یہ تشبیہہ بہت پسند آئی۔ اس لئے ذرا رک کر بولی۔

"زمانہ بڑا ظالم ہے جب عورت زمانے سے لڑنے کے لئے باہر نکل آتی ہے تو وہ عورت نہیں رہتی۔"

"آپ بھی تو ہیں نا۔؟"

"میں کوئی عورت ہوں۔"

"تو کیا ہیں۔؟"

"میں تو مرد بن چکی ہوں۔"

"افوہ! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔؟ اگر آپ عورت نہیں ہیں تو اس ملک میں کوئی عورت نہیں ہے۔"

"اگر میں اپنے آپ کو عورت سمجھتی تو اس وقت آپ کے ساتھ بیٹھی کھانا نہ کھا رہی ہوتی۔"

"کیوں۔؟ میرے ساتھ کھانا کھانے میں کیا عیب ہے۔؟"

"ہمارے ملک میں عورتوں کا اس طرح اجنبیوں کے ساتھ بے حجابانہ پھرنا معیوب گردانا جاتا ہے۔ آپ نے محسوس نہیں کیا ارد گرد بیٹھے لوگ ہمیں کتنی عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔"

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ اس بات سے خوش ہو رہے ہیں کہ کتنا موزوں جوڑا بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔" اس پر نیا کو ہنسی آگئی۔ پھر وہ سرگوشی میں بولا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔؟"

کس سے کروں۔؟"

مجھ سے کر لیں۔"

کیا آپ مسلمان ہو جائیں گے۔؟"

شادی کے لئے کیا مسلمان ہونا ضروری ہے۔؟"

میں تو ضروری سمجھتی ہوں۔ مسلمان عورتیں عام طور پر دوسرے مذہب کے سے شادی نہیں کرتیں۔"

کیا آپ یہ سب وثوق سے کہہ رہی ہیں۔" کوزک کے لہجے میں تمسخر تھا۔

جی ہاں! وثوق سے کہہ رہی ہوں۔"

اچھا فرض کیجئے کہ انہیں کسی دوسرے مذہب کے آدمی سے محبت ہو جائے تو۔"

تو انہیں اپنی محبت قربان کر دینی چاہیئے۔"

یہ — چاہیئے کیوں —؟"

کم از کم میرا یہی عقیدہ ہے۔"

ویسے آپ کے علم کیلئے اتنا عرض کر دوں کہ میں کچھ عرصہ ہندوستان میں بھی ہوں۔"

ہندوستان کی بات نہ کیجئے۔" نیا ایک دم تڑپ کر بولی۔ اب آپ مجھے اجازت دیں گے کہ وہاں مسلمان عورتوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ کچھ ایسی مثالیں بھی پیش کر دیں گے۔ جس میں مسلمان عورتوں نے ہندو مردوں سے شادیاں کیں۔ تو محترم یہ کتنی مثالیں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان مجبور ہیں۔ غیر مذہبیت کا نعرہ لگایا جا رہا ہے۔ نئی نسل کی نوجوان لڑکیوں کو مذہب سے بیرہ رکھا جاتا ہے۔ وہاں مسلمانوں کے لئے تعلیمی اور معاشی مشکلات پیدا جاتی ہیں۔ وہ نسل جو ہندوؤں کی ایک طے شدہ پالیسی کے تحت پروان چڑھ

رہی ہے۔ وہ اگر ایک خاص ماحول میں مذہب سے بے بہرہ ہو گئی ہے۔ تو بھی کوئی ایسی اچھی مثال نہیں۔ جسے پیش کیا جا سکے۔ یہ صورتِ حال بھی عارضی ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ جلدی ہی ہندوستان کی نئی نسل کو بھی احساس ہو جائے گا۔ مگر میرا مطلب تو یہ تھا کہ صحیح مسلمان عورت، جس کی ایک مذہبی گھرانے میں تربیت کی گئی ہو۔ کبھی غیر مذہب سے شادی نہیں کرتی۔

"شادی کا مذہب سے کیا تعلق ہے۔؟"

"جو جسم کا روح سے ہے۔ شادی جسم ہے اور مذہب روح۔ کیا آپ کسی ایسے جسم سے شادی کرنا پسند کریں گے جس میں روح نہ ہو۔"

"یہ فلسفہ بھی عجیب ہے۔"

"مگر یہی فلسفہ ہم مشرقی عورتوں کا زیور ہے۔

"تو چلیئے اگر یہی شرط ہے تو میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔"

"کیا آپ دل سے کہہ رہے ہیں۔؟"

"ہاں دل سے کہہ رہا ہوں اتنی خوبصورت اور مکمل عورت کے لئے مذہب تو کیا، دنیا بھی بدلی جا سکتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے پختہ عمر کی عورت میں ایک انوکھی سی دلکشی ہوتی ہے۔ جوں جوں وہ زندگی کی منزلیں طے کرتی ہے، نکھر کر خوبصورت ہوتی جاتی ہے۔"

"آپ اندازہ لگائیں میری عمر کیا ہو گی۔؟"

"آپ۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ "زیادہ سے زیادہ پینتیس چھتیس سال کی ہو گی۔"

"دھوکا کھا گئے یا دانستہ سچ نہیں بولا۔؟"

"میں بیالیس برس کی ہوں۔"

"او میرے خدا۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "میں نہیں مانتا۔"

"تو نہ مانیئے۔"

"مگر آپ تو اپنے آپ کو سالوں پیچھے لے گئی ہیں۔"

"کاش لے جا سکتی۔" نیا نے بڑے درد سے کہا۔

"خیر شادی کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ بڑی عمر کی عورت میں شفقت زیادہ ہے اور وہ شفقت دے بھی سکتی ہے۔"

"تو آپ مذہب بدل لیں گے۔؟"

"ہاں ہاں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ جانتی ہیں دنیا میں بیشتر جنگیں خوبصورت عورتوں کی وجہ سے ہوئیں۔ تخت و تاج کو الٹنے میں خوبصورت عورتوں کا بھی ہاتھ رہا۔ اسی مسئلے دنیا میں حسین عورتوں نے کھڑے کئے۔ بہت سے شرفا کو عورتوں کا کوڑی کا بنا دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ دنیا میں سب سے بڑی طاقت عورت ہے اور اگر اس طاقت کو زیر کرنے کے لئے اپنا دین و مذہب تج دیا جائے تو کوئی گھاٹے کا سودا نہیں۔"

"میں تو سمجھتی ہوں مسٹر کوزک کہ مذہب ہی انسان کی اساس ہے اور اصل حقیقت جو شخص آسانی سے مذہب بدل لیتا ہے وہ کسی بھی شعبے میں اعتبار کے قابل رہتا۔"

"آپ تو میری کوئی بات بھی ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ اب میں کیا کہوں۔؟"

"آپ میں بڑی اچھی مزاح کی حس ہے مسٹر کوزک!" اس پر وہ خوب قہقہے لگا کے ہنسا۔ اسے پتہ چل گیا کہ نیا نے اس کے مذاق کو پا لیا ہے۔ ورنہ اتنی جلدی کون فضول باتیں کرتا ہے۔

"میں آپ کے خیالات بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آپ جیسی فیشن ایبل عورت

کے منہ سے مذہب کا لفظ سن کر ذرا تعجب ہؤا۔"

"ہاں تو آپ کا خیال ہے کہ آپ مجھے بدل دیں گے۔؟"

"کوشش تو کر سکتا ہوں۔"

"پھر تو وہ مصرع سچ ہو جائے گا۔"

"میں ہؤا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا۔"

"اتنی ثقیل اُردو میں نہیں سمجھتا اور اردو شعر و شاعری تو میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کیونکہ آپ کاروباری آدمی ہیں۔" پھر ان کی گفتگو کا رخ اچانک کاروبار کی طرف مڑ گیا۔ کوزک اسے اپنے کاروبار کا طریق کار بتاتا رہا اور مختلف ملکوں میں اسے جو تجربات و مشاہدات ہوئے تھے انہیں بیان کرتا رہا۔ کھانا ختم ہوا تو نیآ نے کوزک سے پوچھا۔

"آپ کافی یا قہوہ پینا پسند کریں گے؟" کوزک نے قہوے کو ترجیح دی۔ دونوں آہستہ آہستہ قہوہ پیتے رہے۔ اس وقت کوزک نے نیآ سے پوچھا۔

"آپ تو اس علاقے کی ہر دلعزیز ترین خاتون ہیں۔ یہاں کے بڑے بڑے لوگوں سے آپ کے بہت اچھے مراسم ہوں گے۔"

"بڑے لوگوں سے کون اچھے مراسم رکھ سکتا ہے؟"

"نہ ان کی دوستی اچھی، نہ ان کی دشمنی اچھی" — نیآ نے برجستہ جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے آخر بڑے گھرانوں کی فیشن ایبل خواتین تو آپ کی دوکان پر خریداری کے لئے آتی ہوں گی۔؟"

"اکثر آتی ہیں۔"

"کاروبار کے دوران ہی دوستی بھی ہو جاتی ہے۔"

جس طرح آپ کی اور میری ہو گئی۔"

ہاں۔" وہ ہنسا۔

اصل میں عورتیں، عورتوں سے اتنی جلدی دوستی نہیں کرتیں۔ جتنی جلدی مرد تے ہیں۔"

یہ بھی درست ہے۔" یہ کہہ کر کوزک سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔

نیآ نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ وہ دوڑا ہوا گیا اور پلیٹ میں بل رکھ لے یب آ کے وہ ذرا سا جھجک گیا۔ عام طور پہ بل مرد کو پیش کیا جاتا ہے مگر اشارہ اسے ے کیا تھا۔ اس لئے نیآ نے ہاتھ بڑھا کے خود ہی پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی ں کھول کر نوٹ اس کی پلیٹ پر رکھ دیئے۔

تو آپ نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔؟"

میرا ارادہ کوئی موسم تو نہیں۔" اس پہ کوزک ہنسنے لگا۔

میرا خیال ہے اب چلنا چاہیئے۔" نیآ نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ دس بج رہے ہیں۔

ٹھیک ہے۔" کوزک بھی کھڑا ہو گیا۔

دونوں اٹھ کر جب باہر آنے لگے تو پھر ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں نے تنقیدی ان کا جائزہ لیا۔ دور کونے میں بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے نیآ کو ہاتھ ہلایا۔ وہ نیآ واقف تھی۔ جواب میں نیآ نے بھی ہاتھ ہلایا اور باہر نکل آئی۔ باہر رُت کافی بدل ر فروری کے آخری دن تھے اور سردی جیسے نزع کے عالم میں تھی۔ ہلکی ہلکی خنکی اٹھ فضا میں آنے والی بہاروں کے سندیسے رچے ہوتے تھے۔

ایسے موسم میں تو مر جانے کو جی چاہتا ہے۔" نیآ نے اچانک سوچا اور پھر چابی نکال وٹر کی طرف بڑھی۔ کوزک نے آگے بڑھ کر نیآ کی گاڑی کا دروازہ کھول دیا، بہت سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور بولا۔

"اب آپ تنہا اتنی دور جائیں گی؟"

"میں ہمیشہ تنہا ہی اتنی دور جایا کرتی ہوں۔" اس وقت وہ اسلام آباد کے ایک ریستوران کے باہر کھڑے تھے اور نیا کو پنڈی جانا تھا۔

"اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے پیچھے چلا آؤں۔؟"

"مردوں کا پیچھے پیچھے آنا مجھے پسند نہیں۔" نیا نے ہنس کر کہا۔ "مجھے یہ سڑک بہت پسند ہے جو اسلام آباد کو پنڈی سے ملاتی ہے۔ اکثر میں راتوں کو یہاں تنہا ہی ڈرائیو پر آتی ہوں۔ ویسے یہ بڑی بارونق سڑک ہے ہر وقت ٹریفک رہتا ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔"

"خوبصورت عورت اکیلی جا رہی ہو تو دس سو سے گھیر لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

"میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا نا، کہ میں عورت نہیں مرد ہوں۔"

"کاش مجھے اعتبار آجاتے۔" کوزک نے ایک آنکھ بند کر کے کہا۔ نیا نے ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا اور اپنی موٹر کو اس بڑی شاہراہ پر ڈال دیا۔

موٹریں آ جا رہی تھیں۔

انہی میں نیا کی موٹر بھی شامل ہو گئی۔ نیا کے ذہن میں ایک مصرع بار بار آ رہا تھا۔

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

"ہوں تو نیا جی کیا خیال ہے۔؟" اس نے سامنے پہاڑیوں کے اس پار دیکھنا چاہا۔ نیچے گہرا اندھیرا تھا اور اوپر آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

بہت دنوں کے بعد اس نے ستارے دیکھے تھے۔ سردیوں کی کہر اور دھند میں ستارے کہاں چھپ جاتے ہیں۔

ستاروں کا کیا بھید ہے یارب!

ستارے کیوں آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔

ستارے کون سی چال چلنے والے ہیں۔

اس کی موٹر ایک ہی رفتار سے سڑک پر رینگتی جا رہی تھی اور وہ یوں بیٹھی تھی اس پر کسی نے مسمریزم کر دیا ہو۔

کئی دنوں سے نیا کچھ عجیب سی کیفیتوں سے گزر رہی تھی اور وہ ان کیفیتوں کے درمیان یوں لٹکی تھی جیسے کسی نے اس کے گلے میں پھندا ڈال دیا ہو۔

آرزو بھی ایک پھندا ہی ہوتی ہے۔

سو زندگی بھر کوئی نہ کوئی پھندا ضرور گلے میں لپٹا رہتا ہے۔

عجیب طرح کی بے کلی تھی — بے چینی تھی — بے قراری اور اضطراب تھا۔ بظاہر وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس روز وہ اپنی بکھری بکھری طبیعت کو مجتمع کر کے شوروم میں داخل ہوئی تو جولی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میڈم کئی دنوں سے دکان کا کیش سیف میں پڑا ہے۔ پہلے تو آپ ہر دوسرے دن بینک میں جمع کرا آتی تھیں۔ اب کیوں سستی کر رہی ہیں؟"

"جولی! کئی دنوں سے میرا جی کچھ بھی کرنے کو نہیں چاہتا۔"

"مگر یہ تو اتنا بڑا کام نہیں ہے میڈم۔ پلیز آج جا کے جمع کرا دیں نا۔؟"

"ٹھیک ہے۔" نیا نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اور بولی۔ "اس وقت دس بج رہے ہیں۔ بینک تو کھل چکا ہوگا۔ لاؤ کیش دے دو۔ میں ابھی اسلام آباد

ں۔" نیا نے اپنی دکان کا سارا حساب کتاب اسلام آباد کے ایک بینک میں
ا تھا۔ وہاں کے منیجر سے اس کی واقفیت بھی تھی اس لئے فون پر بھی کام ہو
ا۔ جولی نے سارا کیش نکال کے اس کے آگے رکھ دیا اور بولی۔

میڈم پورے انیس ہزار روپے ہیں۔ ذرا احتیاط سے جائیے گا۔" اس پر نیا کو
ختیار ہنسی آگئی۔ جولی کے رخسار پہ ہلکی سی چپت لگا کر بولی۔

کیا خیال ہے جولی۔ کوئی مجھے لوٹ کر لے جائیگا۔؟"

میڈم خدا نہ کرے ایسا ہو۔ مگر راستہ بہت لمبا ہے۔ پلیز آپ راستے میں رک
کے ساتھ گپ نہ لگائیں۔"

اچھا جولی! جس طرح تم کہتی ہو اسی طرح میں کروں گی۔" نیا کو جولی پہ پیار آنے لگا۔
اور جلدی آئیے گا مجھے فکر لگی رہے گی۔"

جولی!" نیا نے مڑ کر حیرت سے کہا۔ "سچ مچ تو بالغ ہوگئی ہے۔ سویٹ —
ں بہت جلد آنے کی کوشش کروں گی مجھے اور کوئی کام نہیں ہے۔ پیسے
ا دیتے ہی فوراً آجاؤں گی۔"

نیا نے جونہی بینک کے باہر جا کر اپنی گاڑی روکی۔ دیکھا کہ ایک آدمی بینک
اندر سے نکل کر باہر آرہا ہے۔

نیا وہیں کار کے اندر بیٹھی بیٹھی جیسے منجمد ہوگئی۔ برف ہوگئی۔ یہ اور بات ہے
کے اوسان خطا نہیں ہوتے۔ اس نے جلدی سے اپنی گاڑی موڑ لی اور دوسری
ل کی اوٹ میں ہوگئی اور وہاں سے ایک زاویہ بنا کر دیکھنے لگی۔

ایک لمبا معمر سا آدمی بینک سے باہر آرہا تھا۔ وہ اپنی لمبی سی موٹر کی جانب بڑھا
رہا تھا۔ دروازہ کھولا مگر جانے اسے پھر کیا یاد آیا کہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رک
ڈرائیور سے کچھ کہا اور بینک کے دروازے کی طرف تیز تیز قدموں سے جانے

لگا۔ بینک کے چوکیدار نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور وہ لمبا سا آدمی جس کے سر کے بال سفید براق تھے اور ایسا لگتا تھا اس نے اپنے سر پر برف کی سفید ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ بینک کے اندر چلا گیا۔

نیاّ نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ اسے زندگی کی ہر منزل پر پہچان سکتی تھی۔ گو صدیوں پہ سے مہ و سال کے غول کے غول گزر گئے تھے۔ مگر پھر بھی شناخت کا ایک ننھا سا دیپ لاشعور میں روشن تھا۔ جس کی روشنی میں اس نے پہچان لیا کہ وہ شہباز ہی تھا۔ وہ خاصا بوڑھا لگ رہا تھا۔ شاید حالات نے اسے مات دے دی اس کے سر کے سفید بال بتا رہے تھے کہ اس نے زندگی شدید جد و جہد میں گزاری ہے مگر اس کا چہرہ اسی طرح تھا۔ خاموش۔ معصوم۔ مظلوم۔ اس لئے اس کے چہرے پر زیادہ شکنیں نہیں آئی تھیں۔ چھریرا بدن تھا۔ کمر میں خم نہیں آیا تھا۔ اس نے نہایت بیش قیمت لباس پہنا ہوا تھا۔ لمبی سی سیاہ کار سے اترا تھا اور چوکیدار نے آگے بڑھ کر جس مؤدبانہ انداز سے دروازہ کھولا تھا اس سے نیاّ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اب وہ کس عہدے پہ تھا اس کے ساتھ ہی ایک اور آدمی بھی اس کے پیچھے اندر چلا گیا تھا۔

نیاّ گم صم سی اپنی سیٹ پر بیٹھی رہ گئی۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ ہلنے جلنے کے قابل نہ رہی حالانکہ اس نے کبھی جذباتی انداز میں شہباز کے بارے میں نہیں سوچا تھا نہ ہی پچھتاووں کی سرخ آندھیوں میں اسے کبھی صدائیں دی تھیں اور نہ اپنے کسی جلد بازی کے فیصلے کو کبھی کوسا تھا مگر جانے آج عرصۂ دراز کے بعد شہباز کو دیکھ کر اس پر بجلی کیوں گر پڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ موٹر سے نکلی اور ڈرتے سہمتے قدموں سے بینک کے دروازے پر پہنچ گئی اسے دیکھتے ہی چوکیدار نے دروازے پہ ہاتھ رکھا تاکہ وہ دروازہ کھول دے مگر نیاّ نے اسے اشارے سے منع کرتے ہوئے نہایت آہستہ

سے کہا۔

"یہ صاحب جو ابھی اندر گئے ہیں۔ کون ہیں۔؟"

"جی یہ خان صاحب۔؟" چوکیدار جلدی سے بولا "یہ جی اس بینک کے سینئر پریذیڈنٹ ہیں ان کا حال ہی میں اسلام آباد تبادلہ ہوا ہے۔ بہت اچھے اور نفیس آدمی ہیں۔" نیاّ ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے اتنی باتیں نہیں تھیں اور نہ اتنی باتیں سننا چاہتی تھی۔ بس یونہی پوچھنے چلی آئی تھی۔ وہ وہیں سے مڑ گئی گاڑی میں بیٹھی اور اسٹارٹ کر کے ایک طرف کو نکل گئی۔ بینک کے اندر جانے کو اس کا دل ہی نہیں چاہا۔ آج صبح ہی سے جی میں عجیب و غریب وسوسے آ رہے تھے۔ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ یونہی جولی کے کہنے پر وہ بینک میں فارم جمع کروانے چلی آئی تھی۔ اس نے موٹر کو ایک بڑی سی شاہراہ پر ڈال دیا۔ اور ٹریفک سگنل کے ذہن کو دھوئیں کے حوالے کر دیا۔ شہباز سے طلاق لینے کے ٹھیک سال بعد اس نے سنا تھا کہ جرنیل آپا کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہی جرنیل آپا جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ موت بھی اس سے خوف کھاتی ہے اور وہ تو بہت سوں کو مار کر مرگی تھی۔ جرنیل آپا مر گئی تھی۔ بالکل اچانک اور عجیب طرح۔ ایک روز چھت پر کھڑی کپڑے پھیلا رہی تھی کہ نیچے سڑک پر شور اٹھا۔ جونہی جرنیل آپا نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر نیچے دیکھنا چاہا تو ان کی چربی کا سارا زور دیوار پر گیا دیوار بھی بودی نکلی وزن نہ سہہ سکی تڑخ گئی اور جرنیل آپا تھامے تھامے تین منزلوں سے نیچے سڑک پر آ رہی۔ اسی وقت شور مچاتا ہوا سے لدا ہوا ایک ٹرک دیو کی طرح چڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جرنیل آپا کو روندتا ہوا آگے نکل گیا۔ لوگوں کے ہاتھ اگر کچھ آیا بھی تو چند بوٹیاں ہوئی ہڈیاں۔ نیاّ نے جب یہ سنا تھا۔ تو کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ توبہ توبہ انسان کو اپنے انجام کا علم نہیں ہوتا۔ اسی لمحے نیاّ نے اپنے کان بند

کر کے اپنے دل کی آواز بھی سن لی تھی۔ جو کہہ رہا تھا۔ پگلی چند دن کی تو بات تھی اگر تو صبر کر لیتی تو تیرا کیا جاتا۔ ؟ عمر بھر کون جیا ہے۔ ؟ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آتا ہے۔ مگر اس نے اپنے دل کی آواز پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے۔ انہی دنوں اس کی ملاقات رازی سے ہو گئی تو زندگی کی روش ہی بدل گئی۔ پر کسی نہ کسی طرف سے اسے شہباز کی خبر مل ہی جاتی تھی اور نہیں تو جب وہ بینک میں جاتی تو اسے کسی بات کا پتہ چل جاتا۔ شہباز باقاعدگی سے موتی کے نام ایک مخصوص رقم بھیجا کرتا تھا۔ وہ جس شہر میں ہوتا۔ وہاں سے اس کی ٹی۔ ٹی آجاتی۔ جس سے نیا کو پتہ چل جاتا کہ وہ کہاں ہے اور کس عہدے پر ہے۔ ؟ رازی کا ہاتھ پکڑنے کے بعد اس پر دو دور آئے۔ پہلا دور خود فراموشی کا تھا جس میں اس کی عقل اور آنکھوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا اور دوسرا دور۔ ذہنی پراگندگی کا تھا۔ جس میں وہ بن بن کر ٹوٹتی رہی تھی۔ جب وہ سوکھے پتے کی مانند حالات کے سنگین اشاروں پر ادھر ادھر ڈولا کرتی تو اسے ذرا کی ذرا شہباز کا خیال آجاتا۔ اس لئے نہیں کہ اسے ابھی تک شہباز سے محبت تھی۔ بلکہ اس لئے کہ شہباز بھی اسی کی طرح تنہا تھا وہ کسی کا ہاتھ تھام لینے کے باوجود تنہائی کے جنگل میں سلگ رہی تھی اور شہباز بلا جواز جوگ کاٹ رہا تھا۔ جانے شہباز نے دوبارہ شادی کیوں نہ کی تھی ؟ اس کی ماں منتیں کر کر کے ہار گئی تھی مگر اس نے ایک ہی تو فیصلہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف کیا تھا۔ دوبارہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ۔ کئی بار نیا کا دل چاہا کہ وہ جاوید کی ٹوپی پہن کر شہباز کے گھر جائے اور اس سے پوچھ کر آئے کہ اس نے نیا سے بچھڑنے کے بعد شادی کیوں نہ کی کیا وہ اس حد تک نیا کے عشق میں مبتلا تھا یا عورت پن سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے انتقام لیا۔ یا۔ اپنے آپ سے۔ اس کے شب روز اب کیسے گزرتے ہیں۔ کیا وہ نیا کو یاد کرتا ہے۔ یاد کرتا ہے تو اس کی کس

بات کو یاد کرتا ہے ؟ نیا نے کئی بار اپنے آپ کو کوسا تھا۔ بھلا وہ کیوں یہ آس ز سے رکھتی ہے۔ مگر اس کے اندر محرومیوں کی ماری ہوئی ایک عورت تھی پنے گھر کے پچھلے دروازے ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ لاشعوری طور پر نیا چاہتی تھی بازاس کے عشق میں مبتلا رہے۔ دنیا کو ٹھکراتا رہے ہمیشہ تنہا رہے۔ کیا م اسے عورت ذات سے نفرت ہو گئی ہو اور اسی نفرت کو لئے لئے وہ ت سے بے نیاز ہو گیا ہو۔ ؟ سو طرح کے خیال دل میں چٹکیاں لیتے تھے وطرح کے راستوں سے نیا گزرتی رہی مگر اس نے کبھی نہ تو شہباز سے ملنے شش کی اور نہ دیکھنے کی۔ دنیا اتنی وسیع جگہ نہیں ہے۔ دنیا کے اس گول گول ں کبھی کبھی ان لوگوں سے بھی سامنا ہو جاتا ہے، جن سے انسان دور بھاگتا ۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ پر آج۔ ایسا ہوا تو برف کی ٹھنڈی ٹھنڈی ں اس کے دل کی اندھیری کوٹھڑیوں پر گرنے لگیں۔ تہہ در تہہ۔

نیا نے کبھی موتی سے بھی اس کے باپ کے بارے میں استفسار نہیں کیا ر میں موتی اپنے باپ سے بارہا مل چکا تھا مگر نیا اس سے کوئی بات نہ پوچھتی اور نہ ہی موتی کھل کر بات کرتا۔ دریا کے دو پہلو، دو کنارے ایک دوسرے سے ر ہو جاتے ہیں۔ اس کا نیا کو اندازہ ہو گیا تھا۔ اور پھر نیا نے کون سی رسم وفا ی تھی۔ ؟ وہ اپنا داغ داغ دل اور اڑا اڑا چہرہ لے کر شہباز کے سامنے نہیں جانا ی تھی کیا خبر شہباز اسے پہچانے بھی یا نہیں۔ نیا اپنی گاڑی سڑکوں پر یوں دوڑاتی جیسے پاؤں جلی بلی اپنا راستہ بناتی ہے۔

ادھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر۔ اس کا دل چاہا کسی ریستوران میں بیٹھ کر کے دو گھونٹ پیئے مگر پھر اس نے اس خیال کی نفی کر دی۔ کوئی یوں اسے بیٹھا دیکھ کر قریب آ گیا تو۔ مشہور عورت کو محتاط رہنا پڑتا ہے۔ لوگ اس کے

بارے میں بے پر کی اڑانے کو ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پیے جا رہی تھی۔ سگریٹ پیتے پیتے اس کی نظر کار کے شیشے پر پڑ گئی اس نے جھک کر اچھی طرح اپنا چہرہ دیکھا۔ وہ ابھی حسین تھی۔ قابل قبول تھی مگر۔ اس کے ساتھ ہی برف کا ایک گولا۔ سفید سفید سر اس کے تصور میں لہرا گیا۔ شہباز کا سفید بالوں والا سر۔ شہباز نے کیا کیا تھا۔ جو اس کے سر کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ شاید اس نے نیا سے بھی زیادہ کڑی منزلیں طے کی تھیں۔ تنہائی کا روگ بھی انسان کی جان نکال دیتا ہے پھر اس نے اپنے دل کی آواز پر ذرا کی ذرا دھیان دیا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کار میں ایک تصویر بنا رہا ہے۔ ایک معمر سفید بالوں والے، باوقار اور سنجیدہ مرد کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر دو تین بچے بیٹھے ہیں۔ مرد موٹر چلا رہا ہے۔ عورت کو ایک معزز مرد کی بیوی ہونے کا احساس ہے اور یہ احساس اس کے چہرے سے روشنی بن کر پھوٹ رہا ہے۔ پھر جونہی بینک کے باہر موٹر آکر کھڑی ہوتی ہے چپڑاسی دوڑ کر آتا ہے۔ سیلوٹ مارتا ہے اور کار کا دروازہ کھول کر بیگم صاحبہ کے آگے سر جھکاتا ہے۔" کسی شریف اور معزز آدمی کی بیوی ہونا کتنی بڑی راحت ہے" نیا نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر سوچا۔" اپنے شوہر کے حوالے سے مشہور ہونا کس قدر باعزت ہے۔ عورت کی شہرت میں مرد کا حوالہ نہ ہو تو اس کی شہرت صابن کے جھاگ کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ کتنی بھگی ہوتی ہیں نوجوان لڑکیاں۔ نیا نے ادھر ادھر دیکھ کر سوچا۔ اپنے نئے شوہروں سے بدظن رہتی ہیں۔ اگر ان کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر کچھ عرصہ ہاتھ چھڑا کر چلیں تو انہیں سب کچھ مل جاتا ہے۔ عزت۔ مرتبہ۔ وقار۔ آسودگی۔

مرد کو بھی تو ایک مقام پر پہنچنے کے لئے وقت درکار ہے۔ جب نیا کی شادی ہوئی تو شہباز ایک معمولی سا ملازم تھا۔ مگر اب اتنی مسافت طے کرنے کے بعد شہباز اونچے عہدے پر فائز ایک معزز آدمی تھا۔ اس کی اپنی بڑی سی کوٹھی تھی۔ ایک لمبی

ی۔ اس کے نام کی شناخت تھی اور سب کچھ تھا اس کے پاس۔

کاش نیا نے صبر کیا ہوتا۔۔؟

"اونہہ۔" نیا نے جیسے اپنے ضمیر کو ٹھوکا لگایا۔

پھر وہی فضول باتیں۔ انسان اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ رف سے ہوتا ہے۔ پتہ نہیں وہ اچھا تھا۔ پتہ نہیں یہ اچھا ہے۔ باؤلی بنی نیا ادھر پھرتی رہی پھر ایک دم اسے فاروق کا خیال آ گیا اور اس نے اپنی گاڑی فاروق یٹ کی طرف موڑ دی۔ کافی دنوں سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ی ملازم تھا۔ زیادہ تر دوروں پر رہتا تھا مگر اکثر فراغت کے وقت نیا کو فون کر لیتا۔ یا نیا اس کے فلیٹ پر آ جاتی تھی۔ نیا کو معلوم تھا کہ اس وقت فاروق گھر پر ہوتا ہے۔ مگر نیا کے پرس میں ہمیشہ فاروق کے فلیٹ کی ایک چابی رہتی تھی۔ نیا فاروق کا فلیٹ کھولا۔ اندر گئی۔ کیتلی چولھے پر رکھی اور پھر فاروق کے دفتر کا نمبر لگی۔

شام کے چار بجے جب تھکی ہاری نیا اپنی دکان پر پہنچی تو اس نے دیکھا جولی منہ ئے سامنے کونٹر پر بیٹھی ہے۔ نیا کو دیکھتے ہی جولی ایک دم کھڑی ہو گئی اور پھر پھوٹ کر رونے لگی۔

لیا ہوا جولی ڈارلنگ۔۔؟" نیا نے اپنا پرس کاؤنٹر پر رکھا اور جولی کے دونوں ہاتھ ے چہرے سے ہٹانے لگی۔

کچھ نہیں۔" جولی نے ہچکیوں کے بیچ کہا۔

گر مجھے بھی تو بتاؤ نا۔؟" نیا نے بڑے پیار سے پوچھا۔ جب جولی اچھی طرح ز بولی۔

یڈم آپ یہ کہہ کر گئی تھیں کہ جلدی آ جائیں گی۔؟"

"ہاں ہاں۔" نیّا بولی۔

"پھر صبح دس بجے کی گئیں آپ اب چار بجے آ رہی ہیں۔"

"تو۔۔۔؟"

"آپ اتنی بھاری رقم بھی ساتھ لے گئی تھیں۔ جب آپ نہیں آئیں اور نہ ہی مجھے فون کیا تو میرا برا حال ہو گیا۔ بہت دیر بعد میں نے بینک فون کیا تو بینک کے مینیجر نے بتایا کہ آپ تو بینک آئی ہی نہیں پھر آپ سوچ لیجئے میرا کیا حال ہوا ہو گا۔ آپ کی ہر سہیلی کے گھر فون کر کے دیکھ لیا تھا اور اب"۔۔۔" وہ پھر رونے لگی۔

"اچھا۔" نیّا ایک زوردار قہقہہ لگا کے ہنسی۔ "جولی! خدا کی قسم آج مجھے بے انتہا خوشی ہوئی ہے۔ یہ سوچ کر کہ کم از کم ایک انسان اس دنیا میں ایسا ضرور ہے جو میرے مرنے کے بعد مجھے روئے گا۔"

"آپ میرا مذاق اڑا رہی ہیں میڈم۔" جولی پھر رونے لگی۔

"نہیں جولی۔" نیّا کرسی پر بیٹھ گئی۔ "تم نہیں جان سکتیں۔ یہ سوچ کس قدر خوبصورت ہے کہ دنیا میں کوئی ہماری فکر کرتا ہے۔ ہمیں دل سے چاہتا ہے۔ ہمارے بارے میں سوچتا ہے اور ہمارے بعد ہمیں روئے گا۔ ماؤں کو بیٹیاں اسی لئے اچھی لگتی ہیں کہ مرنے کے بعد ماؤں کو بہت یاد کرتی ہیں۔"

"لیکن میڈم آپ بتائیں نا کہ آپ کہاں چلی گئی تھیں اور مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟"

"آئی ایم سوری جولی۔" نیّا نے محبت سے کہا۔ "مجھے تمہیں فون ضرور کرنا چاہئے تھا۔ کیونکہ میرا بینک جانے کا ارادہ ہی بدل گیا تھا۔"

"پھر کہاں رہیں آپ۔۔۔؟"

"بس یونہی آوارہ گردی کرتی رہی۔" نیّا نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں اور۔ جولی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"وہ رقم۔۔۔ وہ رقم کیا ہوئی۔۔۔؟" نیّا نے چونک کر آنکھیں کھول لیں اور پھر زور سے ہنس پڑی۔

"سچ بتاؤ جولی تمہیں میری زیادہ فکر تھی یا رقم کی۔"

"رقم کی فکر مجھے کیوں ہوتی۔؟ میں تو اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ آپ بے پروائی سے ادھر نہ ڈال دیں۔ لاتے سیف میں رکھ دیتے ہیں۔ کل صبح آج والا کمیشن ملا کے جمع کرا دیں گے۔"

"رقم تو میں نے جمع کرا دی۔" نیّا کھڑی ہو گئی اور اس نے ایک جمائی لی۔

"کہاں۔۔۔؟" جولی نے جلدی سے پوچھا۔ لیکن پھر مدھم آواز میں بولی۔ "بینک تو آپ جا نہیں سکیں پھر کہاں جمع کرائی ہے؟"

"اللہ کے پاس۔" نیّا نے آگے بڑھ کر اپنا پرس اٹھا لیا۔

"اللہ کے پاس۔۔۔؟" جولی نے حیران ہو کر پوچھا۔ جاتے جاتے نیّا ٹھہر گئی۔ وہ واقعی بہت تھکی ہوئی اور پژمردہ لگ رہی تھی۔ اس نے جولی کا سوالیہ نشان بنا چہرہ دیکھا اور بولی۔

"بینک والے اتنا منافع نہیں دیتے جتنا اللہ میاں دیتا ہے۔ اس لئے میں نے رقم ایک امدادی فنڈ میں جمع کرا دی ہے۔"

"ممّا ــ" مسٹر کوزک کا فون ہے ــ" سیپ نے آکر کہا تو نیّا اٹھ کر چل دی ــ آ
کل نیّا اور کوزک کی خوب گاڑھی چھن رہی تھی۔ نیّا نے اس کا آرڈر لے لیا تھا۔ ایک تھا
رقم کوزک نے اسے ایڈوانس دے دی تھی اور وہ بڑی توجہ سے اس کا کام کر
رہی تھی۔

"فرمایئے ــ" نیّا نے ریسیور کان سے لگاتے ہی کہا۔

"ہمارا گروپ پک نک کے لئے مری جا رہا ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا"

"ہاں میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں بھی چلوں گی" نیّا نے ہنس کر کہا۔

"پھر اس وعدے کا کیا ہوا ــ؟"

"یہ کسی شاعر کا وعدہ تو نہیں کہ شعر میں ڈھل جاتے۔ آپ یہ بتائیں کب جا رہے ہ

"پرسوں ــ یعنی سنڈے کو"

"پرسوں ــ ہوں" نیّا کچھ سوچنے لگی پھر بولی "میری بیٹی کے اسکول کھل رہے ہ
اسے پرسوں ہی مری جانا ہے۔ آپ لوگ کس وقت روانہ ہوں گے۔؟"

"ہم لوگ تو پرسوں صبح گیارہ بجے روانہ ہوں گے"

ٹھیک ہے میں سیپ کو لے کر صبح آٹھ بجے نکل جاؤں گی۔ آپ پتہ دے
کہاں ہوں گے وہیں پر آکر آپ سے مل جاؤں گی"

"تو گویا آپ اکیلی آنا چاہتی ہیں۔ ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتیں"

"بھئی میری مجبوری ہے پہلے میں اپنی بیٹی کو ہاسٹل میں چھوڑوں گی"

"تو ایک ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں"

"نہیں ــ اس طرح مناسب نہیں"

"ٹھیک ہے ــ" کوزک نے کہا۔ پھر اسے اپنا اتا پتہ بتانے لگا۔

"کون کون لوگ جا رہے ہیں" نیّا نے پوچھا۔

"اپنے ہی حلقہ احباب کے کچھ لوگ ہیں ــ خواتین بھی ہیں ــ کچھ دوست ہیں ــ
ی بیویاں ہیں ــ آج تم آپ کی ملاقات کچھ اور اچھی عورتوں سے کرائیں گے جن
مل کر آپ خوش ہوں گی"

"آپ کا حلقہ احباب بہت وسیع ہے مسٹر کوزک" نیّا نے کہا۔

"دیکھیئے آپ کے آجانے سے تو یہ حلقہ خوبصورت بھی ہو گیا ہے" نیّا ہنسنے

کوزک کے ساتھ وقت طے کرنے کے بعد ــ نیّا جا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ کچھ
چھت کی طرف دیکھ کر سوچتی رہی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک سوچنے کے
وہ فاروق کا نمبر ملانے لگی۔ تھوڑی دیر دھیمے لہجے میں فاروق سے باتیں کرتی رہی
اس نے ریسیور رکھا موتی سامنے آگیا۔

"ہاں تو موتی میاں تم خوش ہو اب ــ؟" نیّا نے ہاتھ بڑھا کر موتی کا بازو پکڑ لیا اور
اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔ موتی مسکرا دیا۔ پہلی بار نیّا نے محسوس کیا کہ موتی کی
ہاسٹ اصلی مسکراہٹ تھی۔

"تو آپ جا رہے ہیں پھر ۔۔۔ ؟" موتی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تیاری مکمل ہو گئی ؟"

"ہو گئی ۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے کاغذات مکمل ہو گئے ہیں ۔ ؟"

"سب ہو گئے ہیں ممی ۔ آپ فکر نہ کریں ۔ میں آپ کو روز ایک خط لکھا کروں گا۔"

نیا نے ہنس کر موتی کی طرف دیکھا۔

"یہ لالچ دے رہے ہو مجھے ۔ آدمی روز اپنی محبوبہ کو ایک خط نہیں لکھ سکتا تو ماں کو کیسے لکھ سکتا ہے ۔ ؟"

"ممی ۔" موتی نے شرما کر نیا کے زانو پر اپنا سر رکھ دیا۔

"موتی ۔" نیا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "میرا جی نہیں چاہتا کہ تمہیں اتنی دُور بھیجوں ۔ تمہارے جانے کے تصوّر سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے ۔ ایسے لگتا ہے ۔ ایسے لگتا ہے ۔" نیا کی آواز گلوگیر ہو گئی تو وہ خاموش ہو گئی۔

وہ مائیں جنہوں نے زندگی بھر بہادر باپ بن کر اولاد کو پالا ہو۔ اولاد کے سامنے آنسو بھی نہیں بہا سکتیں ۔ نیا نے اپنی آنکھوں میں آتے آنسو بڑی مشکل سے اپنے حلق میں اتارے ۔ تو موتی نے سر اٹھا کر نیا کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ممی اب تو دنیا میں دوری کا فاصلہ رہا ہی نہیں ۔ آدمی کہیں بھی ہو۔ ایک دن کی مسافت طے کر کے واپس آ سکتا ہے۔ آپ دیکھیں نا ؟ ہر روز کتنے لوگ ہوائی سفر کرتے ہیں ۔ یوں لگتا ہے ساری دنیا ہی سفر پر روانہ ہے ۔ ؟"

"بیٹا یہ تو ماں کا دل ہی جانتا ہے ۔ جب اس کا بیٹا سفر پر روانہ ہوتا ہے ۔ تو اس پر کیا بیت جاتی ہے ۔"

"ممی ۔ آپ بالکل دقیانوسی باتیں کر رہی ہیں ۔ آپ کو مجھے خوشی خوشی روانہ کرنا

ہیئے ۔"

میں تمہیں خوشی خوشی بھیج رہی ہوں موتی ! میں نے اپنی زندگی میں تمہاری وشی پوری کی ہے ۔ مر جاؤں گی تب یاد تو کرو گے ؟"

"ممی ۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ؟"

"بھئی ماں باپ کس کے سدا زندہ رہے ہیں ۔ ایک دن سب کو جانا ہوتا ہے"

"ہاں ۔ مگر آپ اتنی بوڑھی تو نہیں ہیں ممی ۔" اس پر نیا قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی ۔

"پگلا کہیں کا ۔ زندگی تو اللہ کے اختیار میں ہوتی ہے اور موت کا جوانی بڑھاپے تعلق نہیں ہے ۔ تھوڑی چپ رہنے کے بعد وہ بولی ۔" وہاں اپنا خیال رکھنا موتی ابھی بہت معصوم ہو۔ بظاہر جو دوست نظر آتے ہیں وہ دوست نہیں ہوتے تم جلدی کسی پر بھروسہ کر لیتے ہو۔ جب بچے کو دور دیس میں والدین سے الگ رہنا پڑتا ہے تو وہ جلدی بالغ ہو جاتا ہے ۔ تمہارے سامنے زندگی کی بیشمار ہیں ہوں گی ۔ تمہارا ضمیر تمہیں نئی راہوں کے بارے میں اشارا دے گا ۔ بیٹا کوشش کرو تم اپنے ضمیر کی آواز کو بہت سی آوازوں میں پہچان سکو ۔ بس یہی ایک آواز راہبر ہے ۔ راہنما بھی اور راہ بھی ۔ جو شخص یہ آواز پہچان لیتا ہے وہ زندگی کی پہچان لیتا ہے ۔"

موتی چپ بیٹھا رہا۔

امریکہ میں سب لوگ جاب کرتے ہیں ۔ سب خود کفیل ہیں ۔ وہاں کسی کام کو بھی ہب نہیں سمجھا جاتا ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ کچھ دنوں بعد ں اندازہ ہو جائے گا کہ تمہارے لئے کون سا جاب بہتر ہے لیکن بیٹا جو بھی کام کرو انت داری اور محنت سے کرنا ۔ انسان جس جگہ بھی ہو اپنے ملک کا نمائندہ ہوتا ہے ۔ بڑے بڑے سفیر وہ کام نہیں کر سکتے جو ایک عام شہری کر دیتا ہے ۔ کبھی

کوئی گھٹیا حرکت اس لئے بھی نہ کرنا کہ اس سے تمہارا ملک بدنام ہو جائے گا۔"

"اوکے ممی ۔۔۔" موتی نے آہستہ سے کہا۔ "مگر وہ لوگ جو پہلے اپنے ملک کو بدنام کر چکے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں انہیں کچھ نہیں کہتی اور کسی کو کچھ کہنا بھی نہیں چاہیئے۔ بس جہاں سے تم شروع کرو، وہاں سے ٹھیک شروع کرو۔ تمہارے لئے کچھ رقم میں نے بینک میں جمع کرا دی ہے اپنا ایک الگ اپارٹمنٹ لے لینا۔ جب تک جاب نہ ملے تم گزارا کر سکتے ہو۔ مجھے پابندی سے سارے حالات لکھتے رہنا۔"

"ممی۔ آپ کب آئیں گے وہاں۔؟"

"میرا آنا کوئی اتنا آسان نہیں ہے۔ بہت پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ جب اللہ کو منظور ہوگا آجاؤں گی۔" اتنے میں سیپ سلیپر گھسیٹتی ہوئی آگئی اور ایک پرچہ موتی کے ہاتھ میں دے کر بولی۔

"بھیا! یہ میری چیزوں کی فہرست ہے۔ بس جاتے ہی بھیجنا شروع کر دینا۔"

نیا نے موتی کے ہاتھ سے وہ فہرست لے کر دیکھی تو حیران رہ گئی۔

"سیپ۔" اس نے چلا کر کہا۔ "یہ اتنی چیزیں کیسے لے کر بھیج سکے گا۔ تم تو دیوانی ہو گئی ہو۔ بالکل پاگل ہو۔"

"ممی۔ بھیا وہاں جاب کرے گا۔ پیسے بچاتے گا اور میری سب چیزیں مجھے بھیجے گا۔"

"یہی سب لوگ سمجھتے ہیں اور اپنے عزیزوں کو لمبی لمبی فہرستیں بھیجتے رہتے ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ جو لوگ باہر کے ملکوں میں چلے جاتے ہیں۔ انہیں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ کتنی مشکل سے پیسہ کماتے ہیں اور وہ پیسہ ان فرمائشوں پر ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔"

"چھوڑیئے یہ لیکچر ممی۔" موتی نے کہا۔ "میں سیپی کے لیے سب چیزیں بھیجوں گا۔ بھائی جس لئے ہوتے ہیں۔؟"

"ہرا۔۔۔" سیپی نے نعرہ لگایا۔ "بھیا زندہ باد! بھیا مجھے بھی بلانے کی کوشش ؛" سیپی نے آہستہ سے کہا۔ نیا اٹھ کر سامنے بستر پر دراز ہو گئی اور خالی خالی ں سے چھت کی جانب دیکھنے لگی۔ دونوں بہن بھائی امریکہ کا نقشہ دیکھ دیکھ لی پلاؤ پکانے لگے۔

بالآخر نیّا کو موتی کے ارادوں کے آگے ہار مان لینا پڑی تھی۔ اس نے اسے امریکہ جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے داخلے کا بندوبست بھی کر دیا تھا اگلے مہینے موتی واشنگٹن جا رہا تھا اور اسی خیال سے نیّا کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا دونوں بھائی بہن نقشہ دیکھنے میں مگن تھے۔

"سیپی"، نیّا نے اسے پکارا۔ "جاؤ بیٹی اب جا کر سو جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔"

"ممی"، پرسوں تو مجھے بھی ہاسٹل چلے جانا ہے آج بھیّا سے گپ شپ لگانے دو۔ کل جلدی سو جاؤں گی۔

"اچھا پھر اپنے کمرے میں جا کر گپ لگاؤ۔" نیّا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

دونوں بچّے دوسرے کمرے میں چلے گئے تو نیّا نے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ اس نے اپنی مقفل دراز میں سے کچھ کاغذات نکالے۔ انہیں غور سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف فاروق تھا۔

"کیا ہو رہا ہے۔؟"

میدان صاف ہے۔ وہی کام کر رہی تھی۔ جو آپ نے دیا تھا۔"

میں گیارہ بجے تک اپنے کمرے میں ہوں اگر میری ضرورت پڑے تو آپ فون

؟" فاروق نے کہا۔

ٹھیک ہے۔" نیّا آہستہ سے بولی۔

پروگرام کا کیا ہوا۔؟" فاروق نے پوچھا۔

پکّا ہو گیا۔"

میری ہدایات یاد ہیں نا۔؟"

جی۔"

تو پھر میں کب ملوں۔؟"

میں واپس آ کر آپ کو فون کروں گی۔"

فون جلدی کریں ورنہ میں فکر کی سولی پر لٹکا رہوں گا۔"

میں جانتی ہوں۔" نیّا نے ہنس کر کہا۔

شب بخیر۔"

شب بخیر۔" نیّا نے ریسیور رکھ دیا۔ اب جب دوبارہ نیّا کا عذات دیکھنے آئی

کے چہرے پر اجالا تھا۔

سیپ کو ہاسٹل چھوڑ کر نیا کو ژک اور اس کے ساتھیوں کے پاس چلی گئی۔ انہوں نے چھانگلہ گلی اور خیرا گلی کے درمیان ایک بڑی سی پہاڑی کا انتخاب کیا تھا۔ نیچے نشیب میں ان کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس لئے نیا کو ڈھونڈنے میں دقت نہ ہوئی۔

نیا کو دیکھ کر سب لوگ بہت خوش ہوئے بلکہ کو ژک تو نعرے لگانے لگا۔

نیا نے سیاہ عینک لگا رکھی تھی اور سیاہ ہی جینز پہنی ہوئی تھی۔ جس کے باعث بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آج وہ بات بات پر قہقہے لگا رہی تھی۔ اس محفل کے ہر آدمی نے نیا کو پسند کیا تھا۔ پانچ چھ لڑکیاں بھی تھیں جو اپنے حلیے اور حرکات سے ماڈرن دکھائی دیتی تھیں۔

نیا نے ایک ایک کے پاس بیٹھ کر ان سے تفصیلی گفتگو کی اور ہر ایک کا تفصیلی تعارف حاصل کیا پھر وہ مسکراتی ہوئی اٹھی اور کو ژک کو لے کر اونچی نیچی پہاڑیوں میں گم ہو گئی۔ جب وہ لوگ واپس آئے تو سورج مغرب کی سمت جا رہا تھا اور پہاڑوں والی سرمئی شام نے شفق کی سرخ اوڑھنی اوڑھ رکھی تھی۔

خوب ہنگامہ رہا۔ ہلا گلا رہا۔ کھانا، گانا۔ سب ہی زندہ دل لوگ تھے اور

کر نیا کو حیرت ہو رہی تھی کہ سب لوگ تیس سے اوپر اور چالیس سے کم تھے زندہ دلی کا یہ عالم تھا جیسے ابھی جوان ہوئے ہوں اور امنگیں رسے تڑا رہی ہنستے بولتے یہ سب راولپنڈی کی طرف روانہ ہوتے واپسی کے وقت کو ژک یا کے پاس آ کر آہستہ سے کہا۔

"آپ ہمارے دو مہمان اپنے ساتھ لے جائیں۔"

نیا نے ادھر ادھر دیکھا۔ اُس نے دو خوش پوش آدمیوں کو آگے کر دیا۔ ایک کو سب لوگ شاہ جی کہہ رہے تھے۔ جبکہ وہ شاہ جی کم اور ہیرو زیادہ لگ رہا دوسرے کو سب بٹ صاحب کہہ رہے تھے۔ نیا نے ہامی بھری تو شاہ جی کہا۔

"شام اتر آئی ہے اگر آپ اجازت دیں تو اس وقت کاریں چلا لوں۔ راستے میں رہو جائے گا۔"

نیا ابھی پس و پیش میں تھی کہ بٹ صاحب بولے۔

"انہیں ڈر ہے کہ آپ انہیں اغوا کر کے نہ لے جائیں۔" اس پر نیا قہقہہ لگا کے اور کافی دیر تک ہنستی رہی۔

"آپ کے خیال میں کوئی مجھے اغوا کر سکتا ہے۔؟" نیا نے ہنس کر کہا۔

"عورت ہر عمر میں اغوا ہو سکتی ہے۔" شاہ جی بولے۔

"میں عورت نہیں بلا ہوں۔" نیا نے ذو معنی انداز میں کہتے ہوئے ایکسی لیٹر ال رکھ دیا۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھ گئے۔ نیا بولی۔

"جب میں تھک جاؤں گی۔ تو پھر آپ دونوں حضرات میں سے کسی کو زحمت ہ گی۔"

راستے بھر وہ بڑے شگفتہ موڈ میں ان سے ہنسی مذاق کرتی رہی اور باتوں باتوں

میں اس نے ان لوگوں سے بہت کچھ پوچھ لیا۔ پنڈی پہنچنے پر شاہ جی بولے۔
"وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ آپ بڑی دلچسپ شخصیت کی مالک ہیں۔"
"کبھی کبھی آپ ہم سے ملا کریں نا شاہ جی۔" نیّا نے ہنس کر جواب دیا۔
"ضرور ملیں گے۔"
"ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو ہمیں وہاں سڑک کے پار اتار دیں۔" بٹ صاحب نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ نیّا نے حیران ہو کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور بولی۔
"میں آپ لوگوں کو آپ کے گھر ڈراپ کروں گی۔"
"وہ جی۔" بٹ صاحب گھگھیانے لگے۔ "بس جی آپ کا شکریہ۔ ایسے ہی کوئی دیکھ لے گا۔"
"کوئی دیکھ لے گا۔" نیّا بڑے زور سے ہنسی۔
"آپ عورتیں نہیں پھر بھی ڈرتے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟" وہ دونوں شرمندہ سے ہو گئے۔
نیّا نے انہیں سڑک کے پار اتار دیا۔ ان کا اتا پتہ اپنی نوٹ بک میں لکھا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچی تو رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ بہت تھک چکی تھی مگر اپنے کمرے میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس نے فاروق کو فون کیا۔

شام دھیرے دھیرے رات کے کندھوں پر جھکتی چلی آ رہی تھی۔ کل رات یا کی طبیعت کچھ مضمحل سی تھی۔ گولیاں کھا کر طبیعت کو سنبھالتی وہ سب سے الی چھت پر آ گئی۔ کبھی کبھی اس کا جی اس بُری طرح سے گھبراتا اور اس کا دل ہ کھلی فضا میں نکل جاتے۔ دور دور۔ پرے پرے۔ شام کی کشتی میں نے والے طائروں کی مانند۔ آج بھی اس کا جی کلبلا رہا تھا اور سینے کے اندر ن زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ چھت پر آ کے اسے کچھ سکون ملا۔ یں موند کر ایک بنچ پر لیٹ گئی۔ موتی کو گئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ ہر ہفتے ایک خط آتا تھا۔ اس نے جاب بھی تلاش کر لیا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یونیورسٹی ا رہا تھا۔ موتی وہاں بہت خوش تھا۔ نیّا کا خیال تھا کہ وہ اداسیوں میں ڈوبے لکھے گا۔ اپنے وطن کی باتیں یاد کرے گا۔ شروع شروع میں جو تکالیف پیش ئیں ان کا تذکرہ کرے گا مگر اس نے تو کچھ بھی نہ لکھا تھا۔ ہمیشہ یہی لکھتا۔ ی آپ فکر نہ کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور بہت خوش ہوں حالات بھی صلہ افزا ہیں۔"

"تو موتی کا دل لگ گیا تھا۔ جوانی کا ہر جگہ دل لگ جاتا ہے۔ ابھی تو اور بھی خوبصورتیاں اور لطافتیں اس کی زندگی میں آئیں گی۔ کل ہی نیا سیپ سے مل کر آئی تھی۔ پہلے تو مہینے میں ایک بار جایا کرتی تھی مگر اس مہینے وہ تقریباً ہر ہفتے سیپ سے ملنے گئی تھی بلکہ اس جمعے کو وہ اسے اپنے ساتھ لانا چاہتی تھی مگر سیپ کے ٹیسٹ ہو رہے تھے اس لئے اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔

نیا کافی دیر تک بنچ پر بیٹھی موندے اپنے ماضی اور حال پر غور کرتی رہی آج کل اسے اپنا بچپن بہت یاد آتا تھا۔ پرانی باتیں اچانک نگاہوں کے سا آجاتیں کام کرتے کرتے یوں کوئی بات دھیان میں آجاتی جیسے انجانے میں کو قیمتی شے سرراہ مل گئی ہو جسے اس نے اٹھا کر اپنے پلو سے پونچھ کر اپنے ہ میں رکھ لیا ہو۔ زندگی کی راہ گزر میں کتنی قیمتی چیزیں ہاتھ سے گر جاتی ہیں۔ کچھ ادھر اُدھر۔ آدمی انہیں کہاں کہاں تلاش کرے۔؟

نیا ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ دور دور۔ شفق کی لا پرچھائیاں ملگجی رنگت اختیار کر چکی تھی۔ نیا اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پھر میزوں کی اوٹ۔ یوں جھانکنے لگی جیسے کوئی معصوم لڑکی ابھی جوان ہوتی ہو اور اسے جھانکنے میں لطف آیا ہو۔ پنڈی شہر شام کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ دور دور بتیاں جل چکی تھیں کے اودے کناروں میں ایک تنہا ستارا بھی نظر آرہا تھا۔ نیا نے اچٹتی سی نگاہ ڈا پورا شہر اس کے سامنے تھا۔ سب سے اوپر والی چھت پر کھڑے ہو کر تقریباً شہر نظر آتا تھا۔ اوپر سے شہر دیکھنا اسے بڑا عجیب لگتا تھا۔ جہاز میں بیٹھ کر بھی جو وہ نیچے کی طرف دیکھا کرتی تو اسے شہری آبادیاں بہت عجیب و غریب لگا کر یہ شہر اور ان شہروں کے یہ گھر جو اپنے اندر ہزار ہنگامے اور ہزاروں قیامتیں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہی شہر اور یہی گھر بلندی سے کتنے پراسرار اور پُرسکون نظر آ

جیسے کہ گیان دھیان میں مگن ہوں۔

اس نے چھت پر چاروں طرف گھوم کر دور و نزدیک کے ہر گھر کو دیکھا۔ پھر ا ایسے لگا کہ یہ گونگے گھر بولتے ہیں۔ بلاتے ہیں۔ مسکراتے ہیں اور روتے ہیں۔

ہر گھر ایک سربستہ راز کی طرح کھڑا ہے۔ ہر گھر اتنا بہادر ہے کہ اپنے اندر کی اپنے اندر ہی رکھتا ہے۔

پھر بھی کچھ باتیں گھر کے اندر سے کیسے باہر نکل جاتی ہیں؟

یا لوگوں کے دلوں میں چھید ہوتے ہیں؟

اور یہ گم صُم، چپ گپ گھر۔ جو سال ہا سال کسی انسان کے ساتھ گزارتے ہیں۔ اس انسان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے جو صرف ایک گھر بسانے دنیا یا اور وہی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

کاش یہ گھر بولتے ہوتے۔ نیا نے سوچا

کاش کاندھے کے فرشتوں کی جگہ یہ گھر گواہیاں دیتے اور روداد سناتے۔ انسان کے سفر کی روداد۔ ایک انسان کے شب و روز کی کہانی۔ ایک انسان کی کہانی۔ مگر افسوس یہ ساتھی گونگے ہیں اور ان گونگے ساتھیوں کے لئے انسان ہی خون خرابے کرتا ہے۔ مار دھاڑ کرتا ہے اور اپنا اعمال نامہ سیاہ کر لیتا ہے۔

نیا کو خود حیرت ہوئی کہ وہ آج اس انداز میں کیوں سوچ رہی تھی۔ ذرا کی ذرا وہ طبیعت ٹھیک کرنے اوپر والی چھت پہ آگئی تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ آج رات ایک ڈنر پر جانا ہے۔

ایک یورپین ایمبیسڈر کی بیگم اس کی بڑی پیاری سہیلی تھی۔ وہ ہر سال اپنا قومی دھوم دھام سے منایا کرتے تھے اور ہر سال نیا کے پاس ان کا دعوت نامہ

آیا کرتا تھا اور وہ پابندی سے ہر سال اس جشن میں شامل ہوا کرتی تھی۔ اس جشن میں شامل ہونے کا مطلب تھا کہ نئے لوگوں سے تعارف ہو۔ نایاب بوتیک کے نئے گاہک ملیں۔ سوسائٹی میں اسے کچھ اور مقام ملے۔ اس لئے ایسی تقریبات پر وہ ہمیشہ بالکل انوکھی وضع کے جدید ملبوسات پہن کر جایا کرتی تھی اسے معلوم تھا کہ وہ اپنی دکان کا خود ہی ایک چلتا پھرتا اشتہار ہے۔ اس بار بھی اس نے اپنے لئے موتی گوندھ کر ایک سیاہ میکسی بنوائی تھی۔ جس کے ساتھ زیورات پہننے کی بالکل ضرورت نہ تھی مگر نہ جانے کیوں اس بار نیاّ کا دل اس جشن پر جانے کو بالکل نہ چاہ رہا تھا۔ رات بھر وہ ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی اور سوتی بھی تو بڑے بھیانک خواب آنے لگتے۔ ابھی تک طبیعت کسلمند تھی۔

سات بج گئے تھے اس نے گھڑی دیکھی اور سوچنے لگی کہ جائے یا نہ جائے اسی وقت ملازم اسے ڈھونڈتا ہوا ادھر آیا۔ اور بولا

"بیگم صاحبہ آپ کا فون ہے" نیاّ نیچے چلی گئی۔ ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف فاروق تھا۔

"آپ جشن پہ آ رہی ہیں؟"

"سوچ رہی ہوں" نیاّ نے بجھے ہوتے دل سے کہا۔

"ضرور آیئے۔ میں بھی صرف آپ کی خاطر جا رہا ہوں"

"ضروری ہے۔؟" نیاّ نے پوچھا

"ہاں۔ آج رات بہت ضروری ہے"

"کیوں۔۔۔؟"

"یہ ایک یادگار رات ہے۔ میں آپ کو ایک خوشخبری سناؤں گا"

"خوش خبری یا نوید زندگی۔۔۔!"

"نوید زندگی کہہ لیجئے۔ کم از کم ہم دونوں کے لئے تو نوید زندگی ہی ہوگی"

"اچھا۔۔۔!" نیاّ نے پھر دھیمے سروں میں کہا۔

"آپ کچھ سست لگ رہی ہیں!"

"لگ نہیں رہی۔ سست ہوں"

"کیوں۔۔۔؟"

"تھک گئی ہوں"

"بس ایک قدم اور۔۔۔ وہ ہنس کر بولا" آخری لمحوں میں تھکاوٹ کا اظہار نہ کریں"

"آخری لمحے بڑے ظالم ہوتے ہیں" نیاّ نے سوگواری سے ہنس کر کہا۔

"کیوں کہ ان کے بعد فیصلہ جو ہو جاتا ہے" فاروق بولا۔

"کس بات کا فیصلہ۔۔۔؟"

"زندگی یا موت"

"زندگی یا موت۔" نیاّ ہنس پڑی" آپ بھی پہیلیوں میں باتیں کر رہے ہیں"

"آج ساری رات پہیلیوں میں ہی باتیں ہوں گی" فاروق سرگوشی میں بولا۔

"اچھا۔۔۔"

"ہاں! اور میں ذرا دیر سے آؤں گا۔ بالکل اچانک۔ آپ وہاں میرا انتظار کیجئے گا۔ لے میں نہ آؤں۔ واپس نہ جایئے گا"

"آپ کہیں تو زندگی بھر وہیں بیٹھی انتظار کرتی رہوں" فاروق ہنس پڑا۔

"اتنی کڑی سزا نہیں دوں گا۔ اچھا۔۔۔ اب جو کہنا ہے زبانی کہوں گا"

"ٹھیک ہے۔ اب تک تو میں فیصلہ نہ کر سکی تھی۔ جاؤں یا نہ جاؤں لیکن اب آپ کے فون پر جانا پڑے گا اور میں ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جاؤں گی"

"اچھا۔ خدا حافظ۔۔۔!"

"خدا حافظ۔" نیاّ نے فون رکھ دیا۔ مسکرا کر ایک انگڑائی لی اور غسلخانے میں چلی گئی۔

نیا جب محفل میں داخل ہوئی تو وہاں جشن شروع ہو چکا تھا۔ بے شمار لوگ مختلف ٹولیوں میں نظر آ رہے تھے۔ غیر ملکی عورتوں کے ساتھ ساتھ ملکی خواتین بھی نظر آ رہی تھیں جن کے تنگے شانے اور لمبے بال دور سے نظر آ رہے تھے۔

نیا نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور سلگا کر ہونٹوں میں رکھ لیا۔

جب وہ قریب گئی تو ہیلو نیا، ہائے نیا۔ کا شور مچ گیا۔

"اُف آج تو غضب ڈھا رہی ہو۔ یہ میکسی دیکھو۔" خواتین اسکی میکسی پکڑ پکڑ کے دیکھنے لگیں۔

"خدا کی قسم لاجواب ڈیزائن بناتی ہو۔ آج تم محفل کا دل لوٹ لو گی۔" نیا مسکرا دی۔

"میرا خیال ہے۔" ایک عورت بولی۔ "سال بھر کا بہترین شاہکار ڈیزائن ہوتا ہے۔ وہ تم اپنے لئے بناتی ہو۔"

اس پر سب ہنسنے لگے۔ انہیں ہیلو کہہ کر نیا کچھ آگے بڑھی تو عورتوں، مردوں کا ایک اور گروپ نظر آیا۔ اُن کے ہاتھوں میں گلاس تھے۔

"نیا تم تو شام کی پری بن کے آ رہی ہو۔" ایک آدمی نے کہا۔ نیا مسکرا دی اور بولی:

"شام کی پری تو آپ کے پہلو میں ہے۔" اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

اچانک نیا کی نظر کوزک پر پڑ گئی۔ نیا کو حیرت ہوئی کہ کوزک بھی اس محفل میں آیا ہوا تھا نے بھی نیا کو دیکھ لیا تھا اور تیز تیز قدموں سے اس کی طرف چلا آیا۔

"ہیلو نیا۔! مجھے امید نہیں تھی کہ آپ اس محفل میں ہوں گی۔"

"یہی کچھ میں آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" کوزک اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اس وقت نیا نے سنا ایک عورت دوسری سے کہہ رہی تھی۔

"یہ بڑی خوش قسمت عورت ہے۔ اس کو ہر محفل میں اس کا کوئی نہ کوئی عاشق مل ہے۔"

"ارے وہ دوسرا کہاں ہے۔؟"

"کون سا۔؟"

"جس کے ساتھ یہ آج کل برابر نظر آ رہی ہے۔"

"آ جائے گا وہ بھی اس کے پیچھے دم ہلاتا ہوا۔" اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

"آپ کچھ پئیں گی؟" کوزک نے سامنے بیرے کو آتے دیکھ کر پوچھا۔

"سیون اپ لے لوں گی۔" نیا نے جواب دیا۔ کوزک نے آگے بڑھ کر سیون اپ کا گلاس اٹھایا۔ نیا کے ہاتھ میں مسکراتے ہوئے پکڑا دیا اور بڑے ذو معنی انداز اپنا گلاس منہ کی جانب لے جا کر بولا۔

"چیئرز۔"

"چیئرز۔" نیا نے بھی کہا اور گھونٹ گھونٹ سیون اپ پینے لگی۔ وہ دونوں کرتے ہوئے لوگوں سے دور نکل گئے اور کونے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد۔ نیا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ لیتی تھی۔ رقص شروع ہو گیا تھا اور بہت سے جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اندر آرکسٹرا روم میں چلے

گئے تھے۔ نیا نے دیکھا دور سے فاروق آرہا تھا۔

نیا کا دل دھڑکنے لگا۔ فاروق بھی اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ شاید نیا کو تلاش کر رہا تھا۔ جونہی اس کی نظر نیا پر پڑی وہ ٹھٹھک گیا۔ پھر اسی انداز میں چلتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا اور اندر جاکر وہ ہجوم میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر نیا بیٹھی رہی پھر مسٹر کوزک سے معذرت کرکے اٹھی اور اندر کی طرف لپکی۔ راستے میں اسے باتیں بنانے والا گروپ مل گیا۔ نیا مسکراتی ہوئی ان کے پاس سے گزری، تو اس نے سنا ایک خاتون دوسری سے کہہ رہی تھی۔

"اس کا دوسرا عاشق بھی آگیا ہے۔"

"بیچاری اسی کو تلاش کرتی ہوئی اندر جارہی ہے۔"

"میرا خیال ہے آج دونوں میں دنگل ہوجائے گا۔"

"دنگل نہیں ہوگا۔"

"کیوں — ؟"

"عاشق فراخ دل ہوتے ہیں اور شوہر تنگ دل ہوتے ہیں۔" اس پر ایک بھرپور قہقہہ پڑا۔ پھر نیا دور نکل گئی۔ واقعی بہت لوگ تھے وہاں — کچھ واقف کار لوگوں کو ہیلو کہتی اور کچھ کی طرف صرف مسکراہٹیں پھینکتی نیا ہال کے دوسری طرف نکل گئی اس کا خیال درست نکلا۔ دوسری طرف لان میں بہت سی کرسیاں اور میزیں پڑی تھیں۔

ایک کرسی پر فاروق تنہا بیٹھا پیپسی کولا پی رہا تھا۔ نیا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گئی اور جاکر اس کے سامنے بیٹھ گئی پھر وہ دونوں گفتگو میں اتنے مگن ہوئے کہ اس وقت اٹھے جب کھانے کے لئے بلاوا دیا جارہا تھا۔ فاروق تو کھانا کھاتے ہی کہیں غائب ہوگیا۔ مگر نیا ادھر ادھر گھومتی رہی۔ تھوڑی دیر پہلے جو اس پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بھی دُور ہوچکی تھی۔ اس وقت وہ حیرت انگیز طور پر خوش تھی۔ ایسے جیسے واقعی نئی

زندگی ملی ہو۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر اب اسے مسٹر کوزک بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ سامنے اپنا ایک گروپ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ ان کی طرف بڑھی تو پتہ چلا کہ بڑی گرما گرم بحث ہو رہی ہے نیا بھی ان میں شامل ہوگئی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ کس بات پر بحث ہو رہی ہے کہ اچانک ایک آدمی بولا۔

"نیا جی آپ ہی فیصلہ کریں۔ لوگ اس وقت سخت پریشان ہیں اور سر جوڑ کر سوچ رہے ہیں کہ اگر تیل کی کھپت یونہی رہی اور ایک دن دنیا سے تیل ختم ہو گیا تو کیا حشر ہوگا۔ ؟"

"جب حشر کا وقت آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔" نیا نے ہنس کر کہا۔

"بھئی حشر کا وقت تو آج رات بھی آسکتا ہے۔" دوسرے آدمی نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کا خیال ہے کہ آج رات ہی تیل دنیا سے اٹھ جائے گا۔ ؟" ایک عورت نے دخل اندازی کی۔

"بھئی کون آج رات دنیا سے اٹھ رہا ہے ؟" ایک لمبے لمبے بالوں والا صحافی جلدی سے ان کے گروپ میں شامل ہوا اور بولا۔

"مگر اس سے پہلے مجھے ایک گروپ فوٹو بنا لینے دیجئے۔" اس پر سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔ سب لوگ جو اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے تھے وہ ایک دوسرے کے قریب ہوگئے اور اس نے ایک گروپ فوٹو بنالیا۔

"نیا جی —" وہ نیا کو مخاطب کرکے بولا۔ "آپ پر تو ایک فیچر لکھنے کو دل چاہتا ہے۔"

"تو آپ نے اب تک کیوں نہیں لکھا۔ ؟"

"آپ نے کبھی وقت ہی نہیں دیا۔"

"اب لے لیجئے وقت۔ ؟" نیا نے شوخی سے کہا۔

"اب اس وقت، یعنی جبکہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں"۔

"تو کیا ہے"۔ نیّا بولی۔ "آپ کو دو چار باتیں ہی کرنا ہیں نا؟ اور بعد میں حسب عادت ان کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیں گے"۔ اس پر صحافی زور زور سے ہنسنے لگا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ان لوگوں سے دُور نکل گئے اور سامنے لان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"میں آپ کو اپنی زندگی کے کچھ واقعات سناؤں۔ بچپن کے واقعات"۔

"ضرور سنائیے"۔ لیکن ٹھہریئے پہلے میں آپ کی کچھ تصویریں بنالوں"۔ اس نے نیّا کی دو چار تصویریں اتار لیں۔ تو نیّا اسے اپنے ابّا جی اور امّی کے بارے میں بتانے لگی کہ کس طرح انہوں نے بچپن میں اس کی تربیت کی۔ جانے کیوں بار بار جب وہ اپنی امّی اور ابا جی کا ذکر کرتی تو اس کی آنکھوں میں چمک سی آجاتی۔ اسے معلوم تھا کہ صحافی صاحب اس کی باتیں غور سے نہیں سن رہے تھے اور بیچارے نظریں بچا کر بار بار اِدھر اُدھر دیکھ لیتے تھے مگر جانے کیوں نیّا کا بے اختیار دل چاہا کہ آج وہ کسی سے اپنے ماضی کے بارے میں باتیں کرے۔ وہ سب کچھ جو اب تک نہیں کہا۔

محفل ابھی تک شباب پر تھی مگر رات کے بارہ بجے لوگوں نے جانا شروع کر دیا تھا۔ نیّا بھی اٹھی۔ سب سے خدا حافظ کہا اور پرس جھلاتی باہر نکلی۔ کاروں کی قطاروں میں سے اپنی کار نکالی اور پنڈی کی طرف روانہ ہو گئی۔

صبح نو بجے۔ اسلام آباد کے ایک بہت ہی فیشن ایبل گھرانے میں ناشتے میز لگی تھی۔ بچے اور بیگم صاحبہ ناشتہ کر رہے تھے اور صاحب دفتر جا چکے ۔۔اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ تو ملازم نے آکر بیگم صاحبہ سے کہا۔

"آپ کا فون ہے جی۔!"

"کون ہے؟" بیگم صاحبہ نے کرخت لہجے میں کہا۔

"جی وہ نام نہیں بتاتیں۔ بس آپ کو بلایا ہے"۔

"کس قدر واہیات لوگ ہوتے ہیں۔ بیگم صاحبہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھیں۔ "عین ئے کے وقت فون کرنے لگتے ہیں۔ شاید صبح ہی صبح فون کرنے کے علاوہ ں کوئی اور کام نہیں ہوتا"۔ یوں بڑبڑاتے ہوئے وہ فون تک پہنچ گئیں ریسیور اکر ہیلو کیا۔ پھر ایک دم شگفتہ سی آواز میں بولیں۔

"ارے نکی تم ہو۔ بتایا کیوں نہیں۔؟ کیا ہوا ہے صبح ہی صبح۔ اے نہیں"۔ صاحبہ ایک دم چونک گئیں۔ "سچ مچ۔ میں تو ابھی اٹھی ہوں۔ میں نے تو ابھی اخبار بھی نہیں دیکھا۔ اچھا یہ خبر سب اخباروں میں ہے۔ کیسے ہوا۔؟ توبہ۔

توبہ ایسے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ استغفراللہ۔" انہوں نے بڑے ماڈرن ا
میں تأسف کیا اور بولیں۔ "صبح صبح بڑی اہم خبر سنائی ہے تم نے ۔ میں ابھی اخ
دیکھتی ہوں اور پھر تم سے فون پر بات کروں گی۔ ٹھیک ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"
وہ اپنے رولرز ٹھیک کرتے ہوئے واپس میز پر آکر بیٹھ گئیں۔ توس پر مکھن لگا
ہوئے انہوں نے کرارے انداز میں اپنے نوکر کو آواز دے کر بلایا اور بولیں۔

"غلام محمد! صاحب نے اخبار پڑھ لیا تھا۔؟"

"جی بیگم صاحب۔؟"

"کہاں ہے اخبار۔؟"

"بیگم صاحبہ جی! صاحب کے کمرے میں ہوگا۔"

"جاؤ بھاگ کر لے آؤ۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ آج اخبار میں اتنی اہم خبر چھپ
ہے۔" نوکر بھاگا ہوا اخبار لینے دوڑا تو بیگم صاحبہ نے اسے دوبارہ پکارتے ہوئے
"دیکھنا غلام محمد! اردو کے سارے پرچے لے آؤ۔ انگریزی کا اخبار مت لانا
یہ حادثات کی خبریں تفصیل سے نہیں دیتے۔"

پھر بیگم صاحبہ تشکن آلود پیشانی لئے منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔ "صبح ہی صبح کیسی
بُری خبر سُن لی ہے۔ اللہ توبہ! پتہ نہیں اب سارا دن کیسے گزرے گا۔ یا الٰہی میری توبہ

"کیا ہوا ہے ممی؟" بچوں نے دلچسپی اور تجسس سے پوچھا تو وہ کاٹ کھانے
والے انداز میں بولیں۔

"تم لوگ چپ چاپ ناشتہ کرو۔"

پھر انہوں نے فرانسی انڈا کانٹے پر لپیٹا اور اپنا بڑا سا منہ کھول کر اس میں رکھ لیا۔
میں نوکر اردو کا اخبار اٹھائے بھاگا آیا۔ انہوں نے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے
شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے اخبار پکڑ لیا اور اسے اپنی گود میں بچھا لیا۔

صفحے کی پیشانی پر ایک خبر سیاہ حاشیوں میں درج تھی۔ خبر کے ساتھ کچھ تصویریں بھی
ہیں۔ خبر کسی حادثے کی ہو یا جشن کی، تصویریں اسے اہم اور خوشنما بنا دیتی ہیں۔ بیگم
صاحبہ نے جلدی جلدی ساری خبر پڑھ ڈالی اور تصویروں کو بھی غور سے دیکھا۔ انہوں
پوری پڑھی ہی تھی کہ ملازم اخباروں کے باقی پرچے بھی ڈھونڈ کر لے آیا۔ گود والا پرچہ
ں نے لاپروائی سے زمین پر گرا دیا اور باقی پرچے ملازم کے ہاتھ سے لے لیئے
تین اخبار دیکھنے کے بعد وہ بدمزگی سے بولیں۔

"تقریباً ایک ہی خبر ہے، تفصیل تو کسی نے دی ہی نہیں۔ اونہہ!" انہوں نے
سارے اخبار اٹھا کر دور پھینک دیئے اور گرم گرم قہوہ اپنی پیالی میں انڈیلنے لگیں۔
پہلا گھونٹ بھرتے ہی جیسے انہیں دل ہی دل میں خوشی محسوس ہوئی۔ جانے یہ
سی خوشی تھی جیسے کسی دشمن کے مرنے کی خوشی ہوتی ہے۔ اخبار پنکھے کی ہوا
سے پھڑ پھڑا کر دُور جا گرا۔ سب صفحات بکھر گئے اور وہ پنکھے کی ہوا کے زور پر
ل دور دور کھسکتے جا رہے تھے۔ جیسے کسی بچے نے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا ہو۔
ماں کی ہائے ہائے کی پروا کئے بغیر آگے گھسٹتا چلا جا رہا ہو۔ ایک صفحہ صوفے
کے بازو میں اُلجھ گیا تھا اور زخمی کبوتر کی طرح بُری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا اور سامنے بالکل
سامنے نیتا کی مسکراتی ہوئی تصویر نظر آ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے پھر ہوا کا ایک جھونکا آیا۔
اخبار پھڑک کر اڑا اور دور جا گرا اور مسکراتی ہوئی تصویر زمیں بوس ہو گئی۔

اسی وقت ڈرائینگ روم کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ماڈرن خواتین کا ایک
دل اندر داخل ہوا۔

"ارے۔ ٹوٹو تو ابھی تک ناشتہ کر رہی ہے۔" نجی نے کہا۔

"آؤ آؤ بیٹھو!" بیگم صاحبہ نے کھڑے ہوتے کہا۔ تم بھی چائے پیو۔"

"چائے تو ہم نے نجی کے گھر پی لی تھی۔" ایک بیگم بولی۔ "تم نے یہ خبر پڑھی؟" ہر ایک

کے ہاتھ میں کسی نہ کسی اخبار کا صفحہ تھا۔ للّی نے ابھی تک ڈریسنگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔ پوپی نے ہاتھ میں نیل فائیلر پکڑا ہوا تھا اور اپنے لمبے مخروطی ناخنوں کو رگڑ رگڑ کر سنوار رہی تھی۔

"تم نے سُنا!"

"تم نے پڑھا!"

سبھی ملی جلی انگریزی، اُردو میں ایک دوسرے سے سوالات کرنے لگیں۔ ان میں سے کچھ خواتین رات والی پارٹی میں موجود تھیں اور انہوں نے وہاں نیلا کو سیاہ لباس میں رات کی دیوی بنے ہوتے دیکھا تھا اور اب اس پر سیر حاصل تبصرے کے موڈ میں تھیں۔

"ہائے بیچاری!" نونی نے کہا تو للّی برس پڑی۔

"ایسی عورتوں کو بے چاری نہیں کہنا چاہیئے۔ قیامت برپا کی ہوئی تھی اس۔ شہر میں۔"

"ہاں بھئی۔" نکّی نے لمبی سانس چھوڑ کر کہا۔ "بُرے کاموں کے بُرے نتیجے۔"

"بس اللہ سے توبہ کرنی چاہیئے۔" ایک اور اپنے ننگے کندھے اچکا کر بولی۔

"پر یہ سب ہوا کیسے؟"

"اخبار میں تو یہ ساری تفصیل درج نہیں ہے۔" دوسری نے جواب دیا۔

"وہ لوگ کون تھے؟" نکّی نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔"

"بھئی خود ہی سمجھ لو نا۔ ایسے واقعات جوشِ رقابت میں ہوتے ہیں۔ کسی ایک آدمی سے تو اس کی دوستی تھی نہیں۔ کتنوں کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ کسی نے طیش میں آکر اپنا بدلہ لے لیا ہوگا۔"

ارے وہ دونوں تو رات اس کے ساتھ تھے۔"

ہاں۔ انھی میں سے کوئی ہوگا۔"

اللہ جانے!"

مگر اس عورت کو دیکھو، ایک کو بھگتا کر بے حیائی سے دوسرے کے پاس چلی

قیب نے تعاقب کیا ہوگا۔ ایک ہی رات میں اتنا بڑا گھپلا نہیں ہو سکتا نا!"

سی لئے۔"

ہاں۔" سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں۔

بھئی ہنسو نہیں۔" پوپی نے اپنے ناخن سنوار لیے تھے۔ پرس کھول کر اپنا فائیلر

ہوئے بولی۔ "عبرت کا مقام ہے۔"

پتہ نہیں بیچاری کا کیا حال ہوا ہوگا؟" نکّی کو ہمدردی ہونے لگی۔

سپتال چلیں؟" ایک طنزیہ انداز میں بولی۔

ہاں تاکہ پولیس رجسٹر میں ہمارا نام بھی درج کرلے۔"

ائے بیچاری۔"

پھر وہ اس طرح باتیں کرنے لگیں جیسے تھوڑا سا وقت اس پر ترس کھا کر انہوں

نے بے چاری کی سات پشتوں پر احسان کر دیا ہے۔

پھٹے ہوئے برقعے والی ایک غریب عورت بازار میں دہی کا دونا لئے ا
گھر جا رہی تھی۔ ہانپتا کانپتا ہوا برابر والی گلی سے نکلا اور بلند آواز میں ایک ہی خبر
لگا۔ خبر کی بار بار تکرار سے لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے بلکہ جھپٹ جھپٹ کر اخ
خریدنے لگے۔

اس عورت نے اپنا دل تھام کر یہ خبر سنی اور پھر اپنے میلے کچیلے دوپٹے
پلّو سے ایک روپیہ کھولا اور اخبار خرید لیا۔ ایک بند دکان کے تھڑے پر بیٹھ کر ا
نے آہستہ آہستہ وہ ساری خبر پڑھی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ کسی نے
کی طرف دھیان نہیں دیا۔ آج لوگوں کے پاس ایک چلتا ہوا موضوع تھا۔ ایک
اس کے قریب سے گزری تو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور پوچھنے لگی۔

"اے! تیرا کوئی مر گیا ہے؟"

"یہ دیکھو۔ اس عورت کو دیکھو۔" برقعے والی عورت نے میلے دوپٹے
اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ایک ہفتہ ہوا اس نیک عورت نے
ہزار روپے خرچ کر کے میری بیٹی کی شادی کروائی تھی۔ میں اسے جانتی ہ

ایک روز اس کی دکان پر جا کر اپنا دکھڑا رویا تھا اور وہ اٹھ کر میرے ساتھ
تی۔ ہائے ایسے نیک لوگوں پر بھی ظالم ہاتھ اٹھاتے ہیں۔" وہ پھر اپنے
پٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

اسلام آباد کے ایک خوبصورت، خاموش خاموش گھر میں سفید بالوں والا آدمی اپنے ایک ہاتھ میں عینک اور دوسرے ہاتھ میں اخبار پکڑے بے سُدھ تھا۔ نہ تو ہاتھ سے اخبار چھوڑنے کی ہمت ہو رہی تھی اور نہ میز پر عینک رکھ دینے کی سکت تھی۔ ایسا لگتا تھا، اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ اس نے اس خبر کو کئی اخباروں میں پڑھا تھا لیکن پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہر بار جب وہ یہ خبر پڑھتا تو اسے ایسے لگتا جیسے اس کے اپنے ہی گھر پہ بجلی گری ہے۔

وہ بینک کا وائس پریذیڈنٹ تھا۔

آج بینک کے مین آفس میں اس نے ایگزیکٹوز کی ایک میٹنگ بُلا رکھی تھی 9 بجے اسے میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ وقت اور اصول کا بڑا پابند ہے لیکن آج اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ کئی بار اس نے اخبار اپنے سامنے پھیلا دیا۔ قومی اور بین الاقوامی خبریں اس کے سامنے پھیلی ہوئی تھیں۔ جنہیں روزانہ اچھی طرح پڑھ کے وہ گھر سے نکلا کرتا تھا۔ مگر آج ایک سیاہ حاشیے پہ اس کی نظر پڑی تو پھر نہ اٹھ سکی۔

سے حادثات کی خبریں اچھی نہیں لگتی تھیں اس لئے وہ ان دردانگیز تصویروں
ں کی طرف کبھی توجہ نہیں دیتا تھا۔ مگر آج اچانک ایک حادثے کی خبر پر اس
اٹک گئی تھی۔

یا!

چھوٹا سا لفظ اس کے دل کے بھنور میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ یوں تو اس کی زندگی
سے طوفان آئے تھے، کئی بار حالات نے بے دست و پا کیا تھا۔
نے اس کے لیل و نہار کا سکون لوٹ لینا چاہا تھا۔ تنہائی کے ناگ پھن اٹھائے
ف بڑھے تھے۔ اس کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوا تھا مگر ایک ننھا سا نام پھانس کی
ے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ پہلے پہل اسے اس پھانس سے الجھن ہوئی تھی۔
لیجے میں اٹک جائے تو سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے اس کا جی چاہتا تھا
نیا سے کوئی نشتر مستعار لے اور چپکے سے اس پھانس کو نکال کر اس
سے چھٹکارا حاصل کر لے مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا اسے احساس ہوتا گیا کہ
ا تو اس کی زندگی ہے۔ اسی کرب میں تو جینے کا مزا ہے۔ اسی اذیت کو تو
کہتے ہیں۔ اذیت جب راحت بن جاتی ہے تو جینا آسان ہو جاتا ہے۔ سو
خود ہی اس نام کو مقدس جان کر دل کے نہاں خانے میں چھپا لیا تھا۔
باز نے کئی بار سوچا تھا کہ اس نے نیا سے بچھڑنے کے بعد شادی کیوں نہیں
یا تک اس کی ماں زندہ رہی اسے اپنے سر کی قسمیں دیتی رہی مگر اب شہباز
سے عادی ہو چکا تھا۔ ایسی ہی جھوٹی قسمیں اس کی زندگی کا دھارا موڑ چکی تھیں۔
ں کے دل میں ماں کا جو تقدس تھا وہ ہٹ چکا تھا۔ اب وہ صرف اپنے فرض
کے لئے جی رہا تھا۔ جب ماں نے ہر طرح دباؤ ڈال کر دیکھ لیا تو خاموش ہو گئی
سے اس نے یوں ٹوٹ کر عشق کیا تھا کہ اب اس کے بغیر دو قدم جانے کے

بھی قابل نہیں تھا مگر اسے نیّا سے گلہ بھی نہیں تھا۔ چونکہ اس نے خود ہی تو عشق کے تقاضے نہیں نبھاتے تھے پھر نیّا سے وفا کی توقع کیوں رکھتا۔ جب اس کی ماں مر گئی تو اپنی تنہا، ویران زندگی کو سامنے رکھ کر اس نے سنجیدگی سے سوچا۔ گھر بسانے کا سوچا تھا۔ کئی دوست احباب اس کی مدد کو آگے بڑھے تھے۔ اسے کئی لڑکیاں دکھائی بھی گئیں۔ کئی لڑکیوں کے ساتھ اس نے چائے بھی پی، گفتگو کی، مسکرایا، ہنسا۔ مگر وہ گلابی گلابی نشیلی آنکھوں والی لڑکی، جو پہلے پہل ادھ کھلے پھول کی طرح اس کی زندگی میں آئی تھی۔ جس نے پہلی بار اس کے تکیے پر اپنی معطر زلفیں بکھیری تھیں اور جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ان دیکھے خوابوں کے چور نقب لگائے بیٹھے تھے۔

اس لڑکی کو وہ جی بھر کے پیار بھی نہیں کر سکا تھا کہ سماج نے اس پر کڑے پہرے بٹھا دیئے اور وہ لڑکی اس کا گھر ہی نہیں دل بھی خالی کر کے چلی گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اندر سے ٹوٹ چکا ہے، بکھر چکا ہے۔ خالی ہو چکا ہے۔

جوان لڑکی ایک آگ ہوتی ہے اور جب وہ کسی مرد کے نزدیک آ کر بیٹھتی ہے تو اس آگ میں ایک خوشبو بھی شامل ہو جاتی ہے۔ مرد بے اختیار اس کی طرف لپکتا ہے اگر اس آنچ کا اثر مرد پر ایسا ہو، جیسے آگ کا پٹرول پر ہوتا ہے تو وہ بے قرار ہو اٹھتا ہے تب اسے شادی کیے بنا چارہ نہیں رہتا مگر شہباز نے صاف محسوس کر لیا تھا کہ کسی لڑکی کی آنچ اور مہک نے اسے بے قرار نہیں کیا تھا۔ کسی دوشیزہ میں سے اسے وہ تپش آنچ نہیں ملی تھی جو اس کے من کے پندار اور تن کے لالہ زار کو پھونک دیتی۔ وہ کسی بھی لڑکی کے پاس بیٹھ کر برف کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس نے کئی بار تنہائی سے فائدہ اٹھا کر لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر بھی دیکھا مگر نہ تو اس کے جذبات نے انگڑائی لی اور نہ رگوں میں سوالی بن کر کھڑا ہوا۔

تب اس نے سوچا، روبوٹ اور شوہر میں فرق ہونا چاہیئے۔ کسی لڑکی کے ساتھ

سے بڑا کوئی ظلم نہیں کہ اسے شوہر کی جگہ روبوٹ مل جاتے۔ احساس و جذبات سے عاری، مشینی انداز میں فرائض بجا لانے والا پتلا۔

شہباز نے اپنی شکست مان لی تھی کہ نیّا کے سوا وہ کسی سے پیار نہ کر سکتا تھا۔ مگر اس کے پیار کا اب بھی کوئی فائدہ نہ تھا وہ نیّا کے بارے میں ہر خبر رکھتا تھا۔ مگر پس پردہ رہتا تھا۔ جب نیّا نے دوسری شادی کر لی تھی تو اسے دکھ نہیں ہوا تھا اور وہ اور کیا کرتی؟ مگر نیّا نے جس مرد کا انتخاب کیا تھا وہ اسے پسند نہیں آیا تھا اور بدلی ہوئی صورت بھی اسے اچھی نہیں لگی تھی مگر وہ کون تھا اعتراض کرنے والا۔ اس بچے کا باپ ہی تو تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نیّا اسے ایک بزدل آدمی سمجھتی ہے اور بزدل کی محبت پر کوئی عورت بھروسہ نہیں کرتی۔ تبھی اس نے اپنی ساری توجہ اپنے پیشے کی طرف مبذول کر دی تھی۔ اپنے پیشے سے عشق کیا تو ترقی کی منزلیں خود ہی راہ میں آ کھڑی ہوئیں۔ پھر اس نے سنا کہ نیّا نے طلاق لے لی ہے تو اسے ایک انجانی سی خوشی ہوئی۔

جانے کیوں؟ پھر کتنا ہی عرصہ گزر جانے کے بعد اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ "بھئی تم خوش کیوں ہوئے تھے؟" تو دل گونگا بن گیا۔

نیّا نے اپنے قدم جما لئے تو شہباز نے بھی اپنا بھرم نہیں توڑا۔ جب سے وہ اسلام آباد آیا کئی بار اس کا دل چاہا کہ نیّا سے جا کر ملے مگر ڈرتا تھا کہ نیّا کیا سمجھے گی؟ کیا کہے گی؟ زیادہ یہ بھی تو پوچھ سکتی ہے کہ اتنے عرصے بعد کیا لینے آئے ہو؟ جب کبھی اس کی موتی سے ملاقات ہوتی، وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے چپ ہو جاتا۔ وہ کبھی موتی سے کوئی بات نہیں کر سکا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ موتی سے پوچھے۔

"بیٹا! تمہاری امی کا کیا حال ہے؟"

"بیٹا! تمہاری امی مجھے یاد کرتی ہے یا نہیں۔؟"

وہ انتظار میں رہتا کہ موتی کچھ کہے مگر وہ کچھ کہے بنا یوں اُٹھ جاتا جیسے زبردستی بھیجا گیا ہو۔

اسلام آباد آنے کے بعد اس کے دل میں یہ شدید خواہش کئی بار ابھری تھی کہ وہ موتی کو اپنے پاس گھر میں رکھ لے۔ اسلام آباد میں پہاڑوں کی آغوش میں اسے خوبصورت سجا سجایا گھر مل گیا تھا مگر یہ گھر بچوں کی آہٹوں کو ترس رہا تھا۔

ابھی چھ ماہ پہلے موتی اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ بڑا خوش تھا اس لئے کہ امریکہ جا رہا تھا اور نیا نے اسے زبردستی بھیجا تھا یہ کہہ کر کہ ڈیڈی سے مل کر ان کی دعائیں لیتے جاؤ۔ اس وقت شہباز نے جھجکتے ہوئے پوچھ لیا تھا۔

"بیٹا! اپنی امی سے اجازت لے لی ہے؟"

"جی ہاں۔" موتی نے جواب دیا تھا۔

"انہوں نے تمہیں خوشی خوشی اجازت دے دی ہے؟"

"جی ہاں۔" موتی نے اسی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے پھر چلے جاؤ۔"

موتی، شہباز ہی کا بیٹا تھا مگر وہ اس پر تمام تر اختیار نیا کا ہی سمجھتا تھا۔ موتی کو اپنے ساتھ مانوس کر کے یا اپنے پاس رکھ کے وہ نیا کے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کے ذہن میں ابھی تک ایک خوبصورت سی آس تھی ایک اچھوتا سا خیال موجود تھا۔ بچھڑے ہوئے لمحات کے مل جانے کی آس یا گزری جوانی کے لوٹ آنے کا خیال۔ اس نے اپنے دل کے دروازے بند نہیں کئے تھے ابھی ایک سال ہی تو ہوا تھا اسے اسلام آباد آئے ہوئے۔ اس ایک سال میں اس نے صرف ایک بار نیا کی جھلک دیکھی تھی۔ ایک دن وہ بینک کی لمبی سی موٹر میں اپنے شوفر کے ساتھ جا رہا تھا۔ مری روڈ پر وہ زن سے اس کے قریب سے گزر

گئی تھی۔ بہت تیز موٹر چلا رہی تھی۔ عجلت میں تھی اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

یہ جو عورت ہے نا! بکھری ہوئی، ٹوٹی ہوئی شہباز میاں! یہ سب تمہارے کارن ہوئی!

"میں بھی تو ٹوٹ گیا ہوں۔" شہباز نے اپنا شکستہ چہرہ آئینے میں دیکھا۔

"تم مرد ہو۔ دیکھو کس شان سے رہ رہے ہو۔ مگر وہ عورت ہے۔ اپنی آن کی سربلندی کی خاطر تھکتی چلی جا رہی ہے۔" تب اس نے گھر جا کر کئی بار سوچا۔ سو طریقوں سے سوچا کہ نیا سے کس طرح ملا جائے۔ یہ رسم و راہ کیسے پیدا کی جائے۔ پر آج۔ آج ساری خواہشات مسمار ہو گئی تھیں۔

صبح کا تازہ اخبار اس کے سامنے کھلا ہوا تھا اور ایک خبر جلی سرخیوں میں اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

"نایاب بوتیک کی پروپرائٹر نیا پر قاتلانہ حملہ"

"بیان کیا جاتا ہے کہ کل شب کچھ نامعلوم افراد نے میڈم نیا پر قاتلانہ حملہ کر دیا واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ کل رات بارہ بجے شب میڈم نیا ایک تقریب کے اختتام پر اسلام آباد سے پنڈی آ رہی تھیں کہ ایک ویران موڑ پر دو کاروں نے انہیں آگے پیچھے سے گھیر لیا۔ کچھ نامعلوم افراد نے ان پر گولیاں چلا دیں۔ جب وہ اپنی سیٹ پر ڈھیر ہو گئیں تو حملہ آور غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک گشتی پولیس گاڑی وہاں سے گزری۔ انہوں نے میڈم نیا کو اسپتال پہنچایا۔ پولیس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ اسپتال میں میڈم نیا کی حالت تشویشناک ہے۔"

نیا کی حالت تشویش ناک ہے۔ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ سدا خطرے میں ہی رہی۔ شہباز بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اس بھری دنیا میں نیا کا اپنا کوئی نہیں ہے۔ بھائیوں نے کبھی اس

کا ساتھ نہیں دیا تھا اور پھر ایسے سنگین واقعے کے بعد تو کوئی عزیز بھی اس سے رشتہ جوڑنا پسند نہیں کرے گا۔ کوئی بھی اس کی طرف سے مقدمے کی پیروی نہیں کرے گا۔ اس بدنصیب کا جوان بچہ بھی اس سے کوسوں دُور ہے۔

شہباز کی بے چینی سوا نیزے پہ پہنچ گئی۔ جب سوچوں نے اسے شل کر دیا تو اس نے ڈائریکٹری اٹھا کر اس میں سے ایک فون نمبر ڈھونڈا اور پھر اپنے ایک دوست کا نمبر ملانے لگا جو ملک کا نامی گرامی وکیل اور اس کا مخلص دوست تھا۔

فاروق اپنی جیپ میں دو پولیس افسروں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کی جیپ عین سپتال کے آگے آکر رک گئی۔ بغیر توقف کئے وہ جیپ سے کودا، اس کے پیچھے باقی افسر بھی کودے پھر وہ تقریباً دوڑتا ہوا سپتال کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر سپیشل وارڈ کے CONSTANT CARE ROOM میں انہوں نے نیّا کو رکھا ہوا تھا۔

فاروق تین دن سے ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں شہر کے مضافات میں گیا ہوا تھا۔ اس نے آج آتے ہی یہ خبر اخباروں میں پڑھی تھی اور صورتِ حال کا اندازہ کرنے کے لئے سپتال آیا تھا۔

جب وہ نیّا کے کمرے کے باہر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ دو پولیس افسر وہاں پہلے سے موجود تھے اور پانچ چھ جرنلسٹ اور فوٹو گرافر ایک بنچ پر بیٹھے بے تحاشا سگریٹ پھونک رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں نوٹ بک تھی اور کسی کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔ دروازے سے دُور جولی ایک بنچ پر بیٹھی رو رہی تھی فاروق نے نظر اٹھا کر جولی کی طرف دیکھا۔ مسلسل رونے سے جولی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

کسی سے کچھ پُوچھنے کی بجائے فاروق اندر چلا گیا۔ سب کو معلوم تھا۔ فاروق کون

ہے۔ اس وقت وہ اپنے یونیفارم میں بھی تھا، اس لئے کسی نے نہیں روکا۔ آتے ہی
س نے تمام متعلقہ ڈاکٹروں سے نیا کے بارے میں بات کر لی اور اب اسے دیکھنے
مرے میں آیا تھا۔

نیا ایک پلنگ پر بے سُدھ پڑی تھی۔ اس کے دو آپریشن ہو چکے تھے۔ ایک گولی
س کی کھوپڑی میں لگی تھی اور دوسری بائیں بازو میں۔ اس کے سر اور بازو پر پٹیاں بندھی
تھیں۔ ایک طرف اسٹینڈ پر خون کی بوتل لٹک رہی تھی جس سے اسے خون چڑھایا
جا رہا تھا۔ دوسری طرف آکسیجن کی نالی اس کی ناک میں لگی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ یوں
سکون سے لیٹی تھی جیسے اُسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ڈیوٹی پر جو نرس تھی فاروق نے اس سے چارٹ لے کر دیکھا اور پھر سرگوشی
میں اس سے چند سوالات کیئے۔ وہ سراسیمہ سراسیمہ چاروں طرف گھوم کر کونے میں پڑی
ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار کر گود میں رکھ لی اور جیب سے رومال
نکال کر اپنے چہرے کا پسینہ صاف کرنے لگا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں
بند کیں اور ایک لمبی سانس چھوڑی پھر اپنی بند آنکھیں کھول کر گھبرا کے کمرے کے
چاروں کونوں میں دیکھا۔ نرس نیا کے سرہانے کھڑی تھی اور قطرہ قطرہ خون جو اس
کے بازو کی نس میں جا رہا تھا، اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

فاروق نے بھی ان سرخ قطروں کو دیکھنا شروع کر دیا جو آہستہ آہستہ نیا کے بدن
میں جذب ہو رہے تھے۔ پتہ نہیں کس کا خون تھا؟ کس نے بیچا تھا؟ اور کیوں بیچا
تھا؟ کوئی مجبوری تھی یا فرض شناسی! اس خریدے ہوئے خون سے ایک زندگی
بچائی جا رہی تھی۔ قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں، ایک انسان بے دردی سے
دوسرے کی زندگی سے کھیل جاتا ہے، خون کر دیتا ہے پھر انہی بے درد انسانوں کا
خون دوسرے انسانوں کے کام آتا ہے اور ان کی زندگی بچا لیتا ہے۔ مگر اس خون

مول ہے جو نیا کی کار کی اگلی سیٹ پر بہا تھا۔

ایک مجبور اور بے کس عورت کا خون!

اس نے خون کی بوتل سے نظریں ہٹا کر نیا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُسے
ن کی رات والی نیا یاد آ گئی۔ خوب بن ٹھن کر محفل میں چمک رہی تھی اور کس قدر
ی لگ رہی تھی۔

اس کے مرمریں ہونٹوں پر شاید اسی رات والی لالی ٹھہر گئی تھی۔ ورنہ وہاں زندگی
ئی نشان نہیں تھا۔

کمرہ خاموش تھا۔

فاروق کو کمرے کی پُراسرار خاموشی سے بھی ڈر آنے لگا! وہ چاہتا تھا اس کمرے
زندگی کی آہٹ ہو، اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کانچ کے گھر میں بیٹھا ہے اور
ٹ ہونے سے اس کے ٹوٹ جانے کا ڈر ہو۔ اسے ایک پرانا شعر یاد آ گیا۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا!

انسان تو کانچ سے بھی نازک ہے۔ اس نے نیا پر پڑی سفید چادر کی طرف
بھا جس کے نیچے زخمی دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ سانس کی رفتار بہت آہستہ
ا۔ یہی رفتار نبض کی بھی ہو گی۔

آہستہ آہستہ!

"اُف خدایا!" گھبرا کر فاروق نے پھر اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں
کر لیں۔ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ سینے کے اندر اس کے صحت مند
ا کی دھک دھک صاف سنائی دے رہی تھی مگر اسے اپنے دل کی دھک
لک سے بھی خوف آنے لگا۔ اگر ابھی ابھی یہ دل بند ہو جائے تو؟ اس نے متوحش

ہو کر اپنے ہاتھ سینے سے ہٹا لئے۔ پھر انگلیاں ایک دوسرے ہاتھ میں پھنسا کر سر کی پشت تلے رکھ لئے۔ ہاتھوں کے تکیے پر سر ٹکا کر وہ چھت کی جانب دیکھنے لگا۔ ناحق اس نے ایک مظلوم اور بے آسرا عورت کو اس کام میں پھنسایا۔

اسے نیاّ کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات یاد آنے لگی۔

نیاّ، رازی کے ساتھ جب پنڈی ایئرپورٹ پر اتری تھی تو تھکی تھکی اور چپ چپ سی تھی۔ اسے نیاّ کے چہرے پر عجیب سا سوز نظر آیا تھا۔ یوں نیاّ اس کے بچپن کے دوست اور کزن رازی کی بیوی تھی۔ رازی اور وہ اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے مگر دونوں کی اٹھان میں بہت فرق تھا۔ فاروق کے والد محکمہ انٹیلی جنس کے ایک ذمے دار آفیسر تھے۔ بہت ہی محبِ وطن اور انسان دوست قسم کے آدمی تھے۔ ایک کیس کی تفتیش کرتے ہوئے انہیں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تو گھر کی ساری ذمے داریاں فاروق کے کاندھوں پر آپڑی تھیں۔ تعلیم ختم کرتے ہی فاروق نے بھی انٹیلی جنس کی طرف رجوع کیا اور آج اپنے باپ کی طرح وہ انتہائی ذمے دار اور فرض شناس آفیسر تھا۔

فاروق کو بھی اپنے پیشے اور وطن سے عشق تھا۔ اس لئے جب اسے معلوم ہوا کہ رازی غیر قانونی کارروائیاں کر رہا ہے تو اس نے رازی کو سمجھانا شروع کر دیا۔ نتیجتاً دوستی اور رشتے داری میں دراڑیں پڑ گئیں۔ کبھی اچانک مُلاقات ہو جاتی، تو دونوں ایک دوسرے کا کلیجہ طنز کے تیروں سے چھلنی کر دیتے۔ اس روز ایئرپورٹ پر فاروق نے نیاّ کو رازی کے ساتھ دیکھا تو اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کسی انتہائی شریف گھرانے کی لڑکی ہے اور اب رازی اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے گا۔ اس لئے اس نے نیاّ کو اپنا ذاتی کارڈ دے دیا تھا۔

وہی ہوا۔ جب رازی کا سارا گینگ پکڑا گیا تو فاروق نے نیاّ کی مدد کر کے اس کو

یقانہ طریقے سے نکال لیا اور نیاّ کی خواہش کے مطابق اسے پنڈی میں سیٹل کر دیا۔

فاروق کی زندگی کے بارے میں رازی نے نیاّ کو سب کچھ بتا دیا تھا کہ فاروق بن ہی سے اپنی ایک خالہ زاد سویرا سے محبت کرتا تھا۔ دونوں ایک ہی گھر میں ساتھ پلے بڑھے اور پھر دونوں کی شادی ہو گئی۔ لیکن اگلے ہی سال ایک حادثے سویرا اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ تب سے فاروق نے شادی نہ کر لینے کی قسم کھالی

ایک دن نیاّ نے اس سے پوچھا تھا

"فاروق! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"نیاّ! جتنے دوست مجھے شادی کا مشورہ دیا کرتے تھے میں نے ان سب کو دیا ہے۔" فاروق نے جواب دیا تھا۔

"بڑا انوکھا انداز ہے دھمکانے کا۔" نیاّ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہاری ت رہنا چاہتی ہوں۔"

"تم عقلمند خاتون ہو۔"

"اصل میں مجھے تمہاری بیوی پر بے تحاشا رشک آرہا ہے۔"

"کیوں؟"

"بھلا کہیں ایسا ہوا ہے کہ بیوی کے مرجانے کے بعد آدمی ہر عورت کو اپنے م سمجھ لے۔ انتہائی غیر معمولی بلکہ غیر مردانہ فعل ہے، اگر فی زمانہ کسی عورت ہر ایسا ہو تو مجھے اس پر ضرور رشک آئے گا۔ جبکہ محبتوں کے بل بوتے پر ل کرنے والے مرد بھی تھوڑا عرصہ گزر جانے کے بعد بیویوں کا گلا گھونٹتے ہ نظر آتے ہیں۔"

"ہر دور میں مجھ جیسے مرد ہوتے ہیں نیاّ!" فاروق نے کہا۔ "تمہیں ممتاز محل پر

رشک نہیں آتا۔ شاہ جہاں بھی تو ایسا ہی مرد تھا۔"

"ہاں! شاہ جہاں نے اپنی محبت کو تاج محل کی صورت عطا کی۔ اس کا عشق تاج محل بن کے ساری دنیا میں مشہور ہوا۔ پھر بھی کبھی کبھی تو مجھے یہ کتابی کہانی کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ اصل میں تاج محل عجوبہ نہیں، عجوبہ یہ ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی کی محبت کا دم اس کے بعد بھرے اور دنیا کی ساری رنگینیوں سے منہ موڑ لے فاروق! کیا کسی نے ایسے تاج محل دیکھے ہیں جو تم جیسے لوگ اپنے دل میں تعمیر کر لیتے ہیں؟" نیا نے بڑی سچائی سے پوچھا۔

فاروق اداس سا ہو گیا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"تم جو بھی کہو، اب میرا جی نہیں چاہتا کسی عورت کو بیوی کی نگاہ سے دیکھنے کو۔ مجھے سب عورتیں کٹھ پتلیاں لگتی ہیں۔ میں نے پورے بائیس سال ٹوٹ کر سورا کو چاہا تھا اور بائیس صدیاں چاہیئں اب اسے بھلانے کے لئے۔"

"وہ ضرور کوئی عظیم عورت ہو گی۔" نیا نے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہر وہ عورت جو زندگی کی سختیاں سہتی ہے، عظیم ہوتی ہے نیا!"

"مگر نیا نے جیسے اس کی بات نہیں سُنی یونہی بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہی جیسے بے خودی کے عالم میں بولی۔

"اگر کوئی مرد میری محبت کا دم اس طرح بھرے تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں۔"

"اچھا!" فاروق شرارت سے مسکرایا۔

"تم نے بالکل ایسی بات کہی ہے۔ جیسی ایک یورپین لیڈی نے تاج محل دیکھ کر کہی تھی کہ "برٹش گورنمنٹ اگر میرے لئے ایسا مقبرہ بنانے کا وعدہ کرے تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں۔" نیا چپ بیٹھی رہی تو وہ اسے ہنسانے کے لئے بولا۔

"پھر دے دوں اشتہار اخبار میں۔" نیا نے سوالیہ نظریں اٹھائیں تو وہ بولا۔

ایسے آدمی کے لئے؟" اس بات پر نیا کی ہنسی نکل گئی۔

واہ۔ ایسے آدمی کوئی اشتہاروں سے ملتے ہیں۔"

شاید مل ہی جائے کوئی۔" اس بات سے نیا جل ہی تو گئی، پھر کہنے لگی۔

تم جانتے ہو فاروق! جب لوگ تمہیں میرے ساتھ دیکھتے ہیں تو طرح طرح کی گپ شپ کرتے ہیں۔ تمہاری شادی ہو گئی ہوتی تو بھلا کوئی انگلی اٹھا سکتا تھا۔ وہی علاج ہیں اس کے۔" فاروق نے کہا۔ "یا تو لوگوں کی پروا نہ کرو یا پھر ملنا چھوڑ دو۔"

نیا نے لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ کس کس کو جا کر بتاتی کہ فاروق اس کا بھائی، دوست سب کچھ ہے۔ ہر پریشانی میں وہ اس کی مدد کرتا۔ بچوں کے سکول والے خانے میں بھی اس کا نام درج تھا اور نیا کے بچے فاروق کو ماموں کہتے۔ وہ دونوں ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح ملتے تھے۔

فاروق معروف آدمی تھا۔ اسلام آباد میں اسے بہت سے لوگ جانتے تھے اور وہ زیادہ گھومنے پھرنے سے پرہیز کرتا تھا۔ اس نے نیا سے کہہ رکھا تھا کہ اسے اس کے گھر پر ملا کرے۔

ایک سال پہلے نیا اچانک فاروق کے فلیٹ میں گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب طرح کی پریشانی تھی۔ فاروق سے بولی۔

"ایک عجیب و غریب قسم کا آدمی میری دکان میں آیا تھا۔"

"تو اب تمہاری دکان میں عجیب و غریب آدمی بھی آنے لگے ہیں۔" فاروق نے بات کاٹ کر کہا۔

"فاروق غور سے سنو! اس کی آنکھوں سے مکر و فریب ہویدا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں آنکھوں کی بناوٹ اور ان کی حرکات سے کسی کی شخصیت

کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکوں۔"

"یعنی اب تم مردوں کی آنکھوں میں جھانکنے لگی ہو۔ دوسرے لفظوں میں آنکھ کی زبان پڑھنے لگی ہو" فاروق نے اسے چھیڑا۔

"فاروق! خدا کے واسطے اسے مذاق نہ سمجھو۔ میرا خیال ہے یہ تمہارے مطلب کی بات ہے۔" پھر نیّا نے کوزک کے بارے میں فاروق کو سب کچھ بتایا کہ کوزک بظاہر بغیر کسی وجہ یا سفارش کے اسے لاکھوں کا آرڈر دیا ہے اور دو بالکل نئی مشینیں آدھی قیمت پر دے دی ہیں۔ اسی وجہ سے مجھے کچھ شک سا ہو رہا ہے کہ آخر وہ کیوں کر رہا ہے۔ جبکہ شہر میں اور بھی کاروباری ادارے ہیں۔ یہ گورے۔ یہ تو کاروبار میں اپنی سگی ماں کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے صورت سے وہ آدمی چکر باز لگتا ہے۔ ایسے لگتا ہے وہ اندر سے کچھ اور ہے مگر باہر سے کچھ اور۔"

"اچھا" فاروق سنجیدہ ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر گم صم بیٹھا رہا پھر اس نے نیّا سے کا تمام تر حلیہ پوچھا۔ اس کے پورے کوائف سننے کے بعد وہ چونک پڑا اور بولا۔

"نیّا! آج تم نے واقعی بہت پتے کی بات بتائی ہے۔ میں اس آدمی کوزک پر تفتیش کے لئے مامور کیا گیا ہوں۔ یہ شخص پہلے بھی پاکستان آیا تھا مگر وہ تب کسی نام سے آیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ آدمی پولش نژاد یہودی ہے مگر مختلف ملکوں کا پاسپورٹ رکھتا ہے اور ہر بار نئی قومیت اختیار کر کے سفر کرتا ہے۔ بہرحال تمہیں بہت محتاط ہو کر قدم اٹھانا ہے۔ اس سے آرڈر لے کر تم نے بہت عقلمندی کی ہے۔ اب ایسا کرو کہ اس کے اشاروں پر چلتی رہو اور مجھ سے خفیہ رابطہ رکھو۔ کوزک کو یہ بات کبھی نہیں معلوم ہونی چاہیئے کہ تمہارا میرا کسی قسم کا کوئی تعلق ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے اسے اپنے اعتماد میں لو۔"

"لیکن میں کیوں اس کا دھیان رکھوں، کیوں اس پر نظر رکھوں؟ یہ سب کچھ

ام ہے، تمہارا پیشہ ہے۔ میرے ساتھ تو اور بھی بہت سے بکھیڑے ہیں۔
بات میرے ذہن میں آئی تھی میں نے تمہیں بتا دی۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔"
بڑی بے زاری سے کہا۔

ایک بات نہیں ہے نیّا" فاروق نے بڑے درد سے کہا۔ "یہ بہت بڑی بات
اس بات کی اہمیت کا احساس تمہیں بہت دیر بعد ہو گا۔"

یک تو تم کوئی بات کھل کر نہیں کہتے، ہمیشہ اشاروں کنایوں میں بات کرتے ہو۔"
اروق کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔ نیّا کی بات سنی ان سنی کر کے بولا۔

یا! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نازک ترین لمحہ تمہارے
اگر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ پھیلا کر تم سے قربانی مانگتا ہے اس وقت ہر شخص کا فرض
تحقیق کئے قربانی کے لئے تیار ہو جائے۔"

اصاف لفظوں میں کہو فاروق!" نیّا کی آواز میں گھبراہٹ آ گئی۔ "اس حد تک کہو کہ میں
ں اور فیصلہ کر سکوں۔"

اروق چپ بیٹھا رہا تو نیّا دوبارہ بولی۔

بن کر نا میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں، اتنا ضرور بتا دو
بے جھجک اپنا رول ادا کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔" فاروق نے گہری نظروں سے نیّا
یکھا۔ اس کے چہرے پر عزم اور سچائی کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔

سیل تو پھر کبھی بتاؤں گا مگر اتنا ضرور کہے دیتا ہوں کہ کچھ سیاہ کار لوگ یہاں تخریبی
کرنے پر مامور کئے گئے ہیں اور ان کا سرغنہ یہ کوزک ہے۔ مگر وہ اپنی قومیت ظاہر
میرے خیال میں یہ وہی شخص ہے۔ جس کی مجھے عرصے سے تلاش ہے۔ اس کا
چھا اور ہے اور اس کا مشغلہ یہ ہے کہ وہ اونچی سوسائٹی کی عورتوں کو مسخر کر لیتا ہے
کے ذریعے ملک کے مقتدر اور معروف لوگوں کے راز چرانے کی کوشش کرتا ہے

اس کام پر بے تحاشا پیسے خرچ کرتا ہے۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس کے ساتھ
ضمیر فروش پاکستانی بھی ملے ہوتے ہیں مگر وہ اس قدر چالباز شخص ہے کہ ہر بار بچ
جاتا ہے آج تک نہ تو اس کا چہرہ بے نقاب ہو سکا ہے اور نہ ہی کوئی پاکستانی گرفت
"مگر وہ یہ سب کس کے ایما پر کر رہا ہے؟" نیاّ نے بے قرار ہو کر پوچھا
"کس کے ایما پر؟ پگلی! ابھی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ نسلاً یہودی ہے۔ یہ
یہودیوں کی عالمی بادشاہت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے تمام مسلمان ملکوں
جا کر تخریبی کارروائیاں کرتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ عیسائی اور یہودی دنیا مسلمانوں سے
بیزار ہے۔ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ دنیا بھر کے مسلمان متحد ہو کر رہیں۔ ان کو معلوم
کہ مسلمان خواہ دنیا کی کسی سرزمین پر بستے ہوں۔ ان کے اندر ایک ایسی آسمانی
پوشیدہ ہے جو انہیں ایک نعرے کے ساتھ ہی متحد کر دیتی ہے اور وہ ہے
کی قوت! دشمن ڈرتے ہیں کہ جس دن یہ سارے مسلمان اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر متحد
گئے اور ان کے سامنے ایک سیسہ پلائی دیوار بن گئے تو پھر ساری دنیا کو مسخر کر لیں
پھر وہی ہوگا، نیل سے لے کر تا بخاک کاشغر۔ گو مسلمان تو بے چارے عظمتِ
کو سینے سے لگائے خوابِ خرگوش میں مگن ہیں۔ مگر ان سے خوفزدہ رہنے
لوگ پل بھر کو ان سے غافل نہیں ہوتے اور اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف کار
ہیں۔ کبھی مسلمانوں کے مذہب کی آڑ لے کر مسلمانوں پر ریکیک حملے کرتے ہیں، کبھی
سزاؤں کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں، کبھی کوئی بے ہودہ فلم بنا کر مسلمانوں کے جذبا
مجروح کرتے ہیں اور کبھی کذب و افترا کے فسانے گھڑ کے اسلام کے خلاف
دلآزار کتاب چھاپ دیتے ہیں۔؟ یہ سازشیں ہمیشہ سے جاری ہیں۔ علامہ
کا شعر تمہیں یاد ہوگا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا بہ ابد
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

"اب اس "شرارِ بولہبی" کو تم کوئی سا نام دے لو، ہے تو یہ ایک حقیقت!"
"آخر ساری دنیا کے مسلمان اتنی سی بات سمجھ کیوں نہیں جاتے؟ اور دشمنوں
سازشوں سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے سے لڑتے کیوں رہتے ہیں؟" نیاّ
جوش سے سرخ ہو گیا اور لہجے میں غصہ آ گیا۔
"محترمہ! یہ وقت غصہ کرنے اور مٹھیاں بھینچنے کا نہیں ہے۔ ہماری قوم تو ویسے
زبانی ہے۔ نعرے لگاتے ہی اس کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔"
"آخر... آخر..." نیاّ نے اسی انداز میں کہا۔ "ان کو کب سمجھ آئے گی؟"
"ان کو نہیں ہم سب کو۔" فاروق نے اس کا جملہ درست کیا۔
"ہاں ہم سب کو۔" نیاّ پھر بولی۔
"یہ وقت احتجاج اور احتساب کا نہیں ہے۔ یہی ہمارے ہاں خرابی ہے۔
یا تو احتجاج کرتا ہے یا محتسب بننے کی کوشش کرتا ہے۔ تم جانتی ہو۔
لوگ وعظ و نصیحت سے تنگ آ چکے ہیں۔ تقریریں ان کو اب نہیں لبھاتیں
دوسرے کو نصیحت کرتا ہے مگر وہی شخص اپنے گریبان میں جھانکنے کی
نہیں کرتا، جب بے اعتباری کا یہ عالم ہو تو محبِ وطن باہوش انسانوں
ہے کہ عمل کے میدان میں کود پڑیں۔ جو جہاں بھی ہے نہایت دیانت داری سے
بجا لائے جو کچھ بھی اپنے وطن کے لئے کر سکتا ہو، انتہائی خلوص سے کرتا
جب ہر فرد اپنی جگہ پر تہیہ کر لے گا کہ آج کے بعد وہ اپنے وطن کی حرمت
رشوت نہیں لے گا، بد دیانتی نہیں کرے گا، ملاوٹ نہیں کرے گا اور کوئی
نہیں کرے گا۔ جس سے اس کے ملک کی آبرو پر حرف آئے تو سب ٹھیک
ہے۔ فرداً فرداً کوشش کی ضرورت ہے۔ جہاں جس جگہ جس حد تک ہو سکے"
"رواں جرح کو۔" فاروق نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "اگر میری بات تمہاری

سمجھ میں آگئی ہو تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم اپنے وطن کے لئے کیا کر سکتی ہو؟"

نیّا خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر سر جھکائے بیٹھی رہی پھر بولی۔

"میں کیا کر سکتی ہوں، میں تو عورت ذات ہوں۔"

"یس!" فاروق جلدی سے بولا۔ "پھر وہی بات دہرا دی تم نے۔ محترم خاتون! ابھی میں نے تم سے کہا تھا نا! کہ جو شخص جہاں ہے اور جو کچھ بھی کر سکتا ہے اسے وطن کے لئے کرنا چاہیئے۔ دامے، درمے، سخنے، قدمے! وطن کے لئے جہاد صرف میدان جنگ میں ہی نہیں ہوتا بلکہ وطن کے اندر بھی کئی محاذ ہوتے ہیں۔ ان محاذوں پر لڑنا بھی بہت اہم ہے۔"

"وہ کون سے محاذ ہوتے ہیں فاروق؟" نیّا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا جیسے اسے واقعی محاذِ جنگ پر بھیجا جا رہا ہو۔

"اپنے ملک کے حالات سے بے خبر رہنا اگر کوئی شخص اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہے جس سے آپ کے وطن کو اقتصادی، سماجی یا روحانی نقصان پہنچ رہا ہے تو آپ کا فرض ہے کہ سامنے آجائیں اور اس کا مقابلہ کریں اور یہ مقابلہ اس لئے نہیں کرنا چاہیئے کہ حکومت آپ کو کوئی بہت بڑا انعام دے گی اور آپ کا نام اخباروں میں چھپے گا۔ بلکہ اس لئے کہ ایک محب وطن شہری ہونے کے ناطے یہ آپ کا فرض ہے جس طرح اولاد کو پالنا، پڑھانا، شادی کرنا ماں باپ کا فرض ہوتا ہے اور ہم لوگ یہ سب کسی صلے کے لئے نہیں کرتے۔ وطن کی آبرو کا پاس کرنا ہر شہری کا بنیادی فرض ہے مگر صلے اور انعام سے ماورا ہو کر۔"

"ہوں۔" بات نیّا کی سمجھ میں آگئی۔ پھر وہ زمین پر نظریں جمائے کچھ سوچنے لگی۔ کافی دیر گم صم بیٹھی رہی تو فاروق نے پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہو نیّا!"

"دل چاہ رہا ہے کہ اس کوزک کے بچے کا گلا گھونٹ دوں کل آتے میری دکان پر۔"

"اوں ہوں۔۔۔ اوں ہوں۔ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ وہی عورتوں والا جذباتی اقدام! کچھ نے کی کوشش کرو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کوزک انتہائی چالاک، عیار اور کینہ پرور آدمی ۔اب تک اگر گرفتار نہیں ہو سکا تو ضرور اس کے پاس نئے ہتھکنڈے ہوں گے ے پاس وہ ایک خاص مشن سے آیا تھا۔"

کس غرض سے؟" نیّا نے بے تابی سے پوچھا۔

"ذرا صبر سے سنو۔ میں صحیح طور پر نہیں جانتا کہ وہ تم سے کیا کام لینا چاہتا ہے مگر تم کام کی عورت نظر آئی ہو اس لئے کہ تمہارا ناطہ ایک بدنام اور ضمیر فروش انسان سے ہے۔ وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تمہارے قریب آیا ہے۔ اس کا خیال وہ تمہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکے گا۔ آخر اتنا بڑا آرڈر اس نے تمہیں دیا ہے؟ تمہیں زیرِ احسان کرنے کے لئے اور دولت کے جال میں پھنسانے لئے۔ اس نے تمہیں دو نئی مشینیں آدھی قیمت پر دے دیں۔ اس نے تمہیں کلاس کے ٹکٹ کی آفر دی تاکہ تم سارے یورپ کی سیر کر سکو۔ جہاں تک ہو سکے ایا جال بچھائے گا تاکہ تمہارے ضمیر کو شکنجوں میں کس لے۔

میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ یہ سب جان کر بھی اس کے اشارے پر چلونگی۔ اس کا آرڈر اس کے منہ پر دے ماروں گی۔"

نیّا۔۔۔۔ نیّا!" فاروق بڑے سکون سے بولا۔ "اب بے وقوف بننے کی ضرورت لر بے وقوف نہیں ہو تو بن کر اس کے اشاروں پر چلتی رہو۔ جہاں تک تمہارے کا تعلق ہے وہ قابلِ قدر ہیں۔ مگر خدا را جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کو سمجھنے کی کوشش لیز، عورت بن کر نہیں مرد بن کر میری بات پر غور کرو۔ ویسے تو ہر وقت کہتی رہتی مرد ہوں، مگر سوچنے کا انداز بالکل عورتوں والا ہے۔" نیّا ہنسنے لگی۔

کیا کروں۔ اپنا دل جلانے کے لئے اپنی ذات کی نفی کرتی رہتی ہوں۔ بھلا عورت بھی کبھی مرد بن سکتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مرد بن کر بھی کوئی عورت سکھی نہیں رہتی۔ تمہیں کیا معلوم کہ عورت بن کر رہنے میں جو راحت ہے۔ وہ مرد بن کر رہنے میں نہیں۔"

"اچھا اپنے دکھڑے کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔" فاروق نے تلخی سے کہا۔ "اور میری بات غور سے سنو۔"

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے قدرت تم سے کوئی بہت بڑا کام لینا چاہتی ہے۔ تم ایسا کرو کہ کوزک کے ساتھ ربط بڑھاؤ۔ اس سے ملو جلو۔ میری بات سمجھ رہی ہو اور اس کی اصلیت پانے کی کوشش کرو۔ ایسے شاطر آدمی کو، جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہو، مٹھی میں لینا کچھ آسان کام نہیں۔ تمہیں بہت محتاط ہو کر یہ کام کرنا پڑے گا اس کے اشاروں پر چلتی رہو۔ حتیٰ کہ وہ تمہیں اپنا رازدار بنا لے۔"

"فاروق!" نیا نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔ "تم جانتے ہو میں پہلے ہی بدنام عورت ہوں۔ لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ کوزک کے ساتھ سائے کی طرح رہوں گی تو رسوا ہو جاؤں گی۔"

"تو کیا غم ہے۔ اپنے وطن کی خاطر ذرا سی رسوائی ہی تو ہو گی مگر انسانیت اور وطن پر کتنا عظیم احسان ہو گا۔ ذرا وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر سوچو۔ عورت بن کر نہ سوچو!"

نیا تھوڑی دیر چپ بیٹھی اپنے آنچل سے کھیلتی رہی پھر اس نے سر اٹھایا تو اس کی آواز میں ایک نیا عزم تھا۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"فاروق! تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ ساری زندگی یونہی رائیگاں گئی۔ پہلے تو میں نے صنم پوجے، پھر انسانوں کے بت بنائے لیکن انسانوں کے آگے سر جھکانے سے کیا ملا؟ بغیر مقصد کے، محض پیٹ کی خاطر جینا بھی کوئی جینا ہے، مر

پہلے کوئی اچھا کام کرنا چاہیئے۔"

"شاباش!" فاروق مسکرایا۔ "لوگوں کی پروا نہ کرو اگر نیت نیک ہو تو انجام اچھا ہوتا ہے۔ الاعمال بالنیت" اللہ تعالیٰ بھی نیت دیکھتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے جو نیت سے میدان میں اترتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو فاروق!" نیا کے لہجے میں ایک نئی عورت بول رہی تھی۔ "میرا ہے کہ یہ کام صرف میں ہی کر سکتی ہوں۔ کچھ ایسے ہی تجسس سے مجبور ہو کر نے اس کے ساتھ سودا کر لیا تھا ورنہ اجنبیوں سے کام لیتے ہوئے ڈرتی ہوں" بہرحال! اس بار تو کام لے کر تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ یوں لگتا اس بار تو خود آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔"

بس تم دعا کرتے رہنا۔ ہاں۔ وہ مجھے کھانے پر بلا رہا تھا۔ اب اس کی دعوت کر لوں گی۔"

ٹھیک کرو گی۔" فاروق نے کہا۔ "مگر ایک بات یاد رکھنا۔ ان دنوں مجھ سے است رابطہ مت رکھنا۔ مجھ سے ملنے میں خصوصی احتیاط برتنا۔ یہ لو میرے کی دوسری چابی۔" اس نے اپنے چابیوں کے چھلے میں سے ایک چابی نکالی۔ اپنے پاس رکھ لو، جو ضروری معلومات مجھے دینی ہوں۔ کاغذ پر لکھ کر میری ٹیبل کی دائیں دراز میں رکھ دینا، میں شام کو آ کر پڑھ لیا کروں گا۔ مگر تمہیں ڈ میں لکھنی ہوں گی جو میں تمہیں بتا دوں گا اور جو مزید ہدایات دینی ہوں گی ت گئے فون پر کپڑوں کے آرڈر کی صورت میں دیا کروں گا۔"

نیا نے اس سے چابی لے کر اپنے پرس میں ڈال لی۔

دوسرے دن وہ کوزک کیساتھ کھانا کھانے ریستوراں میں چلی گئی۔ اس کے بعد نیا بھی کوزک کے ساتھ کہیں باہر گئی وہ اپنے بناؤ سنگھار کا خاص طور پر خیال رکھتی تھی

ایک دن کوژک کا فون آیا تو نیّا بڑی لگاوٹ سے بولی۔

"آپ تو واقعی کاروباری آدمی ہیں۔ مسٹر کوژک!"

"وہ کس طرح؟"

"کاروباری بات چیت ہونے کے بعد آپ نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔"

"آپ سے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈرنے کی ضرورت نہیں، کبھی کبھی مل لیا کیجئے۔"

"کہئے تو آج رات آجاؤں؟" کوژک چہکا۔

"آجائیے!"

"کہیں کھانا کھانے چلیئے گا؟"

"ضرور چلوں گی۔"

"شرط وہی رہے گی۔"

"ہاں وہی رہے گی۔" نیّا خوش دلی سے ہنسی۔

کوژک بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔

کھانا کھانے کے بعد جب وہ دونوں کافی پی رہے تھے تو نیّا نے آہستہ سے کہا۔

"مسٹر کوژک! آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ زندگی کا بوجھ تنہا نہیں اٹھایا جاسکتا۔"

"خیریت تو ہے۔" وہ ہنسا۔

"سچّی بات تو یہ ہے کہ ایک عورت کو ہمیشہ تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔" اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر بولی۔ "اور اصل تحفظ عورت کے لئے صرف پیسہ ہے۔ پیسہ ہو تو یہ ساری دنیا اپنی مٹھی میں ہوتی ہے۔ دنیا کا مشکل ترین کام سہل ہو جاتا ہے۔"

"ہیں۔" کوژک نے چونک کر پیالی میز پر رکھ دی۔ "اس دن تو آپ اور طرح کی باتیں ہی تھیں، جیسے آپ کو روپے پیسے کی پروا ہی نہیں ہے۔"

"ہے کیوں نہیں۔" وہ بولی۔ "یونہی تو دکان لگائے نہیں بیٹھی۔ اس دن تو میں ذرا کاروباری اصول برت رہی تھی۔ آپ پر رعب ڈال رہی تھی۔ اب تو آپ میرے دوست بن گئے ہیں۔ اتنے تجربہ کار ہیں کچھ دوستانہ مشورے دے سکتے ہیں۔"

"ضرور۔ ضرور۔" کوژک خوش ہو کر بولا۔ "آپ ایسا کریں۔" اس نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔ "کوئی دولت مند ادھیڑ عمر کا آدمی ڈھونڈ کر اس سے شادی کرلیں؟"

"اصل میں مجھے شادی سے نفرت ہو گئی ہے۔" نیّا بولی۔ "شادی میں بندشیں ہوتی ہیں اور اب میں آزاد رہنے کی عادی ہو گئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں۔ کسی سے اتنی دولت کمالوں کہ باقی عمر بیٹھ کر کھاتی رہوں۔ کسی کی محتاج نہ رہوں۔ آپ دولت کمانے کا کوئی ایسا جادوئی طریقہ بتا سکتے ہیں؟" یہ کہہ کر نیّا جلدی سے اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

کوژک نے اپنی طرّار اور بے حد فطین آنکھیں نیّا کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ گھونٹ گھونٹ کافی یوں پینے لگی جیسے اسے کوژک کے اس طرح گھورنے کی ذرا بھی پروا نہیں۔ کوژک تھوڑی دیر یونہی اسے تکتا رہا، جانچتا رہا، سوچتا رہا۔ نیّا نے بڑی ادا سے پلیٹ سرکا لیا، ایک کش لیا اور دھواں اس کی جانب چھوڑ کر بولی۔

"کیا میں نے بہت ہی عجیب بات کہہ دی ہے؟"

"نہیں تو!" وہ چونکا۔

"تو آپ مجھے عجیب نظروں سے کیوں گھور رہے ہیں؟"

"یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس دن آپ نے سچ بولا تھا یا آج سچ کہہ رہی ہیں۔"

"اوہ۔" نیّا اٹھلائی۔ "پتہ نہیں ہر مرد عورت سے اتنا بدگمان کیوں ہوتا ہے اگر آپ

مجھے دولت کمانے کی آسان ترکیب نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی، اپنا موڈ تو ٹھیک کریں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کاروباری آدمی ہیں دنوں میں مجھے امیر کر دیں گے۔ دراصل کچھ دنوں سے مالی طور پر میں خسارے میں جا رہی ہوں۔ بچوں کو اپنے مسائل میں الجھانہیں چاہتی۔ کوئی کاروباری نسخہ ہاتھ آجاتے تو گرتی ساکھ کو سنبھال لوں۔ انکم ٹیکس کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔"

"آپ کے لئے میرے پاس ایک ترکیب ہے مگر اس میں میرے اشاروں پر چلنا ہوگا۔"

"ہیں۔" نیا نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "ایک عورت ہو کر ایک مرد کے اشاروں پر چلنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

"ارے میں وہ بات نہیں کر رہا۔"

"تو پھر کون سی بات کر رہے ہیں؟"

"ایک دوسری بات ہے۔"

"مسٹر کوزک! ذرا کھل کر بات کریں میں اتنی ذہین نہیں ہوں۔"

"صبر کیجئے پہلے مجھے آپ کو پرکھنا ہوگا۔"

"تو پرکھ لیجئے میں کون سا زور دے رہی ہوں۔" نیا نے مذاقاً کہا۔ اسے راستے پر لا کر نیا نے موضوع ہی بدل دیا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔

اس کے بعد نیا اور کوزک کی ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اکثر تفریح گاہوں پر اکٹھے نظر آنے لگے۔ بے تکلفی اس حد تک بڑھی کہ وہ آپ سے تم پر اُتر آئے۔ ملاقات میں نیا نے کوزک کو اپنی مالی پریشانیوں کا یقین دلایا ایک دن کوزک بولا۔

"تم اگر میرا کام کرنے کا ذمہ لے لو تو میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔"

"وہ کیسے بھئی؟ کیا تمہارے پاس الہ دین کا چراغ ہے؟"

"اسے مذاق نہ سمجھو۔" کوزک بولا۔ "میری بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرو اور اپنے مستقبل کو پورے طور پر محفوظ کر لو۔"

"سمجھاؤ۔ ضرور سمجھنے کی کوشش کروں گی۔"

"اصل میں میری نوکری خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

"تو اس سے میں کس طرح مالا مال ہو سکتی ہوں؟"

"پہلے تم وعدہ کرو کہ دوستی کا دم بھرو گی اور میری بات کو آؤٹ نہیں کرو گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" نیا نے کہا۔

"اور تم ہمیشہ میری دوست رہو گی۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

"اگر تم اپنا وعدہ توڑ دو گی تو تمہیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"جانتی ہوں۔" نیا بولی

"ہر کام اور ہر راز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔" کوزک نے کہا۔ "مگر غداری کی قیمت موت ہوتی ہے۔ یہ جانتی ہو۔"

"بالکل درست ——" نیا نے بھی دُہرایا —— "غداری کی قیمت موت ہوتی ہے۔"

"بس" —— تم سے اتنا ہی کہنا تھا۔" کوزک بولا۔

"ڈرو نہیں۔ معاملے کی بات کرو۔ میں نے بہت سے سرد و گرم دیکھے ہیں۔ جس آدمی کے ساتھ میں رہتی تھی وہ تم سے زیادہ خطرناک اور شاطر تھا۔" کوزک زور سے ہنسا۔

"تم تو میرے اندازے سے بھی زیادہ ہوشیار ہو۔"

"ہوشیار ہوں۔ اسی لئے تو غافل رہنا سیکھا ہے۔ کیا سمجھے ——!"

"بہت کچھ —— بنا کہے سمجھ گیا ہوں اور میں نے تم تک پہنچ کر عقلمندی کی تھی۔"

"اب آگے بھی عقل کی بات کرو ——" نیا نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"میں تمہیں ——" وہ رکا —— ذرا سا جھجکا پھر چوکس نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا . . . نیاؔ کو ہمہ تن گوش پاکر، سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"میں تمہیں تمہارے ملک کے سرکردہ لوگوں کے ناموں کی ایک فہرست دوں گا تم ان کی بیگمات سے رسم و راہ پیدا کروگی اور مجھے ان لوگوں کے معمولات کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ گی۔"

"معمولات سے کیا مطلب ہے تمہارا ——؟"

"ان کے مشاغل —— ان کے یورپ میں آنے جانے کے اغراض و مقاصد ان کے مختلف ملکوں سے روابط —— ان کے خانگی اور معاشی حالات —— ان کی زنا کے جھول اور کمزوریاں —— ان کی ازدواجی زندگی کے ہنگامے . . . وغیرہ وغیرہ —— سمجھ گئی ہونا!" اگرچہ نیاؔ سمجھ نہیں سکی تھی . . . مگر اس نے ہامی بھرلی۔

"دوسرے دن کوزک نے اسے سرکردہ وکلا اور ججوں کی فہرست لاکر دی۔ نیاؔ اس کی نقل فاروق کی میز کی دراز میں پہنچا دی۔ سودا طے پاگیا تو رفتہ رفتہ کام آگے بڑھنے لگا۔ دوسری بار کوزک نے اسے سرکاری ملازمین کی ایک لسٹ دی اور ان کی بیگمات کی کمزوری کی تفصیل بھی مانگی اور تیسری بار کوزک نے نیوکلیئر سائنسدانوں کے ناموں کی فہرست دی . . . فاروق ہر بار اس کو خود ساختہ معلومات فراہم کردیتا تھا —— معلومات پہنچانے کے بعد نیاؔ ان کے گینگ کی مستقل ممبر بن گئی تھی اور یہ دیکھ کر کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کوزک کے گینگ میں سارے ضمیر فروش پاکستانی شامل انہوں نے نیاؔ کو بڑے پرجوش انداز میں خوش آمدید کہا کیونکہ وہ لوگ جانتے تھے اس شہر کی ایک سوشل خاتون ہے۔

نیاؔ ان کے گینگ میں شامل ہوگئی تو اس نے فاروق سے مشورہ کرکے مو کو فوراً امریکہ بھجوا دیا۔ ان حالات میں موتی کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں تھا گو نیاؔ کے پا

فی الوقت اتنا پیسہ نہیں تھا مگر فاروق کی مدد سے کچھ ایکس چینج کا بندوبست ہوگیا تھا اور کچھ پیسہ شہباز نے دے دیا تھا۔ موتی کو واشنگٹن یونیورسٹی میں داخلے کی اطلاع بھی مل گئی تھی۔

اب کوزک نے نیاؔ کو صاف بتا دیا تھا کہ ان کے ملک میں کوئی عالمی نمائش منعقد نہیں ہو رہی ہے۔ نیاؔ اطمینان سے اپنا کام کرتی رہے اور اس کام کے بہانے کوزک اس سے باقاعدہ ملتا رہے گا۔ جب ان کا مقصد حل ہوجائے گا تو وہ یہ سارا سامان لے کر یورپ کی کسی منڈی میں فروخت کرآئیں گے۔

جس روز نیاؔ ان کے پورے گینگ کے ساتھ پکنک پر گئی تھی اس روز کوزک نیاؔ کو لے کر پہاڑیوں سے نیچے اُتر گیا تھا اور اس نے اپنے منصوبوں کی طویل فہرست نیاؔ کو دکھائی تھی —— وہ کاغذات پڑھ کر نیاؔ لرز گئی تھی اور اس نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسے یہ کاغذات فاروق تک پہنچانے ہیں۔

کوزک بہت عیار آدمی تھا اس کو یوں چکمہ دینا بظاہر مشکل نظر آرہا تھا —— اس کام کے لئے پاکستانی ساتھیوں کا سہارا لینے کی ضرورت تھی۔ آج پکنک پر نیاؔ جن چار ساتھیوں سے ملی تھی۔ ان میں سے ایک شاہ جی تھے —— دوسرے بٹ صاحب تھے —— تیسرے کو سب بہادر علی صاحب کہہ رہے تھے —— اور چوتھے کو نیاز صاحب —— نیاؔ جب واپسی پر شاہ جی اور بٹ صاحب کو ساتھ لے کر پنڈی گئی تو اسے فوراً یہ اندازہ ہوگیا کہ شاہ جی، عورت کے معاملے میں ذرا کمزور دل ہیں . . . اور اس روز کے بعد سے اس نے شاہ جی پر مہربانیوں اور نوازشوں کی بارش شروع کر دی۔ پہلے تو شاہ جی بدک بدک گئے۔ آخر کب تک —— وہ اس منصوبے کی نقل نیاؔ کو دکھانے پر راضی ہوگئے۔ نیاؔ نے کاغذات مطالعے کے لئے مانگ لئے۔ جس روز صبح نیاؔ وہ منصوبے کے کاغذات لے کر گھر سے نکلی تھی۔ اُسی دن جولی نے اُسے

دکان کا کیش بھی دے دیا تھا۔ اس نے سوچا پہلے رقم بینک میں جمع کرا دے مگر اس روز اچانک اسے بینک کے باہر شہباز نظر آگیا اور اسے یوں لگا جیسے کسی پرانے زخم کے ٹانکے کھل گئے ہوں۔ کاغذات حاصل کرنے پر جتنی اسے خوشی حاصل ہوئی تھی اس پر اداسی سی پڑ گئی۔ تن تنہا خطروں میں گھری اس کی زندگی ایک آسیب زدہ مکان کی طرح سامنے آکھڑی ہوتی۔ بینک میں جانے کی بجائے وہ سیدھی فاروق کے فلیٹ میں چلی گئی تھی۔ وہاں سے اس نے فون کر کے فاروق کو بلا لیا۔ آج منصوبہ دراز میں چھوڑ کر جانا ٹھیک نہیں تھا۔ فاروق اس کی ہدایت پر فوراً چلا آیا۔ اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے ان کاغذات کو خوب اچھی طرح سے دیکھا اور خوش ہو کر نیا کو شاباشی دی اور بولا۔

"وہ کام جو بہت سے جوان مل کر نہیں کر سکتے تھے تم جیسی اکیلی عورت نے کر دکھایا ہے۔ دیکھنا تمہارا نام تاریخ میں، سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔"

"چلو جانے دو۔" نیا نے بے پروائی سے ہنس کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کل میرا نام سیاہ حاشیوں میں لکھا جاتے۔ کچھ معلوم نہیں میرا انجام کیا ہو گا؟"

"کیوں ——؟" فاروق غرایا۔

"فاروق مجھے ایسے لگتا ہے۔ جیسے چاروں طرف سے میں خطروں میں گھر گئی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے۔ کوئی چھپ چھپ کے میرا پیچھا کرتا ہے۔ شاید اسے مجھ پر شک ہو گیا ہے یا شاید اسے میری شاہ جی سے خفیہ ملاقاتوں کا علم ہو گیا ہے اور اب وہ کوئی عینی ثبوت چاہتا ہے۔"

"اچھا——" فاروق فکرمند نظر آیا۔

"اور میں نے تمہیں بتایا تھا نا؟ اس نے کہا تھا غداری کی سزا موت ہوتی ہے۔"

"اب اس کے بعد نیا تم زیادہ گھر رہا کرو۔ رات کو باہر نہ نکلا کرو۔ بس اب تمہارا

کام ختم ہو گیا۔ باقی سب میرا کام ہے۔"

"ارے مجھے کچھ نہیں ہوتا۔" نیا مصنوعی بے پروائی سے بولی۔

"نہیں نیا۔ جب تک میں ان لوگوں کو گرفتار نہ کر لوں تم احتیاط کرو۔ ایسا نہ ہو وہ تمہیں تکلیف پہنچا کر مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کریں۔"

"دیکھو فاروق۔ ایک بات یاد رکھنا۔" نیا بڑے عزم سے بولی۔ "مجھے خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ یہ لوگ میرے ساتھ کچھ بھی سلوک کریں تم اس کی پروا نہ کرنا، اپنا مشن نہ چھوڑنا میری محنت ضائع نہ کرنا۔ میری جان میرے ملک سے زیادہ قیمتی نہیں ہے اور میں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ کاغذات حاصل کئے ہیں۔ وعدہ کرو ہر حالت میں اپنے مشن کو مقدم جانو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں نیا——" فاروق نیا کے جذبے سے متاثر نظر آرہا تھا۔ "مگر تم بھی یہ سمجھ لو اب محتاط رہنا بہت ضروری ہے۔ جب کامیابی سے یہاں تک چلے آئے ہیں تو اب کیوں بے احتیاطی کریں۔"

"وہ میں سمجھ رہی ہوں اور تمہاری ہدایات پر عمل کروں گی۔"

"یہ جو کاغذات تم نے مجھے دیئے ہیں صرف کاغذات ہی نہیں —— ایک کارنامہ ہے —— وطن کی سربلندی کا عظیم کارنامہ ——"

فاروق نے یہ فقرہ نیا کو خوش کرنے کے کہا تھا مگر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی وہ اسی طرح خاموش اداس اور بجھی بجھی بیٹھی ہوئی تھی...

"کیا بات ہے نیا؟" فاروق بولا —— "آج تم کچھ اداس نظر آرہی ہو —— کہیں اس مم میں ہاتھ ڈال کر بچھتا تو نہیں رہی ہو۔"

"نہیں فاروق۔" نیا جلدی سے بولی "ایسی کوئی بات ذہن میں نہ لانا۔ بلکہ میں تو کام کرنے میں ہمیشہ مسرور رہی، یہ سوچ کر کہ میری فضول سی زندگی کچھ کام آرہی ہے۔

آج میری اُداسی کی کوئی اور وجہ ہے ــــ!"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں ــــ! کیا مجھے یہ حق پہنچتا ہے؟"

"تم نہ پوچھو گے تو کون پوچھے گا فاروق ــــ آج عرصہ دراز کے بعد میں نے اسے دیکھ لیا تو جی پر اداسیاں ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے لگیں۔"

"کسے دیکھ لیا ــــ؟" فاروق حیران ہوا۔

"میں نے ــــ" پھر وہ جھجک گئی۔ "آج میں نے عرصہ دراز کے بعد شہباز کو دیکھا ہے۔"

"اوہ... اچھا... اب سمجھا ــــ" فاروق نے شرارت سے ہنکارا بھرا۔

مجھ کو دیکھا چھوٹ کے رویا
اب سمجھا سمجھانے والا

"ایسے لگتا ہے فاروق... جھن سے دل میں کانچ ٹوٹ گیا ہے۔"

"خیر تو ہے۔" فاروق نے اسی انداز میں چھیڑا تاکہ نیا کو ہنسا سکے۔ "کہیں پرانی محبتیں تو انگڑائیاں نہیں لے رہی ہیں۔؟"

"فاروق سچ کہہ دوں؟" نیا نے سوگواری سے پوچھا۔

"کہو۔"

"آج میں نے ایک طویل عرصہ بعد شہباز کو دیکھا، تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے شہباز کو کبھی بھلایا ہی نہیں تھا۔ میں ہمیشہ سے شہباز سے محبت کرتی رہی ہوں۔ میں جنم جنم سے اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہوں... میں اپنی زندگی ضائع کرتی رہی ــــ اپنے کانوں پر انگلیاں ٹھونس کے زندگی سنوارنے کے جتن کرتی رہی مگر آج ــــ ایک ذرا سی جھلک نے میرا سارا بھرم توڑ دیا ہے؟"

"ہوں... یہ تو ہو گیا فلمی ڈائیلاگ..." فاروق بولا "اب آگے کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"خدا کے واسطے فاروق کچھ کہہ کے نہ لگاؤ۔ میں بچی نہیں ہوں کہ کھلونا توڑ کر رو رہی ہوں

دوسرا لے دو گے تو بہل جاؤں گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے؟" نیا نے بے قراری سے پوچھا۔

"وہی پرانا کھلونا دے دیتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو فاروق ــــ" نیا نے چونکنے کے سے انداز میں پوچھا۔

بھئی منگن، سگائی، شادی ــــ اب تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ہاں مگر ایک شرط پر پہلے اپنے بیٹے کے سر پر سہرا باندھ لو اور بیٹی کے ہاتھ پیلے کر لو۔ اور ــــ"

"فاروق"۔ نیا اتنے زور سے چیخی کہ قطار اندر قطار اس کے آنسو، شام کے لوٹتے پرندوں کی طرح اس کے رخساروں پر گرنے لگے ــــ

نیا کیوں چیخی تھی ــــ؟

اس چیخ میں احتجاج تھا، انکار تھا۔ محرومی تھی ــــ یا آہ ــــ؟ فاروق سمجھ نہیں پایا...

یا کا یہ روپ اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ نیا جیسی بہادر عورت کو پہلے اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا... وہ مسلسل روئے جا رہی تھی... جس طرح سنگلاخ چٹانوں کی شوٹ سے اچانک ایک چشمہ پھوٹ بہا ہو۔ سخت دھرتی کا سینہ شق ہو گیا ہو اور دھارے نے ایک رُخ بنا لیا ہو۔ فاروق تھوڑی دیر چپ بیٹھا رہا۔ اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب زیادہ دیر دیکھا نہ گیا، تو اٹھ کر پانی کا گلاس بھر لایا۔ کبھی کبھی آنسو وہ سب کہہ دیتے ہیں جسے ایک بے زبان عورت نے مقدس راز کی طرح دل کے تہہ خانوں میں چھپا رکھا ہو۔ فاروق نے کچھ نہیں کہا پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ جانتا تھا اس پر کیا گزر رہی ہے۔ نیا نے گلاس تھاما، رومال نکال کر آنسو خشک کیے اور غٹ غٹ سارا پانی پی گئی۔ جیسے صدیوں کی پیاس بجھانا چاہتی ہو۔ فاروق اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"میں نے کوئی سخت بات کہہ دی ہو تو نیا میری پیاری بھابی — مجھے معاف کر دینا۔" فاروق نے اتنے دھیمے اور پیارے لہجے میں یہ بات کہی کہ نیا کو ہنسی آگئی فاروق کو جب نیا پر امنڈ گھمنڈ کے پیار آتا تو وہ اسے بھابی ہی کہتا تھا۔ یوں نیا نے اسے منع کر رکھا تھا کہ تم مجھے بھابی نہ کہا کرو، اس سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ تمہارے ایسے عظیم انسان کا نا تارازی جیسے خبیث انسان سے تھا اس کے تعلق سے مجھے بھابی نہ کہو۔"

"رازی کے دوسرے دوست بھی تو تمہیں بھابی کہتے ہوں گے۔"

"میں نے رازی کے سب دوستوں سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اس لفظ سے گھن آنے لگی ہے۔ بس مجھے نیا کہا کرو۔ دوستی کا رشتہ سب سے اچھا اور خوبصورت رشتہ ہے۔ ایک دوسرے کو بہن بھائی کہہ کر ہم دنیا والوں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔" نیا کی اس دلیل کے آگے فاروق ہار گیا تھا مگر آج فاروق نے بے اختیار ہو کر اسے بھابی کہہ دیا تو نیا کو بھی اس کی اس ادا پر پیار آگیا۔ آنسوؤں کی نمی میں ذرا مسکرا کر بولی۔

"نہیں میرے بھائی، میرے دوست، تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ زندگی اس موڑ پر آگئی ہے، جہاں ؎

پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل پڑے

یا پھر....

پھول مارو تو چوٹ لگتی ہے
کتنے حساس ہو گئے ہیں ہم

"اچھا اٹھو پھر —" فاروق نے موضوع بدلنے کے لئے کہا، "تم نے چولہے پر چائے کا پانی رکھا تھا۔ بری طرح کھول رہا ہوگا۔ ذرا چائے بنا کر لاؤ — مجھے بھی پلاؤ آج ہماری کامیابی کا پہلا دن ہے مگر تم رو رو کر بدشگونی کر رہی ہو۔" نیا کھڑی ہو گئی۔

کچن میں گئی، چائے بنا کر لائی، دونوں پینے لگے۔

"موتی کا خط آیا؟" فاروق نے پوچھا۔

"ہاں — موتی حسب وعدہ ہر ہفتے ایک خط لکھ رہا ہے۔ بہت خوش ہے وہاں — اس کا پہلا سمسٹر بھی ہو چکا ہے۔ اس نے اب ایک پاکستانی لڑکے کے ساتھ مل کر دوسرا اپارٹمنٹ لے لیا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"صبح کو وہ یونیورسٹی جاتا ہے اور شام کو ایک بینک میں جاب کرتا ہے۔"

"واہ وا —" فاروق بولا — "تو بالغ ہو گیا ہے ہمارا موتی۔"

"اس بار اس نے لکھا ہے کہ دو چار مہینے کے اندر وہ خود کفیل ہو جائے گا۔ پھر پیسے منگوانے بند کر دے گا۔"

"اللہ اس کی عمر دراز کرے۔ واقعی ہمارا موتی سیانا بچہ ہے۔"

"مجھے تو امید نہ تھی کہ اتنی جلدی سنبھل جائے گا۔" نیا نے اپنی اداس آنکھوں میں موتی کی یاد بھر کر کہا۔

"بچے جب ماؤں سے دور چلے جاتے ہیں، تو یقیناً ہوشیار ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں —" نیا نے سر ہلایا۔ "بہت اچھا دستور ہے مگر کتنا ظالم بھی ہے۔"

فاروق نے دونوں جھوٹی پیالیاں اٹھائیں اور کچن میں رکھ آیا۔

"میں دھو دیتی ہوں برتن۔" نیا بولی۔

"نہیں رہنے دو — ابھی قادر بخش آ کے دھو دے گا، تم یہ بتاؤ شام کو میرے ساتھ کھانا کھانے چلو گی؟"

"نہیں —" نیا نے اپنا پرس اٹھا لیا۔

"کیوں —؟"

"ابھی نہیں ـــ تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ ان دنوں ہمیں احتیاط کرنی چاہیئے"

"ہاں۔ میں نے کہا تو ہے مگر آج تمہارا جی اچھا نہیں ہے اس لیے مجھے تمہارے ساتھ رہنا چاہیئے ـــ"

"ارے نہیں ـــ" نیّا آئینے کے آگے کھڑی ہو کر اپنے بال درست کرنے لگی۔

"طغیانی آئی تھی ـــ گزر گئی، تم جانتے ہو۔ طغیانی کے بعد ساحل پر کتنا سکون ہوتا ہے ـــ! کبھی کبھی رونا کتنا صحت مند اور تسکین دہ لگتا ہے... اس کا انداز ابھی مجھے ابھی ہوا ہے ـــ بہت ہلکی پھلکی اور مسرور لگ رہی ہوں"

"ہاں ایک اور احتیاط کرنا۔ ان دنوں کوزک کے ساتھ کہیں باہر مت جانا"

"میرا بھی یہی اندازہ ہے ـــ" نیّا بولی "اچھا اب تم اپنی کارروائی جلد مکمل کر لو تو مجھے سکون ملے"

"انشاءاللہ بہت جلد تم ان سب کی گرفتاری کی خبر سنو گی" نیّا باہر جانے لگی تو فاروق بولا۔

"اگر تمہیں کچھ اور ضروری خبریں ملیں تو مجھے فون کرنا۔ اب میرے گھر مت آنا، یہ لوگ بہت ہوشیار ہیں۔ فون پر بھی کھلی گفتگو مت کرنا کوڈ زبان بولنا"

"ٹھیک ہے" نیّا کار کی چابیاں پکڑ کر نیچے اُتر آئی۔ موٹر میں آ کے بیٹھی تو اسے یاد آیا کہ دکان کا کیش تو ابھی تک گاڑی کے گلوبکس میں پڑا تھا اور اس وقت تک بینک بند بھی ہو چکا ہو گا۔

"اب کیا ہو سکتا ہے ـــ؟" اس نے گاڑی گھر کی طرف موڑ لی۔ اب وہ اس بینک میں جا بھی کیسے سکے گی۔ جہاں شہباز کی تقرری ہو گئی تھی۔ شاید کسی اور برانچ میں اکاؤنٹ کھولنا پڑے مگر کتنی عجیب سی سوچ ہے اگر وہ شہباز کی بیوی ہوتی آج کس شان سے بینک میں آیا جایا کرتی۔ واقعی... واقعی... اس نے بار بار سوچا کہ کسی معزز شہری کے ساتھ رہنا بہت بڑا اعزاز ہے ـــ اس روٹی کپڑے کے عوض مرد کا دستِ نگر ہونا،

اچھا لگتا ہے ـــ اس روٹی کپڑے کا بوجھ تو عورت کو بیس کے رکھ دیتا ہے اور
یت کچھ بھی کر لے، آخر عورت ہی رہتی ہے۔ کمزور اور سہمی ہوئی مخلوق۔ یہ اس دنیا
یک لازوال اور بے مثال سچائی ہے اور یہی سچائی اس نے اب تک تلاش
ی۔ اب وہ یہ شہر چھوڑ کر کہاں چلی جائے؟ اس شہر میں ـــ جہاں اس نے پہاڑ سی
راتیں ـــ اور تپتے چلچلاتے لمبے دن تنہا رہ کر بسر کئے تھے۔ جہاں اپنا ایک
ندہ بنایا تھا ـــ جہاں اس نے عمر بھر کا بسیرا لیا تھا اب شہباز کے آجانے کے
اس شہر میں کیسے رہا جائے گا۔؟ اس شہر میں کسی اور آدمی کے ساتھ کیسے کھانا کھایا
ئے گا۔ اس شہر میں اس کا محبوب آ گیا تھا۔ اور یوں لگتا تھا۔ شہر کے چاروں طرف،
خاردار تار بچھا دیئے گئے تھے ـــ حساس اور تلخ یادوں سے گندھے
ئے نوکدار کٹیلے تار۔

اللہ کا شکر ہے آج اس کا کام ختم ہو گیا تھا... ورنہ تو شاید وہ کچھ کرنے کے
ر رہتی۔ جاتے جاتے اس کی نظر سامنے رکھے ہوئے ایک بورڈ پر پڑ گئی، جس
ھا تھا ـــ "افغان مہاجرین کے لئے چندہ یہاں جمع کرائیں" ایک دم نیّا نے اپنی
اس دفتر کے سامنے روک لی۔ رقم نکالی اور اندر جا کر جمع کرا دی۔ اس فعل سے
ے اتنی مسرت ہوئی کہ رُوح پر چھائے غم کے بادل پھول پھول ہو کر بکھر گئے شاید
پیوں سے کسی ماں کا لال بچ جائے کسی سہاگن کے سہاگ کو زندگی مل جائے
ہن کے بھائی کی خوشیاں لوٹ آئیں ـــ شاید ان پیسوں سے کسی اجڑے
ئے گھر میں خوشیوں کے چراغ جل اٹھیں۔

دس پندرہ دن نیّا نے بہت محتاط ہو کر گزارے۔ زیادہ تر دکان پر ہی رہی۔
باقاعدہ آتا رہا ـــ گپ بازی ہوتی رہی ـــ چائے چلتی رہی۔ دو چار دفعہ
ل نے کھانے کی دعوت دی مگر نیّا کام کا عذر کر کے ٹال گئی۔ ہاں وہ شاہ جی

سے باقاعدہ ملتی رہی تھی بلکہ اُس نے چند تازہ ترین معلومات بھی حاصل کی تھیں۔
جلد از جلد فاروق کو بتانا چاہتی تھی مگر فاروق نے گھر آنے سے منع کر دیا تھا اور خود
مصروف تھا کہ فون پر بھی نہیں ملتا تھا۔۔۔ نیّا سوچ رہی تھی کہ اب کس طرح
تک یہ ساری خبریں پہنچائے کہ اسی اثنا میں اسے ایک سفیر کی بیگم کی طرف
جشنِ آزادی میں شامل ہونے کا رقعہ مل گیا۔ نیّا ہر سال ان کے گھر، ان کے قومی
کے جشن میں شامل ہونے کے لئے جایا کرتی تھی۔ لیکن اس بار وہ سوچ رہی تھی
جائے کہ نا جائے ــــ دل بالکل آمادہ نہیں ہوتا تھا ــــ پتہ نہیں اس دل کو کچھ
سے کیا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی ساری زندگی ایک گونج کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔
کبھی اسے اپنا آپ ایسے چراغ کی مانند لگنے لگتا رات ختم ہونے سے
جس کی لَو مدھم ہوتی جا رہی ہو۔

کیا بات ہو گئی ہے۔؟

کون سی شے ہے جو ختم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اپنے آپ سے پوچھتی ــــ
کبھی وہ سوچتی، چلتے چلتے یوں اچانک شہباز جو سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ اس سے
پچھتاووں کی سوکھی لکڑیاں چٹخ چٹخ کر جلنے لگی ہیں۔ شہباز بھی لٹ لٹا کر سامنے آیا
تھا۔ وہ بھی نامراد تھا۔ مگر اس کی زندگی ایک منزل پر پہنچ گئی تھی۔ جب کہ نیّا کو کوئی بھی
منزل نظر نہ آ رہی تھی۔ بلکہ اس کی زندگی پچھتاوا بن گئی تھی۔

کئی راتوں سے وہ بے سکون تھی۔ گولیاں کھانے کے باوجود گہری نیند سے محروم
تھی اور رات بھر تو وہ عجیب و غریب خواب دیکھتی رہی تھی۔ بچپنے کے خواب، پرانی
دیں ــــ بھولی بسری شکلیں۔ جو اس نے ذہن کے برزدان میں سیمنٹ کے بڑے
ٹرام سے لاشعور کے طاقچے میں رکھ دی تھیں۔ وہ یوں سر اٹھاتی تھیں۔ جیسے
لپ اندھیرے میں کہیں کہیں جگنو چمک اٹھتے ہیں۔ جب بھی اس کی آنکھ لگتی۔
خواب میں دیکھتی، کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔ امی جان
ں کے ماتھے پہ جڑاؤ جھومر سجا رہی ہیں۔ سہیلیاں ڈھولک پر گیت الاپ رہی ہیں۔

جا کے سسرال سکھی میکے کی لاج رکھنا

لیکن اس کا دِل دھڑک رہا ہے ـــ کہاں رکھی اس نے میکے کی لاج؟ خواب ہی میں وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کا دُولہا کون ہے؟ خواب میں گھبراتی ہوئی ہے۔ چاہتی ہے جلدی سے دُولہا نظر آجائے اور جب امّی جان اسے اٹھا کر رخصتی کے لئے لے جاتی ہیں تو وہ دیکھتی، کہ اس کا دُولہا شہباز ہے اسی طرح جوان، خوبرو شہزادہ سا، ہاتھ سے سہرے کی اوٹ ہٹا کے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

ایسی نظریں۔

ایسی محبت۔

وہ بے اختیار اس کے سینے سے لگ جانا چاہتی ہے کہ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

"افوہ!" آنکھ کھل جانے کے باوجود پسینہ پسینہ ہوتی رہی۔ کیسا خواب تھا؟ اس کے لاشعور میں شادی کی خواہش کیوں ہے؟ ہاں ایک بات عجیب تھی کہ خواب میں اس نے اپنے آپ کو بالکل جوان دیکھا تھا۔ اسی طرح، اٹھارہ برس کی ـــ موتیا کی کلی ـــ رات کی رانی کی پھولوں بھری ڈال ـــ شہباز بھی ویسا ہی جوان ـــ امّی جان بھی اسی طرح کی ـــ امّی جان کو دیکھنا کتنا اچھا لگا تھا۔ لاشعور کتنا مہربان ہے ـــ اپنے پاس پرانی شبیہہ چھپا کے رکھ لیتا ہے۔ ہم تو خود اپنی صورت اور اپنا آپ بھول جاتے ہیں... جب چہرے پر حالات کی خراشیں ہوں اور رُوح پر مسافت کی گرد، تب لاشعور وہ معصوم اور پاک چہرہ دکھا دے تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ رات کو اپنا چہرہ شیشے کی طرح صاف اور چاندی کی طرح اجلا لگا تھا۔ یہ کم بخت شیشہ نا بھی کتنا ہوتا ہے ـــ ذرا قریب ہو کے سانس لو تو دُھندلا جاتا ہے۔

نیّا شام ہوتے ہی گھبرا کر چھت پر چلی آئی ـــ گھبراہٹ تھی یا اداسی ـــ اوپر ننگے بھرے گھروں نے اس کا سواگت کیا۔ زمین کے بدرنگ سینے پر بچھے ہوئے تنے بے شمار گھروں کو دیکھ کر اس نے سوچا تھا اسی ایک گھر کی تمنا میں انسان اتنی ری عمر مانگ کے لاتا ہے، پھر یہی گھر دنیا میں ہی رہ جاتا ہے۔ یہ تو ساری زمین ند کی ہے اپنے نام پہ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگا کے انسان ایک سرے کا منہ نوچتا رہتا ہے۔ ایک ننھے سے قطعے کے لئے تو وہ جان گنوا تا ہے۔ مگر اس سرزمین کے بارے میں کیوں نہیں سوچتا ـــ جو اپنی ماں ہے ـــ اپنی جاگیر ہے۔ اس زمین کا تحفظ سب سے بڑا تحفظ ہے ـــ اگر اپنی سرزمین حفاظت نہ کی جائے تو یہ سارے گھر بے کار ہو جائیں گے۔ ان کی مضبوط دیواریں محفوظ نہ ہوں گی... ان کے اندر بیٹھنے والے بھی چین سے نہ رہیں گے.... نیّا کو یہ سوچ کر سکون سا ملا کہ اس نے اپنے گھر کے لئے نہیں بلکہ اپنی سرزمین کے ظ کے لئے جو ہو سکا وہ کیا ہے۔ کم از کم زندگی میں ایک خوبصورت اور اب کام کیا ہے ـــ وہ ہمیشہ گھر گھر کی رٹ لگائے رکھتی تھی مگر اب اس پیش نظر اپنا گھر نہیں بلکہ اپنا ملک تھا۔

مگر یہ اپنا گھر ہوتا کہاں ہے ـــ؟ اس نے دِل میں سوچا۔ آبا جی نے ت کر کے ایک گھر بنایا تھا۔ کتنا عرصہ نیّا نے اس گھر کو اپنا گھر سمجھا۔ پھر شادی ئی تو اسے دیس نکالا مل گیا ـــ اور عنایت بھائی بلا شرکتِ غیرے اس گھر کے ب بن بیٹھے... اور آگے ان کی اولاد کے ساتھ یہ چکر چلتا رہے گا۔ یہ زمانے صدیوں کا، وقت کا چکر ہے ـــ بچے، جوان، جوان بوڑھے ـــ اور بوڑھے ۔ اپنی جگہ چھوڑتے جائیں گے۔ یہ گھر یونہی کھڑے رہیں گے اور یونہی تماشا ا کریں گے۔ آنے جانے والوں کا ـــ

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ جشن پر جائے یا نہ جائے کہ فاروق کا فون آگیا اور خود بخود فیصلہ ہو گیا کہ آج کی دعوت پر وہ ضرور جائے گی... نیچے آکر جب اس نے اپنا وارڈ روب کھول کر دیکھا تو اس کا پرانا ولولہ جاگ اُٹھا۔ نیّا کو مظلومیت سے نفرت تھی۔ وہ کبھی اپنے لباس یا اپنی صورت سے یہ ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی کہ وہ اداس مضمحل یا پریشان ہے۔ آج رات کے لئے اس نے بہترین لباس بنایا تھا۔ پہلے گرم پانی سے غسل لیا۔ اپنے چہرے کو بھاپ دی تاکہ پچھلی شب کی بے خوابی کے نشان ڈھل جائیں اور وہ ذرا تازہ دم نظر آئے۔ معمول کے مطابق خوب اچھی طرح میک اپ کیا اور جشن کے لئے روانہ ہو گئی۔

وہاں پارٹیوں میں بے شمار لوگ تھے... عورتیں اور مرد — قہقہے، ملبوسات اور مصلحتیں — ہر کوئی مسکرا بھی رہا تھا — مگر مصلحت کے پردے تلے چھپا ہوا بھی تھا۔ ایسی محفلوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ وہاں پہنچتے ہی نیّا نے اپنے جی کی بے قراری کو گیٹ پر چھوڑا اور مسکراہٹ کا ایک دلکش ماسک چڑھا کر محفل میں شامل ہو گئی۔ اسے بہت لطف آتا تھا جب عورتیں اس کو دیکھ کر چونک جاتی تھیں۔ مگر اخلاق کا تقاضا تھا کہ اس سے مسکرا کر ملتی رہیں۔ لیکن ایک بات سے نیّا کا دل دھک سے رہ گیا تھا، جب اس نے بالکل اچانک کوزک کو وہاں دیکھ لیا.... نہ جانے کیوں اسے کوزک کی طرف سے ایک مسلسل خطرہ سا لگا رہتا تھا۔ کوزک نے اسے ایسا سوچنے کا کوئی عملی موقعہ نہیں دیا تھا اس کی کرنجی آنکھیں کینہ اور بغض چھپانے میں بڑی ماہر تھیں۔ پھر بھی نیّا کی چھٹی حس اسے تنبیہ کرتی رہتی تھی خطرہ اس کو یوں بھی محسوس ہوا کہ پہلے تو ایسی ہر جگہ جانے سے پہلے کوزک اسے فون کر کے پوچھ لیا کرتا تھا۔ آیا وہ بھی جا رہی ہے یا کہ نہیں، مگر آج وہ خود ہی چپکے سے چلا آیا تھا۔ حالانکہ پرسوں اس کی ملاقات دکان پر ہوئی تھی اور نیّا جانتی تھی کہ

ی دیر بعد فاروق بھی یہاں آئے گا۔ بہرحال قہر درویش بر جانِ درویش۔
ہنستا مسکراتا ہوا کوزک بالکل اس کے سامنے آگیا۔ تو نیّا نے بھی اپنے
وں کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے ساتھ ایک الگ جگہ پہ جا کر بیٹھ
کوزک مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ نیّا کی بھی ایک لمحے کے لئے
نہیں جھپکی... وہ سوچتی رہی۔

ع فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا

کیا بات ہے — ؟ کیا آج تمہیں کسی کا انتظار ہے ؟" کوزک نے اچانک
ے آنکھوں کی چوری پکڑ ہی لی اور سوال کر ڈالا نیّا ادا سے مسکرائی۔
تمہارے سوا اور کس کا انتظار ہو سکتا ہے ؟"
مگر آج تو میں بغیر انتظار کروائے آگیا ہوں۔"
یہی میں بھی سوچ رہی ہوں، بھلا تم نے آنے سے پہلے مجھے فون کیوں
کیا ؟"
صبح تک میرا ارادہ نہیں تھا یہاں آنے کا — آج شام ایک دوست نے
لیا تو چلا آیا — ویسے مجھے امید تھی کہ آج تم ضرور آؤ گی۔" نیّا کا دل دھڑک
جانے یہ الفاظ اس نے کیوں کہے تھے۔
دیکھا !" نیّا ہنس کر بولی۔ "میں جو کچھ کرتی ہوں، تمہاری توقع کے عین مطابق
ہوں۔"
ہاں... یہ تو تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ تم میری توقعات پہ —" پھر وہ کچھ
کہتے رُک گیا۔
تم نے اپنا فقرہ مکمل نہیں کیا کوزک —"
میں کام مکمل کرنے کے بعد فقرہ مکمل کیا کرتا ہوں۔" نیّا نے اس کی آنکھوں

میں دیکھنا چاہا — وہاں وہی سبز رنگ کا زہر پھیلا ہوا تھا۔ کوزک نے جلدی سے بات بدل دی تھی اور پھر نیّا کے حسن فتنہ سامان کے قصیدے پڑھنے لگا۔ اسی وقت نیّا کو سامنے سے فاروق آتا دکھائی دیا۔ نیّا وہاں سے اٹھنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ جب فاروق ان کے قریب سے انجان بن کے گزر گیا تو کوزک بولا۔

"اس شخص کو تم جانتی ہو —؟" نیّا نے مڑ کر جاتے ہوئے فاروق کو دیکھا اور بڑی بے نیاز سی شکل بنا کر بولی۔

"ہاں .. عرصہ ہوا اس سے ایک محفل میں ملی تھی، یہ اپنے آپ کو میرے ایک شوہر کا رشتے دار بتاتا ہے اور تم جانتے ہو جب شوہر چھوڑ دیا تو اس کے رشتے داروں سے کیا کام —؟ کبھی کسی محفل میں مل جائے تو ہیلو ضرور ہو جاتی ہے۔"

کوزک ایک دم سے کھڑا ہو گیا اور گیٹ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میرا ایک دوست آ گیا ہے — میں اسے لے آؤں —"

"کوئی بات نہیں۔" نیّا بھی کھڑی ہو گئی۔ "میں ذرا اندر جا رہی ہوں۔ ابھی تک میزبان خاتون سے بات نہیں ہوئی، ابھی آ جاؤں گی۔"

کوزک کو گیٹ کی طرف جاتا دیکھ کر نیّا جلدی جلدی اندر کی جانب لپکی۔ اس گ کے دونوں طرف لان تھا اور بیچ میں ایک بہت بڑا ہال تھا۔ ہال میں اس وقت آرکٹ بج رہا تھا اور کئی جوڑے محوِ رقص تھے۔ کچھ لوگ پچھلے لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹ کچھ نہ کچھ پی رہے تھے۔ نیّا راستے میں واقف کاروں کو ہیلو کہتی دوسری طرف نکل گئی۔ یہاں زیادہ تر ایسے لوگ بیٹھے ہوئے تھے جنہیں اس جشن سے کو سروکار نہ تھا۔ اپنے اپنے مطلب کا آدمی ڈھونڈ کر، اپنا اپنا رونا رو رہے تھے — وہیں ایک تنہا میز کے گرد فاروق بیٹھا سیون اَپ گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا نیّا اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی اور عین فاروق کے سامنے والی کر

پر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اس طرف آتے ہوئے کوزک نے بالکل نہیں دیکھا بلکہ وہ گیٹ کی طرف چلا گیا تھا مگر وہ دھوکا کھا گئی۔ کوزک کو ایک آدمی دکھائی ضرور دیا تھا مگر وہ بہانہ کر کے خود ہی اٹھ گیا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اب نیّا کدھر جاتی ہے۔ کیا کرتی ہے —؟ وہ اس کا پیچھا کرتا ہوا آرکسٹرا روم میں پہنچ گیا تھا۔ اور وہاں کھڑکی کے پاس ایک زاویہ بنا کر کھڑا ہو گیا تھا تاکہ شیشے کی اوٹ سے نیّا اور فاروق کو اچھی طرح دیکھ سکے .. کئی دن سے کوزک کو نیّا پر شک ہو گیا تھا۔ گو اس نے کافی ٹھوک بجا کر نیّا پر بھروسا کیا تھا، اسے یہ معلوم تھا کہ عورت ڈرپوک اور کمزور ہوتی ہے .. دھمکیوں سے ڈر جاتی ہے مگر اسے نیّا پر بھروسا تھا۔ پھر ایک دن اچانک اسے علم ہوا کہ نیّا نے اس کے گروپ کے اصول کو توڑ دیا ہے اور اس کی مہربانیاں شاہ کے ساتھ سوا ہو گئی ہیں۔ وہ شاطر آدمی تھا، معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے باوجود جینی ثبوت ڈھوتا پھرتا تھا اور جلد اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نیّا خفیہ طور پر فاروق سے ملتی ہے اور آج بالکل اچانک وہ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے چلا آیا تھا کیوں کہ آج اس پارٹی میں مدعو مہمانوں کی فہرست اُس نے دیکھ لی تھی۔ نیّا نے فاروق کے پاس بیٹھتے ہی اپنا پھولا پھولا ایوننگ بیگ کھولا۔ کچھ طے کئے ہوئے کاغذات نکال کر جلدی سے فاروق کے آگے رکھ دیئے اور بولی۔

"پہلے یہ کاغذات سنبھال لو۔ گھر جا کر دیکھنا اس وقت ان کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔"

فاروق نے اسی طرح وہ کاغذات اٹھا کر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال کوٹ کے بٹن بند کر لیے — یہ سب کچھ کوزک نے صاف دیکھا .. تھوڑی دیر اس انہیں دیکھتا رہا — پھر اس محفل سے نکل گیا۔

"آج کی رات بہت اہم ہے نیّا — صبح تمہیں ایک اہم خبر ملے گی — میں

نے سب لوگوں کے خفیہ اڈوں کا پتہ لگا لیا ہے — بس اب تم ان کی گرفتاری ہی کی خبر سنو گی۔"

"اللہ کرے —" نیا کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آ گئی۔

"تمہیں خوشی ہو گی نا نیا جب تم یہ محسوس کرو گی کہ تم نے وطنِ عزیز کے جسم سے کوڑھ کے کچھ داغ مٹانے کی سعی کی تھی۔"

"یقیناً خوشی ہو گی، لیکن اصل خوشی کے حقدار تم ہو۔ میری دعا ہے۔ اللہ تمہیں ہر قدم پر کامیابی عطا کرے اور تم ہمیشہ اسی جذبے سے کام کرتے رہو۔"

"میں نے اپنی بے بضاعت زندگی وطن کے لئے وقف کر دی ہے۔ جب تک زندہ ہوں اسی کی خاطر سانس لوں گا۔"

"تمہاری زندگی ناکارہ نہیں فاروق۔ تم اپنے عشق کی انتہا پر ہو۔ تمہاری محبوبہ تمہارا وطن ہے۔"

"مگر اس میں اب تم بھی شامل ہو نیا — کسی جذبے کے بغیر کوئی ذی روح اپنی آبرو اور اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگاتا۔"

"اصل میں وطن کی آن کے آگے سب ہیچ ہے فاروق اور پھر میرا تو فلسفۂ حیات ہی بدل گیا ہے۔ میں نے اب تک اپنی زندگی میں ٹھوکریں کھائی ہیں یونہی — دنیوی خواہشوں کے پیچھے بھاگتی رہی تھی۔۔۔ اب زندگی کا ایک مقصد بن گیا ہے۔"

"اپنے بارے میں اس طرح نہ سوچا کرو۔ تم نے اپنی زندگی کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اپنے دست و بازو سے روٹی کما رہی ہو۔ اپنے بچوں کی اچھی طرح پرورش کر کے حقوق العباد پورے کر رہی ہو۔۔۔ کئی عورتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ وافر عطا کیا ہے۔ مگر وہ اپنے آپ اور اپنی اولاد سے بیگانہ رہ کر زندگی گزار دیتی ہیں۔ تم میری نظر میں بہت نیک

ورت ہو۔"

"رہنے دو فاروق۔" نیا ہنس کر بولی۔ "اب مجھے بچوں کی طرح بہلا رہے ہو تم۔ لیے ایک بات میری سمجھ میں پوری طرح سے آ گئی ہے۔"

"وہ کیا —؟" فاروق بولا۔

"ہم — لوگوں نے زندگی کا ایک دائرہ بنا لیا ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان، دولت، دار اور شہرت، اکثر لوگ اس دائرے سے باہر نکل کر سوچتے ہی نہیں۔ ساری دگی انہی پتھروں کو سجدے کر کے چلے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں، عورت اور مرد کا سفۂ حیات چالیس سال تک بدل جانا چاہیئے۔ یعنی اس عمر تک پہنچتے پہنچتے جو کچھ حاصل کر لیا ہو لوگ اس پر قناعت کر لیں اور دل میں سوچیں کہ زندگی کے بنیادی تقاضوں ا کرنے کے لئے، اپنے نفس کے لئے، اپنے بال بچوں کے لئے جو کچھ کرنا ہے۔ یا ہے — اب عمر عزیز کا تھوڑا سا حصہ اپنے وطن کو دیں، بنی نوع انسان کے لئے ریں — اور کچھ ایسے کام ضرور کریں جس سے اللہ اور اس کا رسولؐ خوش ا ہے۔"

"واہ —" فاروق بے حد متاثر ہوا۔ "نیا اب تم ایسا کرو کہ ذہنی بیداری کی ایک تحریک ع کر دو۔"

"اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے مہلت اور توفیق دی، تو بقیہ عمر کوئی نیک کام کرنے میں گزار گی۔ کیا خیال ہے فاروق، چالیس سال کے بعد انسان کے فلسفۂ حیات میں لی آنی چاہیئے؟"

ہاں نیا —" فاروق بولا۔ "کاش ہر شخص اسی طرح سوچنے لگے۔"

جانے مجھے ایسا کیوں لگتا ہے۔ جیسے میں تھک گئی ہوں فاروق!"

ذرا سی قنوطیت ہے۔ آپ ہی آپ دور ہو جائے گی اور تم پھر زندگی کی دوڑ میں

اسی لگن کے ساتھ حصّہ لوگی؟"

"اے ہے"۔۔۔ فاروق ایک دم چونک کر بولا۔ "بارش ہو رہی ہے شاید"

"ہاں۔۔۔" نیّا نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ "دو تین قطرے میرے بازوؤں پر بھی گرے ہیں"۔ آسمان پر ننھے ننھے ستارے بھی ٹمٹما رہے تھے اور ننھی ننھی بوندیں بھی ٹپکنے لگی تھیں۔

"اسلام آباد کا موسم عجیب ہے۔ دیکھو آج ہوا میں بھی بڑی خنکی ہے"

"چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں"۔ فاروق بولا۔

"نہیں فاروق ـــ اندر موسیقی کی آواز سے میرا دم گھٹتا ہے۔ تھوڑی دیر یہیں بیٹھو"

"میرا تو کچھ نہیں تمہارے خوبصورت کپڑے خراب ہو جائیں گے"

"کپڑوں کی خاطر میں تازہ ہوا سے محروم نہیں رہنا چاہتی"۔ نیّا نے جھک کر اپنی کالی میکسی کو دیکھا۔ کہیں کہیں بارش کے قطرے گرے تھے اور رات کے وقت وہ قطرے لہو کے نشان کی طرح نیّا کے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے۔ کچھ لوگ بوندوں سے ڈر کر اندر جا رہے تھے، اور کچھ رم جھم کا مزا لینے باہر آ رہے تھے۔

"فاروق!" نیّا اپنے چہرے پر ہوا کے نرم تھپیڑے محسوس کرنے کے بعد بولی۔ "میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں"

"کہو ـــ؟"

"آج میری بات مذاق میں نہ ٹالنا"

آج میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ ابھی پندرہ منٹ بعد مجھے ایک انتہائی مشن پر جانا ہے۔ جب لوگ کھانے کے لئے اٹھیں گے میں غائب ہو جاؤں گا"۔ نیّا نے صاف پڑھ لیا فاروق کے چہرے پر تردّد کے آثار نمودار ہو رہے تھے اس لئے

اس نے طویل گفتگو سے اجتناب کیا اور جلدی سے بولی۔

"میں نے ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ میرے دونوں بچّوں کا اصل وارث شہباز ہے"

"میں اس پر یقین رکھتا ہوں"۔ فاروق نے جواب دیا۔

"اور اگر کبھی تم ان سے ملو تو میری طرف سے معافی مانگ لینا مجھے انہیں سمجھنے میں دیر تو لگی لیکن کوشش کے باوجود بھلا نہ سکی"

"تم خود کیوں نہ معافی مانگ لو اس سے۔ ذرا مجھے فارغ ہو لینے دو۔ ایک دھماکا خیز ملاقات کا بندوبست کروں گا"

اتنے میں کھانے کا بلاوا آ گیا۔ نیّا نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا اٹھتے اٹھتے دوبارہ بس اتنا ہی کہا۔

"میری یہ بات یاد رکھنا"

"یاد رکھوں گا" فاروق نے معنی خیز انداز میں کہا۔ پھر فاروق اندر کی جانب تے ہوئے بولا۔ "نیّا تم کس وقت جاؤ گی"

"ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔ غالباً گیارہ بجے تک جاؤں گی"

"اگر تم جلدی کھانا کھا لو۔ تو میں تمہیں پنڈی چھوڑ آؤں گا۔ یا کوئی آڈو تمہارے ساتھ کر دوں گا"

"نہیں!" نیّا بولی۔ "ابھی میں کچھ دیر رکوں گی۔ آج یہاں پنڈی کے بہت سے لوگ نظر آ رہے ہیں۔ جاتے وقت ان میں سے کسی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ یلی نہیں جاؤں گی"

"ٹھیک ہے۔ اکیلی مت جانا"۔ فاروق نے کہا اور وہ ڈرائنگ روم کی بھیڑ فائدہ اٹھا کر کہیں گم ہو گیا۔

نیّا نے براتیے نام کھانا کھایا۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لئے اور دوسرے

لان میں آگئی وہاں لوگوں سے گپ شپ لگاتی ایک صحافی سے جا ٹکرائی....
ساحری صاحب پنڈی کے ایک ہفت روزہ کے کالم نگار تھے بڑے تپاک سے ملے۔ انہوں نے جب یہ کہا کہ آپ پہ تو ایک فیچر لکھنے کو دل چاہتا ہے تو نیا ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں انہوں نے سچے دل سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا یا یونہی رواداری میں کہہ گئے مگر نیا پر سوز بانسری کی طرح بجنے لگی۔ سب باتیں اسے یوں ترتیب وار یاد آرہی تھیں جیسے کانچ کے برتنوں کی طرح جھاڑ پونچھ کر سجا کے یادداشت کے طاق میں رکھی تھیں۔ ساحری صاحب بھی قلم کاغذ سے بے نیاز بیٹھے تھے۔ فقط اپنے حافظے کی تختی پر اس کی لایعنی باتیں لکھ رہے تھے

بہت دیر بعد جب اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو گیارہ بجنے والے تھے۔

"افوہ —" اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر پنڈی کے سب لوگ جا چکے تھے۔ کوئی بھی تو نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے ساحری صاحب سے کہا۔ وہ بولے۔

"آج رات میں اسلام آباد میں اپنے ایک دوست کا مہمان ہوں اس لئے پنڈی نہیں جاؤں گا۔"

تب نیا نے اٹھ کر خاتونِ خانہ کو تلاش کیا، تاکہ اس سے اجازت لے کر جلد روانہ ہو جائے۔ ابھی پنڈی جانے والی گاڑیاں سڑکوں پہ ہی ہوں گی۔ خاتونِ خانہ سے ملنے کے بعد وہ اپنی چابیاں گھماتی ہوئی نکلی اور کار اسٹارٹ کر کے سڑک پہ آگئی اس وقت بوندا باندی تیز ہو گئی تھی مگر سڑکیں بہت روشن تھیں... اس نے کار کی روشنی میں دیکھا آسمان سے گرنے والی بوندیں خشک سڑک کے سیاہ سینے پہ عجیب مضطرب اور بے قرار انداز میں گر کر ایک جالا سا بن رہی تھیں۔ نیا کو ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ اس نے کار میں لگے ٹیپ کو آن کر دیا۔

♫ کی جانا میں کون

کی جاناں میں کون

گیت دھیمے دھیمے سروں میں اسرار کے پردے اٹھانے لگا... کئی دنوں سے نیا کے کار کے کیسٹ میں یہی ٹیپ لگا ہوا تھا پھر بھی اسے اپنا سراغ نہیں ملا تھا عمر کی بھول بھلیوں میں گول گول دائروں میں گھومتی، جانے وہ کس موڑ پر آگئی تھی کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ وہ کون ہے؟ خود بھی وہ اپنے آپ سے پوچھتی تھی کہ وہ کون ہے؟

♫ کی جاناں میں کون
کی جاناں میں کون

اسی وقت جیسے ایک زلزلہ سا آگیا۔ دائیں اور بائیں دونوں سمتوں سے دو موٹریں آکر عین اس کے سامنے رک گئیں، بریک پہ پاؤں رکھتے ہی اسے دھچکا سا لگا اور سنبھلنے سے پہلے ٹھائیں ٹھائیں کی آوازوں نے اس کی بصارت اور قوتِ گویائی دونوں سلب کر لیں۔ بادل یہ منظر دیکھ کر زور زور سے رونے لگے وہ لوگ اپنا کام کر کے بھاگ گئے اور وہ وہیں کار کی سیٹ پر سجدہ ریز ہو گئی... ٹیپ دھیمے سُروں میں بج رہا تھا۔

♫ کی جاناں میں کون
کی جاناں میں کون....

بوجھل ہوائیں پیغام لے کر ادھر اُدھر روانہ ہو گئیں، کی جاناں میں کون....
بوندوں نے بھی یہی فریاد کی۔

وہاں سے ایک گشتی پولیس کی جیپ گزری۔ دُور سے تو پولیس کے دستے نے سمجھا کہ کوئی گاڑی بیچ سڑک خراب ہو گئی ہے — اس لئے روشنیاں پھینک کر اور ہارن بجا بجا کر وہ گاڑی والے کو متوجہ کرتے رہے۔ جب ادھر سے کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے جیپ سے اتر کر موٹر کے دائیں بائیں دیکھا۔ دائیں طرف ایک

پیراہن لٹک رہا تھا اور اس میں سے قطرہ قطرہ خون زمین پر گر رہا تھا۔

"کون ہے بھئی ——؟"

"کون ہے ——؟"

"پولیس والوں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا ایک جوان نے اپنی کرخت آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم ——؟"

؎ کی جاناں میں کون . . .
کی جاناں میں کون . . .

آنسو بھرے لہجے میں ٹیپ بجتا رہا۔

"یار یہ تو کوئی عورت ہے۔"

"اور اس کو گولی لگی ہے۔"

"کس نے ماری ہے۔"

"مگر یہ ہے کون۔"

؎ کی جاناں میں کون . . .
کی جاناں میں کون . . .

ایک ہی آواز گاڑی کے دروازوں اور شیشوں کے ساتھ سر پھوڑ رہی تھی۔

"یار پہلے اس بک بک کو تو بند کرو۔" اس افسر نے ٹیپ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

نیا اسپتال پہنچا دی گئی اس کا اتا پتہ مل گیا تھا صبح یہ خبر اخباروں میں بھی لگ گئی فاروق تو اس رات ہی مہم سر کرنے گیا ہوا تھا اور آج کامیابی کے نشے میں لوٹا تھا۔ بہت شدید مقابلے کے بعد اس نے سارے گینگ کو گرفتار کر لیا تھا۔ جونہی وہ اسلام آباد آیا اس دلخراش خبر نے اس کے ہوش اڑا دیئے۔ وہ بھاگا ہوا اسپتال

پہنچا . . . گزشتہ چھتیس گھنٹوں سے نیا بے ہوش تھی۔ ڈاکٹروں نے مایوسی کے عالم میں سر ہلا دیئے تھے۔ فاروق نے نیا کے بازو کی طرف دیکھا اور گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں کیا کروں۔؟" اس نے دل میں سوچا تب اسے اچانک نیا کے الفاظ یاد آ گئے . . .

"میرے دونوں بچوں کا اصل وارث شہباز ہے فاروق اور شہباز سے کہنا۔"

فاروق نے گھڑی بھر کچھ سوچا نظر بھر کر نیا کا خوابیدہ چہرہ دیکھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"میں جب چھوٹی سی تھی تو بہت باغی قسم کی لڑکی تھی۔ تین بھائیوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس کے باوجود بھائیوں کو جو گھر میں برتری حاصل تھی۔ وہ میرا جی جلانے کو کافی تھی۔ اپنی اہمیت کا احساس دلانے کو میں بچپن ہی سے اونگی بونگی حرکتیں کرنے لگ گئی تھی میرے اندر ایک تجسّس بھی بڑھتا گیا... میرا جی چاہتا آسمانوں پر اُڑوں۔ ساری دُنیا کو تہس نہس کر دوں۔ ابّا جی کا مجھ پر دباؤ میری عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ اِدھر میرے اندر دُنیا کو جاننے اور دیکھنے کا تجسّس بھی بڑھتا گیا.... انہوں نے خوفزدہ ہو کر میری شادی کر دی — اصل میں قوتِ پرواز کو مفلوج کرنے کے لئے والدین لڑکی کی کمسنی میں شادی کر دیتے ہیں اور شادی سے لڑکیاں کیا — ؟ لڑکے بھی سنبھل جاتے ہیں۔"

"کیا آپ سنبھل گئیں —— ؟"

"جی ہاں! سنبھل بھی گئی اور بہل بھی گئی تھی۔"

"آپ کے خیال میں آپ کو اپنا آئیڈیل شوہر مل گیا تھا۔ ؟"

"ساحری صاحب! یہ آئیڈیل کیا ہوتے ہیں۔ اس بات کی سمجھ بھی پختہ عمر میں ہی آتی ہے۔ ورنہ تو نوجوان لڑکیوں کے لئے آئیڈیل کانچ کے کھلونے ہوتے ہیں، بنتے

رہتے ہیں۔ ٹوٹتے رہتے ہیں.... اصل میں نوجوانی کی عمر میں لڑکیاں اور لڑکے جو چاہتے ہیں... یا جی میں جو خواہشیں رکھتے ہیں ان کو مجسّم کر کے ایک آئیڈیل تراش لیتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں آئیڈیل ہوتے نہیں بناتے جاتے ہیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر فریق دوسرے کا آئیڈیل بننے کی کوشش کرے۔ شادی کے بعد معاملہ ذرا بڑھا ہو جاتا ہے ہر فریق یہ چاہتا ہے کہ دوسرا فریق اس کا آئیڈیل بن جاتے۔ مگر زندگی میں یوں نہیں ہوتا۔"

"آپ نے کیا چاہا تھا — ؟"

"میں نے بھی یہی چاہا تھا کہ میرا شوہر میرے آئیڈیل میں ڈھل جاتے۔ گھر میں مجھے نسانوی ماحول مل جاتے جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔"

"آپ نے کیا خواب دیکھے تھے — ؟"

"وہی جو ہر نوجوان لڑکی دیکھتی ہے۔ وہ چاہتی ہے۔ شادی کے بعد شوہر کی بلا شرکتِ غیرے مالک ہو۔ گھر میں کوئی روک ٹوک نہ ہو شادی سے پہلے والدین کے گھر میں ہر لڑکی پر کوئی نہ کوئی بندش ہوتی ہے اور والدین ہمیشہ ہر بات اس جملے پر ختم کر دیتے ہیں کہ بھئی جب بھی کرنا ہوا اپنے گھر جا کر کرنا۔ لڑکی لاشعوری طور پر یہ سمجھ لیتی ہے کہ شادی آزادانہ گھومنے پھرنے اپنی مرضی سے پہننے، رہنے سہنے اور کھانے پینے کا ایک پروانہ ہے۔ نہ صرف اس گھر میں آزادی ہوگی۔ بلکہ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل بھی ہوگی۔ پھر فلمیں دیکھ دیکھ کر اور ناولیں پڑھ پڑھ کر تو یوں احساس ہوتا ہے کہ خاوند کی صورت میں ناز نخرے اٹھانے کا ایک مستقل قلی مل جاتے گا۔ ایسا عاشق جسے ہمارے حسن کے قصیدے پڑھنے کے وقت بے وقت محبت کا اظہار کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ ہوگا۔ تقریباً ہر لڑکی یہ خواب آنکھوں میں بسائے رکھتی ہے۔

"تو کیا عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا — ؟"

"نہیں ساحری صاحب! یہ حقیقت بڑی تلخ ہے کہ عملی زندگی میں ایسا ہونے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ دیکھیں نا؟ ذرا آپ ایک متوسط طبقے کے مرد کی زندگی کا جائزہ لیں والدین کس مصیبت سے اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ خصوصاً لڑکوں کو، اور جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں کمانے لگتے ہیں تو پورے خاندان کی پر اُمید آنکھیں ان پر لگ جاتی ہیں۔ گھر میں جوان بہنیں بھی ہوتی ہیں ان کی شادی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی ہوتا ہے اور اب ہمیں اس غریب لڑکے کا بھی جائزہ لینا چاہیئے وہ لڑکا جب جوان ہوتا ہے تو اسے اس معاشرے میں کیا ملتا ہے؟ بیس بائیس سال تو تعلیم حاصل کرنے میں چلے جاتے ہیں۔ باقی کچھ سال نوکری ڈھونڈنے میں، اس کے بعد وہ اس جد و جہد میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ ذرا اسٹیٹس بنا لے۔ پیسہ کما لے، تاکہ کسی اچھی جگہ شادی ہو جائے ـــ وہ بھی شادی کو اپنے خوابوں کی معراج بنا لیتا ہے کہ زندگی کی جفاکشی اسے رومانوی زندگی بسر کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتی، پھر جب شادی ہو جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔؟ اگر بیوی حسبِ منشا نہیں ملی یا بیوی کا مزاج اس کے والدین سے نہیں ملا تو خواب ٹوٹنے لگتے ہیں۔ گھر میں چخ چخ شروع ہو جاتی ہے۔ پھر بچے ہونے لگتے ہیں۔ مالی اور معاشی مسائل بڑھنے لگتے ہیں ایسے میں آئیڈیل کا خیال کہاں رہتا ہے؟ یہ ہمارے پورے معاشرے کا المیہ ہے۔" نیا بے تکان بولے گئی۔

"آپ کے خیال میں اس کا حل کیا ہے ـــ؟" ساحری نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اس کا حل حقیقت پسندی ہے۔ دونوں جانب سے ـــ مرد بھی عورت کو انسان سمجھے اور اس سے زیادہ توقعات وابستہ نہ کرے اور عورت بھی مرد کو کوئی مافوق الفطرت قسم کی چیز نہ سمجھے لڑکیوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اپنی تمام تر دلکشی کے باوجود شادی حقوق و فرائض کی تکمیل کا ایک خوبصورت ذریعہ ہے جو اپنے حقوق صحیح معنوں میں ادا کرے گا۔ وہی خوش بھی رہے گا۔ جد سے زیادہ توقعات انسان کو مایوس کر دیتی ہیں۔ پھر ازدواجی

زندگی میں قدم قدم پر ایثار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایثار عورت کو زیادہ کرنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ عورت لچکدار ہے۔ ٹوٹتی نہیں۔ دنیا میں جتنے بھی گھر آباد اور خوش و خرم نظر آتے ہیں لچکیلی فطرت والی عورتوں کے صبر و تحمل اور ایثار سے آباد ہیں۔ جہاں پر جب بھی کوئی عورت اکڑ جاتی ہے اور جھکنا گوارا نہیں کرتی وہیں پہ بندھن کمزور پڑنے لگتا ہے۔ کسی ایک فریق کو جھکنا ہی پڑتا ہے۔ مرد چونکہ باہر کی دنیا سے لڑتا ہے اس لئے وہ گھر میں ٹوٹنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ گھر میں اپنی برتری کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔"

"اور آپ نے جھکنا گوارا نہ کیا۔ اس لئے ٹوٹ گئیں۔" ساحری نے لقمہ دیا۔ نیا نے ساحری صاحب کے طنز کا برا نہیں مانا۔ بلکہ مسکرا دی۔ آج اسے طنز بہت اچھا لگا تھا اس کر بولی۔

"جھکنے سے گریز نہیں کیا میں نے، لیکن عمر کا جذباتی پن اور حالات کا گھناؤنا پن سے آیا۔ میں ذہنی طور پر جھکنے کے لئے پیدا کی گئی تھی امی ابا نے بھی یہی درس دیا تھا شاید تقدیر مجھ سے زبردستی کر رہی تھی۔ تبھی تو میں کہتی ہوں نوجوانی کے فیصلوں میں رائی نہیں ہوتی۔"

"اس کا ہم یہ مطلب نکالیں کہ طلاق لے کر آپ پچھتائیں۔"

"جی ـــ" نیا نے بہت آہستہ سے جواب دیا۔

"کیا اس کی وضاحت کریں گی؟"

نیا سگریٹ سلگا کر کش لینے لگی پھر اپنی بڑی بڑی اُداس آنکھیں سکوڑ کر بولی۔

"اصل میں جوانی بڑی ظالم شے ہے جوانی کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر یں اور کان نہیں ہوتے۔ اس لئے جوانی کا چراغ حوصلے کی فصیل پر روشن کر کے عورت گھر سے نکل آتی ہے تو یہ عزم ہوتا ہے کہ یہ کرے گی ـــ وہ کرے گی۔ صد کی مالا پروئے گی۔ مقابلے کا سو میٹر رچائے گی۔ قوتِ ارادی آزمائے گی۔ جنگ

لڑے گی۔ فتح کے شادیانے بجائے گی۔ اپنا نیا جہاں دریافت کرلے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت سب کچھ کرنے کے باوجود عورت ہی رہتی ہے۔ اس کے پاس ذہانت ہے ــ عقل ہے ــ ہمت ہے ــ شعور ہے ــ فیصلہ کرنے کی قوت ہے اور اللہ تعالےٰ نے عورت کو صلاحیتیں تقسیم کرتے وقت بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ عورت کو کچھ اس کے سوا بھی دیا ہے۔ مثلاً مامتا کا جذبہ، تخلیق کی دولت، ان دونوں قوتوں کے ساتھ جب وہ سوچتی ہے تو اس کی سوچ میں انسانیت کا سوز آجاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں مرد اس دنیا کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہے اللہ کا خلیفہ ہے اس زمین پر ــ وہ کب گوارا کرتا ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں رہیں۔ اس لئے جب عورت گرہستی کو تج کر میدان میں نکلتی ہے۔ تو بہت سی تلواریں اس کی راہ میں کھڑی ہوجاتی ہیں۔ جس سے اس کا پندار مجروح ہوتا رہتا ہے۔"

"مگر آپ نے تو ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا ہے ــ؟ اور ہمیشہ کامیاب بھی رہی ہیں" نیاؔ جواباً مسکراتی اور دھیرے سے یہ شعر پڑھ دیا۔

میرے سلیقے سے میری نبھی رہی اب تک
تمام عمر ہی ناکامیوں سے کام لیا

"کیا آپ ان مشکلات پر روشنی ڈالیں گی جو اس راہ میں آپ کو پیش آئیں؟"

چھوڑیئے ساحری صاحب! جس راہ سے گزر گئے، اس کو پلٹ کر کیوں دیکھیں ــ اب تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے ؎

؎ غم دیا ہے تو زندگی بھی دے
غم زیادہ ہے زندگی کم ہے

"ہاں تو نیاؔ صاحبہ! سُنا ہے آپ نے دوسری مرتبہ بھی شادی کی تھی ــ؟ کیا دوسری شادی آپ کی محبت کی شادی تھی؟"

"اصل میں ایک سچی عورت بار بار محبت نہیں کرسکتی۔ میں تو کہتی ہوں ایک مرد بھی دوسری تیسری بار پہلی جیسی شدت سے محبت نہیں کرسکتا۔ یونہی ہر بار محبت کا ڈھونگ رچاتے جاتا ہے۔ کیونکہ محبت ایک ایسا کنول ہے جو دل کی سطح پر ایک ہی بار کھلتا ہے یہ وہ چاند ہے جو صرف ایک بار من کے آنگن میں اترتا ہے۔ یہ وہ گیت ہے جو ایک ہی بار کانوں میں رس گھولتا ہے۔ ایک ہی بار جینے کو جی چاہتا ہے۔ محبت کا ایک ہی راستہ ہے ــ اس پر آدمی ایک ہی بار چل کر جاتا ہے اور جاتے ہوئے اپنے قدموں کے نشان مٹاتا جاتا ہے۔ کیونکہ واپسی کا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"پھر آپ نے دوسری شادی کیوں کی؟"

"ضرورت ــ تجربہ ــ آسرا ــ ایک نوجوان عورت عمر بھر تنہا نہیں رہ سکتی اور تھوڑی سی دیر کے لئے وہ سوچ لیتی ہے کہ اسے واقعی کسی سے محبت ہوگئی ہے لیکن محبت ایک جنم میں صرف ایک بار ہوتی ہے ــ باقی سب بہلاوے ہیں۔"

"آپ اپنی دوسری شادی کی ناکامی کے اسباب بتانا پسند فرمائیں گی؟" ساحری صاحب نے چسکا لینے کی خاطر دوسرا کچوکا لگایا۔ نیاؔ اسے بھی پی گئی۔ تھوڑی دیر بیٹھی سگریٹ کے کش لیتی رہی ــ پھر بولی۔

"میں نے ابھی آپ سے کہا تھا نا؟ دوسری شادی یا تو تجربہ ہوتی ہے یا انتقام ــــ پہلی ناکامی کے داغ عورت مرد دونوں کے ذہنوں پر ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے سماج کی عورت کچھ اور طرح کی ہوتی ہے۔ اس پہلے آدمی کو نہیں بھول سکتی جو اس کے نصیب آتا ہے۔ شاید دوسری شادی کی ناکامی کی ایسی ہی نفسیاتی وجوہ ہوں۔"

"آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے دوسرے شوہر پر پردہ ڈال دیا ہے۔"

پردہ ڈالنے والا تو اللہ ہے ــ جو آدمی کہیں ذہن میں نہ ہو اور زندگی سے نکل گیا ہو اس سے کوئی خوشی نہ ملی ہو اس کو بُرے لفظوں میں کیوں یاد کیا جائے؟"

"اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ آپ ابھی تک اپنے پہلے شوہر کو نہیں بھولیں" ساحری صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ڈریے نہیں۔ کھل کے سوال کیجئے ــــ لیجئے میں خود ہی بتائے دیتی ہوں شہباز سے میری طلاق شہباز کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی ماں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس کی ماں ایک سفّاک اور جابر عورت تھی اور میرا جذبۂ انتقام علاحدگی کے نقطے پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔ مگر مجھے شہباز سے نفرت نہیں تھی میں اسے محض ایک بزدل مرد سمجھتی تھی۔ مجھے بہت دیر بعد پتہ چلا کہ والدین خواہ کتنے ہی سفّاک اور ظالم کیوں نہ ہوں۔ ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی اجازت نہیں ہے اور کوئی بھی شریف النفس آدمی ایسا نہیں کرتا۔ شہباز بھی مجبور تھا اور پھر جب میں نے دنیا میں نکل کر دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ دُنیا تو جرنیل آپا سے بھی زیادہ سفّاک اور سنگدل ہے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری ہے اور اس چھری سے وہ آپ کے کلیجے کو چھید دینا چاہتا ہے۔ جرنیل آپا کے ساتھ رہ کر کم از کم چار اور چار دیواری کا تحفظ ضرور تھا مگر ایک تنہا عورت پر اتنی انگلیاں اٹھتی ہیں کہ دیواریں ڈھے جاتی ہیں ــــ بدنامیوں کی ایسی آندھیاں چلتی ہیں کہ چادر اڑ کر دور جا گرتی ہے۔ دنیا میں جرنیل آپا کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتی ہے۔ کہیں خانم کی صورت میں ــــ کہیں رازی بن کر ــــ کہیں... کہیں..."

وہ کوثر کا نام لیتے لیتے رہ گئی تھی کہ اس کا یہاں کیا ذکر ــــ

"جب میں نے یہ سچائیاں تلاش کیں ــــ تو پانی سر سے گزر چکا تھا" وہ دوبارہ گو ہوئی اور پھر میں چلتی رہی، چلنا زندگی کی علامت ہے ــــ رونا، واویلا کرنا ــــ بچپنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"طلاق کے بعد کیا آپ کی مُلاقات کبھی شہباز سے ہوئی ــــ؟"

"نہیں ــــ" اُنیّا نے سوگواری سے سر ہلایا۔ جب سے ہم جدا ہوئے ہیں ہما

مُلاقات نہیں ہوئی مگر وہ اب تک میرے ذہن میں اسی طرح ہیں جیسے کل کی بات ہو کل کا واقعہ ہو۔ نہ چاہنے کے باوجود جب کبھی میں ــــ کسی اچھے آدمی کے بارے میں سوچنا چاہوں گی۔ تو خود بخود شہباز کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ حالانکہ میرا ان کا اب کوئی قانونی تعلق نہیں۔ مگر میں ان کے ساتھ ایک روحانی سا تعلق اب بھی محسوس کرتی ہوں۔ جانے یہ کیسا تعلق ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"یہ کیسا تعلق ہے ــــ؟"

"یہ کیسا تعلق ہے ــــ؟" شہباز نے بے چینی سے پہلو بدلا اور رسالہ ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

جب سے نیّا اسپتال گئی تھی۔ شہباز کا معمول بن گیا تھا کہ علی الصبح سارے اردو اور انگریزی کے اخبار لے کر بیٹھ جاتا اور صفحہ صفحہ کھنگال ڈالتا نیّا پر قاتلانہ حملے کی تہلکہ خیز خبر اخبار میں دے کر دو تین دن بعد اخبار والے غافل ہو گئے تھے انہیں اس سے کیا واسطہ کہ اس ہولناک خبر سے کتنے دل ٹوٹے، کتنے گھروں کا سکون برباد ہوا ــ کون چھپ چھپ کر رویا اور کس نے شب و روز کانٹوں پر گزارے۔ اخباروں کو تو سنسنی خیز خبروں سے اس حد تک دلچسپی ہوتی ہے کہ ہر جا شور مچ جائے اور اخبار کی فروخت بڑھ جائے۔ سو وہ ایک دھماکا کر کے بے حس گونگے اور بہرے ہو گئے تھے۔ وہ ہر روز اس خیال سے اخبار دیکھتا کہ اس میں تردید یا تائید کی کوئی خبر چھپے گی۔ اللہ کرے یہ سب جھوٹ ہو ــ من گھڑت کہانی ہو ــ اخباروں میں آئے دن من گھڑت خبریں بھی تو چھپ جاتی ہیں یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو۔ مگر اخباروں کے صفحات اس کے جنوں کا مذاق اڑاتے

تھے وہ کہتے تھے۔ ہم کوئی قاصد کبوتر ہیں کہ ادھر کی خبر ادھر لاتیں۔ آج اچانک ایک ہفتہ وار اخبار خریدا تو اس میں نیّا کا تفصیلی انٹرویو چھپا تھا جو اس نے جشن کی رات ایک صحافی کو دیا تھا۔ ہفت روزہ نے نیّا پر قاتلانہ حملے کی خبر کے ساتھ اس کا یہ تفصیلی انٹرویو بھی شائع کیا تھا۔ شہباز کئی بار اس انٹرویو کو پڑھ چکا تھا وہ بے اختیار ہو کر رو دیا تھا۔ سنگین سے سنگین حالات گزرے مگر اس کی آنکھ نم نہ ہوئی۔ مگر آج آنسو تمام حدود توڑ کر بہے چلے جا رہے تھے۔ خواہ مخواہ رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

بے وقوف عورت تو کیا جانے ــــ تعلق کیا ہوتا ہے۔ تیرے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی تلافی کے لئے تو میں نے اپنی عمر کا حسین ترین حصہ آسیب زدہ مکان کی طرح ویران رہ کر گزار دیا اور تیرے قریب نہ آیا۔ اس خیال سے کہ تو مجھ سے اور میری صورت سے نفرت کرتی ہے۔ ڈرتا رہا۔ آہیں بھرتا رہا ــ آج . . . . آج بدنصیب عورت ــ تو اس بات کا اعتراف کر رہی ہے۔ بہادری کی چادر اوڑھ کر تو نے مظلومی کی زندگی بسر کی۔ میں تیرا ہاتھ تھام سکتا تھا۔ تیرا سائبان بن سکتا تھا۔

اُس دن کے بعد سے وہ بینک بھی نہیں جا سکا تھا۔ چھٹی لے رکھی تھی۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ جب کبھی نیّا کا خیال آتا رونے لگتا۔ وہ جانتا تھا مردوں کے لئے رونا بزدلی کا طعنہ ہے۔ مگر وہ تو ازلی بزدل تھا اسے ایک سال ہو گیا تھا اسلام آباد آئے ہوئے مگر اس نے ایک بار بھی نیّا سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی نہ اسے فون کیا تھا اور نہ اس کا سامنا کرنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر سکا تھا ایسے مرد کو رونا ہی چاہیئے اور اپنے رونے پر بھی اسے ترس نہیں آتا تھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی ــــ وہ گُم صُم بیٹھا رہا ــ ایسے جیسے گھنٹی اس کے لئے نہیں، پڑوسی کے گھر میں بج رہی ہو۔ گھنٹی کی آواز بھی اسے بُری لگ رہی تھی۔

مگر جب گھنٹی مسلسل بجتی رہی تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں اس کے لئے کوئی ضروری خبر تو نہیں اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو ــــ!"

"شہباز صاحب ہیں؟"

"جی ــــ جی۔ بول رہا ہوں۔" شہباز نے دھڑکتے دل سے کہا۔

"شہباز صاحب میں فاروق بول رہا ہوں نیّا کا کزن ــ چار دن سے نیّا اسپتال میں ہے اور آپ اسے دیکھنے بھی نہیں آئے۔"

"جی ــــ جی ــــ" شہباز ہکلایا۔

"کم از کم آپ اسے دیکھنے تو آجاتے ــــ اس کا حال تو پوچھتے ــــ اس بھری دنیا میں آپ کے سوا اس کا کون ہے ــــ؟"

"جی میں .... میں ...."

"ہاں ہاں آپ ــــ آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ موتی کو اطلاع کرتے۔ ہوسٹل سے سیپ کو لے آتے اسپتال میں نیّا کی خبر گیری کرتے۔ مریضوں کو اسپتال میں دوستوں کا آنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

"شہباز تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ ریسیور اس کے ہاتھوں میں تھرتھرانے لگا ہے۔

"کیا جواب دوں ــــ؟" وہ آہستہ سے بولا۔ فاروق نے اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی صاف محسوس کر لی تھی۔ اس لئے وہ فوراً بولا۔

"جلدی سے تیار ہو جایئے۔ میں آپ کو لینے آرہا ہوں۔"

"جی اچھا ــــ" شہباز صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

نیّا کو اسپتال میں داخل ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس کے دو کامیاب آپریشن ہو چکے تھے مگر ابھی تک اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں کھولتی مگر کسی کو پہچانے بغیر پھر بند کر لیتی تھی۔ کبھی کسی بات کا جواب دینے کی کوشش بھی کرتی مگر اس طرح کہ سننے والوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔ ڈاکٹر ابھی تک اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے تھے اور وہ بستر پر لیٹی تھی۔ جیسے جنم جنم کی تھکن اتار رہی ہو۔ لیٹے لیٹے کبھی کبھی ذہن میں الاؤ سے سلگ اٹھتے۔ کسی نامعلوم سمت سے زمین پر روشنی ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتی اور وہ ایک دم بڑبڑانے لگتی تھی۔

"امّی ــــ امّی جان ــــ اب تو آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں۔"

"ابّا جی ــــ ابّا جی ــــ اب تو میں نے آپ کے نام کو بٹہ نہیں لگایا۔ میں نے زندگی میں کوئی بُرا کام نہیں کیا۔ اپنی آبرو کو سنبھال کر رکھا۔ مگر پھر بھی میری چُنری پر داغ آئے۔ آپ جانتے ہیں ابّا جی میری چُنری صاف تھی ــــ کوری تھی ــــ دُنیا نے یونہی کیچڑ اچھالا تھا۔ چُنری کے یہ داغ دھونے کے لئے ــــ یہ چُنری میں نے وطن کی دلہن پر وار دی ــــ نثار کر دی ــــ امّی ــــ امّی ــــ"

"نیّا ــــ"

"نیّا ــــ"

"نیّا ادھر دیکھو ــــ"

"نیّا تم ہمیں پہچانتی ہو؟"

یکایک نیّا کو کوئی جھنجوڑنے لگتا۔ نیّا کو یہ آوازیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں وہ پہچاننا چاہتی تب بھی ان آوازوں کو نہ پہچان سکتی تھی۔ ذہن پر زور دیتی تو وہ چراغ کی مانند پھڑپھڑا کر بجھ جاتا۔ جانے یہ لوگ کون تھے۔ جو اسے پکار رہے تھے۔ آوازیں دے رہے تھے ــــ یوں لگتا تھا یہ آوازیں بڑی مسافت طے کر کے آ رہی ہیں ــــ وہ پلٹ پلٹ کر آتی ــــ زور لگاتی مگر اسے صرف اپنی شریانوں میں دوڑتے ہوئے خون کی مدھم مدھم آوازیں سنائی دیتیں۔ جیسے چشمے کا زور پیچھے سے ختم ہو گیا ہو۔ جیسے چشمہ دھیرے دھیرے بہہ رہا ہو۔ پھر اچانک وہ چشمہ دودھ کا بن جاتا ہے اور آس پاس بادلوں کے کارواں آ کر ٹھہر جاتے ــــ کسی سمت سے ابّا جی نکل آتے ــــ کہیں سے امّی جان کا مکھڑا دکھائی دیتا ــــ وہ بازو پھیلا دیتی ــــ

امّی مجھے بچا لیں ــــ امّی مجھے واپس بھیج دیں ــــ ابّا جی ــــ آپ جانتے ہیں۔ میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کی کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ میں ان کی زندگی کی خوشیاں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان کا میرے سوا کوئی نہیں ــــ ایک بدنام عورت . . . کے بچّوں کو زمانہ ٹھوکریں مارے گا ــــ امّی جی خدا سے میری زندگی کی بھیک مانگ لیں ــــ سنا ہے ماں کی دُعا کبھی پلٹ کر نہیں آتی۔"

"اس دنیا سے میرا ناطہ جوڑ دو۔"

"آسمانوں سے زمین پہ اتار دو میری ماں۔"

"میرے بچے بلک رہے ہیں۔"

مگر امّی جان تو بولتی نہیں تھیں ــــ آسمان کے اودے، سفید کناروں سے اتر کر یوں بڑھی آ رہی تھیں جیسے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ انہوں نے بادلوں جیسا لباس پہن رکھا تھا ــــ پہلو میں ابّا جی بھی تھے ــــ امّی جان کے ایک ہاتھ میں تاج تھا۔ مرصع، منقش، جگمگ کرتا اور ابّا جی کا عصا مشعل کی مانند چمک رہا تھا ــــ امّی جان ہوا کے دوش پر اڑتی اس کے قریب آ گئیں ــــ تنفس کی دوڑی کے پاس آ کر رک گئیں اور بولیں۔

"یہ دیکھ رہی ہو کیا ہے؟"

"ہاں امّی جان، یہ تاج ہے۔"

"یہ تاج تمہارے لئے بھیجا گیا ہے۔ یہ تاج شہیدوں کو پہنایا جاتا ہے۔ شہید زوال اور لافانی ہوتے ہیں آبدی زندگی کا سُکھ اٹھاتے ہیں۔ فانی زندگی کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہ تاج پہننا چاہتی ہو۔ یا واپس اپنے بچّوں کے پاس جانا چاہتی ہو امّی امّی ــــ امّی جان۔"

"ممی ــــ"

"ممی ــــ"

"او ممّی ــــ" شاید سیپ اسے آوازیں دے رہی تھی۔ غالباً موتی پکار رہا تھا اور بہت آوازیں تھیں عجیب و غریب آوازیں۔ خون کی بوتل سے قطرہ قطرہ خون وجود میں ٹپکنے کی آواز ــــ مشینوں کی ٹک ٹک کی آوازیں ــــ کچھ سوئیاں چبھی تھیں۔ کوئی اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ دل ایک دم سے حرکت میں آ گیا ــــ شریانوں سے خون دوڑنے لگا۔ تنفس نے جلدی جلدی باریک نتھنوں کو چھوا۔ وہ اپنے بستر پر آ گئی۔

"ٹھیک ہے ــــ"

ٹھیک ہے ــــ"

ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ڈاکٹر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ تھپک رہا تھا۔ نیا نے زور لگا کے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ سُرخ انگارہ آنکھیں نرمی سے دا ہوئیں۔ کمرے کی ہر شے سُرخ سرخ اور دھندلی دھندلی نظر آنے لگی۔ کمرہ کیسا اجنبی لگ رہا تھا۔ جیسے کسی جنم میں بھی نہ دیکھا ہو۔ کچھ نئے چہرے آس پاس نگران تھے مگر کسی کی شناخت نہ ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی سرگوشیاں سرہانے کی طرف سے سنائی دے رہی تھیں مشینیں اس کے دل کو دھڑکنے پر مجبور کر رہی تھی اور آکسیجن کی نالی اس کی سانس کو گھسیٹ کر باہر لا رہی تھی۔ اس نے یہ سب محسوس کر کے ۔ اپنی پوری آنکھیں کھول دیں۔ اس بار سب صاف نظر آگیا۔

فاروق بالکل اس کی پٹی کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظر جونہی فاروق پر پڑی۔ فاروق بے تابی سے بولا۔

"نیا ــــ نیا۔ تم ہوش میں ہو" نیا نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بمشکل اتنا کہا۔

"وہ لوگ ــــ"

"ہاں نیا ــــ" فاروق نے جلدی سے کہا "وہ لوگ سب کے سب گرفتار ہو گئے ہیں۔ تمہاری نشاندہی پر ایک بہت خطرناک گروہ پکڑا گیا ہے۔ تم نے ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ مستقبل میں تمہارا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا" نیا کے چہرے پر اطمینان کا نور چھا گیا ــ نحیف آواز میں بولی۔

"تم گواہ رہنا فاروق کہ میں نے اپنے وطن کی خاطر..."

"سارا زمانہ تمہارا گواہ ہے نیا ــــ" فاروق جلدی سے بولا "تم وطن کی قابلِ فخر بیٹی ہو ــــ تم عورتوں کا وقار ہو ــــ تم قابلِ تکریم ماں ہو نیا" نیا نے کوئی جواب نہیں دیا ــــ اس کی لڑکھڑاتی نگاہ اِدھر اُدھر گھومی۔ پھر پائنتی کی طرف جا کر ٹھہر گئی

پائنتی کی طرف اسے شہباز کھڑا نظر آیا۔ اس کے دائیں طرف سیپ تھی اور بائیں طرف موتی کھڑا تھا۔ تینوں اداس اور پریشان تھے۔ نیا نے بڑی محبت پاش نظروں سے پہلے سیپ کو اور پھر موتی کو دیکھا اور پھر اس کی بے چین بولتی نگاہ۔ شہباز کے چہرے پر اٹک گئی۔ شہباز نے جیسے اس نگاہ کا مفہوم ایک دم پڑھ لیا۔ دونوں بازو پھیلا کر اس نے دونوں بچوں کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

ایک دم سے دو گلابی رنگ کے قطرے ۔ نیا کی سُرخ آنکھوں میں نمودار ہوئے اور اس کی آنکھوں سے لوٹ پوٹ کر باہر نکلے۔ ان قطروں میں کچھ بچی کھچی تمنائیں، حسرتیں اور محرومیاں بھی تھیں۔ ان کے رخساروں پر ڈھلک آنے کے بعد ــ نیا کی آنکھیں، مسجد کے گنبد کی طرح صاف چمکدار اور مقدس نظر آنے لگیں۔ نیا کی وہ خالی خالی متشکر اور بولتی ہوئی نگاہیں شہباز کی نگاہوں میں الجھ گئیں۔ جانے اس ایک لمحے میں اس کی تھکی ہوئی، بیقرار اور پُر درد نظروں نے شہباز کی آنکھوں سے کیا کہہ یا کہ شہباز پتھر کا بت بن گیا وہ حرکت کرنے کے قابل نہ رہا۔

شہباز جو نیا کے قدموں پر سر رکھ کر اسے لوٹ چلنے کی التجا کرنے آیا تھا۔ اسے نے آیا تھا، اس کا اجڑا نگر بسانے آیا تھا، معافیاں مانگنے آیا تھا، وہ یوں کھڑا رہا۔ جیسے سحر زدہ ہو گیا ہو۔ کسی آفاقی جادوگرنی کی نگاہ کی زنجیر کا اسیر ہو گیا ہو۔

وہ فقط ایک نگاہ نہیں تھی۔

ایک کہانی تھی۔

ایک زمانہ تھی۔

ایک صدی تھی۔

ایک زندگی تھی۔

نہ جانے وہ کیسی نگاہ تھی۔ جو شہباز کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔ جیسے اس

"امّی جان میرا وہ تاج کہاں ہے"۔ امّی نے وہیں سے گردن موڑ کر جواب دیا۔
"بیٹا تمہارے بچے ابھی چھوٹے ہیں"۔
"نہیں امی جان! میرا اعزاز مجھے لوٹا دیں — مجھے گود میں اُٹھالیں — میں اب تھک گئی ہوں۔ مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ . . . .
میں ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں —
"ابّا جی! آپ ہی تو کہا کرتے تھے۔ کہ "دنیا بڑی بُری ہے — زمانہ بہت خراب ہے"۔
"دیکھ لی میں نے آپ کی دُنیا — آپ کا زمانہ — واقعی آپ ٹھیک کہتے تھے . . . . میں اب زمانے سے لڑ نہیں سکتی۔ مجھے اپنی دنیا میں بُلالیں۔ آپ کی دنیا تو میری دنیا سے اچھی ہے ابّا جی —!"
"امّی جان . . . میرے قریب آئیں۔ اس طرح میرا منہ چُومیں جس طرح میں نے بھی جنم لیا ہو۔ اور مجھے سینے سے لگا کر میرے ننگے سر پہ تاج رکھ دیں — یہ سر ایک عرصہ سے ننگا ہے — اس پہ کوئی ہاتھ سائبان بن کر نہ ٹک سکا امّی جان! مجھے اب اس بیدرد زمانے کے حوالے کر کے نہ جائیں . . . .
امّی جان . . . .
ابّا جی . . . .
امّی جان اور ابّا جی مسکراتے ہوئے پلٹے اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے قریب آگئے۔ اور اس کے بکھرے بالوں والے ننگے سر پہ گول چاند کے ہالے والا تاج رکھ دیا۔
کمرہ ایک دم روشن ہوگیا۔ . . . .
شہباز ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ جب نیّا مسکرائی تھی تو وہ شعلہ سا کیا تھا جو

چہرے کی شبنم سے اپنی قرن قرن کی پیاس بجھانا چاہتی ہو جیسے اس کے سر سے صدیاں گزر گئی ہوں۔ اس کو گھونگٹ کی اوٹ میں وہ نیّا نظر آنے لگی جس کو پہلی بار اس نے گدگدایا تھا۔ "محبت کی ایک کتاب، ایک مقدس کتاب۔ آسمانوں سے اتارے خدا، کہ یہ دنیا محبّت کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہ دنیا لہو لہب سے بھری ہے یہ دنیا نفس کے بجاریوں کا گھر ہے مالک!
محبّت تو ایک آسمانی پودا تھا۔ اسے زمین کا پانی راس نہیں آتا۔
محبّت تو جنت کا ایک میوہ تھا۔ اس کو داغ داغ زبان چکھ نہ سکی۔
محبّت کرنے کے لئے تو کوئی اور جہان دے ہمیں کہ اس جہان کے باسی محبّت کی زبان نہیں جانتے۔ محبّت کے لئے ایک مختصر سی زندگی بہت کم ہے بارِ الٰہا۔ اس خوب صورت، لازوال جذبے کی خاطر بار بار زندگی دے۔ بہت سی زندگیاں دے جس کو محبت عطا کرتا ہے اس سے دنیا داری کی ساری مجبوریاں چھین لیا کر آقا! کہ محبّت کرنا ہی ایک بہت بڑا کام ہے اور اب تیری بخش دنیا میں، میں صرف اور صرف محبّت کرنے کی خاطر زندہ رہنا چاہتا ہوں"۔
الجھی ہوئی، کھوئی ہوئی، سوئی ہوئی نیّا یوں مسکرائی جیسے اس نے اپنی جیت اور اپنی فتح کی خبر سن لی ہو۔ جیسے اس نے شہباز کے دل کی ہر آواز، ہر آرزو سن لی ہو۔ نیّا مسکرائی تو پھر بادلوں میں ڈوب گئی سارا ماحول روشن روشن تھا۔ چاند تارے قریب آگئے تھے — بادلوں کے سائبان خوشبوئیں لٹا رہے تھے۔
فضا مہکی مہکی تھی۔
"امّی جان اور ابّا جی ہاتھوں میں ہاتھ دیئے واپس جا رہے تھے۔ نیّا نے زور زور سے پکارا تو دونوں وہیں رک گئے۔ بادلوں میں اٹک گئے امّی جان نے جب مڑ کر نہیں دیکھا۔ تو نیّا نے بلند آواز سے کہا۔

کمرے میں لپکا تھا۔ کیا وہ روشنی اس کی بجھتی آنکھوں سے ہوتی تھی یا یہ چراغ اس کی لازوال محبت نے جلایا تھا۔؟